ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

سنہ ۱۹۴۲ ع

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشانِ ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشانِ ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندۂ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

زیرِ نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلسِ ادارت
خواجہ حمید الدین بی، اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی، ایس، سی

جلد ۵ بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۴۲ء شمارہ (۸)

خواجہ حمید الدین بی اے کے اہتمام سے رزاقی مشین پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

غزل

رنگِ چمن جنوں کا ہے ساماں لئے ہوئے　　گل ہنس رہے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

مستی مری تھی بادۂ و ساغر سے بے نیاز　　بیخود رہا تصورِ جاناں کئے ہوئے

دنیا تھا کچھ سزا تمھیں زلفوں کو باندھ کر　　سارے جہاں کو ہیں یہ پریشاں کئے ہوئے

یہ سادگی نئی ہے کہ آئے ہیں قتل کو　　شرما رہے ہیں تیغ کو عریاں کئے ہوئے

سارے جہاں میں جلوہ نما ہے وہ خود نما　　سارے جہاں سے آپ کو پنہاں کئے ہوئے

میں بھی اسی کی تیغ کا منت پذیر ہوں　　جس کی ادا قضا پہ ہے احساں کئے ہوئے

لیتے رہے قفس میں مزے آشیاں کے ہم　　دامن کو اشکِ خوں سے گلستاں کئے ہوئے

وہ بے حجاب ہو کے ہیں پھر بے حجاب میں　　دنیا کو اپنے حسن سے حیراں کئے ہوئے

رشک ان پہ ہے جلیلؔ جو بیٹھے ہیں چین سے
دونوں جہاں کو یار پہ قرباں کئے ہوئے

فصاحت جنگ جلیلؔ

مجلس انتظامی جلسۂ سلطان الشعرا

سیدھے طرف سے۔ نشستہ۔ (۱) مولوی صدیق حمد اثر (۲) ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (۳) نواب رحمت یار جنگ بہادر

(۴) نواب ضیاء یار جنگ بہادر ضیاء (۵) نواب تراب یار جنگ بہادر سعید (۶) نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

(۷) نواب قدرت نواز جنگ بہادر قدرت (۸) نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز (۹) نواب شہید یار جنگ بہادر شہید

(۱۰) نواب زین یار جنگ بہادر (۱۱) مولوی علی الدین حمد صاحب (۱۲) مولوی مہر علی فاضل مرحوم

دوسری صف استادہ۔ فرزندان و نبیرگان و تلامذۂ حضرت جلیل

ناگپور میں (میں نے پھر تقریر کی)

حضرت ضیاء الملک ملا رموزی جیسے بالغ نظر اور پختہ کار ادیب کا تعارف ہمارے لئے غیر ضروری ہے۔ البتہ اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ گزشتہ شمارۂ سب رس میں ہم نے ان کا جو پر مغز مضمون شائع کیا تھا اور جس میں انھوں نے اردو شاعری پر ایک نئے نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی تھی ہمیں ناگپور ہی میں ملا صاحب کی عنایات بے غایات کے تحت حاصل ہوا تھا۔ اصل میں ملا صاحب نے انجمن اشاعت اردو کے شاعرے کے لئے یہ مضمون لکھا تھا اور انجمن ہی کے ایثار سے وہ ہمیں حاصل ہوا تھا جس کے لئے ہم دونوں کے شکرگزار ہیں۔

زیر نظر مضمون ملا ضیاء الملک کے اس سلسلۂ مضامین کی ایک کڑی ہے جو انھوں نے رسالہ عندلیب بمبئی میں مسلسل شائع کئے ہیں۔ اسی رسالہ سے یہ مضمون درج ذیل کیا جاتا ہے۔ ملا صاحب ہر رنگ کے مالک ہے۔ یہ رنگ گزشتہ شمارہ کے مضمون کے رنگ سے بالکل جدا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ملا صاحب جو رنگ بھی اختیار کریں، ان کی شخصیت ہر جگہ جھلکتی نظر آتی ہے۔ مدیر سب رس

کسی بڑے شہر میں کسی بڑی شہرت کے ساتھ داخل ہونے پر قدرتی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب چونکہ ہمارا شاندار استقبال ہونے والا ہے اس لئے خود ہم کو بھی شان دار بن جانا چاہیے۔ تاکہ استقبال کرنے والوں پر ہمارا بھی رعب پڑے۔ لیکن بخت و نصیب کی اس ازلی مخالفت کا کیا علاج کہ میں جس شہر میں بھی پہونچا، ریل کے تیسرے ہی درجہ میں پہونچا اور وہ تیسرا درجہ بھی گاندھی جی کے تیسرے درجہ کی طرح نہ ہو سکا جو اکثر درجہ اول کی فراغت دیتا ہے اس لئے اس درجہ سے جس شہر میں بھی اترا، اس درجہ "بے رونقا، بدصورتا، بدحسنا" اور کوفتہ بخت ہو کر کہ وہاں کے استقبال کرنے والے دیر تک بھی نہ پہچان سکے کہ حضرت ملا رموزی کون ہیں۔ اسی لئے میں نے تعین کر لیا تھا کہ میرے چہرے کے مقابل میرے ساتھی مولوی حیات مہری کا چہرہ زیادہ شگفتہ اور عالمانہ ہو رہا ہے اس لئے اچھا ہوگا اگر ناگپور کی مجلس استقبالیہ کے اراکین حیات مہری کو ہی ملا رموزی سمجھ کر سب سے لمبا ہار ان کو پہنا دیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ تمام راستہ یہی ملا رموزی بنے رہیں گے اور قیام گاہ پر پہونچ کر وہ میرا ہار مجھے دیدیں گے۔ اور ان کا ہار میں ان کے حوالے کر دوں گا۔ مگر ریل سے اترتے ہی صوبجات متوسط کے نامور مسلمان اخبار "الفاروق" کھنڈوہ کے ایڈیٹر مولوی عبدالستار صاحب فاروقی کی اس ایڈیٹری کا بے طرح قائل ہو کر رہ گیا کہ موصوف نے صرف میرے "یتیمانہ" اور "یسیرانہ" چہرہ سے تاڑ لیا کہ البتہ تحقیق یہی ملا رموزی ہے۔ نام خدا پھر کیا تھا استقبال والوں میں سے پھر تو بھی آ اور وہ بھی آ، اس نے بھی السلام علیکم اور اس نے بھی آداب عرض ہے کا سلسلہ جو شروع کیا تھا تو ریل گاہ کے علاقہ سے باہر تک ان سراپا خلوص بھائیوں کا تانتا سا بندھا رہا۔

حیرت انگیز بات جو ناگپور میں دیکھی، وہ یہ تھی کہ غریب مسلمانوں میں علمی و ادبی تحریکات کا جذبہ بیحد بلند تھا۔ جس کا ثبوت یہ تھا کہ میری قیام گاہ پر پہونچتے ہی غایت خلوص و محبت سے ملنے والوں میں غریب بھائیوں کی کافی کثرت تھی جو اپنے اپنے خلوص کے اظہار میں کافی مستعد تھے اور ایڈیٹر صاحب اخبار الفاروق کا مٹی میرا تعارف کراتے جاتے تھے اور اراکین انجمن تھے کہ میرے ناشتہ کے لئے مٹھائی سے لے کر خدا جانے کتنے کھانے لانے میں مصروف، کھانے کے بعد میں تو بادشاہ جیسے نخرے، چارپائی پر دراز ہو گیا اور اب ناگپور کے مشتاق ملاقات بھائیوں کی

تشریف آوری شروع ہوئی مجھے اس اندازہ سے بڑی مسرت ہوئی کہ ایک خالص علمی وادبی آدمی سے ملنے کا زیادہ اشتیاق نکلا بھی تو کن میں! کہ غریبوں میں! جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ ناگپور ایسے "غیر اردوئے شہر" میں اردو اور علمی جلسوں سے غریب بھائیوں کی یہ دلچسپی اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ بعض دوسرے ہندوستانی شہروں کے امیروں سے ناگپور کے غریب زیادہ بیدار اور ذہنی و علمی حیثیت سے اردو کے حق میں کارآمد اور لائق احترام ہیں اور ویسے بھی کچھ فطری دستور سا ہے کہ دنیا کے اونچے آدمی اکثر غریبوں ہی کی صف سے نکلے ہیں۔ ان پیارے غریبوں کی آمد کا سلسلہ جتنا بڑھتا جاتا تھا میرے لیڈر ہونے والے غرور اور تکبر میں خاصا اضافہ ہوتا جاتا تھا اور میں بھی ان محبت والے بھائیوں سے اس طرح تن تن کر باتیں کرتا تھا گویا بس ناگپور بھر میں تنہا میں ہی سقراط بھی ہوں اور میں ہی بقراط بھی!

شام کا کھانا کھانے کے بعد مجمع جلسہ کے انتظام میں مصروف ہوگیا اور اب میں اور حیات مہری رہ گئے تو مجھے اپنے بیوی بچے یاد آئے اور کیوں نہ آتے جب کہ تنہا بیویاں ہی چار ہیں اور پھر ان میں بھی کچھ انگریزی داں، کچھ ریڈیو فہم کچھ اے، ٹی، کیٹ کی ماہر اور بہت کم مولوی، اس لیے میں ان کی یاد میں مغرب کے بعد ہی کچھ سو سا گیا اور قریب ہی تھا کہ میں خواب ہی میں اپنی بیویوں کو دیکھ لیتا کہ کوئٹہ والے بھونچال کی طرح حیات مہری نے مجھے بیدار کیا۔ یعنی موصوف نے تو بہت ہی نستعلیق انداز سے مجھے بیدار کیا تھا۔ مگر میں یہی سمجھا کہ جاپان کی گولہ باری کی زد میں آگیا۔ اس لئے بیدار تو ہوا تھا بھاگ جانے کے انداز سے مگر سامنے دیکھا تو مملکت حیدرآباد کے سرمایۂ نازش فاضل ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی، صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی سراپا خلوص بنے مجھ سے ملنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے اس اسلامی خلق، شفقت اور شگفتہ انداز نے مجھے بیحد متاثر کیا اور یہاں سے ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ ہم لوگ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔

ایک دولہن سے کچھ ہی کم رونق کے پنڈال میں داخل ہونے پر چبوترہ کے علماء اور محقق مقررین، مجمع کی کثرت اور خواتین کی بوگی کے علم سے میری تقریر کرنے والی قوت کی نبضیں ساقط سی ہونے لگیں اور دم لبوں پر آنے لگا۔ اب کرم فرما تو سمٹ سمٹ کر تشریف لا رہے تھے مصافحے اور سلام فرما رہے تھے اور میں اس فکر میں تھا کہ وہ کونسی تدبیر کی جائے جس سے میری تقریر نہ ہوسکے اور مجھ سے گھبرا جانے کا الزام بھی نہ آسکے۔ اس موقع پر مجھے افسوس ہوا کہ کاش میں مسلم لیگ یا کانگریس کے نام پر کوئی باغیانہ تقریر کر چکا ہوتا تو اس وقت ممکن تھا کہ حکومتِ ناگپور مجھے تقریر کرنے سے منع کر کے میرے محلکہ کی کارروائی کرتی اور میں اس عظیم الشان جلسہ میں تقریر کرنے سے بچ جاتا۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ تقریری بھوت کے سر پر سوار ہو کر میں اعلان کرتا کہ حضرات! چونکہ اس وقت مجھے اپنی ایک مرحوم بیوی یاد آگئی ہے اور میرا دل بھر آیا ہے، اس لئے مجھے تقریر سے معاف فرمایا جائے۔ ایک دوسری مصیبت خود میری فطری عادت ہے وہ یہ کہ میں تقریر کو لکھ کر پڑھنے کو مقرر کا بڑھاپا سمجھتا ہوں جس طرح میں کہا کرتا ہوں کہ جب کوئی شاعر غزل کہتے کہتے قطعات اور رباعیاں کہنے لگے تو سمجھ لو کہ اس کا دماغی بڑھاپا شروع ہوگیا۔ اس لئے اب گو میں چبوترہ پر بیٹھا تھا مگر کوئی ڈاکٹر آلہ لگا کر دیکھتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ مارے تقریر کے خوف کے میں انا للہ سے لے کر راجعون تک جا پہونچا تھا۔

لائے جلسہ شروع ہوا اور تحریک و تائید کی پہلی گولی چلتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ جرمنی کا اصل حملۂ موسم بہار شروع ہوگیا۔ یعنی ایک تحریک میں ایک ترمیم کے لئے مولوی عبدالباقی بہاری ایم اے سابق ایڈیٹر اخبار "زمیندار لاہور" و حال ناظم نشریاتِ شرقیہ نے درجۂ اول کی صف سے کھڑے ہو کر جو تقریر نما ترمیم پیش فرمائی تو میرے رہے سہے اوسان خطا کے قریب جا پہونچے اور میں حیران رہ گیا کہ اب جب حاضرین میں ایسے ایسے مقرر و متقن ڈٹے ہوئے ہیں، تو میں ندوی قسم کا طالبِ مدرسی کیا بول سکتا ہوں۔ اس کے بعد جو تقریریں شروع ہوئیں تو ان کی عربی، علمی،

اور بھاشا نے میری سوچی ہوئی تقریر کا کچومر نکال دیا۔ اور پھر ڈاکٹر محی الدین ایم اے، پی ایچ ڈی سا فاضل صدر!

بس بار بار دل میں یہی خیال آتا تھا کہ اب کی مرتبہ گھر جا کر چار دن بیویوں کو سکھاؤں گا کہ آئندہ جب مجھے کہیں سے تقریر کا بلاوا آئے تو تم میں سے ایک بیوی ضرور سخت بیمار ہو جایا کرے تاکہ میں بلانے والوں کو لکھ دیا کروں کہ "چونکہ گھر میں حالت نازک ہے" اس لئے حاضری سے مجبور ہوں اور اس سے میں قوم کی نظر میں کاذب اور جھوٹا بھی قرار نہ پاؤں گا کہ ناگاہ آواز کیا آئی وہ:" آواز پھینک کل" پر منہ رکھ کر ایک صاحب نے دل سے اعلان فرمادیا کہ اب ملا رموزی صاحب تقریر فرماتے ہیں۔ تقریر آئندہ ملاحظہ فرمائیے گا۔

جلسہ ختم ہوا میں اپنی تقریر کے اوّل تمّل میں الجھا ہوا ابھی نصف صحن ہی میں تھا کہ: ایک غیر سرکاری حادثے کے طور پر مولانا عبدالباقی ایم اے نے معانقہ فرما کر یاد دلایا کہ ؎ مباش منکر باقی کہ در زمانہ کست،

موصوف سے دفتر اخبار "زمیندار لاہور" میں سنہ ۳۱ء میں شرف نیاز حاصل ہوا تھا اور ہنوز موصوف اسی جذبۂ خلوص سے متاثر تھے۔ ہمارے ممدوح کی سراپا خلوص ملاقات نے اتنا پرجوش بنا دیا کہ اگر موصوف اس موقع پر مجھ سے کسی عظیم بغاوت کا کام لیتے تو میں کسر نہ اٹھا رکھتا۔

صبح کو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کو موصوف کے ہوٹل پر حاضر ہوئے۔ اس وقت میرے ساتھ میرے "قطبین" تھے۔ یعنی مولوی حیات ہری اور حکیم عبدالہادی انصاری جو کامٹی ناگپور میں کامیاب مطب فرماتے ہیں اور بعض لاعلاج امراض کے علاج کے بہترین ماہر ہیں ڈاکٹر صاحب کے پاس جو آتا تھا وہ اعلیٰ درجہ کا علمی و ادبی آدمی ہی ہوتا تھا اس لئے اس مجلس میں خوب گزری مگر وہ جو کہا ہے کہ: نصیب کا لکھا ان مٹ۔ سو اس کو تو میں بھی سمجھ رہا تھا کہ اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہے۔ چلنا چاہیے مگر یہ چیز وہم میں بھی نہ تھی کہ جرمن کی مشینی فوجوں کی طرح یہاں "مشینی ضیافت" کا خفیہ بندوبست ہو چکا ہے یعنی حضرت ڈاکٹر صاحب نے علم نوازی کے ساتھ "بھوک نوازی" کا جو ثبوت دیا تو ہماری شامت آگئی یعنی ساری عمر تو گزاری مولویوں میں اور بغیر کسی ادنیٰ تعلیم و تربیت کے ایک عظیم الشان یورپی ہوٹل کے چھری کانٹوں والے کھانے پر بٹھا دیے گئے اب جب میز پر ڈٹ گئے تو میرے "قطبین" کی گھبراہٹ سے جی چاہا کہ میں ڈاکٹر صاحب سے کہہ دوں کہ "معاف فرمائیے ہم لوگ خوب سیر ہو کر کھا کر آئے ہیں۔ مگر معاً خیال ہوا کہ صبح سے تو ڈاکٹر صاحب ہی کے پاس ڈٹے ہوئے ہیں اب اگر یہ کہا تو چھری کانٹوں سے جاہل ثابت ہو جائیں گے۔ اس لئے بس اتنا یاد ہے کہ ہم نے چھری کانٹوں سے کھایا۔ یا چھری کانٹوں نے ہم کو کھایا۔

ڈاکٹر صاحب چند گھنٹہ کے بعد اس وعدہ کے ساتھ حیدرآباد تشریف لے گئے کہ ہم لوگ ضرور ایک مرتبہ پھر ملیں گے اس کے متصل ہی علامہ عبدالباقی صاحب نے ہم کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور آج ہی شام کو اپنی کوٹھی پر دعوت دی۔ ٹھہری اور ہم پھر گھبرائے کہ شاید یہاں بھی وہی "مشینی ضیافت" ہو جس کو ڈنر کہتے ہیں۔ مگر محترم بیگم عبدالباقی کی صناع موجودگی نے وہ خالص دیسی کھانے کھلائے کہ جی میں آیا، کہ کہہ دیں کہ کل پھر ———!

ملا رموزی

اطلاع :- اگر رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک نہ ملے تو فوراً مطلع کر دیجئے۔ دیر سے اطلاع دینے پر رسالے ختم ہو جاتے ہیں اور تعمیل ارشاد نہیں ہو سکتی۔

مہتمم

حضرت امیر خسروؒ کی روحانیت

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف اپنی تصانیف کی کثرت کے لحاظ سے لاثانی ہیں بلکہ اپنے نصب العین کے لحاظ سے بھی یکتا ہیں جہاں ارباب نثر و نظم ادبیات کی ایک یا دو فروع میں سبقت لے گئے ہیں امیر خسرو ادبیات کی تمام شاخوں میں یکساں طور پر آفتاب ہو کر چمکے ہیں۔ حق یہ ہے کہ زمانۂ گزشتہ میں کوئی ایسا فرد واحد گزرا ہے جو شعر کے تمام اصناف میں ایسا ید طولیٰ اور کمال رکھتا ہو اور نہ امید ہے کہ آئندہ کوئی ایسی عظیم القدر ہستی پیدا ہو گی۔ وہ نہ صرف اپنی ادبی اور علمی قابلیت میں فائق تھے بلکہ ایک نہایت بلند پایہ صوفی بھی تھے۔ امیر موصوف ہر روز روزہ رکھتے تھے اور دن کا زیادہ حصہ قرآن پاک کی تلاوت اور دیگر واجبات اور فرائض دینی کے ادا کرنے میں گزارتے تھے۔ آپ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے خاص اور منظور نظر مریدوں میں تھے اور حق یہ ہے کہ حضرت شیخ نے بھی ایسا مرید کبھی نہ پایا تھا جسے اپنے مرشد کے ساتھ اس قدر شدید اور راسخ اعتقاد ہو۔ حضرت امیر کو عشق و محبت کا وافر حصہ عطا ہوا تھا اور آپ صاحب جذب و حال تھے۔ اسی طرح آپ کو موسیقی کی ساخت و نواخت میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ تمام خوبیاں ودیعت فرما دی تھیں جو اہل علم و فن میں ہوتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ حضرت امیر کی ذات عجوبۂ روزگار تھی اور بالخصوص اس زمانہ میں وہ اپنی نوعیت میں فرد تھے۔

یہ ایک مشہور و معروف واقعہ ہے کہ حضرت امیر خسرو کے والد ماجد نے آپ کو خواجہ نظام الدین اولیاء کے قدموں میں ڈال دیا تھا اس وقت امیر کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ اسی وقت سے آپ خواجہ صاحب کے مریدوں میں شمار ہونے لگے اور مرشد کے روحانی صرف نے آپ کی بالکل قلب ماہیت کر دی۔ قدرت اللہ اپنی کتاب طبقات الشعراء میں بیان کرتے ہیں کہ جب امیر سن بلوغ کو پہونچے تو ان کے مرشد کرم نے دوبارہ ان سے بیعت لی۔ اس بیعت و تسلیم کے بعد امیر نے دنیا و مافیہا ترک کر دیا۔ اور یوں روحانی ترقیات کی ایک شرط پوری کر دی یعنی اصول یک لخت و یکقلم تمام خواہشات کو نیست و نابود کر دیا۔

جس دن سے حضرت امیر کو حضرت خواجہ صاحب سے یہ رشتۂ ارادت حاصل ہوا اسی دن سے ان کو مرشد اقدس سے اس قدر شدید محبت ہو گئی تھی کہ ان سے ایک لمحے کے لئے بھی جدا ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد جب ایک روز انھیں حسن کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ (جو نانبائی کا پیشہ کرتے تھے) وہ انھیں دیکھتے ہی ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ اور اس عشق کو آخری وقت تک نباہا۔ عشق مجازی کے ان دو واقعات نے ان کی طبیعت میں کچھ ایسی یکسوئی پیدا کر دی تھی کہ وہ خود کو اور اپنی خودی کے احساس تک کو فراموش کر بیٹھے تھے اور بالکل ذات باری تعالیٰ میں محو اور گم ہو گئے تھے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ عشق مجازی کا پیدا کرنا اور پھر اسے وسیع اور وسیع تر بنا دینا ہی وہ منزلیں ہیں جن سے گزر کر سالک عشق حقیقی اور عشق الٰہی تک پہونچتا ہے۔ انسانی تعلقات کا دبستان ہی وہ مقام ہے جہاں ہم اس بلند و عالی تجربے کے لئے تیار کئے جاتے ہیں، جس نے روزمرہ کی انسانی زندگی میں عشق کی حیثیت اور قدر نہیں جانی وہ کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ عشق الٰہی کسے کہتے ہیں اور اس کے راستے (طریقت) پر کس طرح گامزن ہونا چاہیے یہی سبب ہے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کا ایک زینہ ہے۔

امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح زندگی سے اور ان کے سلوک کے منازل اور طریق عبور سے نہایت وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ

عرفانِ الٰہی اور وجدانِ روحانی تب ہی حاصل ہوتے ہیں کہ جب کوئی اپنے عشق میں کامل یکسوئی پیدا کرے۔ آمیر اپنے زمانہ کے نہایت معروف و مشغول بزرگوں میں سے تھے۔ وہ دربارِ شاہی میں بلند مراتب اور مناصب پر فائز تھے۔ شعر و سخن پر بھی اپنے اوقاتِ عزیزہ کو صرف فرماتے تھے۔ اور مختلف مضامین اور عنوانات پر نہایت دلکش و دلاویز اور پرجوش نغمات بھی تصنیف فرماتے تھے۔ ان تمام گراں قدر مناصب اور فرائض اور اس قدر کثیر مشاغل کے باوجود بھی آپ کو اتنا وقت مل جاتا تھا کہ اعلیٰ و اسنیٰ روحانی مراتب تک پہونچنے کے لئے ریاضت بھی ہو سکے اور اسی کی بدولت آپ حیاتِ روحانی کے مرکز تک فائز ہو گئے تھے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ اگر آپ کا سینہ انوارِ روحانی سے منور نہ ہوتا تو آپ ترقی کے ان مراتب پر کبھی نہ پہونچ سکتے تھے جو آپ نے اپنی اس مختصر حیاتِ جسدی میں حاصل کر لئے تھے۔ زندگی کے ان تمام شعبوں میں آپ کی کمال کامیابی کا راز صرف ایک لفظ "روحانیت" میں مضمر ہے۔ آپ کی حیاتِ بابرکات "دل بیار و دست بہ کار" کی صحیح مصداق تھی۔

محمد حفیظ سید

محسوساتِ ماہر

سفینہ میرا ساحل آشنا معلوم ہوتا ہے
مجھے یہ بھی فریبِ ناخدا معلوم ہوتا ہے

ترے غم کا جہاں تک سلسلہ معلوم ہوتا ہے
وہیں تک میری ہستی کا پتا معلوم ہوتا ہے

نہ پوچھ اے دوست! شامِ غم میں کیا معلوم ہوتا ہے
مجھے ہر دم قضا کا سامنا معلوم ہوتا ہے

بہ ہر لحظہ بہ ہر ساعت سوا معلوم ہوتا ہے
تمھارا غم طبیعت آشنا معلوم ہوتا ہے

نفس کی آمد و شد سے پتا معلوم ہوتا ہے
کہ اس پردے میں کوئی دوسرا معلوم ہوتا ہے

امیدیں ٹوٹتی ہیں، ڈوبتی جاتی ہیں نبضیں بھی
دلِ بے تاب کو آرام سا معلوم ہوتا ہے

اسی کے دم سے ہے کونین کی ہنگامہ آرائی
بہ ظاہر عشق بے برگ و نوا معلوم ہوتا ہے

تری شبنم فشاں آنکھوں کا آنسو تیرے دامن پر
ستارہ عرش سے ٹوٹا ہوا معلوم ہوتا ہے

اسے میرا سکونِ دل گوارا کس طرح ہوگا
جسے میرا تڑپنا بھی برا معلوم ہوتا ہے

حقیقت یہ ہے ماہرؔ، سخت کافر مشرب ہے
مگر وہ دیکھنے میں پارسا معلوم ہوتا ہے

ماہر القادری

جرعۂ تلخ

یاد ہیں وہ دن کہ دل تھا اور پریشانی نہ تھی
سوختہ جانی نہ تھی آشفتہ سامانی نہ تھی

دل نوائے چنگ و بربط سے لرزجاتا نہ تھا
رقص و رامش سے کلیجا منہ کو یوں آتا نہ تھا

موجِ گل دل کے لئے وجہِ تپش ہوتی نہ تھی
نرم پھولوں سے جگر میں یہ خلش ہوتی نہ تھی

گل کدوں میں دھوپ بن کر چاندنی آتی نہ تھی
چاند کی ٹھنڈی کرن سینہ کو پگھلاتی نہ تھی

خرمنِ مہتاب سے شعلے اٹھا کرتے نہ تھے
ضو فشاں تاروں سے انگارے گرا کرتے نہ تھے

فتنۂ دوراں میں یہ طوفاں یہ طغیانی نہ تھی
ہیکلِ تہذیب پر آدم کی قربانی نہ تھی

پھول کھلتے تھے، چمن پھولوں سے جل جاتے نہ تھے
اس طرح انسان انساں کو نگل جاتے نہ تھے

چاند تاروں کے خنک سائے نہ تھے شعلہ بدوش
کالی راتیں تھیں، مگر صبحیں نہ تھیں ظلمت فروش

نالہ برلب یوں نہ تھا سازِ چمن میرے لئے
صفحۂ عبرت نہ تھی ہر انجمن میرے لئے

خاک بر سر شوق و حسنِ خندہ ساماں اشکبار!
خون روائے انقلابِ گردشِ لیل و نہار!

یہ جہاں بانی عبارت خوں فشانی سے نہ تھی
زندگی شاداب تلواروں کے پانی سے نہ تھی

شوق تھا، لیکن کبھی دامِ سیاست میں نہ تھا
سر برہنہ حسن تلواروں کی ظلمت میں نہ تھا

اے تمدن، آہ اے پروردگارِ کشت و خوں
روحِ آدم ہے تری تزویر کی صیدِ زبوں

تیرے ہاتھوں جب اجڑ جاتے ہیں ناجوں کے سہاگ
خس بداماں جھونپڑوں میں تو لگا دیتا ہے آگ

ہڈیاں یوں نسلِ آدم کی چبا جاتا ہے تو
بھوک میں شاہ و گدا دونوں کو کھا جاتا ہے تو

رہ گزاروں سے گزرتا ہے ترا جب کارواں
معبدوں سے آگ، ایوانوں سے اٹھتا ہے دھواں

تو کہ خونِ بے گنہ کی چیخ سنتا ہی نہیں
روندتا جاتا ہے کلیاں، خار چنتا ہی نہیں

خانہ براندازِ گیتی ہے ترا عہدِ شباب
تو نے اوندھائے ہیں ساغر، تو نے توڑے ہیں رباب

زمزمے گم ہو چکے تلوار کی جھنکار میں
ہم نفس اٹھ کر لگا دیں آگ چنگ و تار میں!
کوئی مطرب ہے، نہ محفل ہے نہ تار و چنگ ہے
انقلابوں سے تصادم قسمتوں سے جنگ ہے

شور

قبائلی علاقہ

موجودہ زمانے میں دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس کے متعلق کافی معلومات حاصل نہ ہوں، لیکن ہندستان کی سرحد پر زمین کا ایک ایسا حصہ ہے جہاں کے رہنے والوں کی تمدنی، معاشی، سیاسی اور جغرافی حالات سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ شمال مغربی صوبے کی سرحد اور افغانستان کی سرحد کے درمیان بڑے بڑے پہاڑوں، خطرناک گھاٹیوں، تیز بہنے والی ندیوں، خوفناک جنگلوں اور بیچدار میدانوں کا ایک سلسلہ میلوں چلا گیا ہے۔ اسی حصۂ زمین کو (Tribal Area) قبائلی علاقہ کہتے ہیں۔ پرانے زمانے کے بعض بوڑھے پٹھانوں کا خیال ہے کہ قدرت نے جب دنیا پیدا کی تو اچھی اچھی زمین، لہلہاتی کھیتیاں، سرسبز وادیاں اور حسین باغ تو زمین کے دوسرے حصوں میں بنائے اور باقی پہاڑ، جنگل، چٹان اور ٹیلے۔ سب کے سب۔ قبائلی علاقہ میں پھینک دیئے۔

اس قبائلی علاقے میں پٹھان قوم کے مسلمان آباد ہیں۔ یہ تو نہیں معلوم کہ یہ کہاں سے آئے اور کب آئے لیکن وہ اپنے آپ کو بنی اسرائیل کی اولاد سے بتاتے ہیں۔ یہ قوم باوجود جاہل، غیر تعلیم یافتہ، وہمی ہونے کے نہ صرف موجودہ زمانے میں آزاد رہی ہے بلکہ انسانی تاریخ کی ابتدا سے اب تک آزاد رہی ہے۔ بہت سے انقلاب آئے اور گئے لیکن ان کی آزادی میں فرق نہیں آیا۔

ان قبائل میں آزادی کی روح اتنی شدت کے ساتھ موجود ہے کہ ہمسایہ حکومتوں۔ حکومت ہند اور حکومت افغانستان نے ان کے آزاد رہنے کے پیدائشی حق کو تسلیم کرلیا ہے۔ تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی چھوٹی قوم جو دو طاقتور ہمسایوں کے درمیان بستی ہے ابتدا سے اب تک آزاد رہی ہو۔

یہ ملک بہت سے قبیلوں پر منقسم ہے مشہور قبیلوں کے یہ نام ہیں۔ آفریدی، وزیری، آراک زائی، زائمکتی لیکن ان میں سے وزیری اور آفریدی اپنی طاقت، اثر اور تعداد کے لحاظ سے سب سے اہم ہیں۔

وزیری قبیلے کے لوگوں کی تعداد قبائلی علاقے کے ہر قبیلے سے بڑی ہوئی ہے۔ یہ لوگ وزیرستان میں رہتے ہیں، جس کی راج دھانی کنی گورم ہے، اور جہاں کوہ سلیمان کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ ٹوچی اور گومال ندیاں اس ملک کو گھیری ہوئی ہیں۔ شمال سے جنوب تک اوسط لمبائی (۱۱۰) میل اور مشرق سے مغرب تک تقریباً (۱۰۰) میل ہے۔ وزیری قبیلے کے لوگوں کی تعداد تقریباً (۵۰,۰۰۰) پچاس ہزار ہے یہ قبیلہ دو بڑے قبیلوں درویش خیل اور محسود پر مشتمل ہے۔ درویش خیل دو اہم قبیلوں یعنی اتمان زائی اور احمد زائی میں بٹا ہوا ہے۔ درویش خیل والے محسودیوں سے زیادہ مہذب سمجھے جاتے ہیں اور یہ خود تین اہم قبیلوں علی زائی، بہلول زائی اور شمان خیل میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہ کوہاٹ اور بنو صوبوں کی سرحدوں کے قریب پہاڑیوں کے دامن میں رہتے ہیں۔ اور محسودی ٹوچی وادی اور گومال ندی کے بیچ کے حصہ میں ہیں۔ لیکن بڑے پھرتیلے اور چالاک ہوتے ہیں۔ اکثر سرحدی مقاموں پر دھاوے کرتے رہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ تمام افغانی قبیلوں میں وہ نہ صرف اب تک بالکل آزاد رہے ہے بلکہ کسی حکومت یا کسی بادشاہ کی فوجیں اس وقت تک ان کی راج دھانی پر قدم نہ رکھ سکیں۔ یہ لوگ پہاڑی قسم کے ہیں اگرچہ کہ آفریدیوں کے طرح وضعدار اور باہتیار نہیں لیکن مالی حیثیت سے یہ

ان سے بڑے ہوئے ہیں۔ علاوہ ان قبیلوں کے وزیرستان میں دوسرے قبیلے مثلاً۔ دوارس، بٹھانی، بھی رہتے ہیں۔ لیکن وزیریوں کے مقابلے میں یہ کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ وزیری علاقہ سوائے چند شاداب وادیوں کے چٹانوں اور ٹیلوں سے پٹا پڑا ہے۔ اس میں بہت کم کاشت ہوتی ہے۔ البتہ یہاں لوہے، خچر، گھوڑوں کی تجارت بعض مقامات پر ہوتی ہے۔ ملک کے ان غیر موافق حالات نے وزیریوں کو نہایت مضبوط اور طاقتور بنا دیا ہے۔ ان کی عورتیں بھی بڑی محنتی ہوتی ہیں۔ اور دوسرے قبیلوں کی عورتوں کے مقابلے میں زیادہ آزاد ہوتی ہیں۔

قبائلی علاقہ کا دوسرا اہم قبیلہ آفریدی ہے۔ جغرافی اعتبار سے یہ علاقہ ہندستان کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چونکہ وہ سڑک جو کوہاٹ کو درۂ خیبر سے ملاتی ہے اور جس کے ذریعے ہندستان اور افغانستان کے تجارتی تعلقات قائم ہیں، آفریدی علاقہ میں سے گزرتی ہے۔ یہ حصہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ مشرق میں صوبۂ سرحد کے صوبے اور مغرب میں شنواری علاقہ ہے۔ شمال میں مہمند لوگوں کا علاقہ ہے، تو جنوب میں اراک زائی اور بنگش قبائل کے علاقے ہیں۔ آفریدی علاقے کا رقبہ تقریباً (۹۰۰) مربع میل ہے۔ جس میں لڑنے والے تیس ہزار آفریدی آباد ہیں۔ یہ آٹھ بڑے قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اور اُن میں سے چھ تو درۂ خیبر جانے والی سڑک پر آباد ہیں۔ یہ سڑک کی حفاظت کرتے ہیں جس کا انھیں حکومتِ ہند کی جانب سے معاوضہ بھی ملتا ہے۔ انھیں خیبر آفریدی کہتے ہیں۔ آفریدی عام طور پر لمبے اور ورزشی جسم کے ہوتے ہیں۔ یہ کسی قدر دُبلے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا جسم بٹا ہوا اور سخت ہوتا ہے۔ ان کے چہرے، ناک اور گال کی ہڈیاں اونچی ہوتی ہیں۔ یہ نہایت بہادر ہوتے ہیں۔ نشانے اور تلوار کے دھنی ہوتے ہیں۔ بندوق سے انھیں بڑی محبت ہوتی ہے بلکہ عشق ہوتا ہے۔ ان کا مقولہ ہے کہ جان جائے مگر بندوق نہ جائے۔ جب کسی کے ہاتھ میں انھیں بندوق نظر آتی ہے تو پھر یا تو بندوق کی خیر نہیں یا بندوق والے کی۔ اسی لئے ہندستان کی فوجوں میں خوشی سے انھیں ملازم رکھا جاتا ہے۔ تقریباً (۷۰۰۰) آفریدی انگریزی صوبوں اور بعض دیسی ریاستوں میں فوج میں ملازم ہیں۔

آفریدی لوگ خانہ بدوش ہیں۔ موسم گرما میں وہ پہاڑیوں کے نیچے بوریوں سے بنی ہوئی متحرک جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور سرما میں جب سردی ناقابل برداشت ہوجاتی ہے تو پہاڑیوں سے نیچے اتر کر خیبر، باڑار اور کجورائی جیسے مقامات میں رہتے ہیں۔ آفریدی، مذہب کے پکے ہوتے ہیں۔ قرآنی احکامات کی بڑی پابندی کرتے ہیں۔ آفریدی عورتیں، مردوں کی عدم موجودگی میں نہ صرف اپنے خاندان بلکہ قبیلے کی جائداد کی نگرانی کرتی ہیں۔ کھانے، پکانے، پانی لانے اور جنگل سے لکڑی کاٹنے کے علاوہ کھیتوں پر روزانہ کام بھی کرتی ہیں جس کی وجہ سے مردوں کی طرح وہ بھی طاقتور بن گئی ہیں۔ لیکن قبائلی سماج میں ان کا وہی درجہ ہے جو ہمارے سماج میں ہندستانی عورتوں کا ہے۔ قبیلہ اراکزائی کے لوگ مذہب پرستی میں آفریدیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ قبیلہ نہ صرف اس حصہ زمین پر قابض ہے جسے کھاکی کہتے ہیں بلکہ خرماں وادی کا ایک بڑا حصہ اور اس وادی کی بائیں طرف سے درۂ مرغان تک زمین کا علاقہ اسی کے قبضے میں ہے۔ یہ قبیلہ سات چھوٹے قبیلوں میں منقسم ہے۔ اور لوگوں کی مجموعی تعداد (۲۹۰۰۰) کے قریب ہے۔ ان میں سے (۲۳۰۰۰) ہزار تو سنی فرقہ کے پٹھان ہیں اور باقی اہل تشیع۔ بہت سے اراکزائی برطانوی ہندستان سے تجارت کرتے ہیں۔ اور بعض تو کافی مالدار ہیں۔ بہت سے ہندو اُن کے علاقہ اور ان کی حفاظت میں بعض مقامات مثلاً کھاکی، ستارقلعہ اور مشلی بازار

میں تجارت کی غرض سے آباد ہیں۔

اراکزائی قبیلے کے جنوب میں پہاڑیوں پر اور صوبۂ کوہاٹ کی سرحد سے کچھ دور ایک دوسرا قبیلہ آباد ہے جس کا نام زیمکتہ ہے۔ اس قبیلے کا علاقہ میراں زائی اور خرم وادی کے درمیان ہے۔ اس کا رقبہ (۴۰۰) مربع میٹر اور ہتیار بند لوگوں کی تعداد (۵۰۰۰) ہے۔ یہ لوگ بھی دو بڑے قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ برخلاف آفریدی، وزیری اور اراکزائی لوگوں کے یہ اپنے ملک سے زیادہ دور نہیں جاتے اور نہ موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے علاقے میں رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا علاقہ دوسرے علاقوں سے زیادہ زرخیز ہے۔ چنانچہ یہاں گیہوں، جو، اور کھانے کی دوسری چیزیں بڑی مقدار میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور بہت سے مویشی گائے، بیل، بکرے، بھیڑیاں، پالتو پرندے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

قبائلی علاقہ نظام حکومت کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصہ تو وہ ہے جو اندرونی طور پر آزاد ہے لیکن بیرونی تعلقات کی نگرانی حکومت ہند اپنی ایجنسیوں کے ذریعے کرتی ہے۔ ان میں چترال، سوات اور دیر قابل ذکر ہیں۔ دوسرے حصے میں بعض جنگجو قبائل مثلاً تورس، بنگیش، بٹھانی، اور ڈوارس ہیں جو اندرونی اور بیرونی طور پر آزاد تو ہیں لیکن برطانوی ہند کے سیاسی نمائندوں کے اثر میں ہیں۔ تیسرا علاقہ وہ ہے جس میں بالکل آزاد اور خود مختار قبائل رہتے ہیں۔ اس علاقے میں نہ تو کوئی باقاعدہ حکومت ہے نہ نظم۔ یہاں کے رہنے والوں نے اپنے آپ کو مختلف قبیلوں میں تقسیم کرلیا ہے۔ اور ہر قبیلہ مختلف جتھوں میں بٹا ہوا ہے۔ اور ہر جتھے کے کئی حصے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے لئے زمین کا ایک حصہ رہنے سہنے کے لئے مختص کرلیا ہے۔ یہ لوگ اپنے مکانوں کے اطراف ایک فصیل کھینچ دیتے ہیں جس میں برج ہوتے ہیں اور لڑائی کے وقت یہ قلعہ کا کام دیتے ہیں۔ نہ صرف چھوٹی چھوٹی بستیوں کے اطراف اس قسم کے قلعے بنے ہوتے ہیں بلکہ بعض مقامات پر تو ہر مکان کی حفاظت کے لئے ایک چھوٹا سا قلعہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ اور جب کبھی موقع ملتا ہے تو مخالف قبیلے کے آدمیوں کو فوراً مار دیتے ہیں۔ ان کی مخالفت اور دشمنی تو دنیا میں مشہور ہے۔ دشمنی کا یہ جذبہ ورثے کے طور پر ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوتا چلا آتا ہے۔ یہ ہمیشہ اپنی جان کو ہتیلی میں لئے پھرتے ہیں۔ اگرچہ کہ وہ آپس میں بری طرح سے منقسم ہیں، لیکن جب کوئی غیر جماعت یا حکومت ان پر حملہ کرتی ہے، تو پھر وہ ایک دوسرے سے فوراً مل جاتے ہیں۔ اور ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔

قبائلی لوگوں میں آزادی کا جذبہ اتنا سخت ہے کہ وہ نہ صرف دوسروں کی حکومت یا مداخلت کو برداشت نہیں کرسکتے بلکہ اپنے لوگوں کی بات بھی بعض اوقات خاطر میں نہیں لاتے۔ ہر جماعت یا گروہ کا ایک سردار ہوتا ہے جسے "ملک" کہتے ہیں۔ اور ہر قبیلے کے ملک کو وہ "خان" کہتے ہیں جو جنگ کے زمانہ میں ان کا قائد اور امن کے زمانہ میں ان کا رہبر ہوتا ہے لیکن حقیقی قوت اور اقتدار تو جرگے کو حاصل ہے جو قبیلے کے تمام بڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ قبائلی زندگی کے تمام اہم معاملات انھیں لوگوں کے توسط سے انجام پاتے ہیں۔

یہ پٹھان نہایت بہادر اور خوددار ہوتے ہیں۔ ان کا سینہ چکلا، قد لمبا اور رنگ گورا ہوتا ہے۔ جنگل، پہاڑ اور وادیوں کی زندگی نے ان کے جسم کو سخت اور مضبوط بنادیا ہے۔ بال اتنے لمبے لمبے ہوتے ہیں کہ مونڈھوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ وہ ایک ڈھیلا کرتہ بڑی آستینوں کا

پہنتے ہیں ۔ اور بکرے کے چمڑے کے کوٹ پر سے شال یا بلانکٹ اوڑھ لیتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں افغانی چاقو اور دوسرے میں بندوق کا ہونا ضروری ہے۔ ان کی عورتیں ایک ڈھیلا اور لمبا کرتہ پہنتی ہیں جو ٹخنوں تک آتا ہے اور سر پر ایک کپڑا باندھ لیتی ہیں ۔

یہ لوگ جس طرح دشمنی میں سخت ہیں اسی طرح دوستی میں مضبوط۔ جب کسی شخص کو خواہ وہ چور ہو' ڈاکو ہو یا خونی ایک مرتبہ پناہ دیتے ہیں تو پھر آخر دم تک اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو اُن کی اجازت سے ان کے قریب آکر آباد ہو جاتے ہیں تو یہ ان کی حفاظت کرنا اپنا مقدس فرض سمجھتے ہیں۔ مہمان نوازی میں بہت مشہور ہیں۔ جب کوئی شخص خواہ وہ کیسا ہی ہو اُن کا مہمان بن جاتا ہے۔ تو وہ ہر طرح سے اس کی خاطر مدارات کرتے ہیں۔ خود نہیں کھاتے اس کو کھلاتے ہیں۔ گھر کی ہر چیز اس کے آرام کے لئے وقف ہو جاتی ہے۔ جب تک مہمان ان کے گھر میں ہوتا ہے تو وہ قبائلی علاقہ کی ہر بلا اور مصیبت سے آزاد ہوتا ہے۔ کیونکہ پٹھان اپنے مہمان کی حفاظت کی خاطر جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ قبائلی علاقہ میں سیکڑوں ہندو اور سکھ تاجر آباد ہیں جہاں یہ بیوپار کرتے ہیں ۔ وہاں کا ملک ان کی حفاظت کرتا ہے اور وہاں کے پٹھان انھیں مخالف قبیلوں سے بچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے ۔

یہ لوگ تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان میں وہم اور قبر پرستی عام ہے۔ یہ ملاؤں اور پیروں سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کے ایک اشارہ پر مارنے اور مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ملاؤں سے ان کی دیوانہ وار عقیدت کا اندازہ ایک قصہ سے ہو سکتا ہے جو صوبہ سرحد میں اکثر سنایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی قبیلے کے ہاں ایک بھی پیر کی درگاہ نہ تھی۔ اس کمی پر دوسرے قبیلے کے پٹھانوں نے انھیں طعنے دئے اور ملامت بھی کی۔ اس واقعہ سے انھیں حقیقت میں بڑی ندامت ہوئی۔ انھوں نے ایک مشہور سید کو بڑی عزت سے اپنے ہاں بلایا۔ بڑے دھوم سے دعوت کی کئی دن مہمان داری کی اور آخر میں اس بے چارے کا کام تمام کردیا اور ایک نہایت شاندار درگاہ سید کی مزار پر بنادی۔ اس طرح انھوں نے اپنی کمی پوری کی اور اس طریقے سے اپنی شرمندگی اور ندامت ہمیشہ کے لئے مٹادی۔

محمد بن عمر

غزل

حالِ غمِ فراق سنانے سے فائدہ
رُو رُو کے آج اُن کو رُلانے سے فائدہ

بیزار ہو نہ جائے کہیں کوئی زیست سے
اتنا کسی کے دل کو دکھانے سے فائدہ

چھائی ہوئی ہوں یاس کی تاریکیاں جہاں
امّید کے چراغ جلانے سے فائدہ

مانوس ہو چکا ہوں جفائے خزاں سے میں
اب مژدۂ بہار سنانے سے فائدہ

ہر گام پر امید کے دے کر مجھے فریب
میری ہر اک امید مٹانے سے فائدہ

جب مٹ چکے تمام محبت کے ولولے
اب التفاتِ خاص جتانے سے فائدہ

اِس طرح چشمِ ناز سے فطرت کو دیکھ کر
کچھ اور دردِ عشق بڑھانے سے فائدہ

محمد جعفر فطرت

وہ دونوں

وہ دونوں مسرت و محبت کی چھوٹی سی نیا میں بیٹھے گرہستی کے ساگر کو پار کر رہے تھے۔ انھیں مطلق گمان نہ تھا کہ موجوں کے زیر و بم سے ان کی کشتی ڈگمگائے گی؟

عطیہ اور ندیم کا بیاہ ہوئے کوئی دو برس ہو گئے تھے، ندیم کے کوئی نہ تھا۔ میاں بیوی راجا رانی کی طرح بسر کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ڈیڑھ برس بڑے ہی عیش و عشرت میں کٹ گیا۔ عطیہ کوئی خواہش ظاہر کرتی اور ندیم بڑی خوشی سے اسے پورا کرتا۔ ندیم کوئی بات بتاتا اور عطیہ نہایت ہی خندہ پیشانی سے بجا لاتی۔ روح اور جان ایک تھی! البتہ دونوں کے جسم علحدہ تھے۔ سچ مچ دونوں ایک دوسرے پر والہانہ شیفتہ تھے چاند و چکور! کلی اور بھونرا!! —

لیکن گزشتہ چھ ماہ سے ان کی متاہل زندگی کچھ کرکری سی ہو گئی تھی۔ کیا ہوا کون جانے؟ ان دونوں میں اکثر اختلافات رہنے لگے۔ اور کتنی ہی دفعہ تو بات خطرناک حالت تک بڑھ بھی گئی۔ یوں تو ندیم طبیعت کا بڑا اچھا تھا۔ لیکن وہ ذرا ضدی بھی تھا۔ جب کوئی بات اس کی مرضی کے مطابق نہ ہوتی تو وہ فوراً بگڑ جاتا، وہ اکثر بھول جاتا کہ اس کی طرح دوسروں کے بھی جذبات و احساسات ہیں۔ لیکن اس کے برعکس عطیہ نہایت ہی بردبار اور ذی فہم تھی۔ وہ ہمیشہ ندیم کی خوشنودی ڈھونڈتی۔ پھر بھی وہ انسان ہی تو تھی؟ صبر و برداشت کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے؟ یہی وجہ تھی کہ پچھلے چند دنوں سے وہ ندیم کے اس بڑھتے ہوئے ضدی پن سے کچھ بیزار رہنے لگی تھی پھر بھی اسے اپنی گرہستی کی گھٹاؤں میں مسرت کی بجلی کوندتی دکھائی دیتی۔ وہ اس لئے کہ ندیم کا پارہ جتنی جلد چڑھتا اتنی ہی جلد اتر بھی جاتا اور پھر وہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔ آج ہی کی تو بات ہے نا؟ ————

چار بجے ندیم جب دفتر سے لوٹا تو وہ حیران رہ گیا۔ معمول کی طرح ہونٹوں پر مسکراہٹ اور حیا سے بوجھل پلکوں میں لپٹی ہوئی ہرن جیسی سیاہ اور چمکدار آنکھوں والی عطیہ اس کے استقبال کے لئے آج دروازہ پر کھڑی نظر نہ آئی۔ اس نے آواز دی۔ پھر بھی جواب نہ ملا۔ ندیم جلدی سے کپڑے اتار کمرے میں گیا۔ دیکھا کہ عطیہ بستر پر خاموش پڑی ہے۔ اس کا چہرہ بے حد اداس تھا۔

صبح دفتر جاتے وقت عطیہ سے جو جھڑپ ہوئی تھی، ندیم کو اس کی یاد ہی نہ تھی۔ گزشتہ ڈیڑھ برس سے عطیہ میکے نہ گئی تھی۔ اسے اکثر اپنے ماں باپ سے مل آنے کی خواہش ہوتی تھی۔ آج صبح ہی اس کے باپ کا خط آیا تھا۔ اس کی بڑی بہن میکے آئی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد سے دونوں بہنیں اب تک ایک دوسرے سے نہیں ملی تھیں۔ اس لئے عطیہ کے باپ نے اسے آنے کے لئے تاکید کر کے لکھا تھا۔ خط ملتے ہی عطیہ نے ندیم سے ذکر کیا۔ عطیہ کا میکے جانا ندیم کو بڑا تکلیف دہ محسوس ہوا۔ اس کی ایک دن کی جدائی اسے ایک صدی معلوم ہو تو کونسا تعجب! —

مگر آج عطیہ جانے کے لئے بے تاب تھی۔ اس نے ندیم کو سمجھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ لیکن ندیم نے اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ لاکھ منانے اور سمجھانے پر بھی وہ اپنے ہیکڑ پن سے باز نہ آیا۔ اس کے اپنے اس سلوک سے عطیہ نے کیا محسوس کیا اس کا بھی اسے مطلق احساس نہ ہوا۔ البتہ بے چاری عطیہ ناراض ہو گئی۔ اور اسے ندیم کی اس ضد پر بڑا غصہ آیا —

ندیم جو دفتر سے لوٹا تو بڑا ہی مسرور ا صبح کی نوک جھوک کا اسے ذرا بھی خیال نہ تھا۔ وہ اپنی من مندر کی دیوی سے پریم کی چند باتیں کرنے کے خیال میں مگن گھر آیا تھا۔ لیکن یہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ عطیہ کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر بڑے ہی پیار سے کہنے لگا "عطی کیا ہوا؟ تم اداس کیوں ہو؟"

عطیہ نے گردن اونچی کرکے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کچھ نہیں!" "پھر ایسی ملول کیوں ہو؟" ندیم نے پوچھا "چلو، تمھیں بھوک ہو رہی ہوگی"۔ یہ کہہ کر عطیہ فوراً اٹھی اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ ندیم منہ دھونے لگا تو اسے اک دم صبح کی ساری باتیں یاد آگئیں اور اس نے خیال کیا۔ شاید اسی لئے عطیہ بگڑ گئی ہے۔ منہ دھو کر ندیم اندر آیا۔ عطیہ نے ابھی ابھی چائے کا پانی رکھا تھا۔ وہ کہنے لگا "عطیہ صبح میں نے تمھیں میکے جانے نہ دیا۔ شاید اسی لئے چاند گہنا گیا ہے"۔

"نہیں، یہ بات نہیں۔ جی کچھ ڈوب سا گیا تھا" "تو چلو پھر آج ہم فلم دیکھنے چلیں۔ نئی فلم ہے مگر ٹریجڈی ہے!"

"ایسی غمناک فلم دیکھنے کو تو میرا مطلق جی نہیں چاہتا۔ چاہو تو اکیلے چلے جاؤ"

عطیہ کا یہ ادھورا جواب ندیم کو بہت برا معلوم ہوا۔ اس نے اسی دماغی ہیجان میں چائے پی اور کپڑے پہن کر باہر نکل گیا۔ شام کو جب وہ گھوم کر آیا تو اس کا پارہ کچھ بلند ہی تھا۔ اسے محسوس ہوا عطیہ بے وجہ اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہے۔ شام کو جب اس نے عطیہ سے سینما چلنے کو کہا تو عطیہ کے انکار سے وہ اور بھی بگڑ گیا تھا۔ جب وہ لوٹا تو چپ چاپ کمرے میں جاکر اخبار الٹ پلٹ کرتا ہوا بیٹھ گیا۔ کھانے کے وقت عطیہ نے اسے آواز دی، کھاتے وقت معمول کی طرح ہنسی مذاق اور خوش گپیوں کے بجائے اس نے چپ چاپ کھانا ختم کرلیا۔ عطیہ جان گئی کہ دریا کا یہ سارا تلاطم سینما نہ جانے کا سبب ہے۔ کھانا ختم ہونے پر اس نے خود ہی سینما چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر البتہ ندیم کے چہرے پر تھوڑی سی سرخی دوڑ گئی اور دونوں مل کر سینما چلے گئے۔ گھٹائیں چھٹ گئیں اور فضا پرسکون ہوگئی۔

سینما سے لوٹتے ہوئے ندیم بڑا ہی خوش تھا۔ رات کا ایک بجا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور سکون چھایا ہوا تھا۔ فضا چاندنی سے لبریز تھی۔ نیلے ساگر میں نور کی موجوں پر چاندی کی کشتی دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ اس من موہن منظر نے ان کے ساز دل کے تاروں کو چھیڑ دیا۔ اور وہ عجیب امنگ سی محسوس کرنے لگے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی ندیم کو عطیہ کا شام کا منہ لبورنا یاد آگیا۔ اس نے بڑے ہی پیار سے پوچھا "عطی سچ بتاؤ! صبح میں نے تمھیں میکے جانے نہ دیا اسی لئے تم ناراض ہوگئی تھیں نا؟ تم ہی کہو تمہارے بغیر مجھے یہاں سکون ملے گا بھی؟!! عطیہ جان گئی کہ اس وقت ندیم بہت خوش ہے۔ ایسے میں اسے کچھ کہا جائے تو اطمینان سے سن لے گا۔ اگر مان جائے تو اپنی غلطی کا اعتراف کرے گا یا پھر اپنی طرز بدل ڈالے گا۔

عطیہ کہنے لگی "تم نے کبھی یہ محسوس کیا کہ آج کل ہماری گرہستی کے ساگر میں اکثر طوفان آرہے ہیں، ایسا کیوں؟ تم نے کبھی ٹھنڈے دل سے اس پر غور بھی کیا؟"

"ہاں۔ ایسا ہو تو رہا ہے۔ مگر کیوں؟ یہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ کیا تم اس زندگی سے ناخوش ہو۔ میں تو تمھیں خوش رکھنے کی ہر ممکنہ کوشش کرتا ہوں۔ پھر تم کیوں ناراض رہتی ہو۔ میں تو نہیں سمجھ سکا، تمہاری محبت میں کمی تو نہیں ہوگئی؟" ندیم نے

جذبات سے انتہائی مغلوب ہوکر کہا۔

"نوج ہمارے دشمنوں کی محبت میں کمی ہو۔ یہ ممکن بھی ہے۔ البتہ تم غصہ نہ ہو تو میں بتائے دیتی ہوں"۔

"منظور! منظور!! بالکل منظور!!! اگر تم یہ بتا دو کہ میرے سلوک میں کوئی خامی ہے تو میں ضرور اسے بدل ڈالوں گا۔ پھر تو بس نا؟"

"پہلے ذرا سکون کے ساتھ تم یہ سوچ لو کہ جس طرح تم اپنی ضد منواتے ہو اسی طرح کوئی تمہاری بات نہ مانے تو تمہارا کیا حال ہوگا۔ تمھیں خود بخود بہت ساری باتیں معلوم ہوجائیں گی۔ بات یہ ہے کہ تم ہمیشہ اپنے آپ کو اپنی ہی نظر سے دیکھتے ہو۔ گر دنیا میں ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ اس کا تو تمھیں بھول کر بھی خیال نہیں آتا۔ تم اپنے نزدیک یہ سمجھتے ہو کہ تم جو کچھ کرتے ہو بالکل ٹھیک ہے غلط نہیں ہوسکتا! مگر اس سے دوسروں کو جو تکلیف ہوتی ہے، انھیں جو دکھ پہنچتا ہے، اس کا احساس بھی تمھیں چھو نہیں سکتا۔ یہی سبب ہے کہ آج کل ہم میں اکثر جھڑپ ہو جاتی ہے۔ خدانخواستہ اگر یہی حال رہے تو عجب نہیں کہ ہماری زندگی میں خلیج حائل ہو جائے اور ہماری گرہستی کی نیا گرداب میں آجائے۔ آج ہی کی بات کو لو نا! ہے تو ذرا سی چیز! مجھے آپا سے ملنے کی بے حد خواہش ہے مگر وہ تمہارے ذہن میں نہ آسکی"

"لیکن میں نے کب کہا تھا کہ نہ ملو۔ میں نے تو کہہ دیا تھا کہ انھیں اپنے پاس ہی بلا لو"۔

"مگر آپا صرف ایک ہفتے کے لئے وہاں آئی ہیں۔ یہ تمھیں معلوم ہے نا؟ بھلا اس تھوڑی سی مدت میں وہ وہاں کیا رہتیں اور ہمارے پاس کیا آتیں۔ لیکن تمہارے تو وہی ڈھاک کے تین پات۔ کوئی کیونکر کہے! تم کبھی یہ سوچتے ہی نہیں کہ تمہارے سلوک سے دوسروں کو بھی سکھ پہنچا ہے یا رنج و تکلیف! یہ کلجگ نہیں کرجگ ہے! اس دنیا میں تو ایک شخص کو دوسرے کو خوش رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ پھر یہ تو خود اپنے گھر کا معاملہ ہے! جیسے تم یہ خیال کرتے ہو کہ تمھیں کوئی دوسرا تکلیف نہ دے۔ اسی طرح تم کو خود بھی یہ سوچنا چاہیئے کہ تمہاری وجہ سے کسی اور کو دکھ نہ پہنچے۔ ایک کو دوسرے کے لئے ایثار کرنا چاہیئے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو کدورت اور رنج و ملال بڑھ کر زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ غور کریں تو دنیا میں بہت سارے دکھوں کی یہی ایک اہم وجہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر اب بھی ہم اپنے آپ کو نہ بچا سکے تو بہت ممکن ہے کہ ہماری زندگی کی گاڑی بھی اسی کھائی کی نذر ہو جائے" —— فرطِ جذبات سے عطیہ کی آواز بھر آگئی۔ اس کی سنتا ہوا ندیم بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے بھی دماغ میں تیز تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ دل میں طوفان سا اٹھا۔ کہنے لگا۔ "عطیہ! آج تم نے میری آنکھوں میں تلخ مگر بصیرت افروز سرمہ لگا دیا۔ جس سے ساری حقیقت میری نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہوگئی۔ واقعی میری کتنی بھول ہے! اگر اب میری آنکھیں کھل گئیں سچ ہے کہ زندگی میں ایک کو دوسرے سے سمجھوتا کرنا چاہئے۔ تب ہی زندگی کامیاب ہوسکتی ہے۔ آؤ عطیہ! آج ایک بار پھر ہم اپنی آئندہ زندگی بھر کے لئے چاند اور اس کی دلفریب چاندنی کو گواہ رکھ کر صلح کا عہد کریں"۔

یہ کہہ کر ندیم نے عطیہ کو قریب کھینچا اور اس کے رس بھرے عنابی لبوں پر صلح کی ایک مضبوط مگر گرم گرم مہر ثبت کر دی!! —

محمد عبدالقادر فاروقی

(بہ اجازت نشرگاہ اورنگ آباد)

غزل

کئے دیتا ہے جنوں اس کو سبکسار ابھی
عشق ہے تیری نگاہوں سے گراں بار ابھی

سرسری حسنِ خراماں پہ نگاہیں ڈالو!
اور اس راہ سے گزریں گے طرحدار ابھی

ناخدا عشق کے بیڑوں کو یونہی بڑھنے دے
ذکرِ ساحل نہ کر آئی نہیں منجدھار ابھی

سیکڑوں رنگ بدلتا ہے دلِ خانہ خراب
دَیر ابھی، کعبہ ابھی، خانۂ خمار ابھی

کارواں کھوئے ہوئے سے ہیں سرِ راہِ حیات
عشق کا درد نہیں قافلہ سالار ابھی

دیکھنے کے بھی کچھ انداز ہیں اے اہلِ نظر!
یہ نگاہیں بھی نہیں محرمِ اسرار ابھی

اہلِ ایماں کو ابھی کفر کے آداب نہ آئے
گردنِ ان کی نہیں شائستۂ زنّار ابھی

عشق بیٹھا ہے جگانے تجھے لیکن اس سے
دیکھ! کھلنا نہ ذرا نرگسِ بیمار ابھی

زندگی کا دیئے جاتے ہیں ثبوت اس کے اسیر
کانوں میں آئی تھی زنجیروں کی جھنکار ابھی

حال و مستقبلِ دنیا کا کہاں ہند میں ذکر
عہدِ ماضی کا یہاں گرم ہے بازار ابھی

کیوں ہوئی جاتی ہے اے ہند تری نیند اچاٹ
تیری دنیا میں نہیں صبح کے آثار ابھی

منزلِ دوست کہاں تک میں پھروں آوارہ
نظر آتے تجھے ترے کچھ در و دیوار ابھی

آج تک چشمِ ملائک سے رہی جو پنہاں!
وہ حقیقت ہوئی جاتی ہے نمودار ابھی

ہاں تری شانِ تغافل میں کمی ہونے نہ پائے
اے ہونا ہے تری آنکھوں کو ہشیار ابھی

آج تک آنکھ ستاروں کی لگی ہے۔ لیکن
عشق کا دور ہوا ہی نہیں بیدار ابھی

اک نظر سے جو کریں اس گلِ رعنا کو خراب
سچ ہے پیدا ہی کہاں ایسے گنہگار ابھی

کوئی چھیڑے تو کس انداز سے اس کو چھیڑے
نرگسِ ناز تری مست ابھی ہشیار ابھی

اے شبِ تارِ غمِ دوست تری عمر دراز!
کہ زمانے میں نہیں صبح کے آثار ابھی

ہوش و غفلت کے قریب اٹھنے کی ہے دیر ذرا
نگہِ شوق ہوا جاتا ہے دیدار ابھی

حسن کو بس میں کرے یہ نہیں آسان ہنوز
اس قدر عشق نہیں سادہ و پرکار ابھی

دیکھیں کب تک رہے آغازِ محبت کا یہ دور
نہ ہے انکار ابھی اور نہ اقرار ابھی

ایک عالم کا اچھلتا ہے لہو اور فراق
کمرِ یار سے کھنچنے کو ہے تلوار ابھی!!

فراق گورکھپوری

نستعلیق ٹائپ

مجتبی جناب ایڈیٹر صاحب!

چند ہی روز ہوئے کہ آپ کے سب رس کی مارچ کی اشاعت ایک دوست کے ہاں سے ہاتھ لگی۔ اس میں "اردو ٹائپ کے مسئلہ" کے عنوان سے دو تحریریں نظر آئیں۔ اس موضوع پر سب رس نے اور مضامین کو بھی شایع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اس کی بنا پر مجھے یہ سطریں لکھنے کی تحریک ہوئی۔

نستعلیق ٹائپ سے مجھے بارہ چودہ برس پہلے اس وقت سے دلچسپی پیدا ہوئی جب کہ ہماری حکومت نے دارالطبع سرکار عالی کو نستعلیق ٹائپ بنانے پر مامور کیا تھا۔ اس موقع پر اگر میں حیدرآباد میں ٹائپ سازی کی روئداد کو مختصراً بیان کروں تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

نواب حیدر نواز جنگ بہادر سر اکبر حیدری مرحوم کو نستعلیق ٹائپ کے بنائے جانے کی دلی آرزو تھی۔ چنانچہ یہ ان ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں دارالطبع کو نستعلیق ٹائپ کے بنانے کے لئے چھیاسی (۸۶۰۰۰) ہزار روپے سرکار عالی نے منظور کئے۔ چار سال کی کوشش کے بعد دارالطبع نے ۲۴ پائنٹ کا ایک فاونٹ تیار کیا جس میں (۱۱۰۱) جوڑ تھے۔ منظورہ رقم میں سے دارالطبع نے تقریباً ساڑھے ترپن (۵۳) ہزار روپے مشنری آلات اور دوسری ضروری اشیاء کے خریدنے میں صرف کئے اور تقریباً ساڑھے تیس (۳۲۵۰۰) ہزار روپے ٹائپ سازی میں خرچ کئے۔

سنہ ۱۹۲۷ء میں سرکار عالی نے مولوی مرزا رفیق بیگ صاحب کو ان کے اپنے نمونہ پر ٹائپ بنانے کے لئے چودہ ہزار کی رقم منظور کی۔ انھوں نے (۲۰۵) جوڑ کا کسراتی ٹائپ (Fractional Type) بنایا۔ یہ ٹائپ اگرچہ جوڑوں کی تعداد کے لحاظ سے دارالطبع کے ٹائپ سے مرجح تھا، لیکن خوبصورتی اور خوش نویسی کے اعتبار سے اس ٹائپ کے مقابلہ میں بہت بھدا تھا۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں نستعلیق کمیٹی کی سفارشات پر دارالطبع کو اور مرزا رفیق بیگ صاحب کو پھر ایک موقع دیا گیا کہ دارالطبع اپنے جوڑوں کی تعداد کو کم کرے اور مرزا صاحب اپنے حروف کو خوش نما بنائیں۔ اس نئی کوشش کے لئے دارالطبع کو تقریباً چھبیس ہزار روپیہ کی اور مرزا رفیق بیگ صاحب کو غالباً پندرہ ہزار روپیہ کی منظوری دی گئی اور کام کی تکمیل کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کر دی گئی۔

اس نوبت پر نستعلیق ٹائپ کے متعلق ملک کے اخباروں میں دھوم مچی ہوئی تھی اور بعض حلقوں میں جانب داری کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ میں اس زمانے میں نظام گزٹ ہفتہ وار میں بہ حیثیت مدیر کے کام کر رہا تھا اور مطبع نظام گزٹ کے چلانے کی وجہ سے لیتھو پرنٹنگ کی مشکلوں اور پریشانیوں سے واقف ہو چلا تھا اس لئے نستعلیق ٹائپ سے مجھے قدرتی طور پر دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اور ویسے بھی بطور اخبار نویس اور اردو ادب کی ترقی چاہنے والے کے اس مسئلہ پر توجہ کا مرکوز ہونا لازمی امر تھا۔

اپریل سنہ ۱۹۳۰ء میں سرکار عالی نے ایک نستعلیق کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے کچھ روز پہلے دارالطبع کے بنائے ہوئے ٹائپ اور مرزا رفیق بیگ صاحب کے بنائے ہوئے ٹائپ کا مقابلہ، و امتحان سرکاری طور پر ایک مختصر سی کمیٹی نے کیا تھا

جس کے تین ارکان تھے۔ اس کمیٹی نے دونوں کوششوں میں سے دارالطبع کے ٹائپ کو قابلِ ترجیح قرار دیا۔

نستعلیق کانفرنس میں (غالباً مولوی عبدالحق صاحب کی تحریک پر) مجھے بھی شرکت کا موقع عنایت فرمایا گیا اور اس میں مجھے دونوں ٹائپوں کے دیکھنے اور ان کے حسن و قبح پر غور کرنے کا موقع ملا۔ مجھے دونوں ٹائپوں میں بنیادی استقام کا احساس ہوا۔ مرزا رفیق بیگ صاحب والے ٹائپ میں زیادہ اور دارالطبع والے ٹائپ میں کم۔

مرزا رفیق بیگ صاحب نے کسراتی ٹائپ بنایا تھا جس کو اصطلاح میں فراکشنل ٹائپ (Fractional Type) کہتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں دارالطبع نے یک جسمی ٹائپ بنایا تھا جس کو (Fall-body Type) کہتے ہیں۔ کسراتی ٹائپ کا خیال مرزا صاحب کو غالباً خط میں کرسی قائم رکھنے میں سہولت پیدا کرنے کے لئے آیا ہوگا۔ نستعلیق رسم الخط میں کئی حروف والے لفظ کا ابتدائی حرف تو سطر سے حسب ضرورت اوپر لکھا جاتا ہے اور اس کے بعد کے دوسرے حروف یکے بعد دیگرے پہلے حرف سے نیچے لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً لفظ "نستعلیق" ہی کو لیجئے۔ پہلے حرف ن کا ابتدائی ٹکڑا سطر کے اوپر سے شروع ہوتا ہے اور آخری حرف ق سطر سے کچھ نیچے چلا جاتا ہے۔ ٹائپ میں ابتدائی ن کا وہ ٹکڑا جو لفظ نستعلیق میں کارآمد ہے اگر لفظ "نسب" میں استعمال کرنا چاہیں تو کام نہ آئے گا۔ کیونکہ اس سہ حرفی لفظ میں ابتدائی ن کا جوڑ سطر پر آتا اور پر نہیں لکھا جاتا جتنا کہ لفظ نستعلیق کے ہفت حرفی ہونے کی وجہ سے لکھا جاتا ہے وہ تقریباً سطر ہی پر ہوتا ہے۔ اس لئے یک جسمی ٹائپ میں ایک ہی جوڑ کو کرسی کے لحاظ سے سطر سے اوپر کئی ایک مختلف درجوں میں علحدہ علحدہ ڈھالنا پڑتا ہے تاکہ مختلف کرسیوں میں مطابقت قائم رہے۔ اس سبب سے یک جسمی ٹائپ کے جوڑوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس مشکل پر قابو حاصل کرنے کے لئے مرزا صاحب نے اس خیال سے کہ ایک ہی جوڑ مختلف کرسیوں میں کام آسکے اس کے جسم کو دو تین حصوں میں منقسم کر دیا۔ مثلاً لفظ نستعلیق میں ابتدائی ن کا جو ٹکڑا ہے وہ سطر کی جسامت کی ثلث یا ربع گنجائش میں ڈھالا گیا۔ طباعت کے وقت اس لفظ میں ن ٹکڑا چونکہ بہت اوپر آتا ہے اس لئے ن کے ٹکڑے کے نیچے سطر کی جسامت پوری کرنے کے لئے خالی ٹکڑے بھرنے پڑیں گے۔ اسی طرح س ت ع ل ی کے جوڑوں کے اوپر یا نیچے ایک ایک دو دو خالی ٹکڑے جگہ بھرنے کے لئے لگانے پڑیں گے۔ اس طرح اس ہفت حرفی لفظ کے کمپوز کرنے میں جہاں یک جسمی ٹائپ کے سات ہی ٹکڑے جانے پڑیں گے اور پھر ان ٹکڑوں کو اپنی اپنی جگہ پر قائم رکھنے کے لئے کمپوزیٹر کو بہت احتیاط کرنی پڑے گی۔ اس کے علاوہ اس ٹائپ میں ایک نقص یہ بھی ہوتا ہے کہ چھپائی کے لئے یہ پوری طرح شکنجہ میں کسے نہیں جا سکتے۔ جس کی وجہ سے چھپائی کے دوران میں بعض ٹکڑوں کا اپنی جگہ سے نکل جانا لازمی امر ہے اس سے نہ صرف اس لفظ میں جس سے کہ کوئی ٹکڑا نکل گیا ہو خامی پیدا ہو جاتی ہے بلکہ وہ ٹکڑا سیاہی کی بیلن سے چپک کر بیلنوں کو بھی خراب کر دیتا ہے سیاہی کے توے پر لگ کر سیاہی کو اور پھر دوسرے ٹکڑوں یا مشین کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔

اس کے برخلاف دارالطبع کی پہلی کوشش والے یک جسمی ٹائپ میں ایک طرف تو جوڑوں کی تعداد حرفوں کی تعداد کے مطابق رہتی ہے اور پھر یک جسمی ہونے کی وجہ سے دوران طباعت میں اس کے کسی ٹکڑے کا اپنی جگہ سے نکل جانے کا احتمال بہت کم ہے۔ لیکن اس ٹائپ کے جوڑوں کی تعداد کا بارہ سو کے قریب ہونا اور اس کثیر تعداد میں سے کمپوزیٹر کو

صحیح کرسی کا صحیح جوڑ ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اور اس تلاش میں جتنا کچھ وقت ضایع ہوگا وہ ظاہر ہے۔

دارالطبع کی دوسری کوشش میں مصر کے ایک مروجہ طریقہ کی تقلید میں نقطے حروف سے علحدہ کردئے گئے۔ اصل حروف اور شوشے بلا نقطوں کے ڈھالے گئے اور نقطوں کے جوڑ علحدہ۔ مثلاً اسی لفظ نستعلیق کو اس ٹائپ میں کمپوز کیا جائے تو ن کا ابتدائی شوشہ (بغیر نقطہ کا) سطر سے بہت اونچا ڈھلا ہوا لیا جائے گا۔ اور اس کے بازو ایک بالائی نقطہ والا جوڑ لگایا جائے گا۔ اس طرح بازو بازو کے (نہ کہ مرزا صاحب کے ٹائپ کی طرح نیچے اوپر کے) دو جوڑ ملانے سے ایک ابتدائی ن کا جوڑ بنے گا۔ اور پھر س کا درمیانی جوڑ اور ت کا درمیانی بغیر نقطہ والا جوڑ اور پھر بالائی دو نقطے والا جوڑ لگایا جائے گا۔ اس طرح بلا نقطے کے شوشے اور نقطوں کے جوڑ مل کر اس سات حرف کے لفظ میں یک جسمی دس جوڑ درکار ہوں گے۔ ن کا ابتدائی بے نقط شوشہ ب پ ت ٹ ث ءی بھی بن جاتا ہے جس کے ساتھ حسب موقع نقطوں کے جوڑ لگانے پڑیں گے۔ اس ترکیب سے کئی سو جوڑوں کی بچت ہوگئی اور نقطوں وغیرہ کے صرف آٹھ ہی دس جوڑ بڑھ گئے جو بچت کے مقابلہ میں بے حقیقت ہیں۔ اس ترکیب سے دارالطبع کی اس دوسری کوشش میں جوڑوں کی تعداد پہلی کوشش کے ۱۰۱۱ کے بجائے چھ سو (۶۰۰) ہوگئی۔

اس ترکیب سے اگرچہ کمپوزیٹر کی دقتوں میں کسی قدر سہولت ضرور پیدا ہوگئی۔ جہاں اس کو تقریباً بارہ سو جوڑوں کو یاد رکھنا پڑتا تھا وہاں اب چھ سو ہی جوڑ یاد رکھنا پڑے گا لیکن ٹائپ کے عملی نتائج میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ کرسی کے لحاظ سے اونچی نیچی کرسی کے جوڑ کی تلاش حسب سابق باقی رہی اور نقطہ دار حرفوں کے نقطے کے جوڑ لگانے کا کام بڑھ گیا۔ نقطوں کے علحدہ کردینے سے بڑا نقص یہ پیدا ہوگیا کہ اول تو نقطے اصل خط کے قلم سے کمتر قلم کے چھوٹے چھوٹے بنانے پڑے جس کی وجہ سے نستعلیق کی عام خوشنمائی میں فرق آگیا اور دوسرے یہ کہ ان نقطوں کا حصہ اپنے ٹائپ کے جسم سے ہٹا ہوا بنانا پڑتا تاکہ وہ بازو والے جوڑ کے حرف کے اوپر یا نیچے صحیح مقام پر آسکیں (اس میں بھی پوری کامیابی نہیں ہوئی اکثر نقطے اپنے صحیح مقام پر نہیں آتے) طباعت کے دوران میں مشین کے داب اور تیز رفتاری کی وجہ سے نقطوں کے ٹوٹ ٹوٹ جانے کا امکان بہت بڑھ گیا۔

اس میں شک نہیں کہ نستعلیق ٹائپ کے بنانے میں اب تک جتنی کوششیں اس سو ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ کامیاب کوشش دارالطبع کی ہے حرفوں کی خوشنمائی میں بھی یہ ٹائپ سابقہ تمام ٹائپوں سے کہیں زیادہ بڑھا چڑھا ہے۔ (گو اصول خوش نویسی کے لحاظ سے اس کے اکثر جوڑ غلط اور بدنما ہیں) باوجود ان خوبیوں کے تجارتی اور عملی اعتبار سے یہ ٹائپ مذکورہ بالا نقائص کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکا۔ دارالطبع میں اس ٹائپ کو تیار ہوئے دس بارہ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ حیدرآباد میں چند مطبعوں نے اس کو استعمال کرنا چاہا لیکن انھیں مایوسی ہوئی اب یہ ٹائپ صرف تصویروں کے بلاکوں پر نام چھاپنے کی حد تک استعمال ہوتا ہے جس کا مواد دو ایک سطر سے زیادہ نہیں ہوتا۔

مذکورۂ بالا نستعلیق کانفرنس کے موقع پر میں نے ٹائپ کے بارے میں اپنا ایک خاص خیال جس کو میں ایک طرح ان عملی دقتوں کا حل سمجھتا تھا سر اکبر حیدری مرحوم اور نواب مہدی یار جنگ بہادر کے سامنے پیش کیا۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر کو جو اُس زمانہ میں صدر المہام سیاسیات تھے میرا خیال پسند آیا اور نواب صاحب ممدوح نے بعض فن داں حضرات کو اس طرف متوجہ کیا اور اس خیال کے

عمل کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر یہ جواب دیا گیا کہ اس خیال کو رو بہ عمل لانے میں عملی اور آلاتی دقتیں ہیں۔ میں چونکہ اس زمانہ
میں ٹائپ سازی کے طریق عمل سے واقف نہ تھا خاموش ہو رہا۔

کانفرنس کے دو تین سال کے بعد ایک اتفاقی واقعہ نے میری توجہ کو پھر ٹائپ سازی کی طرف پھیر دیا۔ اس واقعہ سے پہلے
ٹائپ سازی کے متعلق میرا خیال یہ تھا کہ جب تک دس بیس ہزار روپیہ موجود نہ ہو یہ کوشش نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کسی نئے اصول
کے مطابق ٹائپ بنانے کی کوشش کرنے کا خیال بھی پاس پھٹکنا نہ تھا۔ لیکن اس اتفاقی واقعہ نے میرے دل سے اتنی کثیر رقم کی
لازمی شرط کا خوف نکال دیا اور مجھے اپنے خیال کے مطابق ٹائپ بنانے کی ہمت اور جوش پیدا ہو گیا۔ چنانچہ نو دس سال ہوتے ہیں کہ
میں اس وادی پرخار میں داخل ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے ایک ایک مرحلہ کو طے کرتا گیا۔ چنانچہ اب دو تین سال ہوئے کہ مجھے اپنی
ذاتی کوشش کی بنا پر اس امر کا یقین ہو گیا ہے کہ تین سو جوڑ کے اندر ایک ایسا نستعلیق ٹائپ تیار ہو سکتا ہے جو خط نستعلیق کے اعلیٰ نمونہ
پر قائم ہو اور عملی دقتوں سے اتنا مبرا ہو کہ عام مطابع استعمال کر سکیں۔

سات آٹھ سال خاموش کوشش کے دوران میں میرا یہ تہیہ تھا کہ جب تک پورا ٹائپ نہ بنا لوں اور اس کو مختلف طریقوں
سے استعمال کر کے قابل عمل اور آسان ہونے کا امتحان نہ کر لوں اس کے متعلق کسی سے کوئی تذکرہ یا ادعا نہ کروں۔ لیکن گزشتہ
سال ایسی صورت حال پیش آگئی کہ بعض احباب اور عہدہ داران سرکار عالی سے اس کا تذکرہ کرنا پڑا اور اب سب رس میں جناب
سجاد مرزا صاحب اور جناب یوسف قاسم عارف صاحب کے مکتوبات اور ادارہ سب رس کا یہ طرز عمل دیکھ کر کہ وہ اس مسئلہ پر مختلف
آرا کو منظر عام پر پیش کرنا مناسب سمجھتا ہے یہ سطریں سپرد قلم کی ہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ گزشتہ سال ڈیڑھ سال ہی کے اندر مجھے مختلف طریقوں سے کئی ایک صاحب دماغ حضرات کی اسی
کوشش میں مشغول ہونے کی اطلاع ملی خصوصاً یوسف قاسم عارف صاحب کا ذکر کل ہند اردو کانفرنس دہلی کی روداد میں دیکھ کر اور
ان کا مکتوب سب رس میں پڑھ کر ایک طرح کی خوشی ہوئی کہ اس وادیٔ پرخار میں سفر کرنے والا میں ہی تنہا نہیں ہوں۔ پنجاب میں بھی
دو ایک صاحب اسی دھن میں ہیں۔ اور سب رس کے مذکورہ مقالوں سے اس کی بھی اطلاع ملتی ہے کہ خود جناب مولوی عبدالحق
صاحب یا لطیفی پریس بھی نستعلیق ٹائپ بنا رہے ہیں۔ غرض ان تمام کوششوں میں اس کی امید کی جا سکتی ہے کہ کوئی نہ کوئی کوشش
ضرور بارآور ہوگی اور یہ کوششیں منفرداً کامیاب نہ ہوں تب بھی یہ ممکن ہے کہ دو یا تین کوششوں کے امتزاج سے کوئی ایسی
راہ مل جائے جو اردو کے نستعلیق ٹائپ کو آسان اور قابل عمل بنا دے جس سے اردو زبان اور ادب کی بہت بڑی خدمت انجام
پا سکے گی۔

جناب سجاد مرزا صاحب نے "ہماری زبان" کے ایڈیٹر صاحب کے ٹائپ پر اعتراضات کا جو جواب دیا ہے اس کو دیکھ کر
مجھے اس امر پر تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں اور خصوصاً مدیران جرائد میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اردو ٹائپ
کی ضرورت ہی کو محسوس نہیں فرماتے اور دلائل ایسے پیش فرماتے ہیں جن کا اصل مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

"نستعلیق کو ٹائپ میں ڈھالنے سے فن کے تباہ ہو جانے" کا خوف اور "ٹائپ کے رواج سے خوش نویسی کی بربادی" کا اندیشہ عجیب ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسانی زندگی میں "علم و ادب" اصلی منزل ہے یا اس کے تحفظ کے وسائل (جو رسم الخط یا ٹائپ وغیرہ کی صورت میں اختیار کئے گئے ہیں) اصلی چیز علم و ادب ہے اس کو محفوظ کرنے کی خاطر رسم الخط وجود میں لایا گیا۔ رسم الخط ہر ملک اور قوم میں یکساں نہ رہا بلکہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا گیا۔ اس کے ہر تغیر تبدل میں عمل ارتقاء کارفرما رہا خطِ کوفی، خطِ ثلث اور نسخ میں ارتقاء پانے کے بعد نستعلیق کی منزل پر پہنچا اپنے وقت پر نستعلیق رسم الخط وجود میں آیا اور کسی دوسرے بہتر رسم الخط کے وجود میں آنے تک زندہ رہے گا۔ نستعلیق خوشنویسی کا فن کوئی مستقل بالذات انسانی کارنامہ نہیں ہے کہ اس کی بقا کی خاطر علم و ادب کی ترویج اور سہولت کو قربان کیا جائے۔

جس زمانہ میں لیتھو پریس کا وجود نہ تھا کتابت ایک مستقل پیشہ تھا۔ اس پیشہ کے لوگ اجرت پر کتابیں نقل کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ خوش نویس نہ تھے۔ ما یقرا لکھ لیا کرتے تھے۔ طالبان علم کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس دور میں اصل خوش نویسوں کی جماعت ایک الگ جماعت تھی۔ علم و ادب کی خدمت سے ان کو کوئی تعلق نہ رہا۔ یہ لوگ اسلامی ملکوں میں مصوروں کے جانشین تھے۔ جنہوں برسوں ایک ایک قطعہ کی مشق کرنے کے بعد جب انہیں اس قطعہ پر اطمینان ہوتا تب وہ دوسرے کے حوالے کرتے تھے ورنہ ذرا بھی نقص رہنے پر تلف کر دیتے تھے۔ ایسے قطعات کے مالک کو ان کی ملکیت پر فخر و ناز ہوتا تھا۔ ملک میں ان کی قدر و منزلت ہوتی تھی اور وہ بہت بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت ہوتے تھے۔ یہ قطعات اپنے مالک کے حسن مذاق اور اس کی بصیرت کا ثبوت دیتے تھے اور دیوان خانہ کی آرایش اور زینت میں اضافہ کرتے تھے۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ کسی اعلیٰ درجہ کے خوش نویس نے کوئی کتاب پوری نہ لکھی۔ البتہ شاذ شاذ دو ایک مثالیں ملتی ہیں اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے رسالوں کی حد تک محدود ہیں۔ جس طرح قدیم زمانہ میں کاتب کتابوں کی نقل کر کے فروخت کرتے تھے یا اجرت پر کسی کتاب کو نقل کر دیتے تھے اسی طرح اب پریس ایک ایک کتاب کے کئی کئی نسخے تیار کر کے شائقین تک پہنچاتا ہے۔ لیتھو پریس کے رواج سے خوش نویسوں کے پیشہ پر کوئی اثر نہ پڑا۔ یہ آرٹسٹ جماعت اس وقت تک اپنا کام کرتی رہی جب تک ملک میں اس کی قدر دانی رہی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر خوش نویسی کا شوق کیوں کم ہو گیا اور اب ایسے اعلیٰ پایہ کے خوش نویس کیوں پیدا نہیں ہوتے۔ کیا لیتھو پریس نے ان کا خاتمہ نہیں کر دیا؟ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا لیتھو پریس صرف کاتبوں کا جانشین ہے۔ اصلی خوش نویسوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ خوش نویسی کے انحطاط اور زوال کا اصلی سبب مغرب کی یورش ہے اور ہندوستان کی حد تک انگریزی راج کا قیام۔ اس سیاسی انقلاب نے زندگی کا مذاق بدل دیا۔ امرا اور دوسرے قدردان شوقینوں کو جو قطعات کا شوق تھا اور ان کی بڑی قدردانی کرتے تھے وہ کم ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئی۔ قطعات کی جگہ تصاویر، فرنیچر اور دوسری آرائشی اشیا نے لے لی۔ امرا کا شوق کم ہو جانے سے اس طبقہ میں خوش خطی کی بصیرت بھی کم ہوتی گئی اس لئے لوگوں کو اس فن میں حصول کمال کا شوق بھی جاتا رہا۔ لیتھو یا ٹائپ کے رائج ہونے یا نہ ہونے سے خوش نویسی پر کوئی خاص اثر مترتب نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ لطف تو یہ ہے کہ لیتھو کے رواج سے وہ کاتب جو معمولی طریقہ پر کتابیں نقل کیا کرتے تھے اب اپنے محررات کے سیکڑوں ہزاروں مستقل نسخے تیار ہو جانے کا خیال کر کے اپنا خط درست کرنے لگ گئے اور بہت سے نیم خوش نویس بن گئے۔

ٹائپ کی ضرورت کے دو بڑے اسباب ہیں۔ سب سے بڑا سبب تو یہ کہ لیتھو کی طباعت کے قابل خوش خط کتابت بڑی مشق اور مہارت کے بعد حاصل ہوتی ہے جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ مشق و مہارت کے بعد بھی ہر کاتب کا خط جداگانہ شان رکھتا ہے۔ نہ صرف ہر کاتب کا خط جداگانہ شان کا ہوتا ہے بلکہ ایک ہی کاتب کا خط اس کے ذہنی حالات کے لحاظ سے مختلف اوقات مختلف طور کا ہوتا ہے۔ کاتب اطمینان اور خوشی کی حالت میں جیسا عمدہ خط لکھتا ہے پریشانی اور دماغی ہیجان کی حالت میں اتنا اچھا نہیں لکھ سکتا۔ ایک ہی کاتب کی لکھی ہوئی کتاب کے تمام صفحات ایک ہی شان کے نہیں ہوتے۔ خط کی حالت مختلف مقامات میں مختلف ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنا کچھ بہت مشکل امر نہیں۔ کسی کتاب کو بھی ذرا غور سے دیکھا جائے تو خط کا یہ تفاوت نظر آسکتا ہے۔

شانِ خط جداگانہ ہونے کے علاوہ کاتب کے کام کرنے کی قوت فاصلہ محدود ہوتی ہے۔ کسی کتاب یا رسالہ کی بہ عجلت طباعت منظور ہو تو کاتب کی قوت تحریر محدود ہونے کی وجہ سے بڑے سے بڑے لیتھو کا مطبع بھی اتنا جلد طبع نہیں کرسکتا جتنا کوئی ٹائپ کا مطبع کرسکتا ہے۔ ٹائپ کے وجود سے یہ بات ممکن ہوسکی ہے کہ موقت کام بجلی کی سرعت سے طبع ہوسکتے ہیں۔ بجائے ایک یا دو کے کام کی ضخامت یا عجلت کے اعتبار سے کئی کئی کمپوزیٹر مواد کو کمپوز کرسکتے ہیں۔ صفحات کی سطریں جانے میں آسانی ہوتی ہے اور پھر خود صفحات کی ترتیب خاطر خواہ ہوسکتی ہے۔ اس طرح جلد سے جلد کمپوزنگ کا کام انجام پاسکتا ہے اور اسی رفتار سے طباعت جلد ختم ہوسکتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں لیتھو کی چھپائی کے لئے اگر دس بیس کاتب مقرر کئے بھی جائیں تو وہ مواد کو تقسیم کرکے (کمپوزیٹروں کی طرح) علٰحدہ علٰحدہ نہیں لکھ سکتے اگر لکھ بھی لیں تو منقسمہ مواد کا برابر ایک صفحہ پر ختم ہونا ممکن نہیں۔ کسی کاتب کے آخری صفحہ پر ابتدائی چند ہی سطریں آجائیں گی کسی کا آخری صفحہ نصف تک لکھا جائے گا۔ اور کسی صفحہ میں آخری چند سطریں سادہ رہ جائیں گی اس قسم کے صفحات کو مکمل کرنا اور پھر صفحات کی تقسیم کے بعد پتھر پر منتقل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایسے کام میں طباعت بھی صاف نہیں ہوسکتی۔ غرض کام میں عجلت اور خط میں یکسانیت یہ دو بڑے اسباب ہیں جو لیتھو کی طباعت پر ٹائپ کی طباعت کو فوقیت دیتے ہیں، فوقیت ہی نہیں بلکہ ٹائپ کو موجودہ زندگی کی ایک لازمی ضرورت بنا دیتے ہیں۔

ان دو اسباب کے علاوہ ایک اور سبب اصلاح سنگ کی مصیبت بھی ہے۔ مصلح سنگ کا کام بھی کاتب کی طرح بہت مشق اور مہارت کا طلب گار ہے۔ پھر جو اصلاح پتھر پر ہوتی ہے وہ اچھے کاتب کی تحریر میں بے جوڑ اور بھدی معلوم ہوتی ہے۔ مصلح سنگ پتھر پر الٹے حروف لکھتا ہے اس کی شانِ خط سب سے جداگانہ ہوتی ہے۔ اور پھر مصلح سنگ کی جماعت میں بھی اچھے اور کمتر درجہ کا اختلاف کاتبوں کی طرح موجود ہے۔ کسی اچھے کاتب کے لکھے ہوئے مواد کو خراب مصلح سنگ بالکل برباد کرسکتا ہے۔

مذکورۂ بالا بیان میں اخبار کی طباعت کو نظر انداز کرکے لیتھو اور ٹائپ کی طباعت کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اخبار کے لئے ٹائپ تو ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اگر ٹائپ نہ ہوتا تو دنیا کے مشہور اخباروں کی لاکھوں کی اشاعت شائد کبھی وجود میں نہ آتی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اخبار کی ترتیب اور مضامین، اشتہارات وغیرہ کی تدوین کا کام رات کے بارہ بجے تک ہوتا رہتا ہے۔ بارہ بجے مشینوں کو سربند (lock up) کرکے طباعت شروع کردی جاتی ہے۔ جو صبح کے چار بجے تک ہوتی ہے۔ چار بجے سے اخبار کی اشاعت شروع ہوجاتی ہے۔ اس طرح محض طباعت کا اصلی وقت کم و بیش چار گھنٹے ہوتا ہے۔ ہر صباحی اخبار کا تقریباً یہی عمل درآمد

روزآنہ رہتا ہے۔ اخبار کی زندگی میں طباعت کی سرعت ہی سب سے اہم عنصر ہے جس سے تازہ ترین خبریں کم ترین وقت میں اشاعت
پاسکتی ہیں۔ اگر اخبار کی اشاعت ایک لاکھ ہو تو چار گھنٹے میں اتنی تعداد کا چھپ جانا کس قدر حیرت کی بات ہے۔ برقی قوت سے چلنے
والے بڑے لیتھو مشین کی عام رفتار طباعت ہزار بارہ سو داب فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ چار گھنٹہ میں لیتھو مشین سے پانچ چھ ہزار سے زیادہ
طباعت نہیں ہو سکتی۔ اردو اخباروں کی اشاعت اس تعداد سے بڑھ جانے کے بعد طباعت کی ایسی ایسی مشکلات پیش آتی ہیں
کہ مالکان اخبار کی ہمت ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔ اردو اخباروں میں زمیندار اور مدینہ اور شائد خلافت بھی ایسے اخبار ہیں جن کی
اشاعتیں خاص ہیجانی زمانوں میں پچیس ہزار سے زیادہ ہوگئی تھیں۔ سنا گیا کہ ایسے دور میں ان اخباروں کو باہر کے مختلف مطبعوں
سے کام لینا پڑتا تھا۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اخبار کی طباعت میں سرعت پیدا کرنے کے لئے کئی چیزیں ایجاد ہوئی ہیں۔ اول تو عام
پریس کی جگہ جو ایک ایک تختہ کاغذ کا چھاپتا ہے روٹری پریس (Rotary) وضع کیا گیا جس میں کاغذ کے تختے نہیں چھپتے بلکہ کاغذ
کا رول پانی کے دھارے کی طرح مسلسل چھپتا چلا جاتا ہے۔ اخبار کے صفحات کی مقررہ تعداد کے بعد مشین کاغذ کو کاٹ کاٹ کر ایک ایک
اخبار علحدہ کرتا جاتا ہے۔ روٹری پریس کی ایجاد سے طباعت کی رفتار بہت بڑھ گئی یہ رفتار اعلیٰ درجہ کے لیتھو مشین کے مقابلہ میں چار
پانچ گنا سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر کسی اخبار کے حجم کے لحاظ سے کوئی روٹری مشین فی گھنٹہ پانچ ہزار داب نکالے تو چار گھنٹہ میں بیس ہزار
کی تعداد چھپ سکتی ہے۔ اگر اخبار کی اشاعت ایک لاکھ ہو تو ایک روٹری مشین بھی چار گھنٹہ کی مدت میں اتنی تعداد نہیں چھاپ سکتا۔
اس کے لئے اسٹی ریو ٹائپ (Stereotype) کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ جس سے ایک ہی مواد کئی روٹری مشینوں میں نصب
کیا جاسکتا ہے اور تمام مشینیں بہ یک وقت چل سکتی ہیں۔ اس کا عمل اس طرح ہوتا ہے کہ جب اخبار کا مواد مکمل ہوجاتا ہے اور
طباعت کے لئے سر بند کر دیا جاتا ہے تب اس مواد کو ایک قسم کے مقوے پر زور دار داب سے مرتسم کیا جاتا ہے جس کو اصطلاح
میں میٹرکس (Matrix) کہتے ہیں۔ میٹرکس پورے اخبار کے مواد کا سانچا بن جاتا ہے۔ اس سانچے میں ٹائپ کی پگھلی
ہوئی دھات ڈال ڈال کر تعداد اشاعت کے مطابق متعدد یک جسمی بلاک ڈھال لئے جاتے ہیں۔ یہ بلاک آدھے بیلن کی شکل کے
ہوتے ہیں اسٹی ریو یہی ہیں۔ دو بلاکوں کو مشین کے بیلن پر نصب کر دینے سے ٹائپ کا پورا مواد بیلن کی شکل میں ہوجاتا ہے ایسے
متعدد بیلن متعدد روٹری مشینوں میں نصب کر دیے جا سکتے ہیں۔ اگر اوپر کی مثال کے مطابق ایک لاکھ کی تعداد چھاپنی ہو تو پانچ
روٹری مشینیں بیک وقت چل سکتی ہیں۔ اور چار ہی گھنٹہ میں ایک لاکھ کی تعداد پوری ہو سکتی ہے۔ اسٹی ریو ٹائپ کے طریقے سے
تعداد کے لاکھوں ہوجانے پر بھی بروقت طباعت کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہا۔ تعداد کے اضافہ کے ساتھ ساتھ روٹری مشینیں بڑھائی
جاسکتی ہیں اور بے شمار اسٹی ریو ایک ہی مواد کے تیار کئے جاسکتے ہیں۔ یورپ کے کئی ملکوں کے اور جاپان اور امریکہ کے متعدد اخباروں
کی روزآنہ اشاعتیں دس لاکھ سے زائد ہیں۔ امریکہ کے اخبار ہیرلڈ ٹریبون اور انگلستان کے اخبار ڈیلی میل کی روزآنہ اشاعت
پچیس لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اتنی بڑی بڑی اشاعتوں کا امکان ٹائپ ہی کی وجہ سے ہو سکا۔

روٹری پریس اور اسٹی ریو ٹائپ کے علاوہ لیتھو کے مقابلہ ٹائپ کی طباعت کے لئے ایک اور ایجاد نے بہت سہولت پیدا

کردی ہے۔ ٹائپ کو کمپوز کرنے کا کام آدمی کے بجائے مشین کے حوالہ کردیا گیا ہے۔ اس مشین کی ایجاد کی وجہ سے اب کمپوزیٹر کو ٹائپ کا ایک ایک حرف تلاش کرنا نہیں پڑتا۔ بلکہ وہ ٹائپ رائٹر کے جیسے ایک مشین کے سامنے اطمینان سے بیٹھ کر اسی طرح ٹائپ کرتا جاتا ہے جیسے کسی دفتر میں ٹائپسٹ اپنا کام کرتا ہے۔ جوں ہی وہ اس کمپوزنگ مشین کے کسی حرف کا بٹن دباتا ہے اسی وقت وہ حرف تازہ تازہ ڈھل کر آجاتا ہے اس طرح ایک سطر ٹائپ ہونے کے بعد پوری سطر دوبارہ مشین کے اندر چلی جاتی ہے اور علٰحدہ علٰحدہ حرفوں کی جگہ تمام حرفوں کی جکڑی ہوئی ایک جان سطر ڈھل کر خانہ میں آجاتی ہے۔ اس مشین کو لائنوٹائپ (Linotype) کہتے ہیں۔ اسی کام کی ایک اور مشین بھی ایجاد ہوئی ہے جس میں بٹن دباتے ہی ٹائپ نہیں ڈھلتا بلکہ بٹن دبانے سے ایک دبیز کاغذ میں سوراخ پڑجاتے ہیں۔ جب کاغذ ختم ہوجاتا ہے وہ ایک دوسرے مشین پر رکھ دیا جاتا ہے جو حیرت انگیز طریقہ پر ٹائپ کئے ہوئے مواد کے مطابق آپ ہی آپ اس پورے صفحہ کا ٹائپ ڈھالتا جاتا ہے۔ اس مشین کے ڈھلے ہوئے حروف علٰحدہ علٰحدہ رہتے ہیں۔ لائنوٹائپ کی طرح یک جسمی سطر کی شکل میں نہیں ہوتے۔ اس مشین کو مانوٹائپ (Monotype) کہتے ہیں۔ اگرچہ ان دونوں مشینوں کی عملیت میں تھوڑا سا فرق ہے لیکن کام میں سرعت اور کمپوزیٹر کو ٹائپ کی تلاش کی محنت بچا لینے میں دونوں کا کام حیرت انگیز ہے۔ ان مشینوں کی بدولت کمپوزیٹر کا کام بالکل ٹائپسٹ کا کام ہوگیا ہے۔ ٹائپ کی اہمیت اور ان مشینوں کی سہولت اور کارکردگی کو سامنے رکھنے کے بعد اس کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے اخبار جو اتنی کثیر اشاعتیں رکھتے ہیں کیونکر چھپتے ہیں۔ جن زبانوں کو ٹائپ کی سہولت مہیا نہیں ہے ان کے اخباروں کو کثیر اشاعت کس طرح حاصل ہوسکتی ہے۔

زیر نظر مضمون میں لیتھو کی ترقی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ خیال بھی مجھے عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیتھو یورپ کی ایجاد ہے۔ لیتھو میں جتنی بھی ترقی ہوچکی ہے اور ہورہی ہے وہ سب یورپ ہی کی رہینِ منت ہے۔ یورپ میں جہاں عام طور پر ہر شعبہ جات میں ترقی کی اپج موجود ہے وہاں لیتھو کی چھپائی کے معاملہ میں بھی اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقات اور تجربات کا سلسلہ جاری ہے اس کے علاوہ اگر کسی اور سلسلۂ تحقیقات میں کوئی ایسی چیز دریافت ہوجاتی ہے جو لیتھو کی طباعت کے کام میں لائی جاسکتی ہے تو اس فن کے لوگ اس سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں عام جمود کی حالت ہے۔ زندگی کے ضروری اور مفید معاملات میں بھی ہندوستان میں کسی اختراع یا ایجاد کی صلاحیت نظر نہیں آتی۔ ہر معاملہ میں ہندوستان کی آنکھیں یورپ اور امریکہ ہی کی طرف لگی ہوئی ہیں ایسی حالت میں ہندوستان والوں سے لیتھو کی طباعت کو کسی طرح کی ترقی دینے کی توقع کس طرح ہوسکتی ہے۔ لیتھو کی چھپائی کے تین اجزا ہیں۔ پہلا جزو کتابت ہے۔ دوسرا جزو وہ طریقے اور مسالے ہیں جن سے لکھی ہوئی کاپی صحیح سلامت پتھر پر منتقل کی جاتی ہے۔ اور طباعت کے دوران میں پتھر پر قایم رکھی جاتی ہے۔ تیسرا جزو لیتھو مشین ہے۔ یورپ نے لیتھو مشین کو بہت ترقی دی۔ چھپائی کے طریقوں اور مسالوں میں تحقیقات اور تجربات سے بہت کچھ اصلاح و ترقی کی۔ لیکن جزو اول یعنی کتابت کا معاملہ یورپ کے بس کا نہ تھا۔ ہندوستان والوں کو اتنی مقدرت کہاں کہ وہ مشین میں یا طریقۂ طباعت میں کوئی اصلاح کرسکتے۔ لیتھو کو خود ترقی دینا تو ایک طرف ہندوستان تو ابھی اس قابل

بھی نہیں ہوا کہ یورپ کے اختراع کئے ہوئے جدید طریقوں ہی کو اختیار کرتا جاتا۔ فوٹو لیتھوگرافی اور فوٹو آفسٹ کے طریقے ایسے ہیں جو موجودہ سنگی طباعت پر فوقیت رکھتے ہیں۔ فوٹو لیتھوگرافی کے ذریعہ پتھر پر ہاف ٹون تصویریں چھاپی جاسکتی ہیں۔ چند سال پہلے دہلی سے ایک ہفتہ وار مصور اخبار جاری ہوا تھا جس میں فوٹو لیتھوگرافی سے کام لیا جاتا تھا۔ عبارت کے ساتھ ساتھ ہاف ٹون تصویریں بھی چھاپی جاتی تھیں۔ چند ماہ کی اشاعت کے بعد وہ بند ہوگیا۔ طباعت کی خوبصورتی اور آئندہ ایڈیشنوں کے لئے مواد کے تحفظ کے اعتبار سے فوٹو آفسٹ بہت اہم اختراع ہے۔ اس میں کاپی کے کاغذ پر کاپی نویسی کرنے کے بجائے سفید کاغذ پر سیاہی سے مواد لکھا یا تصاویر نقشے وغیرہ کھینچے جاتے ہیں۔ پھر اس اصل مواد کا عکس فوٹو کے ذریعہ جست کے تختہ پر منتقل کیا جاتا ہے۔ اور ایسی دوائیں استعمال کی جاتی ہیں کہ وہ فوٹو جست کے تختہ پر قائم ہوجاتا اور طباعت کے قابل بن جاتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو کاتب کا لکھا ہوا اصل مواد جوں کا توں محفوظ رہتا ہے (اس کے مقابلہ میں لیتھو کی چھپائی میں کاتب کی لکھی ہوئی اصل کاپی پتھر پر جاری جاتی ہے اور وہی طباعت کے کام آتی ہے) اور پھر فوٹو آفسٹ میں اصل کا منفی عکس بھی فوٹو پلیٹ پر محفوظ رہتا ہے جو آئندہ اشاعتوں کے وقت کام آسکتا ہے فوٹو آفسٹ کی چھپائی نہایت صاف اور خوشنما ہوتی ہے۔ باوجود ان سہولتوں کے یہ چیز ہندوستان میں عام طور پر اختیار نہ کی جاسکی۔

لیکن تمام باتوں کے باوجود ہاتھ سے کتابت کا بکھیڑا جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ جس کی وجہ اچھے اور برے کاتب کا امتیاز اور اس کی قوت تحریر کے محدود ہونے سے طباعت کی رفتار میں دیر وہی لیتھو کی طباعت کی جیسی موجود ہے۔ ان کے علاوہ حروف کی اصلاح مصلح سنگ ویسی ہی محتاج رہتی ہے جیسا کہ میں اوپر بیان کرچکا ہوں۔ مصلح سنگ کو پتھر پر الٹے حروف لکھنے کی تقریباً اتنی ہی مشق و مہارت درکار ہے جتنی کہ کاتب کو۔ اگر کہیں ایک آدھ سطر بدلنے کی ضرورت ہو تو مصلح سنگ کو اس سطر سے کچھ اوپر اور کچھ نیچے کی عبارت مٹا کر زائد الفاظ کو اوپر اور نیچے کی عبارت سے ملا کر الٹا لکھنا پڑتا ہے۔ اس طرح سے الٹی لکھی ہوئی عبارت اصل کاتب کی شان خط سے نہیں ملتی جس سے وہ پورا صفحہ خواہ کتنا ہی اچھا لکھا ہوا اور اچھا چھپا ہوا ہو بدنما اور بھدا نظر آتا ہے۔ اردو کے لئے ٹائپ کی ایجاد سے یہ مشکل بھی رفع ہوجاتی ہے۔

کیا یہ سب امور اہل مطابع اور اخبار نویسوں کی نظر سے اتنے پوشیدہ ہیں کہ وہ ٹائپ کو غیر ضروری سمجھیں اور صرف لیتھو کی ترقی کی تمنا پر اکتفا کریں۔

محمد حبیب اللہ رشدی

... سے خطاب

شاعر نواز شعرِ مجسم اِدھر تو آ   بزمِ تصورات ہے برہم اِدھر تو آ

بے کیفیِ حیات بھی حد سے گزر گئی   اے مستیِ نگاہِ دو عالم اِدھر تو آ

عظیم الدین محبت

یوم ولی

لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد کی جانب سے بتاریخ ۲ جولائی ۱۹۴۲ء یوم ولی اعلیٰ پیمانہ پر منایا گیا تھا۔ جس کی ایک تقریر، فیچر، اور بزم ولی کی نظمیں نشرگاہ سے بطور خاص حاصل کرکے یہاں شائع کی جارہی ہیں جس کے لئے جناب ناظم صاحب محکمہ نشریات لاسلکی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔　　(مدیر سب رس)

بابائے ریختہ ولی اورنگ آبادی

ولی اورنگ آبادی قدیم اردو کے ان چند خوش قسمت شاعروں میں سے ہیں جن کے کلام کی صحیح قدر و منزلت نسبتاً جلد کی گئی۔ ورنہ ان سے پیشتر بھی چند ایسے شاعر گزرے ہیں جن کے کارنامے اردو زبان اور ادب کے شہکار سمجھے جاسکتے ہیں۔ ملا خیالی، سلطان محمد قلی، ملک الشعرا وجہی، ملا غواصی، ملک الشعرا نصرتی بیجاپوری، مولانا طبعی، ملک خوشنود اور ملا ہاشمی ایسے صاحبان کمال تھے جن کے کارنامے ولی سے زیادہ ضخیم اور وزنی ہیں۔ اور ان میں بعض تو اب شائع ہوکر منظر عام پر آبھی چکے ہیں۔ لیکن ان قدیم شاہ کاروں کی اشاعت کے باوجود ان کے مصنفوں کو اردو دنیا میں وہ عظمت اور مقبولیت حاصل نہ ہوئی اور نہ ہوسکتی ہے جو ولی کو آج سے دو سو سال قبل ہی حاصل ہوچکی تھی۔

اس کے کئی اسباب ہیں اور انہی اسباب کی وضاحت سے آج کی اس تقریر کا عنوان سمجھ میں آجائے گا۔

سب سے پہلا سبب جس نے ولی کو بقول ایک قدیم تذکرہ نگار کے شیطان سے زیادہ مشہور کردیا یہ تھا کہ ولی اپنے وطن ہی میں عزلت گزیں نہ رہے۔ انھوں نے اپنے ایک جانشین اردو شاعر مرزا رفیع سودا کے اس شعر کے مطابق عمل کیا کہ

نکل وطن سے، ہے غربت میں زور کیفیت
کہ آب بحت ہے، جب تک ہے تاک میں صہبا

ولی پہلے دکنی صاحب قلم تھے جنھوں نے اپنے وطن سے باہر اپنے نام اور کلام کا ڈنکا بجادیا اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک ایسی نظیر قائم کرگئے جس کو پیش نظر رکھا جاتا تو سرزمین دکن کے اور بہت سے شاعر اردو کے ان تذکروں میں جگہ پاسکتے جو شمالی ہندستان میں لکھے گئے۔ افسوس ہے کہ ولی کے ہم وطن جانشین اور منظور نظر شاہ سراج اورنگ آبادی نے بھی اس امر کے دعوے کے باوجود کہ

تجھ مثل اے سراج بعد ولی　　کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

اپنے استاد کی سنت پر عمل نہ کیا۔ ورنہ ان کا کلام بھی آج سے قبل شائع ہوجاتا اور ان کے لئے بھی گارساں دتاسی جیسا عظیم الشان قدردان فراہم ہوجاتا اور اردو کے تذکرہ نگاران کی صرف اس غزل کے چند اشعار پر اکتفا نہ کرتے جس کا مطلع ہے۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی　　نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

غرض ولی کے ذکرِ خیر سے آج اردو کا کوئی تذکرہ خالی نظر نہیں آتا۔ سرتاج شعرائے اردو میر تقی میر جیسے مغرور شاعر نے بھی شتاً ولی کی استادی کا اعتراف کیا اور میر کے ہم وطن پیشرو بلکہ استاد نجم الدین علی خاں آبرو نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ ؎

آبرو شعر ہے ترا اعجاز پر ولی کا سخن کرامت ہے

اسی طرح مرزا رفیع سودا کے استاد شاہ ظہور الدین حاتم نے ولی کی شاگردی کا اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں علانیہ اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"در شعر فارسی بطرز مرزا صائب و در ریختہ بطور ولی رحمہم اللہ اوقات خود بسر می برد۔
و ہر دو را استادی داند۔"

میر کے ہم عصر تذکرہ نگار فتح علی حسینی گردیزی نے ولی کے اشعارِ آبدار کو گوشوارۂ سخن سرایانِ روزگار قرار دیا ہے۔ اور سودا کے دوست اور ہمعصر قیام الدین قائم نے اپنے تذکرۂ مخزن نکات میں ان کے بابائے ریختہ کے لقب کی یوں وضاحت کی کہ اس بابا کا کلام اتنا مقبول ہوا اور انھوں نے ریختہ اس خوبی سے لکھا کہ اس عہد کے اکثر اساتذۂ سخن نے بھی ریختہ میں لکھنا شروع کر دیا۔ قائم کی اصل عبارت ہے۔

"سخنِ ایں بابا چناں حسن قبول یافت کہ ہر بیت دیوانش روشن تر از مطلع آفتاب گردیدہ۔ و ریختہ را چناں بفصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادانِ آں وقت زراہ ہوش شعر ریختہ موزوں می نمودند۔"

اسی طرح جملہ تذکروں میں ولی کی انتہائی تعریفیں کی گئی ہیں اور قدرت اللہ خاں قاسم نے تو مجموعۂ نغز میں میر خاں کمترین کے اس مصرع کو بطور ضرب المثل پیش کر دیا کہ ؎

ولی پر جو سخن لائے اسے شیطان کہتے ہیں

ان تمام بیانات اور اعترافاتِ کمال کا سب سے اہم سبب یہی تھا کہ ولی اپنے وطن سے باہر نکلے۔ گجرات اور شمالی ہندستان کا ایک سے زیادہ مرتبہ سفر کیا۔ ہر جگہ مشاعروں میں شرکت کی اور متعدد شاعروں سے نہ صرف تعلقات پیدا کئے بلکہ ان کے دلوں میں اپنے اخلاق اور کلام کے لئے ایک ایسی مستقل جگہ پیدا کر لی کہ ہر شخص ان کی بزرگی اور اولیت کا قائل ہو گیا اور اس طرح ایک آدمی سے دوسرے آدمی اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک ان کے کلام کے چرچے اور کمال کی شہرت پہنچ گئی۔ چنانچہ ایک دفعہ خود ان کو لکھنا پڑا کہ ؎

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور اگرچہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

دوسری وجہ جس نے ولی کو بابائے ریختہ مشہور کر دیا ان کے کلام کی رنگا رنگ زبان ہے۔ انھوں نے اورنگ آباد میں ایک ایسے عہد میں نشو و نما پائی جب کہ یہ پس البلاد صحیح معنوں میں مغلوں کا اردوئے معلیٰ بنا ہوا تھا اور تمام ہندوستان کی ایسی فوجیں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی کے ساتھ اس پر فضا مقام پر خیمہ افگن تھیں، جو بھانت بھانت کی بولیاں بولتی تھیں۔ اور خود شاہی دربار کے امراء، واعیان اور لشکر کے سردار و خواص وہ ہندوستانی یا ہندوی استعمال کرتے تھے جو دہلی اور اس کے اطراف و اکناف میں اسی وقت سے تشکیل پا رہی تھی جب کہ رائے پتھورا کی شکست کے بعد شہاب الدین محمد غوری کی پنجابی اور افغان فوجیں ہندوستان کے اس قدیم پایۂ تخت

میں داخل ہوئی تھیں۔ یہ ایک کھچڑی زبان تھی اور اس مخلوط زبان پر دہلی اور اس کے قرب وجوار کی برج بھاشا اور کھڑی بولی کا اورنگ زیبی عہد تک کافی اثر پڑچکا تھا۔

اس زبان کے مقابلے میں ولی کے وطن سرزمین دکن میں جس ہندوستانی یا ہندوی نے عروج حاصل کیا تھا اس پر علاقہ برج کی زبان اور خاص کر کھڑی بولی کا بہت کم اثر پڑنے پایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دلی اور علاقہ برج میں زیادہ دن نہ رہنے پائے تھے کہ ہندوستانی بولنے والے لوگ علاءالدین خلجی اور محمد تغلق کی فوجوں کی شکل میں دکن چلے آئے اور ان کے سیکڑوں خاندان دکن کے دور دور کے کوہستانوں میں آباد ہوگئے۔ ان آباد کاروں نے اپنے ساتھ اپنی زبان کو بھی اس ملک سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کرلیا۔ اور چونکہ ان کی نسلیں برج بھاشا یا کھڑی بولی کے علاقے سے دور کو ہسار دکن کی ان نو آبادیوں میں جو رفتہ رفتہ مختلف سلطنتوں کے جزیرے بن گئی تھیں، اس طرح محصور ہوگئیں کہ ان کی زبان اور شمالی ہند کی اردو میں کچھ فرق پیدا ہوگیا اور اسی لئے دکن میں ولی سے پہلے کے جتنے اساتذہ سخن گزرے ہیں ان کے کلام کو پڑھ کر یا سن کر عہد اورنگ زیب اور اس کے بعد کے شمالی شعرا و ارباب علم و ادب کو اتنا لطف نہ آیا جتنا ولی کے کلام سے آسکتا تھا۔ اسی بنا پر ولی کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ ؎

دکنی زباں میں شعر سب لوگاں کہے ہیں اے ولی
لیکن نہیں بولیا ہے کوئی اک شعر خوشتر زیں نمط

ولی کی زبان صحیح طور پر ریختہ یا اردو کہی جاسکتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے وطن کی زبان اور شمالی ہند کے نو واردانِ اورنگ آباد کی زبان کو اس خوبی سے ایک دوسرے میں گھلا ملا دیا کہ ماہرین فن زبان بھی اس کرامت پر حیرت کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانہ اور ماحول کی ایسی سچی نمائندگی کی کہ کوئی دوسرا بڑے سے بڑا اور باکمال شاعر اور ادیب بھی اس سے بہتر نہیں کرسکتا۔ وہ اردو کی لسانی فطرت کے راز داں تھے اور اس کھچڑی زبان کی فطری صلاحیتوں کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے اپنے دکنی پیشرو شعرا وجہی و محمد قلی اور غواصی و نصرتی کی زبان کا شمالی ہند کی اردو کے ساتھ ایسا خوش گوار امتزاج کیا کہ بیرون دکن کے جو ارباب علم و ادب قدیم دکنی شعرا کے کلام کو سمجھنے اور اس سے محظوظ ہونے سے قاصر تھے وہ بھی اس کی گھلاوٹوں اور حلاوتوں کے قائل ہوگئے۔ اور اس زبان اور انداز بیان کو اتنا پسند کیا کہ اس کی تقلید میں طبع آزمائی کو ترقی قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو جو شمالی ہند میں اب تک ایک بازاری اور بول چال کی زبان تھی اب تحریری زبان بھی بن گئی اور فارسی کے بڑے بڑے صاحبان کمال مثلاً مرزا عبدالقادر بیدل سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں نے بھی فارسی کے آسمان سے نیچے اتر کر اردو میں کچھ لکھنا گوارا کیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ولی کو آدم ریختہ یا بابائے ریختہ کا درجہ نصیب ہوتا ہے۔

کلام ولی میں جدید اور قدیم دونوں طرز کی زبان کے جو نمونے نظر سے گزرتے ہیں اسکی وجہ یہی ہے کہ ان کا جو ابتدائی کلام ہے اگر اس میں سے مقطع نکال کر گولکنڈہ یا بیجاپور کے کسی شاعر کے کلام میں ملا دیا جائے تو یہ پتہ چلانا مشکل ہوجائے گا کہ یہ ولی کا کلام ہے اسی طرح انھوں نے جو کلام شمال اور جنوب کی زبانوں کے امتزاج کے بعد موزوں کیا وہ ایسا ہے کہ اگر اس کو حاتم و مظہر یا میر و سودا کے کلام میں ملا دیں تو بالغ نظر ناقدین بھی مشکل سے امتیاز کرسکیں گے۔

پہلی قسم کی شاعری کے نمونے کے طور پر دو تین غزلوں کے چند منتخب شعر یہ ہیں۔

کتابِ حسن کا یو کہ صفا تیرا صفحا دستا — ترے ابرو کے دو مصرے سوں اس کا ابتدا دستا
ترا مکہ حسن کا دریا و موجاں چین پیشانی — اپرا ابرو کے کشتی کے یو تل جیوں ناخدا دستا
شفق لوہو میں ڈوبا سرسوں پگ تک — تو باندھا سر سوں جب چیرا گلالی
تری انکھیاں دسیں مجھ یوں سیہ مست — پیا گویا شراب پرتگالی
مت غصہ کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا — ٹک مہر کے پانی سوں یو آگ بجھاتی جا
اس ریت اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں — ٹک پاؤں کے بچھووں کی آواز سناتی جا
تجھ گھر کی طرف سندر جاتا ہے ولی دایم — مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

ان اشعار کے مقابلے میں چند ایسے شعر بھی اس وقت پیش کئے جاتے ہیں جن کی زبان اتنی صاف ہے کہ میر و سودا کی زبان تو قدیم ہی ہے ذوق و غالب اور امیر و داغ کی زبان بھی اتنی ہی صاف نظر آتی ہے۔ شعر ہیں۔

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا
آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو — کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی
مت دور ہو اک آن ولی پاس سے ہرگز — اے باعثِ جمعیتِ ایامِ جوانی

ہوا نہیں وہ صنم صاحب اختیار ہنوز — بجائے خود ہے رقیبوں کا اعتبار ہنوز
ہزار بلبل مسکیں کا صید ہے باقی — مقیم ہے چمن حسن میں بہار ہنوز
ولی جہاں کے گلستاں میں ہر طرف ہے خزاں — ولے بحال ہے وہ سرو گل عذار ہنوز

بے شک کرے گا خاطر عشاق باغ باغ — آیا ہے التفات پہ وہ نوبہار آج
اطراف آسماں کے ہجوم شفق نہیں — تجھ رنگ نے ہوا کو کیا لالہ زار آج

یہ تین شعر اگر میرؔ سے منسوب کر کے پیش کئے جائیں تو کون ہے جو شبہ کرے گا۔ حالانکہ یہ ولی کے شعر ہیں۔

مجھ کو تجھ بن کسی سے کام نہیں — فکرِ ناموس و ننگ و نام نہیں
زندگی جام عشق ہے لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں
عشق اس کا ہے ناتمام جسے — پی کی خاطر کا اہتمام نہیں

اسی طرح اگر کسی کو معلوم نہ ہو تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے یہ غالب کے شعر نہیں ہیں۔

درد مندوں کو سدا ہے قولِ مطربِ دلنواز — گرمیٔ افسردہ طبعاں شعلۂ آواز ہے

بزم کو رونق دیا ہے جب سے وہ عالی مقام | رشتۂ آہِ دلِ بے تاب تارِ ساز ہے
غیر حیرت ہے خبر اس آئینہ رو کی کسے | راز کے پردے میں جس کی خامشی آواز ہے
دیکھنا آئینہ رو کا امرِ مشکل نئیں ولی | سدِ راہِ سینہ صافاں، طالعِ ناساز ہے

ایک تیسری اہم خصوصیت جو ولی کو اردو شاعری کا بابا آدم بنانے میں ساز گار ہوئی ان کے کلام کی شکل و صورت ہے۔ وہ اگرچہ ایک ایسے عبوری دور میں پیدا ہوئے تھے جب کہ دکن کی سیاست زیر و زبر ہو رہی تھی اور اس سرزمین کی تہذیب و ثقافت کا وہ دور ختم ہو چکا تھا جو محمد قلی، وجہی وغواصی اور نصرتی کی زندگیوں میں عروج کو پہنچ چکا تھا لیکن ولی نے اس افراتفری اور سیاسی بے چینی ہی سے وہ فائدہ اٹھایا جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہو سکتا ہے۔ سیاسی عروج اور امن و اطمینان کا عہد دراصل علم و ادب اور شعر و سخن کا زمانہ ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ولی سے پہلے کے دکنی شاعروں نے اطمینان کے ساتھ طویل سے طویل رزمیہ اور بزمیہ داستانیں منظوم کیں اور اپنے اپنے سرپرستوں کی شان میں بڑے سے بڑے قصیدے لکھ کر من مانی مرادیں اور شایان شان انعامات حاصل کئے لیکن ولی جس ماحول میں پرورش پا رہے تھے اس میں نہ طویل نظموں اور داستانوں کے لکھنے کی مہلت تھی اور نہ کوئی ایسے سرپرست باقی رہے تھے جن کی مدح آرائی کے لئے وہ اپنی شاعرانہ قوتوں کا استعمال کر سکتے۔ ان حالات کے تحت صرف غزل ہی ایک ایسی صنف سخن رہ گئی تھی جو کسی سچے شاعر کے قلبی واردات کی ترجمانی کر سکتی تھی۔ اس لئے ولی نے اسی میں طبع آزمائی کی اور اپنی طبیعت کے ایسے ایسے جوہر دکھائے کہ ہر کس و ناکس کو داد دینی پڑی۔ ان کی چھوٹی چھوٹی غزلیں اور ان کا ایک ایک شعر آسانی سے لوگوں کے وردِ زبان ہو گیا اور قدیم دکنی شاعروں کی طویل نظمیں اور پچاس پچاس ہزار اشعار کی مسلسل مثنویاں پس منظر میں چلی گئیں۔ کیونکہ ان کے پڑھنے اور سمجھنے کے لئے فرصت درکار تھی جس کا عہد ولی میں سب سے زیادہ فقدان تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم اردو کارنامے جن میں مثنویوں اور قصیدوں کے علاوہ مرثیے اور غزلیں بھی شامل تھیں رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو گئے اور ولی ہی کو ایک ایسا شاعر سمجھا گیا جس نے سب سے پہلے اس زبان میں دیوان مرتب کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ قدرت نے اپنی طرف سے ولی کے اعتراف کمال کے اسباب پیدا کر دیے اور اس طرح اگرچہ وہ اپنے پیش رو اردو شعرا کی طرح انعام و اکرام سے مالا مال نہ ہو سکے لیکن ایک ایسا لقب اور تاریخ ادب اردو میں ایک ایسا مقام حاصل کر لیا جس کے مقابلے میں جملہ اعزازات ہیچ نظر آتے ہیں۔ خود ولی نے ایک جگہ لکھا ہے۔

گوہر اس کی نظر میں جا نہ کرے | جن نے دیکھا ہے آب و تابِ سخن
راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں | تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

آخر میں ولی کے مضامین کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ ان کا زیادہ تر کلام عشق و عاشقی کے جذبات و معاملات کی ترجمانی کرتا ہے اور ان کی متعدد غزلیں بغیر کسی حجاب کے ان کے اکثر محبوبوں کو پیش نظر کر دیتی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو اردو کے بہت کم کلام میں نظر سے گزرتی ہے۔ ولی کی صفائی قلب نے اپنے کسی محبوب کے نام اور خصوصیات کو پردہ میں رکھنا گوارا نہ کیا۔ ان کے عشق مجازی نے ان کو عشق حقیقی کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔ ان کے ماحول کی بے چینی اور مایوسی نے بھی ان کو آزادہ روی اور

تصوف کی طرف متوجہ کرنے میں کافی حصہ لیا۔ قوموں کے زوال اور تصوف میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ کیونکہ دنیوی اقتدار اور عیش وعشرت کے ہجوم میں بالعموم لوگ اپنی حقیقت اور خدا کو بھول جاتے ہیں۔ اور چونکہ ولی کی شاعری کا عروج ایک ایسے زمانے میں ہوا جب کہ اہل ملک کی سیاسی قوتیں روبہ تنزل تھیں اور ولی کی قوم ہمہ جہتی انحطاط کی طرف مائل ہوکر تصوف وعرفان میں زیادہ دلچسپی لینے لگی تھی اس لئے ولی کا کلام اس کے حق میں ایک نعمت ثابت ہوا۔ ایک ایسی نعمت جو ولی سے پہلے کے شاید ہی کسی اردو شاعر کے حصے میں آسکتی تھی۔ ولی کے اس رنگ کے کلام کا کچھ نمونہ پیش کرکے یہ تقریر ختم کی جاتی ہے۔

ہر ایک سوں متواضع ہو سروری یہ ہے	سنبھال کشتیٔ دل کو قلندری یہ ہے
نکال خاطر فاتر سوں جام جم کا خیال	صفا کر آئینۂ دل سکندری یہ ہے
خیال یار کو رکھ اپنے دل میں محکم کر	کہ عاشقاں کے نزک شیشۂ پری یہ ہے
بسا عزیز ہیں تجھ مکھ کے آفتاب پرست	تو جلوہ گر ہو کہ اب ذرہ پروری یہ ہے

زورؔ

سید محی الدین قادری

نذرِ ولی :۔ اس میں دکن کی چار گریجویٹ خواتین انشا پرداز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ، محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ، محترمہ نعیم النساء بیگم صاحبہ، اور محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ کے دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولیؔ اورنگ آبادی کے حالات زندگی اور خصوصیاتِ کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ولیؔ کی معلوماتؔ ان کے تخیل، ان کے فن شعر اور ذوقِ عرفان کے علاوہ ان کے اسلوب، زبان اور انتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے ولیؔ کے متعلق یہ پہلی مستقل اور جامع کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ تشنگانِ ادب کی تسلی کا باعث ہوگا۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ مندرجۂ ذیل تنقیدوں سے ہو جائے گا۔

"چاروں مضامین جامعہ عثمانیہ کی طالبات کے ادبی ذوق اور علمی استعداد کا بہترین نمونہ ہیں۔ ہم نے سب مضامین بالاستیعاب دیکھے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وسعتِ نظر اور ژرف نگاہی کے ساتھ ولی کی شاعری کا ایسا تفصیلی تجزیہ نہیں کیا گیا ہے ہر مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت جامع اور مکمل ہے خصوصاً ولیؔ کا تخیل نہایت جامع اور مبسوط ہے۔ تنہا یہی مضمون ولیؔ کی پوری شاعری پر تبصرہ کیلئے کافی تھا۔ غرض یہ گلدستۂ رنگ و بو ہر لحاظ سے ایوان ادب کی زینت کے لائق ہے۔"
مولٰنا سید سلیمان ندوی۔ معارف دسمبر ۱۹۳۸ء

"ہر عنوان پر ایک ایک بانوئے محترم نے قلم اٹھا کر تبصرہ نویسی کا حق ادا کر دیا ہے اور ایک تازہ شہادت اس امر کی بہم پہنچائی ہے کہ نور جہان بیگم، جہاں آرا بیگم اور زیب النساء کے مذاقِ شعر و ادب کی بابت جو روایات و حکایات مشہور ہیں وہ افسانہ نہیں" **مولٰنا عبد الماجد دریابادی۔** صدق یکم جنوری ۱۹۳۹ء

"چاروں مضامین قابل تعریف اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی مستحق مبارکباد ہے کہ اس کی طالبات بھی علمی و ادبی تحقیق کے کام اس خوش اسلوبی سے کر سکتی ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ تعلیم یافتہ گھرانوں کی خواتین فخر کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں" **میاں بشیر احمد بی اے۔ بیرسٹرایٹ لا۔ ہمایوں** دسمبر ۱۹۳۸ء

صفحات ۲۴۰ طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر دو جگہ سنہری نام قیمت مجلد عہ

بزمِ وَلی

مطربِ شیریں نوا

دیارِ عشق میں اک مطربِ شیریں نوا آیا

زباں جس کی نواؤں نے عطا کی بے زبانوں کو بساطِ خاک پر جس نے جھکایا آسمانوں کو
بتائے نطق کے اسرارِ پنہاں خوش بیانوں کو حقیقت سے ملایا زندگی کی داستانوں کو

محبت کی نئی دھن چھیڑتا، گاتا ہوا آیا

دیارِ عشق میں اک مطربِ شیریں نوا آیا

وَلی جس کی نگاہیں، پا گئیں نبضیں خیالوں کی جبینیں جس کے آگے جھک گئیں شیریں مقالوں کی
بساطِ شعر پر صورت بدل دی جس نے چالوں کی جو بولی ترجماں تھی اہلِ ہند اور آنے والوں کی

اسی کو سرمدی رعنائیاں دیتا ہوا آیا

دیارِ عشق میں اک مطربِ شیریں نوا آیا

گلوں کو تازگی، موجوں کو اس نے خوش خرامی دی غمِ ہستی کے ماروں کو نویدِ شادکامی دی
وہ جب آیا تو اک عالم نے دادِ خوش کلامی دی چمن نے ہار پہنائے، ستاروں نے سلامی دی

مگر اک محرمِ رازِ دلِ درد آشنا آیا

دیارِ عشق میں اک مطربِ شیریں نوا آیا

وہ اپنے عہد میں دارائے اقلیمِ سخن ٹھیرا سرِ بزمِ سخن سرآمدِ اربابِ فن ٹھیرا
نئی محفل سجائی، ناسخِ رسمِ کہن ٹھیرا جہاں اندر جہاں دیکھے، چمن اندر چمن ٹھیرا

بہار آئی، بہارِ جاوداں آئی وہ کیا آیا

دیارِ عشق میں اک مطربِ شیریں نوا آیا

ابھی تک ناز کرتی ہے دکن کی سرزمیں اس پر اٹھا سکتے نہیں انگلی ادب کے نکتہ چیں اس پر
کھلے تھے عشق کی منزل میں اسرارِ یقیں اس پر فنا اور موت کی تاریکیاں اب بھی نہیں اس پر

ابد کا تاج پہنے وہ سرِ بزمِ فنا آیا

دیارِ عشق میں اک مطربِ شیریں نوا آیا

نہ سمجھی قدر اس کی، کم نگاہوں، بے یقینوں نے ہزاروں دکھ دیئے ارباب دنیا کے قرینوں نے
ادا کی سنتِ ناحق رسی، مسند نشینوں نے اسے شاعر ہی سمجھا زندگی کے سطح بینوں نے
نہ جانا یہ کہ ان کی کشتیوں کا ناخدا آیا
دیارِ عشق میں اک مطربِ شیریں نوا آیا

علی اختر

لالۂ صحرا

بزمِ ہستی میں نوائے ہر کلیم آوارہ ہے سروِ گلشن پا بہ گل ہے موجِ نسیم آوارہ ہے
نغمہ گاہ پابندِ زباں ہوتا نہیں ابر سے خورشید بے نام و نشاں ہوتا نہیں
زندگی کی نبض میں اس کی روانی دیکھیے عشق کا سودا حسینوں کی جوانی دیکھیے
گو نئے میکش نئے پیمانے آتے جائیں گے پر جو ساقی ہیں پرانی ہی پلاتے جائیں گے
ندیوں کی راگنی ہو یا ہواؤں کی سنک چشمِ انجم کے اشارے اور غنچوں کی چٹک
محفلِ شب میں وہ شاہِ حسن کی جلوہ گری صبح کی مدہوشیوں میں وہ نشاطِ زندگی
شام کی بیداریوں میں نفس کی خود بینیاں بزمِ دل میں وہ برودگی جذب کی رنگینیاں
آنکھ میں وہ برق سی آتی ہوئی جاتی ہوئی ایک عالم کی تمنا کی خبر لاتی ہوئی
فکرِ شاعر کو انھیں سانچوں میں ڈھلنا چاہیے گوہرِ نایاب کو موجوں میں پلنا چاہیے
پا گرفتہ کے لیے بامِ ہنر مسدود ہے زندگی کی بے قراری ننگِ ہست و بود ہے
بزمِ انجم میں ہو جیسے ماہِ کامل جلوہ گر شاعروں میں ہے نمایاں یوں ترا ذوقِ سفر
تیری گردش نے تجھے بادِ بہاری کر دیا شعر اور دو کو ترے درد کا بھکاری کر دیا
مالوہ، گجرات، برہان پور، دہلی، آگرہ تیری سیاحی نے سب کو حسن کا تحفہ دیا

ناز ہے گلیب کو تجھ پر بلبۂ افسنگ آباد آج بھی معمور سوزِ دل سے ہے تیرا سواد
اے ولی حسنِ تکلم کا رخِ زیبا ہے تو لالۂ گلشن بہت ہیں لالۂ صحرا ہے تو

تیری چہکاروں سے بھولے سب ہی ایسی بولیاں شاہدِ نوخیز اردو نے دکھائیں شوخیاں
تیرے دار الضرب کے سکے زرِ کامل عیار تیری گل افشانیوں پر حسنِ خوباں کا نثار
تجھ سے پہلے اہلِ دہلی سب ملمع ساز تھے انتظارِ راہ بر میں گوش بر آواز تھے
تیرے سوز و درد نے اشعار کو جادو کیا جانے کیا ڈالا کہ آبِ بحث کو دارو کیا
تیری فکرِ شعر میں عشقِ حقیقی کا خیال خال و خد کی بات بھی آئی ہے لیکن خال خال (ولی)
شوق بے پروا تیز رنگ سے بیگانہ تھا اے ولی تو حسنِ عالم سوز کا دیوانہ تھا
خود گدازی ہے ترے شعر و سخن کا مدعا عشق کو سوزِ غزل سے تو نے کامل کر دیا
تاجداروں کے درِ دولت سے تو ڈرتا رہا بات دل کی اہلِ دل کے درمیاں کہتا رہا
اک زمانہ تیری بے پروائیوں سے دنگ ہے تیری آزادی ہنر مندی کا آب و رنگ ہے
دے دیا قدرت نے سوز و درد کا حاصل تجھے
کہتے آئے ہیں سخنور شعر میں کامل تجھے

غلام طیب

ولی

جہانِ رنگ و بو سے کھیلنے والا نہ تھا کوئی شبِ ہجراں کی سختی جھیلنے والا نہ تھا کوئی
زبانِ نغمہ بے تاثیر تھی مستی کی پیاسی تھی پریشاں گیت تھے گیتوں کے چہرے پر اداسی تھی
ترانے حسن و دل کے گانے والا ہی نہ تھا کوئی حسیں فطرت کا جی بہلانے والا ہی نہ تھا کوئی
اک اپنی ترجمانی چاہتے تھے راز فطرت کے کسی داؤد کے محتاج تھے سب ساز فطرت کے
ابھی نا آشنائے لذتِ گفتار تھی دنیا اسیرِ خامشی تھی بار تھی، آزاد تھی دنیا

یکایک دہرِ تیرہ بخت کی قسمت بدلتی ہے
ہوا بھی زیرِ لب ہنستی ہوئی اتراتی چلتی ہے

اٹھے انگڑائیاں لیتے ہوئے بستر سے فوارے
پگھل کر بہہ چلے موسیقیوں کے منجمد دھارے

وہ پیغامِ سحر آ ہی گیا، زنجیرِ شب ٹوٹی
وہ ابھرا مہر لو وہ زندگانی کی کرن پھوٹی

حجابِ تیرگی قدرت نے جب چٹکی سے سرکایا
تو گہوارے میں اک ہنستا ہوا چہرہ نظر آیا

فضائیں احتراماً سر پہ آنچل ڈال لیتی ہیں
سحر کی بیٹیاں رنگینیوں کی ناؤ کھیتی ہیں

صدا دی آسمانوں نے ستاروں نے وؔلی آیا
مبارک بادیاں گائیں بہاروں نے وؔلی آیا

وؔلی وہ ہمدمِ فطرت وہ پیکِ نورِ وجدانی
وہ جبریلِ سخن وہ اولیں تلمیذِ رحمانی

یقیں بخشا زباں کو جس نے پہلے اس کے جینے کا
وہ پہلا ناخدا ہندوستانی کے سفینے کا

دئیے روشن کئے مندر میں کعبے کے چراغوں سے
ہزاروں جنتیں آباد کر دیں دل کے داغوں سے

وہ میراثِ جہاں وہ خلد کا پیغام آتا ہے
دکن کی سرزمیں پر زندگی کا جام آتا ہے

مخدوم محی الدین

نذرِ وؔلی

ادب کی بزم میں جس دم ترا رباب آیا جہانِ نغمہ و مستی میں انقلاب آیا
ایاغِ مے کے عوض دورِ آفتاب آیا حریمِ ناز سے ہنستا ہوا شباب آیا

جبینِ عشق سے امید کی کرن پھوٹی
فضا میں نورِ محبت کی پھلجھڑی چھوٹی

ترے عروج سے پہلے عجب زمانہ تھا چمن سے قافلۂ برگِ گل روانہ تھا
سرودِ نغمۂ بلبل فقط فسانہ تھا زوالِ کیفیتِ عشرتِ شبانہ تھا

شباب و حسن ترستے تھے قدرداں کے لئے
خراب حال تھے عرضِ غمِ نہاں کے لئے

دکن سے جانبِ دلی کیا سفر تو نے دلوں کے راز کہے صاحبِ نظر تو نے
لٹائے فکر کے خورشید وش گہر تو نے شبِ سخن کو کیا مطلعِ سحر تو نے

ترے چراغ سے روشن ہے نام اردو کا
جہاں پہ ثبت ہے نقشِ دوام اردو کا

تری نظر نے کیا وہمِ کمتری کا علاج زبانِ قوم کے سر پر رکھا سنہرا تاج
خرابیٔ وقت میں تو نے وطن کی رکھ لی لاج ترے جہادِ ادب کی تمام دھوم ہے آج

ہر ایک شعر ترا جس کی یادگار ہوا
جگر کے خون سے دیوان لالہ زار ہوا

ترے سخن میں ہے کیفیتِ شبِ مہتاب ہر ایک مصرعۂ رنگیں ہے ساغرِ مئے ناب
نظر نواز ہیں تیرے نقوشِ حسن و شباب تری نوا سے دلِ اہلِ درد ہیں بیتاب

ترے کرم سے ہے سرسبز آج باغِ غزل
ہوائے تیز میں بجھتا نہیں چراغِ غزل

ترا ہی فیض ہے اے ابرِ نو بہارِ دکن اگل رہی ہے خزانے پھر ارضِ پاکِ وطن
خزاں کے وار سے محفوظ ہے ریاضِ سخن بنا رہے ہیں نئے قصرِ شعر صاحبِ فن

تری زبان کو مقبولِ عام ہونا تھا
تجھے جدید ادب کا امام ہونا تھا

شرابِ ناب نے رندوں کو سرخوشی بخشی نسیمِ صبح نے پھولوں کو تازگی بخشی
شعاعِ مہر نے ذروں کو روشنی بخشی ترے کلام نے مردوں کو زندگی بخشی

عجیب کام کیا میرِ کارواں تو نے
دیارِ ہند کے گونگوں کو دی زباں تو نے

سکندر علی وجد

ولی دہلی میں

شکوہِ شاہ جہاں کا نشانِ امکانی — وہ شہر جو تھا سلاطین کا نقشِ پیشانی
وہ شہر جو تھا عروس البلاد مشرق کا — تھی جس میں اہلِ ہنر، اہلِ فن کی ارزانی
وفورِ دولت و ثروت کا مسکن و مامن — زوالِ خاک نشینانِ اہلِ سلطانی
اسی فضا میں دکن کا غریب جا پہنچا — نفس کو جس کی عطا تھی ضیائے روحانی
وہ رازدانِ حقیقت وہ آدمِ اردو — کہ جس سے نطق نے خود اپنی قدر پہچانی
صدا بلند سرِ رہ گزار کی اس نے — بیا و رید گر اینجا بود زباں دانی
صدائے ورد غریب الدیار کو سن کر — ہر ایک مردہ طبیعت نے جان پیدا کی
زمینِ ریختہ چمکی اسی کے نغموں سے — اسی نے شاعرِ ہندی کی شان پیدا کی
اسی نے حضرتِ قائم کو کر دیا قائم — اسی نے میر کی غزلوں کو تازگی بخشی
اسی نے حضرتِ سودا کو خوش بیانی دی — زباں کو روح، تکلم کو زندگی بخشی
حیاتِ نو ملی اس سے جنابِ رنگیں کو — اسی سے حضرتِ مومن نے بانکپن سیکھا
جنابِ غالبِ نکتہ نواز نے اس سے — شعورِ اہلِ دل و فطرتِ سخن سیکھا
اسی زبان میں اقبال نے تخیل سے — جہاں میں رازِ خودی کی گرہ کشائی کی
اسی زبان سے پھر روشنی دکن میں ہوئی — تمام ہند کی پھر اس نے رہنمائی کی
طفیل یہ اسی اہلِ سخن ولی کا ہے — کہ جس سے نطق نے خود اپنی قدر پہچانی
صدا یہ آج تلک ہے بلند دہلی سے — بیا و رید گر اینجا بود زباں دانی

اکبر وفا قانی

"پہلا مطرب"

شفق زارِ جوانی شوق کے رنگوں سے خالی تھا!
نسیمِ صبح کھل کر رقص فرما ہو نہ سکتی تھی
گلوں کی چاک دامانی پہ شبنم رو نہ سکتی تھی!

نظارہ! منتظر نظروں میں اک نورِ خیالی تھا!!
حسیں دوشیزگی پھرتی تھی کھیتوں میں اکیلی سی
قیامت تھا نہ اڑنا بانسری کی مست تانوں کا!
جبینِ چرخ پر پھیکی سی تھی افشاں ستاروں کی
ربابِ زندگی تھا منتظر پر نور گانوں کا!!

طرب زارِ تخیل پر اداسی چھائی جاتی تھی!
دلوں کی دھڑکنیں لب پر دعا بن کر نہ آتی تھیں
امیدیں زندگی کا آسرا بن کر نہ آتی تھیں!

حدیثِ دل خموشی کے سروں میں گائے جاتی تھی!
کسی نے فطرتِ فیاض سے آواز کو مانگا
نگاہوں کے صنم خانے کو آذر آشنا کر کے!!
کسی کھوئے ہوئے ٹھٹکے ہوئے اک ساز کو مانگا
دلِ مضراب کو پازیب کا جادو عطا کر کے!

کہا دوشیزۂ شب نے وہ پہرِ سحر تو نکل آیا !!

مئے عشرت تھی جس جا اور متوالا نہ تھا کوئی

جہاں پر زندگی کا دیکھنے والا نہ تھا کوئی!

حسین مطرب! ترے نغموں سے محفل اب بھی روشن ہے!

تری یادوں سے ہیں معمور ارمانوں کی دنیائیں

ستاروں کی طرح احساس کا دل اب بھی روشن ہے!

ترے گیتوں نے کیا بخشا تجھے ہم کیسے بتلائیں!

ہوائیں آج یوں اٹھلا کے تیری دھن میں گاتی ہیں!

بہاریں بادلوں کے روپ میں مستی لٹاتی ہیں!!

نظر حیدرآبادی

آسمانِ شاعری

اے دکن کے صفحۂ تاریخ پر حرفِ جلی
شعر کے مالک سخن کے شاہ اردو کے ولی

جذبۂ شعری نے تیرے دل سے رسم و راہ کی
تیرے ہی دیوان سے اردو نے بسم اللہ کی

آج بھی سب کو تری سرکردگی تسلیم ہے
تیرا ہر اک شعر موجِ کوثر و تسنیم ہے

کس چمن میں اپنا اندازِ بیاں لے کر گیا
تو دکن سے شہر دہلی تک زباں لے کر گیا

خسروِ ملکِ سخن اے مسند آرائے ادب
تیرا لوہا مانتی ہے اب بھی دنیائے ادب

تجھ سے سیکھی بزمِ اردو نے زبانِ شاعری
تو زمینِ شعر پر تھا آسمانِ شاعری

فطرتِ شاعر نے ذوقِ مستقل تجھ سے لیا
دل تو تھا پہلو میں لیکن وہ دل تجھ سے لیا

دل میں اک بجلی سی لہراتی ہے تیرے نام پر
روحِ شاعر وجد میں آتی ہے تیرے نام پر

نظم میں وہ روح پیدا کی تری تخئیل نے
زندگی پائی مذاقِ شعر کی تکمیل نے

معرکے جیتے ادب کے جاودانی ہو گیا
اپنا جھنڈا گاڑ کر ملکِ سخن میں سو گیا

عابد علی سعید

اعترافِ ولی

اے ولی اے خالقِ حسنِ زبانِ ریختہ
شاعری کیا کی، بچالی تو نے جانِ ریختہ

آج تیرے گیت اپنی دھن میں گانے ہیں مجھے
اپنے لفظوں میں ترے نغمے سنانے ہیں مجھے

میں کہ اپنی بے نیازی کے لئے مشہور ہوں
کچھ تو باعث ہے جو تیری مدح پر مجبور ہوں

جانتے ہیں جاننے والے ہی تیری برتری
قدرِ جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

اپنے اعجازِ سخن سے جو بھی چاہا کر دیا
چشمۂ آتش میں تو نے آب پیدا کر دیا

تیری ہر اک بات میں الہام کی سی شان ہے
دل نہیں پہلو میں تیرے ہیکلِ قرآن ہے

چھپ نہیں سکتی تری نظروں سے شکلِ رنگ و بو
نغمے آتے ہیں مجسّم بن کے تیرے روبرو

ترجمانِ کیفیاتِ حسن ہے تو لا کلام
دردِ دل کی بولتی تصویر ہے تیرا کلام

تیرے ایک اک لفظ سے ہے تیری سیرت آشکار
تجھ کو زیبا ہے خطابِ شاعرِ فطرت نگار

باوجودِ بے خودی غفلت سے بیگانہ ہے تو
عقل جس پر ناز کرتی ہے وہ دیوانہ ہے تو

اللہ اللہ امتزاجِ قوتِ عقل و جنوں
ہر سکوں میں اک تڑپ ہے ہر تڑپ میں اک سکوں

عقل کی کشتی جنونِ عشق سے کھیتا ہے تو
بے ہشی سے ہوشیاری کا سبق لیتا ہے تو

تیرے دردِ عشق کی اللہ رے شانِ فراغ
بے نیازِ لذتِ مرہم ہیں تیرے دل کے داغ

موت میں بھی ڈھونڈ لیتا ہے تو روحِ زندگی
ظلمتوں سے اخذ کر لیتا ہے تو تابندگی

تو نے اتنا کر دیا اپنے کو محوِ زندگی
زندگی بھر موت تجھ کو ڈھونڈتی ہی رہ گئی

مختصر یہ ہے کہ اک آئینۂ عرفاں ہے تو
تجھ میں وہ اسرار پنہاں ہیں کہ خود حیراں ہے تو

تمکین (سرمست)

خسروِ سخن

ایک کیفِ سرمدی ساری فضا پر چھا گیا
صبح کے ہونٹوں پہ ہلکا سا تبسم آ گیا

چھیڑ کر اک نغمۂ رنگین دل کے ساز پر
محفلِ ہستی میں گویا پھول سے برسا گیا

عشق کی دنیا میں روشن کر گیا غم کے چراغ
شعر کے پردہ میں شرحِ زندگی فرما گیا

اپنے ہر اک شعر میں دے دے کے پیغامِ حیات
نیند کے ماتوں کو گہری نیند سے چونکا گیا

بھول سکتی ہے کہیں اردو یہ احسانِ عظیم | گتھیاں شعر و ادب کی کس طرح سلجھا گیا
کیں تری فکرِ رسا نے کیا چمن افروزیاں | بوئے گل سے باغِ اردو کو سدا مہکا گیا
آنسوؤں کے سوزِ پیہم کا فسانہ کہہ دیا | اپنی آہوں سے فضائے زیست کو گرما گیا
مختصر یہ ہے کہ تھی الہام تیری شاعری
خود بھی تڑپا اور زمانے بھر کو بھی تڑپا گیا

امیر احمد خسرو

شاعرِ فطرت

اے شاعرِ رنگین بیاں شاعرِ فطرت
اس ارضِ مقدس پہ جنم تو نے لیا ہے

گوتم کے تخیل نے جلا پائی جہاں پر | عنبر کی تمنا نے ضیا پائی جہاں پر
وہ حسن کے خاموش پرستاروں کی دنیا | وہ عشق کے متوالوں کی سرشاروں کی دنیا
بہتے ہیں جہاں راگ کے اور رنگ کے دریا | ڈھلتی ہے جہاں حسن کے سانچوں میں تمنا

اے شاعرِ رنگین بیاں شاعرِ فطرت
اس ارضِ مقدس پہ جنم تو نے لیا ہے

تعریف سے بالا ہے ترے نطق کا اعجاز | ہے عرش سے اونچی ترے تخیل کی پرواز
ہر شعر میں معصوم ستاروں کا ترنم | دوشیزۂ فطرت کا طرب خیز تبسم
ہر شعر ہے سرشار جوانی کا ترانہ | ہر شعر غمِ عشق کا پُر درد فسانہ
ہر شعر ترا حسنِ مجسم کی ہے تصویر | ہر شعر ترا عشق و تمنا کی ہے تفسیر

پیغامبرِ شعر و سخن شاعرِ فطرت
اردو کو نئی روح ملی تیری بدولت

کی تو نے عطا میرؔ کو شیرینیٔ گفتار | کی تو نے عطا داغؔ کو رنگینیٔ گفتار
غالبؔ کے تخیل کو ملی رفعتِ پرواز | اقبالؔ نے سیکھے ہیں ترے نطق سے اعجاز
ممنون نہیں ایک ترے اہلِ وطن ہی | دعوائے زباں جن کو ہے ممنون ہیں وہ بھی

اے شاعرِ رنگین بیاں شاعرِ فطرت
اس ارضِ مقدس پہ جنم تو نے لیا ہے

منظفر الدین ظفر

ولی کا پیغام

سحر کا فور کہ ہے دعوتِ عروجِ خیال — دکھا رہا ہے زمانے کو وقتِ نو کا جمال

کہیں تلاش ہے ظلمت کو آشیانے کی — کہیں قیامتِ صغریٰ ہے جگمگانے کی

کہیں سکونِ تجلی کہیں ہے شورِ حیات — شباب کے لئے بے چین شاہدِ آفات

کہیں غرورِ جوانی کہ آسمان ہوں میں — کہیں صدائے دو عالم کہ نوجواں ہوں میں

کلاہ کج ہے بیاباں میں کوہساروں کی — نگاہ شوخ ہے فطرت کے نوبہاروں کی

چھلک رہے ہیں وہ ساغر کہ انقلاب آئے — سوال عشق و محبت کا اک جواب آئے

نگاہ مست قدم تیز دست و پا بے باک — خیال شوخ ادا نرم شوق سینہ چاک

سحر کا وقت نہیں روح نوجوانی ہے — وطن کی صبح نہیں، ذوق کامرانی ہے

پکارتا ہے یہ مشرقِ مبارک آزادی — اٹھ اے جوانِ وطن سن یہ نغمۂ شادی

نیازِ عشق کی ٹھوکر لگا زمانے کو — کہ تیری روح تڑپتی ہے غم اٹھانے کو

الٹ بساط کہ فرسودہ کاریاں ہیں بہت — نظر اٹھا کہ نئی پردہ داریاں ہیں بہت

تری زمیں کے پہاڑوں سے آذری پیدا — تری زمیں کی نگاہوں سے دلیری پیدا

تجھے شباب کا پروردگار بننا ہے — مری حیات کی اک یادگار بننا ہے

جہاں کو نغمۂ ہستی سکھا دیے میں نے — صدائے درد سے دل تھرتھرا دیئے میں نے

مرے وطن کے پرستار تو بھی کر آغاز — کہ تیری روح میں ہے زندگی کا سوز و گداز

قلی قطب ہیں کئی اور ابوالحسن ہیں کئی — نیازِ غم ہیں کئی نازِ انجمن ہیں کئی

اک آہ کھینچ کہ عالم کو غم کی تاب نہیں
قدم بڑھا کہ جہاں میں ترا جواب نہیں

عبدالقیوم خاں باقی

نظم بہ یادگارِ ولی اورنگ آبادی

چار سو چھائی ہوئی ہے رحمتِ پروردگار — آئی ہے گلزار میں کس شان سے فصلِ بہار

درفشانی کر رہی ہے شبنمِ شب زندہ دار — نکہتِ گل سے معطر ہو رہے ہیں برگ و بار

اے دکن کی سرزمیں اے بلدۂ میمون اساس — تجھ پہ رحمت ہو خدا کی تو ہے فخرِ روزگار

مرکزِ علم و ادب وہ شاعرِ رنگیں بیاں — ہے ولی کی ذات سے حاصل یہ تجھ کو افتخار

ذرہ ذرہ فیض بخشی کا تری ممنون ہے
قطرہ قطرہ تیرے فیضاں سے بنا ہے آبشار

ہمتِ عالی نہیں درماندۂ حسنِ عمل
کامیابی کا ثمر لائے گی سعیٔ استوار

شکوہ سنجی چرخ کی ہے شاعروں کا مشغلہ
دہر میں ہیں شاکیٔ قسمت ہمیشہ بے قرار

انبساطِ روح ہے سرگرمیٔ ذوقِ عمل
عمل کی حرکت پر ہے جیسے زندگی کا انحصار

گلشنِ اردو کی جس نے آبیاری کی صدا
جس کی خدمت سے یہ گلزار ادب ہے لالہ زار

تھا وہ بانیٔ ادب جانِ ادب کانِ ادب
تھا وہ اقلیم سخن کا تاجدار و شہریار

وہ شہنشاہِ قلم وہ شہریارِ علم و فن
وہ ادیب خوش بیاں تھی شاعری جس پر نثار

زندگی بھر کی نہ غفلت فرض کے احساس سے
نیک طینت نیک نام و نیک دل نیکو شعار

قالب خاکی نظر سے گرچہ پنہاں ہو گیا
کارنامے اس کے دنیا میں رہیں گے یادگار

رنج و راحت ہیں بہم دونوں سرائے دہر میں
ایک حالت پر نہیں ہے گردشِ لیل و نہار

تا بکے اقبال یہ نالہ یہ فریاد و فغاں
اب اٹھا دست دعا پیشِ جنابِ کردگار

ہو نزولِ برکتِ باری وؔلی کی روح پر
اور نازل ہو ہمیشہ رحمتِ پروردگار

سید حسن اختر اقبال

اُردو شاعری کے مرقعے

(آرکسٹرا نغمۂ ماضی بجاتا ہے ۔ دریا کے پیچھے کی طرف بہنے کی آواز)

۱۔ وقت کا دھارا پیچھے کی طرف بہہ رہا ہے ۔

۲۔ ماضی نے اپنے پٹ کھول دئے۔ ہم چار سو سال پہلے کے ہندستان میں داخل ہوگئے۔

۱۔ مغلوں کے اقبال کا ستارہ جگمگا رہا ہے ۔

۲۔ مغلوں کا نہ کہو ہندوستان کے اقبال کا کہو ۔

۱۔ ہاں سچ ہے کبھی جو اجنبی تھے اب اس دیس کے رکھوالی ہیں۔ اس ملک کی قسمت کا دامن ان ہی کے ہاتھوں بندھا ہے۔

۲۔ پھر ان کا رنگ روپ بھی تو بہت کچھ بدل چکا ہے ۔

۱۔ عرب و ایران کی زمین چھوڑے انھیں تین چار سو سال بھی تو ہونے آئے ۔

۲۔ ہندوستان کی تاریخ کی وہ صبح بھی بڑی یادگار ہے، جب دونوں تہذیبوں کا آپس میں میل ملاپ ہوا ۔

۱۔ گویا ایک نے دوسرے کو اپنا لیا ۔

۲۔ دونوں کی تقدیریں ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئیں ۔

۱۔ برسوں کے میل جول نے ہندوستانی تہذیب کو جنم دیا ۔

۲۔ دیکھو جگہ جگہ یہی تہذیب چلتی پھرتی نظر آتی ہے ۔

۱۔ زبان تک بدل گئی ۔

۲۔ ہاں وہ ایک زندہ حقیقت ہے اس میل ملاپ کی ۔

۱۔ لشکر کی بولی اب بازاروں سے گزر کر محلوں اور ایوانوں تک پہنچ گئی ہے ۔

۲۔ مگر دلی میں ابھی تک لوگ فارسی ہی پر ریجھے ہوئے ہیں۔ ذرا دکن کی طرف چلو ۔

۱۔ کیا گولکنڈہ کی طرف ؟

۲۔ گولکنڈہ اور بیجاپور ۔

۱۔ شاید وقت کچھ اور آگے بڑھ گیا ۔

۲۔ ہم بیجاپور کو پیچھے چھوڑ آگئے ۔

۱۔ اوہو یہ تو قطب شاہوں کا دربار ہے ۔

(پس منظر میں دھیما شور و غل)

۲۔ محفل شعر و سخن گرم ہے ۔

۱۔ ذرا ادب سے ۔ بادشاہ خود تشریف رکھتے ہیں ۔ ادھر شہزادے بیٹھے ہیں، ادھر شاعروں کی جماعت ہے ۔

۲۔ یہ محمد قلی قطب شاہ کا دور ہے ۔

۱۔ جس نے حیدر آباد کی بنیاد ڈالی ۔

۲۔ ارے یہاں کا تو رنگ ہی کچھ اور ہے ۔

۱۔ ہاں یہ بالکل دکھنی رنگ ہے ۔

۲۔ جیسے وہ یہاں آکر کھو گئے ہیں ۔

۲۔ کھو نہیں گئے ہیں بلکہ اپنا سب کچھ اس سرزمین کے حوالے کر دیا ہے۔

۱۔ ذرا دیکھنا بادشاہ کچھ فرما رہے ہیں ۔

۲۔ شاعروں کی صف میں کچھ ہل چل مچی ہے ۔

۱۔ اوہو پہچانتے ہو انہیں یہ ملا وجہی ہیں ۔

۲۔ قطب مشتری کے مصنف ۔

۱۔ سب رس کے بھی ۔

۲۔ وجہی کے پاس ہی غواصی، قطبی، جنیدی اور ابن نشاطی بیٹھے ہیں۔

۱۔ یہ سب گولکنڈہ کے مشہور شاعر ہیں ۔

۲۔ دیکھو وجہی کچھ سنا رہے ہیں ۔

(بیچ بیچ میں سبحان اللہ اور ماشاء اللہ کی آوازیں)

دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں　　　پنچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ　　　انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہی لگ

دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے　　　کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے

دکھن ملک بھوتیچ خاصا اہے   تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

۲۔ کیسے میٹھے بول ہیں۔

۱۔ ایک ایک لفظ سے مقامی رنگ ٹپکا پڑتا ہے۔ ٹھار سنسار دھن سماج سب یہیں کے الفاظ ہیں۔

۲۔ اپنا لفظ دیا بھی ہے تو مقامی رنگ میں ڈبو کر۔ فاضلاں کہا ہے

۱۔ شاعر دکن کو سب ملکوں کا تاج کہتا ہے۔

۲۔ ان شعروں کے پسِ منظر میں دکھنی قومیت جھانک رہی ہے۔

۱۔ اپنے وطن کو سراہنے کا جذبہ کیسا اجاگر ہو گیا ہے۔

۲۔ یہ بنے بھی تو یہیں کے گوشت و پوست سے ہیں یہیں کی ہواؤں میں پرورش پائی۔ یہیں ان کی امیدوں اور آرزوؤں نے جوان ہونا سیکھا اور یہیں ان کے ماضی نے ان کے شعر و ادب اور تہذیب و تمدن کی تعمیر کی۔ ان ہی فضاؤں میں تو ان کے تخیل کی آبیاری ہوئی ہے۔

۱۔ دیکھو وجہی نے بادشاہ سے کچھ سنانے کی درخواست کی ہے۔

۲۔ ہاں کیوں نہ ہو۔ محمد قلی ہے بھی تو بہت بڑا شاعر۔

۱۔ محمد قلی کے کلام میں بڑی سادگی اور لطافت ہے۔ جب وہ وارداتِ عشق بیان کرتا ہے تو اس کی شاعری کا اثر اور بڑھ جاتا ہے۔ اس نے منظر نگاری بھی کی ہے مگر اپنے ہی آس پاس کے مناظر کی اور اپنے ملک کے میووں ترکاریوں پرندوں اور رسم و رواج کے متعلق بھی نظمیں کہی ہیں۔ ہندی شاعری کا اس پر گہرا اثر ہے۔

۲۔ ذرا سنو بادشاہ نے غزل شروع کی۔

(بیچ بیچ میں تعریفیں)

پیا باج پیالہ پیا جائے نا   پیا باج یک تل جیا جائے نا

پیا بن ہیں کیسے صبوری کروں   کہیا جائے اما کیا جائے نا

نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے   کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا

قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند   دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

۱۔ ہائے کلام میں کیسا درد ہے۔ جیسے سچ مچ کوئی عاشق بول رہا ہے

۲۔ اس کی عشق کی داستان ہے بھی تو بڑی رنگین۔

۱۔ شاید اب غواصی سنائیں۔ ان کی مثنوی سیف الملوک بدیع الجمال بڑی مشہور رہے۔

۲۔ مگر مثنوی تو سنانے سے رہے۔

۱۔ پھر ابن نشاطی کی باری ہے۔ انھوں نے پھولبن بڑی محنت سے لکھی ہے۔

۲۔ ارے وہاں تو پھر وجہی کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

۱۔ لیجئے وہ سنانے بھی لگے۔

خوش حال ہو جیو آج خوشی پاتا ہیں   پیتا ہوں شراب ہور اثر آتا ہیں

کانٹیاں کے ضرب ڈستے ہیں پھولاں سب   تج باج سکھی باغ منجھے بھاتا ہیں

۲۔ ارے یہ محفل تو برخاست ہو رہی ہے۔

۱۔ ہاں محفل تو برخاست ہو جائے گی۔ مگر زمانہ ان گھڑیوں کو بھلا نہ سکے گا۔ یہ زمانے کو بہت کچھ دے کر محفل سے اٹھ رہے ہیں۔ انھوں نے فضاؤں میں یگانگت اور اتحاد کی روشنی پھیلائی ہے۔ انھوں نے ایک نئی تہذیب کو جنم دے کر زندگی کو نوازا ہے۔

۲۔ چلو بیجاپور چلیں۔

(تھوڑی دیر آرکسٹرا اس کے بعد دھیما شور و غل)

۱۔ یہ علی عادل شاہ ثانی کا دربار ہے۔

۲۔ ہاں یہ بھی بڑا شعر نواز ماحول ہے۔

۱۔ بادشاہ خود بھی بڑا شاعر ہے اور استاد عالم کے نام سے مشہور ہے

۲۔ ذرا شاعروں کی صف میں تو دیکھو۔

۱۔ وہ دیکھو سب سے آگے ملک الشعراء نصرتی ہیں۔ ان کے بعد شاہ ملک، رستمی، امین، ہاشمی، مرزا وغیرہ ہیں۔

۲۔ ارے گولکنڈہ کا ملک خوشنود بھی یہیں ہے ۔
۱۔ دیکھو نصرتی کچھ سنا رہے ہیں ۔

اس وقت شاہنشہ صف شکن کہے گا تدبیر میں یوں بچن
لیا آج نہ جائے یو گڑھ اگر تو ہوں گا انگے یوچ فتنے کون گھر
کچیا تو ڑنا خار بہتر دسے کہ چھوڑے تو ہو سخت خنجر دسے
کسے ہو دسے سکت جو سکے کرنگاہ اٹل فوج وہ ہور یو سردار شاہ
چلیا دھم بہ دھم شاہ جوں مہ بلی پھوٹی ہال انگے باغباں کی علی
جلالت کی جوں تیز لونی دہریا سورج دیکھ دہشت پکڑ تھرتھریا
کیا سالہا کا گھڑی اک میں کام سٹیا کھول فتنہ کا پایہ تمام

۲۔ ارے ہے اس میں تو رزم نگاری کی ہے ۔ بادشاہ کے بہادری کے قصے کو دہرایا گیا ہے ۔
۱۔ نصرتی کو رزم نگاری میں کمال حاصل ہے اس کے علی نامہ میں ایسے بہت سے ٹکڑے ہیں ۔
۲۔ تو یہاں دکھنی شاعری کا دور ختم ہو جاتا ہے ۔
۱۔ ہاں ختم ہو جاتا ہے ۔ دیکھتے ہو ساری دکھنی شاعری میں ہندی کا رنگ کیسا رچ بچ گیا ہے ۔
۲۔ خیال اور زبان دونوں اس رنگ میں بسے ہوئے ہیں ۔
۱۔ جبھی تو ان شعروں میں ایسی سادگی اور لطافت ہے ۔
۲۔ کیا اب ہم ایک نئے دور کے سامنے کھڑے ہیں ۔
۱۔ ہاں شعر و ادب کی ایک نئی صبح طلوع ہونے کو ہے ۔

(آرکسٹرا اونچے سروں میں نغمہ بجانے لگا)

نوبت کا ریکارڈ

۲۔ یہ اورنگ آباد ہے ۔
۱۔ ملک عنبر کی بسائی ہوئی بستی اب دلہن بنی ہوئی ہے ۔
۲۔ یہاں شمال اور جنوب کا میل ہوا ہے ۔
۱۔ اردو شاعری کے آسمان پر نئے ستارے جگمگا رہے ہیں ۔
۲۔ ہاں یہیں سے تو اردو شاعری نے چلنا سیکھا ۔ نک سک سے درست ہوئی ۔ پھر یہ تحفہ دکن نے ولی کے دیوان کی صورت میں دلی کو دے ڈالا ۔
۱۔ یہاں تو بڑی رونق اور چہل پہل ہے ۔
۲۔ اسی لئے تو علامہ آزاد بلگرامی نے اسے عروس البلاد کہا ہے ۔
۱۔ یہاں شاعری درباروں سے نکل کر کھلی فضا میں آگئی ہے ۔
۲۔ اسے یہاں درباروں سے زیادہ بزرگانِ دین کی سرپرستی حاصل ہے ۔
۱۔ گھر گھر شعر و ادب کے چرچے ہیں ۔
۲۔ ولی کے فیض نے ذوق و شوق کی ایک نئی دنیا پیدا کر دی ۔
۱۔ ذرا آگے بڑھ کر شاہ مسافر کے تکیہ کی طرف چلیں ۔
۲۔ یہ بزرگ اورنگ زیب کے مرشد ہیں ۔
۱۔ اردو شاعری کے بچپن کو ایسے ہی پُر تقدس اور پُر کیف ماحول کی ضرورت تھی ۔
۲۔ ان پہاڑیوں کے آغوش میں اردو شاعری کی تربیت ہوئی ہے جن کے دامن میں ہندوستان کی قدیم ترین تہذیبیں دفن ہیں ایک طرف خلجی، تغلق اور بہمنیوں کے نقش قدم یہاں ملتے ہیں ۔ تو دوسری طرف مغلوں کے انتہائی عروج اور آغاز زوال کی کیفیتیں بھی یہاں کی فضاؤں میں جذب ہیں ۔ پھر بزرگان دین کا تقدس بھی یہاں جگمگا رہا ہے ۔
۱۔ چلو شعر و سخن کی مجلس میں چلیں ۔

(پس منظر میں دھیما شور)

۲۔ دیکھتے ہو کیسے کیسے باکمال یہاں جمع ہیں ۔
۱۔ مگر شعر کی سرداری تو ولی ہی کا حق ہے ۔
۲۔ ولی کے پاس ہی سراج بھی بیٹھے ہیں ادھر داؤد ہیں پھر عزلت، عارف، سامی اور نوخیز شاعروں کی جماعت کی

جماعت ہے ۔

۱۔ دیکھو ولیؔ نے داؤد کی طرف اشارہ کیا اور انھوں نے غزل شروع کی ۔

دستِ رنگیں کو دیکھ کر تیرے　　رنگ مہندی چھپا ہے ہاتھوں ہات

دیکھ تیرے لبوں پہ رنگ مسی　　چشمۂ خضر پر پڑا ظلمات

دل پرخوں مرا برنگِ حنا !　　لے گیا گلبدن کوں ہاتھوں ہاتھ

۲۔ اب شاید سراجؔ سنائیں ۔

۱۔ ہاں کچھ اشارے ہو رہے ہیں ۔

۲۔ دیکھو لو سراج کے ہاتھ میں بیاض آگئی ۔ کاغذ الٹ رہے ہیں ۔

۱۔ یہ لو انھوں نے شروع کردی غزل ۔

خبرِ تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی　　نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہ بےخودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی　　نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا　　مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

ترے جوششِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں یہاں ہوا　　کہ نہ آئینے میں جلا رہی نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراجؔ کو　　نہ خطر رہا نہ حذر رہا جو رہی سو بے خبری رہی

۲۔ بڑا سوز و گداز ہے سراج کے کلام میں ۔

۱۔ ارے ادھر دیکھو ولی خود سنا رہے ہیں ۔

اگر موہن کرم سوں مجھ طرف آوے تو کیا ہووے
الپس کے اس قد رعنا کوں دکھلاوے تو کیا ہووے

مجھے اس شوخ کے ملنے کا دائم شوق ہے دل میں
اگر اک بار مجھ سوں آئے مل جاوے تو کیا ہووے

رقیباں سوں نہ ملنے میں نہایت اس کو خوبی ہے
اگر دانش کوں اپنی کام فرماوے تو کیا ہووے

ولیؔ کہتا ہوں اس موہن سوں ہر ایک بات پردے میں
اگر میرے سخن کے مغز کوں پاوے تو کیا ہووے

۲۔ دیکھی ولی کی ولایت ۔ یہ شاعری نہیں ساحری ہے ۔

۱۔ کچھ یہی بات تھی کہ ولیؔ کا دیوان جب دلی پہنچا ہے تو جو صدیوں سے فارسی کے رسیا تھے وہ بھی دکن کی بولی پر جان دینے لگے ۔

۲۔ اس دور کی شاعری ہندی کے ساتھ ساتھ فارسی سے بھی متاثر نظر آتی ہے ۔

۱۔ اورنگ زیب کے دور حکومت میں شمال اور جنوب جب ایک دوسرے سے مل گئے تو شمال کی بہت سی خصوصیات دکن والوں نے اپنالیں ۔ اس ملاپ سے شاعری پر جو اثر پڑا ہے اس میں فارسی کا اثر نمایاں تھا ۔

۲۔ مگر ولیؔ اور سراجؔ کی شاعری میں مقامی رنگ بہت کچھ باقی ہے ۔ ان کی شاعری نے ہندی اور فارسی دونوں سے برابر استفادہ کیا ہے ۔ مجنوں لیلیٰ، فرہاد شیریں کے ساتھ ساتھ راون بھیم، ارجن، ہیر رانجھا اور دوسرے مشاہیر کے نام بھی ان کے کلام میں جا بجا نظر آتے ہیں ۔

۲۔ یہ اردو شاعری کے اولین معمار تھے ۔ ان کے بے تکلف انداز بیان سادگی اور بے ساختگی نے دوسروں کے تخیل کو گرمایا اور ان کی فکر کے صاف و شفاف چشموں سے دوسروں نے اپنی پیاس بجھائی ۔

۱۔ زمانے نے پھر ایک کروٹ لی ۔ ادھر مغلوں کے عروج کا آفتاب گہنا گیا ۔ ادھر اورنگ آباد کی رونق اور چہل پہل ختم ہوگئی ۔ آصف جاہ اول کے بعد جب دارالسلطنت اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہوا ہے تو اورنگ آباد کے شعر و ادب کی محفلیں سونی پڑ گئیں ۔ اور ولی اور سراج نے یہاں کی فضاؤں میں جو نغمے بکھیرے تھے انھیں ہوائیں دلی لے اڑیں ۔

(آرکسٹرا)

۲۔ یہ دلی ہے ۔

۱۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کی نہیں بلکہ محمد شاہ اور شاہ عالم کی ۔

۲۔ جیسے مغلوں کی شان و شوکت آخری سنبھالا لے رہی ہے۔
۱۔ ہر طرف سے زندگی سے گریز کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔
۲۔ اس ماحول میں اُردو نے جنا اور ابھرنا سیکھا ہے۔
۱۔ شاعری کا جو چراغ اورنگ آباد میں روشن ہوا تھا اس کے ستارے اب دلّی کے افق پر جگمگا رہے ہیں۔
۲۔ شاعری کی زبان بہت کچھ منجھ گئی ہے۔
۱۔ ہاں دلی کے محاوروں نے زبان کو سنوارا ہے۔
۲۔ ولی اور سراج نے جو دکھنی الفاظ استعمال کئے تھے وہ رفتہ رفتہ متروک ہوتے جارہے ہیں۔
۱۔ مگر ذومعنی الفاظ کا استعمال بہت ہونے لگا ہے
۲۔ اردو شاعری اب فارسی کے سایہ میں پرورش پارہی ہے۔
۱۔ ویسے روز بروز آگے کی طرف بڑھتی جارہی ہے۔
۲۔ ہاں لشکر کی بولی اب قلعہ معلّیٰ کی زبان بن گئی ہے۔
۱۔ وقت بڑا آہستہ گزر رہا ہے۔
۲۔ حرکت و عمل کہیں نام کو بھی نہیں اور زندگی ایک مسلسل ٹھہراؤ کی طرح ہے۔ ان فرصت کے مشغلوں میں تو ہماری شاعری پروان چڑھ رہی ہے۔
۱۔ چلو شعر و سخن کی مجلس میں چلیں۔
(پس منظر میں دھیما شور)
۲۔ دیکھنا یہاں بڑے بڑے اساتذہ بیٹھے ہیں جن کے فیض سے اُردو شاعری میں میرؔ اور سوداؔ جیسے شاعر پیدا ہوئے۔
۱۔ ہاں دیکھ رہا ہوں آرزوؔ، آبروؔ، حاتمؔ، مظہر جان جاناں یہ سب یہاں ہیں۔
۲۔ دیکھتے ہو مظہر جان جاناں کے پاس تاباںؔ کو
۱۔ ہاں ان کے بعد یقینؔ ہیں۔
۱۔ لو مشاعرہ شروع ہو رہا ہے۔

۲۔ شاید آرزوؔ غزل پڑھ رہے ہیں۔

رات پروانے کی الفت سنی روتے روتے
شمع نے جان دیا صبح کے ہوتے ہوتے
داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل!
ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے
کس پری رو سے ہوئی شب کو مری چشم دوچار
کہیں دیوانہ اٹھا خواب سے سوتے سوتے

۱۔ اب بھی وہی سادگی اور لطافت باقی ہے۔ جو ولی اور سراج کا حصہ تھی۔
۲۔ اس دور کے آخر تک یہی رنگ ہماری شاعری پر چھایا رہا بلکہ درد اور تاثر اور زیادہ بڑھ گیا۔
۱۔ لو اب آبروؔ نے غزل شروع کی۔

نین سیں نین جب ملائے گیا! | دل کے اندر مرے سمائے گیا
نگہہ گرم سیں مرے دل میں | خوش نین آگ سی لگائے گیا
تیرے چلنے کی سن خبر عاشق | یہی کہتا موا کہ ہائے گیا
آبرو ہجر بیچ مرنا تھا! | مکھ دکھا کر اسے جلائے گیا

۲۔ دیکھنا اب حاتمؔ کچھ سنا رہے ہیں۔

جب آپ سے ہی گزر گئے ہم | پھر کس سے کہیں کدھر گئے ہم
کیا کعبہ و دیر و کیا خرابات | تو ہی تھا غرض جدھر گئے ہم
آئے تھے مثال شعلۂ سرگرم | جاتے ہوئے جوں شرر گئے ہم
کچھ اپنے تئیں کیا نہ معلوم | کیا آپ سے بے خبر گئے ہم

۲۔ اب مظہر جان جاناں کی باری ہے۔
۱۔ لو انھیں بھی سن لو۔

چلے اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا!
مرا جاتا ہے جی اس بلبلِ بے کس کی غربت پر
کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہرؔ اپنا جان جاں اپنا

۲۔ دیکھنا مظہرؔ اپنے شاگرد یقینؔ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔
۱۔ ارے وہ تو غزل سنانے بھی لگے۔

نہیں معلوم اب کے سال مے خانہ پہ کیا گزرا
ہمارے توبہ کر لینے سے پیمانے پہ کیا گزرا
مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالوں نے
نہیں معلوم میرے بعد ویرانے پہ کیا گزرا

۲۔ سن لی اس دور کی شاعری۔ زبان میں کیسی شیرینی اور بندشوں میں کیسی چستی آگئی ہے۔
۱۔ اس دور کی انتہا بھی دیکھ لیں۔

(آرکسٹرا)

اس کے بعد دھیما دھیما شور

۲۔ یہ میرؔ و سوداؔ کی مجلس ہے ذرا ادب سے۔
۱۔ اچھا یہاں میر درد اور میر سوز بھی ہیں۔
۲۔ سادگی درد اور تاثر میں یہ دور اردو شاعری کی معراج ہے۔ اور اس کی انتہا میرؔ کے یہاں ہوتی ہے۔
۱۔ ذرا سنو میر درد نے بیاض سنبھالی۔

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے ادھر اودھر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

۲۔ ان میں کا ہر شاعر اپنی ذات سے ایک دور ہے۔ دردؔ کے یہاں واردات قلب کے ساتھ تصوف کی چاشنی ہے تو میرؔ کے نغموں میں سوز و گداز ہے۔ سوداؔ کا رنگ ان دونوں سے الگ ہے۔ معنی آفرینی کے ساتھ شکوہ الفاظ ان ہی کا حصہ ہے۔ اور کردار ایسا ہے کہ جیسے یہ شخص زندگی کو ٹھوکریں مار رہا ہے، زندگی کا مضحکہ اڑا رہا ہے۔ اور میرؔ جیسے زندگی کی طرف پیٹھ کئے کھڑے ہیں۔ جو بات نکلتی ہے درد و غم میں ڈوب کر نکلتی ہے اور سننے والوں کے دلوں میں نشتر کی طرح چبھتی جاتی ہے۔
۱۔ یہ سب اپنے ماحول کی پیداوار ہیں۔
۲۔ دیکھنا مرزا رفیعؔ نے غنچہ کو اشارہ کیا۔ وہ لو قلمدان میں سے بیاض نکل رہی ہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں
کیوں کر نہ چاک چاک گریباں دل کروں
دیکھوں جو تیری زلف کو میں دست شانے میں
دست گرہ کشا کو نہ تزئین کرے فلک
مہندی بندھی نہ دیکھی کبھی انگشت شانے میں
ہم سا تجھے تو لاکھ ہیں تجھ سے میں کئی!
جا دیکھ لے آپ کو تو آئینہ خانے میں
سوداؔ خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

۱۔ دیکھنا مرزا نے میر سوزؔ سے بھی پڑھنے کی فرمائش کی ہے۔
۲۔ ہاں ان کے کلام میں بڑا بے ساختہ پن ہے۔

آج اس راہ سے دل رُبا گزرا
جی یہ کیا جانئے کہ کیا گزرا!
آہ ظالم نے کچھ نہ مانی بات
میں تو اپنا سا جی جلا گزرا!
اب تلک یار اس خدا کو مان
پچھلا شکوہ تھا سو گیا گزرا!
رات کو نیند ہے نہ دن کو چین
ایسے جینے سے اے خدا گزرا!
سوزؔ کے قتل پر کمر مت باندھ
ایسا جاتا ہے کیا گیا گزرا!

۱۔ لو اب میر صاحب سنانے والے ہیں۔

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
بہت عالم کرے گا غم ہمارا

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے   رہے گا دیر تک ماتم ہمارا
نہیں ہے مرجع آدم اگر خاک   کدھر جاتا ہے قدِ خم ہمارا
زمین و آسماں زیر و زبر ہیں   نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا
کسو کے بال برہم دیکھتے میرؔ   ہوا ہے کام دل برہم ہمارا

۲۔ لو یہ محفل بھی برخاست ہوگئی۔ اب دلی کی شان و شوکت سسکیاں لے رہی ہے۔ شاہ عالم کے دربار سے لوگ چھٹ چھٹ کر لکھنؤ کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ ذرا سننا جاتے جاتے میرؔ نے پھر ایک نشتر کھینچ مارا۔

محفل برخاست ہے پتنگے   رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر   تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم   یہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
دنیا کا یہ حال اور ہم کو !   کچھ فکر نہیں ہے سو رہے ہیں

(میر کی آواز آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہے آرکسٹرا غمگین راگ چھیڑتا ہے)

۱۔ زمانہ بھی کیسے کیسے سبق دے رہا ہے۔

۲۔ ہاں جو آج ہے وہ کل نہیں رہے گا۔

۱۔ زندگی کی آنکھ میں آنسو کیوں ہیں۔

۲۔ جس عمارت کی بنیاد اپنے خون جگر سے رکھی تھی، وہ اب کھنڈر بن رہی ہے۔

۱۔ ادھر دیکھو ایک شخص کچھ پڑھتا آ رہا ہے۔

(پس منظر میں شور کا ریکارڈ)

۲۔ پیچھے پیچھے لڑکوں کا غول کا غول چلا آ رہا ہے۔

۱۔ پڑھنے کا طرز بھی کچھ عجیب سا ہے۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں !
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہر جا بچھا رہا ہے سبزہ ہرے بچھونے
قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے
بچھوا دئے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارہ
یا سائباں ستھرا یا بانس کا اسارا !
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے سہارا
مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے سہارا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

۱۔ ارے یہ تو نظیر ہے۔

۲۔ ہاں اُردو کا یہ پہلا شاعر جس نے خیالی دنیا کی بجائے زندگی کی حقیقتوں سے اپنی شاعری کا پیکر تیار کیا۔

۱۔ یہ درباروں کا نہیں زندگی کا شاعر ہے۔

۲۔ ابھی تک ہماری شاعری ایک مخصوص جماعت کے جذبات و احساسات کی آئینہ دار تھی۔ نظیر کی شاعری میں سماج کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔

۱۔ ہم اب اردو شاعری کے ایک عجیب دور کے سامنے کھڑے ہیں۔

۲۔ تمہارا مطلب لکھنؤ سے ہے۔

۱۔ ہاں دلی اجڑی تو لکھنؤ آباد ہوا۔ آصف الدولہ کی داد و دہش کے چرچے سن کر دلی کے بڑے بڑے شاعر لکھنؤ جا پہنچے۔ اور

لکھنؤ میں اس وقت شعر و ادب بے کاری کا مشغلہ بنے ہوئے تھے۔
اُردو شاعری لکھنؤ پہنچ کر خالص درباری رنگ میں رنگ گئی۔ اس میں ابتدائی دور کی سی سادگی اور لطافت باقی نہیں رہی۔ وہ بعید از قیاس تشبیہوں اور استعاروں اور الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنس گئی۔

۲۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ میں زبان کی بہت تراش خراش ہوئی۔ زبان کے ضابطے اور قوانین بنے مگر شاعری کو دلی کی سی بلندی نصیب نہ ہوسکی۔

۱۔ لکھنؤ میں استاد شاعروں کے ہزاروں شاگرد ہوتے تھے۔ کچھ درباری رعایت سے اور کچھ فنی تعصب کی بناء پر اساتذہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ شاعری میں ایک دوسرے پر چوٹیں ہوتیں اور آخر میں برا بھلا کہنے کی نوبت آجاتی اور شاعری کے سرپرستوں کے لئے یہ بھی تفریح کا ایک سامان تھا۔ ایک کو نواز کر دوسرے کو اس کے خلاف اکساتے۔

۲۔ لکھنؤ کے شعر و سخن کی مجلس کا رنگ بھی دیکھئے۔

۱۔ ہاں چلو چلیں۔

(آرکسٹرا۔ پس منظر میں شور)

۲۔ دیکھو مصحفی، انشاء، جرأت اور ان کے ساتھ سیکڑوں شاگرد بانکے ترچھے رنگین مزاج بات بات پر اڑنے اور لڑنے والے سب کے سب پرا جمائے بیٹھے ہیں۔

۱۔ مصحفی غزل پڑھ رہے ہیں۔

اک تو تھا آتش سوزاں بدن سرخ ترا شعلے پر شعلہ ہوا پیرہن سرخ ترا
پان کھانے کی ادا یہ ہے تو اک عالم کو خوں رلا دے گا مری جاں دہنِ سرخ ترا
سرخ عیار سے کم نہیں اے دزدِ حنا کفِ رنگین بتاں ہے دہنِ سرخ ترا
مصحفی زخم ہے تیشہ کا ترے ہر مو پر نام ہم کیوں نہ رکھیں کوہکنِ سرخ ترا

۲۔ تو مصحفی نے غزل پڑھی شاگردوں نے تعریفوں کا طوفان اٹھایا حالانکہ سوائے الفاظ کی الٹ پھیر کے غزل میں کچھ بھی نہیں۔

۱۔ انشاء کو بھی سن لو۔

۲۔ ہائے انشاء کو تو زمانہ نے تباہ کیا۔

۱۔ افسوس ہے کہ یہ شخص اس دور میں پیدا ہوا اور اسے اپنی غیر معمولی ذہانت کے بہاؤ کے لئے ناموزوں ماحول ملا۔

۲۔ یہ تو مشہور ہے کہ انشا کو شاعری نے تباہ کیا۔ اور انشا کی شاعری کو سعادت علی خاں کی صحبت نے

۱۔ ساری زندگی ہنسنے اور ہنسانے میں گزار دی اور آخر عمر میں اس طرز کی زندگی کا جو نتیجہ ہونا تھا وہی ہوا۔ ایک زمانے میں خوشی اور مسرت میں جھولتے تھے۔ اور آخر میں صرف آہیں بھرنے لگے تھے۔ دیکھو غزل شروع ہوتی ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں!
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

۲۔ ایک ایک لفظ سے ان کی زندگی کا درد اور غم ٹپکا پڑتا ہے۔

۱۔ اور یہ بھی کہ ان کی ذہانت ماحول کے ہاتھوں کس طرح تباہ ہوئی۔

۲۔ آؤ ذرا ناسخ و آتش کا رنگ بھی دیکھ لیں۔

(آرکسٹرا۔ شور)

۱۔ یہاں سے لکھنؤ کی اصلی شاعری شروع ہوتی ہے۔ ابھی تک تو دلی کا کچھ نہ کچھ اثر باقی تھا۔ مگر اب جو شاعر آتے ہیں وہ سب لکھنؤ ہی کی پیداوار ہیں۔ شیخ ناسخ کو سن لو۔ غزلوں میں اتنے

زیادہ شوکتِ الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی پائی جاتی ہے۔

پونچھتا اشک اگر گوشۂ داماں ہوتا چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا
منہ کو دامن سے چھپا کر جو وہ رقصاں ہوتا شعلۂ حسن چراغِ تہہ داماں ہوتا
اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا
حسرتِ دل نہیں دیتا ہے نکلنے ناسخ ہاتھ شل ہوتے میسر جو گریباں ہوتا

۲۔ لو! خواجہ آتش کی غزل شروع ہونے والی ہے۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد اسیرِ دام، رگِ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے آب و دانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

یاں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تونے کہی عاشقانہ کیا

۱۔ لیجئے غزل ختم ہو گئی۔ خواجہ صاحب کے کلام میں روزمرۂ محاورہ اور بول چال کا لطف بہت ہے اور زبان کا بھی بڑا خیال رکھتے ہیں شیخ صاحب اور خواجہ صاحب کے بعد اُن کے شاگردوں وزیرؔ، رندؔ اور صباؔ کی شاعری میں سوائے کنگھی، چوٹی، موباف اور گل و بلبل کے خیالی افسانوں کے کچھ باقی نہ رہا، اور بعض اساتذہ نے تو ایسے ایسے مضامین باندھے ہیں کہ سن کر ثقاہت کو پسینہ آجاتا ہے۔ شکر ہے کہ میر حسن اور انیسؔ و دبیرؔ جیسے شاعر لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اس کی لاج رکھ لی۔

۲۔ انیس تو ہماری شاعری کا سب سے بڑا رزم نگار شاعر ہے۔

۱۔ آؤ! ان کو بھی سن لیں۔

سمٹا جما اڑا ادھر آیا ادھر گیا چمکا پھرا جمال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا برہم کیا صفوں کو پرے سے گزر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کے فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال کبکِ دری خجل دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال

جو آگیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

۲۔ دیکھو دلی کے افق پر پھر کچھ ستارے جگمگا رہے ہیں۔

۱۔ ہاں اس نے ابھی کچھ لعل و جواہر ایسے چھپا رکھے ہیں کہ وہ ایک آخری بار انھیں زمانے کے سپرد کر دے گی۔

(آرکسٹرا)

۲۔ یہ بہادر شاہ ظفر کی دلی ہے۔

۱۔ غالبؔ مومنؔ اور ذوقؔ اردو شاعری میں دادِ سخن دے رہے ہیں۔

۱۔ جیسے شاعری آسمانوں کی طرف اڑنے لگی ہے۔

۱۔ غالبؔ کی بلندیٔ فکر، مومن خاں کی نازک خیالی اور ذوقؔ کا شکوہ الفاظ ان سب نے اُردو کے پیکر میں ایک نئی جان ڈال دی۔

۲۔ دلی کی تباہی سے سب کے دل بند ہیں گر خیال کی پرواز جاری ہے۔

۱۔ دیکھو شعر و سخن کی محفل گرم ہے۔

(دھیما شور و غل)

۲۔ کیسے کیسے لوگ بیٹھے ہیں جن پر کمال بھی ناز کرتا ہے۔ مفتی آزردہؔ، امام بخش صہبائیؔ، مصطفےٰ خاں شیفتہؔ

۱۔ دیکھو ذوقؔ کے ساتھ ان کے شاگردوں کا ہجوم ہے۔

۲۔ ہاں یہ تو بادشاہ کے استاد ہیں، خاقانیٔ ہند کا خطاب ملا ہے۔

۱۔ مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔ ذوقؔ غزل پڑھ رہے ہیں۔

مرے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے
نہیں ثبات بلندیٔ عز و شاں کے لئے کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے
فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لئے یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے

وبالِ دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے
بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو!
زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے
بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزوِ ضعیف
اور اِس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

۲۔ لیجئے اب حکیم مومن خاں نے غزل شروع کی۔

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی　　خبر ہے لاش پہ اس بے وفا کے آنے کی
سمجھ کے اور ہی کچھ مر چلا میں اے ناصح　　کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنے کی
چلی ہے جان نہیں تو کوئی نکالو راہ　　تم اپنے پاس تک اس مبتلا کے آنے کی
کروں میں دعوۂ غلامی کا شکوہ کس کس سے　　اجل بھی رہ گئی ظالم سنا کے آنے کی
مجھے یہ ڈر ہے کہ مومنؔ کہیں نہ کہتا ہو　　مری تسلی کو روزِ جزا کے آنے کی

۱۔ دیکھنا غزل ختم کر کے کس طرح مرزا کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

۲۔ حکیم صاحب اپنے دور کے کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ہاں مرزا کو کچھ سمجھتے ہیں۔

۱۔ لو اب مرزا کی طرف سب دیکھ رہے ہیں۔ ذوقؔ نے بھی فرمائش کردی۔ مرزا نے آزردہؔ، صہبائیؔ اور شیفتہؔ کی طرف دیکھا اور غزل شروع کردی۔

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی　　قسمت کھلی ترے قد و رخ کے ظہور کی
اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں　　پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج　　اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں　　کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر　　کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی
غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں　　حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

۲۔ لیجئے یہ باکمال بھی اس محفل سے اٹھ گئے جن پر اردو شاعری کو ناز تھا۔ دلی اور لکھنؤ کے بعد کچھ شاعر حیدرآباد چلے گئے اور کچھ رام پور۔ دلی کی طرح غزل گوئی کو داغؔ اپنی شگفتگی اور بے ساختہ پن سے نبھاتے رہے، اور لکھنؤ کے طرز کو امیرؔ نے چمکایا۔ ان اساتذہ پر غزل گوئی کا قدیم رنگ ختم ہوتا ہے۔

۱۔ دیکھو افق پر بجلیاں کوند رہی ہیں، بادل گرج رہے ہیں، فضاؤں میں کیسا طوفان بپا ہے۔

۲۔ یہ نئے زمانہ کی آمد آمد ہے۔

(آندھی اور طوفان کا ریکارڈ)

۱۔ لو اب ہم قدیم سے جدید زمانے میں آگئے۔

۲۔ قدیم اور جدید کی ٹکر سے معاشرہ میں جو ہیجان پیدا ہو گیا تھا اس میں اب کچھ سکون پیدا ہو گیا ہے۔

۱۔ ہاں جدید کی ٹکر سے قدیم نظامِ زندگی کے بندھن ڈھیلے ہو گئے ہیں اور نئی زندگی نے شعر و ادب کے لئے نئے نئے میدان پیدا کر دیئے۔

۲۔ مگر جو لوگ تخلیق و تقلید اور غلامی و آزادی کے فرق سے آشنا نہ تھے، وہ اس جدید کی رو میں بری طرح بہہ گئے۔

۱۔ بعض ایسے بھی تھے جو جدید کو کسی طرح قبول ہی نہیں کرنا چاہتے تھے۔

۲۔ اس دور پر حالیؔ اور اکبرؔ چھائے ہوئے ہیں۔

۱۔ حالیؔ جدید نظام کی اچھائیوں کو قبول کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

۲۔ اور اکبرؔ پرانی معاشرت سے لپٹے رہنا چاہتے تھے۔

۱۔ جدید شاعری کا آغاز تو آزادؔ کی کوششوں سے لاہور میں ہو چکا تھا۔ حالیؔ نے اس پر عمارت کھڑی کرنے کا کام شروع کیا۔ ہماری معاشرت میں جو ٹھیراؤ آ چلا تھا اس میں انھوں نے روانی پیدا کردی۔

۲۔ اکبر کی آنکھ جدید تہذیب کی برائیاں ہی برائیاں دیکھ سکتی تھی۔ انھوں نے اس کی اچھائیوں پر غور نہیں کیا۔ اس لئے ان کے یہاں تلخی اور ایک طرح کا ردِ عمل ہے، اور ان کا طنز انتہا پسندانہ ہے۔

۱۔ اور حالیؔ کی شاعری درد سے بھری ہے۔ انھوں نے مسدس لکھ کر

قوم کے ہاتھ میں ایک آئینہ دے دیا جس میں وہ اپنے خدوخال دیکھ سکتی تھی۔

۲۔ ابھی تک ہماری شاعری میں چند شاعروں کے سوا کسی نے زندگی کی حقیقتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالیؔ اور اکبرؔ نے اس کی ابتدا کی اور ہماری اجتماعی زندگی کی خواہشات اور مطالبات کو ادب میں جگہ دی اور اب شاعری کے سامنے ایک مقصد اور بلند تر نصب العین تھا جس کے لئے وہ آگے بڑھ رہی تھی۔

۱۔ پھر اقبالؔ پیدا ہوتا ہے، جو ان دونوں کا نقش بہتر ہے اور جس نے اجتماعی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور جو ایک ایسی زندگی چاہتا ہے جس میں انسانیت بلند اور محترم ہو جائے۔

۲۔ اقبالؔ نے انسانوں کو ایسا پیام دیا، جو اردو شاعری میں کہیں نہیں ملتا۔ اس نے قناعت کی بجائے حرکت و عمل کی تلقین کی اور تدبیر کے ساتھ تقدیر کو بھی انسان کے ہاتھ میں دے دیا۔

(شور کا ریکارڈ)

۲۔ اکبر سنا رہے ہیں۔ نظم کا عنوان ہے "دلی کا دربار"

سر میں شوق کا سودا دیکھا　　دلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا　　کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا
جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا　　اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا　　حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا
کچھ چہروں پر مردی دیکھی　　کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی　　دل نے جو حالت کردی دیکھی
سرخی سڑک پر کٹتی دیکھی　　سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتشبازی چھٹتی دیکھی　　لطف کی دولت لٹتی دیکھی

۱۔ اکبر کو سن چکے اب حالیؔ کو سن لو۔

بہت دن سے دریا کا پانی کھڑا تھا　　تموج کا جس میں نہ ہرگز پتہ تھا
تغیّر سے یہ حال اس کا ہوا تھا　　کہ مگر [illegible]
ہوئی تھی یہ پانی سے زائل روانی
کہ مشکل سے کہہ سکتے تھے اس کو پانی
پر اب اس میں رو کچھ دکھانے لگی ہے　　کناروں کو اس کے ہلانے لگی ہے
ہوا بلبلے کچھ اٹھانے لگی ہے　　عفونت وہ پانی سے جانے لگی ہے
اگر ہو نہ یہ انقلاب اتفاقی
تو دریا میں بس تموج ہے باقی

(آرکسٹرا استقبالی نغمہ بجاتا ہے)

۲۔ لو اب اقبال کی باری ہے۔

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر　　زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے　　مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں　　مرے دل کی پوشیدہ بےتابیاں
امنگیں مری آرزوئیں مری　　امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے　　لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

۱۔ کر لی تم نے اردو شاعری کی سیر۔

۲۔ ہاں! اس میں کیسے کیسے دور آئے اور گزر گئے۔

۱۔ اور اتنے دور گزرنے کے بعد کہیں اقبالؔ پیدا ہوا ہے

۲۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اشفاق حسین

اطلاع۔ مضمون نگار اصحاب مضامین کی نقلیں اپنے پاس رکھیں۔ ناقابل اشاعت مضامین واپس نہیں کئے جاتے۔ براہ کرم مضامین کی اشاعت کے لئے یاد دہی کی زحمت نہ فرمائیں۔

بیگم صاحبہ کی خریدی

۱۔ آئیے تشریف لائیے۔ اب صرف چند ساڑیاں رہ گئی ہیں۔ کل تک یقین ہے وہ بھی ختم ہو جائیں گی۔ بنارسی ساڑیوں کی اس قدر مانگ ہے کہ ہاتھوں ہاتھ نکل رہی ہیں۔

۲۔ نہیں، ہم کو جلدی جانا ہے۔ ڈرائیور! موٹر بڑھاؤ، عین بازار میں موٹر رک جاتی ہے۔ ایک مرتبہ پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

۳۔ نئے ڈزائین، نئے پلّو، نئے رنگ، قرمزی، دھوپ چھاؤں وغیرہ وغیرہ دکان کا زنانہ حصہ بیگمات سے بھرا ہوا ہے۔ اس قدر بھیڑ ہے کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں ......

۴۔ نہیں اس گرمی میں طبیعت پریشان ہو جائے گی۔

۵۔ مگر آپ کے لئے خاص انتظام ہو گیا ہے۔ آرام دہ کرسی، بجلی کا پنکھا، برف کا پانی۔

۶۔ مگر رنگ ساڑیوں کے اچھے نہیں اور جب سارا مال فروخت ہو گیا ہے، تو دیکھنے سے کیا فائدہ ہے؟

۷۔ جی نہیں، تار دے کر دوسری مرتبہ پھر منگوایا ہے، اور اتنا منگوایا ہے کہ ساری دکان بھری پڑی ہے۔ بنارس کے مشہور کاریگروں کا کام ہے۔ اسی وجہ سے تو یہ ہجوم ہے۔ آپ یہیں تشریف رکھیں چند ساڑیاں منگواتا ہوں۔ دیکھئے یہ کلابتو نئے قسم کا ہے، چاندی سونے کے تار ملا کر کلابتو تیار ہوا ہے۔

۸۔ اسی وجہ سے نہ چاندی ہے نہ سونا۔ اس سے تو موتیوں کی کور اچھی ہوتی ہے۔

۹۔ آپ چاہیں تو چاندی کے تار الگ اور سونے کے تار الگ دکھاؤں اور آج کل اسی کا فیشن ہے۔

۱۰۔ یہ نمونہ تو بہت پرانا ہے..........

۱۱۔ جی بالکل نیا ہے اس سے پہلے بازار میں اس قسم کی ساڑی نہیں آئی۔

۱۲۔ ملکی مبئی کی ساڑیاں جیسی اچھی ہوتی ہیں۔

۱۳۔ مگر اس سال تو بنارسی ساڑیوں کا فیشن ہے، اخبار میں آپ نے ہمارا اشتہار ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ جو ایک مرتبہ خریدتا ہے پھر بار بار لے جاتا ہے۔ کوئی شادی، بیاہ ایسا نہیں جس میں ہماری دکان سے ساڑیاں نہ خریدی گئی ہوں۔

۱۴۔ اسی فضول خرچی کے باعث تو ملک تباہ ہو رہا ہے۔ جنگ کے زمانے میں تو ایسی فضول خرچی روک دینی چاہئے۔

۱۵۔ جی ہاں! مگر بیگم صاحبہ کہیں شادیاں بھی جنگ کے انتظار میں ....

۱۶۔ مگر سادہ کپڑوں کا استعمال بھی تو ہو سکتا ہے۔

۱۷۔ مگر بنارسی ریشمی ساڑیاں ....

۱۸۔ اپنے سنگاریڈی اور نارائن پیٹھ میں بھی اب اچھا مال تیار ہو رہا ہے۔ کس قدر گرمی ہے؟ چھوکرے! برف کا پانی لاؤ۔ لیمن کی دکان شاید یہاں سے دور ہوگی۔

۱۹۔ جی نہیں، زیادہ دور نہیں ہے دوڑ کر جلد دو شیشے لاؤ۔

۲۰۔ برف زیادہ ڈلوانا۔

۲۱۔ موٹر تیار ہے۔

۲۲۔ اچھا! شکریہ! ساڑیاں پھر واپسی میں دیکھیں گے۔

ـــــــ سبحان اللہ

نئی کتابیں

۱۔ شیرِ میسور (سلطان ٹیپو کے حالات) از قیصر مصطفےٰ بی اے۔ حجم ۲۰۰ صفحے قیمت ؏ہ پتہ زمزم بک ایجنسی لاہور۔

۲۔ بچوں کی عام بیماریاں اور ان کا ہومیو پیتھک علاج از ڈاکٹر ایم اے سعید ایم ڈی ہومیو امریکہ حجم ۲۰۰ صفحے قیمت عہ پتہ ایجنل ہومیو پیتھک سٹور اینڈ ہسپتال ۹ نکلسن روڈ لاہور

۳۔ عورتوں کی عام بیماریاں اور ان کا ہومیو پیتھک علاج از ڈاکٹر سعید حجم ۲۰۰ صفحے قیمت عہ پتہ مذکور الصدر

۴۔ نشریات (تقاریر) از پروفیسر ہارون خاں شروانی قیمت عہ پتہ سید عبدالقادر اینڈ سنز تاجران کتب چارمینار۔ حیدر آباد دکن۔

۵۔ جواہر العلوم (علامہ طنطناوی مصری کی عربی کتاب کا ترجمہ) از عبدالرحیم پروفیسر عربی اسلامیہ کالج۔ پشاور حجم ۲۱۱ صفحے قیمت عالہ۔ پتہ کتابستان پوسٹ بکس ۱۶۴۴ بمبئی نمبر ۳

۶۔ گلچیں (مجموعہ کلام) از حکیم نور احمد خاں گلچیں۔ قیمت عالہ پتہ اردو اکیڈیمی۔ لاہور۔

۷۔ شیخ و برہمن اور دوسرے افسانے۔ از ڈاکٹر اعظم کریوی حجم ۳۱۸ صفحے پتہ کتب خانہ دانش محل۔ امین آباد پارک لکھنو۔

۸۔ تسہیل الترتیل (تلاوت قرآن کے متعلق ترتیل کی عام تشریح) از صلاح الدین محمد الیاس برنی حجم ۶۸ صفحے قیمت ۲ر پتہ۔ پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب۔ عثمانیہ یونیورسٹی

۹۔ دُردانہ (مجموعہ مضامین) از محمودہ رضویہ حجم ۶۴ صفحے قیمت عہ۔ پتہ۔ انجمن ترقی اُردو۔ رام باغ۔ کراچی

۱۰۔ مشغلے (تعلیم کے بعد کے مشغلے) از سید وقار احسن۔ قیمت ۲ر پتہ جعفری برادرس۔ الہ آباد۔

۱۱۔ ہندستانیوں کی مختصر تاریخ۔ مترجمہ بول چند ایم اے۔ پروفیسر سیاسیات بنارس ہندو یونیورسٹی حجم ۷۶ صفحے قیمت عالہ پتہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ بمبئی

۱۲۔ لائبریری اور اس کی تنظیم۔ از سید سجاد حسین حجم ۱۹۰ صفحے۔ قیمت ہ۔ پتہ۔ رستوگی اینڈ کمپنی پبلشرز۔ میرٹھ

۱۳۔ گنج ہائے گرانمایہ (چند مشہور لوگوں کے حالات) از پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ قیمت عہ۔ پتہ اردو اکیڈیمی۔ لوہاری دروازہ۔ لاہور

۱۴۔ دھڑکنیں (قطعات) از احمد ندیم قاسمی قیمت ؏ہ پتہ اردو اکیڈیمی۔ لاہور

۱۵۔ تعلیمی کھیلوں کی کتاب۔ از ریورنڈ ڈبلیو ایم۔ رائبرن و پنڈت ہنسراج قیمت ۶ر پتہ پنڈت ہنسراج۔ کرسچین ہائی اسکول کھرڑ۔ انبالہ

۱۶۔ سازِ حیات (جنگی نظمیں) از محمد صغیر اختر صدیقی اکبرآبادی۔ حجم ۴۸ صفحے۔ قیمت ۶ر پتہ غفار احمد صدیقی ۳۶۵ (الف) "باقرلاج" حسن منزل۔ الہ آباد۔

۱۷۔ تاریخ احرار۔ از چودھری افضل حق حجم ۲۶۰ صفحے قیمت عہ پتہ زمزم بک ایجنسی بیرون موری دروازہ۔ لاہور

۱۸۔ شمیم عشرت (مجموعہ کلام سید احمد علی عشرت گیاوی) مرتبہ سید حسن امام۔ حجم ۲۸۴ صفحے۔ پتہ سید حسن امام۔ حسین منزل۔ گیا

۱۹۔ انتظام کتب خانہ۔ از سید بشیر الدین لائبریرین لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی و سید جمیل احمد نقوی امپیریل لائبریری کلکتہ۔ حجم ۱۰۷ صفحے قیمت ۸ر پتہ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی

۲۰۔ ۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں۔ مرتبہ حلقہ ارباب ذوق۔ لاہور۔ حجم ۶۰ صفحے۔ پتہ ارباب ذوق۔ لاہور

۲۱۔ مرقع شہادت (شہادت حسینؑ منظوم) از ضیاء القادری بدایونی۔ حجم ۲۶۴ صفحے۔ قیمت عالہ۔ پتہ محمد اصغر حسین صدیقی۔ فرشوری محلہ۔ بدایون

۲۲۔ مرقع فطرت (مادہ پرستوں کے خیالات کا اجمالی خاکہ) از ڈاکٹر پریم ناتھ۔ حجم ۱۵۲ صفحے۔ قیمت ۱۳ر۔ پتہ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔

۲۳۔ روح ادب از جوش عالہ مکتبہ اُردو۔ لاہور

۲۴۔ منظر و پس منظر از اختر اورینوی عالہ ۸ر مکتبۂ اُردو۔ لاہور

۲۵۔ رفیق تنہائی از علی عباس حسینی۔ قیمت عالہ " " " "

۲۶۔ شبستانِ الم۔ از زبیدہ سلطانہ " ؏ہ " " "

۲۷۔ آہنگ اسرار الحق مجاز " عہ " " "

مرزا سیف علی خاں

انسانی نسب

رچرڈ کنگ نے اس مسئلے پر اپنے خاص انداز میں چند خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دیکھئے شاید ان کو آپ بھی دلچسپ پائیں۔

مجھے اکثر سوچنے کا اتفاق ہوا ہے کہ آخر اس واقعے کی نفسیاتی بنیاد کیا ہے کہ اکثر لوگوں کو گنہگاروں کے کارناموں سے دلچسپی زیادہ ہوتی ہے اور پارساؤں اور نیکوں کے حالات پڑھنے سے کم۔ گنہگاروں کے کارنامے کس قدر رنگین معلوم ہوتے ہیں اور یہ ان پارسا لوگوں کی زندگیاں بجز چند مستثنیات کے ہمیشہ سے بے رنگ کیوں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گنہگار تو گویا اتوار سے پہلے کی رنگین شب ہیں اور پارساؤں کا تخیل بھی گویا اپنے ساتھ اتوار کی دوپہر کی سی سستی اور عدم دلچسپی لاتا ہے! حالانکہ ایسا نہ ہونا چاہیئے، اس لئے کہ پارسا وہ لوگ ہیں جن کی زندگیوں کی ہم تقلید کرنا چاہتے ہیں، خواہ تذبذب کے ساتھ ہی سہی۔ اور گنہگار "سرخ روشنی والی تنبیہہ" ہیں جتنے وہ اشد ہوتے اتنی ہی سخت تنبیہہ کا باعث ہوتے ہیں۔ پھر بھی ہم اس تنبیہہ کی تفصیلات کا بڑا شوق رکھتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا حقیقت میں ہم منافق ہیں؟

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہم گڑھے میں گرنا تو پسند نہیں کرتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر کو یہ بہت پسند ہے کہ کنارے پر سے جھک کر اور جھانک کر اس سارے تماشے کو دیکھیں جو نیچے ہو رہا ہے۔ اگر ہم اپنے ساتھ بھی اتنے ہی ایماندار ہوتے جتنے ہم دوسروں کے معاملے میں ہوتے ہیں تو شاید ہمارے اخبارات عوام کے برے چلن کے قصوں سے اس قدر بھرے نہ ہوتے بلکہ یہ باخدا اور پارسا اشخاص کے حالات اور اقوال سے پُر نظر آتے اس لئے کہ بہرحال باخدائی ہمارا مسلمہ نصب العین ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر اخبارات اس قدر مقدس بننے کی کوشش کریں تو کون کہہ سکتا ہے کہ لوگ اپنے صبح کے یا شام کے پرچے کے لئے اس قدر بے چین نظر آئیں گے۔ نا صاحب! خواہ آپ اس کو تسلیم نہ کیجئے مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہم اس کے تجسس میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں کہ آخر یہ برے لوگ کیا کیا کرتے رہتے ہیں۔ انسانوں کے اچھے اعمال سے ہم میں احساس تحسین تو پیدا ہوتا ہے مگر شاید ہم سرد ہی رہ جاتے ہیں۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ ہم میں سے اکثر کسی ایقان کی بجائے زیادہ تر خوف کی وجہ سے نیک رہتے ہیں۔ کسی انسان کو پکڑے نہ جانے کا ایک معمولی سا موقعہ دے کر دیکھئے وہ اپنی "خوش وقتی" یا بدوقتی کے اعمال کو وہاں تک پہنچا دے گا جہاں کا ذکر کرتے ہوئے بھی وہ کانپ اٹھے گا، اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کا کوئی عزیز سن رہا ہے۔

بہ حیثیت "گرے ہوئے فرشتے" ہونے کے گنہگاروں کے ساتھ ہماری یہ پوشیدہ ہمدردی تعجب خیز ضرور ہے لیکن اگر ہم یہ مانیں کہ ہم اس شاندار ارتقاء کا نتیجہ ہیں جو بندروں سے ہوتے ہوئے ہم تک پہنچا ہے تو شاید یہ مسئلہ اس قدر تعجب خیز نہیں رہتا۔ شاید یہ ہمارا فطری تجسس ہی ہے یا کوئی اور جبلت جو بار بار ظہور کرتی ہے۔ شاید یہ ہمارے اس دور زندگی کا ایک اثر باقی یا دھندلی سی یاد ہے، جب کہ ہمارے دماغوں نے اخلاقیات سے ہماری زندگی کو پیچیدہ نہیں کر پایا تھا اور ہم بڑی بڑی ٹولیوں میں ایک جھاڑ سے دوسرے جھاڑ پر پھاندا کرتے تھے۔ اور جس چیز کو آج ہم بدی کہتے ہیں شاید یہ ہمارے ان قدیم ایام کے بندری تماشوں کی ایک یادگار ہو۔ غالباً ایسا ہی ہے کیونکہ ہم اپنے اندر ایک ایسی کشش دیکھتے ہیں جو ہمیں پوشیدہ طور پر ایسی بہت سی چیزوں کو انگیز کر لینے پر آمادہ کرتی ہے جن کو ہم جرم یا گناہ کہتے ہیں۔ اور کیا تعجب اگر ہماری یہ پوشیدہ دلچسپی جو مجرمین کے کارناموں سے ہوتی ہے۔ حالانکہ اس سے ہمارے اندر ایک احساس بیزاری پیدا ہونا چاہیئے، ایک پوشیدہ تحسین ہو ان کارناموں کی جو بہرحال ایک مہا بندر کے کہے جا سکتے ہیں۔

اب جب کہ انسانی نسب کے شجرے پر بندر کا وجود مسلم ٹھیرا تو یہ سمجھنے میں دقت نہ ہوگی کہ ہمارا تخیل تشدد اور چالاکیوں کے

ان اوصاف کو پسند کرتا ہے۔ جنھوں نے ہزاروں برس کی مشق کے بعد آخرکار نوع انسان کو اس درجے سے بلند کر دیا جس میں وہ اپنے ابتدائی تخلیقی دور میں تھی۔ کیونکہ افسوس ہے کہ انسانی فطرت کی "قلابازیاں" بندری قلابازیوں سے اکثر ملتی جلتی ہوئی ہیں۔ البتہ ہم نے ارتقاء کے ایک طویل دور کی مدد سے ان کو ذرا شستہ اور شائستہ بنا لیا ہے۔ ہم ڈرانے کے کس قدر خواہشمند ہوتے ہیں؟ ہم ٹولیاں یا غول بنانے کے کتنے خواہاں رہتے ہیں؟ اور ہم میں تجسس کس قدر ہوتا ہے کہ ہم ہر وقت نئے نئے تجربے کرنے کے خواہشمند رہتے ہیں؟ اور افسوس کہ ہم کس قدر کم سوچتے ہیں؟ ہم کس قدر خوش ہوتے ہیں جب ہم کوئی ایجاد کر لیتے ہیں لیکن ہم اس ایجاد کو صرف انسانی مفاد ہی کے لئے استعمال کرنے پر کس قدر کم قادر ہوتے ہیں؟ شاید ہمیں اس ایجاد کو انسانی بربادی میں استعمال کرتے ہوئے زیادہ مسرت ہوتی ہے۔ اور ہاں یہ ہماری نہ ختم ہونے والی دلچسپی جو صرف ہم کو اپنے ماحول سے ہوتی ہے! آیا یہ خود ایک بندری صفت نہیں ہے؟ ہم ہر چیز کو جاننا چاہتے ہیں، ہر چیز کو دیکھنا چاہتے ہیں اور ہر چیز کی آزمائش کرنا چاہتے ہیں۔ مگر جب ہم ایک مرتبہ اس کے راز سے واقف ہو جاتے ہیں تو پھر ہم اس نئی معلوم کردہ شئے سے کس قدر بیزار سے ہو جاتے ہیں؟ اور اسی توجہ کو مرکوز نہ رکھ سکنے، یاد نہ رکھ سکنے، اور تعمیری کام نہ کر سکنے کی بندری صفات ہی نے تو شاید انسانی "ترقیوں" کی تاریخ کو بیسیوں فنون کی گم گشتگی اور کئی تمدنوں کے زوال اور معدومیت کی تاریخ بنا کر رکھ دیا ہے!

یہ صحیح ہے کہ غیر معلوم کے متعلق تجربے کرنا اور زندگی کے مادی واقعات کے متعلق انسان کا تشفی نہ پانے والا تجسس ہی وہ چیز ہے، جس نے انسانوں کو دنیا کا حاکم بنا دیا ہے لیکن کیا واقعی ہم دنیا پر حکمران رہے ہیں گو ہم اس کے حاکم بن گئے ہیں؟ کیا ہماری لامتناہی بےچینیاں ہمیں آخرکار کمزور نہ کر دیں گی۔ یہاں تک کہ انسانی زندگی اس کرۂ ارض پر سے ختم ہی ہو جائے؟

ہم اپنے جذبات میں بھی تکلیف دہ طور پر بندری انداز کے معلوم ہوتے ہیں! ہم اپنے مذہبی معاملات میں بھی تو بعض وقت اپنی اصل کا پتہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے! انجیل کا شیطان بھی صاف طور پر ایک بندری شیطان نظر آتا ہے اور سانپ جیسا کہ معلوم ہے وہ چیز ہے جس سے بندر سب سے زیادہ ڈرتے ہیں۔

بہر حال اس مادی خیال کے اثر سے باز رہنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ایک ارتقاء جو بندروں سے شروع ہوا ہو اور منطقی طور پر قدم بہ قدم آگے بڑھتا گیا ہو، وہ فطرتاً ایک ایسی ہی ہستی کی پیدائش پر منتج ہو سکتا تھا جو ناگوار طور پر انسان سے مشابہ ہو۔ ہم جس چیز کو فطرت انسانی کہتے ہیں وہ بندری فطرت سے کس قدر قریبی تعلق رکھتی ہے؟ حتیٰ کہ اگر آپ کسی بندر کے چہرے کو غور سے دیکھیں تو آپ کے اندر یہ ناگوار احساس پیدا ہوگا کہ آپ کسی مسخ شدہ شکل کے انسان کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ دماغ جو اُن آنکھوں میں سے آپ کی طرف دیکھ رہا ہے انسانی خیالات سوچتا رہتا ہے گو تجسس کا پہلو اس میں غالب ہوتا ہے۔

اور لطف تو ملاحظہ ہو کہ اگر انسان بندر ہی کی نسل سے تھا تو تھا اس کو اتنی طویل مدت کے ارتقاء کے بعد بھی اپنی بہت سی چیزوں میں اس سے مشابہت باقی رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پر کیا کریں کہ بندر بھی تو ابتدائی حیثیت سے انسان کا ساتھ۔ پھر افسوس ناک تر یہ کہ ہم سے کہا جاتا ہے کہ گو ہم نے اپنے اظہار کے طریقوں کو مختلف بنا لیا ہے تاہم اس اندرونی اور بنیادی حقیقت میں جو اعمال و افکار کا منبع ہے ہم کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں یہ رشتہ تسلیم کر لینا چاہئے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ انسان اگر بجائے بندر کے کتے سے ارتقاء پاتا تو زیادہ

بہتر ہوتا کہ کم از کم کتے کی فطرت بندر کی فطرت کے مقابلے میں زیادہ قابلِ اعتماد معلوم ہوتی ہے!

پھر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم بلندی سے گرے ہوئے فرشتے ہیں یا پستی سے بلندی پر پہنچے ہوئے بندر؟ اے کاش اس قدر زیادہ شہادت دوسری صورت کی موافقت میں نہ ہوتی!

ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ ابتدائی دور میں اس سلسلے کے اندر کہیں ایک بلی بھی ضرور آگئی ہوگی اور وہ اپنا سلسلۂ نسب اسی سے ملانا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ انھیں راحت وسکون زیادہ پسند ہیں اور وہ غول بندی سے نفرت رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے مغربی ساحل کے شہر میں جب وہ اس واحد مختصر سے ہریاول کے چپہ پر بیٹھتے ہیں جو تعمیر کے بغیر چھوڑ دیا گیا ہے' تو دیکھتے ہیں کہ اس کے بیچ میں ایک بینڈ اسٹینڈ ہے اور وہ خاصا اچھا ہے۔ وہ دن میں تین مرتبہ والز اور فاکس ٹراٹ بجاتا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ یہ بینڈ آج کل مغرب کے ایک اعلیٰ درجے کے استاد کی موسیقی پیش کرتا ہے جس کے سننے سے موسیقی کے شوقینوں کو کم از کم یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کی موسیقی سن رہے ہیں اور اس سے محظوظ بھی ہو رہے ہیں۔ خیر تو اس بینڈ اسٹینڈ کے اطراف انسانوں کے گلّے غول در غول' ٹھی ٹھی ٹھا ٹھا کرتے ہوئے چکر لگاتے رہتے ہیں اور سوائے ایک دوسرے کو دیکھنے کے ان کو اس وقت کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی اور پھر ان کے اطراف ذراہٹ کر ایک اور غول بیٹھا ہوا ان کو دیکھا کرتا ہے اور پھر اس خطۂ زمین کے اطراف کے جو مکانات ہیں ان کی سیڑھیوں پر بھی جا بجا کھڑے ہوئے لوگ اس مجمع کی دلچسپیوں میں محو نظارہ ہوتے ہیں۔ ان اطراف کے مکانوں کی کھڑکیوں میں سے بھی بعض جھانکنے والی آنکھیں اس پورے منظر کو دیکھتی رہتی ہیں۔ اور شاید غور کرتی اور ذہنی نوٹ لیتی رہتی ہیں۔ غروب آفتاب کے ایک شاندار منظر نے سمندر کو آتشیں رنگ بنا دیا ہے۔ سر پر نیم شفاف آسمان کا زردی مائل نیلا رنگ گہرے نیلم کے رنگ میں بدل رہا ہے لیکن اس غول پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اس کو دیکھتے ہی نہیں۔ ایک سرخ ٹوپی والی میم کی سرخ ٹوپی کے مقابلے میں جس نے مجمع کے لئے کسی قدر جاذبیت پیدا کرلی تھی' مذکورۂ بالا منظر ان کی نظر میں پھیکا تھا!

پھر میرے ذہن میں ایک تصویر پھر جاتی ہے کہ اگر واقعی کوئی نسل بندروں سے پیدا ہوئی ہو تو اس کا اندازہ کیا ہوسکتا ہے! مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ ہاں بظاہر اس سے مفر نہیں معلوم ہوتا! بحیثیت "گرے ہوئے فرشتوں" کے تو ہم ناکام ہیں۔ لیکن بہ حیثیت ترقی یافتہ بندر کے۔ کیا معلوم کہ ابھی کیا کیا "ترقیاں" "انسان" اپنے حدود کے اندر حاصل کرنے والے ہیں۔

لطیف احمد فاروقی

ادارہ کی خبریں

شاخ پرلی مولوی اشرف الدین صاحب فیضی ۲۰ مئی ۱۹۴۲ء روز پنجشنبہ صبح آٹھ بجے بیڑ پہنچے موٹر اسٹانڈ پر مولوی شمس الدین احمد صاحب جاگیردار اور مولوی سید ضیاء الدین صاحب قادری نے استقبال کیا۔ جاگیردار صاحب موصوف نے قیام و طعام کا بہترین انتظام فرمایا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوکر مولوی بشیر الدین احمد صاحب بشیر اور دیگر علم دوست حضرات کے ہمراہ مولوی انوار الحسن صاحب فاضل دیوبند کے گھر پہنچے اور بہت دیر تک ادارۂ ادبیات اردو سے متعلق تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ جمیع حضرات نے قیام شاخ کی تجویز کو پسند فرمایا اور یہ طے پایا کہ رات میں ۸ بجے دارالمطالعہ بیڑ میں ایک جلسہ منعقد کیا جائے چنانچہ اسی وقت مولوی صاحب موصوف نے مقامی علم دوست حضرات میں اس کا اعلان کردیا۔ وقتِ مقررہ پر دارالمطالعہ بیڑ میں فیضی صاحب نے ادارہ کے اغراض و مقاصد پر کافی روشنی ڈالی اور قیام شاخ کی تجویز پیش کی جو باتفاق آرا منظور ہوئی۔ مولوی وہاب الدین صاحب صدیقی معتمد مقرر کئے گئے۔ مولوی عظیم الدین صاحب منشی فاضل (پنجاب) اور مولوی انوار الحسن صاحب فاضل (دیوبند) بالطور خاص شکریہ کے مستحق ہیں کہ جنھوں نے اردو فاضل کے امیدواروں کی تعلیم کے لئے وقت دینے کا وعدہ کیا۔

نیکنور ضلع بیڑ فیضی صاحب کی کوششوں کی بدولت نیکنور سے جتنے امیدوار ۱۹۴۱ء میں شریک ہوئے تھے بفضلہ تعالیٰ وہ کامیاب ہوئے۔ اس سال بتاریخ ۲۳ مئی ۱۹۴۲ء کو فیضی صاحب یہاں پہنچے جب ہدایات شاخ پرلی یہاں برابر کام ہو رہا ہے۔ جناب مولوی سید عبدالوہاب صاحب قادری، محترمہ نعیم النسا بیگم صاحبہ کو ادارے کے کاموں سے خاص دلچسپی ہے چنانچہ دو سال سے یہ سب مسلسل کام کرتے چلے جا رہے ہیں ان حضرات کا خلوص اور ایثار قابل ستائش ہے۔

فتح آباد ضلع بیڑ یکم جون ۱۹۴۲ء کو ۳ بجے فیضی صاحب فتح آباد پہنچے گزشتہ سال یہاں ہمیں کوئی کام کرنے والا نہ مل سکا جس کے باعث یہاں کے امیدواروں کو بغرض تعلیم پرلی بلوایا گیا تھا۔ اس سال شاخ پرلی کی توجہ دہانی پر محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ امیدواران ذکور و اناث کو بڑی توجہ اور پورے انہماک سے تعلیم دے رہی ہیں۔ یہاں سے بھی "اردو دانی" اور "اردو زبان دانی" میں امیدوار شریک کئے گئے ہیں۔

گنگاکھیڑ ضلع پربھنی مولوی غلام حسن صاحب صدیقی اور مولوی اشرف الدین صاحب فیضی بتاریخ ۴ جون ۱۹۴۲ء رات کی ٹرین سے ایک بجے گنگاکھیڑ پہنچے مولوی محمد اکبر خاں صاحب چشتی انھیں لینے اسٹیشن آئے تھے۔ ۵ جون ۱۹۴۲ء کو امیدواران اردو دانی کی تعلیمی حالت دیکھی گئی۔ جو امیدوار شرکت امتحان کے قابل تھے اُن کا انتخاب کیا گیا۔ اور تعلیم سے متعلق مفید مشورے دئے گئے۔

دھرماپوری ضلع بیڑ چند روز قبل حسنِ اتفاق سے جناب تحصیلدار صاحب دھرماپوری پرلی آئے ہوئے تھے۔ مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد، خاص طور پر صاحب موصوف سے ملے، ادارۂ ادبیات اردو کی ہمہ گیر اور ہمہ رس افادیت اور شاخ پرلی کی موجودہ ترقی پذیر حیثیت کو واضح کر کے تحصیلدار صاحب کو اس امر پر آمادہ کیا کہ صاحب موصوف اپنے مستقر یعنی دھرماپوری میں ادارۂ ادبیات اردو کی شاخ قایم کرنے میں ہماری اعانت فرمائیں چنانچہ صاحب موصوف نے حتمی وعدہ فرمایا کہ اگر آپ دھرماپوری آئیں تو امداد میں کوتاہی نہ ہوگی۔ اس قرارداد کے تیسرے دن ہی یعنی ۱۲ جون ۱۹۴۲ء کی صبح معتمد صاحب، حکیم محمد فخر الدین منشی فاضل (پنجاب) صدر شاخ پرلی کو اپنے ہمراہ لیکر بقصد دھرماپوری روانہ ہوگئے۔ تحصیلدار صاحب کے ایک قریبی عزیز ساتھ ہوگئے۔ گھاٹ ناندورہ کے اسٹیشن پر ۸ بجے پہنچے، وہاں سواریاں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ بہرحال تقریباً ۳ گھنٹے میں، تین کوس کا فاصلہ طے کر کے ۱۱ بجے کے قریب دھرماپوری پہونچ گئے۔ جناب تحصیلدار صاحب اکثر معززین کو اپنی معیت میں لئے ہوئے ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں خاص طور پر بستی میں ہمارے آنے کی غایت

اور جلسہ کے انعقاد کا اعلان ہو گیا۔ تین بجے کے قریب جناب تحصیلدار صاحب ہی کے دولت کدہ پر تقریباً ڈیڑھ دو سو اشخاص کا اجتماع ہو گیا۔ یہ مجمع زیادہ تر پڑھے لکھے اور باخبر افراد پر مشتمل تھا کیونکہ ہمارا خطاب بیشتر انہی لوگوں سے ہے۔ سب سے پہلے مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد نے ادارۂ ادبیات اردو کی مختصراً تاریخ اس کے قیام کی غایت، اردو کی ترقی اور نتیجتاً فرقہ داری میل جول، سالانہ امتحانات اور تعلیم کی نوعیت غرض کہ ان میں ہر چیز کو واضح کیا اور مقامی افراد کو آمادہ کیا کہ وہ خود مع اپنے متعلقین کے اس سے فوری استفادہ کریں۔ صدر نے بھی تائیداً تقریر کی چنانچہ اسی وقت شاخ کا قیام عمل میں آیا۔ جناب حاجی سید محبوب صاحب صدر شاخ مسٹر رام لال صاحب زمیندار نائب صدر اور بیشکار صاحب دھرما پوری معتمد بنائے گئے۔

شاخ کی تاسیس و تشکیل سے فارغ ہوتے ہی امیدواروں کے لیے کوشش کی گئی۔ چنانچہ دو تین گھنٹے کی دوا دوش اور رام لال صاحب (جو یہاں کے ایک لکھپتی اور معزز ترین فرد ہیں) کی خاص کوشش سے امیدوار فراہم ہو گئے۔ ان سب امور کو حسب دلخواہ طے کر کے ہم شب میں پرلی واپس ہو گئے اور اس طرح الحمد للہ ہمارا یہ دورہ توقعات سے بھی زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوا۔

سائیگاؤں ضلع بیڑ | ۱ / جون ۱۹۴۲ء کو مولوی اشرف الدین صاحب فیضی بغرض دورہ راہی سائےگاؤں ہوئے۔ بارش کی وجہ سے مومن آباد میں قیام رہا۔ دوسرے دن صبح وہاں سے سائیگاؤں پہنچے۔ اہالیان قصبہ اور معززین جاگیر سے بارہ بجے تک ملاقاتیں کیں۔ نماز جمعہ کے بعد ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا۔ فیضی صاحب نے ادارہ کے اغراض و مقاصد اور شعبہ اردو امتحانات پر کافی روشنی ڈالی چنانچہ اسی جلسہ میں کئی امیدواروں نے شرکت امتحان پر آمادگی کا اظہار کیا۔ مولوی سید منصور علی صاحب جعفری جاگیردار نے تعلیم کے لیے اپنا وقت دینے کا وعدہ فرمایا اور آپ ہی کی معتمدی میں شاخ کا قیام اور دیگر عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

اس سفر میں مولوی شیخ حسین صاحب رکن ادارہ کو بطور خاص فیضی صاحب نے اپنی معیت میں رکھا تھا تاکہ صاحب موصوف دورہ میں کام کرنے کے طریقے، جلسوں کے منعقد کرنے کی تدبیریں اور اسی قسم کے دوسرے کاموں سے عملی طور پر آگاہ ہو جائیں۔ الحمد للہ کہ صاحب موصوف نے بڑے غور اور دلچسپی سے ادارے کے کاروبار اور طریق عمل کا مطالعہ کیا۔

مومن آباد ضلع بیڑ | جناب مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد اور جناب مولوی اشرف الدین صاحب فیضی نائب معتمد شاخ پرلی کا ایک عرصے سے یہ خیال تھا کہ تعلقہ مومن آباد میں جہاں عہدہ داران مال و عدالت اور اکثر علم دوست حضرات کا مستقر ہے ادارہ کی شاخ قائم کی جائے چنانچہ اسی غرض سے معتمد صاحب و نائب معتمد صاحب نے کئی مرتبہ مومن آباد کا سفر کیا اور اپنی کوششوں سے وہاں کی فضا کو اپنے موافق بناتے رہے۔ پانچ سات ماہ کی مسلسل کوشش اور آمد و رفت کا نتیجہ آخر کار بر آمد ہوا چنانچہ ۲۶ / جون ۱۹۴۲ء ایک جلسہ عام کا اعلان کیا گیا۔ غضنفر منزل میں یہ جلسہ ترتیب دیا گیا تھا الحمد للہ کہ اکثر علم دوست حضرات اور اساتذہ صاحبان مدرسہ فوقانیہ نے دلی شوق سے شرکت فرما کر اپنی علم دوستی اور باخبری کا ثبوت بہم پہنچایا جلسہ ہذا کی کارروائی کا بصدارت عالیجناب مولوی سید احمد حسین صاحب بی۔ ایس۔ سی۔ ال۔ ال۔ بی (علیگ) آغاز کیا گیا۔

معتمد صاحب شاخ پرلی نے ایک بسیط تقریر کی جس میں ادارہ ادبیات اردو کے اغراض و مقاصد اور موجودہ زمانہ میں اس کی اہمیت کو ایک انداز خاص میں بیان کیا آخر میں اس امر پر حاضرین کو آمادہ کیا کہ مومن آباد کی وسعت اور اہل علم کی موجودگی اس امر کی مقتضی ہے کہ یہاں بھی ادارۂ ادبیات اردو کی ایک شاخ قائم کی جائے۔ اس کے بعد مولوی اشرف الدین صاحب فیضی نے تفصیلی طور پر اپنی تقریر میں بتایا کہ شاخ کس طرح قائم کی جا سکتی ہے، صدر، معتمد اور نائب معتمد کے فرائض کی نوعیت کیا ہے، کس طرح لوگوں میں ادبی ذوق پیدا کیا جائے۔ ساتھ ہی

اس کے ادارے کے اردو امتحانات کی اہمیت اور اس کے مادی مفادات کو
ایسے دل نشین طریقہ سے ظاہر کیا کہ حاضرین بے حد متاثر ہوئے چنانچہ
اسی جلسہ میں ادارہ کی شاخ کا اعلان کیا گیا اور مندرجۂ ذیل عہدہ داروں
کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر جناب مولوی میر غضنفر علی صاحب وکیل، معتمد جناب مولوی
شبیر حسین صاحب۔ نائب معتمد مولوی خواجہ محمد شمس الدین صاحب فاروقی
بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) خازن۔ جناب حاجی مولوی امام الدین صاحب وغیرہ۔

اخفائے حقیقت ہوگا اگر اس سلسلے میں جناب مولوی میر غضنفر علی
صاحب وکیل مومن آباد کی اعلیٰ شخصیت، ان کی علم دوستی اور ادب نوازی کا
ذکر نہ کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ مومن آباد کا یہ جلسہ بہت کچھ صاحب ممدوح
ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ صاحب ممدوح کی کوششوں کے علاوہ جناب
مولوی خواجہ محمد بدیع الدین صاحب کی دلچسپی اور عملی تعاون کو بھی فراموش
نہیں کیا جا سکتا۔

شاخ رینا پور | ۵ جولائی ۱۹۴۲ء ۵ بجے شام کو ایک جلسہ عام بمقام
مدرسہ تحتانیہ بصدارت مسٹر گووند راؤ صاحب صدر مدرس مدرسہ ہذا منعقد
کیا گیا۔ جلسہ کا آغاز حمد سے ہوا۔ حمد کے بعد ترانۂ دکن پڑھا گیا۔ معتمد شاخ
ہذا نے جلسہ کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے ضرورت علم پر روشنی ڈالی
اور اغراض ادارہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد مولوی
امجد الدین صاحب فاروقی نے ضروریات اردو کے متعلق اپنے خیالات کا
اظہار کرتے ہوئے۔ یہ بیان کیا کہ ان پڑھ اور جاہل لوگوں کو چاہئے کہ وہ
جاہلیت کا داغ اپنی پیشانی سے دور کردیں اور موقع کو غنیمت سمجھ کر
فائدہ حاصل کریں۔ اردو کی دولت سے بہرہ ور ہوں جس کی زندگی کے ہر
شعبہ میں ضرورت ہے اس کے بعد مولوی احمد محی الدین صاحب صدیقی نے
اردو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں صدر ادارہ نے اپنے
روشن خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو کی تعلیم کو مولوی امجد الدین صاحب
فاروقی و مولوی احمد محی الدین صاحب صدیقی کے زیر تفویض کیا۔

حضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ و خاندانِ آصفیہ کے لئے
دعا مانگی گئی اور جلسہ ۷ ۱/۲ بجے برخاست ہوا۔ شاخ ہذا سے ۱۴ امیدوار
امتحان اردو دانی میں شریک کرائے گئے اور معتمد شاخ ہذا و مولوی
احمد محی الدین صاحب و مولوی امجد الدین صاحب ان کو تعلیم دے رہے ہیں۔
نیز صدر ادارہ سے شاخ ہذا کی منظوری بھی مورخہ ۲۶ جون ۱۹۴۲ء
وصول ہو چکی ہے جو باعث مسرت ہے۔ شاخ ہذا کے جملہ متعلقین کی جانب سے
صدر ادارہ کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ نیز مولوی غلام حسن صاحب صدیقی
معتمد و مولوی اشرف الدین صاحب فیضی نائب معتمد شاخ پرلی کا شکریہ ادا
کیا جاتا ہے۔ قصبہ ہذا کے شرکائے امتحان سنٹر پرلی سے امتحان دیں گے۔

شاخ کلیانی | حسب سال گزشتہ امسال بھی امیدواروں
کی ایک معقول تعداد امتحانات ادارہ میں شریک کرائی گئی ہے اس وقت
تک شرکا کی تعداد ۸۰ تک پہنچ چکی ہے اور ابھی مزید طلبہ شریک ہونے کے
امکانات ہیں۔

شاخ کی جانب سے تعلیم کا انتظام کردیا گیا ہے معلمین میں خاص
طور پر حسب ذیل اشخاص قابل ذکر ہیں۔

۱۔ مولوی عبدالکریم صاحب شریک معتمد۔ ۲۔ مولوی غلام معین الدین صاحب رکن تشہیر
۳۔ مولوی سید قادر صاحب اردو عالم۔ ۴۔ مولوی سید منظور احمد صاحب اردو عالم۔
۵۔ مولوی محبوب علی صاحب مدرس انجمن اسلامیہ ۶۔ مولوی حمید الدین صاحب۔

مولوی عبدالکریم صاحب شریک معتمد ادارہ و مولوی قاضی الدین صاحب مینگا
مدرس مدرسہ وسطانیہ اور مولوی غلام معین الدین صاحب رکن تشہیر کی کوششوں
سے اس سال شرکا امتحانات کی تعداد سال گزشتہ سے بڑھ گئی ہے۔ مولوی
نیر الدین صاحب ناظم دار المطالعہ کی نگرانی میں مطالعہ خانہ کا کام ٹھیک طور پر
چل رہا ہے۔ دار المطالعہ میں رہبر دکن، نیا سب رس اور دیگر رسائل
وصول ہوتے ہیں اور پبلک ان سے مستفید ہوتی ہے اس کے علاوہ
صدر ادارہ اور دیگر حضرات کی معطیہ کتب کی بھی ایک خاصی تعداد جمع ہو چکی
ہے اور اس میں برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں عالیجناب

نواب سید جمال الدین حسین خاں بہادر دام اقبالہٗ والیٔ اسٹیٹ کلیانی و سرپرست شاخ ادارہ ہٰذا نے دارالمطالعہ کو "باب الفیض" سے موسوم فرماتے ہوئے مشاعرۂ دائرۃ الشعراء بنگلور کا ایک گلدستہ "شعرستان" نامی مرحمت فرمایا یہ مشاعرہ ۱۹۴۱ء میں آپ کی صدارت میں بمقام بنگلور منعقد ہوا تھا۔ اس ماہ میں مولوی میر نذیر الدین صاحب مددگار مدرس مدرسہ وسطانیہ کلیانی نے بھی "صرف پاکستان" نامی کتاب دارالمطالعہ کو عطا کی ہے اگر کلیانی کے دیگر علم دوست حضرات بھی اسی طرح کتب عطا فرماتے رہیں تو کتب خانہ کی افادیت بہت بڑھ جائے گی۔ ہم ساکنان کلیانی سے مستدعی ہیں کہ ہماری یہ استدعا صدا بہ صحرا ثابت نہ ہوگی۔

شاخ پربھنی

شاخ پربھنی کے پیش نظر اردو امتحانات کی ترویج اور ادارۂ ادبیات اردو کے شاخوں کے قیام کے سلسلہ میں پہلے ہی سے ایک پروگرام تیار تھا جس کو آخر امرداد میں روبہ عمل لایا گیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۲۹ رجون ۱۹۴۲ء کو حسب الحکم عالیجناب مولوی سید عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری سرپرست اعلیٰ شاخ پربھنی۔ مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد شاخ پربھنی اور مولوی عبدالرزاق صاحب فاروقی رکن انتظامی سب سے پہلے پورنا روانہ ہوئے پورنا میں مولوی عبدالحمید خاں صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ کے پاس قیام رہا۔ موصوف ایک خوش اخلاق اور علم دوست نوجوان ہیں۔ ادارے کی شاخوں کے قیام کے متعلق تفصیلی گفتگو رہی اس سلسلہ میں ہاں کے معززا ور تاجر صاحبان سے بھی ملاقات ہوئی جن میں خاص طور پر مولوی امان الدین صاحب صدر مدرس اور مولوی نظام الدین صاحب مدرس اور محمد یوسف صاحب تاجر اور مسٹر لکشمن راؤ قابل ذکر ہیں مولوی عبدالحمید خاں صاحب مدرس مولوی امان الدین صاحب مدرس اور مولوی غلام احمد صاحب صابری اہلکار محکمہ پولیٹیکل کی کوششوں سے عنقریب شاخ کا قیام عمل میں آئے گا یہاں سے چند طلبہ شریک امتحان ہوئے۔ شیدا صاحب نے ادارۂ ادبیات اردو کے کام اور ارباب ادارہ سے واقف کرایا دوسرے دن معتمد صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب مانوت روانہ ہوئے۔

۳۰ رجون ۱۹۴۲ء ۵ بجے شام میں اسٹیشن مانوت روڈ پہنچ کر ذریعہ خانگی بس مستقر مانوت شب میں ۸ بجے پہنچے یہاں مولوی محمد یعقوب صاحب زمیندار کے پاس قیام رہا مختلف حضرات سے ملاقات ہوئی جن میں خاص طور پر سید حبیب صاحب، عبدالشکور صاحب، محمد امیر صاحب، عبدالغفور صاحب اور عبدالستار صاحب تاجر اور خاص کر مولوی سالار خاں صاحب انسپکٹر آبکاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں مولوی سالار خاں صاحب انسپکٹر نے خاص طور پر گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا ادارہ اور ارباب ادارہ سے روشناس کرایا گیا اور قیام شاخ کے متعلق تفصیلی گفتگو ہوئی مولوی سالار خاں صاحب انسپکٹر آبکاری اور مولوی محمد یعقوب صاحب کی کوششوں سے عنقریب شاخ کا قیام عمل میں آئے گا۔ یہاں سے ۲ طلبہ شریک امتحان ہوئے۔ یہاں سے شیدا صاحب اور عبدالرزاق صاحب راہی سیلو ہوئے۔

۲ رجولائی ۱۹۴۲ء کو شاخ پربھنی کے سرگرم معتمد حمید اللہ خاں صاحب شیدا اور مولوی عبدالرزاق صاحب فاروقی سیلو پہنچے اسٹیشن پر مولوی محمد یوسف صاحب اہلکار ڈویژن سیلو اور مولوی ممتاز علی خاں صاحب مدرس موجود تھے دونوں حضرات کو اردو علم و ادب کا اچھا ذوق ہے۔ سیلو مولوی محمد فاروق صاحب ایچ سی ایس دوم تعلقدار کی نگرانی میں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ قیام شاخ کے سلسلہ میں مختلف علم دوست حضرات سے ملاقات ہوئی جن میں خاص کر مولوی عبدالواحد صاحب مدرس مولوی بسم اللہ خاں صاحب زمیندار۔ سید موسیٰ صاحب اہلکار اور دیگر تاجر صاحبان قابل ذکر ہیں۔

شیدا صاحب نے مختصر مگر جامع طور پر ادارہ ادبیات اور اس کی خدمات کو تمام سے روشناس کرایا اور قیام دارالمطالعہ کے لئے حاضرین سے اپیل کی اس کے بعد مولوی عبدالرزاق صاحب نے اردو امتحانات کی اہمیت پر کافی روشنی ڈالی مولوی محمد یوسف صاحب اور ممتاز علی خاں صاحب مدرس کی علمی دلچسپیوں سے توقع ہے کہ شاخ کا اعلان کیا جائے گا۔

۳ رجولائی ۱۹۴۲ء کو مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیدا اور مولوی

عبدالرزاق صاحب فاروقی آشٹی روانہ ہوئے۔ آشٹی اسٹیشن ساتونہ سے ۱۲ میل دور واقع ہے جہاں ہم ذریعہ بنڈی ۶ گھنٹے کے بعد دن میں ۲ بجے پہنچے جہاں مولوی عبدالکریم صاحب، مولوی احمد عبدالعزیز صاحب۔ حکیم صاحب یونانی ہماری آمد کے منتظر تھے۔ شام میں ۵ بجے مولوی غلام احمد صاحب زمیندار آشٹی کی صدارت میں ایک جلسہ منایا گیا جس میں اکثر علم دوست حضرات شریک تھے جن میں ہندو بھائیوں کی بھی کثیر تعداد شریک ہوئی جو مولوی غلام احمد صاحب زمیندار کے خلوص کا نتیجہ تھا جلسہ کی ابتدا ترانہ اقبال سے ہوئی سب سے اول غلام ربانی طالب علم نے ترانۂ اقبال خوش الحانی سے پڑھا اس کے بعد مولوی شیدا صاحب معتمد شاخ پربھنی نے اردو کی ہمہ گیری اور ادارہ ادبیات اردو کی اردو خدمات کو تفصیلی طور سے حاضرین کو روشناس کرایا دوران تقریر میں معتمد صاحب نے فرمایا کہ دکن میں اردو کی خدمت میں اگر کوئی ادارہ سرگرم عمل ہے تو وہ صرف ادارہ ادبیات اردو ہی ہے" جس کی بنیاد ملک کے مایۂ ناز سپوت ڈاکٹر زور صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے ۱۹۳۱ء میں ڈالی جو اب تک برابر سرگرم عمل ہے اس لئے ہر بہی خواہ ملک و مالک کا عین فریضہ ہے کہ وہ ادارے کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائیں اور سرگرمی سے حصہ لیں اردو امتحانات اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک گھنٹہ کے بعد تقریر ختم ہوئی۔ اس کے بعد مولوی عبدالرزاق صاحب نے بھی ادارۂ ادبیات اردو کی شاخوں کی اہمیت اور اس کے قیام پر زور دیتے ہوئے قیام شاخ کی تحریک پیش کی جس کی تائید مولوی عبدالکریم صاحب نے کی اور بہ غلبۂ آرا یہ طے پایا کہ آشٹی میں شاخ قائم کی جائے اس کے بعد دوسری تحریک شیدا صاحب نے قیام دارالمطالعہ کے متعلق پیش کی جس کی تائید مولوی محمود علی صاحب نے کی اور یہ تحریک منظور ہوئی اس کے بعد صدر جلسہ مولوی غلام احمد صاحب زمیندار آشٹی نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ ہم حمید اللہ خان صاحب شیدا معتمد شاخ پربھنی اور عبدالرزاق صاحب کے بیحد مشکور ہیں کہ صاحبان موصوف نے آشٹی جیسے دور دراز مقام کے سفر کی تکالیف برداشت کرکے ادارہ اور اس کی خدمات سے روشناس کرایا۔ حاضرین کو اردو امتحانات میں شرکت کی ترغیب دلائی اور دارالمطالعہ کے لئے اپنا ایک کمرہ دینے کا اعلان فرمایا اور اخبار رہبر دکن۔ مدینہ جاری کرنے کا وعدہ فرمایا۔ اعلیٰحضرت بندگانعالی سلطان العلوم کی سلامتی کی دعا پر یہ جلسہ نہایت کامیابی سے ختم ہوا۔ شب میں مولوی غلام احمد صاحب کی جانب سے عشائیہ ترتیب دیا گیا۔

شاخ ہنگولی

۲ جولائی ۱۹۴۲ء روز جمعہ ۵ بجے شام بہی خواہان اردو کا ایک عام اجتماع بمقام ادارۂ ادبیات اردو محل میں آیا معتمد کی تحریک اور ڈاکٹر مہر الٰہی خان صاحب کی تائید پر مولوی سید صفدر حسین صاحب وکیل ہائیکورٹ نے صدارت کی۔

معتمد نے عالیجناب نواب سر صدر اعظم بہادر باب حکومت سرکار عالی کی عالیہ گشتی کے مضمرات اور معزز کونسل کے اجلاس منعقدہ ۱۲ خورداد ۱۳۵۱ف کی منظورہ تجاویز پر روشنی ڈالتے ہوئے دو قراردادیں پیش کیں۔ پہلی قرارداد ڈاکٹر مہر الٰہی خان صاحب کی اس ترمیم کے ساتھ کہ لفظ ریلوے کے بعد پٹیل پٹواریوں کے دفاتر دیہی کا اضافہ کیا جائے اور دوسری تجویز بالاتفاق آرا جوں کی توں منظور کی گئی۔ طے پایا کہ روئداد جلسہ بغرض اشاعت اخبارات کو بھیجی جائے۔ قرارداد حسب ذیل ہے۔

۱۔ ہم بہی خواہان اردو نواب سر صدر اعظم بہادر ممالک محروسہ سرکار عالی کی گشتی کا دلی خیر مقدم کرتے ہوئے حکومت سرکار عالی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جس نے اس مشترکہ زبان کو جو مملکت آصفیہ کی جملہ اقوام کے اتحاد کا واحد ذریعہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ رواج دینے کے احکام نافذ فرمائے ہیں۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے سررشتہ ریلوے اور پٹیل پٹواریوں کے دیہی دفاتر میں بھی اس "قومی زبان" کو وسعت دی جائے۔

۲۔ یہ اجتماع عہدہ داران سرکار عالی سے درخواست کرتا ہے کہ دفاتر سرکاری میں سختی کے ساتھ اس گشتی کی پابندی کر کے ابنائے وطن کی ان آرزوؤں کی تکمیل کریں جو اپنے ملک متحدہ قومیت کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہماری گہری ہمدردیاں اس تحریک کے ساتھ ہیں۔

شاخ گلبرگہ

۲ جون ۱۹۴۲ء کو ادارہ کا ایک جلسہ ہوا جس میں حسب ذیل

تحریک پاس کی گئی اور اس کی ایک نقل مقامی اخبارات کو روانہ کر دی گئی ہے۔

"ادارۂ ادبیات اردو گلبرگہ کا یہ جلسہ گشتی نشان ۱۵۰ واقع ۱۳ خورداد ۱۳۵۱ف بابتہ ترویج زبان اردو بہ دفاتر سرکار عالی کا دلی خیر مقدم کرتے ہوئے ادارہ کے سرپرست اعلیٰ ہز اکسلنسی نواب صاحب چھتاری صدر اعظم بہادر باب حکومت سرکار عالی کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے اور ممالک محروسہ سرکار عالی کے جملہ دفاتر کے ارباب اقتدار سے توقع ہے کہ وہ اس گشتی کو ہر طرح سے عملی جامہ پہنا کر اردو کی بیش بہا خدمت انجام دیں گے جو نہ صرف ہماری قومی اور سرکاری زبان ہے بلکہ ہندو مسلم اتحاد اور ثقافت کی بہترین یادگار ہے۔"

جلسہ میں یہ بھی طے پایا کہ اس گشتی کی اہمیت جتانے اس کی افادیت واضح کرنے اور اس کی تائید میں رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لئے سروری صاحب، راجہ دھرم کرن بہادر اور ڈاکٹر زور صاحب کے بیانات طلب کئے گئے ہیں۔

شاخ پرینڈہ

۱۰ / جولائی سنہ ۱۹۴۲ء روز جمعہ ۳ بجے شام کو دفتر ادارہ ادبیات اردو شاخ پرینڈہ کا جلسہ انتظامی بصدارت قاضی مولوی سید ظہیر الدین صاحب وکیل منعقد ہوا جس میں علاوہ عہدہ داران ادارہ کے دیگر بہی خواہان اردو بھی شریک تھے بعض انتظامی امور طے پانے کے بعد مولوی محمد یونس صاحب بانیٔ مرکز نما اخبار رہبر دکن، مورخہ ۱۹ / تیر ۱۳۵۱ف گشتی سرکاری نشان ۱۵۰ صیغہ فینانس بعنوان ترویج زبان اردو بدفاتر سرکاری پڑھ کر سنائی اور مولوی سید غلام علی صاحب رکن ادارہ نے گشتی مذکور کی افادیت و توضیحات پر نہایت دل نشین انداز میں حقیقت افروز روشنی ڈالی اس کے بعد معتمد ادارہ نے حسب ذیل قرارداد پیش کی جو مولوی محمد عمر صاحب رکن ادارہ کی تائید کے بعد باتفاق آرا منظور کی گئی۔

"ادارۂ ادبیات اردو شاخ پرینڈہ کا یہ جلسہ گشتی مذکور کا گرمجوشی کے ساتھ دلی خیر مقدم کرتا ہے اور ہز اکسلنسی عالیجناب نواب صدر اعظم بہادر سرکار عالی کی خدمت میں اس مستحسن اقدام پر ہدیۂ تبریک و تشکر پیش کرتا ہے اور حکام سرکار عالی سے متوقع ہے کہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ایسے موثر تدابیر اختیار فرمائے جائیں گے جس سے گشتی مذکور کا منشا پورا ہونے کے علاوہ اس مشترکہ قومی زبان کی ترویج عام ہو سکے۔ اس کے بعد حضرت اقدس و اعلیٰ و خانوادۂ شاہی کی عمر و اقبال کی ترقی کے لئے دعا پر جلسہ ختم ہوا۔"

شاخ بنگلور کے شعبۂ نسواں کا سالانہ جلسہ

اگرچہ ادارۂ ادبیات اردو شاخ بنگلور کو یہاں قائم ہوئے صرف چھ ماہ کا عرصہ ہوا لیکن کتب خانہ نسواں جو اس سے ملحق کیا گیا اس کو ڈیڑھ سال قبل یعنی سنہ ۱۹۴۰ء ماہ ڈسمبر میں قایم کیا گیا تھا۔ اس کا عام جلسہ سنہ ۱۹۴۱ء ماہ جون میں منعقد ہوا جس میں کتب خانہ کی رپورٹ سنائی گئی تھی۔ اس سال اس کا ایک عام جلسہ ادارہ ادبیات اردو کے تحت بروز شنبہ ۱۸ / جولائی سنہ ۴۲ء صبح کے ۱۰ بجے زیر صدارت محترمہ ملک سلطان بیگم کا ر روفی صاحبہ مہارانی کالج میں منعقد ہوا جس میں تقریباً چار سو بہنوں نے شرکت فرمائی قرأت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ وحیدہ بیگم اور اقبال النساء نے اردو کے بارے میں نظمیں پڑھیں۔ رپورٹ پڑھی گئی اور محترمہ عقیلہ بیگم صاحبہ نے ادارہ ادبیات اردو کے اغراض و مقاصد اور امتحانات کے متعلق تقریر فرمائی۔ جس کو حاضرین نے نہایت شوق و دلچسپی سے سنا۔ صدر صاحبہ حاجی بی بی ملک سلطان بیگم کا ر روفی کی پر مغز تقریر سے حاضرین جلسہ خاص طور سے محظوظ ہوئیں جلسہ ۱۱½ بجے ختم ہوا اور رپورٹ منظور ہوئی۔

ہم پرنسپل صاحبہ مہارانی کالج کی خاص طور سے ممنون ہیں جنہوں نے کالج ہال اور فرنیچر کے استعمال کی اجازت دی اور کالج کے وسیع احاطے میں پولیس کا خاص انتظام کیا گیا تھا تاکہ گاڑیوں کی آمد و رفت میں دقت نہ ہو۔ کالج ہال کا خوبصورت اسٹیج نہایت ہی صفائی سے سجایا گیا تھا جس میں طالبات کالج نے خاص حصہ لیا۔ الغرض میں بحیثیت معتمد ادارۂ ادبیات اردو پرنسپل و طالبات مہارانی کالج کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی کوششوں نے جلسے کو ہر طرح سے کامیاب و بارونق بنایا۔

ادارۂ ادبیات اردو بنگلور کی پہلی رپورٹ برائے سال ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۲ء

معزز خواتین۔

آج ہم ادارۂ ادبیات اردو شاخ بنگلور کا سالانہ جلسہ منعقد کر رہی ہیں۔ جس میں یکم جولائی ۱۹۴۱ء سے ۳۰ جون ۱۹۴۲ء تک کی کارروائی پیش ہے۔

گو کہ ادارۂ ادبیات اردو کو قائم ہوئے صرف چھ ماہ ہوئے لیکن اس کے تحت میں فی الحال جو کتب خانہ چل رہا ہے وہ ۱۹۴۰ء ماہ ڈسمبر میں قائم کیا گیا تھا۔ اور سالِ گزشتہ ۱۵ جون کے منعقد شدہ عام جلسے میں اس کی رپورٹ پڑھی گئی تھی۔ اور یہ تجویز ہوئی تھی کہ آئندہ سے اس کتب خانے کو کسی انجمن کے تحت میں چلایا جائے۔ لہٰذا مجلس عاملہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کی ایک شاخ بنگلور میں کھولی جائے اور کتب خانہ اس سے ملحق کیا جائے۔ ادارہ کے معتمد معزز ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن سے اس بارے میں خط و کتابت کی گئی اور ماہ ڈسمبر ۱۹۴۱ء میں اجازت نامہ وصول ہوا چنانچہ ۱۹۴۲ء جنوری سے کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو کے تحت چل رہا ہے۔

گزشتہ سال سے اب تک مجلس عاملہ کے دس اجلاس منعقد ہوئے اور آج اس کا جلسۂ عام ہے جس میں آپ سب بہنوں کو حق حاصل ہے کہ اپنے قیمتی خیالات سے ہمیں آگاہ فرمائیں اور ادارے کے مقاصد و اغراض کی تبلیغ و اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ اس موقع پر آپ کو ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن سے متعارف ہونا ضروری ہے۔ اس کے معتمد اعزازی ڈاکٹر زورؔ صاحب ہیں جن کے جوشِ عمل نے آج ادارۂ ادبیات اردو کو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مقبولِ خاص و عام بنایا۔ حیدرآباد جس کی خاک کے ہر ذرہ ذرہ میں اسلامی شان جاہ و جلال نمایاں ہو رہے ہیں اعلیٰحضرت سلطان العلوم کی اردو نوازیوں کی بدولت کل پرستارانِ اردو کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بنا ہوا ہے یہاں کے بچے بچے کے دل میں اردو زبان کی محبت جاگزین ہے اور اس کی خدمت باعث فخر سمجھی جاتی ہے۔

چنانچہ ادارۂ ادبیات اردو کا قیام ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر زورؔ صاحب کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا۔ اس کا بنیادی مقصد اردو زبان کی توسیع و اشاعت اس کے ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا ہے۔ اور اس میں اس وقت تک توقع سے بڑھ کر کامیابی نصیب ہوئی۔ اس ادارے کے مختلف شعبے ہیں مثلاً شعبۂ زبان شعبۂ اطفال، شعبۂ طلبہ، شعبۂ امتحان، شعبۂ اردو انسائیکلو پیڈیا۔ ان تمام کا تفصیلاً ذکر اس محدود وقت میں ناممکن ہے۔ لہٰذا بہنوں سے استدعا کی جاتی ہے کہ سرگذشت ادارۂ ادبیات اردو جس کی تین چار جلدیں ہمارے ادارے میں موجود ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔

الغرض حیدرآباد نے ہی اردو زبان کی ترقی میں برق رفتاری پیدا کر دی شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری مہربان گورنمنٹ نے جناب عبد القادر صاحب سروری کو ہماری یونیورسٹی کا اردو پروفیسر مقرر کیا ہے۔ صاحب موصوف کو ادارے سے نہایت ہی دلچسپی رہی ہے اور نہایت ذوق و شوق سے اردو کی خدمت میں سرگرم رہے ہیں۔ اور اس وقت ہماری خوش قسمتی سے ان کا تقرر میسور میں ہوا ہے اور ہمیں امید قوی ہے کہ آئندہ چند سال میں میسور "حیدرآباد ثانی" بن کر رہے گا۔

اگر میں ان تمام باتوں کو جو حیدرآباد میں میرے چشم دید ہیں بیان کروں تو بہت سا وقت صرف ہو جائے گا۔ لیکن اپنی رپورٹ کو ختم کرنے سے پہلے یہ آپ کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں کہ اس وقت ہم صرف کتب خانے کے ذریعے اردو کی خدمت کر رہی ہیں لیکن اردو کی صحیح تبلیغ و اشاعت کے لئے ہمیں تعلیم بالغان کا انتظام کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں درخواست کی ہے کہ ادارے کے لئے ایک کمرہ مڈل اسکول یا پرائمری اسکول نلا بیلم میں دیا جائے۔ جہاں ادارے کا دفتر رکھا جائے اور تعلیم بالغان کا باقاعدہ انتظام ہو اور اس کے ماتحت متعدد تقاریر اور مشاعروں کا انتظام کیا جا سکے اور ممکن ہو تو اس کی طرف سے ایک مقامی رسالہ نکالا جا سکے۔

ادارے کے اغراض و مقاصد اور امتحانات کے قواعد و ضوابط کو عقیلہ بیگم صاحبہ اپنی تقریر میں تفصیلاً بیان کریں گی۔ اپنی رپورٹ ختم کرنے سے

پہلے آپ کی خدمت میں ایک گزارش یہ کرنی ہے کہ از راہ نوازش ہماری کوششوں میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اور اپنی قیمتی رائے سے وقتاً فوقتاً ہمیں آگاہ فرماتی رہیں۔

اس ادارے کے سرپرست بیگم جسٹس عبدالغنی ہیں۔ محترمہ موصوفہ کی دلچسپی و امداد اراکین ادارہ کی سرگرمیوں میں حوصلہ افزائی کا باعث ہے ہم آپ کی خدمت میں تہ دل سے شکریہ پیش کرتی ہیں۔ محترمہ صدر ادارہ کے زبان اردو سے غیر معمولی شفقت و محبت کو بھی ادارہ کی کامیابی میں بڑا دخل ہے نیز میں معتمد ادارہ کی حیثیت سے محترمہ صدر صاحبہ بیگم کا زرونی کو خوش آمدید کہتی ہوں آپ نے اپنی متعدد مصروفیات کے باوجود اپنے قیمتی وقت کو صرف کرکے آج جلسے کی صدارت فرمائی جو ہمارے لئے بے انتہا حوصلہ افزائی و خوشی کا باعث ہوا جس کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ خدائے پاک آپ کو تادیر سلامت رکھے۔ نیز جملہ حاضرین کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے ہماری دعوت قبول فرماکر آج کے جلسے کی رونق بڑھائی۔

اس موقع پر لیڈی مرزا اسمٰعیل صاحبہ کا ذکر نہ کرنا کفران نعمت ہوگا۔ لہٰذا آپ کی خدمت میں اپنا ناچیز ہدیۂ تشکر پیش کرتی ہوں کہ آپ کو ہمیشہ سے ہماری کوششوں سے دلچسپی رہی اور آپ ہر طرح سے امداد بھی کرتی رہیں۔ آپ کی قیمتی رائے سے ہم بارہا مستفید ہوئے اور دراصل ہم میں اس خدمت کا ذوق و شوق آپ کی وجہ سے پیدا ہوا۔

مندرجہ ذیل عہدہ داروں کے نام جو مجلس عاملہ میں پاس ہوئے ہیں آپ کی اطلاع کے لئے پیش کرتی ہوں۔ اس سال کے ادارہ کے عہدہ دار حسب ذیل ہیں۔

عقیلہ بیگم۔ صدر و خازن۔ حبیب النساء بیگم سکرٹری عالیہ بیگم اسسٹنٹ سکرٹری۔

مجلس عاملہ:۔ فاطمہ بی۔ ہیڈ مسٹرس مڈل اسکول رکن

صابرہ بیگم " " "

ملکہ حفیظہ " " "

پروفیسر سروری کو وداعی عصرانہ

۲۰ر شہریور ۱۳۵۱ف

م ۱۳ر جولائی سنہ ۴۲ء ۵ بجے شام "رفعت منزل" خیریت آباد میں پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی (عثمانیہ) منتخب صدر شعبۂ اردو جامعۂ میسور کے اعزاز میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی جانب سے ایک پرتکلف وداعی عصرانہ ترتیب دیا گیا تھا۔

باب الداخلہ پر ڈاکٹر زور صاحب، خواجہ حمید الدین صاحب بی اے (عثمانیہ) مہتمم ادارۂ ادبیات اردو اور معین الدین صاحب انصاری مدیر "بچوں کا سب رس" مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔

مہمانوں میں نواب ظہیر الدین خاں بہادر بی اے (عثمانیہ) امیر پائیگاہ، سر عقیل جنگ بہادر، آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر، نواب بہادر یار جنگ بہادر، نواب تراب یار جنگ بہادر سعید، نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز، نواب عزیز نواز جنگ بہادر، نواب شبیر یار جنگ بہادر، ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی منتخب نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ، مولوی عبدالرحمن خاں صاحب سابق صدر جامعہ عثمانیہ، پروفیسر معین علی خاں صاحب پرووسٹ جامعہ عثمانیہ، مولوی سید محمد اعظم صاحب، ڈاکٹر نظام الدین صاحب، پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی، ڈاکٹر شرما صاحب، ڈاکٹر ایشور ناتھ صاحب ٹوپا، ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب، پروفیسر و نسی دھر صاحب، ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی، ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی، پروفیسر سیار اؤ صاحب، ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی صاحب، پروفیسر لطیف احمد صاحب فاروقی، مولوی یوسف الدین صاحب مہتمم کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، مولوی میر حسن صاحب، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب، ڈاکٹر عبدالحق صاحب، مولوی غلام احمد خاں صاحب میر مجلس پائیگاہ، مولوی رحمت اللہ صاحب، مولوی ضامن علی صاحب حجازی، مولوی ناصر علی صاحب، مولوی سید محمد صاحب، اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر، مولوی باسط علی خاں صاحب، مولوی عبدالرؤف صاحب ایڈوکیٹ، مولوی بدر شکیب صاحب، مولوی محمد علی صاحب تیر، مولوی سید بادشاہ حسین صاحب، مولوی فیض محمد صاحب قابل ذکر ہیں۔

عصرانہ کے اختتام پر آنریبل نواب مہدی یار جنگ بہادر معین امیر جامعہ عثمانیہ نے پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کی گل پوشی فرمائی۔

ادارۂ ادبیات اُردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
بن کی بیتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ...	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طیبہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۳
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
نبض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکنی ...	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدورکشتاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان ...	۳۲	۰	۳	۰
خطابات ...	۱۱۲	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

حیدر آباد

(عالیجناب آنریبل نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ کے اس خطبہ کا حصہ جو نواب صاحب ممدوح نے جامعہ آندھرا کے جلسہ تقسیم اسناد منعقدہ ۱۰ر ڈسمبر ۱۹۴۱ء کو سنایا)

میں حیدرآباد کا باشندہ ہوں اور ہمارا شہر حیدرآباد تلنگانے میں واقع ہے جو ممالک محروسہ سرکار عالی کا ایک حصہ ہے اور جہاں آندھرا قوم کی بے شمار تاریخی یادگاریں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ آندھرا قوم ایک بہت قدیم قوم ہے لیکن اس کے ابتدائی زمانے کی تحریری تاریخیں مفقود ہیں اور اس عہد کے متعلق جس قدر معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ قدیم کتبات اثری یادگاروں اور بیرونی ملکوں کے ان سیاحوں کے بیانات سے حاصل ہوئی ہیں جو وقتاً فوقتاً اس ملک میں آتے رہے۔ مثلاً میگاس تھنیز اور مارکوپولو وغیرہ سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں آندھرا ریاست کا ذکر کیا ہے۔

لیکن جہاں تک ملک سرکار عالی کا تعلق ہے وہ ایسے مستند اثری یادگاروں اور تاریخی مواد کا مخزن ہے جس سے آندھرا تاریخ کے عہد قدیم پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ملک سرکار عالی میں جگہ جگہ قدیم حجری دور کے آثار پھیلے ہوئے ہیں۔ قبل تاریخ عہد کی قبریں جنہیں اثریات کی اصطلاح میں سنگ گھیرے کرملخ اور ڈالمن کہتے ہیں۔ حیدرآباد سے چند میل کے فاصلے پر کوہ مولا علیؑ نیز ڈورنال اور ہمکنڈہ میں دریافت کی گئی ہیں۔ اسی طرح ضلع رائچور میں مسکی اور اس کے قرب و جوار میں پوت اور منکے کثیر مقدار میں برآمد ہوئے ہیں اور یہ موہنجوڈارو کی پوت اور منکوں سے بہت مشابہ ہیں۔

ابھی چند روز پہلے کا ذکر ہے کہ حیدرآباد سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر کنڈاپور نامی بستی میں ایک بہت ہی قدیم آندھرا کے آثار برآمد کئے گئے۔ یہاں کھدائی کا کام ابھی جاری ہے اور بہت دلچسپ چیزیں مثلاً قدیم سکے، زیورات اور مٹی کے برتن نکالے گئے ہیں جن سے ہمیں آندھرا تہذیب کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں مطالعہ اور تحقیق کے لئے ایک دل کش موضوع ہیں۔

تقریباً ایک سال پہلے جامعہ عثمانیہ نے ایسے بارہ سو مخطوطات حاصل کئے ہیں جو تاڑ کے پتوں پر لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر تلنگی زبان میں ہیں۔ ان قدیم مخطوطات کی بدولت تحقیقات کا ایک نیا میدان ہاتھ آیا ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہ تاریخی اور ادبی حیثیت سے نہایت گراں قدر ثابت ہوں۔

اس عہد میں جس کی تاریخیں موجود ہیں ممالک محروسہ سرکار عالی آندھرا راجاؤں کے کئی ایک خاندانوں کی حکومت کا مستقر رہا ہے مثلاً وکاٹا کا خاندان، چالوکیا خاندان، راشٹرکوٹ خاندان اور کاکتیا خاندان۔ ان میں سے آخرالذکر خاندان ورنگل پر حکمراں تھا۔ اس خاندان کے راجاؤں نے بڑی بڑی عمارتیں بنائی ہیں اور قلعوں اور شہری عمارتوں کی صورت میں اپنی بہت سی یادگاریں چھوڑی تھیں جنہیں ان کے بعد آنے والے بادشاہوں نے اپنے عہد میں مرمت وغیرہ کرکے محفوظ رکھا ہے۔ پاکھال اور رامپا کے عظیم الشان تالاب جو آج تک موجود ہیں ان ہی راجاؤں کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے مندروں میں ورنگل کی "ہزار ستون کی دیول" اور پالم پیٹ اور ہانگل کے مندر سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

تلنگی زبان کے شاعر ودیا ناتھ نے "آندھرا نگری" کے نام سے جس شہر کا ذکر کیا ہے، وہ یہی ورنگل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے ایک عجیب و غریب شہر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی شہر پناہ کے دروازے سونے کے تھے اور وہ جن شاہراہوں پر واقع تھا وہاں آمد و رفت کی بڑی کثرت رہتی تھی۔ وقتاً فوقتاً ان سڑکوں پر سے ساز و سامان سے مرصع گھوڑوں اور ہاتھیوں کے خوش نما جلوس اور پیدل فوج کے دستے تزک و احتشام

سے گزرتے تھے۔ کہیں مرغ لڑائے جاتے تھے اور کہیں مینڈھوں کی لڑائی ہوتی تھی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے تماشے دیکھنے کے لئے لوگ چاروں طرف سے آیا کرتے تھے۔ شہر کے ایک حصے میں وہ عظیم الشان عمارت بنی ہوئی تھی جو کسی زمانے میں تصویر خانے کی عمارت کہلاتی تھی اور جو آندھرا قوم کے ذوقِ فنونِ لطیفہ کی آئینہ دار تھی۔ ورنگل ہی وہ شہر ہے جس کے قرب و جوار میں مہا بھگوت کو تلنگی زبان میں نظم کیا گیا اور اب یہ نظم تلنگی ادب کا ایک غیر فانی شاہکار سمجھی جاتی ہے۔

ورنگل کے قریب ایک کتبہ دریافت ہوا ہے جس پر اس زمانے کی درآمدات کی ایک عجیب و غریب فہرست کندہ ہے۔ اس فہرست میں عطریات، سنگار کا سامان، کالی مرچ، شہد، جست، تانبا اور دوسری دھاتیں، کافور، صندل کی لکڑی، ریشم، ہاتھی دانت، مونگا، موتی، تراشیدہ شیشے، نیل، میوے اور چٹنی اچار وغیرہ شامل ہیں اس زمانے میں ان سب پر جنس وار محصول لیا جاتا تھا۔ اس فہرست کی اشیاء میں آپ بعض ایسی اشیا بھی دیکھتے ہیں جو عورتوں کے بناؤ سنگار سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی مانگ ان ہی کی ضروریات کے تحت پیدا ہوئی ہوگی۔

قدیم آندھرا دارالسلطنت پٹن یا پرتس آنا پور جو ممالک محروسہ سرکار عالی کے شمال مشرق میں دریائے گوداوری پر واقع ہے تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا جہاں بروچ کے راستے دوسرے ممالک کا مال درآمد ہوتا تھا اور وہاں سے براہ مچھلی بندر یا سالیا چین تک کے دور دراز ممالک کو بھیجا جاتا تھا۔ وزیگاپٹم اور مچھلی بندر کے راستے یہاں سے ہاتھی دانت اور ململ کی برآمد شہر روم تک ہوتی تھی ممالک محروسہ سرکار عالی میں رومیوں کے سونے چاندی کے جو سکے دریافت ہوئے ہیں ان سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ مشہور مصنف پلنی شکایت کرتا ہے کہ ہر سال ہندوستان تقریباً پچاس لاکھ پونڈ کی دولت سامان تعیش مہیا کرکے روم سے حاصل کر لیتا ہے۔ پٹرونیس اور سنیکا بھی رومیوں میں ہاتھی دانت اور ململ کے حد سے زیادہ شوق پر اظہار ناراضی کرتے ہیں اور اس قسم کی فضول خرچیوں کا ذمہ دار عورتوں کو قرار دیتے ہیں۔

پس ریاست حیدرآباد اور آندھرا قوم کے درمیان ایسے مستحکم تمدنی اور معاشی تعلقات قایم ہیں جن کا مشترکہ تہذیب و تمدن کے ارتقا میں بہت خاص حصہ ہے۔ تلنگی ممالک محروسہ سرکار عالی کی ملکی زبانوں میں سے ہے۔ اور جامعہ عثمانیہ میں اعلیٰ ترین معیار تک اس کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے منشور جامعہ کی پابندی میں اس زبان کی تعلیم کا ذریعہ بھی اور زبانوں کی طرح اسی زبان کو بنایا گیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے استاد تلنگی اور بیرسٹر سبا راؤ ایک ایسے بلند پایہ عالم اور شاعر ہیں کہ جہاں کہیں تلنگی زبان بولی جاتی ہے لوگ ان کے نام سے واقف ہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں تلنگی اور دوسری ملکی زبانوں میں اصلی اور اونچی تحقیقات کی سہولتیں بھی بہم پہنچائی گئی ہیں اور ایسا تحقیقاتی کام کرنے والوں کو وظائف تعلیمی بھی دئے جاتے ہیں۔

گولکنڈے کے قطب شاہی بادشاہ تلنگی زبان کے بڑے مربی اور سرپرست گزرے ہیں تلنگی کے مشہور شاعر" ادھنکی گنگادھر کوی" کو ابراہیم قطب شاہ کی سرپرستی حاصل تھی اور اس شاعر نے ابراہیم کی لشکر کشی کے واقعات کے بیان میں ایک نظم بھی لکھی ہے جو آج بھی موجود ہے حقیقتاً دیکھا جائے تو ابراہیم کی تخت نشینی بھی زیادہ تر ہندو طبقے کی تائید کی بدولت ہوئی تھی ابراہیم بڑا ہر دلعزیز بادشاہ تھا اور ہندوؤں میں وہ ملک ابراہام کے نام سے مشہور تھا۔ ابراہیم کے ایک عہدہ دار امین خاں نے جو پٹن چرو پر متعین تھا اپنے مالک کی پیروی کرتے ہوئے تلنگی ادب کی بڑی سرپرستی کی ہے۔ امین خاں کی بیوی غریبوں اور بےکسوں کے ساتھ ہمدردی کرنے میں ضلع بھر میں مشہور تھی۔

قطب شاہی فوجوں میں ہندو اور مسلمانوں دونوں فرقوں کے لوگ برابر کے شریک تھے اور اپنے بادشاہ کے ساتھ عقیدت اور وفاداری میں ہمیشہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں رہتے تھے۔ اس ریاست میں آندھراؤں کو بڑی بڑی خدمات پر ترقی دی جاتی تھی۔ آخری قطب شاہی بادشاہ

دور میں مشہور فنکار اکنا اور مادنا ریاست کے مختار کل تھے۔ دیگر فنون لطیفہ کے علاوہ یہ بادشاہ خطاطی اور خوش نویسی کے بھی بڑے سرپرست تھے اور ان کے عہد حکومت میں تلنگی زبان کی خطاطی کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی ہے۔ ریاست میں فارسی کے بعد تلنگی زبان کا درجہ اور سب زبانوں سے بڑھا ہوا تھا۔

قطب شاہی بادشاہوں کی مذہبی رواداری بے مثال تھی۔ اور صوبر ہمنی فرقے کے تیاگیوں اور گوسائیوں پر ان کی خاص نظرِ عنایت مبذول تھی۔ اور ان لوگوں کو بادشاہوں نے بڑی بڑی اراضی عطا کی ہیں۔ نہ صرف دکن کے مسلمان بادشاہوں نے بلکہ مغل شہنشاہوں نے بھی مندروں کی نگہداشت اور ان کے مصارف جاریہ کے لئے بڑی بڑی زمینات کے فیاضانہ عطیے دئے ہیں ان میں سے بہت سے عطیات آج بھی برقرار ہیں۔ مثال کے طور پر بھدراچلم کے مشہور مندر کو لیجئے۔ اس ہندو معبد کو آج ایک بڑا عطیہ حاصل ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبوں کا باہم ملکر ایک ہم آہنگ مرکب کی شکل اختیار کرنا تاریخ کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ ہے۔ مسلمان اپنے ساتھ رہن سہن کا ایک نیا معیار لیکر آئے تھے اور انھوں نے کھانے اور پینے کے طریقوں میں بہت ہی نفیس اصلاحیں کی ہیں۔ انھوں نے مالگزاری اور عدالت کے طریقے رائج کئے اور درباری آداب وآئین کی بنا ڈالی، جن کی پابندی آج تک ہندوستانی درباروں میں کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی دورِ حکومت نے اپنے زمانے کی سماجی زندگی اور مذہبی خیالات پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اس کا میلان اس طرف تھا کہ کسی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائد میں مفاہمت پیدا کی جائے۔ کیا شمالی ہندوستان اور کیا جنوبی ہندوستان دونوں جگہ ایسے کئی ہندو پیشوایانِ مذہب پیدا ہوئے جنھوں نے ایسے فرقوں کی بنا ڈالی جو کم وبیش توحید کے قایل تھے اور اکثر ہندو بھی مسلمان بزرگانِ دین کا اسی طرح ادب واحترام کرتے تھے جیسا کہ مسلمان کیا کرتے ہیں۔ ایسے مذہبی پیشواؤں میں مثال کے طور پر شمالی ہند کے رام نند اور کبیر اور جنوبی ہند کے بسوا بانیٔ فرقۂ لنگایت کے نام لئے جا سکتے ہیں مسلمانوں نے اپنی جگہ ہندوؤں کے بہت سے طور طریقے اور رسم ورواج اختیار کر لئے مثلاً شادی بیاہ کی رسوم، جشن، جلسے، میلے بلکہ بعض عام اور عام بھی ہندوؤں ہی سے لئے ہیں۔

ہمارے ملک کی باضابطہ تحریری تاریخ مسلمانوں ہی کی وجہ سے وجود میں آئی خاص طور پر دکن کی تاریخ نویں صدی عیسوی کے بعد سے زیادہ تر مسلمانوں ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اس سلسلے میں مشہور مورخ فرشتہ کا نام لیا جا سکتا ہے اور تاریخ ہند کے عہد متوسط کے متعلق ہماری معلومات زیادہ تر اسی مورخ کی تاریخ پر مبنی ہیں۔ علاوہ ازیں عرب بہت بڑے جغرافیہ داں اور سیاح تھے۔

اس کے برخلاف دیگر علوم مثلاً ریاضیات وفلکیات میں ہندوؤں کے نظریے اور طریقے بہت ہی ترقی یافتہ تھے اور ان علوم کی حد تک مسلمان بہت کچھ ہندوؤں سے مستفید ہوئے ہیں لیکن عربوں کے علم وفن کے اپنے نظریے اور طریقے بھی تھے اور دونوں قوموں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ علم حاصل کیا ہے۔ ہر ایک نے اپنے ہاں جس چیز کی کمی پائی دوسرے سے مدد لے کر اس کی تکمیل کی مثلاً ہندوؤں نے مسلمانوں سے فلکیات کی بہت سی اصطلاحات مستعار لیں اور عرض بلد وطول بلد کے حساب کے طریقے حاصل کئے۔ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں نے ریاضیات کی مختلف شاخوں کے متعلق سنسکرت زبان سے اوق کتابوں کا فارسی ترجمہ کرایا۔ جہاں تک صنعت ودست کاری کا تعلق ہے مسلمانوں نے کاغذ سازی، مینا کاری، فولاد میں جوہر بٹھانے کا کام اور بعض قسم کی اونی پارچہ بافی کو رائج کیا۔ علاج کے دونوں طریقے یعنی ایورویدک اور یونانی آج بھی ساتھ ساتھ رائج ہیں اور دونوں قوموں کے لوگ برابر ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

ہندوستان کی موسیقی ایک بالکل ہندو فن ہے جس کو مسلمانوں نے ان سے سیکھا ہے اور یہ عجیب و غریب بات ہے کہ بعض بہترین موسیقی داں مسلمان گذرے ہیں۔ فنون لطیفہ میں سے مجسمہ سازی مسلمانوں کے لئے مذہبًا منع ہے، کم و بیش ان ہی وجوہ سے مصوری کی طرف بھی انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ بہیں ہم ان کے دورِ حکومت میں مصوری اور شبیہ سازی کا ایک مخصوص اسلوب جو مغلیہ دبستان کے نام سے مشہور ہے، قائم ہو گیا تھا اور یہ اسلوب ایرانی اور ہندی دونوں کے اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ اس دبستان کی تصاویر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مناظر کی حد تک وہ بالکل بے جان ہوتے ہیں لیکن جہاں تک جزئیات اور تفصیلات کا تعلق ہے، نہایت اعلیٰ درجہ کی مانی گئی ہیں۔ اس کمالِ فن کے باوجود دبستاں کا کوئی کارنامہ اس قدر عظیم الشان نہیں ہے جیسی کہ ایجنٹا کی تصویریں ہیں جو غالبًا آندھرا فن کاروں کی صناعی کی بے مثال یادگار ہیں۔

اس کے برخلاف مسلمانوں کا ذوقِ فن زیادہ تر ان کی تعمیرات میں نمایاں ہے۔ انھوں نے بڑی عظیم الشان عمارتیں بنائیں۔ جن میں بعض آج بھی حیدرآباد، اورنگ آباد، بیدر اور دوسرے مقامات پر موجود ہیں اور بہت سی کھنڈروں کی شکل میں پائی جاتی ہیں۔ دکن کی طرزِ تعمیر شمالی ہند کی طرزِ تعمیر سے کسی قدر الگ ہے۔ اس میں ہندوانی اور ایرانی دونوں کا اثر نمایاں ہے۔ جیسا کہ لونگ ہرسٹ نے اپنی کتاب "ہمپی کے کھنڈر" میں بتایا ہے۔ ہمپی (وجیانگر) کی اکثر بڑی عمارات میں اسلامی طرزِ تعمیر کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ پس ہم جس چیز کو "ہندوستانی طرزِ تعمیر" کہتے ہیں۔ وہ ہندو مسلمان دونوں قوموں کے جمالیاتی ذوق اور ان کی تہذیبوں کے باہمی اشتراک و انضمام کی ایک اور مثال ہے۔

لیکن جو سب سے زیادہ لائق غور ہے وہ ایک اس زبان کا نشو و نما پانا ہے جو سارے ملک میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مسلمانوں نے اپنی عربی اور فارسی کے علاوہ شمالی ہندوستان کی ایک زبان بھی اختیار کر لی تھی جس کو وہ "ہندی" کہتے ہیں۔ فارسی میں اس لفظ کے معنی ہند کی یعنی ہندوستان کی زبان کے ہیں۔ گریرسن اور دیگر ماہرین نے اس کو لسانی اعتبار سے "مغربی ہند" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس زبان میں عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ بہت زیادہ گھل مل گئے ہیں یہ الفاظ زیادہ تر اسما اور صفات ہیں۔ افعال اور دیگر اجزائے کلام نیز جملوں کی نحوی ترکیب علیٰ حالہ ہندی ہی رکھی گئی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ ملی جلی بولی ترقی کر کے ایک مستقل زبان ہو گئی اور اردو کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس نئی زبان نے بہت جلد اپنی غیر معمولی قوت اور تمام زبانوں حتیٰ کہ انگریزی، فرانسیسی اور پرتگالی جیسی یورپین زبانوں کے الفاظ کو اپنا لینے کی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ اس کی سیدھی سادی اور غیر عالمانہ صورت (جس کو بعض اوقات ہندوستانی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے) عملاً سارے ہندوستان کی مشترکہ اور عام زبان بن گئی اور خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جن کو انگریزی نہیں [illegible] زبان اظہار خیالات کا واحد ذریعہ ہے۔ یہ کشمیر سے لیکر میسور تک اور بمبئی سے لیکر بنگال تک برابر سمجھی جاتی ہے۔ کانگریسی حکومتوں [illegible] اور عام فہم زبان کے ذریعہ ایک مشترکہ قومیت پیدا کرنے کے خیال سے "ہندی" کے نام سے اسی زبان کو اس کے وطن سے دور دراز مقامات مثلاً مدراس میں بھی رائج کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہندوستان کے باہر بھی جہاں کہیں ہندوستانی بستے ہیں اسی کے جاننے والے موجود ہیں۔

اردو کے کئی ایک بہترین شاعر اور انشاپرداز ہندو ہوئے ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں۔ اسی طرح ہندی کے بعض قدیم مصنفین عبدالرحیم اور کبیر کی طرح مسلمان گذرے ہیں اس سے ظاہر کہ اردو کسی طرح بدیسی زبان نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے برخلاف وہ ہندوستان کی مقبول خاص و عام زبان ہے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے گہرے میل جول کا نتیجہ ہے اور اب اہل یورپ کے ساتھ میل جول سے اثر پذیر ہو رہی ہے وہ سراسر ایک آریائی زبان ہے اور اس کو (عربی ایرانی) زبان کہنا ایسا ہی غلط ہو گا جیسا کہ کوئی شخص انگریزی زبان میں یونانی اور

لاطینی الفاظ کی کثیر تعداد دیکھ کر انگریزی کو یونا لطینی (یونانی لاطینی) زبان کہے۔

جامعہ عثمانیہ نے اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا جرأت آزما قدم محض اس لئے نہیں اٹھایا کہ اردو ریاست حیدرآباد کی سرکاری اور مقبول خاص و عام زبان ہے بلکہ اس کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ مخلوط الفاظ کے غیر معمولی طور پر وسیع ذخیرہ کی وجہ سے وہ ہندوستان کے بہت بڑے حصہ میں سمجھی جاتی ہے۔ اس کا ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جانا ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان تیار کرنے کی طرف ایک اہم پیش قدمی ہے۔ مقامی یا ملکی زبانیں اس مقصد کے لئے اس وجہ سے کارآمد نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں ایسی تین زبانیں بولی جاتی ہیں اور اس صورت میں تین یا چار جامعات قائم کرنی پڑتیں اور یہ کام ظاہر ہے کہ سراسر ناممکن ہے۔ اس سے قطع نظر ان میں سے کوئی زبان بھی ایسی نہیں جو ملک کی عام اور مشترکہ زبان بننے کے قابل ہو۔ بریں ہمہ جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی بیان کیا ہے جامعہ عثمانیہ میں ملکی زبانیں جن میں تلنگی بھی شامل ہے اعلیٰ ترین معیار تک انہی زبانوں کے ذریعہ سکھائی جاتی ہیں اور اس طرح جس زبان میں چاہو ایم اے کا امتحان دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں بہت کم جامعات ایسی ہیں جہاں ان زبانوں اور ہندوستان کی اور زبانوں میں اس اعلیٰ معیار تک تعلیم دی جاتی ہے۔

مہدی یار جنگ

کیا کر رہا ہوں میں!

پھر سازِ دل کو نغمہ سرا کر رہا ہوں میں
پھر زندگی کی نشو و نما کر رہا ہوں میں

احساس کی نگاہ میں جو حین ذات تھے،
ان کافروں کی مدح و ثنا کر رہا ہوں میں

اب سیر ہو چکا ہوں سکونِ حیات سے
جو کچھ عطا ہوا ہے، فنا کر رہا ہوں میں

بے سوزِ دل، بلند نگاہی کی موت ہے
اپنی تباہیوں کی دعا کر رہا ہوں میں

اخلاق مضطرب ہے تو مذہب ہے بیقرار
احساس مطمئن ہے، خطا کر رہا ہوں میں

سر پوچھتا ہے" جان کے کیوں مر رہا ہے تو؟"
دل کہہ رہا ہے" فرض ادا کر رہا ہوں میں

زخموں کو ضد ہے، پھر وہ نمک پاشیاں کریں
پھر دردِ زندگی کی دوا کر رہا ہوں میں

جاؤ، کوئی بتاؤ فقیہانِ شہر کو،
جو کچھ بھی کر رہا ہوں، بجا کر رہا ہوں میں،

تو ہی بتا ندیم کہ دنیا سمجھ سکے
کیا کر چکا ہوں اور یہ کیا کر رہا ہوں میں

احمد ندیم قاسمی

اطلاع۔ جناب احمد ندیم قاسمی کے ڈھائی سو قطعات کا ایک مجموعہ "دھڑکنیں" اردو اکیڈیمی لاہور سے عنقریب شائع ہوگا۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر تاثیر نے لکھا ہے۔ کتابت و طباعت بے نظیر ہے۔

الہامِ شعر!

جب رات کی پُراسرار سہیلی خواب کے نغمے گاتی ہے　　آرام کی موجیں اٹھتی ہیں، آلام کی رو تھم جاتی ہے

صحرا میں خموشی ہوتی ہے، بے خود سے نظر آتے ہیں چمن　　کچھ غور میں اس دنیا کی ہر شے محو سی پائی جاتی ہے

چہرے سے حیاتِ فانی کے اسرار کے پردے اٹھتے ہیں　　احساس کی ناہمواری میں اک سطح ابھرتی جاتی ہے

اُس وقت میں اپنی خلوت میں اک پیکرِ حسرت ہوتا ہوں　　آنکھوں میں نشاطِ ماضی کی تصویر سی اک پھر جاتی ہے

سینے میں تلاطم ہوتا ہے، دل کی ابھر آتی ہیں چوٹیں　　جذبات کی اک دنیا گویا بیدار سی ہوتی جاتی ہے

کس طرح بتاؤں دل کے پریشاں خواب کہاں تک سچے ہیں　　سینے میں سبک رو موجِ ہوا کن شعلوں کو بھڑکاتی ہے

اتنے میں نظر آتا ہے کچھ ایسا گویا میرے ہر جانب　　ہلکی سی نظر افروز تجلی حلقہ کرتی جاتی ہے!

ہو جاتی ہیں خیرہ میری نگاہیں اور ادھر تاریکی میں　　موہوم سی یہ تنویرِ حقیقت گہری ہوتی جاتی ہے

اس نور کے پردے میں چھپ کر گاتا ہے کوئی پھر وہ نغمے　　ہر نبض میں جن کی موجِ لطافت بجلی سی دوڑاتی ہے

جو مجھ کو بتایا جاتا ہے پیغام وہی میں دیتا ہوں!

سنتا ہوں جو کچھ اس عالم میں کاغذ پہ اسے لکھ لیتا ہوں

علی اختر

انوار :- جناب علی اختر صاحب کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ ؛ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پُرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر ان کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوشؔ کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔

اس مجموعہ کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا۔ قیمت (عہ)

ایک اکٹ کے ڈرامے

ایک اکٹ کا ڈراما، ہمارے زمانے کے مختصر ڈراموں کی ایک خاص شکل ہے۔ اس کا رواج پچھلے دس پندرہ سال کے اندر اندر ہوا۔ امریکہ، جو ان ڈراموں کا پیدائشی گھر سمجھا جاتا ہے، وہاں بھی ان کی عمر پندرہ، بیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کے اصول بھی، ابھی تک بہت کم روشنی میں آسکے ہیں۔

اس چھوٹی سی ادبی صنف کو، جنگ عظیم کے بعد کی پیداوار سمجھنا چاہیے۔ اس کی ابتدا اور ترقی میں، ان معاشی اور سماجی حالات کو دخل ہے، جو جنگ عظیم کے بعد، یورپ اور امریکہ کے اکثر ملکوں میں پھیل گئے تھے۔ مقدمہ بازوں میں ایک کہاوت مشہور ہے: "جو جیتا سو ہارا اور جو ہارا سو مرا"۔ یہی کہاوت جنگ زدہ قوموں پر بھی پوری اترتی ہے۔ جنگ کے زمانے میں ہر فریق، جیتنے کی خاطر اپنی زندگی کے تمام ذریعوں کو بازی پر لگا دیتا ہے۔ اسی میں آیندہ زمانے کے ذریعے بھی ہوتے ہیں، جو مستقبل سے قرض لئے جاتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد جنگ زدہ قوموں کو تنگ دستی سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ معمولی زمانوں سے زیادہ محنت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ فرصت کے اوقات ان کی زندگی میں گھٹ جاتے ہیں۔ اسی لئے ان کے تفریحی مشاغل بھی مختصر ہو جاتے ہیں۔ پرانے زمانے کے طویل طویل ناٹک، جن کے بعض میٹھی نیند کے چار، چھ گھنٹے چڑھ جاتے تھے، اب بار خاطر بن جاتے ہیں۔ اسی لئے، ادیبوں نے، مختصر قصوں کی طرح، مختصر ڈراموں کی یہ شکل دریافت کی۔

پورا نشو و نما پایا ہوا ڈراما، پانچ اکٹ کا ہوتا ہے۔ بیسویں صدی تک جتنے بلند پایہ ڈرامے لکھے گئے وہ سب پانچ اکٹ کے ہیں کچھ عرصہ پہلے، وقت کی کمی اور مصروفیتوں کی زیادتی کی وجہ سے، تین اکٹ کے ڈرامے رائج ہونے لگے تھے ان کا اچھا خاصا ادب بھی پیدا ہوا، لیکن یہ ابھی عام نہ ہونے پائے تھے کہ وقت کی ضرورت نے انھیں اور بھی مختصر کر دیا۔ اور، وہ اب ایک اکٹ کے رہ گئے ہیں۔

اس طرح ایک اکٹ کا ڈراما، گویا اس صنف کی گاؤدم ترقی کا نقطۂ آخر ہے۔ لیکن اس کو، ہم نہ تو پانچ اکٹ کے ڈراما کا بچہ کہہ سکتے ہیں اور نہ تین اکٹ کے ڈراما کا چھوٹا بھائی۔ کیونکہ، قد و قامت کو چھوڑ کر، باقی تمام خصوصیات، میں وہ پانچ یا تین اکٹ کے ڈراما کا ہمسر ہے۔ بلکہ اس کو یہ امتیاز اور بھی حاصل ہے کہ، جو عقل و فراست اور سلطنت و عمل، بڑے ڈراما میں پانچ اکٹ پر پھیلا ہوا ہوتا تھا۔ وہ یہاں ایک اکٹ میں سمایا ہوا نظر آئے گا۔ اسی لئے اگر ہم اسے "باؤنا ڈراما" کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

اس باؤنے کے قد و قامت کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ اس کی عمر، عموماً بیس منٹ کی ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ اس کو آدھے گھنٹے میں ختم ہو جانا چاہیے۔ اس کے مقابلہ میں، تین اکٹ کا ڈراما، اگر بہ آواز بلند پڑھا جائے، تو دو تین گھنٹے میں ختم ہوگا۔ پانچ اکٹ کے ڈرامے، چار پانچ گھنٹے میں بھی بہ مشکل ختم ہو سکتے ہیں۔

الفاظ اور وقت کی یہ کفایت شعاری ہمارے زمانے کی خصوصیت ہے! لیکن بعض لوگوں نے اس کے ڈانڈے قدیم زمانے سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اسے یونانی "فارس"، تفریحی نقلوں اور "کرٹن ریزر" کی ترقی یافتہ شکل سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ غلطی ہے۔ ایک اکٹ کا ڈراما، مختصر قصے کی طرح، ٹھیٹ ہمارے زمانے کی پیداوار ہے۔

ادب کی کوئی صنف بھی ہو، چند عام اور چند خاص اصولوں کے تابع ہوگی۔ ادب کے عام اصول، نفیس خیالات، اسلوب اور زبان کی خوبی

اور مقصد میں وہ ادب جو افسانے اور قصے سے تعلق رکھتا ہے، اُس میں اشخاص قصہ اور خاکے کا مزید اضافہ ہے۔ ڈراما میں ان سب کے علاوہ مکالمہ بھی ہوتا ہے۔

ڈراما کی کوئی صورت اور کوئی صنف ہو، اس کا اہم ترین جز کردار یعنی وہ سیرتیں ہوتی ہیں، جو ڈراما میں کام کرنے والے اشخاص سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ڈراما کا خاکہ اور مکالمے، سب "اشخاص" سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ڈراما کی کامیابی کا بڑا انحصار کرداروں کی خوبی پر ہوتا ہے۔ جتنی کوشش ان پر صرف کی جائے، وہ ڈرامے کی کامیابی کا زینہ ثابت ہوتی ہے۔ ڈراما اگر ذہنوں میں محفوظ اور تازہ رہ سکتا ہے، تو وہ کردار ہی کی بدولت ممکن ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ڈراما کا تعلق پیش کشی سے ہے، اس لئے کردار کی خوبی یا خرابی کا انحصار اداکاروں پر ہے، اور خود کردار بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، وہ حقیقت میں غلطی پر ہیں۔ یہ صاف بات ہے کہ کردار، اگر بذات خود اچھے نہ ہوں، تو اداکار ان میں جان ڈال سکتے ہیں، اور نہ اسٹیج کے منتظم۔ اس کو یوں سمجھئے کہ شکسپیر کا مشہور ڈراما جو "ہملٹ" ہے۔ اس کی خوبی، خون آشامی کے افعال میں مضمر نہیں بلکہ خود ہملٹ کے کردار میں ہے۔

ایک اکٹ کے ڈرامے میں، کردار اور بھی اہم ہوتے ہیں۔ بڑے ڈراموں میں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اشخاص زیادہ ہوں۔ اور ہیرو کے علاوہ، دوسرے اشخاص بھی دلچسپ ہوں۔ ایسی صورت میں لوگوں کی توجہ کہیں نہ کہیں الجھی رہ سکتی ہے۔ لیکن ایک اکٹ کے ڈراما میں، ضمنی اشخاص شاذ و نادر ہوتے ہیں۔ اس لئے مخاطب کی آنکھیں شروع سے آخر تک اصلی شخص پر جمی رہتی ہیں۔ جہاں یہ معیار سے گرا ڈراما کی ساری عمارت زمین پر آرہی۔

بڑے ڈراما میں، کرداروں کا ارتقا عمل میں آتا ہے۔ لیکن ناول کے مقابلے میں یہاں اختصار سے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔ اسی سے ایک اکٹ کے ڈراما کا اندازہ کیجئے۔ یہاں کردار کے ارتقا کی گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ وہ صرف کردار یا سیرت کا ایک پہلو پیش کرتا ہے۔ اگر کسی پس منظر کے پیدا کرنے کی ضرورت آ پڑی ہو تو ایک دو جملوں سے زیادہ کا موقع نہیں۔ جو ڈراما نگار، کردار کی تفصیلات میں پڑ جاتے ہیں، وہ ڈراما کو تباہ کر کے چھوڑتے ہیں۔ یہ چیز ایک مثال سے اچھی طرح ذہن نشین ہو سکتی ہے۔ پانچ اکٹ کے ڈراما میں ایک کردار، زید کی زندگی کے اہم واقعات کی تصویر، اسباب و علل کے جوڑ گھٹنے کے ساتھ پیش کی جائے گی۔ ایک اکٹ کے ڈراما میں "زید" کی زندگی کا صرف ایک پہلو، مثلاً اس کی شادی، کسی دوست سے لڑائی، یا اسی طرح کا کوئی واقعہ پیش کیا جائے گا۔

ڈراما کا خاکہ، دوسرا اہم جز ہے۔ یہ ان افعال کا نتیجہ ہوتا ہے، جو اشخاص انجام دیتے ہیں۔ خاکہ، جب پانچ اکٹ پر پھیلا ہوا ہو تو ظاہر ہے کہ اس میں شاخیں پھوٹ سکتی ہیں، برگ و بار آ سکتے ہیں۔ بعض وقت وہ ایک سے زیادہ سلسلۂ واقعات پر حاوی ہو سکتا ہے۔ اس میں یہ فائدہ ہے کہ اگر کوئی سلسلۂ واقعات بے مزہ ہو جائے، تو دوسرے سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے، اور ڈراما کی دلچسپی گھٹنے نہیں پاتی۔

اس کے مقابلے میں، ایک اکٹ کا ڈراما، اتنا مختصر ہوتا ہے کہ اس میں کئی واقعات شامل نہیں ہو سکتے، بلکہ صرف ایک واقعہ پیش کیا جائے گا، باقی جو کچھ ہوگا اسی واقعہ کا سابقہ یا لاحقہ۔ دوہرے یا مخلوط خاکے اس کی فطرت کے منافی ہیں۔ خاکے میں پیچیدگی پیدا کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ صرف ایک بحث یا ایک موضوع کو، آدھے گھنٹے کے اندر اندر شروع ہونا، بڑھنا اور ختم ہونا ہے۔ ظاہر ہے کہ الفاظ ضایع کرنے کی یہاں گنجائش نہیں،

جو کچھ ہو، راست اور انجام پر موثر ہو۔ اِس اعتبار سے ایک اکٹ کے ڈراما نگار کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس کا کام، کمالِ فن کا نمونہ ہوگا، بشرطیکہ وہ کام ہو۔ اس میں، جتنا وہ الفاظ سے کام لے گا، اس سے بہت زیادہ سوچنے اور سمجھنے کے لئے چھوڑ دے گا۔

ڈراما کے خاکے کی جان، "عمل" ہے۔ جن ڈراموں کا موضوع مار پیٹ یا اسی طرح کی چیزیں ہوتی ہیں، اُن میں عمل کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف، فلسفیانہ غور و فکر کے ڈراموں میں، عمل کی رفتار نسبتاً دھیمی ہوتی ہے۔ عمل کی رفتار کا تیز یا سست ہونا، ڈراما کے اچھے یا بُرے ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ تاہم واقعات، جب بہت زیادہ تاخیر سے حرکت کرنے لگیں، تو ڈراما بارِ خاطر بن جاتا ہے۔

ایک اکٹ کے ڈراما میں رفتارِ عمل سست نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے وہ، عام اور خاص سب کے لئے یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔

عمل کی رفتار کو، اس فن کے ماہروں نے ایک خط سے تشبیہ دی ہے اور اس کے منازل مقرر کئے ہیں۔ پہلی منزل، ابتدا ہے جہاں سے تمہید شروع ہوتی ہے پھر کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے، جس کی وجہ سے واقعات میں تصادم اور کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ ڈرامائی دلچسپی بڑھنے لگتی ہے اور خط اوپر کو اٹھنے لگتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایسے نقطے پر پہنچ جاتا ہے جہاں کش مکش انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ اسے "منتہا" کہتے ہیں۔ اس کے بعد سے انکشاف کی منزل شروع ہوتی ہے اور خط نیچے اترنے لگتا ہے، یہاں تک کہ وہ کسی واقعہ پر ختم ہو جاتا ہے۔

چھوٹے ڈراموں میں ڈرامائی دلچسپی کا خط، ہوائی کی طرح ایک دم اوپر چڑھ جاتا ہے اور پھر پلٹ کر زمین پر آ رہتا ہے۔ اس کی منزلوں کو بڑھانے کی یہاں گنجایش نہیں ہوتی۔ دو یا زیادہ سے زیادہ تین منزلوں پر یہ ختم ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے کہ (ا) نقطۂ آغاز ہے، (ب) منتہا ہوگا اور (ج) اختتام۔ کبھی کبھی (ب) اور (ج) ملے ہوئے بھی ہوتے ہیں۔

ڈراما کے ساتھ "تین وحدتوں" کا اصول خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ عمل، وقت اور مقام کی وحدتیں ہیں۔ عمل، وقت اور مقام میں، فصل اور کھانچے، ڈراما کے بنیادی اصول کے منافی سمجھے جاتے ہیں۔ ناول میں اس طرح کے فصل کو ناول نگار سمجھا سکتا ہے کیونکہ وہ پورے وقت میں پڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ لیکن ڈراما میں ڈراما نگار، اپنی زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے علاوہ ناظرین، کے ذہن بھی ایسے فصل کو سمجھ نہیں سکتے جو عمل، وقت یا مقام میں ظاہر کیا جائے۔

گویا اِس اصول کی پابندی، ناظرین اور اسٹیج کے تعلق سے اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ اور ڈراما کا تصور، اسٹیج کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ لیکن بعض اساتذۂ ادب، جیسے ہنری ہڈسن، اس اصول کی اندھی تقلید کے مخالف ہیں۔ وہ اس کو بعد کے لوگوں کی بدعت سمجھتے ہیں۔ بہر حال طویل ڈراما میں، ان وحدتوں یا ان میں سے کسی ایک وحدت کی پیروی ضروری ہو یا نہ ہو، لیکن ایک اکٹ کے ڈراما میں یہ تقریباً ناگزیر ہیں۔ اس مختصر ادبی پارے میں نہ تو عمل کی دوئی ممکن ہے اور نہ وقت اور مقام کے اعتبار سے فصل کا موقع ہے۔ ان کا وجود اور عدم چند گھنٹوں کے مفروضہ وقت، ایک دیوان خانے، گھر کے کمرے یا باغ، اور ایک واقعے پر موقوف ہے۔ حقیقت میں، اس سے ساز و سامان، اور وقت دونوں کی بڑی کفایت ہوتی ہے۔

دو چیزیں اور ہیں، جو ڈراما کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ یہ بیان اور عمل ہے۔ ڈراما میں ہر بات عمل کے ذریعہ ظاہر کی جاتی ہے۔ لیکن بعض جزئیات ایسی ہوتی ہیں، جن کا اسٹیج پر عملاً پیش کرنا فضول ہوتا ہے۔ اسی لئے ایسے امور عموماً، اشخاصِ قصہ کی زبان سے ظاہر کر دیے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی غیر اہم شخص کی موت کی اطلاع دینی ہو تو یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اسٹیج پر لایا جائے اور مرتا ہوا دکھایا جائے۔ ایک اکٹ

کے ڈراما میں پہلے تو ضمنی اور غیر ضروری واقعات کی گنجایش نہیں ہوتی، اگر یہ ناگزیر ہوں تو بھی عملاً ان کا پیش کیا جانا ممکن نہیں۔ اسی لئے یہ چیز بر سبیل تذکرہ بیان کر دی جاتی ہیں۔

ایک اکٹ کا ڈراما، طویل ناٹکوں کی طرح، محض اسٹیج کو سامنے رکھ کر کم لکھا جاتا ہے۔ اسی لئے وہ کھیل اور ادب دونوں کی خصوصیت رکھتا ہے۔ عام طور پر، اس کے لکھنے والوں کے پیش نظر ناظرین سے زیادہ قارئین ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس میں پڑھے جانے والے ادب کی خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔ اس کا اندازہ ہم کو اس وقت ہوتا ہے جب یہ ڈرامے اسٹیج پر پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ان کو اسٹیج کے قابل بنانے کے لئے بہت کچھ تبدیلی کرنی پڑتی ہے، قدیم ڈراما نگار وقت، اسٹیج، ناظرین اور عام مذاق کے چوکھٹے کے اندر ڈراما تیار کرتا تھا۔ لیکن موجودہ ڈراما نگار، اپنے آپ کو کسی اصول کا پابند بنانے کو بھی اپنی قابلیت، اپج اور آزاد خیالی کی ہتک سمجھتا ہے۔

ایک اکٹ کے ڈرامے، طویل ڈراموں کی طرح نظم اور نثر دونوں میں لکھے جاتے ہیں۔ لیکن منظوم ڈرامے کچھ مزاج وقت کے موافق نہیں معلوم ہوتے۔ اس لئے یہ شاذ و نادر ہی لکھے جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ پیشہ ور اسٹیج کو، ابھی ان کھیلوں کا مصرف معلوم نہ ہو سکا، لیکن شوقین ادارے انہیں سے کام لے رہے ہیں۔ ریڈیو نشر کے لئے بھی یہی موزوں ثابت ہوئے ہیں۔ بعض اہم فلم کمپنیاں اپنے بہترین اداکاروں کے ساتھ، چھوٹے ڈرامے تیار کرنے پر بھی سنجیدگی سے غور کر رہی ہیں۔ اس طرح توقع ہے کہ ایک اکٹ کے ڈرامے، بہت جلد، ادب کی سب سے اہم صنف بن جائیں گے۔

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہوا)　　**عبدالقادر سروری**

کشمکش

(شریکِ زندگی کے نام)

تم ہو حیران کیا کر رہا ہوں!

ساری دنیا کی رسمیں مٹا کر — ساری دنیا سے نظریں ہٹا کر!
دل کی تاریکیٔ دردوغم کو — آنسوؤں کی چمک میں چھپا کر!
بزمِ عشرت میں ساغر ٹپک کر — پیارے ہاتھوں سے دامن چھڑا کر!
سرخ ہونٹوں کی ہر التجا کو — اپنی نظروں کی زد سے بچا کر!
غم کی راتوں کو افسانہ کر کے — دل کی باتوں کو نغمہ بنا کر!

ایک دنیا الگ ہی بنا کر!!
تم ہو حیران کیا کر رہا ہوں!

پوچھتی ہو، زمانہ کہاں ہے؟ — برق کی زد میں جب آشیاں ہے!
خون بہتا ہے اشکوں کے بدلے! — تم سمجھتی ہو دل کو، جواں ہے!
دیکھو دنیا کو، کیا بن گئی ہے — رنگِ حسنِ چمن اب کہاں ہے!
زلزلے آرہے ہیں زمیں میں — منہ کو کھولے ہوئے آسماں ہے!
ایک عالم پہ طاری بڑھاپا — یہ تو زندوں کا شاندمساں ہے!

میرا احساس پھر بھی جواں ہے!!
تم ہو حیران کیا کر رہا ہوں!

کیا سنو گی یہ خونیں کہانی! — موت سے کم نہیں زندگانی!
چند مزدور کچھ بے نوا ہیں — اور چمکتا ہے تاجِ کیانی!
قصر بنتے ہیں، بنتے رہیں گے — خون ہوتا ہے بھوکوں کا پانی!
ہائے مفلس کی آنکھوں کے حلقے — آہ، بیوہ کی سہمی جوانی!
تیغ ہاتھوں میں لینی پڑے گی — ہو چکی آنسوؤں کی روانی!!

پھر سنو گی، یہ خونیں کہانی!!
تم ہو حیران کیا کر رہا ہوں!

آؤ دیکھو بھیانک نظارے　　کتنے خاموش ہیں چاند تارے!
ابر سے آگ گرتی ہے پیہم　　اور ہواؤں میں پنہاں شرارے!
چشمِ انساں میں حل ہو گئے ہیں　　سرخ شعلوں کے خونیں اشارے!
خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں　　اور چڑھتے ہی جاتے ہیں دھارے!
زندگی کو سمجھنا پڑے گا　　موت کی لوریوں کے سہارے!

اس نشے کو نہ کوئی اتارے!!
تم ہو حیران کیا کر رہا ہوں!

جیل جانا ہے" "جانے نہ دوں گی!"　　کیا کہا! "غم اٹھانے نہ دوں گی"!
"اپنے زانو پہ بے ہوش کرکے　　ہوش آئے تو آنے نہ دوں گی!
چھین کر فرقِ فرض و محبت　　آنسوؤں کو بہانے نہ دوں گی!
لے ملاتی ہو زنجیر جن سے　　ایسے نغمے سنانے نہ دوں گی"!
لو چلا میں، بلاتا ہے کوئی　　پھر کہو! "تم کو جانے نہ دوں گی"!

کیا کہا! غم اٹھانے نہ دوں گی!!
تم ہو حیران کیا کر رہا ہوں!

نظرؔ حیدرآبادی

ضروری اعلان

فروری ۱۹۴۲ء کے پہلے ہفتے میں سب رس کا ایک خاص شمارہ "**جنگ نمبر**" شائع ہوگا۔ اس شمارہ کی ترتیب میں جنگ کے متعلق اہم اور ضروری معلومات پیش کی جا رہی ہیں۔ مضامین کے تنوع اور افادیت کے پیش نظر اس کے لکھنے والے اپنی اپنی حیثیت سے ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

توقع ہے کہ یہ شمارہ اپنی نوعیت، اہمیت اور افادیت میں یکتا رہے گا اور اردو ادب میں ایک ہر جہتی معلوماتی کتاب کا اضافہ ثابت ہوگا۔

مدیر

گیتانجلی

(ڈبلیو، بی ییٹس کا مقدمہ)

کچھ دن ہوئے میں نے ایک ممتاز بنگالی طبیب سے یہ کہا تھا "میں جرمن زبان نہیں جانتا، لیکن اگر کسی جرمن شاعر کا کلام مجھے متاثر کرتا، تو میں یقیناً برٹش میوزیم جاتا، اور انگریزی زبان میں چند ایسی کتابیں پڑھتا جن میں اس شاعر کے کچھ حالاتِ زندگی معلوم ہوتے اور اس کے خیال کی تاریخ سے واقفیت حاصل ہوتی۔ اگرچہ رابندرناتھ ٹیگور کے ان نثری ترجموں نے مجھے اتنا متاثر کیا جتنا برسوں میں کسی اور چیز نے نہیں کیا تھا، افسوس ہے جب تک کوئی ہندوستانی سیاح مجھے واقف نہ کرائے، میں اس کی زندگی کے متعلق نہ کچھ معلوم کر سکوں گا، اور نہ ان تحریکات کا پتہ چلا سکوں گا جنھوں نے اس کے خیال کی تعمیر کی ہے۔" میرا یہ کہنا، اور اتنا متاثر ہونا ان بنگالی ڈاکٹر صاحب کو بالکل فطری معلوم ہوا، اور انھوں نے کہا — "میں ٹیگور کا مطالعہ ہر روز کرتا ہوں، کیونکہ ان کا ایک شعر پڑھنا زندگی کی ساری مصیبتوں کو بھول جانا ہے۔" اس پر میں نے کہا "اگر شاہ رچرڈ دوم کے زمانے میں لندن کے کسی باشندے کو پٹرارک یا دانتے کے ترجمے دکھائے جاتے، تو اس کے سوالات کا جواب دینے کے لئے انگریزی میں کوئی کتاب نہ ملتی۔ اسے مجبوراً فلارنس کے کسی بنکر یا لمبارڈ کے کسی تاجر سے اس طرح کچھ پوچھنا پڑتا جس طرح میں، آپ سے پوچھ رہا ہوں۔" انھوں نے جواب دیا "ہمارے دیس کے چند اور بھی شاعر ہیں، مگر کوئی ان کے برابر نہیں۔ ہم اپنے عہد کو رابندرناتھ کا عہد کہتے ہیں۔ مجھے یورپ میں کوئی شاعر اتنا مشہور نظر نہیں آتا، جتنا ٹیگور ہمارے یہاں ہیں۔ وہ جتنے شاعری میں بڑے ہیں اتنے موسیقی میں بھی ہیں۔ ان کے گیت مغربی ہندوستان سے لیکر برما تک ہر اس جگہ گائے جاتے ہیں، جہاں بنگالی زبان بولی جاتی ہے۔ انیس ۱۹ سال کی عمر میں جب کہ انھوں نے اپنا پہلا ناول لکھا، وہ کافی مشہور ہو چکے تھے۔ کچھ دنوں بعد کے لکھے ہوئے ان کے ڈرامے اب تک کلکتے میں دکھائے جاتے ہیں۔ میں ان کی زندگی کی کاملیت کو بہت پسند کرتا ہوں۔ جب وہ نوجوان تھے تو قدرتی چیزوں کے متعلق بہت لکھا کرتے تھے، اور تمام دن اپنے باغ میں بیٹھے رہتے تھے؛ پچیس سال کی عمر سے پینتیس سال کی عمر تک، جب کہ ان پر غم کے سخت دن آئے تھے، انھوں نے ہماری زبان میں نہایت خوبصورت عشقیہ شاعری کی۔" اس کے بعد انھوں نے بڑے جذبے کے ساتھ کہا "ان کی عشقیہ شاعری سے سترہ سال کی عمر میں مجھے جو فائدہ پہنچا بیان میں نہیں آ سکتا۔ اس کے بعد ان کی شاعری زیادہ مذہبی اور حکیمانہ بن گئی۔ انسانیت کے تمام حوصلے اور ارادے ان کے گیتوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں میں اور صاحب دل لوگوں میں یہ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے زندگی سے کبھی گریز نہیں کیا، بلکہ زندگی کے اندر ہی سے اپنا پیام دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان سے اتنی محبت کرتے ہیں۔"

ان کے یہ اچھی طرح چنے ہوئے الفاظ شاید میرے سینے سے اتر گئے ہوں، مگر ان کا خیال اب تک فراموش نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا تھا۔ "کچھ دن ہوئے ان کو ہمارے گرجا میں — ہم برہما سماجی لوگ مندر کو گرجا بھی کہتے ہیں — کچھ عبادت کرنی پڑی۔ یہ گرجا کلکتے میں سب سے بڑا تھا۔ یہ سب بھر گیا تھا، لوگ کھڑکیوں میں کھڑے ہو گئے تھے۔ اس سے زیادہ سڑکوں پر ہجوم تھا کہ گزرنا مشکل ہو گیا تھا۔"

اس طرح بہت سے ہندوستانیوں نے مجھ سے ملاقات کی اور اس شخص کی ان سب نے جو تعظیم کی وہ ہماری دنیا میں عجیب و غریب معلوم ہوتی تھی، کیونکہ ہم چھوٹی بڑی چیزوں کو بدیہی تمسخر، اور نیم سنجیدہ بے قدری کے ایک ہی نقاب میں چھپانے کے عادی ہیں۔ جب ہم اپنے کلیسا

بنا رہے تھے، تو کیا ہم بھی اپنے بڑے لوگوں کی ایسی ہی تعظیم کرتے تھے ؟ انہیں ہندوستانیوں میں سے ایک نے مجھ سے کہا " میں خوب جانتا ہوں، کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں یہ سماں دیکھا ہے کہ ہر روز صبح کے تین بجے ٹیگور مراقبے میں بے حس و حرکت بیٹھے رہتے تھے اور خدائے تعالیٰ کی ذات پر غور کرتے ہوئے ڈو گھنٹے تک اس عالم کیف سے بیدار نہ ہوتے تھے۔ دوسرے رشی ان کے والد جو مہارشی تھے، تمام دن اس مقام پر بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایک وقت دریا کی سیر کرتے ہوئے وہ منظر کی دلکشی دیکھ کر عالم فکر میں ڈوب گئے، اور کشتی بانوں کو اپنا سفر جاری کرنے کے لئے آٹھ گھنٹے انتظار کرنا پڑا " اس کے بعد اس نے مجھے مسٹر ٹیگور کے خاندانی حالات سنائے اور بتایا کہ کس طرح اس خاندان کی آغوش سے بڑے لوگوں کی کئی پشتیں عالم وجود میں آئی ہیں۔ اس نے کہا " اس خاندان سے کئی گگنندرا ناتھ اور آبندرا ناتھ پیدا ہوئے جو حسن کار ہیں۔ رابندرا ناتھ کے بھائی راجندرا ناتھ بھی ہیں جو ایک بڑے فلسفی ہیں۔ درختوں کی ڈالیوں سے گلہریاں اترآتی اور ان کے گھٹنوں پر چڑھ جاتی ہیں اور پرند شاخوں سے ان کے ہاتھوں پر آ بیٹھتے ہیں "

ان لوگوں کے اس خیال میں مجھے ایک حسن مرئی اور ایک معنی نظر آئے، گویا وہ نطشے کے اس نظریے کے قائل ہیں کہ ہمیں کسی اخلاقی یا ذہنی حسن پر اس وقت تک کوئی اعتقاد نہیں رکھنا چاہیے جب تک کہ وہ جلد یا بدیر مادی اشیا پر اثر انداز نہ ہو۔ میں نے کہا " مشرق میں آپ لوگ خاندانوں کی عظمت و احترام کو قایم رکھنا خوب جانتے ہیں۔ کل ہی کا ذکر ہے، عجائب خانہ کے ایک مہتمم نے ایک سیاہ فام شخص کے متعلق جو چینی کتبوں کو جھاڑ رہا تھا یہ کہا یہ میکاڈو خاندان کا ایک موروثی خادم ہے۔ اس جگہ کام کرتے ہوئے اس کی چودہ پشتیں گزر گئی ہیں۔" اس ہندوستانی نے کہا۔ " جب رابندرا ناتھ نوجوان تھے، تو ان کے مکان میں چاروں طرف موسیقی اور ادب ہی موجود رہتا تھا " میں نے ان کی نظموں کی بہت زیادہ سادگی کا خیال کرتے ہوئے کہا۔ " کیا تمہارے ملک میں بہت زیادہ پروپگنڈا اور تنقیدی کام ہوتا ہے ؟ ہمیں اس سرزمین پر اور بالخصوص میرے وطن میں اس قسم کا بہت کچھ عمل کرنا پڑتا ہے، حتی کہ ہمارے دل و دماغ آہستہ آہستہ اپنی تخلیقی قوت کھو بیٹھتے ہیں، اگر ہمیں کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ اگر ہماری زندگی ایک مسلسل جدوجہد نہ ہوتی، تو ہمیں کوئی ذوق نہ حاصل ہوتا، ہم یہ بھی نہ جانتے کہ خوب کسے کہتے ہیں، ہمیں نہ کوئی پڑھنے والا ملتا نہ سننے والا۔ ہماری زندگی کا سہ ربع حصہ بد ذوقی سے مقابلہ اور جنگ کرنے میں گزر جاتا ہے، خواہ یہ بد ذوقی ہمارے ہی دلوں میں ہو یا دوسروں کے دلوں میں۔ اس نے جواب دیا " میں خوب سمجھتا ہوں، ہمارے یہاں بھی پروپگنڈا کی تحریریں نکلتی ہیں۔ ہمارے گاؤں میں سنسکرت زبان کی وہ مذہبی نظمیں پڑھی جاتی ہیں جو ازمنۂ وسطیٰ میں لکھی گئی تھیں۔ ان میں بعض ایسی ہوتی ہیں جن میں لوگوں کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ دل سے اپنے فرض ادا کریں "

(۲)

کئی دنوں تک میں ان ترجموں کے مسودات کو اپنے ساتھ لئے لئے پھرتا رہا۔ انھیں ریلوں میں پڑھتا، کبھی ڈونرلہ موٹروں کی چھتوں پر اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر ان کا مطالعہ کرتا تھا بعض وقت میں انھیں اچانک بند کر دینے پر مجبور ہو جاتا تاکہ لوگ ان کا مجھ پر اثر دیکھ کر حیرت نہ کرنے لگیں۔ یہ دل کے نغمے ــــ جن کے متعلق میرے ہندوستانی دوست یہ کہتے ہیں کہ اصل میں یہ لَے کی غیر محسوس خوبیوں سے مالا مال، رنگ کے ناقابل ترجمہ نزاکتوں، اور بحروں کی اختراع اور جدت سے بھرے ہوئے ہیں :- اپنے خیال کی دنیا میں مجھے اس عالم کی سیر کراتے ہیں جس کا خواب میں نے عمر بھر دیکھا ہے۔ یہ گیت ایک اعلیٰ ترین تہذیب کی پیداوار ہیں، اور ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ سبزہ اور پتوں کی طرح یہ ایک ہی سرزمین سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ایک روایت معلوم ہوتے ہیں جس میں شاعری اور مذہب رہتے بستے نظر آتے ہیں۔ جاہلوں اور عالموں سے استعارے

اور جذبات جمع کرتے ہوئے یہ صدیوں کے دَور سے گزرے، اور نیک دلی اور علم کے خیالات لے کر پھر یہ کثیر مخلوق کی طرف لوٹ آئے۔ اگر بنگال کی تہذیب اسی طرح قایم رہے، اگر وہ عام دل، وہ "قلبِ محیط" جسے ربانی کہا جاسکتا ہے ــــ سب میں جاری وساری رہے، اور جس طرح ہماری حالت ہے، یہ کئی ایسے دلوں میں بٹ نہ جائے جو ایک دوسرے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے ــــ تو ان نظموں کی غیر محسوس اور موہوم باتوں میں سے بعض ایسی ہوں گی، جو چند نسلوں کے بعد، سڑکوں پر صدا لگانے والے فقیروں تک پہنچ جائے گی۔ جب انگلستان کا دل کسی زمانے میں ایک تھا، اس وقت ہمارے شاعر چاسر نے "ٹرائلس اور کرسیڈا" لکھی، اور گو اس لئے لکھی کہ وہ پڑھی جائے یا پڑھ کر ختم کر دی جائے ــــ کیونکہ ہمارا زمانہ قریب آرہا تھا! ــــ تاہم بعض مطربوں نے اسے کچھ دنوں کے لئے گایا ــــ رابندر ناتھ ٹیگور، چاسر کے پیشروؤں کی طرح، اپنے الفاظ کے لئے موسیقی لکھتا ہے، اور ہر لحظہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت پُرگو، سلاست اور آمد سے سرشار، اپنے جذبات پیش کرنے میں بہت نڈر، اور بہت حیرت میں ڈالنے والا ہے، کیونکہ وہ ایسا کام کر رہا ہے جو کسی وقت بھی انوکھا، فطرت سے دور نہیں معلوم ہوتا، اور نہ کبھی اس کو کسی سہارے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ نظمیں خواتین کے روبرو میزوں پر، عمدہ خط میں لکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی کتابوں میں رکھی نہیں رہیں گی، تاکہ وہ تنجنتر کے ساتھ ورق الٹاتی رہیں۔ اور اپنی زندگی کے جو کچھ معنی سمجھے ہیں ان پر سرد آہیں بھرتی رہیں۔ یا جامعہ کی چار دیواری میں طلبہ انھیں اٹھائے نہیں پھریں گے، کہ جب اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کا وقت آئے تو انہیں تہہ کرکے رکھ دیں۔ بلکہ جوں جوں زمانہ گزرے گا، مسافر انھیں شاہراہوں پر گنگنائیں گے، اور کھیون ہار انھیں گاتے ہوئے کشتیاں چلائیں گے۔ محبت کے پجاری، فراق کی گھڑیاں جھیلتے ہوئے، ان کی سمرن پڑھیں گے، اور اس ایشور پریم میں انھیں جادو کی ایک گنگا دکھائی دے گی جس میں ان کی پاپن آشائیں نہائیں گی اور پھر سے اپنی جوانی پائیں گی۔ ان گیتوں میں ہر گھڑی اس شاعر کا دل ان پر کھلتا رہے گا، نہ ان کی ہمت پست ہوگی اور نہ ان کا پاس ولحاظ کم ہوگا، کیونکہ یہ وہ دل ہے جس میں ان کی وارداتیں بھری ہوئی ہیں۔ وہ جاتری جو گیروے لباس میں ہے تاکہ گرد اس کے دامن پر نظر نہ آئے، وہ کنیا جو اپنے راج کنور کے گلے سے ٹوٹے ہوئے ہار کے پھولوں کو اپنے بستر پر چن رہی ہے، وہ نوکر، یا وہ دلہن جو خالی مکان کے دروازے پر اپنے مالک کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے، یہ سب اس دل کے مرقعے ہیں جو خدا سے لگا ہوا ہے۔ پھول اور چشمے، نرسنگھے کی پکار، ہندوستان کی طوفانی برکھا، یا جلتی ہوئی گرمی، اس ایک دل کی کیفیتوں کی شبیہیں ہیں جو فراق میں بھی ہے اور وصال میں بھی۔ وہ کشتی بان جو بانسری بجاتا ہوا، دریا پر کشتی کھے رہا ہے، اور جو کسی چینی تصویر کے آدمی کی طرح پُراسرار نظر آتا ہے، خدا ایشور ہے۔ پوری قوم کی قوم، تہذیب کی تہذیب، جو ہمارے لئے بہت ہی نئی اور عجیب ہے، اس بڑے تخیل میں بس گئی ہے۔ ہم اس لئے سر نہیں دُھنتے کہ یہ ہمارے لئے عجیب ہے، بلکہ اس لئے وارفتہ ہوتے ہیں کہ اس میں خود اپنی شبیہہ نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم راز ٹی جیسے شاعر کے نیستان میں پھر رہے ہیں، یا ادب میں سب سے پہلی مرتبہ اپنی آواز اس طرح سن رہے ہیں جیسے کوئی خواب میں پکار رہا ہو۔

نشاۃِ جدیدہ کے بعد سے یورپی بزرگوں کی تحریریں ــــ جن کے استعارے اور خیالات کے عام ڈھانچے چاہے جس قدر اپنے معلوم ہوں اب ہمارا دل نہیں پسیجتیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمیں ایک دن دنیا چھوڑنی پڑے گی۔ ہم اپنی تکان یا خوشی کی گھڑیوں میں اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے دنیا سے دور ہو جائیں، لیکن یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم، جنھوں نے شعر و سخن کا اتنا لطف اٹھایا ہے، اتنی

تصویریں دیکھی ہیں' اور اتنے نغمے سنے ہیں' اور جہاں تن اور من کی آوازیں ایک سی ہو گئی ہیں' اس دنیا کو اتنی بے رخی کے ساتھ چھوڑ بیٹھیں۔ سینٹ برنارڈ اپنی آنکھیں بند کر کے سوئٹزرلینڈ کی جھیلوں کے حسین مناظر دیکھنے سے انکار کرتا ہے' یا "کتاب الہام" میں بہت جوشیلی خطابت پائی جاتی ہے' تو ان دونوں سے ہم کس طرح ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ ان کی وہ کونسی باتیں ہیں جو ہم میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مگر' ہم چاہیں تو' جس طرح گیتانجلی میں ہے' ہمیں بڑے منکسرانہ اور کریمانہ الفاظ مل سکتے ہیں ــــ

"مجھے چھٹی مل گئی۔ بھائیو' مجھے الوداع کہو۔ میں تمھیں پرنام کرتا ہوں اور رخصت ہوتا ہوں۔ یہ لو'
دروازے کی کنجیاں سنبھالو' اب اس مکان پر میرا کوئی تصرف نہیں۔ بھائیو' جاتے ہوئے تمھاری
زبان سے دو میٹھے حرف سننا چاہتا ہوں۔ کتنے دنوں تک ہم تم ہمسایہ رہے' اور میں نے دینے
سے زیادہ بہت کچھ پالیا۔ اب دن نکل چکا ہے اور وہ دیا جو میرے اندھیرے گھر میں اجالا کرتا تھا
بجھ گیا۔ بلاوا آچکا ہے' اور میں سفر کے لئے تیار ہوں!"

جب اے کیمپس یا جان آف دی کراس کی زبان سے یہ دور و دراز آواز سنتے ہیں ــــ

"اور چونکہ میں اس زندگی سے محبت رکھتا ہوں' اس لئے جانتا ہوں کہ مجھے موت سے بھی محبت رکھنی ہوگی"

تو اس میں ہمارے ہی دل کی کیفیت نظر آتی ہے۔ گیتانجلی میں جدائی کی جو گہرائیاں ہیں وہ صرف ہمارے دماغوں اور خیالات ہی میں نہیں ہیں بلکہ دل میں بھی اتر گئی ہیں۔ اس پر یقین رکھنا تو کجا' ہم یہ تک نہ جانتے تھے کہ ہم خدا سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن اپنی زندگی کو مڑکر دیکھتے ہوئے' جب ہم اپنے بیابانوں کی پگڈنڈیوں' اپنے پہاڑوں کی تنہائیوں' اور ان الفتوں پر جو ہم نے چھپے چھپائے اپنی عورتوں سے کرنے کا دعوی کیا ہے نظر ڈالتے ہیں' تو ہمیں ان میں گیتانجلی کا یہ جذبہ نظر آتا ہے جس کی وجہ سے ایک شیریں فریب پیدا ہوتا ہے ــــ

"میرے راجہ' تم بھیڑ بھاڑ سے عام لوگوں کی طرح چھپے چھپائے میرے دل میں آکر' میری بہت سی گزرتی ہوئی
عمر کی گھڑیوں پر جاوید کی مہر لگاتے ہو۔"

یہ صدا کسی راہب کے تقدس یا تکلیف جسمانی کی صدا نہیں ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کسی مصور نے' جو آب و گل اور نور دونوں میں رنگ بھرتا ہے' اپنے کسی تیز جذبے کی سنہری فضا میں اٹھا لیا ہے۔ اور اسی قسم کی آواز سننے کے لئے ہم سینٹ فرانسس یا ولیم بلیک کے قریب ہو جاتے ہیں جو ہماری پرشور تاریخ میں ہم سے بہت دور ہو گئے ہیں۔

۳

ہم بڑی بڑی کتابیں لکھتے ہیں جن کے ہر صفحے پر شاید ہمیں ان کی تحریریں مسرت بخش نہیں معلوم ہوتیں۔ جس طرح ہم لڑتے جھگڑتے' روپیہ پیدا کرتے اور اپنے دماغوں میں سیاست بھر لیتے ہیں' اسی طرح ہم کوئی ایک عام خاکہ بنا لیتے اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ سلسلہ عمل اداسیوں سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن مسٹر ٹیگور' خود ہندوستانی تہذیب کی طرح' روح کا پتہ چلاتے' اس پر اطمینان رکھتے اور اس کی روانی کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ بہت سے موقعوں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹیگور اپنی زندگی کا مقابلہ ایسے لوگوں سے کر رہے ہیں جو ہماری طرح زندگی بسر کرتے ہیں' اور ظاہری طور پر دنیا میں ایک وزن رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اس انداز میں ایک قسم کا عجز و نیاز بھی پایا جاتا ہے گویا وہ اس بات کے

یقین رکھتے ہیں کہ ان کا راستہ ان کے لئے سب سے اچھا ہے ——

"لوگ گھر جاتے ہوئے مجھ پر نظر ڈالتے ہیں، اور مسکراتے ہیں اور مجھے محجوب کرتے ہیں۔ میں ایک غریب
بھکارن کی طرح آنچل سر پر ڈالے ہوئے بیٹھتا ہوں، اور جب وہ مجھ سے میری ضرورت دریافت کرتے ہیں،
تو میں آنکھیں نیچی کرلیتا ہوں اور کوئی جواب نہیں دیتا۔"

ایک موقعہ ایسا آتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو یاد کرتے اور دیکھتے ہیں کہ وہ کس قدر بدل گئی ہے تو کہتے ہیں ——

"خیروشر کی پیکار میں، میں نے اپنی کتنی ہی ساعتیں برباد کی ہیں، مگر اب میرے خالی دنوں کے ہمجولی کا
یہ تقاضا ہے کہ میں اپنا دل اس کی طرف پھیروں۔ مگر میں نہیں جانتا کہ یہ اچانک آواز مجھے کس بیکار نتیجے
کی طرف بلارہی ہے۔"

ان میں ایک معصومیت، ایک سادگی ہے، جو کسی اور جگہ ادب میں نہیں نظر آتی اس کی بدولت پرند اور "برگ درختان سبز"
ان کے اتنے قریب ہوجاتے ہیں جتنے کہ معصوم بچوں کے قریب ہوتے ہیں۔ موسموں کا بدلنا، گویا بڑے بڑے واقعات اور خیالات کا بدلنا
ہے۔ بعض وقت میں یہ غور کرتا ہوں کہ انھیں یہ باتیں آیا بنگالی ادب سے نصیب ہوئی ہیں یا مذہب سے! کبھی پرند کا ان کے بھائی کے
ہاتھوں پر آتے ہوئے یاد کرکے، مجھے یہ خیال ہوتا ہے اور اس پر خوشی بھی ہوتی ہے کہ یہ بات خاندانی ہے، ایک راز ہے جو صدیوں سے پرورش
پاتا رہا۔ یہ واقعہ ہے کہ جب وہ بچوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان میں اپنے من کی بات ڈال دیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساتھ ہی ساتھ
اولیا اور بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں ——

"وہ ریت میں اپنے محل بناتے اور خالی سیپیوں سے کھیلتے ہیں۔ سوکھے ہوئے پتے لے کر اپنی کشتیاں
بناتے اور وسیع سمندر میں انہیں مسکراتے ہوئے چھوڑ دیتے ہیں۔
بچے دنیا کے کناروں پر اپنا کھیل کھیلتے ہیں وہ پیرنا نہیں جانتے اور نہ جال پھینا جانتے ہیں۔
موتی نکالنے والے غوطے لگاتے ہیں، تاجر جہازوں میں سیاحت کرتے ہیں، لیکن بچے گھونگے جمع کرتے
اور انہیں پھر بکھیر دیتے ہیں۔ ان کو چھپے ہوئے خزانوں کی تلاش نہیں ہوتی۔ انہیں جال پھینا نہیں آتا۔"

(ترجمہ)　عبدالقیوم باقی

اردو کے چار نثر نگار

غالب جس طرح اردو غزل میں، ایک جدید مکتبۂ خیال کا بانی ہے، اسی طرح نثر نگاری میں بھی، اس کا اسلوب اچھوتا، تخلیقی اور انتہائی دلچسپ ہے، حیرت ہے کہ۔

اک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز — چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

اور شمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا

جیسے شعر کہنے والا، اپنے خطوط میں اس قدر سہل، عام فہم اور سلیس زبان استعمال کرتا ہے کہ اس سے زیادہ سہل اور سلیس زبان کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ غالب خط کا ہے کو لکھتا ہے، بات چیت کرتا ہے، جیسے سچ مچ دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کررہے ہیں۔ غالب کے بعد اب تک اردو زبان کتنے ہی دوروں سے گزر چکی ہے، مگر غالب کے خطوط کی دلچسپی بدستور باقی ہے اور ادب اردو کے اس زمانہ میں جسے میں "افسانوں اور ڈراموں کا زمانہ" کہتا ہوں، غالب کے خطوط کو ارباب ذوق، تبرک کی طرح آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

جاڑے کی رت ہے، شراب ختم ہوچکی ہے، اسی عالم میں غالب، میر مہدی مجروح کو خط لکھتا ہے۔

میر مہدی!

صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے، انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے، دو حرف لکھتا ہوں، آگ تاپتا جاتا ہوں، آگ میں گرمی سہی مگر ہائے وہ آتشِ سیال کہاں، کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی، دل توانا ہوگیا، دماغ روشن ہوگیا اور نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہونچا۔ ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! ہائے غضب!

الفاظ کا تناسب اور جملوں کا (construction) دیکھئے! ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر نہیں کیا جاسکتا اور ان چند لفظوں کی اثر انگیزی کا یہ عالم ہے کہ زاہدِ شب زندہ دار بھی اس خط کو پڑھے، تو بے اختیار پکار اٹھے۔

مے باندازۂ حرام آمدہ ساقی! برخیز — بشکن شیشۂ خود بر سرِ پیمانۂ ما

ایک دوسرا خط بھی ان ہی میر مجروح کے نام ہے:۔

بھائی!

کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں! دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روزہ بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں! ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا......

خط نہیں ہے "شہر آشوب" ہے، مرثیہ ہے، نوحہ ہے! غالب نے دل کی پھانسیں کاغذ پر نکال کر رکھ دی ہیں، اور آخری ٹکڑا تو زہر میں

بجھا ہوا نشتر ہے کہ ذرا سا کچو کا لگتے ہی، تمام جذبات متاثر ہو جاتے ہیں، اسی آپ کی دلی کے متعلق جس نے بھی کہا خوب کہا۔
دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

مولنٰا حالی غالب کے قابلِ فخر شاگرد مولنٰا حالی پانی پتی بھی نثر نگاری میں اپنے استاد سے بڑی حد تک متاثر ہیں، حالی کا اسلوب نگارش بھی بہت سادہ اور دلآویز ہے، خالص علمی اور تنقیدی مضامین میں بھی حالی اردو نثر کو "بدرچاچ" نہیں بناتے۔ سیدھی سادی باتیں بیان کرتے ہیں مگر پورے عالمانہ اور ناقدانہ وقار کے ساتھ! حالی کے طرزِ تحریر میں گھلاوٹ پائی جاتی ہے اور ان کے طویل سے طویل مضمون کو پڑھ کر نہ تو جی اُکتاتا ہے اور نہ طبیعت اچاٹ ہوتی ہے۔ اردو ادب میں "حیاتِ جاوید" فنِ سیرت پر پہلی کتاب ہے، جس میں سوانح نگار نے صاحب سوانح کی زندگی کو اصلی رنگ میں پیش کیا ہے۔ حالی کی نثر ان کی سیرت کی طرح پاکیزہ اور ہموار ہے۔

کسی نے اچھے شعر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :۔
"اچھا شعر وہ ہے، جس کو سن کر لوگ سمجھیں کہ ہم بھی ایسا کہہ سکتے ہیں، لیکن جب کہنے کو بیٹھیں تو کہہ نہ سکیں"
بالکل یہی حال نثر کا ہے، ہر لکھنے والا واقعات اور واردات کی ترجمانی کی کوشش کرتا ہے، لیکن بہت کم لکھنے والے اس کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں۔ دل کی بات، کاغذ پر آکر "وہ" نہیں رہتی "جو" دل میں ہوتی ہے۔ اچھے اور ناکام مضمون نگار جب واقعات و واردات کی ترجمانی میں ناکام ہونے لگتے ہیں، تو الفاظ سے کھیلتے ہیں کبھی طلسم ان کی کمزوری کا تھوڑا بہت پردہ رکھ لیتا ہے۔
مولنٰا حالی اس منزل کے شہسوار ہیں، واقعات و واردات کی ترجمانی میں ان کو یدِطولیٰ حاصل ہے، ان کی نثر اسی لئے بناوٹ اور تکلف سے پاک ہے، میں نے حالی کے مضامین سے چند جملے منتخب کئے ہیں، جو یہاں درج کرتا ہوں :۔

"سچ میں اور صرف سچ میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اس میں زیادہ گرید کی جاتی ہے، اسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں"۔

"تھوڑی سی تعلیم، بہت تجربہ اور بالکل سچائی، یہ تینوں مل کر ایسے ایسے کام انجام دے سکتے ہیں، جو بڑے بڑے مدبروں سے انجام نہیں پا سکتے"۔

"قوم میں لائق آدمی روز بروز بڑھتے جاتے ہیں، مگر مزدوروں کا گھاٹا ہوتا جاتا ہے"۔

"جوہریوں سے بازار پٹا پڑا ہے، مگر کان کھودنے والے مفقود ہیں"۔

یہ چند جملے جو ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے ہیں، حالی کے طرزِ نگارش کی خوبیوں کا تھوڑا بہت اتا پتہ دیتے ہیں۔ زبان کی سلاست اور گھلاوٹ کے علاوہ، حالی کے یہاں تفکر اور حکمت بھی پائی جاتی ہے؛

علامہ آزاد مولنٰا ابوالکلام آزاد اپنی طرز کے موجد اور خاتم ہیں، بہت سے لوگوں نے ان کی نقل اتارنے کی کوشش کی، مگر قدم قدم پر ٹھوکر لگی اور دن میں تارے نظر آنے لگے، ابوالکلام کے مضامین میں خطابت کا جوش نظر آتا ہے اور اردو ادب کے وہ پہلے انقلابی ادیب ہیں۔ ان کی نثر جوش و عمل کا آتش کدہ ہے جس کی گرمی افسردہ روحوں کو گرماتی ہے۔ سروالٹر اسکاٹ اور ڈان ژاک کو

کی طرح ابوالکلام بھی قوم و ملک کو خطابت کے زور سے انقلاب کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نثر "پیغام انقلاب" ہے " بانگ درا" ہے "انقلاب جنگ" ہے! جب ہی تو امام المتغزلین مولانا حسرت موہانی کو کہنا پڑا کہ :-

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر نظم حسرت میں بھی مزہ نہ رہا

ابوالکلام اپنے پیش رو نثر نگاروں غالب اور حالی کی طرح چھوٹے چھوٹے جملے نہیں لکھتے، ان کے یہاں طویل سے طویل جملے پائے جاتے ہیں، مگر یہ شرح و اطناب "مخل فصاحت" نہیں ہوتی، اور ارباب علم و معانی سے یہ نکتہ پوشیدہ نہیں ہے کہ مضمون نگاری کا یہ بہت بڑا وصف بلکہ اعجاز ہے۔ ابوالکلام کے بڑے بڑے جملوں میں الفاظ کا آپس میں ایسا ربط اور امتزاج پایا جاتا ہے کہ جملہ میں نام کو بھی جھول پیدا نہیں ہوتا اور پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے، اتنے ہی بڑے جملہ کی ضرورت تھی۔

ابوالکلام افراد سے نہیں قوم سے مخاطب ہیں، اس لئے وہ نثر میں کلیات اور نظریے پیش کرتے ہیں، عملی نظریے جو ایک تیز انقلاب کا سنگ بنیاد بن سکیں۔ ابوالکلام "فریب گلچیں" اور "سیاست صیاد" سے اچھی طرح باخبر ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ طایران چمن کی ہم نوائی کرنے کے بجائے، ان کی زم و نازک منقاروں میں جوہر شمشیر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ الہلال کے فائل کو اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو ہر مضمون میں یہی جذبہ نظر آئے گا کہ لکھنے والا اپنے احول کو بدل دینا چاہتا ہے اور اس کی غیور و خود دار طبیعت غلامی پر قانع ہونا نہیں چاہتی۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے بعض لوگوں کو شکوہ ہے، وہ عربی، فارسی کے مغلق الفاظ استعمال کرتے ہیں، لیکن شکوہ کرنے والے تصویر کے صرف ایک رخ کو دیکھا ہے، دوسرا رخ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ ابوالکلام کے مضامین سے چند جملے منتخب کرکے یہاں لکھے جاتے ہیں

"خدا کی آواز ایں کے کاموں سے نکلتی ہے۔"

"یہ سچ ہے کہ ہوا چراغ کی لو کو بجھا دیتی ہے مگر کیا یہ بھی سچ نہیں ہے کہ انگیٹھی کے شعلوں کو بھڑکا بھی دیتی ہے"

"میں حق کی خاطر دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں اور ایسی ایسی قویں میری دشمن ہیں، جن کے ہاتھوں میں قانون کا آلہ، جیل خانہ کی کوٹھڑیاں اور سولی کے تختے ہیں۔"

"راہ حق پرستی کی سب سے بڑی آزمایش چاندی کی چمک اور سونے کی سرخی میں ہے۔"

"دوسروں کی اس خوشی پر مجھے کیوں اعتراض ہو، جو میری خوشی کو نقصان نہیں پہونچا سکتی۔"

"سچ ہمیشہ سے ایک ابھرنے والا جوہر ہے، اگرچہ جھوٹ کی بڑی بڑی چٹانوں سے دبایا جائے۔"

"جو مسافر بستر سے اٹھ کر راہ میں سو جائے، وہ گو بستر سے اٹھ چکا ہے، لیکن نیند سے بیدار نہیں ہوا۔"

"باغ بانی کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ درختوں کی شاخوں کو پانی کی پچکاری سے پانی دیجئے، پہلی بات یہ ہے کہ جڑ کو تروتازہ کیجئے۔"

"انسان جسم کو پارہ پارہ کرسکتا ہے، پر دلوں کو نہیں بدل سکتا، زمین کی خشکی و تری کا نقشہ ممکن ہے کہ وہ بدل دے، لیکن قلب و روح کا ایک گوشہ بھی اس کے پھیرے نہیں پھر سکتا۔"

"یہ کونسی عقلمندی ہے کہ اگر جیب سے ایک دھیلا گر جائے تو ہاتھ سے اشرفی بھی پھینک دی جائے۔"

ابوالکلام آزاد کے مضامین اس قسم کے شہ پاروں سے بھرے پڑے ہیں، حکمت اور دانائی کی گہری باتیں، کس قدر سلیس اور آسان پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں!

گمنام ادیب

مہدی افادی کا نام بعض پڑھنے والوں کو اجنبی سا معلوم ہوگا، یہ ہماری بدقسمتی بلکہ شامتِ اعمال ہے کہ اپنے نامور ادیبوں کے نام اور کام سے ہم بے پرواہ ہوتے جاتے ہیں، جو چند لوگ روشنی میں آگئے ہیں، ان سے تو ہم واقف ہیں، لیکن بہت سے جوہر ہماری نگاہوں سے چھپے ہوئے ہیں اور ہماری کاہلی ہم کو ان تک پہونچنے نہیں دیتی۔ وقت آگیا ہے کہ گمنامی کی کان کے ایک ایک ہیرے کو ادب کے بازار میں لایا جائے، اردو کے مستقبل کو، اس کے ماضی سے ہی بہت کچھ سنوارا جا سکتا ہے۔

مہدی افادی ایک خاص طرزِ نگارش کے موجد ہیں، اردو ادب میں "طنز نگاری" کے وہ مقدمۃ الجیش ہیں۔ ہنسی ہنسی میں چٹکیاں لینا اور باتوں باتوں میں حکمت و دانش کے مسائل بیان کر دینا، مہدی کی نثر نگاری کا طرۂ امتیاز ہے۔ مہدی افادی کے یہاں بلا کی "آمد" پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ از خود مضمون نہیں لکھتے، کوئی لکھواتا ہے تو لکھتے ہیں۔

مہدی بڑے خوش پوشاک، خوش خوراک اور خوش سلیقہ انسان تھے، ان کے کپڑوں میں مشکل ہی سے سلوٹ پڑتی تھی، انتہائی صفائی پسند مزاج پایا تھا، یہی چیز ان کی نثر میں نمایاں ہے۔ ان کا توسنِ قلم، ادب کی وادی میں گرد و غبار سے دامن بچاتے ہوئے قدم اٹھاتا ہے۔ مہدی افادی نے سچ مچ نثر میں شاعری کی ہے۔

ایک مضمون میں کس قیامت کا جملہ کہہ گئے ہیں :-

"جو آگ برف کے ٹکڑوں پر سلگائی جائے وہ جل چکی۔"

مہدی افادی تحصیلداری کے عہدے پر فائز تھے، ان کے ایک انگریز عہدہ دار نے غلط سلط رپورٹ مرتب کی، جس کا مہدی پر بہت برا اثر ہوا، اس شدید تاثر کا اظہار ایک جملہ میں کس خوبی سے کیا ہے۔

"گورے کے دل کی سیاہی، جب قلم سے ٹپکتی ہے تو زیادہ پھیلتی ہے۔"

ایک جملہ میں اہلِ مغرب کی فطرت بیان کردی، طنز اور حقیقت آمیز طنز! اور یہ طنز اس وقت کی گئی ہے جب کہ "صاحب لوگوں" کے جوتوں کے تسموں کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے لوگ جھجکتے تھے۔

مہدی افادی کے ایک دوست کی شادی ہوئی، اتفاق کی بات کہ شادی کی پہلی رات میں ان کے دوست بیمار پڑ گئے، مہدی کی شوخ و رنگین طبیعت میں ترنگ پیدا ہوئی، دوست کو لکھا۔

"جسے "بستر شکن" ہونا تھا وہ شاعری کی اصطلاح میں صرف "شکنِ بستر" نکلا۔"

اس جملہ کی اثر انگیزی کے متعلق میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ بہت سے ناظرین، اس کو پڑھ کر کہیں سے کہیں پہونچ جائیں گے، حافظہ ایسے رنگین اوراق الٹنے کے لئے ہر وقت بے تاب رہتا ہے۔

ماہر القادری

خدا حافظ

دادی جان کی عمر پچاسی کے لگ بھگ تھی۔ وہ کمزور بھی بہت ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ ان کا دل اب بہت بڈھا ہوگیا ہے۔ گزشتہ سال سب سمجھتے تھے کہ وہ سردی کی شدت برداشت نہ کرسکیں گی۔ جب گرمی شروع ہوئی تو سب نے کہا کہ یہ تو ان کے لئے پیغام موت لے کر آئی ہے۔ گر لوگوں کی سب پیشین گوئیاں غلط نکلیں۔

وہ پرانے زمانے کی یادگار تھیں۔ ان کے گزر جانے کے بعد پرانی باشفقت زندگی کی یاد دلانے کے لئے کچھ بھی باقی نہ تھا۔ وہی زمین جہاں مویشیوں کے لئے گھاس اگا کرتی تھی اب ہنر کی پُر فضا مضافات بن گئی تھی۔ وہ سڑکیں جن پر ایک زمانے میں گائے بیل اور چھکڑے چلا کرتے تھے اب ان پر موٹریں سیکلیں اور لاریاں چلتی تھیں۔ گلیوں اور سڑکوں کے نام تک بدل گئے تھے۔ وہ چھوٹا سا گھروندا جسے دادی جان اور دادا جان نے اتنے شوق سے بنایا تھا موٹر اور باغ کا سامان رکھنے کے کام آرہا تھا۔ اور گھر کے اکثر حصے گرا بھی دئے تھے۔ کیونکہ نجمہ کا خیال تھا کہ ان سے سامنے کا خوبصورت منظر دکھائی نہیں دیتا۔ اس گھروندے کی جگہ ایک عالی شان مکان بن گیا تھا۔ نجمہ ہی نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ سب اصطبل اور گودام کی کوٹھڑیاں گرادی جائیں اب وہاں ایک گھوڑا یا گائے نہ تھی۔ چند مرغیاں بھی نہیں تھیں جو ہر روز صبح کی آمد کا اعلان کرتیں۔ یہاں تک کہ نجمہ نے خورشید کو چند خرگوش بھی نہ رکھنے دیئے اب اس کے پاس صرف ایک خرگوش رہ گیا تھا۔ جو اسے بہت پیارا تھا۔ خورشید کے بہت خوشامد کرنے پر نجمہ نے اسے رکھنے کی اجازت دی تھی۔ مگر گھر سے بہت دور نوکروں کی کوٹھڑیوں کے قریب اس کا گھر بنوایا تھا۔ خورشید دادی جان کا اکلوتا پوتا تھا اور نجمہ اکلوتی پوتی تھی ان کے ماں باپ مدت ہوئی مرچکے تھے۔ انھوں نے ہی ان کو پالا تھا۔ خورشید ابھی دس برس کا تھا۔ "مجھے کبھی امید نہیں تھی کہ نجمہ اتنی بے وقوف نکلے گی" وہ اکثر کہا کرتیں۔ دادی جان پانچ بچوں کی ماں تھیں۔ مگر اب ان میں سے صرف ایک بیٹا قاسم باقی تھا۔ اور اس کی بیوی کا نام نسیمہ تھا۔ جب نجمہ اور خورشید کے ماں باپ کا ایک ریل کے حادثے میں انتقال ہوا ہے تو خورشید صرف سال بھر کا تھا۔

یہ سچ ہے کہ ان کا دل بہت تھکا ہوا تھا۔ باوجود کمزور ہونے کے وہ روز صبح کو بہت ہمت کرکے اٹھتی تھیں۔ ان کی صبح کی نماز کبھی ناغہ نہیں ہوتی تھی۔ نجمہ کے نماز نہ پڑھنے پر وہ اکثر ناراض ہوا کرتی تھیں۔ بعض وقت وہ بہت بحال ہوتی تھیں۔ اور بعض مرتبہ بہت چڑچڑی ہو جاتی تھیں۔ کبھی ان کو نئے فیشن کے تکلیف دہ فرنیچر پر غصہ آتا تھا۔ کبھی بجلی کی چیزوں پر جھنجلاہٹ ہوتی ان کو نجمہ کا معمولی معمولی کاموں کے لئے نوکروں کو پکارنا بھی برا لگتا تھا۔

ان سب باتوں کے باوجود دادی جان حد سے زیادہ رحم دل اور خوش اخلاق تھیں۔ آج صبح گھر کے بے ڈھنگے پن سے وہ اور بھی چڑچڑی ہو رہی تھیں۔ قاسم اور نسیمہ آج کشمیر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ تمام گھر میں ایک گڑبڑ مچی ہوئی تھی۔

نسیمہ سیدھی سادی ادھیڑ عمر کی اور گول بدن کی عورت تھی۔ وہ ایک دفعہ خدا حافظ کہہ کر پھر واپس آئی۔ اور کہنے لگی کہ "اماں جان دیکھئے آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بیٹے دعوتوں میں کس طرح کھا کر اپنا معدہ خراب کرتے ہیں۔ اور آپ بھی آرام کیجئے اس طرح بیٹھے رہنا آپ کے لئے اچھا نہیں۔"

گر دادی جان اسی طرح بیٹھی تسبیح پڑھتی رہیں۔ "مجھے کچھ ضروری کام کرنا تھا۔ نہیں یاد ہے نجمہ مجھے کیا کرنا تھا؟ کوئی کام ادھورا رہ گیا تھا"
نجمہ بیٹھی ٹینس کے میاچ کے متعلق سوچ رہی تھی۔ یا اس کا دماغ اپنے نوجوان میاں رشید کے متعلق سوچنے میں مشغول تھا۔ وہ انجنیئر تھا اس لئے ہمیشہ جنگل جنگل پھرتا رہا کرتا تھا۔ گر نجمہ کبھی اس کے ساتھ نہیں گئی۔ کیونکہ ایسی خاموش زندگی اس سے برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ نجمہ رشید سے جدا رہتے رہتے اس سے بالکل ناواقف سی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کو اس کا بہت افسوس تھا۔ "دادی جان میں نہیں جانتی کون سا کام ادھورا رہ گیا ہے۔"
لیکن دادی جان کو تو کرنے کے لئے کچھ کام چاہیے تھا۔ ان کے لئے دنیا میں صرف یہ ہی ایک دلچسپی باقی رہ گئی تھی کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہنا چاہیے۔ ان کی ساری عمر اسی میں گزری تھی کہ ایک بچے کو نہلا دیا دوسرے کو دوا کھلا دی۔ تیسرے کو سلا دیا۔ کپڑے سیئے پرانے کپڑوں میں پیوند لگائے کھانا پکایا۔ اور جو وقت اس سے بچتا تھا وہ مویشیوں کی خدمت میں گزرتا تھا۔ وہ اکثر رات کو بھی بچوں کو رضائی اڑھانے یا سب سے چھوٹے بچے کے پیشاب کے گیلے کپڑے بدلنے کے لئے اٹھا کرتی تھیں پھر صبح اٹھ کر اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ چاہے کتنی ہی تھکی ہوئی ہوں کتنی ہی نیند آتی ہو ان کو یہ سب کام کرنے پڑتے تھے۔
وہ کہہ گئیں "مجھے آج کچھ ضروری کام کرنے تھے اسی لئے یہاں آکر بیٹھی تھی" خورشید بھی پاس ہی فرش پر لیٹا کچھ سوچ رہا تھا۔
"شاید آج میرا کھویا ہوا خرگوش واپس آنے والا ہو۔ آپ اسی کا انتظار کر رہی ہوں گی۔"
دادی جان مسکرائیں اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ خورشید بڑا ہی پیارا بچہ تھا۔ حد سے زیادہ باتونی۔ کہنا ماننے والا۔ اور رحم دل۔ نجمہ جو کسی کے ساتھ بہت کم ہمدردی کا اظہار کرتی تھی۔ خورشید سے بہت اچھی طرح پیش آتی تھی۔
صبح دس بجے رشید کے پاؤں کی آواز آئی۔ "دادی جان وہ آپ کو خدا حافظ کہنے آرہے ہیں۔" نجمہ نے آہستہ سے کہا۔
نجمہ نے اس وقت ہلکے سبز رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ کیونکہ اس کی ایک عزیز سہیلی کا خیال تھا کہ یہ رنگ اس پر بہت کھلتا ہے۔ اس نے ناخنوں پر لال پینٹ لگایا ہوا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر بھی مصنوعی سرخی لگی ہوئی تھی۔ مہمانوں کے دادی جان کے پاس آنے سے وہ بہت گھبراتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دادی جان کوئی الٹی سیدھی بات ان کے سامنے کہہ دیں۔ ایک دفعہ جب نجمہ نے بہت سے معزز لوگوں کی دعوت کی تھی تو دادی جان نہ صرف بھینسوں اور مرغیوں کے قصے لے بیٹھیں بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ کسی زمانے میں وہ سلائی کر کے پیٹ پالتی تھیں۔ اور نجمہ کو بیکار شرمندگی اٹھانی پڑی۔
دادی جان نے رشید کا مضبوط ہاتھ اپنے ٹھنڈے کمزور ہاتھوں میں لے لیا۔ ان کو رشید بہت پسند تھا۔ کیونکہ وہ پرانے زمانے کے مضبوط سختی جھیلنے والے مردوں کی طرح تھا۔ "اب کے میں بہت دور جا رہا ہوں۔ مجھے ایک پل کی تعمیر کی نگرانی پر مقرر کیا گیا ہے شاید چھ مہینے تک میں یہاں نہ آسکوں گا۔" اس نے کہا۔
"نجمہ کو بھی تمھارے ساتھ جانا چاہیے۔" دادی جان نے کہا۔
"ان سے چلنے کے لئے کہا تو تھا۔" رشید نے جواب دیا۔
"جو عورت اپنے میاں کا ساتھ نہ دے وہ عورت نہیں ہے" انھوں نے کہا۔

ان کی شادی کو تین سال ہو گئے تھے۔ رشید کام کے سلسلے میں دور دور پھرتا تھا۔ مگر اب تک نجمہ اس کے ساتھ کہیں نہیں گئی تھی۔
رشید اپنی بیوی کی طرف ہو کر کہنے لگا وہاں کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے۔ جنگلوں میں رہنا ہوگا ہر طرف کیچڑ اور دلدلیں ہیں۔ ہزار طرح قسم کے کیڑے پیدا ہوتے ہیں۔ صاف پانی میسر نہیں آتا۔ اور بہت سی بیماریاں پھیلتی ہیں۔ اتنے دور دراز کے سفر کے لئے نجمہ ابھی بہت کم عمر ہے۔
اب وہ تیئس سال کی ہو چکی ہے۔" دادی جان نے کہا۔" اس عمر میں میں تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اور ان میں سے ایک کو دفن بھی کر چکی تھی۔ آخری بچے کی پیدائش کے وقت میں ستائیس سال کی تھی۔"
" آپ جیسی ہمت لانے کے لئے مجھے پندرہ بیس سال اور چاہئیں۔" نجمہ نے ہنس کر کہا۔
لیکن دادی جان نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ نجمہ ہنس تو رہی ہے۔ مگر اس کا دل بھرا ہوا ہے۔ اور اسے یہ خوف دامن گیر ہے کہ اس کا مستقبل کچھ تاریک سا نظر آ رہا ہے۔ نجمہ یہ سوچ کر اطمینان کر لیتی تھی کہ اس کی طرح اور بہت سی عورتیں ہیں جو بجائے اپنے میاں کے ساتھ جانے کے میکے میں رہتی ہیں۔ مگر نجمہ کو فوراً اپنی ماں کا قول یاد آ گیا کہ "بڑے ہو کر بچوں کی سی حرکتیں کرنا بہت شرم کی بات ہے۔"
وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ مگر دادی جان بہت دیر تک خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہیں۔ نجمہ خوبصورت بھی تھی اور تیز طرار بھی مگر اب تک وہ یہ نہیں سمجھی تھی کہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور اب وہ عورت ہے لڑکی نہیں۔ وہ کام سے جی چراتی تھی جہاں کہیں مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا وہ چپ چاپ الگ ہو جاتی تھی۔ نسیمہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتی تھی کہ "اماں جان آج کل زندگی میں انسان کو اتنی مشکلیں اٹھانی نہیں پڑتیں جتنی آپ کو یا مجھ کو اٹھانی پڑی تھیں۔ تو پھر آپ اس سے کس طرح امید کرتی ہیں کہ وہ تکلیفیں اٹھانے کی عادی بن جائے۔"
مگر اصل یہ ہے کہ ہر ایک نسل کے ساتھ پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں یہ تمدنی چہل پہل قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں کو نہیں بدل سکتی۔ یا مضبوطی سے جم کر زندگی کی مشکلوں اور مایوسیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، یا جن میں ہمت نہیں وہ دُم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ اور ناکام زندگی بسر کرتے ہیں۔
باہر زوروں کی ہوا چل رہی تھی۔ سب کھڑکیاں، دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ اندر سائیں سائیں کا شور مچا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ زوروں کی آندھی آنے والی ہے۔ بے انتہا احتیاط کے باوجود سب چیزیں گرد آلود ہوتی جا رہی تھیں۔ آیا بھاگ بھاگ کر تمام فرنیچر صاف کر رہی تھی۔ خورشید کو صرف اپنے خرگوش کی فکر دامن گیر تھی۔ کہ اسے صبح سے کچھ کھانے کو نہیں ملا۔
جس وقت وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے بارش بھی ہونے لگی۔" اب تو اولے پڑ رہے ہیں خورشید نے کہا۔"
"اس موسم میں اولے نہیں پڑا کرتے۔" نجمہ نے کہا
بارش کا پانی درختوں کے پتوں سے ٹپک رہا تھا۔ دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ آندھی کا یہ عالم تھا کہ تمام گھر ہلتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔
دادی جان کھڑکی کے پاس جا بیٹھی اور کہنے لگی: آج کا دن بہت سہانا ہے۔"
اس وقت ان کو وہ دن یاد آئے جب وہ بالکل جوان تھیں۔ ایک چھوٹا سا بچہ ان کی گود میں تھا۔ ایک دن چوروں نے آ کر ان کو گھیر لیا تھا اس زمانے میں دادی جان اور دادا جان دریا کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ اس وقت وہ گھر میں بالکل اکیلی تھیں قاسم ان کی گود میں تھا۔ دادا جان کسی کام سے شہر گئے ہوئے تھے۔ گاؤں میں کچھ کام مل گیا تو اس کی ماں بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ اور دادی جان اکیلی رہ گئیں۔

مگر وہ تنہائی سے گھبرائی نہیں۔ وہ بےفکری سے اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں۔ ان دنوں دادی جان کے پاس بہت سے مرغیوں کے بچے جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ اور باسی روٹی کے ٹکڑے ان کو کھلا رہی تھیں۔ پھر انھوں نے بچھڑوں کو پانی پلایا۔ گھر میں بچہ سو رہا تھا۔ دھوپ میں کام کرنے سے ان کا پورا بدن جل رہا تھا مگر وہ بے فکر اور خوش تھیں۔ اچانک انھیں خیال آیا کہ بچے کو دودھ پلائے بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ گھر کی طرف جا ہی رہی تھیں کہ راستے میں ایک ہانپتے ہوئے آدمی نے ان کو یہ خبر دی کہ "بہت سے لٹیرے اس طرف آ رہے ہیں آپ جلدی سے کہیں چھپ جائیں۔"

"ابھی وہ کتنی دور ہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

"بس وہ گھوڑوں پر سوار آ ہی رہے ہیں۔ وہ سارا گھر لوٹ لیں گے اور جو کچھ بچے گا اسے آگ لگا دیں گے۔"

وہ کہاں چھپتیں اور نہ چھپتیں تو ان ڈاکوؤں کا کس طرح مقابلہ کرتیں۔

انھوں نے بچھڑوں کی طرف دیکھا جو آرام سے گھاس کھا رہے تھے۔ اور گائیں ان کی پیٹھیں چاٹ رہی تھیں۔ انھیں بچے کا خیال آیا کہ اگر واقعی ڈاکو آ گئے تو معلوم نہیں اس کے چھوٹے سے دل پر اس کا کیا اثر ہوگا۔

دو تین گھنٹے امن چین سے گزر گئے۔ انھوں نے سوچا کہ یہ محض ایک دھوکا تھا۔ وہ آرام سے بیٹھ کر ترکاری بنانے لگیں۔ اور کتا آ کر ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔ "ہم آرام سے گھر میں بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ ہم کو گھر سے نکال کر حیران کرنا چاہتے تھے۔" انھوں نے دل ہی دل میں کہا۔ کتا ان کی طرف دیکھ کر دم ہلا رہا تھا۔ وہ جب اس گاؤں میں آئے ہیں تو ایک ترکاری والی نے انھیں یہ کتا لا کر دیا تھا۔ اس وقت یہ بالکل چھوٹا سا بچہ تھا۔ اس نے کہا تھا کہ "یہ بہت ہوشیار ماں کا بچہ ہے آپ جو کچھ سکھائیں گی بہت جلدی سیکھ لے گا۔" اس نے بہت سے کرتب اور کام کی باتیں بہت جلد سیکھ لیں۔ آج کا دن بہت اچھا تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دھوپ میں بھی عجیب قسم کی کشش تھی۔ "ایسے سہانے دن بھی کیا قتل عام اور لوٹ مار ہوگی۔" وہ ترکاری کی ٹوکری ہاتھ میں لیئے ہوئے اطمینان سے اٹھیں۔

اک بارگی دور سے عجیب بھیانک چیخوں کی آواز آئی۔ جس سے وہ خود اور تمام جانور چونک پڑے اس دور افتادہ گاؤں میں جس طرح یہ ڈاکو آ کر غریب گاؤں والوں کو ستاتے تھے وہ بہت قابل رحم تھا۔

انھوں نے جلدی سے بھاگ کر بچے کو اٹھا لیا جو پلنگ پر لیٹا مسکرا رہا تھا۔ آخر ایک اکیلی عورت اتنے سارے ڈاکوؤں سے چھپتی تو کہاں چھپتی۔ اگر گھر میں چھپیں تو وہ فوراً ہی گھر لوٹ کر انھیں باہر نکال کر کھڑا کر دیں گے۔ یا گھر کو ہی جلا کر خاک کر دیں گے۔ اس قسم کے طرح طرح کے وسواس ان کے دل میں پیدا ہوئے۔

ان کے گھر کے پاس املی کے دو درخت تھے۔ ایک پر تو چند سال ہوئے بجلی گری تھی۔ اور وہ جل کر خاک ہو گیا تھا۔ دوسرا خوب گھنا تھا۔ انھوں نے بچے کو ایک شال میں لپیٹ کر کمر سے باندھ لیا۔ اس طرح ان کے دونوں ہاتھ درخت پر چڑھنے کے لئے خالی رہے۔

جب وہ درخت پر چڑھ رہی تھیں تو انھیں خیال آیا کہ کتا تو نیچے کھڑا ہے اور ان کو معلوم تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ڈاکو صاف معلوم کر لیں گے کہ درخت پر کوئی ہے اگر اسے باندھ دیا تو وہ ان کی طرف دیکھ دیکھ کر چیخے گا۔ کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں اسے بند کر دیا جاتا۔ وہ درخت پر سے اتریں بچے کو زمین پر لٹایا اور کتے کو پاس بلا کر اس کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں ایک سنگ جما دی اور اسے لیجا کر ایک گڑھے میں

پھینک دیا۔ ان کو معلوم تھا کہ وہ اپنے پیارے وفادار کتے کو بہت دن تک روئیں گی۔ مگر اس وقت سوائے اسی کے کچھ چارہ نہ تھا۔ وہ پھر بھاگی بھاگی واپس آئیں بچے کو شال میں لپیٹ کر پھر کمر سے باندھا اور درخت پر چڑھنے لگیں۔ مگر جوتا پھسلنے لگا انھوں نے جوتا اتار کر جس قدر دور ہو سکتا تھا پھینک دیا۔ ابھی وہ آدھی اوپر چڑھی تھیں کہ ان کا سانس پھولنے لگا۔ وہ سانس لینے کے لئے رک گئیں۔ اس کو ہچانے میں بچے کے منہ پر گھوڑیں لگ گئیں اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ انھوں نے شال کو اور کھینچ کر باندھا اور پھر پھرتی سے چڑھنے لگیں۔ اتنی اوپر چلی گئیں کہ ان کو ڈر لگنے لگا۔ پھر وہ آرام سے ایک ٹہنی پر بیٹھ کر اسے دودھ پلانے لگیں۔ دادی جان ہنس کر کہا کرتی تھیں: "بچہ کا بچا بڑا ندیدہ تھا۔ دودھ ملتے ساتھ ہی خاموش ہو جایا کرتا تھا۔ اور اب بھی قاسم کو اچھے اچھے کھانوں کا بہت شوق ہے۔"

انھوں نے پتوں میں سے جھانک کر دیکھا کہ سب بچھڑے اور گائیں کان کھڑے کئے ڈاکوؤں کا شور غل سن رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں پرچھائیاں سی دکھائی دینے لگیں۔ ان میں سے ایک آدمی جھاڑیوں میں چھپتا ہوا آگے آگے آیا۔ "شاید یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ گھر میں کوئی مرد تو نہیں۔" دادی جان نے سوچا۔

جب انھوں نے دیکھا کہ گھر میں کوئی مرد نہیں ہے تو وہ چیختے ہوئے گھر میں گھس گئے۔ مگر انھوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ لوگ موت اور تباہی اپنے ساتھ لائے ہیں۔ وہ خود بھی سوکھے کمزور تھے اور ان کے ٹٹو بھی ان ہی جیسے تھے۔ صرف یہ معلوم ہو رہا تھا کہ چھوٹے بچوں کی طرح اپنی قوت کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑے سے مرغیوں کے ڈربے کی طرف دوڑے اور اس کو کھول کر چھوڑ دیا۔ مرغیاں اس بے وقت کی آزادی سے گھبرا کر ادھر ادھر پھرنے لگیں۔ اور تھوڑے سے گھر میں گھس گئے اور پلنگوں کے نیچے اور صندوقوں کے پیچھے گھسنے کی وجہ سے ان کے منہ اور کپڑوں پر جالے لگ گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر بچوں کی طرح ہنس رہے تھے۔ انھوں نے لکڑیوں کی کوٹھڑی کو آگ لگا دی۔ اور کپڑے وغیرہ اکٹھے کر کے اپنے ٹٹوؤں پر باندھنے لگے۔ کسی نے گھوڑوں کو بھی کھول دیا۔ ان میں سے ایک اصطبل سے نکلا ہی نہیں تو اسے تیر مار مار کر مار ڈالا۔ وہ کتنا ہی چاہتی تھیں کہ یہ سب کچھ نہ دیکھیں۔ مگر سب ان کے سامنے ہی ہو رہا تھا۔ اب بچے نے دودھ پینا بند کر دیا تھا۔ اور اس نے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دیے تھے۔ اس کے ہلنے جلنے سے اس کی ایک جراب گر گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی دادی جان کے دل میں طرح طرح کے وسواس پیدا ہوئے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر یہ نیچے گر گئی تو وہ سب آ کر درخت کے گرد کھڑے ہو جائیں گے اور ان میں سے ایک بچے کو ان سے چھین کر کھا جائے گا وہ گڑگڑا گڑگڑا کر خدا سے دعا کرنے لگیں کہ وہ ان سے بچے کو نہ چھینیں۔ مگر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ جراب تھوڑی دور گرنے کے بعد ایک ڈالی میں لٹک گئی۔

جلتے ہوئے مکان کی گرمی لوہے کی بھٹی سے کم نہ تھی لکڑیوں کے جل جل کر گرنے کا شور۔ اور اس کے ساتھ ہوا کا زور کچھ عجیب ہیبت ناک سماں پیدا کر رہا تھا۔ اس منظر سے ان کے دل میں عجیب قسم کا درد پیدا ہوا وہ سوچنے لگیں۔ "معلوم نہیں ہم پھر ایسا گھر بنا سکیں گے کہ نہیں۔"

آخر کار جب وہاں اور کچھ برباد کرنے کے لئے باقی نہیں رہا تو لٹیرے چلنے کی تیاری کرنے لگے۔ جب وہ اپنے سوکھے ہوئے ٹٹوؤں پر سوار ہو گئے۔ تو وہ کسی بات پر جھگڑنے لگے۔ دادی جان کو یہ شبہ ہوا کہ وہ ان کی طرف اشارے کر کے کچھ کہہ رہے ہیں۔ مگر اصل میں وہ آپس میں یہ بحث کر رہے تھے کہ گائیں اور بچھڑے بھی لے چلیں یا نہیں۔ مگر آخر میں انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ گھوڑے لے چلنے چاہئیں جو زیادہ کار آمد تھا۔

وہ درخت پر بیٹھی رات ہونے کا انتظار کرنے لگیں۔ وہ ڈر رہی تھیں کہ کہیں ڈاکوؤں کو درخت پر سے اترتا دیکھ نہ لیں ......

"بیگم صاحب اگر کچھ اور کام نہ ہو تو میں جاؤں۔" ماما نے کہا۔ ان کے خیالات کا طلسم ٹوٹا اس کے یہ کہنے سے وہ چونک پڑیں۔ "کیونکہ بارش

بہت ہو رہی ہے اگر اور بڑھ گئی تو میں گھر پہنچنے تک بالکل بھیگ جاؤں گی۔" "ہاں ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واقعی تم جاؤ آج یہ بے وقت خوب بارش ہو رہی ہے۔" دادی جان نے کہا۔

اس وقت اس خوبصورت سجے ہوئے کمرے میں صرف دادی جان اور خورشید بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے کی سب کھڑکیاں بند تھیں۔ بارش کی بوچھاڑ آکر ان سے ٹکرا رہی تھی۔ دادی جان پھر سوچنے لگیں۔ اور جیسا کہ ان کا قاعدہ تھا وہ سوچتے سوچتے بولنے لگتیں تھیں وہ کہنے لگیں۔ تب اندھیرا ہو گیا تو میں درخت پر سے اتری۔ اصطبل میں ایک گھوڑا مرا پڑا تھا اور سب ڈاکو لے گئے۔ بچھڑے اور گائیں اسی طرح صحیح سلامت تھیں۔ اس وقت کی ہر آہٹ سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ ڈاکو چلے آ رہے ہیں۔"

"دادی جان اس وقت تو آپ کو بڑا ڈر لگا ہوگا۔" خورشید اس کہانی کو سن کر ہمیشہ یہ پوچھا کرتا تھا۔

"ہاں بیٹا اس وقت میں ڈری ہوئی تو بہت تھی۔ میرا سارا بدن کانپتے کانپتے دکھ رہا تھا۔ مگر اس وقت میں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ میں نے کوئی بہادری کا کام کیا ہے۔ نہ اب کرتی ہوں۔ ہاں آدمی مصیبتوں کا مقابلہ کرتے کرتے بہادر اور بے پروا ہو جاتا ہے۔"

"اچھا اب یہ بتایئے کہ آپ نے اپنی جوتیاں کس طرح ڈھونڈیں۔" خورشید یہ بہت دفعہ سن چکا تھا۔ مگر اس کو یہ گھڑی گھڑی سننے میں معلوم نہیں کیوں مزا آتا تھا۔

"میں نے اندھیرے میں بہت تلاش کی مگر صرف ایک جوتی ملی۔ آخر مجھے سردی لگنے لگی۔ اور پاؤں میں کانٹے بھی چبھ گئے۔ آخر میں قاسم کو شال میں لپیٹ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔"

بارش بہت زور کی ہو رہی تھی۔ ان کے سامنے والا پیپل کا درخت گر گیا۔ لوگ چلتے چلتے راستہ بھول گئے۔ موٹریں رک گئیں۔ پولس والے ان کی مدد کے لئے بھاگے پھر رہے تھے۔ خورشید کو مزا آ رہا تھا دادی جان بے فکر تھیں۔ مگر نجمہ گھبرائی پھر رہی تھی۔ خورشید کا خرگوش اپنے چھوٹے سے مکان میں الگ پریشان تھا۔ ٹیلیفون کے سب تار ٹوٹ گئے، ریڈیو بند ہو گیا بجلی بجھ گئی۔ آخر خورشید سے رہا نہیں گیا وہ دادی جان اور نجمہ کے منع کرتے کرتے دروازہ کھول کر اپنے خرگوش کے پاس بھاگا۔

"ایک دفعہ نجمہ نے دروازہ کھول کر پکارا۔" خورشید اندر آؤ۔"

"کچھ جواب بھی دیتا ہے۔" دادی جان نے پوچھا۔

"نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیٹھ کر خرگوش کو شال میں لپیٹ رہا ہے۔"

"جاؤ اسے کسی طرح اندر گھسیٹ لاؤ۔" آخر دادی جان نے مجبور ہو کر کہا۔

تھوڑی دیر میں نجمہ پریشان حال بھیگی ہوئی واپس آئی۔" دادی جان خورشید کی انگلی موٹر خانے کے دروازے میں آ گئی ہے۔ اور دروازہ اتنی زور سے بند ہو گیا ہے کہ میں اتنی دیر سے دھکیل رہی ہوں مگر وہ کھلتا ہی نہیں۔

دادی جان اپنا بڑھاپا اور کمزوری سب بھول گئیں دروازہ کھول کر نجمہ سے آگے نوکروں کی کوٹھڑیوں کی طرف چل پڑیں بہت مشکل سے دونوں نے مل کر دروازہ کھولا۔ نجمہ روتے ہوئے خورشید کو اٹھا کر اندر لائی۔ جب وہ اندر آ رہے تھے تو ایک بوسیدہ سا مکان جو بالکل ان کے گھر کے سامنے تھا گر پڑا۔ اس سے وہ دونوں اور بھی سہم گئیں۔

گھر میں صرف ایک موم بتی ٹمٹما رہی تھی۔ نہ بجلی جل رہی تھی نہ ٹیلیفون چل رہا تھا۔ خورشید سردی اور درد کے مارے کانپ رہا تھا" پہلے اس کی پٹی باندھیں گے۔ پھر انگیٹھی جلا کر کمرہ گرم کریں گے۔"

دادی جان نے اپنے جھریاں پڑے ہوئے کمزور ہاتھ میں خورشید کا زخمی ہاتھ لے کر دیکھا۔ اس کی انگلی کا گوشت ہڈی تک کٹا ہوا تھا۔ اور اس کی انگلی ایسے ہی لٹک رہی تھی جیسے درختوں کی ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں۔ "اس کی انگلی تو گئی" انھوں نے گھبرا کر کہا۔ "اب جلدی پٹی باندھنے کی تیاری کرو ورنہ بالکل بیکار ہو جائے گی۔"

نجمہ کا یہ حال تھا کہ اس سے زخم دیکھا بھی نہیں جاتا تھا "کسی ڈاکٹر کو بلانا چاہیئے" اس نے کہا۔ اور ٹیلیفون کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگی "اب کیا کریں ٹیلیفون نہیں چلتا۔ موٹرخانے کے سامنے درخت گرا ہوا ہے موٹر نہیں نکل سکتی۔ اور سڑک پر مکان گر گیا ہے کوئی آ بھی نہیں سکتا" نجمہ نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ دادی جان نے پٹی باندھنے کے لئے تیاری کی۔ مگر انھیں اچھی طرح دکھائی نہیں دیتا تھا "ایک زمانے میں میں یہ سب کام کر لیتی تھی مگر اب تو کچھ سوجھتا ہی نہیں" انھوں نے پٹی پھینک دی، نجمہ کے مضبوط ہاتھوں نے سہارا دے کر انھیں کرسی پر بٹھا دیا۔ "آپ آرام سے بیٹھ جائیے میں باندھ لوں گی۔"

دوسرے دن دادی جان بستر پر سے نہ اٹھ سکیں۔ انھوں نے پلنگ پر ہی منہ دھویا اور وہیں ناشتہ کیا۔ بارش تو بند ہو چکی تھی۔ مگر ابھی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ دادی جان پہلے کی طرح آج غمگین نظر نہیں آ رہی تھیں۔ کیونکہ ان کو اطمینان ہو گیا تھا کہ نجمہ میں بھی ہمت ہے۔

نجمہ نے خورشید کو پٹیاں باندھ کر آرام سے لٹا دیا تھا۔ اور دادی جان اس کو کہانیاں سنا رہی تھیں۔ جس سے اس کا جی بہل گیا تھا۔ ڈاکٹر نے بھی آ کر پٹیوں کی تعریف کر دی کہ نجمہ گرل گائڈ کے کام میں بالکل ماہر ہے۔

نجمہ اور دادی جان میٹھی باتیں کر رہی تھیں نجمہ نے کہا کہ "جیسے آپ کہا کرتی تھیں کہ انسان تکلیفیں اٹھا اٹھا کر بہادر بن جاتا ہے۔ اسی طرح رات کے حادثے نے مجھے بہادر بنا دیا ہے۔ اب تو میں ہر کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

رشید نے طوفان کی وجہ سے اپنی روانگی ملتوی کر دی تھی۔ آج وہ پھر دادی جان سے رخصت ہونے کے لئے آیا" دادی جان" نجمہ نے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ میں ان کے ساتھ جا رہی ہوں۔ صرف آپ سے رخصت ہوتے ہوئے دل بھر آتا ہے۔"

شاباش بیٹیا۔ دادی جان نے کہا۔ ہمارے گھر والے کبھی تکلیفوں سے نہیں گھبراتے۔ اللہ تم دونوں کو خوش رکھے۔ اچھا خدا حافظ۔

معتصمۃ الرحمٰن

گارساں دتاسی :- اردو کے پہلے پروفیسر، فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی ادبی کارناموں، طریقہ تعلیم تلامذہ، کتب خانہ، اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کی یورپ کی درس گاہوں، اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ۔

مولفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ

ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر۔ صفحات ۱۲۸ قیمت عہ

جبری اختیار

حل ہو سکا نہ مسئلہ جبر و اختیار
اس فکر میں ہر ایک پریشان کب سے ہے

"ہر روح، امرِ رب ہے" (صغریٰ موجبہ)
"ہر اک فعل، امرِ روح" (کبریٰ کلیہ)

ثابت ہوا کہ:-

"فعل ہر اک امرِ رب ہے"

امجد (حیدرآبادی)

نئی کتابیں

۱۔ انتظام مدارس کے لئے اشارات (از ڈبلیو۔ ایم۔ ریان) مترجمہ عبدالمجید خاں ۱۸۰ صفحے۔ اوت پریس لاہور۔

۲۔ عجائبات قدرت (مطالعہ فطرت اور نباتاتی زندگی) از سی۔ ایل۔ گوسائین ۲۴۴ صفحے۔ پنجاب آرٹ پریس لاہور۔

۳۔ نوائے سرکش (نظم) از طالب اناوی ۱۳۶ صفحے۔ گیلانی الیکٹرک پریس۔ لاہور۔

۴۔ پیام شوق (نظم) از جگ موہن ناتھ شوق ۱۹۰ صفحے۔ نظامی پریس۔ لاہور۔

۵۔ فتنۂ رہبانیت از مرزا عزیز فیضانی ۴۴ صفحے۔ تعلیمی پرنٹنگ پریس بدایوں۔

۶۔ وظایف اشرفی از شاہ سید ابو احمد محمد علی حسین اشرفی ۵۵۱ صفحے۔ اہل سنت برقی پریس۔ مرادآباد۔

۷۔ ساز فطرت (افسانے) از حسن عزیز جاوید ۱۹۹ صفحے قیمت عہ گیلانی الکٹرک پریس۔ لاہور۔

۸۔ بے وقوفوں سے عقل سیکھو از سر فیروز خاں نون ۱۸۶ صفحے۔ مفید عام پریس۔ لاہور

۹۔ قسمت (مختصر افسانے) از حسن عزیز جاوید ۲۰۶ صفحے قیمت عہ۔ کیپٹل پرنٹنگ پریس۔ لاہور۔

۱۰۔ دورنگی چال (ناول) از محمد عبدالقدوس ۲۳۶ صفحے۔ فائین آرٹ پریس۔ لکھنؤ

۱۱۔ گناہ کا خوف (افسانے) از محمد علی ۱۴۱ صفحے قیمت عہ

۱۲۔ داستان تاریخ اردو (نثر اردو کی تاریخ) از حامد حسن قادری ۲۵۰ صفحے لکشمی نراین۔ اگروال۔ آگرہ

۱۳۔ سرزمین ملتان (مختصر تاریخ) از نور احمد خاں ۲۴۸ صفحے۔ تعلیمی پرنٹنگ پریس۔ لاہور۔

۱۴۔ زبان دانی۔ از فضل الٰہی عارف ۲۰۰ صفحے قیمت عہ۔ دین محمدی پریس۔ لاہور۔

۱۵۔ بچوں کا حکیم از حکیم عبدالمجید ۳۵۲ صفحے۔ حجازی پریس لاہور۔

۱۶۔ ہدایت نامہ پرورش بچگاں (تیسرا ایڈیشن) از ہرنام داس ۳۰۴ صفحے۔ مفید عام پریس۔ لاہور

۱۷۔ پانچ ہزار مجربات (جلد دوم) از حکیم عبدالمجید خادم ۲۴۰ صفحے حجازی پریس۔ لاہور۔

۱۸۔ لاثانی لغات الادویہ (دوسرا ایڈیشن) از پنڈت ٹھاکر دت ۲۸۶ صفحے۔ امرت الکٹرک پریس۔ لاہور

۱۹۔ مجرباتِ طب قدیم وجدید (دوسرا ایڈیشن) از صوفی لچھمن پرشاد ۳۲۸ صفحے۔ گیلانی الکٹرک پریس۔ لاہور۔

۲۰۔ عجائبات ہندوستان (تاریخی یادگاریں) از احمد حسین خاں ۳۰۰ صفحے قیمت عالہ۔ قومی کتب خانہ۔ لاہور۔

۲۱۔ جدید کھیلوں کی کتاب دوسرا ایڈیشن (جسمانی ورزشیں) از ایچ۔ ڈبلیو ہاگ ۲۷۴ صفحے۔ کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس۔ لاہور

۲۲۔ جدید نصاب تربیت جسمانی حصہ دوم از ایچ۔ ڈبلیو۔ ہاگ ۲۶۱ صفحے۔ کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس۔ لاہور۔

۲۳۔ نغمۂ خاموش (ظریفانہ نظمیں) از سر یر اکبر آبادی ۱۴۸ صفحے۔ مرکنٹائیل پریس۔ لاہور۔

۲۴۔ تفسیر خودی (اسرار خودی کا ترجمہ) از عبدالرحمٰن طارق ۲۰۴ صفحے۔ عالمگیر الکٹرک پریس۔ لاہور۔

۲۵۔ سیاحت روس (تیسرا ایڈیشن) از پنڈت جواہر لال نہرو ۱۵۰ صفحے قیمت عہ۔ گیلانی پریس۔ لاہور۔

۲۶۔ چشمۂ عرفان از مبارک احمد خاں ۲۷۲ صفحے۔ وزیر ہند پریس۔ امرتسر۔

مرزا سیف علیخاں

قسمت

محلے کے ہر گھر میں "اُستانی ماں" کا نام عزت سے لیا جاتا۔ چھ سال سے وہ اُسی ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتی تھیں۔ پڑوس کی دو چار بچیاں اُن کے ہاں پڑھنے کو آتیں، اور اپنے ساتھ اُستانی ماں کے لئے پان سپیاری، ترکاریاں، اور کبھی تھوڑا بہت تکلّف بھی لاتیں، یہی چیزیں اُستانی ماں کو فیس کے طور پر ادا کی جاتیں۔ کبھی اُستانی ماں کا دل گھومنے پر مائل ہوتا تو وہ ساڑی بدل کے ننھی پُشپا کے ساتھ محلے والوں سے ملنے نکل جاتیں۔ مرد اِن کا احترام کرتے اور عورتیں اپنے دل کی باتیں سُنا سُنا کر اُن کے مشوروں کی طلبگار ہوتیں۔ اُستانی ماں کے کمرہ کے بازو ہی ایک قصائی رہتا تھا۔ اتنا لڑاکا اور بیوٹ تھا کہ شام سے رات کے دو بجے تک اپنی بکواس سے محلے والوں کی نیند خراب کرتا۔ "اُستانی ماں" کا کمرہ تو بالکل بازو ہی لگا ہوا تھا۔ ایسا سنائی دیتا جیسے خود اُستانی ماں کے کمرے میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ اُستانی ماں ہر شخص کے آگے اس کا دکھڑا روتیں، لیکن مالک مکان کو اپنے کرایے سے مطلب تھا۔ اسے محلے والوں کے آرام کی پروا کیوں ہو؟ وہ سب کی شکایتوں کو سنتا اور ٹال جاتا۔ اتفاق سے ایک دن خود مالک کے مکان سے اس قصائی کی جھڑپ ہو گئی۔ دو مہینے کا کرایہ اُس کے ذمے تھا اور وہ "اگلے مہینے" کے وعدوں پر مالک مکان کو چٹکیوں میں اُڑا رہا تھا۔ مالکِ مکان ذرا بپھر گئے۔ کہنے لگے۔ "کرایہ دینا ہو تو رہو۔ ورنہ کمرہ خالی کر دو"۔ یہ گفتگو رات کو ہوئی، صبح میں قصائی کا پتہ تھا نہ اس کے سامان کا۔ کمرہ خالی کر دیا گیا تھا۔ اور وہ کمرہ ایک ہفتہ تک اسی طرح خالی رہا۔ دو تین کتے جو قصائی کے پیچھے اس کی دکان سے بھاگتے آتے۔ اب دن رات اس کمرے پر قبضہ جمائے رہتے۔ اِن کتوں کو قصائی کا انتظار ہوتا، اور مالکِ مکان کو کرایہ دار کا۔ اُستانی ماں اب چین کی نیند سوتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی راتوں میں کتوں کے لڑنے اور بھونکنے کی آوازیں گزری ہوئی بےچینیوں کے تصور کو بیدار کر دیتیں۔

اُستانی ماں کا نیا پڑوسی ایک طالب علم تھا۔ تعلیم کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ کر شہر چلا آیا تھا۔ اسکول کی قربت کے خیال سے اس نے یہ تنگ و تاریک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اُستانی ماں نے اُسے دیکھا تو انھیں اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ اپنے ہاتھ سے وہ پکاتا۔ سامنے کے نل پر اپنے کپڑے دھو لیتا، اور سڑک کے لمپ کی روشنی میں پڑھتا رہتا۔ رات کو استانی ماں دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے سونے کی تیاری کرنے لگتیں تو انہیں کتاب کے ورق اُلٹنے کی آواز سنائی دیتی۔ ایک دفعہ انہوں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا تو وہی طالب علم سیڑھیوں پر پڑھتا تھا۔ پُشپا استانی ماں کی لاڈلی بچی تھی۔ استانی ماں دوسری بچیوں کو تو ڈانٹ ڈپٹ کر کے پڑھاتیں، ڈرانے کے لئے چھڑی بھی کھونٹی سے ٹنگا رکھتیں لیکن پُشپا ان کے بس کی نہ تھی۔ روز وہ اُسے پڑھانے بیٹھتیں اور روز وہ روئے دھوئے بغیر کتاب بند نہ کرتی۔ پُشپا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے کہ اُستانی ماں کا دل اُمڈنے لگا۔ تنگ آکر وہ کہتیں "مت پڑھ، میرا کیا جائے گا، بعد میں خود ہی پچھتائے گی"۔ اور پُشپا پلو سے آنکھیں ڈھانپ کر ہچکیاں لینے لگتی۔ "دوسری بچیوں کو دیکھ کر بھی شرم نہیں آتی۔ دن بھر کھیلتی رہتی ہے، اس وقت رونا نہیں آتا"۔ استانی ماں بڑے غور سے پُشپا کو دیکھتی رہتیں۔ اس کے بکھرے بالوں میں نہیں جانے کیا نظر آتا کہ لہجے میں پیار کی گھلاوٹ آجاتی "کالا کوا بھی تجھ سے شادی نہ کرے گا"۔ پُشپا کا سر جھک جاتا اور ہچکیوں کی آواز تیز ہو جاتی "چل اُٹھ۔ گوری کے ہاں سے دودھ لے"۔ پُشپا بڑی تیز طرار لڑکی تھی گھر کا

رنگ، بڑی بڑی چمکدار آنکھیں ۔ اس جیسی صحت مند بچی تو سارے محلے میں نہ ہوگی ۔ آہستہ چلنا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں
بس دوڑتی پھرتی ۔ دودھ لانے چلی تو گلاس کو چوڑیوں پہ بجاتی ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتی نکل گئی ۔

کشور کو اپنے دوست کے ہاں سے ایک کتاب لانی تھی ۔ اس نے چراغ سلگایا اور کپڑے پہن کر کمرے کے باہر نکلا ۔
دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا ۔ اور پلٹا ہی تھا کہ اس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ سے ٹکرایا، جس سے کوئی چیز زمین پر گری، اور ہوں کی آواز
دبی ہوئی چیخ بن کر اس کے دل پر تیر کی طرح کھٹکی ۔ اُستانی ماں اپنے کمرہ کے باہر نکل آئیں ۔ پشپا دونوں ہاتھوں میں چہرے کو ڈھانپے
کھڑی تھی ۔ اور دودھ کا گلاس زمین پر چور چور پڑا تھا ۔ دودھ کبھی کا زمین میں جذب ہو چکا تھا ۔ کشور نے استانی ماں کی طرف دیکھا پھر
پشپا کی طرف .. وہ پریشان تھا کہ کیا کہے ؟ کس سے کہے ؟ اُستانی ماں پشپا کے قریب چلی آئیں ۔ "اتنا تیز کیوں دوڑتی ہے؟" انہوں
نے دھیمے لہجے میں پوچھا ۔ "بڑی شریر ہے" انہوں نے کشور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ "جی ۔ مگر ... میں بھی ذرا جلدی میں تھا" کشور
کا لہجہ ندامت کا اظہار کر رہا تھا " ارے اس میں آپ کا کیا قصور ہے ۔ چل پشپا اندر چل" ۔

دوسرے دن صبح میں کشور نے پشپا کو بلایا ۔ وہ جھجکتے شرماتے چلی آئی ۔ کشور نے پوچھا ۔ "پشپا تمہارا نام کیا ہے ؟" پشپا
ہنسنے لگی "پشپا کل تمہاری ماں نے تم کو پیٹا تو نہیں" پشپا کی گردن ہل گئی "اوں ہوں" "یہ لو ہماری طرف سے دودھ" کشور
نے دودھ کا گلاس پشپا کے ہاتھ میں پکڑا دیا ۔ پشپا نے گلاس لینے سے انکار کیا تو کشور نے اُسے ڈھکیل کر اپنے کمرے کے باہر کیا اور
اندر سے زنجیر چڑھائی ۔ تھوڑی دیر بعد اس کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا ۔ کشور نے تیزی سے دروازہ کھول دیا ۔ کون پشپا !! کہو کیا کہنا
ہے ؟ "آپ کو اماں بلاتی ہیں" ۔ "مجھے" ، کشور نے مسرت آمیز تعجب کے ساتھ پوچھا اور پشپا کے پیچھے استانی ماں کے کمرہ کی طرف
بڑھا "یہ آپ عجیب آدمی ہیں" ۔ استانی ماں نے شکایت آمیز انداز میں کہا ۔ کشور نظر جھکائے کرسی پر بیٹھا رہا ۔

"آپ نے یہ کیا تکلیف کی ۔ لیجئے ـــ " کشور نے نظر اُٹھائی ۔ اُستانی ماں کے ہاتھ میں پیالی تھی ۔ اور پیالی میں گرم
گرم کافی کشور نے پس و پیش کیا تو اُستانی ماں نے کہا " تو پھر آپ کو آپ کا دودھ مبارک " لا، پشپا وہ دودھ کا گلاس ۔ پشپا
اُٹھنے کو ہوئی تو کشور نے ہاتھ بڑھا کر کافی کی پیالی لے لی ۔ " آپ مجھے شرمندہ کرتی ہیں" کشور نے آہستہ سے کہا اور کافی پینے لگا ۔
اُستانی ماں کی عمر یہی چالیس کے لگ بھگ ہوگی ۔ اپنی بچی کے ساتھ ان کی زندگی سکون اور اطمینان سے گزر رہی تھی ۔ لباس اُن کا
سیدھا سادا رہتا اور وہ ہمیشہ اسی دھن میں رہتیں کہ ان کی بچی کو کسی قسم کا دکھ نہ پہنچے ۔ اُن کے چہرے پر بزرگانہ سنجیدگی کا
نور برستا، اور آنکھوں کے سیاہ حلقے رنج و غم کی کھلی نشانیاں تھیں ۔ انہوں نے پاندان کھسکا لیا ۔ " تو آپ بہت دور
سے یہاں آئے ہیں ـــ " "جی ہاں" کشور نے جواب دیا ـــ "بہت محنتی ہیں آپ" ـــ

"دوسرے بچے مجھ سے بھی زیادہ محنت کرتے ہیں ۔ پشپا ہی مجھ سے کہیں زیادہ محنت کرتی ہوگی" کشور نے مسکراتے
ہوئے پشپا کی طرف دیکھا تو اس نے شرما کر منہ پھیر لیا "آہ ۔ پشپا کی محنت کا ذکر نہ کیجئے ـــ کبھی فرصت سے سنیئے گا ؟
اچھا آپ کو کھانے پینے کی تو بہت تکلیف ہوگی ـــ ارے میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں ـــ"
"جی مجھے کشور کہتے ہیں" "تو ہم بھی یہی کہیں گے ـــ کیا کہیں گے پشپا ؟" پشپا نے تیزی سے کہا "کشور" ـــ اول ہوں

تم کشور بھیا کہو گی —" اُستانی ماں نے کشور کے ہاتھ سے خالی پیالی لے لی اور اُسے میز پر رکھ دیا۔
"دیکھئے کھانے پکانے کی تکلیف تو ضرور ہوتی ہے۔ لیکن مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف نہیں ہوتی۔" کشور نے سنجیدگی سے کہا لیکن جملے کو ختم کرتے کرتے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی —
"آپ اپنی بیوی کو تو بہت خوش رکھیں گے۔" استانی ماں نے کہا "بیوی کو کوئی خوش نہیں رکھ سکتا؟ یہ میرا دعویٰ ہے۔" کشور اب کچھ بے تکلف ہو چلا تھا۔ اُستانی ماں کھکھلا کر ہنسیں۔ "آپ عورتوں سے بہت بدظن ہیں۔ میں آپ سے کہتی ہوں — عورت۔ اور خاص طور سے بیوی — خوش ہونے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھی ہے۔ ترستی رہتی ہے۔ لیکن مرد — خاوند کہئے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ اُسے ہمیشہ مایوس کرتا ہے — ہمیشہ سنا آپ نے۔"
"جی" کشور کی زبان سے نکلا — "آپ مجھ سے پھر کبھی ملئے — اور پھر کبھی سنئے کہ عورت کی خوشی کتنے سستے داموں ملتی ہے — پشپا تم چلو بیٹی کتابیں کھولو" کتابوں کے نام پر پشپا کا چہرہ اتر گیا۔ "دیکھئے کشور بابو یہ میری لاڈلی پشپا کی محنت۔ اس کو تو کوئی آپ جیسا شوہر ملے تو وہ پڑھا بھی سکتے ہیں تو ہار مانتی ہوں۔ اسکول کی کتنی بچیوں کو میں نے سیدھا کیا۔ لیکن اس کے آگے میں عاجز ہو جاتی ہوں۔"
"تو میں پڑھا دوں گا" کشور نے پشپا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
"میں ان سے شادی نہیں کرتی؟ آں.. آں.. آں.." پشپا بھاگ کھڑی ہوئی۔ کشور اور استانی ماں دونوں ہنسنے لگے۔
"کتنی بھولی ہے!" استانی ماں نے کہنا شروع کیا۔ "آج کہہ رہی ہے کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ کل بڑی ہوگی، اور اپنی اس بات کو یاد کرے گی تو بہت ہنسے گی۔ کشور بابو سچ کہتی ہوں۔ مجھے آپ بہت پسند ہیں۔ آپ مجھے جس طبیعت کا چاہیں سمجھ لیں۔ لیکن پشپا کی جگہ میں ہوتی تو آپ کے پیر پکڑ لیتی اور کہتی کہ مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دیجئے — آپ پڑھے لکھے ہیں۔ مجھ سے بہتر جانتے اور سمجھتے ہیں۔ سچ کہئے آج کل کے لڑکے بیٹی دینے کے قابل ہیں؟ فیشن کے دلدادہ ویسے فضول خرچ ویسے، متلون مزاج ویسے بڑے گن بھرے ہوتے ہیں۔ پینے کھانے کی ہوا بھی خوب زوروں پہ چل نکلی ہے۔ مگر آپ کنول کی طرح پانی میں رہ کر بھی پانی سے الگ تھلگ ہیں۔ آپ بہت نیک ہیں۔ میں آپ کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی ہوں۔ کہئے ہیں آپ کو ایسا سمجھوں۔ آپ بُرا تو نہ مانیں گے کہ یہ بلا کہاں سے گلے پڑی، جان نہ پہچان، آپ کو میں چھوٹا بھائی سمجھتی ہوں —" کشور مسکرانے لگا "آپ نے میری اتنی تعریف کی ہے کہ میں اب اپنے آپ کو آپ کا بھائی بننے کے قابل نہیں سمجھتا۔ میں آپ کا خادم ہوں۔" "ارے آپ یہ کیا کہتے ہیں کشور بابو —"

کشور استانی ماں کے کمرے میں شام گزارنے لگا۔ کافی سے اس کی تواضع کی جاتی۔ اور باتوں کا ایسا سلسلہ چھڑ جاتا کہ رات کے نو نو بھی بج گئے۔ استانی ماں کا شہر میں کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ جو کچھ ملاقات تھی تو وہ محلہ والوں سے۔ اب جو انہیں ایک دلچسپ اور شریف پڑوسی مل گیا تو اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ایک دن پشپا کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ استانی ماں اسکول چلی گئی۔ اور پشپا اکیلی بستر پر لیٹی رہی۔ کشور کے اسکول کو اس دن تعطیل تھی۔ وہ بھی اپنے کمرے پر تھا۔ اُستانی ماں کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھا تو وہ اندر

چلا آیا۔ پشپا اس کو اندر آتا دیکھ کر شال میں چھپ گئی ــــ "پشپا" کشور نے پکارا ــ اب طبیعت کیسی ہے تمہاری؟ پشپا چپ چاپ لیٹی رہی ــ کشور پلنگ پر جا بیٹھا "کیسی ہے اب طبیعت؟" اس نے پشپا کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "جائیے آپ کی بلا سے ــ آپ کو کیا؟" "ارے" یہ الفاظ پشپا کی زبان سے نکل رہے تھے۔ ننھی بھولی بھالی پشپا یہ لہجہ اس نے کہاں سے سیکھا؟ کشور دم بخود بیٹھا رہا "پشپا" اس نے دھیمے لہجے میں پکارا ـــ "جی" ـ پشپا کی آواز تھی "آج تم اسکول نہیں گئیں" "جی ہاں آپ کو مجھ سے کیا غرض۔ آپ تو اماں ہی سے ملنے آتے ہیں۔ میں اسکول چلی جاتی آپ کو خوشی ہوتی! کیوں" کشور کمرے کے باہر نکل گیا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا بازار کی طرف چلا گیا۔

شام میں استانی ماں اس کے کمرے پر آئیں۔ وہ کتاب پڑھتا بیٹھا تھا۔ "کشور بابو آپ کے پاس ایوڈین ہے" "جی ہاں ہے" کشور نے کتاب بند کر دی اور اپنا چھوٹا سا صندوق کھولنے لگا۔ "آج میرے سینے میں بڑا غضب کا درد ہو رہا ہے۔ آپ شیشی لے کر آئیے میں انگیٹھی میں آگ سلگاؤں۔۔۔" کشور ایوڈین کی شیشی لئے استانی ماں کے کمرہ میں داخل ہوا پشپا پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی ـــ اس کا منہ دروازہ کی طرف تھا اور وہ انگور کے دانے گھول رہی تھی "کشور بابو" پشپا کہہ رہی تھی کہ آج اس نے آپ کو بہت ناراض کیا؟ کیا بات ہوئی؟ "جی مجھے تو کچھ یاد نہیں پڑتا۔ پشپا تو نے کب مجھے ناراض کیا شریر کہیں کی؟" "کشور بابو پشپا شریر ہو تو کیا؟ بھولی ضرور ہے؟"

"آپ صرف بھولی کہتی ہیں۔ بھولی ہے ـ پیاری ہے ـ لاڈلی ہے، دلاری ہے، اور پشپا ہے؟" اور۔۔۔ اور۔۔۔۔"

"میری بچی ہے" استانی ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ کا درد۔۔۔" کشور نے ایوڈین کی شیشی کو ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا اس کے کھلتے ہی درد بھی ہوا ہو جائے گا ــــ"

"کشور بابو" استانی ماں نے کہنا شروع کیا۔ "ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ مرض علاج کے قابو کا نہیں ـــ" "آخر یہ ہوا کیسے؟" کشور نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا" آپ اطمینان سے بیٹھئے ـ یہ درد میری بدنصیبیوں کے انبار کی تہہ میں چھپا ہوا ہے ـ آپ کو اپنی زندگی کا کچھ حال سناؤں تو شاید آپ کچھ سمجھ سکیں یہ درد کیسے ہوا؟ میری شادی بچپن میں ہوئی، کشور بابو پشپا کی عمر میں تھی میں ـ میرا خاوند مہینوں گھر نہ آتا رہا کبھی تو بس جیسے صورت دکھانے آیا ہو؟ مجھے اس کی کچھ پروا بھی نہ تھی لیکن جب میں بڑی ہوئی تو اس کی یہ غیر حاضری کانٹے کی طرح چبھتی ـ اس کے ماں باپ اسے سمجھاتے میں نے بھی ایک دن اس کے پیر پکڑ لئے ـ لیکن آوارہ دوستوں نے شراب کی لت ایسی ڈال دی تھی کہ گھر میں اُسے چین ہی نہ پڑتا ـ میں، اپنی قسمت کو کوستی روتی دھوتی جوانی کے پہاڑ سے دن کاٹ رہی تھی ـ عورتوں کو مصیبت سہنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے ـ بیچاریاں سہہ جاتی ہیں ـ ایک رات میں سو رہی تھی کہ سارے گھر میں کہرام مچ گیا ـ رونے دھونے کی آوازوں سے میری نیند ہشیار ہو گئی ـ کمرے کے باہر نکل کر دیکھتی ہوں تو صحن میں میرے خاوند کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی ـ ان کے ایک شرابی دوست نے انہیں قتل کر ڈالا تھا ـ میں ایک چیخ مار کر لاش سے لپٹ گئی ـ روتے روتے بیہوش ہو گئی ـ شرابی تھا، جواری تھا، وہ سب کچھ تھا ـ لیکن میرا خاوند تھا ـ میں نے اس کا سہارا لیا تھا خدا کو حاضر ناظر جان کر اس کی خدمت اور محبت کے لئے اپنی گردن جھکاتی تھی اور پھر اس ہندوستان میں بیوگی ایک، ایسی لعنت ہے، جو چتا کی آگ سے زیادہ ہولناک اور جان لیوا ہوتی ہے ـ بیوگی، ایک ایسی زندگی جو

جو موت کے بعد گنہگاروں کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے۔ میں روتی رہی۔ اور میں شاید عمر بھر روتی رہتی لیکن میرے ایک دور کے ماموں تھے انہوں نے مجھے میری سسرال سے اپنے گھر میں بلالیا۔ ساس نند کے طعنوں سے بچی۔ ظلم سے بچی، مرنے سے بچی۔ خدا میرے ماموں کو ہمیشہ خوش رکھے انہوں نے تھوڑا بہت پڑھا لکھا کر مجھے اس قابل تو بنا دیا کہ آج اپنے پیر پر کھڑی رہ سکوں۔ اپنے اور پشپا کے اخراجات کے لئے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ پڑے۔ توبہ ہے یہ میں کیا دکھڑا لے بیٹھی، کہنا یہ چاہتی تھی کہ یہ درد کیسے پیدا ہوگیا؟ اور جانے کیا کیا کہتے رہی۔ تو جس وقت یہ پشپا، جو اب پلنگ پر لیٹی ہوئی ہے میرے پیٹ میں تھی۔ ایک دن اس کا باپ نشے میں لڑکھڑاتا گھر آیا، مجھ سے کہا "کھانا لاؤ" میں نے کھانا چن دیا تو کہنے لگا "سونے کی رکابیاں لاؤ۔ میں اس کا منہ تکنے لگی تو اس نے یکے بعد دیگرے ساری رکابیاں صحن میں پھینک ڈالیں" ارے یہ کیا کرتے ہو" کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو اس نے مجھے ڈھکیل دیا۔ میں کھم سے ٹکرائی۔ میرا سر چکرانے لگا، میں اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی، گالیاں بکتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور ایک زور کی لات کھینچ ماری، میں بیہوش ہوگئی اور صبح میں میری گود پشپا سے آباد تھی۔ یہ درد اسی لات کا ہے کشور بابو۔ اسی لئے اب میں چاہتی ہوں کہ پشپا کی زندگی پھولوں کی طرح ہنستی کھلکھلاتی رہے۔ اور آپ جانتے ہیں عورت کی زندگی مرد کے ہاتھ میں ہے۔ چاہے وہ اسے خوشیوں سے معمور کردے چاہے اُجاڑ دے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ اور اب بھی کہتی ہوں کہ آپ اپنی بیوی کو خوش رکھیں گے"

"دیکھئے آپ نے پھر۔ میری تعریف شروع کردی ——" کشور نے شرماتے ہوئے کہا۔ "تو دیکھئے اگر آپ کو ایک غریب بیوہ کی لڑکی سے شادی کرنے کو کہا جائے تو آپ انکار تو نہ کریں گے ——" "اچھا اگر وہ خود انکار کرے تب"

"دیکھئے اماں کشور، ہمیں ستاتے رہتے ہیں" پشپا نے بسورتے ہوئے کہا۔ "کشور بھیا کیوں نہیں کہتی۔ تو آپ ذرا مجھے یہ کپڑا سینک دیتے جائیے، دیکھئے آپ کی پڑھائی میں تو ہرج نہیں ہو رہا ہے نا!" ——

"ذرا دیکھوں تو ——" کشور اتنا کہہ کر کمرے کے باہر چلا گیا۔ واپس آکر اُس نے کہا "معلوم ہوتا ہے کوئی شخص میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ کل بھی میں نے دیکھا کہ آپ کے کمرے میں داخل ہوتے وقت کوئی شخص اس کھڑکی کے نیچے کھڑا تھا۔ خدا معلوم کون ہے؟" کشور بہت متفکر نظر آرہا تھا۔

"اونہہ، ہوگا کوئی فقیر" استانی ماں نے لاپروائی سے کہا۔"

دوسرے دن مالک مکان نے کشور سے کہا کہ وہ دو دن کے اندر کمرہ خالی کردے اس کے ایک قریبی رشتہ دار کو اس کمرے کی ضرورت ہے؟ کشور نے رضامندی ظاہر کردی، اور سیدھا استانی ماں کے ہاں چلا آیا۔ اور انہیں سارا حال سنا دیا —— اُستانی ماں بڑی پریشان ہوئیں۔ مالک مکان سے مل کر اُسے سمجھایا۔ خوشامد کی۔ لیکن وہ نہ ماننا تھا نہ مانا۔ استانی ماں ملول اور دل گرفتہ واپس ہوئیں۔ سوچتے سوچتے بیچاری کا دماغ معطل ہوگیا" تو پھر اب آپ کہاں جائیں گے،" "جہاں سینگ سمائیں گے" "کشور بابو" استانی ماں کا لہجہ تیز اور سخت ہوگیا ——" کشور بابو یہ دنیا اب انسانوں کے بسنے کے قابل نہیں رہی، آپ کا شبہ ٹھیک تھا۔ کوئی شخص آپ کے پیچھا لگا ہوا تھا۔ اور میں جانتی ہوں وہ شخص کون تھا۔ وہ شخص آپ کے کمرے کا مالک تھا؟ "مگر میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا" آپ نے کچھ نہیں۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے لئے پشپا کو مانگا تھا مگر میں نے صاف انکار کردیا۔ میں اُسے اور اس کے بیٹے دونوں کو پہچانتی ہوں۔ مرجاؤں گی مگر پشپا اس بدمعاش کے پلے نہ پڑے گی، آپ بھی دیکھتے رہئے۔ اور سنتے بھی

رہئے ۔ یہ کیسے کیسے گل کھلاتا ہے ۔ مجھے دق کرنے کی یہ پوری کوشش کرے گا مجھے ہر طرح مجبور کرے گا ۔ میری عزت اور بیوگی پر دباؤ پڑیں گے ۔ اور معصوم پشپا کو ایک بدمعاش کے پنجے میں دینے کے لئے زمین و آسمان ایک کر دئیے جائیں گے ۔

کشور نے رکتے رکتے کہنا شروع کیا " استانی ماں میرا جانا ایک لحاظ سے ٹھیک بھی ہے ، میرے آپ کے پاس آنے جانے کو لوگ عجیب عجیب باتوں پر محمول کر رہے ہیں ، کوئی کچھ کہتا ہے ، کوئی کچھ ؟ میری وجہ سے آپ کی بدنامی ہو ، مجھے کبھی گوارا نہیں ۔" " میں سمجھ گئی " یہ ساری کارستانی اسی بدمعاش کی ہے خیر دیکھ لیا جائے گا ۔ یہ دنیا بڑی پاپی ہے ۔ بڑی پاپی ہے کشور بابو ـــــ اور میں مجبور ! ایک غریب بیوہ عورت ۔

کشور نے وہ محلہ چھوڑ دیا ۔ چند دن استانی ماں اور پشپا کی یاد اُسے بہت ستاتی رہی ، لیکن امتحان کی تیاری میں وہ سب کچھ بھول گیا محلے اور اسکول بدلتے بدلتے تین سال گزر گئے ، اور وہ کالج کی بورڈنگ میں چلا گیا ، محنت اور شوق نے اُسے ہر سال کامیاب کیا اور بی ۔ اے کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد اس کی تعلیمی زندگی ختم ہو گئی ۔ اب وہ عملی زندگی میں قدم رکھ چکا تھا ۔ دفتر کے عہدہ داروں سے واسطہ تھا ۔ جگہ کہیں نہ تھی ۔ لیکن کشور ہر جگہ قسمت آزماتا ۔ ایک دن وہ بس سے سفر کر رہا تھا ۔ بس رُکی ، اُترنے والے مسافر اتر گئے اور سوار ہونے والے مسافر سوار ہو گئے ۔ کشور اپنی دھن میں بیٹھا ہوا تھا ۔ لیکن ایک مسافر کی آواز نے اُسے چونکا دیا ۔ ایک مسافر نشے میں چور کنڈکٹر سے کہہ رہا تھا کہ " بس آہستہ چلاؤ "۔ کشور نے پشپا کو دیکھا ۔ اس مسافر کے بازو ایک لڑکی سہمی سہمائی بیٹھی تھی ۔ کشور نے گردن پھیر لی اور اپنی دھن میں گم ہو گیا ۔ کچھ سوچ کر ایک جھٹکے کے ساتھ اُس نے گردن موڑ لی ۔ اس کی نظریں اس لڑکی کے چہرہ پر گڑ کر رہ گئیں ۔ " اِدھر کیا دیکھتا ہے ؟ چل سامنے دیکھ " اُس مسافر نے ڈانٹ کر کہا ۔ لیکن کشور برابر گھورتا رہا ـــ اس کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی تو وہ لڑکی پشپا سے ملتی جلتی تھی یا خود پشپا تھی ، مگر یہ وہ پشپا نہ تھی ۔ بھولی بھالی ننھی ـــ یہ ایک دراز قد ، گداز جسم کی خوبصورت لڑکی تھی ۔ جس کی نشیلی آنکھوں کے اطراف سیاہ حلقے گہرے ہوتے جا رہے تھے ۔ لڑکی نے کشور کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا تھا ۔ لیکن کنکھیوں سے وہ اسے دیکھتی رہی " اُف لڑکیاں کتنی جلد بڑی ہو جاتی ہیں ، کتنی جلد بدل جاتی ہیں " کشور سوچ رہا تھا ـــ اتنے میں بس اسٹانڈ آ گیا ۔ وہ لڑکی اپنی نشست سے اٹھی اور کشور کی طرف جانی پہچانی نظروں سے دیکھتی ہوئی نیچے اتر گئی ۔ اُس کے پیچھے وہ مرد بھی اترنے لگا ۔ کنڈکٹر نے گھنٹی بجائی ۔ بس آگے بڑھنے لگی ۔ لیکن چیخ کی آواز نے سب کو پریشان کر دیا ۔ بس روک دی گئی ، کشور تیزی کے ساتھ نیچے اُترا ، کیا دیکھتا ہے کہ وہ مرد اس لڑکی کے ساتھ تھا ، سڑک پر اوندھے منہ پڑا ہے ۔ اس کے منہ اور سر سے خون کے فوارے ابل رہے ہیں اور وہ لڑکی زار و قطار روتی کھڑی ہے ۔ حادثہ یہ ہوا کہ وہ شخص بس کے پائدان ہی پر کھڑا تھا کہ بس چلنے لگی اور وہ اُترنے لگا تو دھڑام سے زمین پر آ رہا ۔ بس کے کنڈکٹر نے رپورٹ لکھ لی ۔ اور پولیس نے قانونی کارروائی کے بعد بس کو چھوڑ دیا ۔

کشور اس لڑکی کے قریب پہنچا تو " کشور " کہہ کر وہ لڑکی اس سے لپٹ گئی " پشپا یہ کیا " کشور نے گلوگیر آواز میں پوچھا " یہ میرا خاوند ہے کشور ؟ تمہارے جانے کے بعد اماں کو مجبور کر کے میری شادی اس سے کر دی گئی ۔ تم جس کمرے میں ٹھیرے ہوئے تھے ۔ اس کے مالک کا بیٹا ہے ! یہ بدنصیب ! اب میں کیا کروں کشور ؟" اتنے میں " امبولنس " آ گئی اور اس نے پشپا کے خاوند کو ہسپتال پہنچا دیا جہاں تین گھنٹے تک ایڑیاں رگڑ کر وہ راہئ عدم ہو گیا ۔

"پشپا چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں ___" کشور نے دھیمے لہجے میں کہا۔ پشپا نے کشور کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ کشور"

کشور کا ذہن اس وقت برسوں پہلے کی باتوں کو یاد دلا رہا تھا۔ استانی ماں کی زندگی کا ہر پہلو کشور کی نظروں میں تھا۔ اور پشپا ان کی بیٹی ... اپنی قسمت سے لڑ رہی تھی۔ کشور کو اب کیا کرنا چاہیئے تھا وہ سوچتا تھا اور پشپا اس کے کاندھے پر اپنا سر رکھے ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

رشید قریشی

قطعات

غم کی داستان ←

بے بسی، بیچارگی، بدبختیاں
درد دل میں، آنکھ سے آنسو رواں
خیر، رہنے دیجئے، بندہ نواز
کیا سنیں گے، آپ غم کی داستاں؟

یاد ←

یاد جب آ کے کسی کی مجھے تڑپاتی ہے
اشک ہوتے ہیں رواں، آہ نکل جاتی ہے
شدتِ درد سے بیتاب سا ہو جاتا ہوں
زندگی خواب فراموش نظر آتی ہے

آزمائش قسمت ←

قصۂ درد و غم سناتا ہوں
داغ دل کے انھیں دکھاتا ہوں
آرزوئے کرم نہیں، لیکن
اپنی تقدیر آزماتا ہوں

جوانی ←

کتنی ظالم ہے اُف جوانی بھی
درد سے ہم کنار کرتی ہے
سازِ دل کے خموش تاروں کو
چھیڑ کر بے قرار کرتی ہے

تحسین سروری

ٹیگور بہ حیثیت حُسن کار

حسن کاری کا مفہوم :۔ ادب یا حسن کاری کیا ہے۔ حسن کاری کی تخلیق کیوں ہوئی اور زندگی سے اس کا کیا تعلق ہے۔ یہ سوالات ہر ملک اور زمانے میں کئے گئے۔ افلاطون سے لے کر عہد حاضر تک ہر فلسفی نے فکر و تجسس کے بعد مختلف اندازمیں ان کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن یہ موہوم اور سمٹا ہوا استعجاب زمانے کے ساتھ وسیع ہوتا گیا۔ ارباب نظر نے فکر واندیشہ کی دنیا سے جو پھول چن لائے تھے وہ رنگ و بو اور شکل و صورت کے اختلاف کی وجہ اس وسیع اور ہمہ گیر استفسار کا تسکین بخش جواب نہ بن سکے۔ متجسس نگاہوں نے ہر منزل پر ایک نیا گل کھلایا لیکن دورِ امکان کی دنیا وسیع تر ہی ہوتی گئی۔

ادب یا حسن کاری کی ماہیت کو معین الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ادب یا حسن کاری کی بقا و ترقی میں وہی حرکات عمل فرما ہیں جو زندگی کو نت نئے قالب اور جوانی بخشتے ہیں، اس لئے کسی محرک اور برق زا کیفیت یا شئے کی ماہیت کے سمجھنے کے لئے اس کی تعریف ایک لاحاصل کوشش ہے۔ ادب یا حسن کاری کی مثال اس چاک کی گردش کی سی ہے جو آبشار سے برقی قوت پیدا کرنے کے لئے نصب کیا گیا ہو۔ چاک کی گردش سے متعلق کچھ کہنا ہو تو اس کے مظاہر اور نتائج تو بیان کئے جاسکتے ہیں اور برق کی انسان نوازیاں بھی گنائی جاسکتی ہیں لیکن گردش کی ماہیت کے لئے معین الفاظ کی جکڑ بندیاں عبث ہیں۔

ادب ایک دھارا ہے جو ماضی کی فلک بوس پہاڑیوں کے دامن سے نکل کر حال کے وسیع میدانوں میں بہہ رہا ہے۔ انسانی شعور اس دھارے کی رفتار میں سرعت اور موجوں میں تلاطم و سکون پیدا کرتا ہے۔ یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔ ادب یا حسن کاری ایک حقیقت ہے جسے دیکھنے والوں نے اختلافِ ذوق و نظر سے دیکھا اور مختلف نظریے قائم کئے۔

حسن کاری کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس میں زندگی، دنیا، زمین و آسمان کی ہر چیز سماتی ہے، عالیشان عمارتوں میں بھی حسن کاری دکھائی دیتی ہے۔ قدیم تہذیب کے سرمایۂ عمل میں بھی اس کے نشانات قدم ملتے ہیں، موسیقی کے زیر و بم اور اتار چڑھاؤ میں بھی صاحب ذوق حسن کاری کی روح محسوس کرتے ہیں لیکن تعمیر کاری کی گرانی کا جمالیاتی ذوق متحمل نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے حسن کاری کے وسیع دائرے میں ایک وسطی خط کھینچا گیا اور جمالیات کی ایک نئی لیکن دلکش و لطیف اصطلاح تراشی گئی، جمالیات دراصل حسن اور فنون لطیفہ کا فلسفہ ہے یہ کائنات کی ہر چیز پر جسم و مادہ کی سطح سے بلند ہو کر نظر ڈالتا ہے اور اپنی قوت سے بدصورت اشیاء کو بھی حسن کے نور میں غسل دے کر ان کو حسین بنا دیتا ہے۔

حسن کاری برائے حسن کاری یا ادب برائے ادب کا طلسم ایک عرصے تک بڑے بڑے نقادوں کو مسحور کئے رہا اور انہوں نے اسی کے اشاروں پر اس کی نشر و اشاعت میں اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔

جمالیاتی تخیلیت (AesThetic Idealism) سے بہت جلد انسانی زندگی کے حرم میں شر و فساد کی بجلیاں کوندنے لگیں اور روز بروز انسانیت خطرے کے خوفناک غاروں سے قریب ہوتی گئی۔ قوموں کی زندگی میں ایسی بحرانی کیفیت

([illegible]) کے وقت میں کوئی نہ کوئی ایسا آتش زبان جنم لیتا ہے جو پھر سے ایک نئی اور حیات بخش روح پھونکتا ہے۔ تخیلیت کا یہ قدیم جادو بھی بہت جلد اترا۔ سب سے پہلے مارکس اور اینگلیز نے واقعیت (Realism) کی کسوٹی پر حسن کاری کے سونے کو کسنا شروع کیا اور کہا کہ حسن کاری دراصل ہیئت اجتماعی اور نظام تمدن کی خدمت کا آلۂ نشر و اشاعت ہے۔ مارکس کی صداقت بیان کو اس کے پیروؤں نے انتہائی نقطہ تک پہنچا دیا اور اشتراکیوں نے ببانگ دہل کہنا شروع کیا کہ مزدوروں کے مفادات کا تحفظ قلم کے ہتھیاروں سے کیا جائے اور تاوقتیکہ کوئی تصنیف اجتماعی مفاد کو پورا نہ کرے اسے شائع کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

حسن کاری برائے حسن کاری کے خالص جمالیاتی نظریے کا یہ ردِ عمل تھا۔ لیکن یہ دونوں نظریے دراصل انتہاپسندی کا نتیجہ تھے جو عمل اور ردِ عمل کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے۔ ادب کی طویل زنجیر کے ان دونوں انتہائی سروں کو ایک وسطی کڑی ملاتی ہے جس کو میتھو آرنلڈ اپنے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے ہے اس نے حسن کاری برائے تنقید حیات کہہ کر خزاں کے دھندلکے میں ایک تجلی دکھائی جو موسم بہار کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اس کے بعد متعدد نقادوں نے اسی سرچشمہ سے بصیرت حاصل کی اور واقعیت و جمالیت کی دو متضاد قوتوں میں توازن پیدا کر کے ان سے ایک عظیم الشان اور حیات بخش قوت کی تخلیق کی یہی ہمارا جدید ادب ہے جس میں واقعیت کے ساتھ افیون بھی ہے کہ اس کی گرانی محسوس نہ ہو۔

ٹیگور کا نظریۂ حسن کاری ـــــ حسن کاری کی اس عام اور سرسری بحث کے بعد ضروری ہے کہ ہم ٹیگور کے نظریۂ حسن کاری کا مطالعہ کریں کیونکہ اس کے حسن کارانہ عمل کی جانچ کا یہی راست اور مفید طریقہ ہوگا۔ حسن کاری کا مفہوم اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے صرف یہی مراد ہے کہ جمالیت پسندی اور واقعیت پسندی دو متضاد قوتوں سے جدید ادب کی تخلیق ہوئی اور یہی نقطۂ تصادم جدید ادب کی آفرینش کا مقام ہے۔ کسی کے نظریۂ حسن کاری کا مطالعہ کرتے وقت تین امور خاص طور پر پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔ اول تو یہ کہ حسن کار کے نزدیک ادب کی تخلیق کا کیا مفہوم ہے دوسرا یہ کہ اس کی غرض و غایت کیا ہے اور تیسرا یہ ہے کہ زندگی کی واقعیت کس درجہ پائی جاتی ہے۔

ٹیگور حسن کاری برائے حسن کاری کے قدیم اور خالص جمالیاتی نظریے کا علم بردار ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کسی غرض و غایت کے سائے میں ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ انسان کی شخصیت کا ساغر جب اپنے وجود کی شراب سے چھلکتا ہے تو ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جنگجو کو صرف نبرد آزمائی ہی سے طمانیت قلب نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذوق جہاد کے تخیل کو ارفع و اعلیٰ بنانے کے لئے موسیقی اور تزئین کی بھی ضرورت ہوتی ہے وہ اس وجود کے احساس اور اس کی نمائش کے لطیف فرق کو واضح کرنے کے لئے کہتا ہے۔

"ایک ایسا انسان جو مذہبی اعتقادات کا پابند ہو اپنی تمام توجہ صرف دیوتا کی پرستش پر ہی صرف نہیں کرتا بلکہ اس کی مذہبی شخصیت اپنی نمود و نمائش کے لئے بت خانے کی رونق و تزئین اور عبادت کے طریقوں کے لئے بھی بے تاب رہتی ہے۔"[۵]

• ادب کی تخلیق کو فن کاروں نے ایک حادثہ یا اتفاق بتایا ہے۔ یہ حادثہ یا اتفاق کیا ہے؟ حسن کار ایک طویل مدت تک اپنے تجربے اور تصور کی دنیا میں سرگرم سفر رہتا ہے تب کہیں جا کر اس کی اس سخت ریاضت کا یہ صلہ ملتا ہے کہ یکایک اسے تجلی دکھائی دیتی ہے اور اسی تجلی کی ترجمانی ادب کی صورت میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ یہی حسن کار کے تجربات اور تصورات سے (Personality

کا عکس ہے جو اس کی شخصیت کے آئینے میں دکھائی دیتا ہے۔ ٹیگور کہتا ہے کہ شخصیت کی نمود ہی کا نام ادب کی تخلیق ہے۔ لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حسن کار کے دل کی یہ آوازیں جو اس کی شخصیت کے مضراب سے نکل رہی ہیں، اپنے ماحول اور تجربے سے متاثر ہوئے بغیر سنائی نہیں دیتیں۔ بادی النظر میں یہ فرق ناقابل التفات معلوم ہوتا ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حسن کار یا ادیب کو اسی دوراہے پر بصیرت حاصل ہوتی ہے اگر یہاں اس کے قدم متزلزل ہو جائیں تو پھر اسے کبھی ہمت کا دامن نہیں ملتا اور گوشۂ گمنامی اختیار کرنا پڑتا ہے ـــ

ٹیگور کا مقام: ـــ ٹیگور نے ہندوستان کی حیات و موت کی کشمکش کے زمانے میں جنم لیا ہے۔ موت و حیات کی یہ کشمکش قومی تھی لیکن ٹیگور نے اس سے بہت کم اثر قبول کیا ہے۔ اس حقیقت پر غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ موت و حیات کی کشمکش سے متعلق کچھ بیان کیا جائے۔ موت و حیات کی کشمکش یا تجرباتی کیفیت دو نوعیت کی ہوتی ہے۔ بعض وقت قوموں کی زندگی میں بحرانی کیفیت سے آئندہ انقلاب کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے اور اس کے اثرات حسن کاری پر بھی مرتب ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اس کے خلاف خود ادب کی خانگی زندگی میں بھی ایسے خطرے پیدا ہوتے ہیں جن کا اثر حسن کاروں پر پڑتا ہے اور ان کی شخصیتیں شہرۂ آفاق بن جاتی ہیں۔ ایسے ہی شاعروں میں فانی بدایونی بھی ہے۔ لیکن اس قبیل کے حسن کاروں کی ایک خصوصیت مشترک یہ ہوتی ہے کہ وہ انفرادی حیثیت سے تو انسان کے جذبات و احساسات کو متاثر کر سکتی ہے لیکن اجتماعی اور قومی نقطۂ نظر سے ان پر نظر ڈالی جائے تو سخت مایوسی ہوگی۔

قومی زندگی میں جب بحرانی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو اس سے اثر پذیر ہونے والوں کی حیثیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو قوم کی بوسیدہ عمارت کو دیکھ کر متردد تو ضرور ہوتے ہیں لیکن اس میں ترمیم کر کے قوم کے سامنے اُسے نئی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کا مرتبہ قومی نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور بعض وہ ہیں جو اس بے بسی و بے چارگی کی تلخیوں سے آہیں بھرا کرتے ہیں یا پھر ان کی آہیں ہستی کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو ان تلخیوں سے گھبرا کر دنیا و حقائق سے قطع تعلق کر لیتا ہے اور اپنی علیحدہ خیالی دنیا بسانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دنیا کی ناگواریوں سے بھاگ کر اپنے لئے ایک گوشۂ عزلت میں سکون اور شانتی تلاش کرتا ہے۔ ٹیگور بھی اسی گروہ کا ایک نمایاں فرد ہے۔ ان تینوں جماعتوں کے علاوہ ایک وہ بھی گروہ ہے جو انحطاط پذیر تہذیب کو منہدم کر کے ایک نئی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ قومی نقطۂ نظر سے ایسے ہی لوگوں کی عزت کی جا سکتی ہے اور یہی پیمبرانہ پیام نہی قوموں تک پہنچا کر ان میں زندگی پیدا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسے ادیب کم ہیں لیکن اقبال ان سب میں سرآمد ہے۔

ٹیگور کو طمانیت قلب کی جستجو تھی۔ اس کی فطرت اجتماعی زندگی کی کشمکش سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی تھی اس لئے اس نے دنیا کی تمام تباہیوں اور لعنتوں سے چشم پوشی کر کے اپنے لئے ایک حسین خوابگاہ تیار کر لی تھی۔ اگر اس سے دریافت کیا جاتا کہ تم اپنی قوم کی فلاح و بہبودی اور نجات و سربلندی کے لئے کیا پیام دیتے ہو تو وہ اسی خواب کے خمار میں جواب دیتا کہ ان سب کے لئے اسی حسین خوابگاہ میں جگہ ہے، وہ محبت و پرستش کے ذریعہ سرفراز ہو سکتے ہیں۔

ٹیگور کا حسن کارانہ ایقان اور اس کی محرکات: ـــ ٹیگور کا پیام قوموں کے نام صرف یہ ہے کہ وہ محبت اور جذبۂ پرستش

(Love and Devotion) کے گیت گا کر اپنے لئے نجات کی بصیرت حاصل کریں۔ یہ معلوم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ آخر وہ کیا اسباب اور محرکات ہیں جن سے شاعر نے گوشۂ تنہائی اختیار کیا۔ سب سے پہلے ہم کو اس کے ایام طفلی کے رنگین عہد پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ کیونکہ اس کے ایقان کی اس عظیم الشان عمارت کا سنگ بنیاد دراصل عہدِ طفولیت ہی میں رکھا گیا تھا۔

ٹیگور ایک دولت مند خاندان کا چشم و چراغ تھا اس کو ہر قسم کا آرام و آسائش حاصل تھی۔ اس کی خوش گوار زندگی تکلیف و مصیبت کی آندھیوں کے تصور سے بھی ناآشنا تھی۔ فطرت میں مستانگی جوش اور القائیت کے عناصر پہلے ہی سے موجود تھے۔ شعر و سخن اور نغمہ و موسیقی کی مترنم صداؤں نے اس کی روح میں رقص و مستانگی پیدا کر دی۔ اور فکر و اندیشہ کو تیز کرنے کا پورا سامان بہم پہنچ گیا۔ اس زمانے میں وہ سب کچھ جو ادب کی صورت میں وجود میں آیا اس کے تصوراتِ خاندان ہی کی دیواروں تک محدود تھے۔ اور اگر کہیں کسی بیرونی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے تو وہ مستعار ہے۔ ٹیگور کی روح اس طرح تعیش و تلذذ سے مست کھلی فضاؤں میں پہنچی تو یہاں فطرت کی دلکشی نے اس پر گہرے اور ان مٹ نقوش مرتب کئے اور ٹیگور فطرت پرست بن گیا۔

فطرت کی پوجا اور پرستش کا مفہوم اس قدر فرسودہ ہو چکا ہے کہ ہمارا ذہن اب اس کی لطافتوں اور وسعتوں کی طرف بالکل منتقل نہیں ہوتا۔ فطرت پرستی کے سلسلے میں سب سے پہلے جو چیز زیر بحث آتی ہے وہ کائنات کی وسعت ہے۔ کائنات کی وسعت سے مراد یہ ہے کہ شاعر کی روح میں کائنات کی ہر چیز بلا کسی امتیاز کے وجد و رقص پیدا کرے اور ہر چیز کی روح اپنے چہرے سے نقاب الٹ کر فطرت پرست سے ہم کلام ہو۔ ایسے فطرت پرست ہی نغموں اور تلوار کے لچکنے سے نکلنے والی آوازوں میں یکساں لطافت محسوس کرتے ہیں۔

فطرت پرستی:۔ ٹیگور کی فطرت پرستی کا ظرف اس قدر وسیع ہیں کہ کائنات کا ہر جزو اپنے لئے اس میں جگہ پیدا کر سکے۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس کی شاعری میں جہاں فطرت نگاری کے دریا بہا دئیے گئے ہیں، پہاڑوں کو کچھ اس طرح نظر انداز کیا گیا ہے کہ گویا صفحۂ ہستی پر ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ ٹیگور کے نزدیک پہاڑ اس لئے قابل التفات نہیں ہیں کہ وہ وسیع منظر کے آگے سدِ راہ بن جاتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ٹیگور جس کو ہم فطرت نگاروں کی پہلی صف میں جگہ دیتے ہیں اس قدر تنگ نظر ہو۔

ایک بار ٹیگور نے دارجلنگ کے مقام پر کہا تھا کہ یہ چٹانیں آنکھوں کے سامنے پردہ ڈال دیتی ہیں وہ غیر متزلزل اور ناقابل انتقال ہیں۔ وہ وسعت کی آزادی کو محدود کر دیتے ہیں[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیگور نے کہیں کہیں پہاڑوں کی بھی تصویر نگاری کی ہے لیکن وہ ایسے وقت جب کہ وہ خود ان چوٹیوں سے جن کے نظارہ کی لطافتوں کو بیان کرتے ہیں زیادہ بلند چوٹی پر ہوتے تھے۔ اور وہ پہاڑ جن کا وہ ذکر کرتے ہیں کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ ہم کو اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ٹیگور کی نرم و نازک طبیعت پہاڑ کی ثقالت کو گوارہ نہیں کر سکتی۔ وہ پہاڑ کے منظر سے اسی وقت لطف اندوز ہوتے ہیں جب کہ وہ سب سے بلند چوٹیوں پر ہوتے ہیں اور فطرت کی دلفریبیوں میں ان کی روح بھی رقص کرنے لگتی ہے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

مغرب سے کچھ پہلے سنگری (Sunghri) نامی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا۔ کب اور کس طرح سورج نے پہاڑوں کی چوٹیوں میں اپنا روشن منہ چھپا لیا، مجھے خبر نہیں میں اس بلند چوٹی پر سے دو خوبصورت پہاڑوں کے سلسلے کو دیکھنے میں محو ہو گیا جو ایک دوسرے کو

[1] خود نوشتہ سوانح عمری

تک رہے تھے۔ مغرب ہوئی اور تاریکی نے سیاہ چادر میں زمین کو لپیٹ لیا۔ اس کے بعد بھی میں اس سربلند پہاڑی پر تنہا بیٹھا رہا۔

اس تصویر کو ذرا غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ٹیگور کو پہاڑوں سے بنفسہٖ کوئی تنفر نہیں ہے لیکن جب یہ دیو نما پہاڑ اُن کی آنکھوں کے سامنے حائل ہو کر ایک وسیع منظر پر پردہ ڈال دیتے ہیں تو اس وقت اُن کی طبع نازک پر یہ گراں ہو جاتے ہیں۔ یہ پھر بھی نظر کی تنگی ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

فطرت پرستی کی وسعت کے علاوہ اور دو چیزیں ہیں جن کو ہم عقیدت اور تقدس و پاکیزگی کہہ سکتے ہیں جس طرح ہماری آنکھیں فطرت کی بے شمار چیزوں کو دیکھ کر حظ اٹھاتی ہیں اسی طرح محسوسات کی دنیا میں بھی بعض نظارے ہیں۔ ان میں حسن، عشق و صداقت جیسے اٹل اور وسیع حقائق شامل ہیں ایک فطرت پرست شاعر صرف مادی اشیاء ہی سے حظ حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کی لذت و حظ کے لئے ایک غیر ارضی فطرت گاہ بھی ہے۔ آیئے ذرا غور سے دیکھیں کہ ان محسوسات کی دنیا میں ٹیگور کی نظریں کیا دیکھتی ہیں۔

"میرے راجہ نے بھیڑ بھاڑ سے عام لوگوں کی طرح چھپے چھپائے میرے دل میں آکر میری بہت سی گزرتی ہوئی عمر کی گھڑیوں پر جاوید کی مہر لگادی"

ان اشعار میں ٹیگور کے جذبۂ پرستش و محبت کا پیام بول رہا ہے۔ محبت کا تقاضا دنیا کے شور و شغف سے آزاد ہو کر جذب و رقص پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ شور و شغف میں چند لمحے اس مقدس فرض کی ادائیگی کے لئے بھی نکالنا ہے۔

"اے میری زندگی کی روح تابندہ! میں اپنے جسم کو ہمیشہ پاک رکھنے کی کوشش کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہارا حیات بخش ہاتھ میرے دست و بازو تھامے ہوئے ہے"

"میں اپنے خیالات کی دنیا سے کذب و ریا کو نکال دوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم "صداقت" ہو جو میرے خانۂ دل میں بصیرت کے چراغ جلاتی ہے"

"میں ہمیشہ کوشش کروں گا کہ تمام برائیوں کو نکال دوں میں اپنی محبت پھول سے وابستہ کرلوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے دل کی گہرائیوں میں تم اپنی جگہ رکھتے ہو"

"یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے حرکات و سکنات سے تمہارے وجود کی نمائش کروں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم ہی ہو جو مجھے حرکت کی قوت عطا کرتے ہو"

یوں تو یہ دونوں نظمیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک میں جذب و کیف کا بیان ہے اور دوسری نظم میں محبت کی کشش کے اثرات دکھائے گئے ہیں۔ ہرچند ان کے تخیلات کا تعلق قدیم شاعری سے ہے اور کوئی نئی بات بیان نہیں کی گئی۔ لیکن اس کے اظہار کا طرز بالکل نیا اور ممتاز ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور خصوصیت پیش نظر ہونی چاہئے کہ اس کے خیالات ہمیشہ ایک ہی مرکز کے اطراف گردش کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ایک تدریجی ارتقا بھی موجود ہے اس میں ٹیگور کی عظمت کا راز بھی نہاں ہے۔

"میں نے گلزار عالم کا خوبصورت پھول توڑ لیا۔ اسے محبت کے ساتھ سینے سے لگایا۔ درد و کرب کی ایک ٹیس لگی — اور کانٹا دل میں پیوست ہوگیا"

گیتان جلی

"سورج گوشۂ مغرب میں روپوش تھا۔ تاریکی نے ہر جانب اپنے سیاہ بازو پھیلا دئے تھے میں نے پھول کی طرف دیکھا مرجھا چکا تھا۔ لیکن سینے میں درد بدستور قائم تھا۔ ایک نہ ختم ہونے والا درد ــــ !"

"دنیا کے خوش نما باغیچہ میں سیکڑوں قسم کے پھول کھلیں گے۔ ان کی خوشبو سے ذرہ ذرہ معطر ہو جائے گا۔ مگر میرا وقت گزر چکا ہے۔ اب میں پھول نہ چنوں گا"

"شب اندھیری اور طوفان خیز ہے میرا گلاب میرے پاس موجود نہیں مگر درد ــــ وہ اب بھی باقی ہے شاید تازیست رہے"

یہ محبت اور روح کی وجدانی کیفیت ہے جس نے ٹیگور کے حجاب سے پردۂ حقیقت اُٹھایا۔ یوں تو گلزار عالم میں پھولوں کی کمی نہیں لیکن داد دیجئے ٹیگور کی نظر انتخاب کی کہ گلزار عالم کا وہی پھول چن لیتا ہے جس کو در و دیوار بھی حیرت اور وارفتگی سے دیکھتے ہیں۔ اور اس پھول سے ٹیگور کی روح پر ایک القائی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

فطرت پرستی نے ٹیگور کی روح کے وہ تمام مہلک جراثیم ختم کر دئے تھے جو روح کو علیل کئے دیتے ہیں لیکن طبیعت کا یہ تقدس اس قدر آزاد نہیں ہے، مذہب کی چار دیواری سے سر اٹھا کر بیرونی دنیا کو بھی دیکھ سکے اور پھر مذہب کی دیوار بھی بہت ہی معمولی مسالہ سے تیار کی گئی ہے حقیقی تقدس تو مذہب کی مجبوریوں کو طے کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔

فطرت اور انسان میں مطابقت:۔ فطرت پرستی کی جو صورتیں بیان کی گئی ہیں وہ بالکل ابتدائی ہیں اس سے آگے ایک اور منزل بھی ہے جسے فطرت پرستی کا معراج کہنا زیادہ مناسب ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایک فطرت پرست خوبصورت گلاب کو دیکھ کر بے اختیار ہو جاتا ہے لیکن جب اُس کے ذوق نظر کی دنیا اور وسیع ہو جاتی ہے اور غیر تصوری طور پر بصیرت حاصل ہوتی ہے تو اسے انسان اور فطرت میں ہم آہنگی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ وہ غریبی اور افلاس میں خزاں کی تصویر دیکھتا ہے، اس کے خلاف جب انسان کاروبار کی گتھی میں فطرت کے وجود سے چشم پوشی کرنے لگتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ اپنا ذوق نظر دیکر ہی کھونے لگتا ہے چنانچہ رابندرناتھ ٹیگور نے کہا ہے۔

"دنیاوی کاروبار ہماری کامل توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ پیدائش دولت اور صرف دولت میں ہماری تمام تر قوتیں ضائع ہو رہی ہیں اور ہمیں فطرت میں کوئی چیز ایسی دکھائی نہیں دیتی جن کا تعلق ہم سے ہو"

"ہم نے دلوں کو وقف کر دیا ہے ایک نہایت ہی ادنی چیز کے حصول کے لئے سمندر چاند کے لئے اپنی آغوش انتظار کھولے ہوئے ہے۔ ہوا جو ہر وقت ایک شور مچائی رہتی ہے اور پھر مردہ پھولوں کی طرح سمٹ جاتی ہے یہ اور اس قسم کی دوسری چیزوں سے ہم لذت گیر نہیں ہوتے، فطرت ہم کو متاثر نہیں کرتی۔"

فطرت کے نمایندے:۔ ٹیگور کے خیال و دل کی دنیا پر روح کی پرچھائیاں چھائی ہوئی ہیں ان کے ادبی کارنامے دراصل فطرت انسانی اور مناظر قدرت کا دلکش مرکب ہیں اور ان دونوں باغوں سے چنے ہوئے پھول ان کے ادبی گلدستوں میں نظر افروز بن گئے ہیں ان کے ہر ادبی کارنامے کے کردار کو روشن کرنے کے لئے مناظر قدرت کی روشنی ڈالی جاتی ہے اور پیچھے سے جب روشنی پڑتی ہے تو تصویر پہلے سے بھی زیادہ حسین دکھائی دیتی ہے۔

"مہب کا خیال ہے کہ وہ کالی ہے مگر میری نگاہ میں سوسن کا پھول، میں نے پہلے پہل اسے کھیت میں دیکھا تھا، عریاں اور بے نقاب چہرہ قومیت (Nationalism)

گندھے ہوئے بال دونوں شانوں پر رقصاں تھے ۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کالی ہو جیسا کہ گاؤں کے لوگ کہتے ہیں۔ مگر میں نے اس کی نرگسی آنکھیں دیکھی ہیں مجھے بے حد پسند ہیں۔ اس کی گایوں نے خوف زدہ ہوکر بولنا شروع کردیا وہ جھونپڑی سے باہر نکل آئی ایک تھرکتی ہوئی نگاہ آسمان پر ڈالی، بادل محو خرام ناز تھے، اسے آنے والی بارش کا خطرہ محسوس ہوا۔

"میں دھان کے کھیت کے کنارے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا یہ بات شائد صرف اُسے ہی معلوم ہے یا مجھ کو، وہ کالی ہے۔ جیسے ساون کی گھٹائیں۔ پھولوں کی بیل کی طرح —— خوابیدہ خواہش کی طرح جو صرف برسات کی راتوں کو دل میں بیدار ہوتی ہے"

یہ ہے وہ پس منظر جسے ٹیگور کسی کردار کو واضح اور روشن کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا فطرت انسان کی زبان سے بول رہی ہے۔ ٹیگور کے نزدیک عورت کی آفرینش کا واحد مقصد یہی ہے کہ مردوں کو اپنے سحر آفریں نغموں سے زندگی بخشے لیکن جیون نغموں میں فطرت بھی اپنے ساز کی آوازیں ملانے لگتی ہے تو ان کی سحرکاری اور اثر آفرینی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ شاعر نے ساون کی گھٹاؤں جیسی کالی، پھولوں کی بیل کی طرح —— خوابیدہ خواہش کی طرح —— برسات کی راتوں میں بیدار ہونے والی کہہ کر ایک موہوم تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دی اب ہر شخص کا اپنا ذوق ہے کہ اس تصویر کو روشن کرنے کے لئے اپنے اپنے ذوق کے پانی میں دھوئے جن کے ذوق ادب کا پانی تمام اجزائے ترکیبی کا متناسب مرکب ہو وہ اس تصویر کو روشن کرنے میں انتہائی کامیاب ہوئے۔ کہنے کو تو ساون کی گھٹائیں کہہ دیا گیا ہے۔ کوئی تو اس سے صرف گھٹاؤں کے کالے رنگ پر ایک نگاہ ڈال لیتا ہے اور کوئی اس کی دلنوازیوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور خرام ناز، البیلا رقص، الھڑپن جیسے نایاب گوہر چن لاتا ہے۔ ٹیگور کی ادبی سرگرمی کا واحد مرکز عورت ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں اول تو یہ کہ ہند و عورت ذلت و خواری کی وجہ سے ہمدردی کی مستحق بن گئی ہے۔ چنانچہ اس لعنت سے عورت کو نکالنے کی بنگال میں مختلف لوگوں نے کوشش کی۔ راجہ رام موہن رائے نے ایک مستقل تحریک کا آغاز کیا اور اس کے بعد ٹیگور خاندان کے مختلف افراد نے اس تحریک کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ اس لئے ٹیگور کا عورت کی تباہی و مجبوری سے متاثر ہونا ایک لازمی اور ناگزیر امر تھا۔

ٹیگور کے ادبی کارناموں کے کرداروں میں عورت کے بعد بچہ دوسرے درجہ پر ہے۔ ٹیگور کے نزدیک بچہ اپنی معصوم اور دنیا کی لعنتوں سے ناآشنا زبان سے فطرت کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ دو کردار ایسے ہیں جن سے فطرت پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

مجاز و حقیقت:۔ ٹیگور کے ہاں لطافت بیان اور رفعت تخئیل کے ساتھ موسیقی اور دلکشی بھی موجود ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور جادو بھی ہے جو خاموش اپنا اثر کئے جاتا ہے۔ جب کسی نظم، افسانہ، یا ڈرامے کے آخری جملوں کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے آخری منتر اپنا پیدا اثر دکھا رہے ہیں۔ اس کے بعد جادو ایسا چلے گا کہ پھر اس سے الگ ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ناظرین مہینوں بلکہ برسوں اسی سحر آفریں خیال کو دل میں جاگزیں کئے رہتے ہیں ان کی کوئی تصنیف ایسی نہیں جن میں مجاز کے توسط سے کسی نہ کسی حقیقت کی ترجمانی نہ کی گئی ہو۔ خواہ معمولی افسانہ ہو یا ڈراما ہر ایک میں مجاز کے پردوں سے حقیقت نغمہ ریز ہوتی ہے اس کا نمونہ غیر ضروری ہے۔ کیونکہ ہر تصنیف کی بھی ایک مشترکہ خصوصیت ہے۔ حتیٰ کہ ابتدائی کارنامہ سنیاسی یا انتقام بھی اس خصوصیت سے مالا مال ہے۔

اس تمثیل کا مرکزی کردار ایک سنیاسی ہے جس کے آئینہ خودی میں دنیائے فانی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ وہ دنیا کو

ایک بے حقیقت شئے سمجھ کر اسرارِ خودی اور انکشافِ حق و جستجوئے صداقت کی فکر میں سرگرداں رہتا ہے ۔ وہ تمام دنیا اور فطرت کی دوسری دل نوازیوں کو محض کرشمہ غلط نگاہی تصور کرتا ہے اور دن رات ریاضت میں مصروف ہو جاتا ہے کہ اسے عرفان کی تجلی دکھائی دے ۔ لیکن یہ اس کی غلطی تھی ۔ جس وسیع چیز کی اسے تلاش تھی وہ محدود دنیا ہی میں مل سکتی تھی ۔ وہ جس دنیا کی تنگیوں سے متنفر ہو کر خودی کی جد و جہد کے لئے ناکافی سمجھ کر دوسری طرف لو لگائے ہوئے تھا پھر اسے اسی کی طرف رجوع کرنا پڑا ۔ اسے دنیا کی تنگیوں ہی میں ابدی سکون نصیب ہوتا ہے ۔ اس کی زندگی میں ایسا عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے والی کرشمہ نواز ایک نوجوان لڑکی ہے ۔ آخر وہ عقل و خرد کے سحر کی چار دیواریوں سے نکل کر محبت کی وسعتوں میں کھو جاتا ہے ۔ یہی اس کی حقیقی کامرانی ہے ۔

یہ ہے وہ مقام جہاں سے شاعر مجاز کی بانسری بجا کر حقیقت کے نغمے سنا رہا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دو باتوں پر غور کرنا بھی ناگزیر ہے ۔ اول تو یہ کہ یہ مجاز کی جو بانسری بتائی گئی ہے اس کی ساخت کیا اس قابل ہے کہ تمام دنیا والوں کے لئے مفید ثابت ہو اور جدید عہد کے عصری رجحانات کا پورا ساتھ دے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس حقیقت کے گیت کی کائناتی قدر و قیمت کیا ہے ۔

حقیقت :۔ حقیقت کی ترجمانی ہی حسن کارانہ عظمت کی آئینہ دار ہوتی ہے ۔ جس سے حسن کار کے مقام کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس سے پہلے بہت سے مرحلوں اور منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے ۔ ہر مرحلے کے بعد حسن کار میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اس کے مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔

حسن کار کی عام لوگوں سے مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اس کے احساسات کی دنیا بہت وسیع اور ہمہ گیر ہوتی ہے ۔ وہ زمین و آسمان، خیال و تصور ہر چیز سے برابر اثر قبول کرتا ہے ۔ اس زمانے میں حسن کار وارفتۂ تخیل رہتا ہے ۔ یہ کیفیت ٹیگور پر بھی گذر چکی ہے ۔ وہ اپنے گرد و پیش کی ہر چیز سے برابر متاثر ہوتے رہے ہیں تصورات کی دنیا میں کھوئے رہنا ان کی زندگی کا ایک ناگزیر مشغلہ تھا ۔

وارفتگی کے بعد احساس کا ساغر بھرنے لگتا ہے ۔ اور جذبۂ وارفتگی اظہار بن کر جلوہ فگن ہوتا ہے یہی در اصل حسن کاری کی ابتدار ہوتی ہے ۔ حسن کار کے احساسات و جذبات کی ترجمانی میں مختلف چیزیں اثر آفریں بن کر اس کی مدد کرتی ہیں ۔ اس ضمن میں سب سے پہلی خصوصیت حسن کار کی اپج ہے ۔ حسن کار کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے وہ اس دنیا کی اشیا کو جو اس کی اپج اور قوت تخلیق کی نمایندگی کرتے ہیں تخیل کی روشنی کے ساتھ دنیا کے آگے پیش کرتا ہے ۔ آئیے ٹیگور کی قوتِ تخلیق اور اپج کی صلاحیت کا جائزہ لیں ۔

ٹیگور کے تخیل کی دنیا بہت وسیع ہے اس کی زندگی مختلف مرحلوں سے دوچار ہوتی رہی ہے ۔ اس نے ان سے فائدہ بھی اٹھایا ہے نوجوانی کے زمانے کے کارناموں میں والہانہ جذبات اور حسن و عشق کی کیفیات کی ترجمانی کے سوائے اس کے تخیل کی دنیا میں کچھ اور نہیں ہے ۔ اس میں ٹیگور کے ایقان کی آزادی نسائیت کے حجاب میں مجبور ہونے کے باوجود دوسروں پر اس کے اثر کا جذب و انتقال پوری قوت کے ساتھ ملتا ہے ۔

" میں بے چین ہوں ۔ میں پیاسا ہوں ۔ ان دور کی چیزوں کے لئے میری روح اس تاریک فاصلے کے دامن کو چھونے کیلئے بڑھ رہی ہے ۔
اے ماورائی عظمت ! تیری بانسری کی دلدوز پکار میں فراموش نہیں کر سکتا ۔ میں ہمیشہ ہی فراموش کر دیتا ہوں ۔ کیونکہ مجھے پر پرواز نہیں ملے ۔ میں مقام کی حدود میں جکڑا ہوا ہوں "

"میں متردد اور مشتاق ہوں۔ میں اس اجنبی دنیا میں اجنبی ہوں"

"نسیم صبح ایک لاحاصل امید کا پیام لے کر آئی۔ زبان سے میرا دل ہم آہنگ ہے۔ گویا دونوں ایک ہی شے ہے۔

اے منتہائے تلاش۔ یہ تیری بانسری کی دلدوز پکار ہے۔ میں بھول جاتا ہوں۔ میں ہمیشہ فراموش کرلیتا ہوں کیونکہ میرے گھوڑے کے پر نہیں ہے۔"

یہ نظم باغبان سے ترجمہ کی گئی ہے۔ جو ان کی جوانی کا کارنامہ ہے جس میں انھوں نے شباب کی پوری خصوصیتوں کو ایک جا جمع کردیا ہے۔ ہمارا احساس بیدار ہوجاتا ہے جب یہ شاعر کہتا ہے کہ:

"زبان سے دل اس درجہ ہم آہنگ ہے گویا کہ دونوں ایک ہی ہیں" تو اس کی شباب پرستی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اس صداقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ٹیگور کی شاعری قلبی تاثرات کا مرقع ہے۔ ایک اور خصوصیت بھی ٹیگور کو عام شاعروں سے ممیز کرتی ہے وہ اس کی موسیقی ہے فی الحال صرف اس قدر بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ٹیگور کی شاعری کا ایک اہم عنصر اس کی موسیقی ہے اگر وہ موسیقی میں اس درجہ نمایاں نہ ہوتا تو شاید ٹیگور کی شاعری بھی اس قدر مقبولیت حاصل نہ کرسکتی۔

پیام:- ٹیگور کا عہد شباب کا زمانہ جب ختم ہوا تو اس کے حسن و عشق کے جذبہ میں بھی کچھ اور وسعت پیدا ہوئی اور یہ ایک پیام کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ یہی وہ پیغام ہے جہاں سے ٹیگور کے کلام میں ایک نامعلوم پیام کی طرف بھی اشارے دکھائی دیتے ہیں۔ ٹیگور کے اس پیام کی حقیقت کو سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ دنیا کے عظیم المرتبت حسن کاروں کے پیام پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تاکہ پیام کا صحیح مفہوم سمجھ میں آئے۔

گوئٹے کی عظمت کا اندازہ دراصل اس کے اس پیام سے ہوتا ہے کہ شیطان ارتقائے زندگی کے لئے ضروری ہے یہ شیطان دراصل اندرونی پیداوار ہے جو جذبۂ ناکامی کی آفرینش کرتا ہے۔ اس جذبہ پر فتح پانا عقبیٰ سے زیادہ شاندار ہے۔ عشق اس کشمکش میں راہ نجات کا تعین کرتا ہے۔

ڈانٹے سے عشق کی قوت کے ذریعہ دوزخ و جنت کی تخلیق کرنے کے راز کا پردہ فاش ہوا اور اسی کو گناہوں سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا گیا۔

اقبال نے اپنے فلسفہ کے چار تاروں کے ارتعاش سے ارتقائے انسانیت کے چار عناصر، خودی، عشق، یقین اور عمل کا گیت سنایا۔ ان میں کا ہر ایک پیام بجائے خود ایک کائناتی قدروقیمت کا حامل ہے اور یہ ایسی صداقتیں ہیں جن سے انکار کرنا آسان نہیں ہے ان میں روح عصر بھی پوری قوت کے ساتھ بول رہی ہے۔ لیکن ٹیگور کے سارے کلام کا مجموعی اثر اور پیام صرف (Love and Devotion) محبت اور جذبۂ پرستش ہے۔ خود ٹیگور کو اس امر کا اعتراف ہے کہ اس کی شاعری دوامی نہیں جس کا ثبوت ذیل کی نظم اور دوسری تحریروں سے ملتا ہے جو اس کے بعد حسب موقع درج کی جائیں گی۔

"میری تخلیق نغمہ سرائی کے لئے ہوئی ہے تیرے اس وسیع کمرے کے ایک گوشہ میں میری نشست گاہ ہے۔ تیری دنیا میں میرے لئے کوئی اور کام نہیں ہے۔ میری بے مقصد زندگی کسی منزل کے بغیر صرف ترنم ریز ہوسکتی ہے؟"

اے میرے مالک جب نصف شب کے تاریک بت خانے کا گھنٹہ مجھے خاموش عبادت کے لئے بیدار کرے تو تو مجھے اپنے سامنے کھڑا ہو کر گانے کا حکم دے۔ جب صبح کی ہواؤں سے سنہرے بربط کے تاروں میں ارتعاش پیدا ہو تو مجھے حاضری کا حکم دے کر اعزاز بخش۔

ٹیگور نے اس نظم میں اپنی تخلیق کا اصلی مقصد بیان کیا ہے اگر اس کے بعد بھی دنیا والے اس کے کلام میں کسی جسارت بخش پیام کی جستجو کریں تو یہ ان کی نادانی ہوگی۔ ٹیگور جیسا کہ اس سے پہلے "ٹیگور کا مقام" کے زیرِ عنوان لکھا جا چکا ہے کہ وہ زندگی کی تلخیوں سے قطعی بیزار ہے اس کی نشست گاہ اس وسیع کرہ کا ایک گوشے میں ہے جہاں وہ اپنے محبوب شغلے میں مصروف ہے۔ ان گیتوں کی شیرینی سے لوگ متاثر ہیں اور اس کے اطراف حلقہ بنائے ہوئے ہیں اگر اس کا کوئی پیام وہ ان گیتوں میں سن سکتے ہیں تو صرف اس قدر کہ "دنیا کا امن محبت و جذبۂ پرستش سے عبارت ہے"۔

جذبۂ پرستش و محبت کوئی نیا پیام نہیں ہے اس سے پہلے بھی دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف سخن سنجوں نے ایسے پیام دنیا والوں تک پہنچائے ہیں۔ فارسی زبان اس فلسفہ کا سب سے بڑا ماخذ ہے۔ ٹیگور نے کسی ایک ہی ماخذ سے استفادہ نہیں کیا بلکہ ہر چشمہ سے سیراب ہونے کی کوشش کی ہے۔ کیا اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ ذیل کے قطعہ کے خیالات ٹیگور سے پہلے کسی فارسی شاعر یا کبیر کے ملک والے کسی صوفی منش کوی نے نہیں بیان کئے اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیگور کی قوت بیان بہت ممتاز ہے۔

"میں نے افسانوں میں فخر کیا کہ تمھیں جانتا ہوں وہ میرے ہر عمل میں تمھاری تصویریں دیکھتے ہیں۔ وہ میرے پاس آئے اور دریافت کرتے ہیں یہ کون ہے؟ میں نہیں جانتا کہ ان کو کیا جواب دوں میں کہتا ہوں کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ مجھے برا بھلا کہہ کر چلے جاتے ہیں اور تم وہاں بیٹھے مسکراتے ہو"

"میں اپنی کہانیاں جو تم سے متعلق ہیں لافانی گیتوں میں سناتا ہوں تو دلی راز کے نغمے ابلتے ہیں۔ وہ آتے ہیں اور مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کا مطلب بیان کر! میں کہتا ہوں آہ! ان کا مطلب کیا ہے کون جانتا ہے؟ وہ پہلے سے بھی زیادہ غصہ کے ساتھ واپس چلے جاتے ہیں اور تم وہیں بیٹھے مسکراتے ہو"۔ ٹیگور کے تصوف اور نغمہ سرمدی کا اندازہ اس نظم سے ہوتا ہے جو ان کے مسلک اور پیام کی آئینہ دار ہے۔ وہ صرف گانا جانتے ہیں۔ کوئی انھیں ان گیتوں کے سرِ بتا رہا ہے۔ اور یہ جذبہ خود بہ خود اظہار کا پیکر تراش لیتا ہے۔

اس تمام بحث کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ٹیگور کی حسن کاری در اصل ان کے اپنے نظریہ کی حامل ہے۔ زندگی کی صداقتیں اور واقفیت کا اس میں عام فقدان ہے۔ اور اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ کہ اتنے بڑے شاعر کا کوئی ایسا پیام بھی نہیں کہ اس کے بعد اسے زندہ رکھے۔

موسیقی ٹیگور نے موسیقی کی فضاؤں میں پرورش پائی تھی۔ ان کا گھر موسیقی کی فضاؤں سے گونج رہا تھا۔ ان کے خاندان میں مختلف افراد نے موسیقی کی دنیا میں خوب نام پیدا کیا تھا۔ خود ٹیگور موسیقی کے اچھے ماہر تھے اس سے ان کے کلام میں بھی جان پڑ گئی ہے۔ انھوں نے موسیقی سے اپنے کلام میں بہت سی جدتیں پیدا کی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ خالص شاعری سے زیادہ انھوں نے شاعرانہ موسیقی کی خدمات انجام دی ہیں جو ان کے بعد بھی دوسرے کے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہوں گی۔ اس کا ٹیگور کو بھی اعتراف ہے۔ میرے نزدیک ان کی شاعری بھی در اصل موسیقی ہی کا نتیجہ ہے۔

کتاب "ٹیگور بہ حیثیت شاعر و تمثیل نگار" کے مصنف (E.J. THOMSON) نے ٹیگور کی عبارت یوں نقل کی ہے۔

میں نے موسیقی کو بعض نئے عناصر سے روشناس کرایا ہے مجھے یاد ہے کہ میں نے تقریباً پانچ سو سے زیادہ نئے سروں میں نظمیں کہی ہیں اور یہ میری شاعری کے ساتھ متوازی ترقی کرتی رہی ہیں۔ کسی نہ کسی طرح میں شاعری کی اس خصوصیت کا حامی ہوں میں اپنے گیتوں میں کھو جاتا ہوں۔

میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ میری تمام شاعری فراموش کر دی جائے گی اور صرف میرے گیت میرے ہم وطنوں کے ساتھ باقی رہیں گے۔ میں اسی سے غیر معمولی فرحت محسوس کرتا ہوں..... میں ان کی حسن کارانہ قدر و قیمت سے بھی اچھی طرح واقف ہوں لیکن اس سے میرے صوبے کے باہر والے واقف نہیں ہو سکتے۔

قوتِ بیان آخر میں ہم ٹیگور کے ادبی کارناموں میں حسن کاری کے اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہیں کہ ادب میں اسلوب زیادہ ضروری ہے یا موضوع اور مواد؟ دراصل کسی ادبی کارنامے کے خارجی عناصر میں موضوع اور مواد داخل ہیں۔ معاشرتی اور سیاسی میلانات کا عکس ان پر پڑتا ہے۔ اس کے برخلاف صورت یا اسلوب ادیب کی انفرادیت کی آفرینش کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ ادب کے جمالیاتی عناصر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ٹیگور کا نظریۂ حسن کاری خالص جمالیاتی ہے اس لئے یہ اپنے خیال کو جادو اثر پیکر دیتا ہے جس کو سن کر انسان کا ذوق بے اختیار داد دیتا ہے۔ حسن کار کی انفرادیت کا راز بھی اسی میں ہے کہ وہ اپنے خیال کے نت نئے قالب تراشے۔

ٹیگور کی حسن کاری خیال سے زیادہ زبان کی وادیوں میں سرگرداں ہے لیکن اس کے سفر کا انداز بہت ممتاز ہے۔ وہ جس جگہ سے گزرتا ہے اس سے کچھ پھول چن لیتا ہے اور اپنی شاعری کی قبا میں کچھ اس طرح ان پھولوں کو لگاتا ہے کہ اس سے قبا کے حسن میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔

نظرِ بازگشت ٹیگور کی حسن کاری کے متعلق ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اجمالاً صرف اس قدر ہے کہ ٹیگور حسن کاری برائے حسن کاری کے خالص جمالیاتی نظریے کا حامی ہے۔ اسے زندگی کی تلخیوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اس سے وہ دنیا کے آگے نہ تو کوئی پیام ہی پیش کر سکا اور نہ ادب میں واقعیت کا عنصر ہی داخل ہو سکا۔ اس کا اگر کوئی پیام ہے تو صرف جذبۂ محبت و پرستش ہے۔ جس میں زندگی بخشنے کی صلاحیتیں موجود نہیں ہیں بلکہ مسحور کرنے کی قوت ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی انفرادی شخصیت ممتاز ہے جو اس کے اسلوب بیان کا نتیجہ ہے۔ اور یہی اس کی عظمت کا راز ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی ٹیگور کے کلام میں کسی اور پیام کے معلوم کرنے کی کوشش کرے گا تو شاید ہی اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوگی۔ ہر شخص انفرادی حیثیت سے ٹیگور کی عزت کر سکتا ہے لیکن اجتماعی اور قومی نقطۂ نظر سے اسے کسی خاص مقام پر بٹھانا غلطی ہوگی۔

رحیم الدین کمال ظہیر آبادی

چارہ گر

یہ دنیا —— ایک بازیگر کا تماشا ہے۔ کتنے بہروپ بدلتی ہے۔ کیسے کیسے انہیں یاد ہیں۔ لوگ تم سے ملتے ہیں۔ ایسے کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ دل میں نہ جانے کیا کیا بھرا ہے۔ مگر زبان اس کی سچی ترجمان نہیں ہوتی۔ غرض اس دنیا کی دورنگی سے متعلق اتنی باتیں ہیں میرے دل میں کہ بس اب کچھ نہیں سوائے اس کے ع آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آسکتا نہیں۔

اس دنیا کے دھندوں سے مجھے لیٹنے اور غور کرنے کی بہت کم مہلت ملتی تھی۔ لیکن جب کبھی اندھیرے میں یہ سنہرا موقع مل گیا میرے تخیل کو پر لگ جاتے۔ جانے کہاں کہاں یہ مجھے اڑانے لئے جاتا۔ میں ایک ناکام زندگی کا مرقع ہوں۔ میری سچی کہانی آپ نہ سن سکیں گے۔ یہ تو صرف میرے ہی دل کی آگ ہے اور اب تو ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

مجھے ایک درد رہتا ہے۔ مگر مجھے خود نہیں معلوم کہ یہ درد کہاں ہوتا ہے۔ اور اس کا درماں کیا ہے۔ میں دنیا کو اس کی داستان سنا کر مغموم کرنا بھی نہیں چاہتا اور نہ مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ کبھی کبھی تو یہ درد اٹھتے اٹھتے سارے نظام عصبی کو تہ و بالا کر دیتا۔ اور مجھ پر بے ہوشی سی طاری ہو جاتی۔ دنیا کے چند لوگ میرے حال پر ہنستے تھے۔ دنیا، اگر ہمدردی نہیں کر سکتی تو چپ چاپ کسی تباہ حال کا حال تو دیکھ سکتی ہے۔ مگر نہیں۔ وہ اتنی متین، سنجیدہ اور اپنے مستقبل سے خبردار نہیں۔ اس لئے اس کو ہنسنے دیجئے۔ نہ جانے کس کس کے قسمت میں کیا کیا لکھا ہے۔ اچھا تو ہاں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا درد رہین درماں ہو جائے۔ لیکن میرے دوستوں سے خدا ہر کسی کو اماں میں رکھے، ایسے ایک دو دوست آپ کے ہوں تو آپ کو پھر اپنی قدر و عافیت معلوم ہو جائے ؎

جیتا نہ بچا ایک بھی جاں بر نہ کوئی ہو　　　دو چار ستم گار ہوں تیرے سے اگر اور

ڈاکٹر جے رام اس زمانہ کے بڑے مشہور ماہر طب تھے۔ جرمنی ورمنی جانے کہاں کہاں کی ان کے پاس ڈگریاں تھیں۔ میں نے بھی نام سنا تھا۔ مگر ان ڈاکٹروں سے خدا بچائے، مجھے ہمت ہوتی تھی کہ انہیں بتاؤں۔ جانے کیا کہہ دیں۔ کچھ کا کچھ۔ اور میں وہم میں مبتلا ہو جاؤں۔ جس سے بدتر کوئی مرض نہیں۔ اور یوں بھی مجھے طبیبوں سے مشورہ کرنا۔ ان کے پاس ذری ذری سی شکایت لیجانا۔ درد پیدا ہوتا۔ نیند نہیں آتی بھوک کا پتہ نہیں۔ ہول ہول سی ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ سوانگ بھرنا میری فطرت کے خلاف ہے۔ منطق کا ایک سوال یاد آتا ہے "طبیبوں سے مشورہ نہ کرو۔ کیونکہ جو مشورہ کرتے ہیں وہ بھی تو مرتے ہیں" میں اپنے درد کو لیے دیے رہتا تھا۔ ایک دن میرے پاس برج کی پارٹی تھی۔ میرے چند بے تکلف دوست جمع تھے۔ ہم کھیل میں ایسے منہمک تھے کہ ہمیں سر و پا کا ہوش نہ تھا۔ میری جیت پر جیت ہو رہی تھی۔ کسی کا وہ مقولہ رہ رہ کر یاد آتا تھا "جو محبت میں ناکام رہتا ہے کھیل میں ہر بازی جیت لیتا ہے" ہاں تو کبھی میں نے بھی محبت کی تھی۔ کیا آپ لوگوں نے نہیں کی؟ اور ناکامی تو محبت کا سایہ ہے۔ محبت کو کامرانی سے کیا واسطہ۔ بس ہم کھیل ہی رہے تھے۔ کیونکہ بس اب اس قسم کی وارفتگیوں اور دلچسپ وغیرہ دلچسپ مصروفیتوں میں میں اپنا غم غلط کر سکتا تھا۔ اگر یہ دوست نہ ہوتے تو میں جیتے جی مر جاتا۔ خدا انہیں اچھا رکھے اور "کسی سے محبت نہ دے" برج اور سگریٹ یہ دو میری زندگی کے گہرے شغلے تھے۔ میرا کمرہ سگریٹ کی راکھ سے گرد آلود ہو رہا تھا۔ ایش ٹرے میں راکھ جھٹکنے کی تو آج تک کسی بھلے مانس کو توفیق نہیں ہوئی۔ اس اثناء میں میرے درد نے کروٹ لی چشم فلک کے تیور بدلے۔ میں نے ایک ٹیس سی محسوس کی۔ گر ضبط کے سارے انجر پنجر آگئے تھے۔ برداشت کی قوت مجھ پر مسلط

ہوگئی تھی۔ میں نے پہلے حملے پر بڑی مضبوطی کے ساتھ قابو پالیا مگر آج تو درد کے اس بے تکے حملے نے مجھے تڑپا دیا۔ جیسے میری سٹی گم ہوگئی۔ میں تڑپ کر بیہوش ہوگیا۔ صرف ایک چیخ میری زبان سے نکلی۔ اتنا مجھے یاد ہے۔ اور پھر مجھے کچھ خبر نہیں۔ کیا ہوا۔ کچھ دیر کی بے ہوشی کے بعد ــــ یاد نہیں کیا وقت تھا۔ مگر میرے کمرہ کا سبز لیپ روشن تھا۔ رم جھم رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ میں نے کروٹ لی۔ دیکھا، یاض اور سلیم کراماً کاتبین کی طرح میرے دائیں بائیں کھڑے ہیں۔ اور ایک نئے صاحب جن کو میں پہچان نہ سکا چشمہ لگائے مجھے گھور رہے ہیں۔ سالک میرے سرہانے کھڑا ہے۔ ابھی جو ہم سب بیٹھے کھیل رہے تھے۔ اور ابھی سب کھڑے کیوں ہو گئے۔ برج کے پتے کہاں ہیں اور میرے ہاتھ کا سگریٹ! ان سب کے چہرے متفکر کیوں ہیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہیں شاید چشمہ لگائے ہوئے۔ قیاس کہتا تھا۔ بیماری میں انسان بہت ذی حس ہوجاتا ہے۔ اس کا جسم کمزور ہوا تو کیا، اس کی عقل رسا ہو جاتی ہے۔ میں اپنے ذہن میں انھیں گتھیوں کو سلجھا رہا تھا کہ کسی نے پوچھا "آخر درد تمھیں کہاں ہوتا ہے؟" میں ڈاکٹری مشورہ کو ڈھکوسلا سمجھنے والا انسان، بھلا اس درد کا ان سب کو کہاں پتہ چلنے دیتا۔ وہ پوچھ رہے تھے اور میں کروٹ بدل بدل کر ٹالتا جا رہا تھا۔ اب ان صاحب نے آلے وغیرہ کی مدد سے باقاعدہ تشخیص شروع کردی اور یہ فیصلہ کردیا کہ "تمھیں اپنڈکس ہے۔ میں اس پر عمل جراحی کروں گا۔" میں جراحت سے گھبرانے والا نہیں۔ آج ہمارے کتنے ہم جنس آگ کے شعلوں میں کھیل رہے ہیں۔ مگر پھر بھی میرے اس معمولی سے درد کو ایک دم جراحت کیا نسبت؟ کیا یہ ڈاکٹر صرف چیر پھاڑ ہی جانتے ہیں۔ انھوں نے صرف ہتیار چلائے قلم نہیں پکڑا اپنی ڈاکٹری کی ڈگری میں! میں نے کہا مجھے بس یوں ہی جینے دیجئے۔ میں علاج ولاج کا قائل نہیں۔ مجھ میں درد کے پیہم حملوں نے رہی سہی سکت بھی باقی نہیں رکھی۔ میں جراحت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

سالک نے دھمکی دی۔ "جمیل تم تو پاگل ہوگئے ہو۔ کب تک اس درد کو پالتے رہوگے۔ تمہاری عقل جانے کہاں چرنے گئی ہے۔ نیک بخت ذرا سوجھ بوجھ سے کام لے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے ماہر فن طبیب ہیں۔ ان کے مریض کو کبھی ناکامی کا سامنا نہیں ہوا۔" "ان کے مریض ہے۔ کیوں ہوں میں ان کا مریض۔ میں ایسا مریض نہیں جس کو ایسے ویسے طبیب شفا دے سکیں۔ اب میں ان مودکھوں سے کیا کہوں۔ شفا اور مجھے۔ اب ہو چکی میں سالک کی بے تکی باتوں کا جواب ہی کیا دے سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا راستہ لیا۔ اور میں سوگیا۔ صبح ہوئی۔ اور یہ تینوں موکل نازل ہوئے۔ وہی بے معنی بول۔ لایعنی بکواس، دور از کار تاویلیں، من گھڑت قصے، جن کی جھنجھناہٹ سے میرا سر پھرنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کوئی فرشتہ تو تھے نہیں کہ بس جو یہ کہہ کر گئے ہیں اس پر فوری عمل کیا جائے۔ میری اور ہٹ دھرمی تو معلوم۔ میں نے ان سب کو بہلا کر منالیا کہ اب کے درد اٹھا تو ضرور جاؤں گا۔ خیر۔ ان کو راضی ہوتے ہی بنی۔ دن گزرتے گئے۔ مجھے یاد نہیں کتنی مدت بعد۔ پھر وہی درد اٹھا۔ وہی کرب وہی اضطراب کا سامان لئے ہوئے۔ اور اب میری آنکھوں میں دنیا تاریک ہوگئی۔ اب تو خود بخود مجھے اپنے مرض کی تشخیص کی دھن سوار ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر محمود کے پاس جانے کی ٹھانی۔ اور ان کے مطب کو روانہ ہوا۔ درد کے عالم میں۔ جب کہ اٹھنا بیٹھنا میرے لئے عذاب تھا۔ وہاں پہنچا۔ نام بڑا اور درشن چھوٹے تھے۔ مجھے اس کی خبر نہ تھی۔ شہر بھر میں ان کی ڈاکٹری کی دھوم تھی۔ بچہ بچہ کی زبان پر محمود کا کلمہ تھا۔ مگر شاید طبیب اور مریض کے ستاروں کو بھی ملنا چاہیئے۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میرا رنگ درد کے حملوں سے زرد ہوگیا تھا۔ میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ مجھے چکر سا آرہا تھا۔ انھوں نے نبض دیکھی آلے کی مدد سے سانس گنے۔ قلب کی حرکتوں کا تجربہ کیا۔ اور فتویٰ دے دیا کہ "تمھیں دق کا مرض ہے۔ مگر گھبراؤ نہیں۔ ابھی پہلا درجہ ہے۔ میرے سنی ٹوریم آجاؤ۔ جو ایک بہت ہی پر فضا بلند مقام پر بنا ہے۔

دونوں طرف اودی اودی پہاڑیاں چشمے۔ جھیل۔ تالاب۔ جہاں فطرت اپنا راگ الاپ رہی ہے۔" مجھے تو ڈاکٹر محمود شاعر سے لگتے تھے انھوں نے میرے مرض کی تشخیص کے مہیب تخیل کو اس سنہرے جال میں پھنسا کر مجھ پر کام روپ کا جادو کردیا تھا۔ میں —— جو زمانہ کے نشیب و فراز سہتے سہتے زندگی سے اکتا سا گیا تھا۔ اس جیون کے دکھی تجربوں نے جس کو انتہا درجہ کا ذکی الحس بنا دیا تھا۔ اس مرض کا نام سن کر بجائے خوفزدہ ہونے کے مسرت سے میرا دل ناچنے لگا۔ مجھے تپ دق سے ایک قلبی انس تھا۔ مجھے اس مرض کی تکلیف میں خدا جانے کیا کیا لذت ملتی تھی۔ میں نے دق والوں کے بہت مریض دیکھے تھے۔ سینی ٹوریم میں غزالہ کے ساتھ مہینوں گزارے تھے۔ غزالہ —— میری بنت عم۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ مگر چھپی ہوئی محبت۔ نہ اس نے کبھی اس کا پتہ چلنے دیا کہ اس کے پہلو میں بھی ایک دھڑکن سی ہوتی ہے اور نہ میں نے کبھی اس کی اس کو خبر ہونے دی۔ ہم دونوں کا جیسے ایک ہی مسلک تھا۔ محبت جتانے کے بعد اپنی وقعت و منزلت کھو دیتی ہے۔ جب میری طرف سے بے نیازی رہی اس کی غیرت نے اس کو دنیا سے کھو دیا۔ اس کی شادی اس کے والدین کے جبر سے ایک جاہل رئیس زادہ سے ہوگئی۔ جس کا شغل کبوتر بازی پتنگ بازی اور جانے کیا کیا اس کی بازیاں تھیں۔ عمر کے لحاظ سے بھی حامد اس سے بہت معمر تھا۔ لیکن والدین تو صرف دولت اور امارت ہی کو سرمایۂ زیست سمجھتے ہیں۔ ان میں زندگی کے کسی دوسرے نازک و اہم پہلو پر غور کرنے کی صلاحیت کہاں۔ چھپے ہوئے جوہر کو مادی آنکھیں تلاش نہیں کرسکتیں۔ دنیا تو صرف ظاہری چیزوں کو دیکھتی ہے۔ وہ تو ہر چمکنے والی چیز کو سونا سمجھ لیتی ہے۔ شادی کے ایک سال بعد ہی حامد کا دل اس نئے کھلونے سے بھر گیا۔ اور پھر وہ اپنی قدیم دلچسپیوں میں بدستور محو ہوگیا۔ اس نے اپنے والدین کے اصرار پر برائے نام شادی کرلی تھی۔ اس کو نسوانی احساسات کا دور سے بھی پاس و لحاظ نہ تھا۔ غزالہ کے مرض کا مواد اس استغنا و بے نیازی کے نشتر سے پھوٹ نکلا تھا۔ اس کو تپ آنے لگی تھی۔ اس کے سر میں درد رہتا تھا۔ وہ گھلتی جاتی تھی۔ میں نے اس کی تیمارداری میں اپنی زندگی کے دو سال اس کی قربت میں گزارے تھے۔ لیکن جب وہ جانبر نہ ہوسکی۔ اور میں پھر اپنی وہی بے حیا زندگی گزارنے پر مجبور ہوگیا تو مجھے آئے دن یہی سوچ رہتی تھی۔ کہ آخر مجھے دق کیوں نہیں ہوجاتی۔ آخر میرے شش اتنے مضبوط و بے حس کیوں ہوگئے ہیں۔ میں نے غزالہ کی سانسوں میں اپنی زندگی گزاری تھی۔ اس سے اتنی قربت کے باوجود میری یہ سخت جانی —— مجھے جتنی بھی دوبھر نہ ہو، کم تھی۔ غزالہ مجھ کو خود سے دور رہنے کی التجا کرتی تھی۔ میری نزدیکی سے جتنا اس کو خوف لگا ہوا تھا اتنی وہ اپنی موت سے خائف نہ تھی۔ بیماری کے اس موذی حملے سے قبل وہ ایک ہنستا ہوا گلاب کا پھول تھی۔ اس کی خوبصورت چمکیلی سیاہ آنکھیں دیکھنے کے بعد اسکو غزالہ نہ سمجھنا اپنی بے وقوفی تھی۔ رنج و غم کے بادل اس سنہرے افق سے کتنی دور دور تک نہ دکھائی دیتے تھے۔ اور آج —— یعنی مرنے سے کچھ دنوں پہلے۔ وہ ڈوبتی ہوئی زرد، دھیمی اور کمزور دھوپ سے زیادہ اداس تھی۔ وہ ایک پھول تھی۔ جو کمھلا چکا تھا۔ وہ ایک چڑیا تھی جس کی بولیوں پر صیاد کی زبردست دھمکیاں تھیں۔ اس کے غزالہ ہونے کا ثبوت، اس کے ہڈیوں بھرے ڈھانچے میں صرف اس کی آنکھیں ڈگمگ ڈگمگ کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ میں کبھی دکھی ہوکر کہتا کہ یہ تمھاری کیا حالت ہے۔ آخر اس سے حاصل؟ تو وہ مسکرا دیتی اور بس یہی جملہ اس کو یاد تھا۔" میں تو وہی ہوں جو تھی۔ شاید تمھاری آنکھیں بدل گئی ہیں۔" وہ بناوٹ کی مصنوعی ہنسی ہنس کر اپنا دکھ چھپانا چاہتی تھی۔ نہ جانے وہ اب کس نامعلوم غم میں گھلی جاتی تھی۔ میری اور اپنی محبت کی ناکامی یا حامد کی بے رخی و لاپروائی۔ وہ تکلم کے ہر انداز پر قدرت رکھتی تھی۔ اس کو بات کرنے کا بہت سلیقہ تھا۔ انسان بیماری میں کتنا بزدل، چڑچڑا اور بدمزاج ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ عام لوگوں سے کتنی مختلف تھی۔ اس میں کچھ چھپی ہوئی معصوم

تو تھیں۔ اس کی شرارت میں بھی سنجیدگی و متانت کی آن تھی۔ ذرا کے ذرا میں روٹھ جاتی۔ اور پھر منائے نہ منتی۔ خیر ـــــ تو یہ تھی غزالہ ـــ جس کا میں پجاری تھا۔ وہ میری امیدوں کا مرکز اور میرا "ایڈیل" تھی۔ ع عالم میں اس سے لاکھ سہی، وہ مگر کہاں

جس وقت ڈاکٹر محمود نے میرے مرض کی تشخیص اس طرح کی کہ مجھے تپ دق ہے تو میری مسرتوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ میرا بس چلتا تو میں محمود کو گود میں لے کر اچھالنے لگتا۔ میرے چہرے پر بجائے خوف و تردد کے نشاط کی لہریں دوڑتی دیکھ کر وہ بھی حیران ہو گئے۔ اور کچھ تعجب، کچھ حیرانی کچھ دلچسپی سے پوچھا۔

"آ ہو گئے نا میرے سینی ٹوریم پر؟" ان کو ایک نیا شکار جو ملا تھا پھر وہ کیونکر خوش نہ ہوتے۔ مگر ـــــ میں اپنے مرض کو اب کیا سمجھوں بتا لیجئے! اپنڈکس یا تپ دق! کیسی متضاد بیماریاں۔ میں سوچنے لگا کہ ان کے سوال کا کیا جواب دوں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے کیا کہنا چاہیئے۔ بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا کہ ان طبیبوں کی قیاس آرائیاں کہاں تک صحیح ہو سکتی ہیں۔ اُف۔ ان کے تخیل کی دنیا۔ وہ انوکھی دنیا۔ اتنی وسیع تجربہ و مشاہدہ کی دنیا کہ جس کا جہاں تک جی چاہے چلا جائے۔ میں نے جیسے کوئی فلم دیکھی تھی۔ حقیقت کے پردے میری آنکھوں سے اٹھتے جاتے تھے۔ ان ماہر فن طبیبوں نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔

آخری تاریخوں کی زردی مائل اداس چاندنی درختوں پر کوئی دم کی مہمان ہے۔ رات بہت بیت گئی۔ لیکن نیند کا پتہ نہیں۔ میں سوچ رہا تھا۔ لیکن کیا سوچ رہا تھا۔ یہی کہ ان ڈاکٹروں کے لئے میرا مرض اب ان کے تجربے کے امتحان کا ایک دلچسپ موضوع تھا۔ تو اب کیا ہو گا؟ آپ کہیں گے ع تو نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا۔

جہاں بانو بیگم

تغیرات

ہنس ہنس کے چھیڑنے کی وہ عادت نہیں رہی
وہ بن نہیں رہا، وہ مسرت نہیں رہی

میرا شعور خود ہی مرا پاسبان ہے
اب منزلِ حیات مرے درمیان ہے

تیرے لئے وہ وحشتِ ہوش آزما گئی
وہ عرضِ صبح، شام کی وہ التجا گئی!

بے باکیوں کا تیری وہ دلکش فسوں گیا
وہ دل بجھا، وہ شوق مٹا، وہ جنوں گیا

اگلی محبتوں کی وہ تحریر مٹ گئی
نادانیوں کے دور کی تصویر مٹ گئی

مدھم سا پڑ گیا ہے کچھ اب سازِ دوستی
جب سے کھلا ہے مجھ پہ ترا رازِ دوستی

وہ ولولے جو دل میں تھے خاموش ہو گئے
اک سانحے سے میرے بجا ہوش ہو گئے

جو راز تھی نباہ کا وہ بات بھی گئی
وارفتگیٔ شوقِ ملاقات بھی گئی!!

اب تو قدیم وضع کا اک پاس ہے مجھے
دیرینہ دوستی کا کچھ احساس ہے مجھے

کچھ یہ نہیں کہ دردِ نہاں دور ہو گیا
میں گردشِ زمانہ سے مجبور ہو گیا

اڑتا ہوا سا رنگِ رُخِ روزگار ہے
یعنی! تغیرات پہ کیا اختیار ہے

جوہر فریادی۔

تنقید و تبصرہ

رسالہ "سہیل" گیا :- خاص نمبر حجم ۲۰۰ صفحے قیمت عمر۔ سالانہ چندہ ۳ روپے۔ حافظ محمد عبدالرحمٰن صاحب تسبل سنہاروی کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ خاصہ ضخیم پرچہ ہے۔ اس خاص نمبر کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں مقالے، نظمیں، افسانے ڈرامے اور غزلیں ملے جلے نہیں ہیں ان کی تقسیم کردی گئی ہے۔ یوں تو ہر مضمون اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن خاص طور پر "معارضہ مومن و غالب" ایک تحقیقاتی دلچسپ بحث ہے۔ اس ادبی پھیر پھاڑ کو اور زیادہ طویل ہونا تھا۔ آغا حشر اور اس کے آرٹ پر جو مقالہ لکھا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے "شکست عزم" ایک لازمی ٹھوکر ہے۔ "میری جو شامت آئی" بڑی موزونیت سے غالب کے اس ٹکڑے کی کھپت ہوئی ہے۔ واقعی شامت آئی تھی۔ "خاموشی" "خود گویائی بن گئی ہے۔" "فرض" احساس فرض کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ "گواہ" جس قسم کا افسانہ ہے ایسے نہ جانے کتنے حقایق ہوں گے کائنات کے اس بکھرے ہوئے شیرازہ میں۔ "ہاتھ کی لکیریں" قسمت کی بند مٹھی کو قبل از وقت کھولنے کی آپ ہی سزا بن گئی ہیں۔ "تلخی" کسی تشنہ کام کی زندگی کا نقشہ ہے۔ ڈراموں میں "رقاصہ کی محبت" اس شمارہ کا شہ کار ہے۔ "تمنائی کا" "محصور دستہ" سہیل کی جان کا محافظ ہے۔ "نقاب" نے کسی واقعہ کو بے نقاب کردیا ہے۔ "ماماہری" دھوکہ کی ٹٹی سے واقف کردینے کے لئے کافی ہے نیز یہ بھی کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔ نظموں اور غزلیات کا انتخاب بھی برا نہیں۔ "م ج"

بحرالکاہل کی سیاست :- از امین خالدی ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔ اس میں بحرالکاہل اور اس کے اطراف کے ممالک کے جغرافیائی حالات تاریخ اور اقتصادی مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سمجھنے والوں کی سہولت کے لئے اعداد و شمار اور نقشے بھی شریک کئے گئے ہیں جن سے مختلف ممالک کی پیداوار رقبہ آبادی اور تجارت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ہر ملک کے مسائل اور سیاسی اہمیت کا ذکر تاریخ کی روشنی میں کیا گیا ہے تاکہ موجودہ حالات کا تعلق ماضی سے ہوسکے اور مستقبل کے متعلق کوئی اندازہ قایم ہو۔

بحرالکاہل کے ممالک میں مسائل کے علاوہ چین و جاپان کے تعلقات اور منچوریا سے متعلق مسائل بھی پیش کئے گئے ہیں۔ چین و جاپان کے بعد بحرالکاہل سے تعلق رکھنے والی سلطنتیں برطانیہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور روس ہیں۔ برطانوی مفاد کینیڈا۔ آسٹریلیا۔ اور نیوزیلینڈ کی نوآبادیوں سے متعلق ہے اور اسی لئے برطانیہ کی دولت عامہ اس بحر سے خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ روس اور امریکہ تو جغرافی نقطۂ نظر سے اس بحر کے حدود ہی پر واقع ہیں۔ ان تمام امور کے پیش نظر بحرالکاہل کی سیاست دنیا کے بہتر کروڑ تیس لاکھ نفوس کے اقتصادی قومی اور ملکی مسائل کا مجموعہ ہے۔ اس طرح موجودہ حالات میں انسانی آبادی کے اعتبار سے بحرالکاہل کی اہمیت دنیا کے سمندروں میں دوسرے درجہ پر ہے اور جب تک ایشیائی ممالک کو بنیادی حقوق حاصل نہ ہوں گے بحرالکاہل میں زبردست کشمکش جاری رہے گی۔ غرض اس کتاب کے مطالعہ سے وہ لوگ جو سیاسی امور سے دلچسپی رکھتے ہیں ایک اہم مسئلہ کی نسبت مفید معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

نازیت :- از شاہد حسین رزاقی ایم اے عثمانیہ۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔ اس کا پیش لفظ پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی ایم اے آکسن بارایٹلا صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ نے قلم بند کیا ہے۔ جس میں انھوں نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ

"آج کل کے زمانے میں شاید کوئی سیاسی اصطلاح اتنی سننے میں نہیں آتی جتنی یہ اصطلاح نازیت ہے اور گو یہ لفظ بولشویت

اور فاشیت کے بعد ہی زبان پر آیا لیکن اس لفظ نے دونوں پیش روؤں کو گویا پس پشت ڈال دیا ہے۔ آج کل کے زمانے میں ناتسیت اور ہٹلر کچھ ایسے ہم معنی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور سمجھا جاتا ہے کہ ناتسیت ہٹلر کی پیداوار ہے یعنی ہٹلر نہ رہے گا تو ناتسیت خود بہ خود فنا ہو جائے گی۔ لیکن اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ ناتسیت ہٹلر کی نہیں بلکہ ہٹلر ناتسیت کی پیداوار ہے اور حکومت اور معاشیات کا یہ نظریہ ایک ارتقاء کا نتیجہ ہے جسے ہٹلر صرف اس لئے تقویت پہنچا سکا کہ اس کے عہدنامہ ورسائی کے بعد کی جرمنی کی پستی اور نکبت کا مقابلہ جرمنی کے درخشاں ماضی اور جبلی اہلیت سے کرنے کا موقع مل گیا اور خود اپنی قابلیت درشتی مزاج اور تنظیمی قوت کی وجہ سے وہ اس اثر کو کام میں لا سکا جو اس معاہدہ کے ردِ عمل کے طور پر جرمن قوم میں پیدا ہو چکا تھا؛

اس کتاب کے پہلے باب میں آمریت اور عمومیت سے متعلق ضروری امور بطور تعارف کے درج کئے گئے ہیں۔ اور دوسرے میں ناتسیت کے پس منظر کے طور پر جرمن مملکت کے ارتقاء کو سمجھایا گیا ہے جس میں فریڈرک اعظم۔ انقلاب فرانس۔ اور بسمارک کے اثرات کی وجہ سے جرمنی میں جو قومی اتحاد عمل پذیر ہوا اس کو واضح کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں جرمنی کی شکست اور عہدنامہ ورسائی کے بعد جو دورِ انتشار شروع ہوا تھا اور اس کے نتیجہ کے طور پر قومی اشتراکی جماعت یعنی ناتسی جماعت کے قیام اور تقویت کی نسبت معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ چوتھے اور پانچویں ابواب میں ناتسیوں کے مختلف نظریے اصول اور دیگر اہم مسائل اور معاشی امور بیان کئے گئے ہیں۔ آخر میں حوالہ کی کتابوں کی ایک فہرست بھی درج کی گئی ہے لیکن اس امر کا افسوس ہے کہ اس کتاب میں انڈکس یا اشاریہ شریک نہیں کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص اس کا مطالعہ کرے۔ "ق"

ادارہ کی خبریں

ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف شعبے اور شاخیں حسب معمول اردو کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ اس اثنا میں اردو انسائیکلوپیڈیا سے متعلقہ مجلسوں کے کئی اجلاس ہوئے اور یہ کام رفتہ رفتہ آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

اردو انسائیکلوپیڈیا

مجلس انتظامی کا ایک اجلاس ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو ۱۰ بجے صبح دفتر ادارہ میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور صدر مجلس انتظامی۔
ڈاکٹر محمد راحت اللہ خان صاحب ایم اے۔ ڈی فل (آکسن)
مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی
مولوی سید محمد صاحب ایم اے
مولوی سید بادشاہ حسین صاحب معتمد
مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ۔ معتمد

اُن قواعد و ضوابط کی آخری خواندگی عمل میں آئی جن کی نقلیں کر کے غور و خوض کے لئے اراکین کی خدمت میں روانہ کی گئی تھیں۔ اس مجلس میں مسودہ کو ضروری ترمیمات کے بعد منظور کیا گیا اور اشاعت کی اجازت دی گئی۔

غیر زبانوں کی اصطلاحوں اور الفاظ کو اردو میں لکھنے کے سلسلہ میں بعض دشواریاں پیش کی گئیں۔ کافی تبادلۂ خیال کے بعد طے پایا کہ اس سے پیشتر اس مجلس نے جو قاعدہ غور و خوض کے بعد بنایا تھا اس پر عمل کیا جائے اور اگر مزید عملی دقتیں پیش آئیں تو ذیلی مجلس زبان و بیان سے مشورہ لیا جائے۔

صدر جلسہ کی تحریک اور مولوی عبدالقادر صاحب سروری و ڈاکٹر راحت اللہ خان صاحب کی تائید کہ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کو مجلس کی رکنیت کی دعوت دی جائے۔ بغلبہ منظور کی گئی۔

مجلس انتظامی کا دوسرا اجلاس بتاریخ ۲ ڈسمبر ۱۹۴۱ء دفتر ادارہ میں شام کے ساڑھے چار بجے منعقد ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ صدر
ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی (کنٹب)
پروفیسر فضل حق صاحب ایم اے علیگ بی اے آنرز (لندن)
مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔
مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی ایم اے
مولوی سید بادشاہ حسین صاحب۔ معتمد
مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے۔ ایم ایڈ۔ معتمد

حسب ذیل اصحاب نے بھی بطور خاص شرکت کی۔

پروفیسر رگھوناتھ راؤ صاحب بھساری ایم اے صدر شعبۂ مرہٹی جامعہ عثمانیہ
پروفیسر نارائن راؤ صاحب ایم اے۔ استاد شعبۂ مرہٹی جامعہ عثمانیہ
مولوی امجد علی خاں صاحب یوسف زئی۔

حسب ذیل امور طے پائے۔

(۱) صدر جلسہ نے مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کے الفاظ کی فہرست پڑھی۔ بعد اس فہرست سے مرہٹی ادب، کلچر، تاریخ وغیرہ سے متعلقہ الفاظ ان کی اہمیت کے لحاظ سے، پنڈت رگھوناتھ راؤ بھساری ام اے اور پنڈت نارائن راؤ ایم اے کے مشورہ سے منتخب کئے گئے۔ طے پایا کہ ان الفاظ کو ٹائپ کروا کر ہر دو حضرات کے پاس روانہ کیا جائے تاکہ وہ بعد غور و خوض ان میں اضافہ یا حذف کر سکیں۔

(۲) قواعد و ضوابط اردو انسائیکلوپیڈیا کے ساتھ ایڈیٹوریل بورڈ کی

فہرست کی طباعت کے سلسلے میں یہ تصفیہ ہوا کہ بعد ڈکشنری ارکین کے نام بہ واری طریقہ پر شایع کردئے جائیں اور جب تمام حروف کے جواب وصول ہو جائیں، پھر علحدہ علحدہ مضامین کے بعد ڈکی فہرست شایع کی جائے۔

(۳) طے پایا کہ معاونین کی فہرست بھی قواعد و ضوابط کے ساتھ شایع کی جائے۔

قواعد و ضوابط اردو انسائیکلوپیڈیا

تفصیلی قواعد و ضوابط ایک مختصر سے رسالے کی شکل میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان سے اس اہم علمی کام سے دلچسپی رکھنے والوں کو جملہ متعلقہ امور مثلاً مقاصد، طریقۂ کار، مجلس انتظامی، مجلس ادارت، مجلس نظر ثانی زبان و بیان، مجلس ترجمہ، مجلس اشاعت، مجلس فروخت و تشہیر، معیار، اور معاوضہ وغیرہ کی نسبت تفصیلی معلومات حاصل ہو سکیں گی۔

اس کتابچہ میں ان چند معاونین کی ایک مختصر سی فہرست بھی شامل ہے جو اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے ملک کے مختلف حصوں سے اپنے خاص موضوعوں پر مقالے لکھ رہے ہیں۔ کام کی وسعت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ سب ماہرین علوم و فنون جنھوں نے اب تک کسی نہ کسی وجہ سے اشتراک عمل نہیں کیا اب مجلس کا ہاتھ بٹانا منظور فرمائیں گے۔

یہ کتابچہ معتمدین اردو انسائیکلوپیڈیا ادارۂ ادبیات اردو خیرت آباد سے ایک آنے کا اسٹامپ بھیج کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

معلومات ادارہ

آل انڈیا اورینٹل کانفرنس اور آل انڈیا ہسٹری کانگریس وغیرہ کے اکثر مندوبین چونکہ اردو سے ناواقف تھے اس لئے ادارہ نے انگریزی میں ایک کتابچہ معلومات شایع کیا جس میں جملہ شاخوں، شعبوں اور دیگر سرگرمیوں کی نسبت ضروری معلومات درج کی گئیں۔ جو اصحاب اردو سے دلچسپی رکھتے ہیں لیکن خود اردو نہیں پڑھ سکتے وہ دفتر ادارہ سے یہ کتابچہ مفت طلب فرما سکتے ہیں۔

معائنے

اس اثنا میں ادارہ نے ہندستان کے علم دوست اصحاب میں اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ جو اصحاب حیدرآباد تشریف لاتے ہیں وہ ادارہ کا ضرور معائنہ کرتے اور اس کی عظیم الشان خدمات کا اعتراف کر جاتے ہیں۔

اس مہینے اردو کی مشہور ادیبہ محترمہ ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردی بی اے آنرز پی ایچ ڈی (لندن) نے ادارہ کا دو دفعہ معائنہ کیا۔ محترمہ موصوفہ خواتین ہند میں اردو کی پہلی پی ایچ ڈی ہیں اور اپنی اعلیٰ مضمون نگاری اور ادیبانہ قوتوں کی وجہ سے علمی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر لی ہے چنانچہ گزشتہ چھ سات سال سے رسالہ عصمت دہلی کی طرف سے بہترین مضمون نگاری کا انعام ہر سال حاصل کرتی رہی ہیں۔ انھوں نے اردو ناول کے عنوان پر کئی سو صفحات کی ایک مبسوط کتاب قلمبند فرمائی ہے۔ اور اب ادارۂ ادبیات اردو کے لئے مشاہیر اردو کے متعلق مفید اور مستند کتابوں کا ایک سلسلہ مرتب فرما رہی ہیں۔ اس سلسلہ کی پہلی کتاب نذیر احمد پر لکھی جا رہی ہے جو قریب میں تکمیل پاکر بغرض اشاعت روانہ کر دی جائے گی۔

مسٹر حسان سہروردی

ڈاکٹر شائستہ اختر کے ساتھ ان کے مشہور اور لائق والد ڈاکٹر کرنل حسان سہروردی ایل ایل ڈی (لندن) سابق وائس چانسلر جامعہ کلکتہ اور حال رکن انڈیا کونسل نے بھی ادارہ کا دو بار معائنہ فرمایا۔ اردو کی خدمت جس خلوص اور سرگرمی کے ساتھ یہ ادارہ انجام دے رہا ہے اس کی دل کھول کر داد دی۔

مشاہیر علم کو عصرانہ

بتاریخ ۲۳ ڈسمبر ۱۹۴۱ء شام کے ساڑھے چار بجے دفتر ادارہ میں ایک شاندار عصرانہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس اور آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے اکثر ایسے مندوبین کو مدعو کیا گیا تھا جنھیں اردو سے دلچسپی ہے۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی اور ادارہ کی

خدمات کا معائنہ کیا۔

ڈاکٹر تاراچند صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (آکسن) معتمد ہندستانی اکیڈیمی و پرنسپل کایستھ کالج الہ آباد۔

ڈاکٹر بنارسی پرشاد صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر تاریخ جامعہ الہ آباد۔

ڈاکٹر سدھیشور ورما صاحب ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ۔ پروفیسر سنسکرت و تقابلی لسانیات پرنس آف ویلز کالج جموں۔ و صدر کل ہند انجمن لسانیات۔

ڈاکٹر جوشی ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) ناظم کتب خانہ جامعہ بمبئی۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ڈی لٹ پروفیسر اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ پونہ۔

ڈاکٹر اظہر علی صاحب ایم اے پی ایچ ڈی۔ پروفیسر عربی جامعہ دہلی۔

افضل العلما مولانا عبدالوہاب بخاری ایم اے ایل ٹی پرنسپل اسلامیہ کالج وانم باڑی۔

مقامی اصحاب میں ادارہ کے اکثر معتمدین شعبہ جات وغیرہ کے علاوہ نواب جیون یار جنگ بہادر رکن مجلس عدالت العالیہ، نواب بہادر یار جنگ بہادر صدر مجلس اتحاد المسلمین، نواب دوست محمد خاں صاحب جاگیردار، رائے نرنارائن پرشاد صاحب بی اے مددگار فینانس، مولوی یوسف الدین احمد صاحب بی اے لائبریرین جامعہ عثمانیہ، اور مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے لکچرار گلبرگہ کالج و معتمد شاخ ادارہ ادبیات اردو گلبرگہ وغیرہ نے شرکت فرمائی۔ اس دلچسپ علمی صحبت میں مختلف امور پر تبادلۂ خیال کیا گیا اور اس موقع پر جو گروپ تصویر لی گئی وہ آئندہ سب رس کی کسی اشاعت میں شائع کی جائے گی۔

ایک اور علمی صحبت

بتاریخ ۳۰ ڈسمبر ۱۹۴۱ء لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر مسٹر محمد وسیم اور نواب مرزا یار جنگ بہادر نے شام میں ادارہ کا معائنہ فرمایا۔ اس موقع پر نواب ناظر یار جنگ بہادر، مولوی میر واسط علی خاں صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا، اور مولوی سید عارف الدین صاحب چیف انجنیر و معتمد تعمیرات وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ نواب مرزا یار جنگ بہادر اور مسٹر محمد وسیم نے اردو انسائیکلوپیڈیا کے کام میں بے حد دلچسپی لی اور قلمی اعانت کے لئے آمادگی ظاہر فرمائی۔

شاخیں

ادارہ کی شاخوں میں پربھنی کی شاخ مولوی عارف الدین حسن صاحب کی سرپرستی میں خاص طور پر سرگرم عمل ہے اور ماہ ڈسمبر کے آخر میں وہ اپنا سالانہ جلسہ ڈاکٹر زور صاحب معتمد ادارہ کی صدارت میں عظیم الشان پیمانہ پر منانے والی تھی۔ جس کے لئے نہایت اعلیٰ انتظامات کئے گئے تھے۔ اور پربھنی کے اطراف واکناف کے جملہ علم دوست اصحاب و عہدہ دار اور ادارہ کی شاخوں کے معتمدین اور دیگر کارکن جمع ہو چکے تھے۔ مولوی عارف الدین حسن صاحب نے پنڈال وغیرہ نیز رہائش کا بڑا اچھا انتظام کیا تھا اور مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیدا نے ان انتظامات میں بڑی زحمت اٹھائی تھی مگر افسوس ہے کہ ڈاکٹر زور صاحب ایک اچانک خانگی ضرورت کی بنا پر پربھنی تشریف نہ لے جا سکے اور یہ جلسہ ملتوی کر دیا گیا۔ جس کا ان کو اور منتظمین پربھنی کو بے حد قلق ہے۔

شاخ پرلی

معتمد صاحب شاخ ادارہ ادبیات اردو پرلی اطلاع دیتے ہیں کہ شاخ کے روح رواں مولوی اشرف الدین صاحب فیضی اردو فاضل (ادارہ) کی کوششوں کی بدولت پرلی سے بیس تیس میل کے مقامات پر اردو امتحانات کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں سال حال فیضی صاحب کی سعی و کوشش سے اڈس، مومن آباد، ریناپور، بردا پور، دیولہ، راڈی اور دھانورہ بزرگ تعلقہ مومن آباد سے کثیر تعداد میں امیدواروں کو اردو امتحانات کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں فیضی صاحب نے بتواریخ ۵، ۶، ۷ بہمن ۱۳۵۱ف مختلف مقامات کا دورہ فرمایا۔

دھانورہ بزرگ تعلقہ مومن آباد میں بتاریخ ۶ بہمن ۱۳۵۱ف

بصدارت پنڈت وناتری گوبند راؤ صاحب وکیل ایک جلسہ منعقد ہوا۔ مختلف مقامات کے علم دوست اصحاب شریک جلسہ تھے جس میں مولوی اشرف الدین صاحب فیضی اردو فاضل (ادارہ) نے صدر ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے اغراض و مقاصد کی تشریح فرمائی، اردو امتحانات کی اہمیت پر کافی روشنی ڈالی، شاخ کے قیام اور اس کے طرز کار سے واقف کرایا بغرض کہ گزشتہ سال کی طرح جناب فیضی صاحب کا یہ دورہ بھی نہایت کامیاب رہا۔

شعبۂ طلبہ پرلی

مولوی اشرف الدین صاحب فیضی اردو فاضل (ادارہ) کی تحریک و کوشش سے پرلی میں شعبہ طلبہ کا قیام عمل میں آیا۔ سالِ حال مجلس انتظامی حسب ذیل عہدہ داران و ارکان پر مشتمل ہوگی۔

صدر حکیم مولوی فخرالدین صاحب منشی فاضل (پنجاب)
نائب صدر محمد عزیز الدین صاحب قریشی۔
معتمد محمد ابوظفر محی الدین صاحب صدیقی۔
خازن محمد سعید الدین صاحب صدیقی۔
کتب خانہ محمد ابوالخیر صاحب فاروقی۔

اراکین:۔ ڈگمبر بالاجی صاحب، اظہر الدین صاحب، خیرالدین صاحب صدیقی، سید شریف الحسن صاحب اشفاق، منظر حسین صاحب آزاد، محمد عبدالکریم صاحب۔

شاخ شاہ آباد

بتاریخ ۲۴ ماہ دے ۱۳۵۲ف بمقام آفیسرس کلب بوقت ۲ ساعت دن بصدارت عالی جناب مولوی محمد عماد الدین صاحب اول تعلقدار ضلع شاہ آباد ایک جلسہ منعقد ہوا۔

جناب سید محمد نورالحسن صاحب نے تقریر کرتے ہوئے اردو زبان کی تاریخ بیان کی۔ اور اردو کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ادارۂ ادبیات اردو کا ذکر کیا۔ اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور اس کی شاخوں کے قیام کی ضرورت بتائی۔

اس کے بعد شاخ کی مجلس انتظامی کے لئے عہدہ داران و ارکان کے انتخابات عمل میں آئے۔ بعد ازاں جناب صدر صاحب جلسہ نے عہدہ داران و ارکان انتظامی کو مبارکباد دی۔ اور شاخ کی ہر طرح امداد کرنے کا وعدہ فرمایا اور امید ظاہر کی کہ جناب سشن صاحب اور تحصیلدار صاحب بھی اس کی سرپرستی فرمائیں گے۔ پھر جناب مولوی سید محمد نورالحسن صاحب نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور جناب مولوی عماد الدین صاحب اول تعلقدار کا بھی کہ صاحب موصوف نے شاخ کی سرپرستی قبول فرمائی۔ جناب سشن صاحب اور تحصیلدار صاحب مستقر پر نہ تھے۔ ان کے علمی و ادبی ذوق سے امید ہے کہ وہ اس شاخ کی سرپرستی قبول فرمائیں گے۔

مجلس انتظامی شاہ آباد

سالِ حال مجلس انتظامی حسب ذیل عہدہ داران و ارکان پر مشتمل ہوگی۔

صدر۔ مولوی سید جعفر حسین صاحب وکیل۔
نائب صدر۔ مولوی سید غلام نبی صاحب وکیل ہائیکورٹ۔
معتمد۔ مولوی سید سرمد حسینی صاحب منتظم صدر عدالت۔
نائب معتمد۔ مولوی سید کامل حسین صاحب۔

اراکین:۔ مسٹر راگھو راؤ صاحب۔ مولوی وحید الرحمن صاحب۔ مولوی سید محمد نورالحسن صاحب انور۔ مولوی محمد فصیح الدین صاحب۔ مولوی محمود علی صاحب۔ مولوی ظہور الحق صاحب۔ مولوی سید یوسف صاحب۔ مولوی محمد آدم صاحب۔

معاونین:۔ جناب مولوی عبدالستار صاحب سوداگر۔ مولوی سید جعفر حسین صاحب وکیل ہائیکورٹ۔ مولوی سید غلام نبی صاحب وکیل ہائیکورٹ۔ مولوی سید سرمد حسینی صاحب منتظم صدر عدالت۔ مولوی محمد یوسف صاحب۔ مولوی محمد فصیح الدین صاحب۔

ارکان الف :۔ مولوی سید تقی اللہ حسینی صاحب۔ مولوی سید ظہور الحق صاحب۔ مولوی عبدالغنی صاحب محزانہ دار مسٹر ڈی گھورا و صاحب۔ مولوی سید کامل حسین صاحب۔

ارکان (ب) :۔ مسٹر نارائن راؤ صاحب مدرس۔ مولوی محمد آدم صاحب مدرس۔ مولوی شیخ حسین صاحب صیغہ دار۔ مولوی سید یعقوب صاحب قریشی۔ مولوی فخرالدین صاحب۔ مولوی سید محمد عزیز الحسن صاحب شاہ آبادی۔

شاخ کے لئے ایک مکان کرایہ پر لیا گیا ہے۔ اور دارالمطالعہ کے لئے فی الحال مندرجہ ذیل رسالجات جاری کئے گئے ہیں۔

۱۔ صدق (لکھنؤ) ۲۔ چمنستان (دہلی) ۳۔ ادب لطیف (لاہور) ۴۔ شاعر (آگرہ)۔

جلسۂ تقسیم اسناد

سنہ ۱۹۴۱ء کے اردو امتحانات کا جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات جنوری سنہ ۴۲ء کے دوسرے ہفتہ میں منعقد ہوگا اور ہز ایکسلنسی عالیجناب نواب سر ڈاکٹر کرنل حافظ محمد احمد سعید خاں بہادر نواب چھتاری و صدر اعظم دولت آصفیہ اس جلسہ کی صدارت فرمائیں گے۔ ٹھیک وقت اور تاریخ کی اطلاع بذریعہ اخبارات دی جائے گی۔

شعبۂ طلبہ شاخ گلبرگہ

بتاریخ یکم بہمن سنہ ۱۳۵۱ف یونین ہال گلبرگہ کالج میں ایک انعامی مباحثہ بعنوان "تدریجی ترقی فوری تبدیلی سے بہتر ہے" زیر صدارت جناب مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے منعقد ہوا۔ مولوی کریم اللہ صاحب ایم ایس سی و مولوی محمد اسحاق صاحب بی ایس سی اور مولوی محمد حنیف صاحب بی اے۔ ڈپ ایڈ حکم کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس مباحثہ میں مدرسہ وسطانیہ مومن پورہ سے (۵) مدرسہ وسطانیہ کالج سے (۲) طبقہ فوقانیہ کالج سے (۲) اور طبقہ کالج سے بھی (۲) جماعتیں شریک تھیں۔ معتمد صاحب نے گذشتہ جلسہ کی روئداد سنائی اور مباحثہ شروع ہوا۔

نتیجہ حسب ذیل رہا:۔

طبقہ کالج ۔ فتح اللہ عثمانی ۔ اول ۔ خواجہ معین الدین دوم

" فوقانیہ ۔ عبدالحفیظ ۔ اول ۔

" وسطانیہ ۔ معین الدین ۔ اول ۔ کاظم رضوی دوم ۔ بسیم حسین سوم۔

معین الدین کو مولوی اقبال احمد صاحب ڈائرکٹر کالج نے ایک انعام دینے کا وعدہ کیا اور سید نور الحسن صاحب معتمد نے بھی اپنی طرف سے ایک انعام کا اعلان کیا۔ غلام حیدر (طبقہ وسطانیہ) کو بھی ایک خاص انعام دیا جائے گا۔

اس کے بعد معتمد نے حاضرین، حکم صاحبان اور اساتذہ صاحبان کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے شرکت سے جلسہ کو رونق بخشی۔

گلبرگہ کی علمی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ ہے۔ کیونکہ مختلف مدارس کے (۲۲) طلبا نے اس مباحثہ میں شرکت کی۔ یہ شعبۂ طلبہ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مختلف مدارس کے طلبہ کو ایک ہی مقام پر جمع ہونے کا موقع ملا۔

اس عرصہ میں شعبۂ طلبہ کے لئے ایک بورڈ تیار کرلیا گیا ہے۔ شعبۂ طلبہ کی رکنیت کے لئے شرکت کی درخواستیں اور مراسلے بھی طبع کروائے گئے ہیں۔

رپورٹ شعبۂ طلبہ شاخ برلی

مورخہ ۲۴ اردی بہشت سنہ ۱۳۵۱ف شعبۂ طلبہ کا ایک جلسہ بصدارت حکیم مولوی فخرالدین صاحب منشی فاضل (پنجاب) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ معتمد شعبہ نے گزشتہ جلسہ کی روئداد سنائی۔ بعد میں محمد سعید الدین صدیقی، ابوظفر محی الدین، محمد نصیر الدین، مظہر حسین اور شریف الحسن نے "علم و دولت" پر تقریریں کیں۔

مولوی اشرف الدین صاحب نیفی کی تحریک پر جناب مولوی خواجہ محمود احمد صاحب حسینی بی اے۔ ڈپ ایڈ (عثمانیہ) نے بھی دولت کی موافقت میں تقریر فرمائی۔ فاضل صدر نے علم کی فضیلت اور برتری

اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ اور معتمد شعبہ کے شکریہ کے بعد جلسہ کامیابی سے برخواست ہوا۔

معائنہ شعبۂ طلبہ

۲۴؍دے ۱۳۵۱ف عالیجناب مولوی خواجہ محمود احمد صاحب حسنی بی اے۔ ڈپ ایڈ (عثمانیہ) نے شاخ کا معائنہ فرما کر حسب ذیل رائے کا اظہار فرمایا۔

"آج مجھ کو شاخ ادارۂ ادبیات اردو پرلی کے شعبۂ طلبہ کے معائنہ سے نہایت مسرت ہوئی۔ خوشی کا مقام ہے کہ اس قصبہ میں ادارے کی شاخ نہایت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ شعبۂ طلبہ کا قیام، شاخ کے سرگرم اراکین حکیم مولوی فخر الدین صاحب، غلام حسن صاحب اور مولوی اشرف الدین صاحب فیضی کا رہین منت ہے۔ یہ اصحاب طلبہ اور اردو کے شائقین میں علمی اور ادبی ذوق پیدا کرا رہے ہیں۔ اور اس کا اندازہ ہر شخص معائنہ کر کے کر سکتا ہے۔

میں نے مختلف رجسٹر دیکھے، موصولہ اور مجاریہ کا رجسٹر مرتب کرنا، دفتری معلومات سے واقفیت پیدا کراتا ہے۔ کتب کا رجسٹر اور کتب کی فراہمی بھی قابل ستائش ہے کروی کا رجسٹر بھی دیکھا گیا جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور مختلف رجسٹر بھی موجود ہیں جن کی اس شعبہ کو ضرورت ہے مسرت کا مقام ہے کہ یہ جملہ کام خود طلبہ کرتے ہیں، کام کی انجام دہی سرگرم اراکین شاخ کے زیر نگرانی اور ہدایت ہوتی ہے لیکن مجھ کو امید ہے کہ چند ہی روز میں نگرانی کی ضرورت باقی نہ رہے گی طلبہ کافی تعداد میں شریک ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔ اچھا خاصا شوق پیدا ہو چلا ہے۔ میں طلبہ کو ان کے اس شوق پر مبارکباد دیتا ہوں اور ان کو مشورہ دیتا ہوں کہ اپنی تقریر اور تحریر ہی نہیں بلکہ روزمرہ کی عام گفتگو میں بھی اپنی زبان کی اصلاح کریں۔ قواعد کا لحاظ اور عمدہ الفاظ کا استعمال نہایت ضروری ہے۔ زبان پر توجہ کرنا قوم کی خدمت کرنا ہے اور مجھ کو یقین ہے کہ یہ ہونہار کافی توجہ سے کام لے کر مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل کریں گے۔ اور اپنے وطن کا نام روشن کریں گے۔"

شاخ دھانورہ (تعلقہ مومن آباد)

دھانورہ بزرگ تعلقہ مومن آباد کے علم دوست اصحاب نے ادارہ کی روز افزوں ترقی اور شہرت سن کر اپنے یہاں بھی ادارہ ادبیات اردو کی ایک شاخ قایم کرنے کا ارادہ کیا اور یہاں مولوی محمد اشرف الدین صاحب فیضی اردو فاضل سے ادارہ کے مقاصد اور شاخ کے طریقۂ کار کے متعلق تقریر کرنے کی فرمایش کی گئی۔ چنانچہ بتاریخ ۱۲؍بہمن ۱۳۵۱ف پنڈت دتاتری گوبند راؤ صاحب وکیل کی صدارت میں ایک عام جلسہ کیا گیا جس میں دھانورہ کے علاوہ پاٹودہ، واڑی اور دیولہ کے علم دوست اور صاحب ذوق اصحاب کی کثیر تعداد شریک تھی جناب مولوی حسن الدین صاحب میئرنگ سرکل انسپکٹر حلقہ مومن آباد جو لغرض دورہ تشریف فرما تھے جلسہ میں شرکت فرما کر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا اور جلسہ کو رونق بخشی۔ حاضرین جلسہ سے پنڈت ناگو راؤ صاحب اور مولوی محمد اشرف الدین صاحب فیضی اردو فاضل نے ادارے کا خوبی سے تعارف کرایا۔

فاضل مقرر نے اردو زبان کی خصوصیات و ضروریات اس کی ترقی اور بقا کے متعلق ادارہ ادبیات اردو کے خدمات اس کے امتحانات کی اہمیت اور شاخ کے قیام کی بھی تشریح فرمائی اور اردو زبان کی ترقی کے لئے "اردو کے نوجوان" عالیجناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے۔ پی ایچ ڈی (لندن) صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی کوششوں اور ایثار کا ذکر کیا اور اردو امتحانات میں شرکت کی ترغیب دلائی جو نہایت کامیاب ہوئی۔

فیضی صاحب نے مسن حضرات کو جنہیں اردو کا ایک لفظ بھی نہ آتا تھا۔ کشن لال جی دتاپو، جناردھن راؤ اور بابو راؤ کو اردو کا سبق ایسے موثر انداز میں پڑھایا کہ صرف پندرہ منٹ میں ان لوگوں نے اردو کے جملے پڑھے اور املا لکھتے گئے اس طرح ہر شخص اس عمر میں بھی

صلاحیت اور سادگی دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد باتفاق آرا شاخ کی مجلس انتظامی کا حسب ذیل انتخاب عمل میں آیا۔

صدر۔ پنڈت وناترے گوبند راؤ صاحب وکیل۔

معتمد۔ پنڈت نگو راؤ صاحب۔

نائب معتمد جناب بھگونت راؤ صاحب۔

اراکین:۔ جناب داوا راؤ گوبند راؤ پٹیل۔ وا وا راؤ صاحب۔ مولوی ریاض الدین صاحب۔ لچھمی نارائن ساہو۔ وناترے گوبند راؤ۔ نانا راؤ پٹواری۔

انتخابی کارروائی کے اختتام پر وکیل صاحب صدر جلسہ نے امتحانات کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور موثر پیرایے میں اردو امتحانات میں شرکت کی طرف توجہ دلائی۔ فی الحال اردو دانی کے ۱۲۔ زبان دانی کے ۴۔ اور اردو عالم کے ۱۱۔ امیدواروں سے اردو امتحانات کی تعلیم کا افتتاح کیا گیا۔

آخر میں اعلیحضرت بندگان عالی خانوادہ آصفی اور محترم ڈاکٹر زور کی صحت و سلامتی کی دعا پر جلسہ برخواست ہوا۔

ادارتی مجلس اردو انسائیکلوپیڈیا

اردو انسائیکلوپیڈیا کی تکمیل کے سلسلہ میں مختلف علوم و فنون سے متعلق جو مجالس ادارت منتخب ہوئی ہیں ان کے صرف اُن اراکین کے نام بلحاظ حروف تہجی یہاں درج کئے جاتے ہیں جنھوں نے اس اثنا میں مجلس ادارت میں کام کرنا شروع کر دیا ہے:۔

۱۔ احمد علی خاں، میر، ایم اے۔ ایم ایڈ (لیڈز) بیرسٹر ایٹ لا۔ وائس پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج۔

۲۔ انور اقبال قریشی۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ

۳۔ جلیل الرحمٰن، محمد، ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ پرنسپل اسمٰعیل کالج جوگیشوری بمبئی۔

۴۔ برجموہن لال۔ ڈاکٹر ایل آر سی پی۔ ایم آر سی ایس۔ پرنسپل میڈیکل کالج حیدرآباد

۵۔ بشیشور ناتھ، راجہ بہادر۔ بی اے۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ رکن مجلس وضع قوانین۔

۶۔ بنکٹ چندر راؤ، ڈاکٹر۔ ایم بی۔ ایم آر سی ایس۔ ایم آر سی پی (لندن) فرسٹ فزیشین دواخانہ عثمانیہ

۷۔ تاثیر، محمد دین۔ ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی (کنٹب) پرنسپل ایس پی کالج سری نگر۔

۸۔ ٹوپا، ایشور ناتھ۔ پی ایچ ڈی۔ شعبہ تاریخ تمدن ہند، جامعہ عثمانیہ۔

۹۔ جیسی سندری بس۔ بی اے۔ آنرز (لندن) مہتمہ دارس نسوان حیدرآباد۔

۱۰۔ جمیل الرحمٰن، محمد۔ ایم اے۔ پروفیسر تاریخ اسلام جامعہ عثمانیہ۔

۱۱۔ حسین علی خاں۔ بی اے (آکسن) پرا ووسٹ جامعہ عثمانیہ و صدر شعبہ انگریزی

۱۲۔ داس بی کے۔ ڈی، ایس، سی (لندن) صدر شعبہ حیوانیات جامعہ عثمانیہ

۱۳۔ داؤد پوتہ، عمر بن محمد، شمس العلماء۔ بی اے پی ایچ ڈی (کنٹب) ناظم تعلیمات صوبہ سندھ۔

۱۴۔ ذاکر حسین۔ ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ شیخ جامعہ ملیہ دہلی۔

۱۵۔ رام بابو سکسینہ، ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پی سی ایس۔ دیوان کوٹہ اسٹیٹ۔

۱۶۔ رام لال۔ ایم ایس سی، پی ایچ ڈی۔ شعبہ طبعیات جامعہ عثمانیہ۔

۱۷۔ رشید ترابی، رضا حسین خان۔ بی اے۔

۱۸۔ رقیہ بیگم (بیگم زین یار جنگ) بی اے آنرز (آکسن) پرنسپل کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ

۱۹۔ زاہد علی۔ ایم اے۔ ڈی فل (آکسن) پروفیسر عربی نظام کالج۔

۲۰۔ سبا راؤ، آر۔ پروفیسر تلنگی جامعہ عثمانیہ۔

۲۱۔ سردار علی، ملک۔ بی اے۔ بی ٹی۔ ریڈر فلسفہ تعلیم عثمانیہ ٹریننگ کالج۔

۲۲۔ سعید الدین، محمد۔ ایم اے۔ بی ایس سی۔ ایف آر ایم ایس۔ ایف ایل ایس سی، ایف ایل ایس۔ صدر شعبہ نباتات جامعہ عثمانیہ۔

۲۳۔ سیادت علی خاں۔ ایم اے۔ ایل ایل بی۔ بی سی ایل۔ ڈی فل بیرسٹر ایٹ لا۔ مولوی فاضل۔ سٹی مجسٹریٹ حیدرآباد۔

۲۴۔ سید احمد خان بہادر۔ پرنسپل فائن آرٹس اسکول حیدرآباد

۲۵۔ سید سلیمان ندوی۔ ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ۔

۲۶۔ شاہد سہروردی۔ پروفیسر آرٹس۔ جامعہ کلکتہ۔

۲۷۔ شنڈارکر، ڈی، ڈی۔ بی، اے، بی، ٹی، ڈی۔ پی ایچ ڈی۔ ریڈر نفسیات تعلیمی عثمانیہ ٹریننگ کالج۔

۲۸۔ صدیقی، عبدالستار، ایم اے، پی ایچ ڈی۔ صدر شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی

۲۹۔ ضیاء الدین انصاری۔ ایم اے۔ بی ایس سی آنرز (مانچسٹر) پروفیسر انجینیرنگ کالج حیدرآباد

۳۰۔ عارف الدین، سید۔ بی ایس سی آنرز (مانچسٹر) چیف انجینیر و معتمد تعمیرات

۳۱۔ عبدالباری ندوی۔ ریڈر فلسفہ جامعہ عثمانیہ۔

۳۲۔ عبدالجبار رحمانی۔ بی اے۔ بی ٹی۔ مہتمم تعلیمات ضلع ناندیڑ۔

۳۳۔ عبدالحق افضل العلماء۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ پرنسپل محمڈن کالج مدراس

۳۴۔ عبدالرحمن چغتائی، خان بہادر۔ لاہور

۳۵۔ عبدالرحمن خاں۔ اے آر سی ایس۔ بی ایس سی آنرز (لندن) سابق پرنسپل کلیہ جامعہ عثمانیہ۔

۳۶۔ عبداللہ چغتائی۔ ڈی لٹ (پیرس)۔ رکن اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونہ

۳۷۔ عبداللہ العمادی۔ رکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ۔

۳۸۔ عبدالماجد، دریابادی۔ بی اے۔ مدیر صدق لکھنؤ

۳۹۔ عثمان خاں، محمد، ڈاکٹر ایل ایم اینڈ ایس۔ رکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ۔

۴۰۔ عسکر یار جنگ بہادر، نواب بی اے۔ بیرسٹرایٹ لا معتمد مجلس وضع قوانین حیدرآباد

۴۱۔ عطاء اللہ بٹ، ڈاکٹر۔ پرنسپل میڈیکل کالج علی گڑھ۔

۴۲۔ علی اکبر، سید۔ ایم اے (کنٹب) نائب ناظم تعلیمات حیدرآباد۔

۴۳۔ علی یاور جنگ بہادر، نواب بی اے (آکسن) معتمد امور دستوری و سابق سابق پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

۴۴۔ غلام محمد، حاجی۔ ایم ایس سی۔ ڈی ایس سی شعبہ طبیعیات جامعہ عثمانیہ

۴۵۔ فیروز دین مراد۔ بی اے، ایم ایس سی۔ سابق صدر شعبہ طبیعیات علی گڑھ

۴۶۔ کالی داس سہائی، رائے بہادر۔ ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی۔ ناظم محکمہ زراعت

۴۷۔ محمد ابراہیم۔ بی اے۔ ایم ایس سی۔ بی ای۔ ایم آئی ای۔ انجینیر انچارج محکمہ آبرسانی

۴۸۔ محمد احمد، خواجہ۔ ایم اے، ایل ایل بی، مددگار ناظم آثار قدیمہ حیدرآباد۔

۴۹۔ محمد اقبال، شیخ۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ پروفیسر فارسی اورینٹل کالج لاہور۔

۵۰۔ محمد باقر۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ پروفیسر اردو۔ اورینٹل کالج لاہور۔

۵۱۔ محمد علی بیگ، مرزا۔ ایم اے (آکسن) ڈی ایف، ایم، ناظم جنگلات حیدرآباد

۵۲۔ محمد علی خاں، سید۔ اے آر سی ایس، بی ایس سی آنرز (لندن) پروفیسر طبیعیات نظام کالج

۵۳۔ مسعود حسن رضوی، سید۔ ادیب ایم اے۔ صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ۔

۵۴۔ مسعود عالم ندوی، سید۔ اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور۔ پٹنہ

۵۵۔ معین الدین، قاضی، سید۔ ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر کیمیا نظام کالج

۵۶۔ مناظر احسن گیلانی، سید۔ صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ۔

۵۷۔ منور علی، ڈاکٹر۔ ایل آر سی پی۔ ایف آر سی ایس۔ سرجن دواخانہ عثمانیہ

۵۸۔ مہدی علی۔ ایم ایس سی۔ استاد شعبہ حیوانیات جامعہ عثمانیہ۔

۵۹۔ مہندر بہادر، رائے۔ بی اے۔ ایم ایس سی۔ ناظم محکمہ زراعت حیدرآباد۔

۶۰۔ مہندر راج سکسینہ۔ ایم ایس سی۔ استاد شعبہ نباتات جامعہ عثمانیہ۔

۶۱۔ ناظر یار جنگ بہادر، جسٹس نواب۔ ایم اے۔ ایل ایل بی۔ ایل ایل ڈی۔ رکن عدالت العالیہ

۶۲۔ نجیب اشرف ندوی، سید۔ ایم اے۔ بی ٹی۔ ایس۔ پروفیسر اردو اسمٰعیل کالج بمبئی

۶۳۔ نظام الدین، محمد، مولوی فاضل۔ پی ایچ ڈی (کنٹب) صدر شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ

۶۴۔ نوازش علی، میر۔ بی ایس سی (اڈنبرا) مددگار ناظم جنگلات حیدرآباد۔

۶۵۔ ورما، سدھیشور۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ، پروفیسر سنسکرت جموں۔ صدر کل ہند انجمن لسانیات۔

۶۶۔ ولی الدین، میر۔ ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا۔ ریڈر فلسفہ جامعہ عثمانیہ

۶۷۔ ونشی دھر۔ ودیالنکار۔ استاد ہندی و سنسکرت جامعہ عثمانیہ۔

۶۸۔ ہارون خاں شروانی۔ ایم اے (آکسن)، بیرسٹرایٹ لا۔ صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ

۶۹۔ ہاشم ندوی، سید۔ مہتمم دائرۃ المعارف حیدرآباد۔

۷۰۔ یوسف حسین خاں۔ ڈی لٹ (پیرس) ریڈر تاریخ جامعہ عثمانیہ

شاخ ادارۂ ادبیات اردو گلبرگہ | یوم ادارہ:۔ بتاریخ ۱۶ر ڈسمبر ۱۹۴۱ء بعد مغرب بمقام ٹاؤن ہال ادارۂ ادبیات اردو گلبرگہ کا جشن "یوم ادارہ" بصدارت عالی جناب امیر علی خاں صاحب ایچ، سی، ایس صوبہ دار گلبرگہ نہایت اعلیٰ پیمانے پر منایا گیا۔ گلبرگہ کے مشہور وکیل محمد احمد صاحب خالدی اور عبد العلی صاحب معتمد وکل فنڈ کی تائید صدارت کے بعد عالی جناب امیر علی خاں صاحب نے کرسی صدارت کو زینت بخشی۔ اس جلسہ کا افتتاح وسطانیہ کالج کے کمسن بچوں کے ترانہ سے ہوا۔ ترانہ کے بعد معتمد ادارہ نے ہندستان کی مشہور اردو نواز اور علم دوست شخصیتوں کے پیامات اور رائیں سنائیں۔ ادارۂ ادبیات اردو گلبرگہ کے شعبہ طلبہ کے معتمد نور الحسن صاحب انور (اردو فاضل) نے مولانا حالی کی زندگی اور شاعری پر ایک دلچسپ مقالہ سنایا۔ جناب عبد القیوم خاں صاحب باقی ایم اے لکچرار اردو جامعہ عثمانیہ نے ایک نظم سنائی جسے سامعین نے بہت پسند کیا۔ نذیر احمد صاحب قریشی ام ایس سی (علیگ) لکچرار کیمیا گلبرگہ کالج نے صنعتی کیمیا پر ایک تحقیقاتی مقالہ پڑھا۔ مقالہ فنی اور تحقیقاتی تھا لیکن قابل مقرر کے انداز تحریر و بیان نے اسے دلچسپ اور شگفتہ بنا دیا۔ آل احمد صاحب جمالی منشی فاضل نے ایک نظم سنائی۔ گلبرگہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک علم دوست خاتون محترمہ سلیم النساء بیگم صاحبہ بی اے۔ بی ٹی صدر معلمہ فوقانیہ نسوان گلبرگہ نے ایک فاضلانہ تقریر فرمائی۔ یہ تقریر نہایت معلومات آفریں تھی اور انداز بیان سادہ اور دلکش تھا۔ اس میں فن مطالعہ کے بعض علمی پہلوؤں سے بھی دلچسپ انداز میں بحث کی گئی۔ جناب نظر حیدر آبادی کی صبا آفریں نظم کے بعد جناب محمد بن عمر صاحب ام اے (عثمانیہ) سابق صدر انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ و حال لکچرار انگریزی گلبرگہ کالج نے بعنوان "اقبال کا پیام نوجوانوں کے نام" اپنے مخصوص انداز اور طرز بیان میں ایک دلچسپ تقریر فرمائی۔

تقسیم انعامات | عالیجناب صوبہ دار صاحب نے ادارہ کی علمی، تقریری اور تحریری مصروفیات میں حصہ لینے والوں کو حسب ذیل انعامات تقسیم کئے۔

نشان سلسلہ	نام انعام یافتہ	نوعیت انعام	نشان سلسلہ	نام انعام یافتہ	نوعیت انعام
۱	معین الدین متعلم وسطانیہ موسیٰ پورہ	تقریری مباحثہ میں اول	۹	فتح اللہ عثمانی متعلم انٹرمیڈیٹ کالج	فی البدیہہ تحریری مقابلہ میں دوم (مستحق انعام محمد بن عمر صاحب)
۲	کاظم رضوی ۔۔ ۔۔ ۔۔	۔۔ ۔۔ دوم	۱۰	معین الدین ۔۔ وسطانیہ موسیٰ پورہ	کپ معطیہ اقبال احمد صاحب
۳	بسیم سین ۔۔ ۔۔	۔۔ ۔۔ سوم	۱۱	۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۔۔ نور الحسن صاحب انور
۴	غلام حیدر متعلم وسطانیہ کالج ۔۔	۔۔ خاص انعام	۱۲	سید محمد نور الحسن انور رکن ادارہ	امتحان اردو فاضل میں اول
۵	عبد الحفیظ متعلم فوقانیہ کالج ۔۔	۔۔ اول	۱۳	عبد الغنی افسر ۔۔	۔۔ امتحان اردو عالم میں اول
۶	فتح اللہ عثمانی متعلم انٹرمیڈیٹ کالج ۔۔	۔۔ ۔۔	۱۴	نور النساء بیگم ۔۔	۔۔ امتحان اردو دانی میں اول
۷	خواجہ معین الدین ۔۔ ۔۔	۔۔ ۔۔ دوم	۱۵	عبد القادر ۔۔	۔۔ ۔۔ ۔۔
۸	غلام محی الدین خاں کیف متعلم انٹرمیڈیٹ کالج	فی البدیہہ تحریری مقابلہ میں اول (مستحق انعام سعید الزماں صاحب)۔	۱۶	کنیز فاطمہ ۔۔	۔۔ ۔۔ (خاص انعام)

صدارتی تقریر | عالی جناب امیر علی خاں صاحب ایچ سی ایس صوبہ دار گلبرگہ شریف نے تالیوں کی گونج میں ادارۂ ادبیات اردو کی شاخ گلبرگہ کی مخلصانہ علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے "یوم ادارہ" کی کامیاب تقاریب پر مبارکباد دی اور کہا کہ یہ ادارہ نہایت نیک اور مستحسن خدمات انجام

دیرہا ہے اور ہر ہوا خواہ اردو کا یہ فرض ہے کہ ہر طرح سے اس کی مدد کرے۔ دوران تقریر میں آپ نے فرمایا کہ یہ مقام جہاں ادارہ کی شاخ قایم ہے اسے یہ فخر حاصل ہے کہ اردو نثر کی پہلی کتاب معراج العاشقین مصنفہ حضرت خواجہ بندہ نواز ؒ یہیں سے نکلی۔ آپ نے فرمایا کہ اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے اس کی تشکیل اور ترقی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا حصہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہ کافی ترقی کر چکی ہے اور ہر قسم کے اظہار خیال کا ذریعہ بن چکی ہے۔ اس کی تاریخی ترقی میں ہندوستان کی دو بڑی قوموں کی محبت، ایثار اور خدمات کو بہت بڑا دخل ہے۔ یہ ہندو مسلم تہذیب، روایتی اتفاق و ثقافت کی ایک بہترین یادگار ہے۔ یہ ماضی کا ایک بیش بہا ورثہ ہے جو حال کے سپرد کیا گیا ہے اور اب موجودہ زمانے کے لوگوں کا یہ قومی فرض ہے کہ وہ اس مشترکہ سرمایہ میں دن رات اضافہ کرتے رہیں۔ آخر میں آپ نے ادارہ کی جانب سے انعام پانے والے اراکین کو مبارکباد دی اور ادارہ کے خوش آیندہ مستقبل کے متعلق نیک توقعات اور تمناؤں کے بعد تقریر ختم فرمائی۔

جناب نیاز علی خاں صاحب نیازؔ اردو عالم و نائب صدر شعبہ طلبہ ادارۂ ادبیات اردو نے جناب صدر کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے جلسہ کی صدارت قبول فرمائی نیز جناب جمیل حسن صاحب اول تعلقدار کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے ان تقاریب کے سلسلہ میں ادارہ کی مالی مدد فرمائی اور عملی دلچسپی لیتے رہے۔ اور جناب سید ذوالفقار علی صاحب حقانی پرنسپل گلبرگہ کالج کا کہ وہ ابتدا سے اب تک ادارہ کی تمام مصروفیات میں نہایت دلچسپی کا اظہار فرماتے رہے اور ماہانہ مالی امداد بھی دیتے رہے۔ جناب عبدالعلی صاحب معتمد لوکل فنڈ کا بھی شکریہ ادا کیا گیا جن کے علمی انہماک اور مالی اعانت کی وجہ سے ادارہ کی بہت سی مشکلات حل ہو گئیں۔ تمام شعرائے کرام اور مقررین خاص طور پر محترمہ سلیم النساء بیگم صاحبہ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کیا گیا جن کی علمی و ادبی دلچسپی اور مساعی جمیلہ کے باعث نہ صرف مشاعرہ بلکہ یوم ادارہ کے جلسہ کے انتظامات متعلقہ خواتین نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام پائے اور توقع ظاہر کی کہ موصوفہ آئندہ بھی اسی طرح دلچسپی لیتی رہیں گی۔

نائب صدر شعبہ طلبہ نے آخر میں جناب نصیر الدین صاحب نظامی لکچرار اردو گلبرگہ کالج، تمام رضاکاران اور حاضرین کا پرخلوص شکریہ ادا کیا۔

یہ جلسہ بعد دعائے عمر و اقبال اعلیٰ حضرت بندگان عالی و خانوادۂ آصفی نہایت کامیابی کے ساتھ رات کے ۹½ بجے ختم ہوا۔

تقریریں

مولوی وزیر احمد صاحب لکچرار گلبرگہ کالج نے "نامیاتی کیمیا کی ابتدا اور اس کا مفاد" پر حسب ذیل تقریر کی:۔

سترھویں صدی کے اواخر تک کیمیا کے مرکبات کو تین شعبوں میں ان کے اپنے ماخذ کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا تھا۔

(۱) معدنی اشیا مثلاً دھاتیں۔ معدنی مرکبات وغیرہ (۲) نباتی اشیا مثلاً گوند۔ شہد۔ پھولوں کی روح وغیرہ۔ (۳) حیوانی اشیا مثلاً خون فضلہ وغیرہ۔ یہی سب سے پہلی کوشش ہے۔ جس کے ذریعہ نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا میں امتیاز کیا گیا۔ اس زمانے تک مرکبات کی ترکیب کا صحیح علم حاصل نہ ہو سکا تھا۔ حالانکہ اسٹال نے ۱۷۰۰ء کے اوائل ہی میں بتلا دیا تھا کہ حیوانی اور نباتی مرکبات میں احتراق پذیر اور آبی جز پایا جاتا ہے۔ شیل نے ۱۷۸۰ء میں بیشتر نامیاتی ترشے حاصل کئے اور گلیسرین بھی تیار کیا اور اس طرح دوسرے علما نے بھی مختلف نامیاتی مرکبات حاصل کئے لیکن کوئی حقیقی ترقی اس علم میں نہیں ہوئی۔ ۱۸۰۳ء میں ڈالٹین کے نظریہ جواہر کے پیش کرنے کے بعد برزیلیس (۱۸۱۴ء تا ۱۸۴۸ء) نے نامیاتی مرکبات میں کاربن ہائیڈروجن اور نائٹروجن کی تخمین کے بہتر طریقے وضع کئے اور ثابت کیا کہ نامیاتی مرکبات اور ان کے تحلیلی حاصل ان ہی اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔ جن کی غیر نامیاتی مرکبات پابندی کرتے ہیں۔ ۱۸۳۱ء میں (Liebig) لیبگ نے بھی نامیاتی مرکبات کی تشریح کے طریقوں میں اصلاح کی اس طرح آہستہ آہستہ نامیاتی کیمیا جو پہلے صرف مرکبات کے نام اور خواص کا مجموعہ تھی اب ایک علم اور فن کا درجہ حاصل کرنے لگی۔ اس لئے کہ جب تک کیفی معلومات پر

کسی نقطۂ نظر پر بحث نہ کی جائے اور یہ نہ معلوم کیا جائے کہ مرکبات میں اجزائے ترکیبی کا کیا تناسب ہے۔ علمی اور فنی امتیاز سے وہ تشنہ رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ([illegible]) کا نام سب سے پیش پیش رہے گا۔ اس لئے کہ اس نے مرکبات کی ترکیب اور ان کی ساخت سے بحث کی اور معلوم کیا کہ وہ تمام مرکبات جن کا ماخذ حیوانات ہیں، بحکم عموم کاربن ہائڈروجن اور آکسیجن پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جن کے ساتھ کبھی کبھی نائٹروجن اور بعض اوقات گندک اور فاسفورس بھی شریک رہتے ہیں۔ اس نے تجربتاً یہ بات بھی واضح کی کہ ان مرکبات کی ترکیب مستقل ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ تمام مرکبات ان کا ماخذ خواہ کوئی ہو، کیمیا کے عام امتزاجی کلیوں کی پابندی کرتے ہیں۔ لیکن نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا میں اس مماثلت کے باوجود کیمیا والوں کا ایک ایسا طبقہ بھی تھا جن کو اس بات پر اصرار تھا کہ نامیاتی مرکبات کی پیدائش کسی بعید از فہم حیاتی قوت (Vital Force) کے زیر اثر ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کو مصنوعی طور پر تیار کیا جا سکتا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ عام طور پر غیر نامیاتی مرکبات کو ہم ان کے اجزائے ترکیبی سے تیار کر لیتے ہیں۔ لیکن نامیاتی مرکبات تیار نہیں کئے جا سکتے۔ ان کا بیان تھا کہ کاربن ہائڈروجن اور آکسیجن سے (Acetic Acid) ایسٹک ترشہ الکوہل شکر یا نشاستہ حیوانی چربی تیل۔ گلیسرین جیسی مختلف النوع اور مختلف الخواص اشیاء بغیر کسی مخصوص طاقت یا قوت کے تیار نہیں کئے جا سکتے اور اس طاقت کو قوت نمونہ یا قوت حیات کا لقب دیا گیا جو کیمیا کے عام قوانین کی پابندی نہیں کرتی ہے اور انسان قدرت سے بالا ہے۔ چونکہ نامیاتی مرکبات کو اپنی ترکیب کی پیچیدگی اور تنوع کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے بھی کہ اس زمانے میں تالیفی یا امتزاجی کیمیا اپنے ابتدائی دور میں تھی تیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے یہ خیال عرصہ تک قایم رہا۔ اس خیال کا سب سے بڑا حامی (Berzelius) برزیلیس تھا۔ لیکن جوں جوں اس مسئلہ کی طرف لوگوں کی توجہ ہونے لگی متعدد کیمیادان نامیاتی مرکبات کو مصنوعی طور پر تیار کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد آگزیلک ترشہ فارمک ترشہ اور الکوہل کو مصنوعی طور پر تیار کر لیا گیا۔ ۱۸۲۸ء نامیاتی کیمیا کی تاریخ میں یادگار رہے گا اس لئے کہ اس سنہ میں (Wöhler) ووہلر نے یوریا کو عمل میں تیار کیا جو خالص حیوانی مرکب ہے۔ جس کی وجہ سے قوت حیات کے نظریہ کو بہت بڑا دھکا لگا۔ اس کے بعد متعدد نباتی اور حیوانی مرکبات کو تالیفی طور پر تیار کرنے کے طریقے دریافت ہوئے۔ بالخصوص نیل اور یورک ترشہ کی مصنوعی تیاری نے برزیلیس اور لیبگ کے اصلاح کردہ طریقہ ہائے تشریح اور لوازمہ کی تحقیقی کاوشوں نے یہ ثابت کر دیا کہ فی الحقیقت نامیاتی مرکبات کاربن کے ایسے مرکبات میں جو کاربن کے ہائڈروجن اور آکسیجن سے عام طور پر اور کبھی نائٹروجن، گندگ اور فاسفورس سے ترکیب کھانے پر پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ غیر نامیاتی اور نامیاتی مرکبات میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ غیر نامیاتی کیمیا میں عام طور پر تین عناصر کے باہمی امتزاج سے چار یا پانچ مختلف مرکبات حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن کاربن ہائڈروجن اور آکسیجن کے بے شمار مرکبات وجود پذیر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کاربن کے جوہر میں یہ مخصوص قابلیت ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے جوہر سے ترکیب کھا سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے مرکبات بھی دریافت کئے گئے ہیں کہ جن میں (۶۰ و ۹۰) کاربن کے جوہر باہم مربوط ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کاربن کے مرکبات کی تعداد دیگر تمام عناصر کے جملہ مرکبات سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مطالعہ جداگانہ طور پر کیا جاتا ہے۔ اس لئے نامیاتی کیمیا حقیقت میں کاربن کے مرکبات کا مطالعہ ہے۔ دوسری وجہ امتیاز تشاکل ترکیب ہے۔ ووہلر نے سائنٹیک ترشہ کا امونیم نمک تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کو بجائے امونیم سائنٹ حاصل ہونے کے یوریا حاصل ہوا۔ امونیم سائنٹ جو پہلے محلول میں حاصل ہوا تھا فوراً دوسرے قیام پذیر مرکب یوریا میں تبدیل ہو گیا۔ بادی النظر میں دونوں مرکبات میں عناصر ترکیبی ایک ہی ہیں۔ لیکن دونوں میں ساخت کا فرق ہے۔

امونیم سائنیٹ ($CNO.NH_4$) - یوریا ($CO(NH_2)_2$) ایسے مرکبات جن کا سالمی ضابطہ ایک ہی ہو لیکن جوہری ترتیب میں فرق ہو متشاکل کہلاتے ہیں۔ چنانچہ کافور کے جس کا سالمی ضابطہ ($C_{10}H_{16}O$) سے ظاہر کیا جاسکتا ہے (۱۱۹) متشاکل ہیں۔ جو خواص وغیرہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لئے کہ ہر ایک سالمہ کے اندر جوہروں کی ترتیب مختلف ہے۔ تشاکل ترکیب کا اصول حقیقت میں فنی نقطۂ نظر سے علم کیمیا کا واضح نشان راہ ہے۔ جس کی وجہ سے سالمی ساخت اور سالمہ کی تعمیر میں جوہروں کی ترتیب پر خاص توجہ کی جانے لگی۔ غیر نامیاتی کیمیا میں ایسی بہت کم مثالیں ملتی ہیں کہ ایک ہی ضابطہ رکھنے والے کئی مرکبات ہوں مثلاً سلفیورک ترشہ کا ضابطہ (H_2SO_4) ہے اور اس ضابطہ کا کوئی اور مرکب وجود پذیر نہیں۔

تیسرا فرق نامیاتی اور غیر نامیاتی مرکبات میں یہ ہے کہ اکثر نامیاتی مرکبات ناقیام پذیر ہوتے ہیں۔ اور اعلیٰ تپش پر تحلیل ہوجاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مطالعہ اور تحقیق کے لئے خاص طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی باعث تشریح کے ترقی یافتہ طریقوں کی دریافت تک اس فن میں قابل ذکر ترقی نہ ہوسکی۔

چوتھا فرق یہ ہے کہ نامیاتی مرکبات کی ترکیب بہت پیچیدہ ہوتی ہے۔ مثلاً گنے کی شکر کا ضابطہ ($C_{12}H_{22}O_{11}$) ہے۔ اولاسیٹرن جو عام طور پر چربیوں میں پایا جاتا ہے ($C_{17}H_{35}COOH$) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طرح نشاستہ یا سیلولوز کے سالمی ضابطے ہیں۔ جن کے ایک ایک سالمہ میں کئی کئی ہزار جوہر ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف غیر نامیاتی کیمیا میں شاذ ہی ایسے مرکبات سے واسطہ پڑتا ہے جن کے ایک سالمہ میں درجن بھر جوہروں سے زیادہ پائے جاتے ہوں۔ اس بحث سے ظاہر ہے کہ نامیاتی مرکبات کا مطالعہ جداگانہ طور پر کرنا کسی خاص اصول کی بناء پر نہیں ہے بلکہ سہولت کی وجہ سے ہے تاکہ کیمیا کی یہ دونوں شاخیں ایک دوسرے سے متمیز رہیں۔

نامیاتی کیمیا کا مفاد | نامیاتی کیمیا کی غیر معمولی ترقی دو باتوں کی زیادہ مرہون منت ہے۔ ایک تو یہ کہ اس میں مرکبات کی ساخت پر زیادہ زور دیا گیا جس کو (Kekule) کیکیولے کے کلیوں سے زیادہ مدد ملی۔ جو ۱۸۵۸ء میں پیش کئے گئے ان کلیوں سے معلومہ باتوں میں ارتباط پیدا ہوگیا اور ساتھ ہی نئے مرکبات کے متعلق پیش قیاسی بھی کی جاسکی۔ جس کی وجہ سے نامیاتی کیمیا کا علم زیادہ مستحکم، مربوط اور معین ہوگیا۔

دوسرا اثر جس کی وجہ سے نامیاتی کیمیا میں زیادہ ترقی ہوئی۔ نامیاتی مرکبات کا صنعتی استعمال ہے نامیاتی کیمیا کی معلومات سے صناع اور کارخانہ دار فائدہ اٹھانے لگے۔ اور انھوں نے اپنے منافع کا ایک معتدبہ حصہ تحقیقی اداروں کو دیا تاکہ وہ مزید انکشافات اس سلسلہ میں کرسکیں۔ چنانچہ ان کی ایک مثال نیل کی صنعت ہے ۱۸۸۰ء میں (Baeyer) نے نیل کی مصنوعی طور پر تالیف کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس تحقیق کو جرمنی کے رنگ ساز کارخانوں نے حاصل کرلیا۔ اور بے انتہا مشقت اور کثیر صرفہ کے بعد تجارتی پیمانہ پر نیل چونکہ مقابلتہً خالص اور سستا ہوتا تھا اس لئے اس صنعت کو فروغ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرق میں نیل کی کاشت آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئی اور اس طرح جرمنی نے ایک عمل کے تجربہ کو تجارتی پیمانہ پر تیار کرنے کے طریقہ میں تبدیل کردیا جس سے اس کو کثیر منافع ہوا۔

ادویہ بھی جب تالیفی طریقوں سے تیار کی جانے لگیں تو اپنے خالص ہونے کے باعث انکی تجارت کو بھی بہت فروغ ہوا۔ چنانچہ اسپرن سیلل سلفونال سیکرین وغیرہ بھی شروع میں جرمنی ہی کی رنگساز کمپنیوں میں تیار کئے جانے لگے۔ اسی دوران میں مختلف مصنوعی طور پر تیار شدہ مرکبات کے اثرات کا جو حیوانی نظام پر عارض ہوتے ہیں مطالعہ کیا جانا شروع ہوا۔ جس سے بہت ساری نئی نئی ادویہ کا انکشاف ہوا اسی طرح مختلف قدرتی

دواؤں کی ساخت وغیرہ کے دریافت ہونے پر ان کو مصنوعی طور پر خالص اور کثیر مقدار میں تیار کرنے کے طریقے معلوم کئے گئے۔

نامیاتی کیمیا اور صنعت کے تعلق کا اندازہ تالیفی رنگوں کی صنعت کے مطالعہ سے بہتر طریقے پر ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں رنگسازی اور رنگریزی کا علم قدما کو بھی تھا چنانچہ مصر کے قدیم پارچہ باف بھی اس فن سے کافی واقفیت رکھتے تھے کہ مختلف رنگوں کی آمیزش سے کس طرح مختلف الوان حاصل ہوتے ہیں اور کس طرح رنگوں کو پختہ کیا جا سکتا ہے کہ صدیوں تک رنگ پھیکا نہ ہو۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ انیسویں صدی کے اواخر تک قدرتی رنگوں کی تعداد محدود تھی جو مختلف بیلوں، چھالوں اور پھولوں سے حاصل کئے جا سکتے تھے۔ سب سے پہلے ۱۷۷۱ء میں مصنوعی رنگ پکرک ترشہ معلوم کیا گیا جو اون اور ریشم کے لئے رنگ کے طور پر اور جنگ کے زمانے میں بطور دھماکو شئے کے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ تالیفی رنگوں کی تاریخ کی ابتدا ۱۸۵۶ء میں ہوتی ہے جب کہ (Perkin) پرکن نے سترہ سال کی عمر میں مصنوعی طور پر انیلین کا ایک رنگ (Mauve) ماو تیار کیا یہ تحقیق اگرچہ بالکل اتفاقی تھی لیکن پرکن نے ایک ہی سال بعد اس رنگ کو تجارتی پیمانہ پر تیار کرنے کے لئے ایک کارخانہ قایم کر لیا اور اس طرح رنگسازی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ چنانچہ (۸۰) سال کے اندر اندر کولتار سے ہزاروں ہی قسم کے رنگ مصنوعی طور پر تیار کر لئے گئے۔ اور بیشتر مختلف صنعتوں میں مثلاً کاغذ سازی، روغن سازی، پینٹ، پارچہ، دباغت اور روشنائی وغیرہ میں استعمال کئے جانے لگے۔

رنگ سازی کی صنعت اور دھماکو اشیا کی تیاری دونوں میں نہایت قریبی تعلق ہے۔ اس لئے کہ دونوں کے درمیانی حاصل ایک ہی ہیں چنانچہ اس کا نہایت تکلیف دہ احساس حکومت برطانیہ کو گزشتہ جنگ عظیم کے موقع پر ہوا جرمنی نے صرف ۱۹۱۳ء میں تقریباً (۲۰) کروڑ پونڈ کا رنگ کولتار سے تیار کیا تھا۔ اگرچہ کولتار سے رنگ سازی کا آغاز انگلستان میں ہوا۔ لیکن اس صنعت کو اپنے مقام پیدائش پر کچھ فروغ حاصل نہ ہو سکا اس لئے کہ انگلستان میں ۱۸۸۰ء تک نامیاتی کیمیا پر کوئی زیادہ توجہ نہیں کی جاتی تھی۔

(Sabatier) سے بیٹیر کی تحقیقات سے بھی نامیاتی کیمیا کی ترقی میں بہت مدد ملی اس نے یہ انکشاف کیا کہ ایسے ناسیر شدہ نامیاتی مرکبات جو کیسی ہائیڈروجن سے غیر متاثر رہتے ہیں وہ کسی حامل کے استعمال سے ہائیڈروجن سے ترکیب کھا جاتے ہیں اس تحقیق نے چربیوں اور تیلوں سے روغن اور وارنش وغیرہ کی تیاری میں بہت بڑی مدد کی۔ اب بھی اگرچہ کیمیا داں نشاستہ سیلولوز وغیرہ تیار نہ کر سکے پھر بھی سلولوز کی مختلف صنعتوں میں کیمیا کا بہت بڑا دخل ہے۔ چنانچہ مصنوعی ریشم، کاغذ، فلم، سیلولائیڈ بیکیلائیٹ وغیرہ۔ صنعتیں کیمیا ہی کی مرہون کرم ہیں اور آئندہ بھی نہیں معلوم کہ نامیاتی کیمیا انسان کے کن کن اغراض اور ضرورتوں میں کام آئے گی۔ مثلاً قدرتی تیل کے چشموں سے آج کل قوت محرکہ حاصل کی جا رہی ہے۔ ان چشموں سے مہذب اقوام جس قدر استفادہ کر رہی ہیں اظہر من الشمس ہے۔ یہ بھی علم کیمیا کا ایک احسان ہے۔ لیکن جب توانائی کے حصول کا یہ قدرتی ذخیرہ ختم ہو جائے گا تو اس وقت ضرورت ہو گی کہ ایسا سستا اور مصنوعی الکوہل حاصل کیا جائے............

.... جو توانائی یا قوت محرکہ پیدا کرنے میں استعمال کیا جا سکے۔ غرض نامیاتی کیمیا کے مفاد اور اس کے صنعتی استعمال کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا کہ آئندہ وہ کیا کیا انسانی خدمات انجام دے سکے گی۔

(نوٹ) بقیہ تقریریں آئندہ سب رس میں شایع کی جائیں گی۔

مشاعرہ | بتقریب یوم ادارۂ ادبیات اردو گلبرگہ ایک طرحی مشاعرہ زیر صدارت جناب جمیل حسن صاحب ایچ سی ایس اول تعلقدار گلبرگہ شریف بتاریخ ۵ ار ڈسمبر ۱۹۴۱ء وقت ساڑھے نو ساعت شب بمقام ٹاؤن ہال گلبرگہ منعقد کیا گیا۔ اس مشاعرہ کے لئے حسب ذیل مصرع ہائے طرح دئے گئے تھے۔

(۱) فلک کو یاس سے منزل بہ منزل دیکھنے والے :- (قافیہ منزل، دل) (ردیف دیکھنے والے)

(۲) کچھ فتنے اٹھے حسن سے کچھ حسن نظر سے :- (قافیہ نظر، بشر) (ردیف سے)

(۳) نظم بعنوان "نوجوانوں کے نام پیغام عمل"

گلبرگہ کے وسیع اور خوشنما ٹاؤن ہال میں چاندی کے فرش اور برقی روشنی کے امتزاج سے ایک عجیب کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ میر مشاعرہ کی مسند کے اطراف دور تک بیش بہا قالینوں کا فرش کیا گیا تھا۔ شعرائے کرام کے لئے مسند کے سیدھے بازو کی جگہ مختص کر دی گئی تھی۔ مقامی عہدہ دار مسند کے بائیں بازو ایک بڑی تعداد میں جمع تھے۔ سامنے عوام کا کثیر مجمع تھا۔ خواتین کے لئے بھی پردہ کا معقول انتظام تھا۔ آلہ مکبر الصوت کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ یہ جلسہ اس ٹاؤن ہال میں اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ تھا۔ ادارہ کے رضا کار ایک بڑی تعداد میں مصروف انتظام تھے۔ بعض مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے اور بعض انھیں اپنی اپنی نشستوں پر لا کر بٹھا رہے تھے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی شاخ کے مقامی معتمد محمد بن عمر صاحب ایم اے (عثمانیہ) لکچرار انگریزی گلبرگہ کالج نے اپنی افتتاحی تقریر میں مشاعروں کی اہمیت اور اردو شاعری کے ارتقا سے بحث کی۔ اردو شاعری کی ترقی میں عادل شاہیوں اور قطب شاہیوں کے دور حکومت کے شعرا کا ۱۴۹۰ء سے ۱۶۳۰ء تک جو حصہ رہا ہے اسے بھی واضح کیا۔ موجودہ زمانے کے شعری رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے آخر میں جمیل حسن صاحب اول تعلقدار گلبرگہ شریف سے درخواست کی کہ اس عظیم الشان مشاعرہ کی مسند صدارت کو رونق بخشیں۔ مشاعرہ کا آغاز پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی نظم بعنوان "نوجوانوں کے نام پیغام عمل" سے عمل میں آیا۔

شعرائے کرام | اس مشاعرہ میں گلبرگہ اور بلدہ کے بعض مشہور شعرا مثلاً محمد حسین صاحب اختر، عبدالحفیظ صاحب حفیظ، محمد عبدالرحیم صاحب سیفی، قطب الدین صاحب عاقل، نور الحسن صاحب انور، عبدالرسول صاحب قربت، نیاز علی خاں صاحب نیاز، غلام محی الدین خاں صاحب کیف، عبدالحلیم صاحب ساحل، حمیدہ بانو صاحبہ مخفی، آل احمد صاحب جمالی، لطف النساء بیگم صاحبہ اثیمہ، عبدالرحیم صاحب فضل، خطیب صاحب، لطیف شریف صاحب ساجد، محمد غوث صاحب صدیقی، سیح الدین خاں صاحب متین، احمد حسین صاحب شاہد، نظر صاحب حیدرآبادی، مرزا یگانہ صاحب چنگیزی اور دہقانی صاحب نے حصہ لیا۔ اس مشاعرے میں حضرت یگانہ، دہقانی، نظر، فضل، ساحل، اثیمہ صاحبہ و مخفی صاحبہ کا کلام خاص طور پر پسند کیا گیا۔

اس طرحی مشاعرے میں بہترین غزل و نظم پر محمد بن عمر صاحب معتمد مشاعرہ نے حسب ذیل انعامات کا اعلان کیا :-

۱۔ انعام عطیہ عالی جناب امیر علی خاں صاحب صوبہ دار گلبرگہ .... جناب عبدالحلیم صاحب ساحل۔

۲۔ " " جناب جمیل حسن صاحب اول تعلقدار گلبرگہ .... محترمہ لطف النساء بیگم صاحبہ اثیمہ۔

۳۔ " " احمد محی الدین صاحب انصاری ناظم عدالت .... جناب عبدالرحیم صاحب فضل۔

۴۔ " " محمد بن عمر صاحب ایم اے لکچرار انگریزی .... محترمہ حمیدہ بانو صاحبہ مخفی۔

۵۔ " " نصیر الدین صاحب ہاشمی مددگار رجسٹر بشن .... محترمہ لطف النساء بیگم صاحبہ اثیمہ۔

معتمد مشاعرہ کے شکریہ کے بعد رات کے ۲ بجے یہ مشاعرہ ختم ہوا۔

نوجوانوں کے نام پیغام عمل

"یوم ادارہ کی تقریب سے متعلق آپ کا مفصل دعوت نامہ ملا۔ شکریہ! میں اپنی صحت سے مجبور ہوں ورنہ ضرور شریک ہوتا آپ کے موضوع (نوجوانوں کے نام پیغام عمل) پر ایک نظم اس کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ غزل بہت ہی کم کہتا ہوں اس لئے معذور ہوں۔ دعا ہے کہ آپکا یوم ادارہ ہر طور کامیاب رہے۔"

(برجموہن دتاتریہ کیفی دہلی)

(اقتباس)

ہاں تو ہی اے نوجواں تعبیر خواب قوم ہے
قوت بازوئے ہستی ہے۔ شباب قوم ہے

زندگانی کے قصیدے کی تو ہی تشبیہ ہے
بہتری کی تو وطن کے واسطے تقریب ہے

ہے عروسِ زندگی کا تو ہی سرتاج اور سہاگ
تو رباب ہستئ انساں کا ہے کلیان راگ

کیا فقط ماں باپ ہی کی آنکھ کا تارا ہے تو
ہے وطن کا نور چشم اور قوم کا پیارا ہے تو

امر حق کو کچھ ضرورت استعارے کی نہیں
ہو جو نیت نیک۔ حاجت استخارے کی نہیں

مجھ کو کہنا ہے یہ تم سے اس کو سن لو نوجواں!
آنکھ اٹھائے تم پہ ہے اس وقت کل ہندوستاں

کام وہ ہو جس سے نکھرے کچھ وطن کا رنگ روپ
اہل عالم کو دکھا دو ہند کے تم ہو سپوت

جو نہ آیا تھا کبھی وہ انقلاب آنے کو ہے
عالم تہذیب کو روز حساب آنے کو ہے

وہم و اندیشہ سے تو اب کام چلنے کا نہیں
یہ شجر آہوں کی گرمی سے تو پھلنے کا نہیں

باغ کی رونق۔ سجاوٹ جو ہے وہ پھولوں سے ہے
غور سے دیکھو تو ہستی پھول کی کلیوں سے ہے

ذمہ داری ہے بڑی اور کام بھی آساں نہیں
پر لغت میں اہل دل کے لفظ غیر امکاں نہیں

ہے یہ میدانِ عمل آجاؤ تم سر جوڑ کر
دو وطن کے فرض کو انجام تم جی توڑ کر

اس قدر خود رفتہ ہو جاؤ مطلب کی راہ میں
منزلِ مقصود ڈھونڈے دوڑ کر خود ہی تمہیں

جب تمہارا جذبۂ پنہاں عیاں ہو جائے گا
نوجواں! بخت وطن بھی پھر جواں ہو جائے گا

غزل

برجموہن دتاتریہ کیفی

ہر اک صورت ہر اک تصویر باطل دیکھنے والے
کبھی لیلیٰ کو بھی دیکھا ہے محمل دیکھنے والے

بگولہ بن کے خاکِ آشیاں دن رات پھرتی ہے
یہی تھا زندگی کا میری حاصل دیکھنے والے

شبِ تاریک جس دم صبح کے دامن میں آتی ہے
ہمیں ہوتے ہیں تم کو بالمقابل دیکھنے والے

مبادا صورتِ زیبا اتر آئی ہو بوندوں میں
لہو کیوں دیکھتے ہیں تیغ قاتل دیکھنے والے

یہ کون آیا سرِ محفل کہ شمعیں ماند پڑتی ہیں
قیامت ہے ہوئے جاتے ہیں غافل دیکھنے والے

خدا ہی جانے کیا انجامِ محفل ہونے والا ہے　　اٹھے جاتے ہیں یک یک رنگِ محفل دیکھنے والے
جسے ساحل تو سمجھا ہے وہ بحرِ نامرادی ہے　　پلٹ طوفاں کی جانب سوئے ساحل دیکھنے والے

عبدالحلیم ساحل

غزل

نیکی کی توقع ہے عبث نوعِ بشر سے　　تخلیق کبھی خیر کی ہوتی نہیں شر سے
کیوں شیخ و برہمن میں ہے ناچاقی باہم　　بت شکنی بھی رائج ہوئی بت گر ہی کے گھر سے
خود کھو گئے دیکھا جو جھلک حسنِ ازل کی　　بوجھ اٹھ نہ سکا دید کا موسیٰ کی نظر سے
خالق سے ملا دیتی ہے انگشتِ شہادت　　ثابت یہ ہوا معجزۂ شقِ قمر سے
یہ شوقِ زیارت ہے کہ یثرب کے سفر میں　　تھک جائیں جو پاؤں بھی تو ہم جائینگے سر سے
افشا کیا سر دے کے یہ سرِ سبطِ نبی نے　　اسلام کا پھلتا ہے شجر خونِ بشر سے
دھلتے بھی ہیں بارش سے کہیں داغِ معاصی　　لینا ہی پڑا کام مجھے دیدۂ تر سے
ظلمت سے خودی کی جو نکل جائیں اثیمہ　　مطلب او نہیں شب سے نہ سپیدیٔ سحر سے

لطف النساء بیگم اثیمہ

اے نوجوان (نظم)

مصیبت میں بھی مسکراتا چلا جا　　جوانی کی ہمت بڑھاتا چلا جا
مٹا دے ستم رانیوں کو جہاں سے　　تظلم کی بنیاد ڈھاتا چلا جا
یہ بھرپور بازو یہ مضبوط پنجے　　انھیں بھی تو تو آزماتا چلا جا
چل ایسے دہل جائے گیتی کا سینہ　　اکڑتا ہوا دندناتا چلا جا
فلک ہنس رہا ہے تو ہنسنے دے اسکو　　ستاروں سے آنکھیں ملاتا چلا جا
نہ پھنس تو کبھی عقل کی الجھنوں میں　　یقیں بن کے دنیا پہ چھاتا چلا جا
قیادت کی مشعل کو ہاتھوں میں لیکر　　دیا سے دیا کو جلاتا چلا جا
جوانی تصادم، تصادم جوانی　　مصیبت کو خود ہی بلاتا چلا جا
وطن کی امانت ہے تیری جوانی　　اسے رہزنوں سے بچاتا چلا جا
شکن تیرے ماتھے پہ کیوں آرہی ہے　　یہ دنیا ہے۔ ہنستا ہنساتا چلا جا
غلامی کی زنجیر کو توڑتا چل　　علم حریت کا اڑاتا چلا جا
جو مایوسیاں گھیر لیتی ہیں تجھکو　　یہ وجد آفریں نغمہ گاتا چلا جا
اسی طرح اے فضل نظروں سے اپنی
ہر اک سمت جادو جگاتا چلا جا

عبدالرحیم فضل

غزل

دیکھا جو کبھی تم نے محبت کی نظر سے　　کچھ فتنے اٹھے حسن سے کچھ حسنِ نظر سے
گر پایا ان کو تو نہیں اس میں مزا کچھ　　ہو یاد فسانہ مرا بس دیدۂ تر سے
جب پاس تھے تم صبر و سکوں تجھے میسر　　تم کیا اٹھے ہیں چیخ اٹھے درد و جگر سے
ان غم کی گھٹاؤں میں بس اک تیرا تصور　　بیگانہ بناتا ہے مجھے شمس و قمر سے
پھر رنگ کے گل جائے تو جانوں تجھے ناصح　　مل جائے جو اک بار نظر ان کی نظر سے
او شعرِ مجسم مری دنیائے طلب کے　　پھر لطفِ توجہ ہو کسی عنوانِ دگر سے
فردوس ہزاروں اس دلِ ناشاد کے بدلے　　بہتر ہے مرا داغِ جگر ہر گلِ تر سے
دے لطف رنگیں مجھے آشفتگیٔ زیست　　کملا گئی کیوں شمعِ دل افروز سحر سے؟

اے مخفی تقلیدِ جگر حاصلِ اظہار
رنجیدہ نہ ہو جائیں کہیں نظم و نثر سے

حمیدہ بانو مخفی

(ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں)

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	
من کی بیتا	۸۰	•	۸	•
سرگزشت غالب	۶۴	•	۸	•
نظام الملک	۴۰	•	۴	•
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	•
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	•	•
ارمغان جذب	۱۲۰	•	۱۲	•
سوتیلی ماں	۴۸	•	۴	•
سر سید احمد خاں	۱۶	•	۲	•
سر سالار جنگ	۴۸	•	۶	•
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	•
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	•
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	•
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	•	•
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	•
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	•
دادا بھائی	۱۶	•	۲	•
اردو نامہ	۲۰۰	۲	•	•
ارسطو جاہ	۶۵	•	۶	•
عمادالملک	۴۰	•	۶	•
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	•	۲	۶
" دوسری کتاب	۵۶	•	۴	۶
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	•	•
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	•
فن تقریر	۹۶	•	۸	•
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	•	•
پانی کی کہانی	۴۸	•	۶	•
رسایل طبعہ	۳۱۲	۲	۸	•
سلک گوہریں	۴۰	•	۴	•
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۱	۴	•
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	•
ہوش کے ناخن	۹۴	۱	•	•
سف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	•	•

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۱	۴	•
متاع سخن	۱۲۴	•	۱۲	•
کیف سخن	۱۲۲	•	۱۲	•
بادہ سخن	۱۲۷	•	۱۲	•
سراج سخن	۱۵۲	•	۱۲	•
ایمان سخن	۱۲۰	•	۱۲	•
فیض سخن	۱۴۴	•	۱۲	•
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	•	•
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	•	•
نقد سخن	۱۷۵	۱	•	•
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	•
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	•	•
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	•	•
من کی دنیا	۱۴۵	۱	•	•
مدارس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	•
محرم نامہ	۱۱۲	۱	•	•
نذر دکن	۱۰۴	۱	۴	•
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	•
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	•
دفتری معلومات	۵۶	•	۶	•
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	•	۶	•
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	•
نمود زندگی	۲۱۲	۱	۸	•
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	•	۱۲	•
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	•
بلقان	۳۲	•	۳	•
خطابات	۱۱۲	•	۱۲	•
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	•	•
چونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	•
انوار	۱۶۸	۱	۸	•
کشمش نانی (۴) تصاویر	۸۰	•	۱۰	•
کارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

سنہ ۱۹۴۲ ع

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

جلد ۵ بابت ماہ نومبر ۱۹۴۲ء شمارہ ۱۱

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین بی اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

سب رس کے قلمی معاونین سے

ادارۂ ادبیات اردو کے ترجمان کی حیثیت سے ماہنامہ سب رس نے اردو دنیا میں جو خاص وقعت حاصل کر لی ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اس رسالے کا ادبی معیار کسی ہمعصر رسالے سے کم نہیں سمجھا جاتا اور اس کے افسانے اور نظمیں دیگر رسائل و جرائد میں بالنقل ہوتی رہتی ہیں۔

افسانوں، نظموں اور غزلوں کے لئے اب تک جتنے صفحات سب رس میں وقف ہوتے رہے ہیں وہ برابر باقی رہیں گے۔ لیکن ان کے علاوہ جو علمی مضامین شایع ہوتے ہیں ان کو آئندہ سے خاص مسائل کے تحت مرتب اور شریک کیا جائے گا۔ فی الحال یہ مسائل حسب ذیل ہوں گے:

۱۔ حیدرآباد میں ہندو مسلم تعلقات | اس سرخی کے تحت زمانۂ ماضی و حال کے متعلق تمام مضامین اور مقالے شایع ہوں گے جن میں واقعات اور مثالوں اور حوالوں کے ذریعے سے حیدرآباد کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ دکن کی تاریخیں اور تذکرے ایسے واقعات سے معمور ہیں۔ ان کو جدید انداز میں پیش کرنے کے علاوہ ذاتی تجربات بھی قلمبند کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ اردو زبان کے مسائل | اس سرخی کے تحت اردو زبان کے لسانی اور صوتی پہلو، رسم الخط، ٹائپ، مقامی بولیاں، الفاظ، محاورے، ضرب الامثال اور کہاوتیں جیسے مسائل پر معلومات شایع کی جائیں گی۔

۳۔ دکن کے آثار قدیمہ | سرزمین دکن میں مختلف مقامات پر جو قدیم تاریخی آثار (مناور، مساجد، محلات کے کھنڈر، قلعے، برج، قبریں اور گنبد وغیرہ) ہیں ان کی تفصیلی معلومات جن میں مقامی روایتوں اور کتبوں کی عبارتوں کو وضاحت سے قلمبند کیا گیا ہو۔

۴۔ دکنی مشاہیر | جن میں مذہبی بزرگ اور مدبرین، امرا اور ادیب و شاعر بھی شامل ہیں۔ ان کے حالات اور کارناموں پر مستند اور مکمل تبصرہ۔

توقع ہے کہ آئندہ سے ہمارے فاضل مضمون نگار ان ہی چار مسائل سے متعلق کسی نہ کسی موضوع پر اپنے مضامین سپرد قلم فرمائیں گے۔

ادارۂ سب رس کو توقع ہے کہ وہ ان مضامین کے مجموعے جدا جدا کتابی صورتوں میں بھی شایع کر سکے گا۔ اور اس طرح ہمارے قلمی معاونین کے رشحات قلم مستند اور حوالے کی تحریروں کی شکل اختیار کر سکیں گے۔

نوٹ | مذکورہ بالا عنوانات سے متعلق جو مضامین سب رس میں شایع کئے جا رہے ہیں ان کی قطعی صحت کا ادارۂ سب رس ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر کوئی معلومات غلط درج ہوں تو ناظرین سب رس سے توقع ہے کہ وہ ان سے مطلع فرمائیں گے۔ مطبوعہ مضامین سے متعلق اگر کوئی صاحب مزید معلومات روانہ فرمائیں تو انہیں شکریہ کے ساتھ درج رسالہ کیا جائے گا۔

غلط فہمی | سب رس بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء میں ٹیگور کے ایک انگریزی افسانے کا ترجمہ شایع ہوا ہے جس کی نسبت ادارۂ سب رس کا خیال تھا کہ یہ فرضی واقعات پر مشتمل ہوگا۔ لیکن اب ہمارے ایک کرم فرما نے توجہ دلائی ہے کہ یہ ہندوستان کی ایک مشہور تاریخی شخصیت اور سکھوں کے مقدس رہنما کے حالات زندگی سے یک گونہ تعلق رکھتا ہے۔ ادارۂ سب رس کو افسوس ہے کہ ایک ایسا افسانہ اس کے اوراق پر شایع ہو گیا جو ملک کے ایک فرقہ کی ناگواری کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہم ندامت کے ساتھ اس واقعہ کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

ادارہ

مشائخین ٹیکمال

ٹیکمال دریائے مانجرا پر پرانا اسلامی قصبہ ہے۔ اب ضلع میدک میں ہے، پہلے بیدر میں تھا۔ بیدر کے جانب شرق ٹیکمال اور جانبِ غرب قندہار اور جانبِ جنوب کوہیر، مردم خیز بستیاں ہیں جہاں ہر عہد میں مشاہیر پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم نے اطراف و نواح کو علم کی روشنی بخشی۔

ٹیکمال میں حضرت سید صاحب حسینی آداب کا وجود مولٰنا رفیع الدین کے بعد ہوا ہے۔ آپ بندہ نواز حسینی اور غوث پاک کی آل سے ہیں۔ نواب صدیق یار جنگ کی ہمشیرہ آپ کی اہلیہ تھیں۔ تنظیم جدید میں آپ نے اپنے مدرسۂ حسینیہ سے اپنے تعلیم دئے ہوئے سات سو طالب علم دئے تھے۔ نواب سالار جنگ بہادر کا یہ خط ہنوز کتب خانے میں محفوظ ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں کہ "دریں قحط الرجال ایں قدر مردم باکمال از یک قصبہ بہم رسیدن موجبِ خوشنودیٔ کمال است"۔ آخر میں عبارت ہے "وجود فیض آمود باعثِ افتخار ملک و ممنونیتِ سرکار است" آپ قادری حسینی تھے۔ درس کا شغل تھا۔ شعر خوب کہتے تھے۔ تخلص کبھی آداب کرتے تھے اور اکثر حسینی۔ آپ کی ولادت ۱۲۱۹ھ میں ہوئی ۷۸ سال عمر پائی ۱۲۹۷ھ میں رحلت فرمائی۔

آپ کے واقعات میں آپ کے ہمشیرہ زادہ اور شاگرد و خلیفہ شاہ محمد غلام جیلانی تسلیم گلشن آبادی جو سیہ لکھتے ہیں حسب ذیل ہیں۔

پیر و مرشد کا مولد و مشہد　　قصبۂ ٹیکمال ہے مسند　　سیدِ صاحبِ حسینی نام　　جانتے ہیں دکن کے خاص و عام

اہلِ اسلام اور اہلِ ہنود!　　معتقد آپ کے ہیں سر بہ سجود　　سایۂ روضۂ محمد ہے　　آپ کی خوش نما جو گنبد ہے

عمر کی ہے حکیم میں تعداد　　تھی جو حکمت میں انتہا سے مراد　　سالِ مولود ہے ظہورِ حق　　تھے جو ظلِ ظلیل نورِ حق!

ہیں کرامات آپ کے بے حد　　فصل اور وصل میں بربِ صمد　　یا غفور آپ کا ہے سالِ وصال　　ہوا سرسبز جب نہالِ وصال

قاضی صدیق احمد صاحب فہیم بھی آپ کے حلقۂ درس میں تھے۔ آپ کے اشعار حسبِ ذیل ہیں جو فرہنگ حسینی میں طبع ہو چکے ہیں۔

حضرتِ صاحب حسینی طرۂ دستارِ فضل　　ذرہ اش چشمک زن خورشیدِ تاباں دیدہ ام

واقفِ امر حقیقت واقفِ اسرارِ شرع　　یک زبانش صد کلیدِ گنج عرفاں دیدہ ام!

کے رسد آئینہ بارنگ صفائے گوہرش　　صد سکندر را بکاوش سخت حیراں دیدہ ام!

ٹیکمال منصور خاں الہ آبادی سپہ سالار دکن کی جاگیر تھی۔ اس کے اب وجد میں سے ایک صاحب بغداد شریف سے ایک پیرزادہ کو ہمراہ لائے تھے جن کا نام سید احمد قادری تھا۔ ان کے صاحبزادے جمال اللہ قادری الہ آباد میں رہے۔ ان کے شاگرد محمد اسمٰعیل حریا کوٹی ہیں جن کے تصنیفات کثیر ہیں آپ نے تصنیفات میں اپنے استاد و پیر کی جا بجا مدحت کی ہے۔ ملاحظہ ہو سفرنامۂ منشی صدیق یار جنگ مرحوم بکتب خانۂ آصفیہ۔ منصور خاں جن کا مزار منجہ شاہ میں ہے اپنے مرشد کے صاحبزادے عبدالواحد صاحب کو حیدرآباد ساتھ لے آئے۔ جوگی پیٹھ میں جوگی ناتھ سے حریفانہ مقابلہ رہا۔ آپ کا مزار جوگی پیٹھ میں ہے اندرون مسجد۔ آپ شاہ عبدالغنی جنیدی کے داماد ہوئے، جو امین خاں عرب قلعہ دار میدک کے شیخ اور سراج الدین صاحب جنیدی کے بیرے تھے۔ جن کی عالی شان گنبد رونقِ گلشن آباد ہے۔

آپ کا نسب نامہ حسب ذیل ہے۔

سید صاحب حسینی الحسنی ابن عبدالرزاق قادری بن عبدالواحد بن شکر اللہ بن شاہ عبدالواحد بن جاق اللہ قادری الہ آبادی بن سید احمد قادری بغدادی بن ابو الحسن قادری بن سید محمد اولیا قادری بن علی مسعود قادری بن سید احمد بن سید عمر بن سید عبدالملک بن حاجی حمید بن سلطان الموحدین بن ابو الفتح ہدایت اللہ بن سید قریش بن سید عبدالوہاب بن سید عبدالرؤف بن سید محمد بن سید عبدالغفار بن سید محمد بن سید جعفر بن سید ابراہیم بن سید عبداللہ بن قاضی القضاۃ سید ابو نصر محی الدین قادری بن سید ابو صالح بن سید ابوبکر تاج الدین عبدالرزاق قادری بن غوث الاعظم سید میراں محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ۔

آپ سے اکابرانِ ملک نے استفادہ کیا۔ فرہنگ حسینی کے خطوط سے اس کا پتہ ملتا ہے۔ لاکھوں آدمیوں نے آپ سے فیض پایا۔ آپ کے شیخ آپ کے گھر آئے اور وہیں رہے۔ آپ کے اکثر تصنیفات شیخ کے نام سے ہیں (۱) شاہد الوجود (۲) شاہد الاذکار (۳) شواہد حسینی (۴) فرہنگ حسینی۔ یہ کتاب مدرسۂ حسینیہ کے لئے لکھی تھی جس نے ایک صدی خدمت علم کی ہے اس سے فارسی بہت جلد آتی ہے (۵) فرہنگ حسینی (۶) وظائف (۷) دستور العمل حسینی۔ آپ کا کلام۔ رباعی ؎

انجا ہمہ آثار و جمالے تو بہ بینم ہر جا کہ رود مدرکام بہر خیالے
از ذرہ و ذرات کمالے تو بہ بینم یارب بسببے کن کہ جمالے تو بہ بینم

آپ کے دو محل تھے۔ (۱) ایک زوجہ حضرت نعمت اللہ ولی الکرمانی کی اولاد سے تھیں جن کے اجداد شاہانِ سلاطین بہمنیہ کے استاد تھے۔ جن کے برادر غلام محمد ذکا مددگار صوبہ دار پٹن چیرو و غلام علی صاحب استاد فراہم زنجنگ تحصیل دار مدگل تھے اور برادر زادے قاضی حبیب الرحمٰن صاحب تحصیل دار یرگی تھے۔ مولوی غلام علی صاحب کی اولاد موجود ہے جس کا شجرہ حاشیہ ذیل میں درج ہے ؎[1]

[1]

(۲) دوسری زوجہ نواب صدیق یار جنگ بہادر کی ہمشیرہ تھیں۔

زوجہ اول کی اولاد پہلے محل سے حضرت سید احمد بادشاہ قادری صاحب سجادہ تھے آپ ان خوش نصیبوں سے تھے جن کو دنیاوی و دینی کامل نعمتیں خدا نے دی تھیں حسن صورت اس کے علاوہ تھا۔ آپ کا تذکرہ تزک محبوبیہ میں ہے اور انتخاب لاجواب اور علمی خبر میں آچکا ہے۔ آپ ماہ رمضان ۱۲۴۳ھ کو پیدا ہوئے (۸۲) سال عمر پائی ۱۳۲۵ھ ہجری میں واصل بحق ہوئے۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب رزیڈنٹ بہادر کو ہمیں مختار ٹیکمال لائے تھے رزیڈنٹ پلوڈن پر آپ کے تدبر و حسن کا خاص اثر پڑا تھا۔ آپ کا دسترخوان اور آپ کی زرعی قابلیت اپنا آپ نمونہ تھی۔ والد کے بعد آپ مدرسہ کی علمی خدمت میں مشغول رہے۔ آپ کی محل اولی قاضی عظیم الدین خاں اودگیری کی نواسی تھیں جن کے فرزند سید محمد حسینی بادشاہ ناظم مداخل و مخارج صرف خاص مبارک تھے۔ محل ثانی شاہ عبدالنبی جنیدی کے خاندان سے تھیں۔ جن کے بطن سے (۱) سید نور اللہ حسینی اول تعلقدار۔ (۲) سید محمود بادشاہ سجادہ نشین (۳) شاہ عبدالرزاق قادری (۴) فاطمہ زہرا والدہ قاضی پرکھنی نیر الدین و عبدالصمد تھیں قاضی نیر الدین ۱۳۱۳ھ میں پیدا ہوا۔ قاضی فاروقی تاریخ تولد ہے۔ منشی فاضل مولوی عالم کی تعلیم پائی پونہ کالج میں زرعی تعلیم ہوئی تحصیلداری و منصفی کا کام سیکھا، وکیل درجہ اول ہوا تحصیلدار و منصف ہوا شعر اپنے چچا اور سید معروف صاحب و مولوی عبدالقدیر صاحب سے سیکھا۔ عبدالصمد کی علیگڑھ میں ایف اے تک تعلیم ہوئی، رجسٹرار ہیں شعر خوب کہتے ہیں۔

سید نوراللہ حسینی۔ ابتداً مدرس مدرسہ حسینیہ تھے ریاضی کی تعلیم کے بعد نواب سالار جنگ نے تحصیلدار کیا۔ مہاراجہ بہادر کے معتمد رہے۔ بخدمت اول تعلقداری انتقال کیا۔ آپ کو تعلیمی شغف تھا حیدرآباد میں اسلامیہ بورڈنگ آپ کا قایم کردہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ

"علم ہو یورپ کا اور اخلاق ہوں اسلام کے"

اس خیال کے تحت آپ کی عمر اور مال کا بڑا حصہ صرف تھا۔ سر سید کی ڈائری میں آپ کا نام ہے علیگڑھ کے حامی تھے۔ رحلت ۱۳۲۷ف میں انتقال ہوا۔ آپ کے فرزند سید عبدالقادر حسینی تعلقدار اور (۲) سید احمد محی الدین بی اے کنٹب مارکٹنگ افسر سابق پروفیسر نظام کالج ہیں۔

(۲) سید محمود قادری کے فرزند سید احمد قادری مددگار پروفیسر عثمانیہ کالج اور دختران یہ ہیں۔ (۱) اہلیہ سید عبدالقادر حسینی صاحب (۲) اہلیہ ریاض الدین صاحب خطیب بودھن (۳) اہلیہ قاضی زین العابدین صدیقی جو حاجی قیام الدین حسن مرحوم سیاہ پوش درویش کے نواسے ہیں۔ حاجی قیام الدین صاحب داماد سید صاحب حسینی ہیں اور قاضی عظیم الدین خاں اودگیری کے نواسے ہیں۔ (۴) اہلیہ خواجہ محمد اعظم اللہ صاحب۔

حضرت سید احمد بادشاہ صاحب کے شعر فارسی میں ہیں۔ مثلاً خدا نورِ رسول اللہ جان است ٭ ز نورِ پاک او ہر دو جہان است

(۳) شاہ عبدالرزاق صاحب کے فرزند سید احمد جمال اللہ حسینی بی اے نائب ناظم زراعت ہیں جو یورپ کے تعلیم یافتہ ہیں (۲) سید احمد اللہ تعلیم یافتہ علیگڑھ کالج فوج میں ہیں (۳) سید ضیاء اللہ زیرِ تعلیم ہیں جن کی والدہ حضرت ملتانی بادشاہ صاحب قدس سرہٗ کی اولاد سے ہیں۔

حضرت سید صاحب حسینی صاحب کے فرزندِ دوم حضرت سید شاہ معروف حسینی قادری ہیں۔ آپ کے فرزندِ اکبر ابوالقاسم سید محمد صاحب وظیفہ یاب تحصیلدار ہیں جو اپنے بزرگوں کی مثال اور نقش صورت ہیں۔ دوسرے سید ابوالحسن صاحب قیصر مددگار صدارت العالیہ شاگردِ استادِ جلیل ہیں۔ تیسرے سید فرید بادشاہ مرحوم تحصیلدار آرمور۔

حضرت سید معروف صاحب فیض صاحب کے شاگرد صاحب سوز و قادر الکلام شاعر تھے۔

ہمارا سیدِ معروف مشرب ہے فقیرانہ   نہ بیم تنگدستی ہے نہ خوفِ فاقہ مستی ہے

ولہ

دیکھ کر قاصد کو سب مضمون نامہ کھل گیا   بن گئی ہے طرزِ رفتار کبوتر آئینہ

آپ کی مثنوی ہے۔ دیوان ہے۔ نوّد سال کی عمر پائی حاجی الحرمین تھے۔

زوجۂ ثانی کی اولاد سید یٰسین بادشاہ قادری زوجۂ ثانی سے پہلے فرزند ہیں یہ ہمشیرہ زادہ اور داماد نواب صدیق یار جنگ معتمد امور غیر ملکی ہیں۔ آپ کے داماد بھی تھے اور سررشتۂ مال کے ملازم بعد میں تارکِ دنیا ہوئے۔ ان کے فرزند ندیم اللہ حسینی عربی داں ذی علم ہیں۔ (۲) سید محی الدین صاحب قادری آپ کے دو فرزند ہیں (۱) سید صاحب حسینی (۲) سید نور الحق صاحب قادری ٹیکمال ہی میں رہتے ہیں بزرگ ہستی ہیں۔

صاحبزادی حضرت صاحب حسینی صاحب کی ایک صاحبزادی تھی جو زوجہ خواجہ قیام الدین حسین تھیں آپ کی ایک دختر اہلیہ محمود بادشاہ صاحب تھیں۔

ہمشیرزادے حضرت صاحب حسینی صاحب کے خلیفہ اور ہمشیرہ زادہ شاہ غلام جیلانی قادری گلشن آبادی متخلص تسلیم تھے۔ حیات تسلیم آپ کی سوانح ہے۔

دیوان مرتب اور مشہور امام ہے۔ ان کے دو فرزند ہیں (۱) شاہ محمد روح اللہ قادری بزرگ تھے شعر بھی خوب کہتے تھے۔ شیروانی صاحب نے ان کی شاہل دکن میں نہیں پائی۔ ان کے فرزند کلیم اللہ قادری بی ایس سی ہیں۔ (۲) شاہ محمد ولی اللہ ادیب۔ آپ کثیر التصانیف ہیں۔ عمر تمام تدریس و تعلیم میں گزاری نہایت بزرگ ہستی تھی آپ کے تصانیف۔ مسائل المنہا۔ حیات تسلیم و دیوان اور کثیر کتب ہیں۔ آپ کے ہمشیر زادہ خلیل اللہ حسینی وو تعلقدار ناگر کرنول ہیں۔

حضرت سید احمد بادشاہ قادری کے وصف میں قاضی صدیق احمد صاحب فہیم کے شعر حسب ذیل ہیں۔

آنکہ فرزند معتقد سید احمد بادشاہ	سایہ اش ہم پایۂ گردون گرواں دیدہ ام
مسند آرائے طریقت قدوۂ اہل کمال	خاک بوس آستانش خان و ترخاں دیدہ ام
رفعت قدرش فزوں برآمد از اوج خیال	پست پیشش ندوہ ہائے بام کیواں دیدہ ام
موشگافیہائے نطقش رو نقے دیگر فزود	خامہ اش شاطۂ زلف پریشاں دیدہ ام
بسکہ بہر علم می آیند مردم گرد او	غیرت صبح وطن شام غریباں دیدہ ام
رتبہا ندست دعا بر بستم و بلا شدم	تا در بام اجابت راہ آساں دیدہ ام
آں سیہ کار نگوں اختر فہیم تنگ دل	کز سیہ بختی چو زلف مہ رخاں دیدہ ام
مرحمت بر حال زارش کن برآر از فقر و غم	زانکہ حالش بیشتر زار و پریشاں دیدہ ام

منیر الدین قاضی پربھنی

گارساں دتاسی :۔ اردو کے پہلے پروفیسر فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندوستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی و ادبی کارنامے طریقہ تعلیم، تلامذہ، کتب خانہ، اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کی یورپ کی درس گاہوں، اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے نہایت تحقیق اور جانفشانی سے تالیف کیا ہے۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب

صفحات ۱۲۸۔ قیمت ۱۲/

مقدمۂ تاریخ دکن :۔ یہ کتاب پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں انھوں نے سرزمین دکن کے مختلف حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقا، عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ اس کتاب کے آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی ہے۔

کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصہ میں قدیم دور کے دس حکمران خاندانوں کے شجرے اور ان کے متعلق معلومات ہیں۔ دوسرے حصے میں دور وسطی کے آٹھ ہندو اور مسلمانوں کا تذکرہ ہے۔ تیسرے میں دور حالیہ کے تین خاندانوں کا اور چوتھے میں نوابان کرناٹک، سدھوٹ اور ساونور کا تذکرہ ہے۔ ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جو بجائے خود دکن کی ایک مختصر سی تاریخ ہے۔ ۲۳۸ صفحات قیمت ۱۲/

غزل

تری زُلف سے دل کو بہلا رہا ہوں
جنوں کی حدوں سے بڑھا جا رہا ہوں

پھر ان سے ہے اصرارِ جلوہ نمائی
پھر افسانۂ طور دُہرا رہا ہوں

یہ مہکی سی زلفیں، یہ آنچل معطر
انہیں نکہتوں میں بسا جا رہا ہوں

کوئی حد بھی ہے میری گستاخیوں کی
تری سمت نظروں کو دوڑا رہا ہوں

جدھر تیری موجِ نظر بہہ رہی ہے
اسی سمت بہتا ہوا جا رہا ہوں

ترستی نگاہوں کا اف رے تقاضا دم
وہ گھبرا رہے ہیں، میں گھبرا رہا ہوں

مری آنکھ سے دُور لہرانے والے
قریب اور تجھ سے ہوا جا رہا ہوں

یہ کس کی شرابی نگاہیں تھیں تو بہ
بہک کر زمانے کو بہکا رہا ہوں

علیؔ نام اسی کا محبت ہے شاید
جوانی میں اک کیفِ سا پا رہا ہوں

علی احمد علیؔ

غزل

قصۂ غم ہوا جاتا ہے تمام آج کی رات
آ بدل دے مری ہستی کا نظام آجکی رات

نغمے بیتاب اثر، جلوۂ رنگیں بے باک
میرے حصہ میں ہے وہ عرش مقام آجکی رات

پردہ درِ لغزشِ سر مستیٔ صہبا کی قسم
ذرے ذرے میں ہے وہ منظرِ عام آج کی رات

گنگناتے ہوئے چشمے ہیں فضائیں مے پاش
کیف بردار ہے عالم یہ تمام آج کی رات

تارے قسمت کے گرے پڑتے ہیں پابوسی کو
میری خاطر ہے کوئی محوِ خرام آج کی رات

مرتعش ہے مرا ہر تارِ ربابِ ہستی
ان کی نظروں میں ہے الفت کا پیام آجکی رات

گدگداتی ہوئی ہر موجِ صبا آتی ہے
نظروں نظروں میں ہے پیغام و سلام آجکی رات

چھا گیا ہے کوئی اس طرح مری ہستی پر
حسن مجبور ہے جیسے پسِ جام آج کی رات

کیوں عزیزؔ آپ ہوئے جاتے ہیں اتنے بیتاب
کیا کوئی آنے کو ہے مست خرام آج کی رات

عزیز احمد عزیزؔ

اردو زبان کے مسائل کا سلسلہ

زبان اور ادب کی ضرورت و اہمیت

انسان طبعاً اجتماعی ہے اس لئے وہ مجبور ہے اس بات پر کہ بنی نوع انسان کے ساتھ اشتراکِ عمل کرے۔ پھر چونکہ اجتماعی زندگی کا انحصار باہمی میل جول پر ہے اس لئے یہ بات کسی فردِ واحد کے لئے ممکن ہی نہیں کہ کارزارِ حیات میں اپنی جملہ ضروریاتِ زندگی کو بیرونی امداد کے بغیر پورا کر سکے یا اپنے عیوب اور خامیوں کی بغیر کسی کے مشورہ کے اصلاح کر سکے۔ زندگی کی مشکلات گوناگوں اور ان کی تعداد غیر محدود ہے۔ اور انسان کی اہمیت کم۔ اس لئے وہ بے بس، و مجبور رہتے۔ خارجی امداد کے بغیر وہ اپنی تمام ضروریات کو پورا کر ہی نہیں سکتا ہے۔ آپ دیکھیں اور غور کریں کہ فطرت نے نر اور مادہ ہر دو کو نامکمل پیدا کیا ہے۔ ان دونوں کے ملاپ کے بعد ہی ان کی تکمیل اور بقائے زندگی ممکن ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ہمارے مقاصد اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب ہمارے جوشِ عمل میں ابنائے جنس کی امداد شامل ہو۔ ورنہ ہم ناکامیوں اور نامرادیوں کا تختۂ مشق بن کر رہ جائیں گے۔ اور اگر ہم اجتماعی زندگی کے اصول کو نظر انداز کر دینے کی غلطی کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علٰحدہ بنائیں تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانے کے علاوہ ہم میں اور حیوان میں بہت کم فرق باقی رہ جائے گا اور ہم بھی حیوانوں کی طرح مقام و قیام سے بے پروا ہو کر سر فلک پہاڑوں، خوفناک جنگلوں اور مہیب بیابانوں میں بے خانماں برباد پھرنے لگیں گے۔

مشاہدہ اور تجربہ سے ظاہر ہے کہ حیوان بھی ایک حد تک اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ انفرادی طور پر اپنی جملہ ضروریاتِ زندگی کو پورا نہ کر سکنے کے علاوہ بقائے حیات اور اپنے سے زیادہ طاقتور دشمن کے حملوں سے بچنے کے لئے بھی انہیں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں اور جماعتوں میں رہنا پڑتا ہے۔ لیکن اس نوع کی زندگی کو صحیح معنوں میں اجتماعی زندگی نہیں کہا جا سکتا۔ علاوہ ازیں حیوان اجتماعی زندگی کے اصول، غرض و غایت اور فوائد سے بھی واقف نہیں۔ اسی وجہ سے وہ اپنی عمر ضائع کرتے ہیں اور ان کی زندگی میں خود غرضی کی بھیانک جھلک کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ اندریں حالات تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اجتماعی زندگی ایک سایۂ رحمت ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہماری لامحدود ذاتی خواہش پوری نہیں ہو سکتی ہیں۔ اور نہ ہم اپنے متعدد شہری مقاصد کے لئے جامۂ عمل مہیا کر سکتے ہیں۔ اب جس طرح شہری زندگی کے لئے انسان اجتماعیت چاہتا ہے بالکل اسی طرح وہ اس زندگی کے لئے اس چیز کو بھی حاصل کرنا چاہتا ہے جو اس کے اور ابنائے جنس کے درمیان دوستی کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔ اس "ذریعہ" کو زبان کہا جاتا ہے۔ جس کی وساطت کے بغیر ایک انسان کسی دوسرے انسان سے طالبِ امداد ہونا تو درکنار وہ اپنی ضروریات، حاجتوں اور دلی خیالات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ شیر خوار بچوں کی حالت پر نظر ڈالیے۔ کہ وہ زبان کے بغیر کس قدر بے بس و مجبور ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی وساطت سے ہم ایک دوسرے کے خیالات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور ان سے اپنی اپنی ضروریات کے مطابق فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ملکوں اور تمدنوں میں رابطہ پیدا کر سکتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ اگر بنی نوعِ آدم کو اظہارِ خیال میں "زبان" کی مدد حاصل نہ ہوتی تو پھر اسے اشرف المخلوقات کہنا صحیح نہ ہوتا۔ اور اس میں اور حیوان میں امتیاز کرنا ناممکن ہو جاتا۔

انسان سب سے پہلے اپنی ضرورتوں کو ادراک سے پیدا کرتا ہے، اس کے بعد ان کو مکمل کرتا ہے۔ اور اس کی ذہنی قوت کی تکمیل عمر کا تہائی حصہ گزر جانے کے بعد ہو جاتی ہے۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے جس ذریعہ سے وہ امداد حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے، اس کا نام "زبان" ہے اور زبان کی شائستہ، پُر اثر اور ترقی یافتہ صورت کو "ادب" کہا جاتا ہے۔ ایک قوم کا ادب آئینہ دار ہے اس کی تمدنی، معاشرتی، اقتصادی

اخلاقی اور مذہبی ترقی کا کسی قوم کے ادب کے مطالعہ سے اس کی پوری تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ ہم اس کے مطالعہ سے گزشتہ قوموں کے کارنامے، زمانۂ ماضی کے واقعات، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب، ان کے نشو و نما اور ارتقاء کے طریقے معلوم کر سکتے ہیں۔ ماضی کی تاریخ اور ہولناک پہلوؤں سے عبرت حاصل کر سکتے اور روشن صورتوں سے ترقی کے اصول سیکھ سکتے ہیں۔

ادب کی ضرورت اور اہمیت کا ہر صاحبِ فکر کو احساس ہے کیونکہ ادب ہی کی وساطت سے زمانۂ ماضی کی قوموں اور ان کی تہذیب و تمدن کے عروج و زوال، ان کے اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی اصولوں کی کیفیت عہد بہ عہد اور نسل بہ نسل معلوم ہو سکتی ہے۔ مثلاً یونانی تہذیب و تمدن کا روم میں داخلہ اور وہاں سے ایشیائے کوچک تک وسعت پھر وہاں سے شام، ایران اور عرب پر چھا جانے کا حال صرف یونانی ادبیات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی پتہ لگتا ہے کہ اہلِ یونان کی زبان صرف اپنے ہمہ گیر ادب کی وجہ سے اس قدر وسعت، شہرت اور قبولیت حاصل کر سکی تھی۔ کیونکہ اہلِ یونان اپنی ادبیات کی مدد سے غیر قوموں کو آسانی کے ساتھ اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کی خوبیاں ذہن نشین کرا دیتے تھے۔

اہلِ عرب کے عروج کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے تمدن اور روحانی عرفان کو نہ صرف براعظم ایشیا بلکہ کرۂ ارض کے تین چوتھائی حصہ میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی اہم وجہ یہی تھی کہ ان کی زبان فصیح اور بلیغ تھی اور زبان و ادب کا بہترین نمونہ قرآن بھی ان کے پاس تھا۔ ادبیاتِ عرب نے سب سے پہلے شام، ایران اور نواحی ملکوں کو مسخر کیا۔ اور چونکہ فلسفہ و الہامات اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت ادبیاتِ عرب کے رنگین اور خوشنما لباس میں کی گئی تھی، اس لئے ذہین اور صاحبِ فکر لوگ بہ آسانی اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اگر اہلِ عرب کی زبان ادبی طاقت سے محروم ہوتی تو اسلام کو اس قدر عروج اس آسانی اور اس سرعت کے ساتھ حاصل نہ ہوتا۔ اسی طرح اہلِ یونان کا فلسفہ اور ان کا طریقۂ علاج صرف یونانی زبان کی ادبیات کی ہمہ گیری اور لطافت کی وجہ سے آج نہ صرف زندہ ہے بلکہ بدستورِ سابق مقبول بھی ہے۔ یونانی طب اور فلسفہ نے پہلا ایران میں روایتوں اور حکایتوں کی صورت اختیار کی پھر خلافتِ عباسیہ کے عروج کے زمانہ میں جب کہ شہر بغداد دنیا کے جملہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا ہوا تھا طبِ یونانی اور فلسفہ کو نہ صرف ملکِ عرب میں داخل ہونے کا موقع ملا بلکہ شہر بغداد کو اس کی جنم بھومی ثانی بننے کا فخر حاصل ہوا اور یہاں اس نے اس قدر مضبوطی سے اپنی جڑیں جمالیں اور اس قدر ترقی کی کہ آج بھی ہمیں علمائے اسلام کے مباحثوں اور علمی مقالات میں فلسفۂ یونان کی جھلک نظر آتی ہے۔

جس طرح ایک تناور درخت کی بہت سی شاخیں اور ٹہنیاں ہوتی ہیں اسی طرح ادبیات کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً تاریخ، شاعری، افسانہ، ناول، صحافت وغیرہ اور سب کے مطالعہ سے ایک قوم کے خاص عقائد، زمانہ کے بنیادی امتیازات اور ہر دور کے اجتماعی و انفرادی اصولوں کی کیفیت بہ آسانی معلوم کی جا سکتی ہے۔ مثلاً عرب کے زندۂ جاوید شاعر امرأ القیس کے پرجوش قصائد کے مطالعہ سے آج بھی ہم شجاع اور جانباز عربوں کی جنگجو زندگی کے تمام پہلو معلوم کر سکتے ہیں۔ عہدِ عباسیہ کے مشہورِ عالم شاعر متنبی کے حکیمانہ قصائد کا مطالعہ کرتے وقت خلفائے عباسیہ کی عظمت و جلالت اور اس زمانہ کی تہذیب و تمدن کا نقشہ نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ ہندوستانی راجاؤں کے درباری گویوں کے گیتوں کے مطالعہ سے اس دور کے رسوم و رواج، طریقۂ جنگ و جدل اور طرزِ معاشرت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی مقدس کتابیں رامائن، مہابھارت اور وید اپنے اپنے زمانہ کے تمدن اور اصولِ زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ اردو کے پہلے حقیقت نگار شاعر نظیر اکبرآبادی کی نظموں کے مطالعہ سے ہمیں اپنے دیس کے

میلوں ٹھیلوں اور رسم و رواج کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ان کی شاعری انسانیت کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ فرانس کے زندۂ جاوید شاعر اور ادیب والٹیر کے کلام سے اہل فرانس کی غلامانہ افسردگی کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ یونان کے قدیم شعرا کے اشعار اہل یونان کی مسرت سے لبریز زندگی کا روح پرور عکس ہماری زندگیوں پر ڈالتے ہیں۔ الغرض شاعری ہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر زمانہ اور ہر ماحول کی سیاسی و اجتماعی زندگی اور طرز معاشرت و عقائد کی جھلک دیکھی جاتی ہے۔ کیونکہ ابتدائے آفرینش سے ہی شاعری ہر دور اور ہر ماحول میں اپنے قومی مقاصد کی مطیع رہی ہے اور اجتماعی ضروریات کے مطابق اپنے آپ کو حیات تازہ سے آشنا کرتی رہتی ہے۔

دنیا کا اصول ہے کہ اگر کوئی قوم دوسری قوم کے ذہن و دماغ پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھانا چاہے تو اس کے لئے لازمی ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں سب سے پہلے اپنا ادب پیش کرے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنی تہذیب و تمدن، اخلاق اور دیانت کی برتری کا حال مخالف کے ذہن نشین نہیں کرا سکتی ہے۔ علمبرداران اسلام اپنی تہذیب کا اثر دنیا کی دیگر قوموں کی تہذیبوں پر محض اس لئے آسانی کے ساتھ ڈال سکے کہ اہل عرب کی زبان اور ادبیات میں اقوام عالم کو مسخر کرنے کا جوہر موجود تھا۔ اسی طرح سرکار دوجہاں کی پیدائش سے قبل عیسائیت کو عرب اور دوسرے ملکوں میں جو عروج حاصل ہوا وہ عبرانی زبان اور اس کے ادب کی وجہ سے تھا جس کی دلفریب فصاحت اپنے سامعین اور ناظرین کی روح کو اپنا متوالا بنا چکی تھی۔ کیونکہ عربی اور عبرانی زبانوں کو دلکش اور جامع الفاظ کا جو سرمایہ حاصل ہے وہ دوسری زبان کو انتہائی وسعت کے باوجود نصیب نہیں ہو سکا۔

زبان کی دلکشی مذہب اور تمدن کو مقبول و محبوب بنانے میں جس قدر کامیاب ہو سکتی ہے اس کا اندازہ خارجی شہادتوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر مرکز اسلام اور دنیا کے مسلمانوں کے درمیان لسانی اتحاد کا واسطہ نہ ہوتا تو اسلام کی تعلیم اخوت دلائل کی حد سے بڑھ کر عملی جامہ نہ پہن سکتی، لیکن عربی کی ہمہ گیر مقبولیت نے شریعت اسلام کے احکام پر افہام و تفہیم کے لئے جو وحدت پیدا کردی ہے اس کی بدولت مسلمان مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ایک ہی تسبیح کے دانے بن چکے ہیں۔ علاوہ ازیں عربی کے الفاظ ...... کی دنیا نے اسلام کی دیگر زبانوں میں اس حد تک ملاوٹ ہو چکی ہے کہ ہر ادیب کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مجبوراً عربی زبان کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔

یہ عربی زبان ہی کی لطافت کا ایک اثر ہے کہ ظہور اسلام سے تقریباً تین صدی بعد جب مسلمانوں نے براعظم ایشیا و یورپ کے ایک بڑے حصہ کو فتح کرلیا تو ہر ملک کے علماء کو اپنی مکمل زبان کی موجودگی میں بھی عربی زبان میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھانی پڑیں۔ مثلاً امام غزالی اور ابونصر فارابی وغیرہ علماء ایرانی النسل ہیں لیکن ان کا شمار عربی مصنفین میں ہوتا ہے۔ اسی طرح انگلینڈ کے متعدد مشہور و معروف حکماء نے اپنے فلسفہ کے حقائق لاطینی زبان میں پیش کئے، اسی وجہ سے آج دنیا کو ان کی وطنیت پر بھی شک ہے۔ ایرانی علما نے چونکہ اپنی تصانیف میں عربی کو ذریعۂ تحریر بنالیا تھا اس لئے ایرانی ادبیات کا متوقع عروج بھی عربی کے کمال کا ایک حصہ بن کر رہ گیا۔

علمائے السنہ کا قول ہے کہ جس قوم کا ادب غیر مکمل ہے اس کی امتیازی تہذیب و تمدن اور مذہبی روایات بھی دیرپا نہیں ہو سکتی ہیں۔ قوموں کے سیاسی اور مذہبی عروج و زوال کی داستان پر تاریخ کی روشنی میں غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاتح قوم مفتوحہ ملک کے باشندوں کی ذہنیت کو غلام بنانے کے لئے وہاں اپنی زبان اور ادب کو عروج دینا شروع کر دیتی ہے کیونکہ جس وقت محکوموں کے ذہن پر حاکم کی

زبان اور ادب کا احترام قائم ہو جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اہل زبان کے متعلق بھی ان کے دل میں محبت پیدا ہو جاتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ جو کام چشم زدن میں سیکڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے والی توپوں سے نہیں ہو سکتا ہے وہ زبان اور ادب کی وساطت سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔

ہم جب کسی محکوم قوم کی غلامی کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں حاکموں کی زبان اور ان کی ادبیات غلامی کا شوق بن کر رہ گئی ہے۔ حاکموں کی زبان اور اس کی ادبیات کا ان پر اس قدر اثر پڑا ہے کہ بظاہر اس کی گرفت سے رہائی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ کاش وطنیت کا ہنگامہ بلند کرنے والے انسان غلامی کی حقیقی وجہ یعنی وطنی زبان کے انحطاط کے اسباب پر غور کریں۔ اس دعوے کی تصدیق کے لئے یورپین مستعمرات مثلاً کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ کی لسانی اور ادبی حیثیت پر غور کیجئے تو آپ پر ظاہر ہوگا کہ یہ ملک فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے فرانس اور انگلستان کی مدنیت، تعلیم اور اخلاق پر وطنی روایات قربان کر چکے ہیں۔ ان میں غیروں کی زبان مقبول ہونے کی وجہ سے اپنی زبانوں کی حفاظت کے لئے کوئی ذہنی اور عملی طاقت موجود نہیں۔ اگر یہ ملک اسی طرح انگریزی اور فرانسیسی ملکوں کے غلام رہے تو ان کی اپنی زبانیں آہستہ آہستہ بالکل فنا ہو جائیں گی۔

غلام ہندوستانیوں اور بالخصوص ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کی غلامانہ ذہنیت بھی بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے، ان لوگوں نے نہ صرف انگریزی لباس اور انگریزی طرز بود و باش کی تقلید کرنا اپنا شعار بنالیا ہے بلکہ وہ اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتے ہوئے شرم و ذلت محسوس کرتے ہیں۔ انھیں اپنی وطنی زبان اور اس کے ادب سے نہ صرف کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ وہ ایک حد تک اس کی ترقی کی راہیں مسدود کرنے کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ان کو اپنی انگریزی دانی پر فخر ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ وطنی زبان کو مٹا کر ملک میں انگریزی رائج کر دیں۔ اس تاریکی میں صرف مملکت حیدر آباد میں روشنی کی ایک شعاع نظر آتی ہے، جس کے دور اندیش اور حساس دل کے مالک تاجدار سلطان العلوم اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نے اپنی مادری زبان اور اس کے ادب کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کر کے اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیدیا ہے اور اس طرح اپنی اس قومی اور وطنی زبان کو فنا ہو جانے سے بچا لیا ہے۔

حقیقت السنہ پر نگاہ ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان اور حکومت کا آپس میں لازم اور ملزوم کا تعلق ہے، جب ہندوستان پر آریاؤں کی حکومت تھی تو سنسکرت کو فروغ حاصل تھا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہر شہر اور ہر قصبہ عربی و ایرانی علوم اور معارف کا مرکز بن گیا۔ اور جب ہندوستان میں برطانوی راج قائم ہوگیا تو ہر طرف انگریزی کا چرچا ہوا اور آج بیچاری سنسکرت تو ایک مردہ زبان ہو کر رہ گئی ہے عربی اور فارسی کا ذکر بھی سوائے چند مذہبی درسگاہوں کے اور کہیں بہت کم سننے میں آتا ہے۔

جو قوم اپنی طویل غلامی کی سیاہی کو مستقبل میں آزادی کی روشنی سے منور کرنا چاہتی ہے اس کا فرض اولین یہی ہے کہ سیاسی حقوق کا ہنگامہ برپا کرنے سے پہلے حاکم قوم کی زبان سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی مادری زبان کو ترقی دے۔ اگر کسی کی زبان میں فاتحانہ قوت موجود ہے تو وہ آزادی کی دیوی سے بھی ہمکنار ہو سکتا ہے، ورنہ انسانیت بھی خطرہ میں ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان اپنی مادری زبان اور اس کے ادب کے تحفظ کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں اور ہندی کی روز افزوں ترقی سے خائف ہیں۔ کیونکہ ان کے دور اندیش اور

صائب الرائے حضرات نے محسوس کر لیا ہے کہ اگر برادرانِ وطن اردو کو مٹا کر ہندی کو قومی زبان بنانے میں کامیاب ہو گئے تو اس کا صاف اور واضح الفاظ میں یہی مطلب ہوگا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کی بجائے ہندوؤں کی ذہنی غلامی کرنی پڑے گی، کاش اردو داں حضرات اپنی زبان اور اس کے ادب کی حفاظت کی ضرورت کو محسوس کر کے اسے ترقی دینے اور خادمانِ زبان کی ہمت افزائی کرنے کی طرف متوجہ ہوں، کیونکہ اسی صورت میں ہندوستان کے مسلمان اپنی انفرادی ہستی کے قیام و بقا کا انتظام کر سکیں گے۔

زبان کی ضرورت اور اہمیت پر سطور بالا میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ قوم کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کی ساری بنیاد زبان پر قائم ہوتی ہے، ہمارے خیالات و افکار اور اعمال و افعال کا راستہ زبان ہی متعین کرتی ہے اگر آج جزائر برطانیہ کی سرکاری اور دفتری زبان انگریزی کی بجائے عربی کر دی جائے تو چند سال کے اندر اندر اس ملک کی تہذیب اور معاشرت میں نمایاں تغیر نظر آنے لگے۔ ہندوستان میں انگریزی زبان کے رواج پذیر ہونے کی وجہ سے اس کا ہماری معاشرت اور تہذیب پر جو خاموش گر بیحد نمایاں اثر پڑا ہے وہ آج ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے اگر اب بھی مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوئے اور انھوں نے اردو کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس نہ کیا تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ زبان جو آج کل بنائی جا رہی ہے پورے طور پر مسلط ہو جائے گی اور وہ زمانہ بہت قریب ہے جب کہ اردو حرفِ غلط کی طرح فنا ہو جائے گی اور کوئی تعجب نہیں کہ عنقریب بقول شاعر اس کی یہ حالت ہو جائے کہ ؎

سنا ہے رہ نہ جائے گا کہیں پرسانِ حال اس کا ۔۔۔ وہ اردو جو کبھی ممتاز تھی ساری زبانوں میں

وہ جس ٹہنی پہ بیٹھے ہیں اسی کو کاٹے جاتے ہیں ۔۔۔ یہ نادانی کی صورت کیوں ہوئی پیدا سیانوں میں

غرض اس ملک کی پیاری زباں کا اب خدا حافظ

کہ "یس" اور "نو" کا چرچا ہو رہا ہے نوجوانوں میں

غور کیجئے کہ اگر ہندوستان کے متحد جمہوری نظام حکومت میں ہندو اپنی اکثریت کی وجہ سے اس ہندی کو جو آج کل بنائی جا رہی ہے سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت دیدیں تو اس کے لازمی اور بدیہی معنی یہ ہوں گے کہ ہندو تہذیب و تمدن کو ہندوستان میں رائج کیا جا رہا ہے اور بہت جلد ہم یہ بھی بھول جائیں گے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ملاپ سے ہندوستان میں ایک مشترک زبان بنی تھی۔ اور یہی مشترک زبان ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ قومیت کا سنگ بنیاد تھی۔ افسوس ہے کہ آج اسی مشترک زبان کو اردو کا نام دیکر صرف مسلمانوں کی مخصوص زبان کہا جا رہا ہے اور اس کی جگہ ملک کی عام زبان خالص سنسکرتی ہندی کو قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اشتراک و اتحاد کا جھوٹا نام لیکر مسلمانوں کو خالص ہندو معاشرت قبول کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیکر اس کی تعلیم کا جداگانہ انتظام کر دینا یا کتب خانوں میں اردو کی کتابیں فراہم کر دینا یا اس قسم کی چند رعایتیں جن کا بہت زور و شور کے ساتھ پرچار کیا جا رہا ہے مسلمانوں کے لئے بیکار ہیں۔ اگر ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت قائم ہو جاتی ہے اور اس جمہوری حکومت میں ہندو اکثریت ہندی رائج کر دے تو پھر اردو کی حیثیت ہی کیا رہ جائے گی، اس صورت میں نہ تو اردو میں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت باقی رہے گی اور نہ اس کے تحفظ کا کوئی مطالبہ کرے گا۔ اس وقت اردو کی وہی حیثیت رہ جائے گی جو آج عربی اور فارسی کی ہے۔

ان دونوں زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہر اسکول اور ہر کالج میں ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ کتنے فیصدی مسلمان طلبہ ان زبانوں کی تعلیم حاصل کرنا ضروری خیال کرتے ہیں؟

- مسلمانوں کو اردو کے تحفظ پر اصرار اس لئے نہیں کہ یہ ان کی مذہبی زبان ہے بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ اردو ہندو اور مسلمان کی تہذیب اور معاشرت کے ملاپ کی نشانی ہے۔ یہ ایک ایسا نشان راہ ہے جس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ باہمی اشتراک و اتحاد کی راہ میں ہم نے کتنی منزلیں طے کی ہیں۔ اس لئے اگر آج اردو کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے سے کسی کو انکار ہے تو اس کے صاف اور کھلے ہوئے معنی یہی ہیں کہ مسلمانوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ آنے والے ہندوستان کی مشترک قومی زبان اور تہذیب کے موقع میں ہم تمہیں تمہارا جائز حق دینے کے لئے تیار نہیں۔ ہم تم سے متاثر ہونا نہیں چاہتے صرف تم کو متاثر کرنا چاہتے ہیں ظاہر ہے کہ مسلمان اس حیثیت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے کیونکہ جس زبان کو ہندو اکثریت ملک میں رائج کرنا چاہتی ہے اس میں عربی اور فارسی کے زود فہم اور کثیر الاستعمال الفاظ کو بھی خارج کر کے ادق قطعاً ناقابل فہم سنسکرت کے الفاظ کو ٹھونسا جا رہا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر اس نوع کی زبان ملک میں رائج ہو گئی اور مسلمانوں کو اس کے اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا یا مجبور ہونا پڑا تو وہ عربی اور فارسی سے قطعاً بیگانہ ہو جائیں گے اور اس کے نتیجہ کے طور پر ان کو اسلامی دنیا سے دور کا بھی واسطہ نہ رہے گا۔ وہ مرکز سے الگ ہٹ کر اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اندریں حالات مسلمانوں کے دور اندیش اور صائب الرائے حضرات کا فرض ہے کہ وہ ابھی سے اس خطرہ کو محسوس کر کے مسلمانوں کو اس سے بچانے کے لئے کوشش شروع کر دیں۔ ورنہ پانی سر سے اونچا ہو جانے کی صورت میں کوئی تدبیر کارگر نہ ہو گی۔

سید محمود مورخ

سرگزشت

مرغزاروں میں چمن زاروں میں کہساروں میں
چرخ کے نور میں ڈوبے ہوئے نظاروں میں
شب تاریک کی بہکی ہوئی تنہائی میں
شب مہتاب کی بہکی ہوئی رعنائی میں
شفقِ شام کی رنگینیٔ و سرشاری میں
صبحِ پر کیف کے انوار کی بیداری میں
حسنِ معصوم کو ہر رنگ میں دیکھا میں نے!

۲

دیدۂ شوق سے اشکوں کی روانی نہ گئی
نہ گئی دل کی تڑپ، شعلہ فشانی نہ گئی
تیر پر تیر برستے رہے مجھ پر برسوں
سنگ دل دور سے ہنستے رہے مجھ پر برسوں
یورشِ غم بھی سہی، رنج و محن بھی دیکھے
رہ الفت میں کئی دار و رسن بھی دیکھے
اپنے محبوب کو ہر حال میں چاہا میں نے!

۳

بزمِ امکاں میں رہا ظلمتِ باطل کا ہجوم
چھپ گئے خوف کے مارے مہ و خورشید و نجوم
ہیبتِ اہرمنی چار طرف طاری تھی
مردِ حق کوش پہ یہ رات بہت بھاری تھی
حق پرستوں کے لئے خنجرِ خونخوار کہیں!
زہر کا جام کہیں، نار کہیں، دار کہیں!
پرچمِ حق و صداقت کو اٹھایا میں نے!

اثر صہبائی

انوار ۔ جناب علی اختر صاحب کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے ۔ جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شایع کیا گیا ہے ۔ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجرباتِ زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں۔ بلکہ حیات اور شباب پر اُن کی نظر بہت وسیع ہے ۔ ان کا کلام ہندوستان کے بلند پایہ معیاری رسالوں مثلاً نگار، ہمایوں ادبی دنیا اور شاہکار وغیرہ میں شایع ہو کر کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ قیمت عہ

ابو الفتح خاں شمس الامراء

ابوالفتح خاں نام، تیغ جنگ، شمس الدولہ، شمس الملک اور شمس الامرا خطابات ہیں۔ شمشیر بہادر نواب ابوالخیر خاں امام جنگ کے صاحبزادہ ہیں۔ بمقام برہان پور پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار کے انتقال کے بعد اپنی جاگیر لاڑشاکر میں گوشہ نشین تھے۔ جب نواب صلابت جنگ ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء میں برہان پور تشریف لے گئے تو آپ موصوف کے ہمراہ ہوگئے۔ چنانچہ نواب صلابت جنگ نے آپ کو دربار کے امیروں میں شامل فرمالیا۔

۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں جب رکن الدولہ وزیر اعظم کا انتقال ہوگیا تو اس خدمت پر نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے آپ کا انتخاب کیا۔ لیکن آپ نے یہ خدمت منظور نہ کی اور کہا کہ "سپاہی پیشہ لوگوں کو ملکی معاملات سے کیا کام"۔ اس جواب کے بعد آپ ہی کی رائے سے نواب صمصام الملک بہادر وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں اعلیٰ حضرت آصف جاہ ثانی نے آپ پر خاص توجہ شاہانہ مبذول فرمائی اور آپ دس ہزار فوج کے حاکم بنائے گئے جو جمعیت پائیگاہ کے نام سے موسوم ہوئی۔

۱۷ رجمادی الآخر ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء میں آصف جاہ ثانی نے آپ کو خطاب تیغ جنگ، شمس الدولہ اور پنج ہزاری منصب کا اعزاز عطا فرمایا اور ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء میں خطاب شمس الملک اور ہفت ہزاری منصب مع علم و نقارہ اور پالکی جھالردار سے سرفرازی ہوئی۔ یہ ایسا منصب ہے جو شاہنشاہ اکبر کے زمانے میں صرف شاہزادۂ دانیال کو سرفراز ہوا تھا۔ ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء میں جب حضور آصف جاہ ثانی نے قلعۂ نرل و مگنتیال کا محاصرہ فرمایا تو آپ بھی ہمراہ رکاب تھے اور جب ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء میں ٹیپو سلطان نے قلعۂ بادامی کے رنج میں ایک فوج کثیر کے ساتھ قلعۂ ادھونی کا محاصرہ کرلیا تو اس خبر کو سن کر آصف جاہ ثانی خود بہ نفس نفیس اس طرف متوجہ ہوئے لیکن شمس الملک ابوالفتح خاں نے باادب عرض کیا کہ "حضور عالی تکلیف نہ فرمائیں۔ اس تابعدار کو اجازت ہو"۔ چنانچہ بحصول اجازت آپ مع اعظم الامرا ارسطو جاہ مدارالمہام فوج جرار کے ساتھ ادھونی پہنچے اور ٹیپو سلطان کو بالآخر ترک محاصرہ پر مجبور کیا۔ چونکہ آپ کی جاگیر کی آمدنی فوجی اخراجات کے لئے مکتفی نہ ہوتی تھی جس کی وجہ خزانۂ شاہی سے ایک معتدبہ رقم انھیں وقتاً فوقتاً مرحمت ہوا کرتی تھی۔ اس لئے آپ کی کارگزاریوں کی بناء پر خوش ہوکر نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء میں آپ کو شمس الامراء کا گراں قدر خطاب اور نہ ہزاری منصب، ماہی و مراتب، سراپا جواہر مع لڑی و لشکن عطا فرمایا اور فوجی اخراجات کے لئے بجائے تیس لاکھ کے چالیس لاکھ کی جاگیرات مرحمت فرمائیں جس سے پائیگاہ کی ابتدا ہوئی۔

پائیگاہ کی جاگیرات ۱۲۷۳ دیہات اور مواضعات پر شامل ہیں جو مملکت آصفیہ کے اضلاع بیدر، ناندیڑ، عثمان آباد، گلبرگہ، میدک، اطراف بلدہ اور نظام آباد میں تقسیم ہیں۔ اس کے علاوہ چند مواضعات اورنگ آباد، ورنگل، محبوب نگر، نلگنڈہ اور آصف آباد میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کا مجموعی رقبہ (۱۳۳۴) مربع میل ہے۔ پائیگاہ کی یہ فوج سرکار نظام کی خانگی فوج یا شاہی محافظ کی حیثیت رکھتی ہے۔

غرۂ رجب ۱۲۰۴ھ/۱۷۹۰ء روز یکشنبہ آپ کو سِل کا عارضہ ہوا اور اسی اشتداد مرض میں بحالت سفر پانگل کے مقام پر ۲۵ ربیع الاول ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء کو آپ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی نعش بلدۂ حیدرآباد لائی جاکر بیرون شہر درگاہ حضرت سید حسین برہنہ شاہ صاحبؒ میں سپرد خاک کی گئی۔ آپ کے انتقال پر حضور میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کو اس قدر رنج ہوا کہ تین روز تک خاصے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور اربعین تک سماع نہ فرمایا۔ آپ کے انتقال پر آپ کے قابلِ فخر سپوت نواب محمد فخر الدین خاں جو اس وقت دس سال کے تھے اور جو تاریخ میں شمس الامرا امیر کبیر کے نام سے مشہور ہیں جانشین ہوکر امیر پائیگاہ کہلائے۔

سید مراد علی طالع

تاریخ تشکیل شہری (دورِ جدید)

سویڈن یورپ میں جدید تشکیل شہری کا دور گزشتہ ستر سال سے شروع ہوتا ہے، جس کا استقبال پہلی مرتبہ سویڈن میں ہوا۔ جہاں سنہ ۷۴ء میں تشکیل شہری کا قانون دوسرے ملکوں سے پہلے نافذ کیا گیا۔ یوں تو تقریباً دو سو سال قبل ہی سے یہاں شہروں کے پھیلاؤ کی روک تھام اور درستگی کا عمل برابر جاری تھا، لیکن قانون کے نفاذ کے بعد سویڈن کی تمام بلدیات پر لازمی کروانا گیا کہ وہ اپنے اپنے شہروں اور قصبات کے لیے تشکیل شہری کی تجاویز مرتب کریں جو راستوں اور فروخت گاہوں اور شہر کی دیگر عام عمارتوں پر مشتمل ہوں۔ اس کی تقویت میں مزید دوسرا قانون سنہ ۱۹۰۷ء میں جاری ہوا جس کے مطابق شہری بلدیات کو ان امور کے کامل اختیارات دئے گئے۔ مثلاً جملہ آبادیوں اور غیر آباد رقبوں کی روک تھام اور ان کو حسب ضرورت معاوضہ دے کر بلا کسی رکاوٹ کے حاصل کرنا۔ فی ایکڑ مکانات کی تعداد کا تعین کرنا عمارات کی بلندی اور نوعیت کا قیام راستوں کی چوڑائی اور داغ بیل کا مقرر کرنا وغیرہ۔

اس قانون کے نفاذ کے بعد اسٹاک ہوم (STOCKHOLM.) اور کرسٹن برگ (KRISTINE BERG) میں بیسیوں تجاویز روبہ عمل لائی گئیں۔ خصوصاً غربا، اور متوسط درجہ کی رہائش گاہوں کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ انیسویں صدی کے آخر تک سویڈن میں تشکیل شہری کی تجاویز شطرنج نما طرز کی ہوتی تھیں جن میں جائے وقوع کی جغرافی حالت کو نظر انداز کیا جاتا تھا لیکن موجودہ زمانہ کی تجاویز میں زمین کے نشیب و فراز اور سطحی کیفیات کا بخوبی لحاظ رکھا جاتا ہے۔

فرانس فرانس میں اٹھارویں صدی کے آخری زمانہ سے قرن وسطیٰ کے تنگ و تاریک راستوں کی درستی اور توسیع کا کام آغاز ہوا سنہ ۱۷۹۰ء میں ورنیکٹ (VERNIQUET.) فرانس کے ماہر تعمیر نے نپولین اول کے زمانے میں پیرس کی آرائش کی تجاویز مرتب کیں جو تقریباً ساٹھ جدید سڑکوں پر مشتمل تھیں اور جن میں سے اکثر و بیشتر کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ نپولین سوم کے زمانے میں بیرن ہوسمان نے ان تجاویز کو بحال رکھتے ہوئے مزید قدیم راستوں کی کشادگی کی تجاویز بھی شامل کیں۔ سب میں پہلے، شہر کے مرکزی راستوں کی ترتیب میں مشہور عمارات کو مربوط کیا گیا اور حدود نظر کے دلچسپ نقاط پیدا کئے گئے۔ عوام الناس کے لئے تفریح گاہیں، کھلے مقامات، اور صحت بخش رہائش گاہیں فراہم کی گئیں۔ تقریباً پانچ کروڑ پاؤنڈ کے مصارف سے پیرس کی بلدی تجاویز کو اس اعلیٰ پیمانے پر مکمل کیا گیا کہ اس کی نظیر دنیا بھر میں نہیں ملتی۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں حکومت نے دس ہزار سے زیادہ آبادی والے شہروں پر قانوناً لازم کر دیا کہ وہ تشکیل شہری کی تجاویز مرتب کریں اور مزید ان شہروں کے لئے جو آگ، طوفان، زلزلہ اور جنگ سے تباہ ہوں اسی طرح تجاویز مرتب کرنے کے احکام نافذ کئے گئے تاکہ شہروں کی ترتیب ایک منظم خاکہ پر کی جائے۔

امریکہ امریکہ میں اس نئی تحریک کی ابتدا فلاڈیلفیا کی بنیاد کے بعد شروع ہوئی جس کو ولیم پن (WILLIAM PENN) نے سترھویں صدی کے آخر میں ترتیب دیا۔ اس کا خاکہ شطرنج ناطرز پر بنایا گیا تھا جس میں سڑکیں سیدھی اور قطعات مستطیل تھے۔ اس مخصوص تجویز کا اثر ممالک متحدہ امریکہ کے اکثر شہروں پر پڑا۔ البتہ شہر واشنگٹن کی ترتیب میں لانفان L. ENFANT نے اپنی جدت سے ایک خاص رنگ پیدا کیا۔ اس نے علاوہ سیدھی سڑکوں کے آٹھ آڑے راستے اس طرح بنائے جو سیدھی سڑکوں کو مختلف زاویوں سے کاٹتے ہوئے CAPITAL کا رخ کرتے ہیں جو شہر کا مرکز مانا جاتا ہے۔ اس تجویز میں راستوں کی حد نظر اور ان کے رخ بدلنے کی جگہ مرکزی نقاط کا پیدا کرنا "رینسانس" کی وضع کے مطابق نہایت کامیابی سے انجام دیا گیا۔ لانفان کے مجوزہ خاکہ میں نامناسب تبدیلیاں ہونی شروع ہوئی تھیں۔ لیکن خوش قسمتی سے بہت جلد اس کو محسوس کیا گیا اور ۱۹۰۱ء میں دوبارہ یہ تصفیہ ہوا کہ قدیم تجاویز کو بجنسہ بحال رکھا جائے اور کچھ عرصہ بعد ۱۹۱۰ء کے دستور العمل کے موافق ایک مجلس شوریٰ فنون لطیفہ مقرر کی گئی۔ "لانفان" کے تجاویز کو روبہ عمل لانے کے لئے مختلف مسئلوں مثلاً آبرسانی، عمارات کے خاکہ جات، اور کھلے مقامات وغیرہ کے ضوابط منظور کئے جس کے مطابق اس اہم تجویز کو مکمل کیا گیا۔
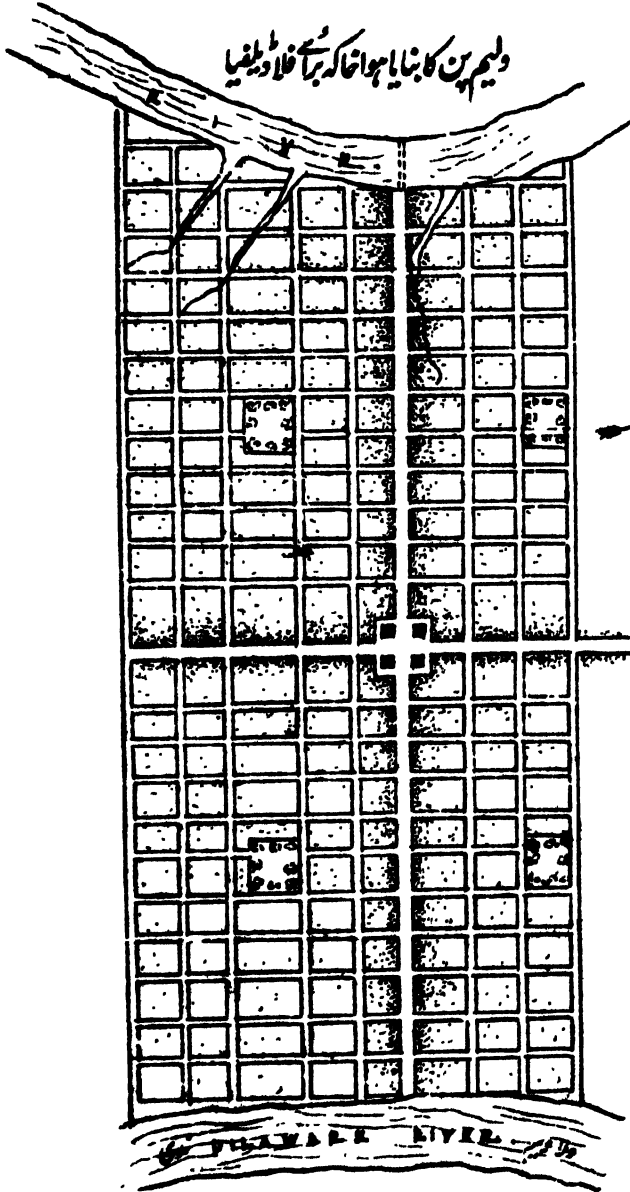
WILLIAM PENN'S PLAN OF PHILADELPHIA

شیکاگو:۔ شیکاگو (CHICAGO.) کی جدید تشکیل شہری کی تجاویز اپنی عظمت اور بڑھیاپن میں امریکہ بھر میں مشہور ہیں جو تقریباً واشنگٹن کی وضع پر ترتیب دی گئیں۔ خوبصورت کنٹوں کے قرب و جوار میں دلکش تفریح گاہیں اور کھلے مقامات فراہم کئے گئے حتی کہ رعایا کے اخراجات سفر کے بچاؤ کے مدنظر ریل کے راستوں کی داغ بیل میں تبدیلیاں کی گئیں۔ اور شیکاگو ایسا شہر بنانے کی ٹھانی گئی کہ ممالک متحدہ امریکہ اس پر فخر کرے۔

آسٹریلیا موجودہ زمانہ کی تمام بڑی بڑی تجاویز میں جو ساری دنیا میں روبہ عمل لائی جارہی ہیں سب سے عظیم الشان آسٹریلیا کے دارالحکومت کنبرا کی تشکیل شہری ہے جس کو ایک امریکی ماہر تعمیر والٹر بی گریفن (WALTER . B. GRIFFEN) نے مرتب کیا اور جس کا بیشتر حصہ مکمل ہو چکا ہے۔ اس شہر کا ہر ایک حصہ از خود منظم ہونے کے علاوہ آپس میں ایک دوسرے سے ایسا ترتیب دیا گیا ہے کہ شہر ایک مربوط اجزا کا خوش گوار مجموعہ بن گیا۔ منطقہ واری ترتیب کے تحت مختلف جداگانہ مرکز مناسب طریقہ پر قائم کئے گئے۔ مثلاً رہائشی مرکز، سرکاری اور بلدی مرکز، صنعتی اور تجارتی مرکز وغیرہ، جس میں آئندہ کے پھیلاؤ کے لئے خاطر خواہ گنجائش بھی مہیا کی گئی۔ اس کی وسیع سڑکیں، عالیشان عمارات، خوش نما باغ، اور کھلے میدان ان سب منطقوں سے مل جلکر ایک شان دار دارالسلطنت کا ثبوت دیتے ہیں۔ شہر کی ترتیب میں قدرتی مناظر سے ہم آہنگی اور جائے وقوع کی جغرافی حالت کا کامیابی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مولانگ لو (MOLONGLO RIVER) ندی کے پانی کو جا بجا روک کر خوشنما کنٹوں کا تسلسل قائم کرنا اس شہر کی ترتیب کو نہایت خوشگوار بنا لیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مکمل ہونے کے بعد کنبرا ہر اعتبار سے دنیا کا بہترین نو آباد شہر ہوگا۔

نقشہ آسٹریلیا دیکھو

جرمنی ملک جرمنی کو تشکیل شہری سے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ یہاں کے ماہرین تعمیر نے برسوں اس فن کی تحقیق میں عمر صرف کی اور اپنی گہری دلچسپی سے اس کو کامیاب بنایا۔ چنانچہ پہلا صنعتی باغ نما قصبہ (INDUSTRIAL GARDEN SUBURB.) بنانے کا فخر اسی ملک کو نصیب ہے جس کو کرپس

کرپس کا باغ نما صنعتی قصبہ (جرمنی)
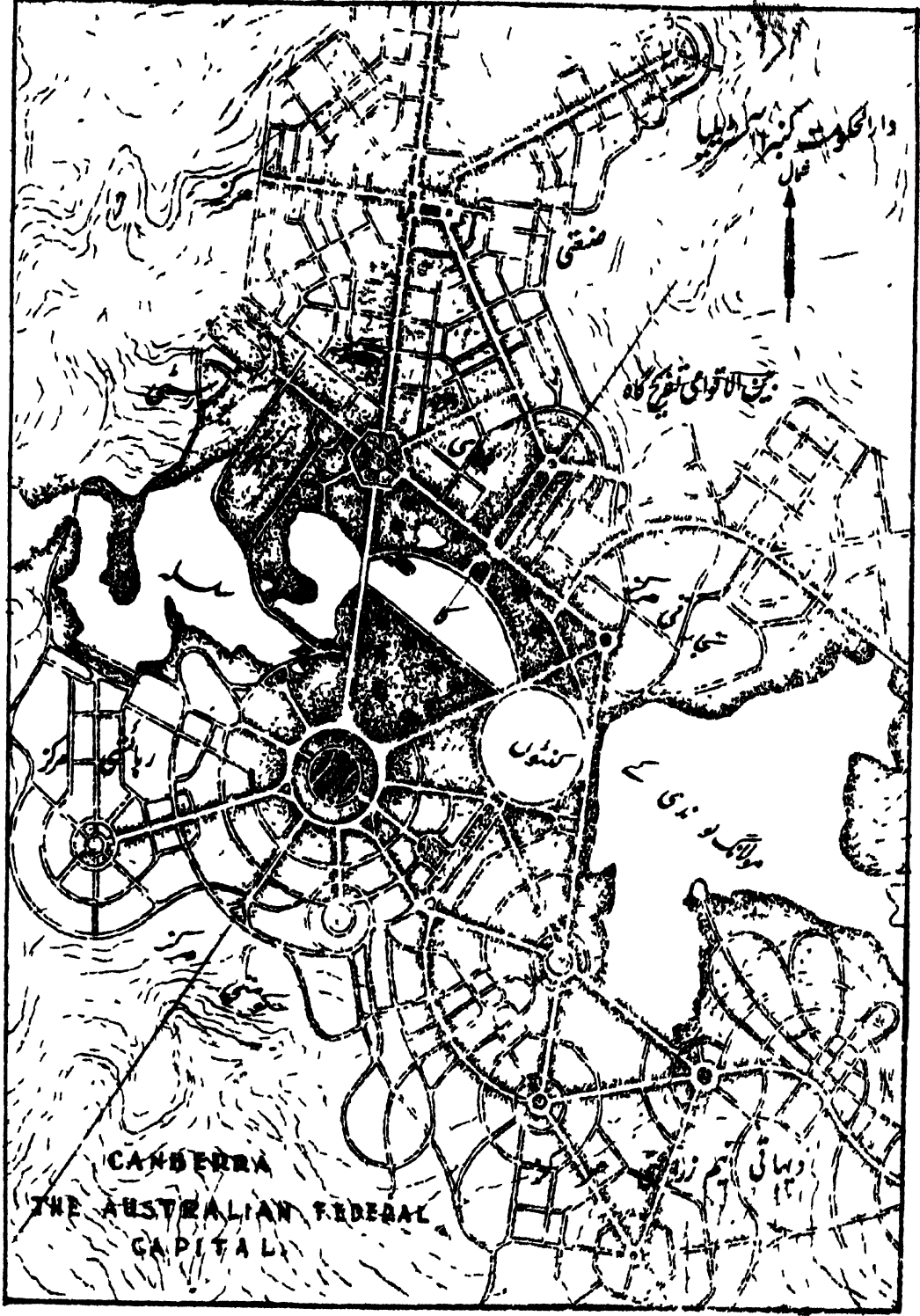
دارالحکومت کنبرا آسٹریلیا
شمال
صنعتی
بین الاقوامی تفریح گاہ
CANBERRA
THE AUSTRALIAN FEDERAL
CAPITAL

(KRUPPS) نے اپنے کارخانہ کے ملازمین کے لئے ۱۸۸۵ء میں ترتیب دیا۔

بیرن ہوسمان (BARON HAUSSMANN,) کے منظم اشکال کا طرز جو اس نے پیارس کی تشکیل شہری کر میں رائج کیا جرمنی میں اختیار کیا گیا۔ لیکن ۱۸۸۹ء میں کمیلوسٹی (CAMALLO SITTI) کی مشہور تصنیف "ڈراسٹا ڈ بو" (DER STADTE BAU.) نے جس کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں جرمنی کی تشکیل شہری میں غیر معمولی تغیر پیدا کر دیا۔ مصنف دور متوسط کے شہروں کی باضابطہ تحقیق کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ دور متوسط کے شہروں کی غیر منظم ترتیب نہ صرف زمین کی جغرافی کیفیت سے مستفید ہوتی ہے بلکہ شہر کی منطقہ واری ترتیب میں سہولت بخشتی ہے۔ چنانچہ وسیع تر برلن (GREATER BERLIN) کی تجاویز اور دیگر جرمن شہروں کے خاکہ جات میں اس کا گہرا اثر پڑا مثلاً برون اور فلنسبرگ (BRUNN AND FLUNSBURG) وغیرہ۔

انگلستان

انگلستان میں اس تحریک کی ابتدا رائٹ آنریبل جان برنز (RIGHT HONOURABLE JOHN BURNS) کے اس بل (BILL.) کے بعد شروع ہوئی جو انھوں نے ۱۹۰۹ء میں منظور کروایا جس کے بموجب تمام بلدیات پر قانوناً لازم کیا گیا کہ وہ اپنے شہروں میں تشکیل شہری کی ایسی تجاویز مرتب کریں جو شہر کی جملہ عمارات، شوارع اور غیر آباد اراضی کی منظم ترتیب اور اصول حفظان صحت پر مشتمل ہوں۔

۱۹۱۹ء میں دوسرا قانون مزید ترمیمات اور تشریحات کے ساتھ جاری کیا گیا جس میں تمام بلدیات کو جن کے شہروں کی آبادی بیس ہزار سے زیادہ ہو لازمی طور پر تشکیل شہری کی تجاویز مرتب کرنے اور پہلی جنوری ۱۹۲۶ء کے قبل پیش کرنے کے احکام دیئے گئے۔ ان قوانین میں مقامی مشاورتی مجالس کے حقوق اور فرائض کی تشریحات اور فی ایکڑ مکانات کی تعداد و رقبہ جات کی صراحت بھی کی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ برطانیہ میں اس تحریک کی طرف بہت دیر میں توجہ کی گئی لیکن پھر بھی گزشتہ نصف صدی سے ملک کا ہر حصہ اس اہم قومی تحریک میں سرگرم عمل ہے۔ وسیع تر لندن (Greater London) کی تجاویز نہایت جانفشانی سے تیار کی گئیں جس کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ مختلف دیگر مقامات میں مثلاً لیورپول (Liverpool) ۔ اڈنبرا (EDINBURGH)۔ میانچسٹر (MANCHESTER.) اور برمنگھم (BIRMINGHAM.) میں متعدد تجاویز روبہ عمل لائی گئیں۔ سر ریمنڈ انون (SIR RAYMOND UNWIN.) لندن کے مشہور استاد تشکیل شہری اور دیگر مشہور ماہران فن تشکیل شہری نے کئی تجاویز مرتب کیں اور متعدد گراں بہا کتب اس فن پر لکھے خصوصاً سر ریمنڈ انون کی بعض قابل تجاویز مثلاً ہیم اسٹیڈ کا باغ نما قصبہ (HAMSTEAD GARDEN SUBURB) اور لیچورتھ کا باغ نما شہر (LETCHWORTH GARDEN CITY) نہایت کامیاب اور مقبول عام کارنامے ہیں۔

"ادارۂ باغ نما شہر" کی ان انتھک کوششوں سے ملک میں اس تحریک کو تائید عام حاصل ہوئی۔ چنانچہ متعدد شہر اس اصول پر بنائے گئے۔

ہیم اسٹیڈ کا جدید باغ نما قصبہ (لندن میں)
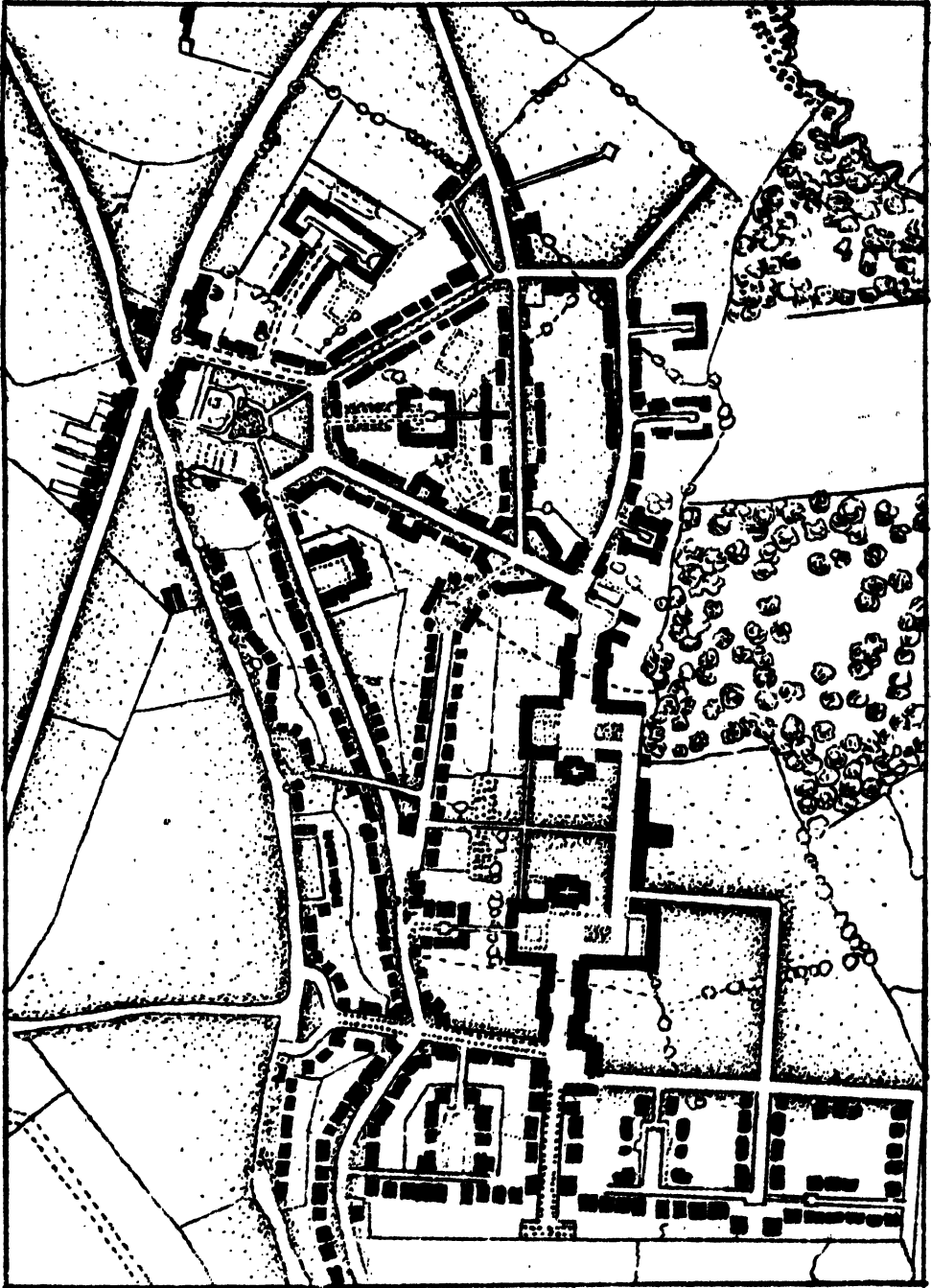
HAMESTEAD GARDEN SUBURB (LONDON).

علاوہ ازیں ملک میں جا بجا کئی اور فنی ادارے اور مجالس قائم ہیں مثلاً "ادارۂ شاہی برطانوی ماہرین فن تعمیر" (ROYAL INSTITUTE OF BRITISH ARCHITECTS) اور "ادارۂ تشکیل شہری لندن" (LONDON TOWN PLANNING ASSOCIATION) جن کی گہری دلچسپیوں اور کاوشوں نے ملک میں ہر طرف جوش عمل پیدا کر دیا۔ اس فن کے لئے مخصوص مدارس کھولے گئے۔ جامعات میں اس مضمون کو نصاب میں رکھا گیا۔ مختلف نمائشوں، تقریروں، اشتہاروں اور کتب کے ذریعہ اس تحریک کو وسیع تر کرنے اور منظر عام پر لانے کی حتی الامکان کوششیں جاری ہیں۔

متذکرۂ بالا مقامات کے علاوہ گزشتہ پچاس سال کے اندر ملک روس، جاپان، مصر، ترکی اور ہندستان میں جدید تشکیل شہری کے اصولوں پر متعدد بڑے بڑے عالیشان شہر تعمیر کئے گئے اور بعضوں کے تعمیری سلسلے ابھی پایۂ تکمیل کو پہنچنے نہ پائے تھے کہ موجودہ جنگ نے ان کا خاتمہ ہی کر دیا۔

محمد فیاض الدین

فردوسِ آرزو

جب رات اندھیری بڑھتی ہو تو خوابِ پریشاں بنکر آ
آ میری خیالی دنیا میں امید کا ساماں بنکر آ

اک یادِ حقیقتِ نادیدہ، ہر سانس پہ آتی جاتی ہے
ہر سانس کے پردے میں چھپ کر تو نوح کا طوفاں بنکر آ

سرمست گھٹائیں چھائی ہیں یا زلفِ شبِ آسا بکھری ہے
گھِر جاؤں خودی میں، میں مٹ کر تو کاکلِ پیچاں بنکر آ

مخمور نگاہیں بل کھاتیں جب ابر کی چادر چھاتی ہے
تو دل کا دلاسا بن کر آ یا درد کا درماں بنکر آ

اک ہجر کا مارا جاگے ہے اور اشک مچلتے آنکھوں میں
گر جھوٹ سہی اک دم کے لئے امید کا ارماں بنکر آ

کعبہ بھی ہے دل دیر بھی ہے، پرخاش تجھے گو مجھ سے سہی
آ جامۂ مستی بن کر آ، یا جامۂ قرآں بنکر آ

تو بھی اے مسیحا کیا جانے جب درد کا درماں بن نہ سکا
اب تارِ نفس کو گنتا ہوں تو کعبۂ ایماں بنکر آ

دنیائے خودی پر چھاتا جا تو اختر تاباں بن بن کر
اب تیرا زمانہ آتا ہے تو چاکِ گریباں بنکر آ

سید عبد الکریم اختر

۱۔ جنگ زدہ ممالک مرتبہ میر حسن ایم اے عثمانیہ۔ ۱۵۲ صفحے قیمت عہ ادارۂ ادب جدید۔ شاہراہ عثمانی۔ حیدرآباد دکن۔

۲۔ شرح قانون شہادت ہند (دوسرا ایڈیشن) مولفہ شیخ غلام رسول کی بیرسٹرایٹ لا۔ قیمت ۵ جنرل لا بکس ایجنسی ہال بازار امرتسر۔

۳۔ شرابی۔ (افسانے) از ایم اسلم قیمت عاں۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ۔ لاہور۔

۴۔ رباب شکستہ (افسانے) مترجمہ جمیل احمد ایم اے ۲۰۰ صفحے قیمت عہ۔ نرائن دت سہگل۔ لاہور۔

۵۔ کوشلیا (طویل افسانہ) از ایم اسلم۔ قیمت عہ۔ نرائن دت سہگل۔ لاہور

۶۔ ہمارا ہندوستان۔ مترجمہ مرزا عصمت اللہ بیگ۔ ۳۰۰ صفحے قیمت عہ۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی۔ کلکتہ۔ مدراس۔

۷۔ جگ بیتی حصہ اول (پنڈت جواہر لال نہرو کے خط اپنی بیٹی اندرا نہرو کے نام) ۵۵۰ صفحے قیمت ے۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔

۸۔ محمد علی کے یورپ کے سفر مرتبہ محمد سرور۔ ۲۳۸ صفحے قیمت عہ کتاب خانہ پنجاب لاہور۔

۹۔ صحرا نورد کے رومان از مرزا ادیب ۲۲۰ صفحے قیمت عاں نارائن دت سہگل اینڈ سنز لاہوری گیٹ۔ لاہور۔

۱۰۔ شیخ و برہمن (افسانے) از ڈاکٹر اعظم کریوی۔ ۲۲۰ صفحے قیمت عاں کتاب خانہ دانش محل۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ۔

۱۱۔ جلوہ گاہ (مجموعہ کلام) از مخمور جالندھری ۲۰۰ صفحے قیمت عہ ساقی بکڈپو۔ دہلی۔

۱۲۔ انگبیں (عورت کے متعلق مضامین) از عطاء اللہ پالوی ۲۵۲ صفحے قیمت عاں نارائن دت سہگل اینڈ سنز۔ لاہور۔

۱۳۔ راہگذر (افسانے) از عاشق بٹالوی۔ ۲۰۰ صفحے قیمت عہ لاہور بک شاپ بسنت روڈ۔ لاہور

۱۴۔ غذائیات (رسالہ ہمدرد صحت کا خاص نمبر) ۲۰۰ صفحے قیمت عہ دفتر رسالہ "ہمدرد صحت"۔ دہلی۔

۱۵۔ شمع انجمن (افسانے) از صادق الخیری ایم اے دہلوی ۲۰۰ صفحے قیمت عہ کتب خانہ علم و ادب اردو بازار۔ دہلی۔

۱۶۔ مضامین عالم (مجموعہ مضامین) از جے۔ اے۔ ساقی قیمت ۱۲؍ اردو بک اسٹال۔ ہال بازار۔ امرتسر۔

۱۷۔ متین کے سو شعر از متین تلمیذ حضرت داغ دہلوی قیمت ۴؍ مکتبۂ ادب۔ الہ آباد۔

۱۸۔ سوز دروں (ناول) از رشید اختر ندوی ۱۹۰ صفحے قیمت عہ اردو بک اسٹال۔ لاہور

۱۹۔ آتش کے ڈیڑھ سو نشتر (خاں بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر کے کلام کا انتخاب) قیمت ۴؍ نظامی پریس۔ بدایوں

۲۰۔ اردو سبھا (مجموعہ مضامین) مرتبہ پرتاب اردو سبھا کشمیر قیمت عہ۔ سری پرتاب کالج۔ سری نگر کشمیر۔

۲۱۔ قرآن اور سیرت سازی (آیات قرآنی کی روشنی میں سیرت انسانی) از ڈاکٹر میر ولی الدین پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ قیمت ۸ مولف سے مل سکتی ہے۔

۲۲۔ روح ادب (مجموعہ کلام) از جوش ملیح آبادی قیمت عاں مکتبۂ اردو۔ لاہور۔

۲۳۔ تنقید عقل محض (جرمن فلسفی کی کتاب کا ترجمہ) از ڈاکٹر سید عابد حسین قیمت لے۔ انجمن ترقی اردو۔ دہلی

۲۴۔ پیاری زمین (ناول) مترجمہ اختر حسین رائے پوری ۴۴۴ صفحے قیمت عاں۔

مرزا سیف علی خاں

موجودہ جنگ کے اثرات

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

سن کے ریشوں سے بنے ہوئے کپڑے "فلاکس" کی جنگ کے زمانے میں محکمہ جہازرانی اور ہوائی حملوں سے بچاؤ کے اداروں کو سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی تقریباً تین چوتھائی مقدار ہندوستان میں روس، ہالینڈ، ڈنمارک اور بلجیم سے آتی رہی۔ اس کپڑے کی تیاری کے لئے حکومت ہند نے پہلے تو ہالینڈ سے آئے ہوئے السی کے بیجوں پر تحقیقات کرائی اور پھر بہار اور بنگال کی حکومتوں سے خواہش کی کہ وہ ایک وسیع رقبے پر اس کی کاشت کرے۔ مرکزی ہندوستانی سن کمیٹی سن کے ریشوں سے فلاکس کی تیاری میں لگی ہوئی ہے۔ مزید تحقیقات، تیاری اور مشینری کے لئے حکومت ہند چار لاکھ روپے منظور کر چکی ہے۔ ان ریشوں کی تیاری تک ایک مدت گزر جاتی، اس لئے روئی کے ماہرین نے روئی اور سن سے اس خاص کپڑے کا ایک بہترین بدل تیار کر لیا۔ نہ صرف یہ بلکہ روئی کے بعض کارخانوں نے بغیر کسی نئی مشینری کے پرانے کل پرزوں سے کام لے کر کینویس اور مچھردان کے کپڑوں کی ایک بڑی مقدار بھی تیار کر لی ہے۔

نقلی سلک کی تیاری کے لئے نقلی ریشم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور سالانہ دو کروڑ روپے کا نقلی ریشم باہر سے ہندوستان آتا ہے۔ حکومت ہند کا محکمہ صنعت و حرفت نقلی ریشم بنانے کی طرف خاص توجہ کر رہا ہے۔ پچھلی تین سالہ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ لکڑی کے گودے اور روئی سے تیار کیا جا سکتا ہے۔ آج کل روئی کی مرکزی ہندوستانی کمیٹی اور بورڈ آف سائنٹفک ریسرچ اس کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں۔ روئی کی کمیٹی اس پر تحقیقات کے لئے پچاس ہزار روپے صرف کر رہی ہے اور بورڈ اس کی تیاری کے امکانات کی تحقیق کے لئے پچاس ہزار روپے سیلیلوز ریسرچ کمیٹی کے حوالے کر چکا ہے۔

فولاد سے نئی نئی چیزیں بنانے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی جو مسٹر جے جے گاندھی جنرل منیجر ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل، مسٹر آر ماتھر (R. Mathur) اور مسٹر سیرل فاکس (Cyril Fox) پر مشتمل ہے جمشید پور میں کام کر رہی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کمیٹی کے تحقیقاتی کام کی وجہ سے لوہے اور فولاد کا بہت سا فوجی سامان ایک بڑے پیمانے پر ملک ہی میں تیار ہو سکے گا۔

ناروے، سویڈن، ڈنمارک، جرمنی اور آسٹریا سے جب کاغذ آنا رک گیا تو حکومت نے ڈاکٹر (Bhargava) اور میجر ہاورڈ (Howard) کو دیسی مسالوں سے کاغذ بنانے کے کام پر مقرر کیا۔ چنانچہ کلکتہ میں اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ روئی کے پودے کے ٹکڑوں، چاول اور السی کے بھوسے سے کاغذ تیار کیا جائے۔ مدراس، سندھ، جے پور اور ریوا میں گھاس سے کاغذ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ سیالکوٹ میں بے کار دفتری کاغذ سے صاف اور اچھا کاغذ بنایا جا رہا ہے۔ اور حیدرآباد دکن میں سرپور ملز کی وجہ سے ہر قسم اور سائز کا دیسی کاغذ مقابلتہً سستے داموں پر تیار ہو رہا ہے۔

فنی تحقیقات کی وجہ سے شیشہ کی صنعت کافی ترقی کر چکی ہے۔ بورڈ نے عینک کے شیشوں اور کیمیائی آلوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے صوبہ متحدہ کے ماہر شیشہ سازی ڈاکٹر (A Nadel) کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی جس کے دوسرے ارکان مسٹر آئی ڈی وارشنی (I. D. Varshney) پروفیسر این سی ناگ (N. C. Nag) اور مسٹر ایم ال جوشی (M. L. Joshi) ہیں۔ ان لوگوں کی صنعتی تحقیقات کی وجہ سے آج ہندوستان میں تھرماس، قیف، بوتل، چھوٹی شیشیاں، شیشے سے بنا ہوا کیمیائی سامان، بجلی کے گولے، بند منہ کی بوتلیں، چپٹے پیندے کے گلاس، اور شیشے کی چادریں تجارتی پیمانے پر بنائی جا رہی ہیں۔ اور مختلف قسم کے پمپ، ریفریجریٹرس اور ریڈیو سٹ کی تیاری کا امکان ہو چلا ہے۔ شیشے کی صنعت میں سونے کے پانی یعنی مائع سونا [illegible] کی کافی مقدار

خرچ ہوتی ہے۔ اب تک تقریباً چار لاکھ روپے کے سونے کا پانی باہر سے ہمارے ملک میں آتا رہا لیکن ایلچی پور کے صنعتی تحقیقاتی شعبہ کی ان تھک کوششوں اور مسلسل تحقیقات کی وجہ سے یہ ہندوستان میں تیار ہو رہا ہے اور نہایت آسانی کے ساتھ جرمن سونے کے پانی کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

موجودہ جنگ کی وجہ سے صنعتی تحقیقات پر جو گہرے اثرات پڑے ہیں ان کا اندازہ دواؤں کی صنعت سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ جنگ سے پہلے ملک میں اس صنعت کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ جنگ چھڑتے ہی دوسرے ملکوں سے خاص طور پر جرمنی کا مال آنا بند ہو گیا۔ اب ہندوستانی تحقیقاتی اداروں نے دیسی دواؤں کے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بہت سی بیرونی دوائیں دیسی مسالوں سے بنانے لگے۔ اس کام کو بہتر طریقے سے چلانے کے لئے حکومت ہند نے نہ صرف پچیس ہزار روپیوں کی منظوری دی بلکہ ڈاکٹر چوپڑے، ان ہی کی صدارت میں ماہرین کی ایک کمیٹی بھی بنائی جس کے ارکان میں ڈاکٹر پی، سی میتر (P. C. Mittar) ڈاکٹر ایس صدیقی، ڈاکٹر پی سی گوہا (P. C Guha) اور ڈاکٹر کے حمید (K. Hameed) شامل ہیں۔ ان لوگوں کی تحقیقات کی وجہ سے اس کا یقین ہو چکا ہے کہ ہندوستان ہر قسم کے کیمیائی مرکبات، سفوف اور دوائیں تیار کرسکتا ہے۔ چنانچہ نہ صرف بہت سی جڑی بوٹی کی دوائیں بنائی جارہی ہیں بلکہ بعض ٹھیٹ مغربی مرکبات مثلاً کلوروفارم، الکحل، اینتھر، بینزین اور بیسیوں کول تار مرکبات تیار کئے جارہے ہیں جن کی دواؤں میں ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر میکنزی ٹیلر اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ پنجاب کے نمکوں سے سوڈیم کاربونیٹ اور کاوی سوڈا تیار کریں۔ ان کے علاوہ ٹانک ترشہ، اسٹک ترشہ، ہائیڈروکلورک ترشہ، نائٹرک ترشہ، امونیم کلورائیڈ، سوڈے کی راکھ، امونیہ، امونیم سلفیٹ اور بعض بائی کرومیٹس تیار ہو رہے ہیں۔ اور بعض دوسری کیمیائی چیزوں مثلاً زنک کلورائیڈ، کلورین، برومین اور سوڈیم سائینڈ کی تیاری کے انتظامات بڑے پیمانے پر کئے جارہے ہیں۔

موجودہ جنگ کی وجہ سے ہندوستان میں پہلی مرتبہ رنگ بنانے کی صنعت کی طرف توجہ کی گئی۔ بمبئی یونیورسٹی کا شعبہ کیمیکل ٹکنالوجی اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ ملک ہی میں ایسے تمام نباتاتی رنگ تیار ہو جائیں جو کیمیائی رنگوں کا بدل ثابت ہوسکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جڑی بوٹی کے رنگ کیمیائی رنگوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے لیکن یہ دیسی رنگ فوجی کپڑوں کی رنگائی میں آج کل کثرت سے کام آرہے ہیں۔ علاوہ اس کے ان رنگوں کو کیمیائی رنگوں کی تیاری میں بھی ابتدائی مسالہ کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ اب تک کئی دیسی رنگ تجارتی طور پر تیار کئے جاچکے ہیں اور انہیں بڑے پیمانے پر کپڑے کی صنعت میں استعمال کیا جارہا ہے۔

بعض اہم سمندپار تجارتی منڈیوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے ملک میں ہزاروں ٹن تیل کے بیج بیکار پڑے ہیں۔ ان کی کھپت میں حکومت خاص دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ بیج جو باہر بھیجے جاتے ہیں کچھ دنوں بعد مختلف قسم کی مشینوں کے تیلوں کی شکل میں ہندوستان آتے ہیں۔ بیج سے تیل نکالنے کے تحقیقاتی کام پر بعض مشہور ماہرین کیمیا مثلاً پی۔ اے ناریدوالا (P. A Naridwala) جنرل منیجر ٹاٹا آئیل ملز، ڈاکٹر کے وینکٹ رامن، بمبئی کیمیکل ٹکنالوجی، ڈاکٹر گاڈبول (Godbole) بمبئی یونیورسٹی اور ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی صدر شعبۂ کیمیا جامعہ عثمانیہ لگے ہوئے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ آئندہ چند مہینوں میں ہمارے ملک کے تیل کے بیجوں کے بڑے بڑے ذخیرے کام پر آجائیں گے اور مستقل طور پر ایک فائدہ بخش اور ملکی صنعت قایم ہوجائے گی۔

محمد بن عمر

اُردو مثنویوں میں جنگ کے مناظر

(حیدرآباد لاسلکی نشرگاہ سے پڑھا گیا)

مثنویاں ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جو اپنی وسعت اور دوسری آسانیوں کی وجہ سے مختلف خیالات کے اظہار کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ شاعروں نے ہر دور میں اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ سوال اس وقت میرے موضوع سے خارج ہے کہ اردو زبان میں مثنویوں کی ابتدا کب سے ہوئی اور شروع ہونے سے اسے تدریجی ترقی کے راستوں سے گزار کر کس منزل تک پہونچایا۔ صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ تقریباً اردو شاعری کے آغاز ہی سے مثنویوں کے آغاز کا پتہ چلتا ہے اور آج بھی جب کہ ہماری شاعری ارتقاء کے بہت سے مراحل طے کر چکی ہے اس صنف کی مقبولیت اور دلکشی میں کوئی کمی پیدا نہیں ہونے پائی۔ ایسی تمام نظمیں جن کا ہر شعر جداگانہ ردیف و قافیہ رکھتا ہے اور جن میں مطالب کا تسلسل پایا جاتا ہے، مثنوی کی تعریف میں آتی ہیں۔

گزشتہ زمانے میں ہمارا ادب زندگی سے زیادہ قریب نہ تھا۔ شاعر حضرات اپنی دماغی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ حیرت انگیز اور تعجب خیز بنانا چاہتے تھے۔ حیات انسانی کی ترجمانی ان کا مقصود نہ تھی۔ چنانچہ مثنویوں میں بھی اس بات کی کوشش کی جاتی رہی کہ انھیں ایسے واقعات سے آراستہ کیا جائے جو پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیں۔ ہمارے یہاں سوائے چند مثنویوں کے باقی تمام مثنویاں منظوم افسانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان افسانوں کے واقعات عموماً اسی قسم کے ہوتے تھے جن میں ہماری عام زندگی کی کوئی جھلک نہیں پائی جاتی تھی۔ مثنوی کے افسانے کا پلاٹ کبھی کبھی دیووں اور جنوں کے خیالی شہروں سے لیا جاتا تھا۔ اس کے کردار بھی عام انسانی سطح سے بلند ہوتے تھے۔ مثنوی کے ہیرو کے لئے مافوق الفطرت قوت اور شجاعت لازمی چیز تھی۔ وہ گوشت پوست کا ایک معمولی انسان ہوتے ہوئے بھی جنوں اور دیووں سے لڑ سکتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کو زیر کر کے اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا۔ چنانچہ مثنوی گلزار نسیم میں بھی جو ہماری زبان کی ایک مشہور مثنوی ہے اس قسم کے واقعات ملتے ہیں۔ اس قصے کا مرکزی کردار شہزادہ تاج الملوک ہے جو پریوں کے شہر میں داد عیش دے رہا ہے۔ ایک صبح وہ اپنے آپ کو کسی صحرا میں پاتا ہے، یہاں کے تمام دیو اس کے دشمن ہیں اور اسے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ لیکن جب وہ اپنے سامنے ایک خوفناک دیو کو دیکھتا ہے تو بلا پس و پیش اس پر حملہ کر دیتا ہے اس موقع پر پنڈت دیاشنکر نسیم نے اپنی حد تک منظر نگاری کی اچھی کوشش کی ہے فرماتے ہیں ؎

دیکھا جو نہ دیو نے گزارا　　پتھر اک اٹھا کے کھینچ مارا

لیکن تاج الملوک کے پاس ایک طلسمی پھل ہے جو اس کی محبوب پری کا دیا ہوا ہے۔ اس پھل کی تاثیر یہ ہے کہ دشمن کا حملہ کارگر نہیں ہونے پاتا۔ چنانچہ

جس طرح عصا سے جام بلّور　　لٹھ اس کا پڑا تو وہ ہوا چور
تاثیر سے پھل کی بن گیا پھول　　وہ سنگ گرانِ حربۂ غول !

دیووں کی لڑائی ہماری داستانوں اور مثنویوں کا اہم عنصر ہے اور طلسمی لڑائی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی دیو کسی کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے تو اس کی جگہ بہت سے دیو پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعہ تاج الملوک کے ساتھ بھی پیش آیا یعنی لٹھ پڑنے کے بعد جیسے ہی

غل کر کے زمین پر گرا دیو !!　　موجود ہوئے ہزار دیو
بادل کی طرح جو اٹھے دشمن　　لاٹھی سے ہوا وہ برق خرمن
موسیٰ کا عصا تھا لٹھ جوان کا　　ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکا
سرمہ کیا کوہ پیکروں کا　　جی چھوٹ گیا دلاوروں کا

مثنوی "فسونِ بابل" جس کے مصنف احمد خاں صاحب صوفی ہیں اسی قسم کے حیرت انگیز واقعات کا مجموعہ ہے اس مثنوی کے کرداروں میں

دیو اور پریاں شامل ہیں۔ ان کا ہیرو بہرام گور ہے جو پرستان پہنچتا ہے اور گلچہرہ پری پر عاشق ہوجاتا ہے۔ یہ پری بھی اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ تھوڑے دن تک یہاں رہنے کے بعد بہرام گور کو وطن کی یاد ستاتی ہے اور وہ اس پری جمال کے ساتھ نے کر اپنی مملکت میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں اسے اپنے وزیر کی عیاری کا پتہ چلتا ہے جو بادشاہ کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر خود تخت پر قابض ہوگیا ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ وزیر اطاعت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے بلکہ بادشاہ کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ بغیر انجام کی پروا کئے ہوئے ۔

حیراں ہوا پھر یہ صاحب تاج　　تھیں موروملخ سے دونی افواج
دل آتش خصم سے جلایا　　سب فوج درست کر کے لایا

لیکن بہرام گور کے ساتھ بھی لشکر تھا اور وہ بہادر بھی تھا۔ اپنے فریب کار وزیر کی طاقت دیکھ کر مرعوب نہ ہوا اس نے اپنی فوج کی صفیں درست کیں اور حملہ کا حکم دے دیا۔ جب جمع ہوئے یہ مرد میداں

غصے میں زیادہ رحم میں کم　　دشمن کے لئے قضائے مبرم
لشکر ہوا خصم کا پریشاں　　...

افواج عدو تھیں بے پروبال　　سینے کئے تیروں نے جو غربال
مرغان ہوا تلک چھدے تھے　　یہ نیزہ و تیر چل رہے تھے
سرکش جو تھا اس کا سر مروڑا　　زندہ نہ ادھر کا کوئی چھوڑا

جنگ زور پکڑتی گئی۔ کشتوں کے پشتے لگتے گئے۔ دونوں طرف کے بہادروں نے فتح حاصل کرنے کی کوشش میں کمی نہ کی لیکن کامیابی بہرام گور ہی کو ہوئی اور آخر کار ـــ

مردوں کے سوا نہ کچھ وہاں تھا　　جو دشت کہ پر ز مرداں تھا

مثنوی گلدستۂ شجاعت "در اصل سکندر نامے کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ پوری مثنوی واقعات جنگ سے بھری ہوئی ہے۔ قصے کا ہیرو چونکہ مشہور جنگجو سکندر رومی ہے، اس لئے ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ مثنوی کا ترجمہ غلام حیدر خاں حیدرؔ نے کیا ہے۔ اور جنگی مناظر کو پورے جوش کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ واقعات کے دوران میں ایک مرتبہ سکندر کو زنگیوں کے ساتھ لڑنا پڑتا ہے۔ اس موقع کی تصویر ان اشعار میں موجود ہے۔

بہ بانگ جرس سب ہوئے بے قرار　　بجا کوس دروازۂ شہریار
کمر کو کیا شاہ نے استوار　　بہ خوں ریزیٔ زنگی نابکار
تو نکلے جوانمرو بہر وغا　　مقابل جو لشکر کے لشکر ہوا
ہوا خوف سے شیر گرداں زبوں　　ہوا آب اندر دل ابر خوں

کافی خوں ریزی کے بعد سکندر کو فتح حاصل ہوئی لیکن یہ فتح کامل نہ تھی، زنگیوں کا ایک سردار جس کا نام زرادہ تھا شکست ماننے پر تیار نہ ہوا۔ اس زمانے میں ابتداً انفرادی جنگ ہوتی تھی۔ ایک ایک سپاہی میدان میں نکل کر آتا تھا اور دشمن سے مقابلہ کرتا تھا۔ چنانچہ اسی طریقے سے زنگی سردار نے سکندر کی فوج کے ستر آدمی قتل کر دئے۔ یہ حالت سکندر کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ وہ مقابلے پر آیا۔

ہوا سخت تر گرم با کارزار　　کمر سے کمر کو کیا استوار
کرے عرصۂ زنگ کو تا بہ تنگ　　ہوا خود یہ ناچار تیار جنگ
ہوا غل کہ آیا عجب تند شیر　　در آیا بہ میداں وہ شاہ دلیر
حمائل کیا تیغ کو دوش پر　　زرہ کو کیا شاہ نے زیب سر

ظاہر ہے کہ سکندر کی قوت شجاعت اور رعب کا مقابلہ زنگی کے لئے قطعی ناممکن تھا۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ سکندر نے پہلے ہی حملے میں

بہ یک ضرب گرز شاہ جہاں　　ہوا قتل وہ زنگی پہلواں

سکندر چونکہ ساری دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ لے کر اپنے ملک سے نکلا تھا اس لئے اس کی پوری شاعرانہ داستان حیات جنگی واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ زنگیوں کے مقابلے میں کامیاب ہو کر اس نے روس پر چڑھائی کی اور مسلسل سات حملے کرنے کے بعد فتح پائی۔ ابتدائی حملے کے متعلق یہ اشعار سنئے ـــ جو اروس واقف کہ دارائے روم　　در آیا بہ شوکت بہ ایں مرز بوم　　بہ مع فوج جرار و لشکر شکن　　کہ ہے جس میں ہر اک جواں پیلتن

نہ لشکر فقط ساتھ اس کے رواں زمیں اس کے نیچے ہوئی ناتواں
جلو میں دو صد فیل فولاد پوش کرلادیں جو خونِ زمیں کو بہ جوش

اس موقع پر شاعر نے ایک شعر میں صوتی اثرات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ہیبت ناک حملے کے ہنگامے کو الفاظ کی آواز کے ذریعہ سے نمایاں کیا ہے۔

خروشاں وغراں دنعرہ زناں کہ ہو جن کی آواز سے دل جواں

روسی بادشاہ نے اپنے فوجی افسروں سے مشورہ کیا کہ سکندر کی اطاعت کرنا بہتر ہے یا مقابلہ کرنا۔ کافی بحث و گفتگو کے بعد طے پایا کہ بزدلوں کی طرح دب جانا کسی طرح مناسب نہیں بلکہ بہادروں کی مانند میدانِ جنگ آراستہ کرنا چاہئیے۔ چنانچہ اب ایک جانب سکندر کا لشکر تھا اور

بہ طرفِ دگر بہرخ رویانِ روس فروزاں تراز قبلہ گاہِ مجوس
باآواز اسپان فولاد سم ہوئے ہوش شیر نیستاں کے گم
ہوا جب کہ آغاز وقتِ ستیز چمکنے لگے گوہر تیغ تیز

دونوں طرف جانباز لڑتے رہے۔ جنگ بہت طول کھینچی۔ چونکہ اس زمانہ کا روس آج کا ناقابلِ شکست ملک نہیں تھا، اس لئے سکندر کامیاب ہوا اور اپنی جنگی بھوک مٹانے کے لئے آگے بڑھ گیا۔ "مثنوی مہر تاباں" کنور درگا پرشاد صاحب کی تصنیف ہے اس کے قصے کا پلاٹ قدیم مملکت دکن کے واقعات پر استوار کیا گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار شاہزادہ چندر ہے۔ جیسا کہ پرانی داستانوں میں پایا جاتا ہے جب یہ شہزادہ پیدا ہوا تو نجومیوں نے پیشین گوئی کی کہ جوان ہونے کے بعد اس کے ستارے اچھے نہیں رہیں گے اور کچھ تدبیریں بھی بتائیں جن پر عمل کرکے شہزادے کو رنج و مصیبت سے بچایا جاسکتا تھا۔ پیش بینی کے مطابق شہزادے کا عنفوانِ شباب ہی تھا کہ ایک دشمن نے اس کے ملک پر حملہ کردیا۔ رعایا میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ ہر طرف جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں بہادر مرنے مارنے پر آمادہ ہوگئے۔ بالآخر ایک دن دشمن نے ؎

کرلیا آکے شہر کو محصور چار جانب بپا تھا شور نشور
مثل سیماب کانپتی تھی زمین متزلزل تھا ہر مکان کا مکیں
چار جانب سے فوج آنے لگی ایک کالی گھٹا سی چھانے لگی
لاکھوں پیدل ہزارہا اسوار دَل کے دَل جن کا ہو سکے نہ شمار
وہ نفیری وہ بوقی وہ قرنا جن سے آوازِ صور ہو پیدا

اس ہنگامۂ قیامت کو دیکھ کر چندر کا باپ بھی اپنی بہترین فوج لایا اور میدانِ جنگ کا یہ عالم ہوگیا کہ ؎

ہر طرف فوج کے پرے کے پرے ریگ صحرا میں جس طرح ذرے
پیل تن، دلوگیر، جملہ جوان قدِ بالا بسانِ کوہ گراں
چار آئینے سب لگائے ہوئے قاعدے سے پرے جمائے ہوئے

ان اشعار سے اس وقت کی جنگ کے متعلق ایک نمایاں اور واضح تصور پیدا ہوسکتا ہے اور اس طریقۂ جنگ پر روشنی پڑتی ہے۔ جو اس زمانے میں رائج تھا۔ آخرکار فوجیں آپس میں مل گئیں اور پھر ؎

دونوں جانب بجے جو جنگ کے ساز ہوش گردوں کے کرگئے پرواز
دستِ مریخ سے سپر چھوٹی قوس کے دوش پر کماں ٹوٹی

لڑائی میں گریز و فرار کا جو عالم پیدا ہوتا ہے۔ اس کی جانب ایک شعر میں اشارہ کیا گیا ہے ؎

بھاگے صحرا کو ساکنانِ زمیں تھی نہ اس پر بھی جائے امن کہیں

مصیبت زدہ شہری تباہی اور پریشانی کے عالم میں اپنی اپنی پونجی چھوڑ کر جان بچانے کی جو صورتیں اختیار کرتے ہیں ان کی مصوری اس شعر میں موجود ہے۔

چھٹ گیا سب گھروں میں سرمایہ جان ہر شخص لے کے بھاگ آیا

اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر جان کا بچ جانا ہی بہت غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ جب عالم یہ ہو کہ

ہر طرف فوج کی گھٹا گھنگور !　　　　دونوں جانب تھا دار و گیر کا شور

اس وقت جس مصیبت کا سامنا ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ آخر کار دونوں فوجیں اس طرح ایک دوسرے میں شامل ہو گئیں کہ دوست اور دشمن کا امتیاز مشکل ہو گیا۔ شاعر نے زندگی اور موت کی اس کش مکش کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے

شیر دل تیغ زن، جواں نکلے　　　　دونوں جانب سے پہلواں نکلے
غرق بیگانہ و یگانہ ہوا　　　　ان میں دریائے خوں روانہ ہوا
جس میں بہتے تھے سر بر رنگ حباب　　　　دشت سارا تھا قلزم خون ناب
حد کے زخمی مگر نبرد کا جوش　　　　سر و پا کی خبر نہ تن کا ہوش

ہوس کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" دراصل ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ لیکن اس کا دامن بھی جنگی مناظر سے خالی نہیں۔ قصے کے افراد میں ایک شخص سردار نوفل ہے اسے ایک مرتبہ مجنوں کے حالِ زار پر رحم آ جاتا ہے وہ اس کے لئے لیلیٰ کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب لیلیٰ کے قبیلے والے قطعاً انکار کر دیتے ہیں تو تنگ آمد بہ جنگ آمد کے تحت نوفل لڑائی پر آمادہ ہو جاتا ہے اس موقع پر شاعر نے واقعات جنگ کی اچھی مصوری کی ہے

زخمی کرے روبرو ہزاروں　　　　مارے گئے جنگجو ہزاروں
ہونے لگی یکدگر لڑائی !　　　　آپس سے جب اٹھ گئی صفائی
باہر تھا کسی کے سینے سے دل !　　　　تھے کشتوں کے پشتے رہگزر میں
کوئی تھا گلو بریدہ بسمل　　　　جو مرگ نہ تھا کوئی نظر میں
شام اتنے میں درمیان آئی　　　　تا وقت غروب تھی لڑائی
کوئی خستہ بہ خاک لوٹتا تھا　　　　سر تن سے جدا کوئی پڑا تھا
آئے سوئے خوابگاہ، مردہ　　　　مردان سپاہِ زخم خوردہ !

شام ہونے کی وجہ سے لڑائی بند کر دینی پڑی۔ لیکن چونکہ ابھی مقصد حاصل نہیں ہوا تھا اس لئے دوسرے دن نوفل دوبارہ اپنی فوجیں جمع کر کے ؎

کانپ اٹھی زمیں زلزلے سے　　　　آیا جو شکوہ و دبدبے سے

اس دوسرے حملے کی اطلاع لیلیٰ کے باپ کو ہوئی جو اپنے قبیلے کا سردار تھا وہ جب اصل حالات معلوم کرنے کی غرض سے باہر آیا تو دیکھتا کیا ہے کہ ؎

شیراں سیہ ہیں اس میں غراں　　　　صحرا نیزوں سے ہے نیستاں

مجبوراً اسے بھی تیار ہونا پڑا۔

اس دبہ کہ ہو گئی ہوا گرم　　　　بازار نبرد پھر ہوا گرم !
لاشوں کے ہزاروں پشتے تھے　　　　کشتوں پہ بسکہ کشتے تھے واں

طلسماتی، جنگی اور عشقیہ مثنویوں کے علاوہ بعض دوسری قسم کی مثنویوں میں بھی ہمیں جنگ کے مناظر ملتے ہیں اس سلسلے میں میر تقی میر کے "قصیدہ نامہ" کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان مثنویوں کا موضوع دراصل شکار ہے۔ لیکن جہاں تک منظر نگاری کا تعلق ہے یہ بلا تکلف جنگی مثنویوں کی فہرست میں شامل کی جا سکتی ہیں چند شعر ملاحظہ کیجئے اور پھر یہ فیصلہ فرمائیے کہ کیا یہ ظاہر یہ کسی جنگ کے منظر سے متعلق نہیں معلوم ہوتے۔

ہوا فیل باراں کا جنگل میں شور　　　　برسنے لگا مینہ تیروں کا زور !
پریشاں ہوا جس سے ابر سیاہ　　　　لگی پڑنے بجلی سی تیغ سپاہ
چلے پہروں واں تیر و بندوق زور　　　　جہاں چلتے پھرتے نہ تھے مار و مور

آخر میں ایک سوال کی جانب آپ حضرات کو متوجہ کر کے میں رخصت ہوتا ہوں۔ جن مثنویوں میں سے جنگی مناظر ابھی ابھی پیش کئے گئے، ان کے علاوہ بھی ہمارے ادب کا بہت بڑا حصہ اسی قسم کے تدمیہ تصورات پر مشتمل ہے۔ مثنویوں میں خاص طور پر جنگ کی ہنگامہ خیزی کے مناظر کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ شاعر موضوع کے اس جزو پر بہت زیادہ زورِ قلم اور قوتِ سخن صرف کرتا ہے۔ کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ہمارا ذہن اجتماعی جنگی مسائل پر سوچنے کا عادی ہے؟ اور جنگ کی تمام ہیبتناکیوں اور تباہ کاریوں کے باوجود اس کا محبوب موضوع غور و فکر ہے۔

حامد صدیقی

قلعۂ اوسہ

(آثارِ دکن کا سلسلہ)

اوسہ تعلقہ لاتور کا ایک قصبہ ہے۔ پہلے ضلع عثمان آباد کا ایک تعلقہ تھا۔ لیکن ضلع بندی میں یہ تعلقہ قصبہ ہوگیا۔ یہ بستی عہدِ قدیم سے ہے ۱۰۱۱ھ میں مرتضیٰ نظام شاہ کے مقابلہ میں ملک عنبر کو فتح ہوئی اور اس نے اوسہ کا نام "عنبر پور" رکھا جو کثرتِ استعمال سے امراپور ہوگیا تھا۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلا کہ اوسہ کا نام کب اور کس طرح پڑا۔ یہ مقام عادل شاہیہ۔ نظام شاہیہ، بریدیہ، اور مغلیہ دورِ حکومت میں اہم رہ چکا ہے۔ یہاں ایک قلعہ بھی ہے۔

تاریخِ فرشتہ میں مرقوم ہے کہ یہاں کا قلعہ ۸۷۱ھ میں عادل شاہیوں کے قبضے میں تھا۔ ۸۷۶ھ میں اس پر بہمنیوں کا تسلط ہوگیا۔ قاسم برید جو دراصل ترکی غلام تھا، ابتداء ہی سے لائق اور مدبر شخص تھا۔ اس کا عروج ۸۹۲ھ میں ہوا اور ۸۹۵ھ میں وزیر ہوا۔ قلعہ اوسہ و قندہار و اودگیر و کلیانی وغیرہ پر قابض اور متصرف رہا۔ اور آگے چل کر بادشاہ ہوگیا۔ اس طرح اس نے پندرہ سال سلطنت کرکے ۹۱۰ھ میں انتقال کیا۔ ۹۹۲ھ میں جب کہ برہان نظام شاہ بن احمد شاہ بحری والیٔ احمد نگر نے قلعہ اوسہ کا محاصرہ کیا تو "علی برید" (جو قاسم برید کا پوتا تھا) نے ابراہیم عادل شاہ والیٔ بیجاپور کی خدمت میں "قلعہ کلیانی" پیش کرکے استمداد چاہی۔ ابراہیم عادل شاہ بعزمِ اعانت اوسہ آیا اور علی برید سے مل کر نظام شاہ کے مقابلے کے لئے تیار ہوا۔ اوسہ سے ایک کوس کے فاصلے پر بہ جانب مشرق ایک چھوٹا سا ٹیلہ اور ایک مسجد ہے عموماً "سلطان ٹیکری" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقام پر لڑائی ہوئی اور نظام شاہ نے دشمنوں کو پسپا کردیا اور قلعہ فتح کرکے اودگیر چلا گیا۔

۱۰۱۲ھ میں مرتضیٰ نظام شاہ اور ملک عنبر کا مقابلہ بھی اسی مقام پر ہوا۔ اس لڑائی میں نظام شاہ کو شکست ہوئی اور ملک عنبر کامیاب ہوا۔ لیکن ۱۰۶۹ھ میں یہ قلعہ اورنگ زیب کے قبضے میں آگیا۔

(۲)

آبادی سے بالکل ملا ہوا جانب جنوب ایک قلعہ ہے جس کی فصیل اور برج آج تک درست حالت میں ہیں۔ اس کی تعمیر مربع ہے اور اس قلعہ کا دَور بھی تقریباً ۴۰ یا ۵۰ ہزار فٹ ہوگا۔ قلعہ کے اطراف خندق بھی بنی ہوئی ہے۔ جس کا عمق تقریباً ۲۵ فٹ ہے۔ خندق سے فصیل کا فصل بھی ۱۵۰ فٹ کے قریب ہے۔ اس قلعہ کے سات دروازے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) چینی دروازہ (۲) احتشام دروازہ (۳) لوہ بندی دروازہ (اس دروازہ پر لوہے کے کیلے اور پتر لگے ہوئے ہیں اور اس دروازے کے داہنے ہاتھ کو گاڑی خانہ اور بائیں کو دالان بنے ہوئے ہیں)۔ (۴) عاشور خانہ دروازہ (۵) نوبت دروازہ (۶) سادات دروازہ (۷) گھریالی دروازہ۔

اس قلعہ میں ایک مسجد بھی نہایت خوبصورت بنی ہوئی ہے۔

قلعہ زمین دوز ہے۔ آبادی میں سے کچھ کچھ حصہ برج کا اور بالا حصار نظر آتا ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر بروز دوشنبہ ۱۰ ربیع الاول ۱۰۰۳ھ میں ہوئی ہے۔ اس کے بعد عادل شاہیوں کے زمانۂ حکومت میں کچھ ترمیم و تعمیر ہوئی جس کی تاریخ اس مصرعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

اصل او ساز دولت عادل

(الف) قلعہ کی خندق کے بعد چھوٹی (۱۰۲۱ھ) فصیل ہے اس کے مغربی برج پر ناگری خط میں کتبے لکھے ہوئے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ فصیل کی تعمیر مرتضیٰ نظام شاہ کے عہد میں ہوئی، کتبوں کی نقل حسب ذیل ہے۔

پہلا کتبہ۔

ह बमाने हजरत मुर्तुजा निजामशाह कारकर्द
کارکرد نظام شاہ مرتضیٰ حضرت زمان در

खान मलिक आजम मलिक अंदर रास
راس اندر ملک اعظم ملک خان

तुंगा करदन खराज खान आजम जोहर
جوہر اعظم خان خراج کردن پلونگ

अलफ शके १५२९ नाम संवत्सरे माघ
ماگھو سمبھر نام ۱۵۲۹ شکے الف

دوسرا کتبہ۔

मुर्तुजा निजामशाह दर जमान
زمان در شاہ نظام مرتضیٰ

अंदर कारकिर्द खान आजम हजरत
حضرت اعظم خاں کارکرد اندر

रास खुराज सोहर सन मलिक
ملک سن سوہر خراج و راس

शके १५२९ प्लेग जोहर खान
خاں جوہر پلونگ ۱۵۲۹ شکے

मासे मोहर्त गभाडु समान अलफ
الف ثنان بھاڑ مہورت ماسے

नाम संवत्सरे माघ
ماگھ سمبھر نام

(ب) تیسرا کتبہ جو صدر دروازہ کے اندر دوسرے دو دروازہ کے متصل کوٹھے پر داہنی طرف نصب ہے:

रासता व घंती नजीक दरवाजा लोह
لوہ دروازہ نزدیک گھنٹی و راستہ

बन्दी कारकिर्द जनाब तुर्क नान
نان ترک جناب کارکرد بندی

ठाणेदार कुठारा सन सात सो तीन
تین سو سات سنہ کوٹھارا و ٹھانہ دار

सोमवार माहे रबीलावल मोरतब भाले
بھالے مرتب ربیع الاول ماہ سوموار

(ج) قلعہ کی چھوٹی سی فصیل کے بعد بڑی فصیل ہے جو حصار قلعہ کہلاتی ہے۔ ان فصیلوں پر کل ۳۲ برج ہیں۔ جن میں سے ایک برج "بلند برج" کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت پیاری بی صاحبہ کوگی اس میں زندہ دفن ہوئیں۔

(د) اس قلعہ میں توپیں بھی ہیں۔ بعض تو ضائع ہو گئیں اور بعض پڑی ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) نظام شاہی (۲) کنتی (۳) بہتری (۴) بھوسلی (۵) کڑاک بجلی (۶) سنتھیو (۷) افغانی (۸) ہسری (۹) شیر دہاں (۱۰) لم چھڑی (۱۱) کالا پہاڑ

(ک) ان توپوں سے ایک توپ قابلِ ذکر ہے جس کی لمبائی ۸ فٹ ہے اور دہانہ ۱۰ انچ کا ہے۔ پتھروں کے گولے کے سوائے ایک مجوف آہنی گولہ بھی ہے۔ اس میں ایک سوراخ ہے جس میں بوقت حملہ تیر نشتر اور لوہے فولاد کے ٹکڑے وغیرہ بھرے جاتے تھے۔ مجوف گولے کا وزن ۵۵ سیر کا ہے۔

اس توپ پر یہ کتبہ کندہ ہے۔

ابوالغازی شاہ نظام عمل استاد محمد ابن حسین رومی۔
۹۵

دوسری توپ پر ایک کتبہ انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ حروف برابر پڑھے نہیں گئے اور کچھ حروف تو حرف غلط کی طرح مٹ گئے ہیں۔

(ز) اس قلعہ میں مکانات بہت سے ہیں مثلاً باروت خانہ، اور لنگر خانہ وغیرہ لیکن یہ سب خراب حالت میں ہیں موسم بارش میں ٹپکتے ہیں۔

(ح) اس قلعہ میں ایک تہ خانہ بھی ہے۔ یہ تہ خانہ سطح زمین کے اندر ہے اور اس تہ خانہ میں بیس محرابیں ہیں۔ اوپر سے اس کی چھت ایک حوض کے مانند معلوم دیتی ہے جس کا طول تقریباً ۷۵ فٹ اور عرض ۵۰ فٹ ہے۔ یہ چھت گچ کی بنی ہوئی ہے اور نہایت ہی صاف ہے۔

(ط) دوسرا مکان قلعہ کے دروازے کے متصل برج پر بنا ہوا ہے قلعہ کے اندر کسی زمانے میں رنگ محل اور عشرت محل تھے۔ لیکن اب بالکل کھنڈر ہو گئے ہیں صرف نام باقی رہ گیا ہے۔ اسی طرح دو انبار خانے گنگا اور جمنا تھے یہ بھی منہدم ہو گئے ہیں۔

(ی) اندرون قلعہ و بیرون فصیل کلاں متعدد پختہ باؤلیاں بنی ہوئی ہیں۔ چنانچہ بیرونی دروازے کے باہر ہی برابر برابر تین بڑی پختہ باؤلیاں اب بھی موجود ہیں۔

(ک) چھوٹی اور بڑی فصیل کے درمیان قلعہ کے دروازے سے تھوڑے ہی فاصلہ پر بجانب جنوب قلعہ دار کا مکان تھا لیکن وہ بھی منہدم ہو چکا ہے۔ صرف ایک دروازہ باقی ہے جس پر

یہ کتبہ لکھا ہوا ہے۔

خدایا تو ایں قصبہ پائندہ دار　　به اجلاس داود علی ذی دول

سروش از پئے سال تاریخ گفت　　نموده مسمی ز عشرت محل
۱۵۰۵ھ

(ل) اس قلعہ کی قدیم عمارتوں میں ایک جامع مسجد بھی ہے جو سنگ سیاہ سے بہت خوبصورت بنائی گئی ہے اور جس کے سیاہ ستون نہایت عمدہ ہیں۔ مسجد کا طول ۳۲ ہاتھ اور عرض ۲۸ ہاتھ اور بلندی ۵۰ ہاتھ کے قریب ہے یہ اب بھی درست حالت میں ہے۔ محراب کے کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد اورنگ زیب کے زمانے میں پڑی۔

درزمان شاہ دیں اورنگ زیب　　گو بہ گیتی سایۂ لطف خداست

بندہ اش جان و دل سہراب خاں　　بانی ایں مسجد نزہت فزاست

شد رقم از بہر تاریخ بنائے!　　مسجد والامکان دل کشاست
۱۰۹۱ھ

بیت

ایں دل پذیر مسجد ایں دلکشا مقام　　از اہتمام نور محمد شدہ تمام

(داروغہ تعمیر مسجد سید بابو)

(م) بیرون قلعہ ایک گنبد ہے جس کو "تیلی گنبد" کہتے ہیں۔ اس پر حسب ذیل کتبہ لکھا ہے

سپہر عصمت مہر النساء کریمہ عصر!　　کہ مرغ روحش پرواز کرد بر افلاک

برائے تربت او روضۂ بنا کردند　　کہ خیرہ ماند در و دیدۂ اولوالادراک

چو خواستم ز خرد سال فوت و روضہ:　　خرد بگفت طلب از حروف روضۂ پاک
۱۰۳۲ھ

(۳)

یہاں بڑے بڑے بزرگانِ دین آرام فرما ہیں۔ جن میں حضرت خاکی شاہ قدس سرہ العزیز۔ حضرت میر مہدی شاہ قدس سرہ العزیز حضرت برہان شاہ قدس سرہ العزیز۔ حضرت برہان الدین عرف سید سادات قدس سرہ العزیز۔ حضرت برخوردار خواجہ نقشبند قدس سرہ العزیز بہت مشہور ہیں۔ حضرت خاکی قدس سرہ العزیز کا زمانہ بہت قدیم ہے۔ آپ تعمیر قلعہ کے ۳۴ سال بعد تشریف لائے۔ کیونکہ مندرجۂ ذیل تاریخی مادوں سے یہ سنہ نکلتے ہیں۔

خاکی بقیام　　خاکی بمقام

۷۸۴　　۸۱۴

(۴)

یہاں ایک دیول ملیّا مہاراج کا ہے جو ۱۲۰۸ف میں تیار ہوا۔ اس دیول میں پتھر کا کام بڑی صنعت گری سے کیا گیا ہے۔ دیول میں تین حجرے ہیں۔ ایک حجرے میں خود ایرپا کا اور دوسرے میں گنڈو مہاراج کا اور تیسرے میں ناتھ کا سمادہ ہے۔

قاضی سراج الدین احمد نیّر

میر محمد مومن۔ سلطنت قطب شاہیہ کے مشہور پیشوا، سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم حیدرآباد کے مشہور تعمیر کار اور مصلح اور بانیٔ دائرہ میر مومن کے حالاتِ زندگی اور علمی و رفاہی اور سیاسی کارناموں کا مفصل تذکرہ ہے۔ جس کو جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے مرتب کرکے ادارہ کی طرف سے شائع کیا ہے۔ یہ ضخیم کتاب (۴۰۰) سے زیادہ صفحات اور (۱۴) عکسی تصاویر پر مشتمل ہے دکن کی علمی و سیاسی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حیدرآباد کے اس سابق وزیر اعظم کے کارناموں کے مطالعہ سے مفید معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب قیمت مجلد ۸/

وداع

آج وہ اور کے ہمراہ چلی جائے گی !

دل میں بے جان سے ارمانوں کا طوفان لئے
اپنے لب پر کوئی سہما ہوا پیمان لئے
تھرتھرائی ہوئی، سہمی ہوئی، گھبرائی ہوئی
آہ، کہنے کو ذرا یونہی سی شرمائی ہوئی !!

سرخ آنچل میں رخِ زرد چھپانے والی
اپنے ارمانوں کا خوں اوڑھ کے جانے والی
طے کرے گی رہِ ہستی کو وہ ناداں کیونکر !
آہ، سلجھائے گی وہ زلفِ پریشاں کیونکر!

راہ پُرخار ہے اور غم کی گھٹا چھائی ہے
ساتھ والا تو فقط نور کا سودائی ہے !
رنگِ رخسار پہ آجائے سیاہی نہ کہیں
اٹھ نہ جائے درِ ایثار و تحمل سے جبیں

ڈر ہے آنکھوں سے نکل جائے نہ پھر ضبط کا تیر
پھیل جائے نہ کہیں شام سے کاجل کی لکیر
دردِ فردا نہ بنے عشرتِ ماضی کا خیال
اُن گھنی پلکوں پہ تڑپے نہ کہیں اشکِ ملال

آج وہ اور کے ہمراہ چلی جائے گی !
درد بن کر دلِ شاعر میں جگہ پائے گی

— نظر

خدمات شاعرہ

زمیں سے کی ہے فلک تک پیمبری میں نے
ہر ایک ذرے کو بخشی ہے دلکشی میں نے
عطائے خاص میں اپنی نہ کی کمی میں نے

مری نوا کی حیات آفرینیاں توبہ !!
کہ زندگی کو دیا درسِ زندگی میں نے

بنا کے سبزۂ تازہ کو فرشِ صحنِ چمن !
نسیمِ صبح کو شانِ خرام دی میں نے

چمن چمن میری رعنائیوں کے آئینے
کلی کلی کو عطا کی شگفتگی میں نے

جبینِ گل کو زر افشاں بنا کے شبنم سے
شعاعِ مہر کو تکلیفِ دید دی میں نے

کبھی جو منظرِ فطرت پہ اک نظر ڈالی
تو بخش دی مہ و انجم کو روشنی میں نے

سمجھ سکے نہ جسے اہلِ معرفت وہ راز
بیاں کئے ہیں بعنوانِ شاعری میں نے

بنا کے اپنی نگاہوں کو آشنائے مجاز
مجاز میں بھی حقیقت کی سیر کی میں نے

بتائے اہلِ طریقت کو رازہائے نیاز
سکھائی اہلِ محبت کو کافری میں نے

نوائے سرمد و منصور و قیس بن بن کر
کسی کو چھیڑ دیا ہے کبھی کبھی میں نے

یہ سب زمان و مکاں عرش و فرش میرے ہیں
کہ ان میں اپنی حقیقت کی سیر کی میں نے

مری نیاز کے آگے جھکے ہیں سب کے سر
لباسِ عجز میں کی ہے خدائی بھی میں نے

یہی ہے بس مری روداد مختصر اختر
زمیں سے کی ہے فلک تک پیمبری میں نے

— سیدہ اختر

قہر!

دروازے پر معمول کی طرح دستک پاتے ہی فہیمہ فوراً دروازہ کھولنے بڑھی۔ نمک مرچ اور مسالے سے لت پت ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کر کے دوسرے ہاتھ سے چٹخنی اتار دی اور شوہر کی طرف ایک سہمی ہوئی نگاہ ڈال کر فوراً اندر چلی آئی!

ناظم کے داخل ہوتے ہی وہاں کھیلنے والے چھوٹے چھوٹے بچے اسے چمٹ گئے لیکن ۔۔۔۔۔۔

"ٹھیرو بے الو کے پٹھو! یہ گھر ہے کہ شیطانوں کا اڈا! قسم لے لو جو گھر میں ذرا بھی سلیقہ ہو! ہر طرف سامان بکھرا ہوا۔ فرش الٹا سیدھا۔ توبہ توبہ! ۔۔۔۔ اس گندگی میں تو بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا!"

ناظم کے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ سارے بچے کبھی کے رفوچکر ہو گئے اور ناظم کو باورچی خانے کی طرف آتا دیکھ کر فہیمہ جلدی جلدی ساری چیزیں قرینے سے رکھنے لگی۔

"میرے آنے پر ہی تمہیں سب سوجھتا ہے؟ گھر میں ذرا نظر ڈالو تو بیٹھنے لائق جگہ بھی نہیں دکھائی دیتی! گھر بھی ذرا صاف ستھرا نہیں رکھا جاتا۔ گھر سے بہتر تو کسی ہوٹل میں سکون مل جاتا!"

بڑبڑاتا ہوا ناظم منہ دھونے چل دیا ۔۔۔

ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں سے اس کا غصہ سرد پڑ جائے گا سمجھ کر فہیمہ نے تولیہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے مسکرا دیا جیسے اس کی مسکراہٹ کہہ رہی ہو ۔۔۔ "آخر اس قدر غصہ کیوں؟"

ناظم کے بیٹھتے ہی فہیمہ نے ایک رکابی میں کچھ میٹھا دیا اور اسٹو پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا۔

میٹھا حلق سے اترا اور پانی کے ٹھنڈے گھونٹوں نے اس کے مزاج کو معتدل بنا دیا۔ وہ بڑی ہی متانت سے کہنے لگا۔

"فہیمہ تم عجیب ہو! تم ہی غور کرو میں تھکا ماندہ سکون اور آرام کے لیے گھر آتا ہوں اور یہاں گھر میں ہر طرف اداسی پریشانی! اور تم بھی گھر کے کاموں میں محو! کیا یہ سب دیکھ کر کوئی خوش بھی رہ سکتا ہے؟"

"لیکن میں کیا کروں؟ دو مرتبہ جھاڑو دی! بچوں کو کیا کروں؟" چائے کی پیالی ناظم کے ہاتھ میں دے کر اور دوسری خود لے کر وہ وہیں بیٹھ گئی۔ "تمہارے بچوں کو تم نہیں سنبھال سکتیں! کتنی شرم کی بات! کیوں تم نے بچوں کو اس قدر گستاخ بنا دیا؟"

"مگر ہر روز تھوڑی ایسا ہوتا ہے۔ آج میں ذرا کباب بنانے میں لگ گئی تھی ۔۔۔۔"

"خوب! میرے آنے کا وقت تو معلوم تھا نا۔ پھر کیوں اسی وقت کام نکالا؟ آخر عورت ذات ہی تو ۔۔ ۔۔ عورتوں کے نزدیک زبردست حربہ تو رونا ہے ہی! دو آنسو سیکڑوں الفاظ پر بھاری ہوتے ہیں!" اور پھر تسلی دینے کے لئے سنجیدگی سے بولا ۔۔

"میری بات جھوٹ ہے! کیا میں اتنی بھی توقع نہ کروں کہ میری سگھڑ اور پڑھی لکھی بیوی اپنے چھوٹے سے گھر اور اس کے سامان کو پاک و صاف رکھے؟"

فہیمہ چپ تھی اس کے چہرہ کا رنگ بتا رہا تھا کہ وہ آج بہت کچھ کہے گی۔ کچھ دیر جواب کا انتظار کر کے پھر ناظم کہنے لگا "کم از کم باتیں کر کے تو شوہر کو خوش کرو! پہلے کی عورتوں جیسی گرہستی سے دلچسپی اور کارکردگی تو تم میں ہے نہیں۔ یہ نہیں تو نہ سہی کچھ اپنی جدت دکھاؤ! یہ بھی نہیں تو کم از کم دلکش ادائیں اور موہنی ہنسی ہی سہی!"

فہیمہ نے اپنی مہر خاموشی کو نہ توڑتے ہوئے صرف ایک بار شوہر کی طرف دیکھا۔ ناظم پھر کہنے لگا۔

"وہ سامنے والی کو دیکھتی ہو نا؟ بے چاری گیارہ بجے سے

پانچ تک نوکری کرتی ہے مگر کیسی ٹیپ ٹاپ سے رہتی ہے!۔ نوکری
اور پھر انداز اور موہنی ادائیں! ان دونوں چیزوں کو وہ کس طرح
سنبھالتی ہے! وہ کوئی جنت کی حور تو ہے نہیں پھر بھی اس کی طرف
دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے! بالوں کا خاص انداز سے جمانا اور
پھر گوری گوری گردن پر چوٹی کو بیچ دے کر باندھنا جھالر کی آستینوں
اور گول گلے کا بلاؤز۔ اس کے رنگ پر کھلنے والے بندے اور پھر
ہلکے رنگ کی صاف اور ستھری ساڑی ـــ

ــ "بس ہو گیا وعظ شروع؟" پیالیاں اٹھاتے ہوئے فہمیدہ نے
تنک کر کہا

" غلطی اور پھر زبان درازی، چوری اور سینہ زوری ــــ
صرف دوسروں کو تم ٹھیک نہیں رکھ سکتیں۔ آخر اپنا سلیقہ اور ہوشیاری
دکھاتی کہاں ہو؟ پڑھے لکھے اور جاہل سب ایک سے!"

" چولھا چکی اور بچوں کے گھٹے ہوئے ماحول میں سلیقہ اور ذہانت!
کہاں کہاں" فہمیدہ نے بلند آواز سے کہا۔

" ہاں ہاں میں تو بھول ہی گیا۔ تفریح کرنے کے لئے
گھر میں پارٹی نہیں، ناٹک میں پارٹ کرکے نام حاصل کرنے کے لئے
اسٹیج نہیں! اور۔ شادی کرکے میں نے تمہاری ساری صلاحیتوں کو
تو دفن ہی کر دیا!" ناظم نے کسی قدر مسکراتے ہوئے لیکن طنز آمیز
انداز میں کہا ــــ

لمحہ بھر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بات کا اس قدر
طول پکڑ لینا کسی کو اچھا معلوم نہ ہوا ــــ فہمیدہ بہت کچھ کہنا چاہتی
تھی، لیکن آنسو امڈے چلے آ رہے تھے۔ بڑی کوشش کے بعد وہ
صرف اتنا ہی کہہ سکی ــــ یہ چولھا چکی، نمک مرچ تو ہماری اماں
جانتی بھی نہ تھیں ــ"

اس کے دماغ میں ناظم کے الفاظ گھوم رہے تھے ــــ
وہ سامنے والی کتنی سگھڑ ہے! اس کی شوخی اور چنچل پن کتنا اچھا
معلوم ہوتا ہے!" ناظم نے لفظ "اچھا" کچھ اس انداز سے ادا کیا
تھا کہ جیسے وہ اس کی دید سے بڑی مسرت محسوس کرتا ہے فہمیدہ کے
تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ بل کھا کے اٹھی! چولھے میں کوئلے اور
لکڑیاں زور سے ٹھونس کر ہانڈی چڑھا دی! چولھے اور فہمیدہ
کے دل دونوں میں آگ جلنے لگے اسے محسوس ہوتا ــــ بولے
.......خوب بولے۔ یوں بولے۔ ......ایسا بولے.....

لیکن اس کا دل بھر آیا تھا۔ جذبات کی رو ایک دوسرے پر چڑھ
دوڑ رہی تھی۔ الفاظ کی صورت اختیار نہیں کر رہے تھے۔ دل
ہی دل میں سب......ــــ

حالات کو پوری طرح بگڑے ہوئے پاکر ناظم اٹھا۔ وہ بھی لال
پیلا ہی تھا۔ ٹوپی سر پر رکھ کر باہر نکل گیا۔ جاتے وقت البتہ اس کے
دروازہ بند کرنے کی آواز فہمیدہ کے کان اور دل پر ٹپکی۔ چولھے پر
ہانڈی ویسے ہی چھوڑ کر وہ باہر آئی۔ اس نے دروازے کی کنڈی
چڑھا دی لیکن اس کے دل کے سارے دروازے کھل گئے! اتنی
دیر دبائے ہوئے جذبات، روکے ہوئے آنسو ــــ سب نے
ایک ہی شکایت کی! ــــ

ــــ سچ مچ میں نے آج گھر صاف نہیں رکھا۔ وہ آنے سے
پانچ منٹ پہلے باہر کی کوٹھری ٹھیک کر دیتی تو! کتنا اچھا ہوتا!
لیکن کیوں مجھے آج یہ خیال نہ آیا؟ ــــ

ادھر دال کب کے گل چکی تھی۔ لیکن وہ خیالات کی ترنگ میں
بڑی دیر تک کھوئی رہی۔ اب جو وہ بگھار دینے لگی تو چر۔ ر۔ ر آواز
ہوئی اور اس کے دل میں بھی ایک قسم کی چرچراہٹ محسوس ہوئی!

ــــ وہ سامنے والی عورت ......اس کی ادائیں، ٹیپ
ٹاپ ...بالوں کا جوڑا، گوری گردن......اس کی طرف دیکھنے
کو جی چاہتا......!

'کس کو؟' اس کے شریر دل نے سوال کیا۔

"تمھیں اسے دیکھنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ۔ ۔ !"

فہیمہ کے دل میں رشک، حسد اور گمان کی آندھی چلنے لگی۔

"واقعی میں بدصورت ہوں۔ میں نخرے نہیں جانتی۔ گھر کا سلیقہ نہیں معلوم۔ بچوں پر کوئی خیال نہیں میرا۔ پہلے کی عورتوں جیسی کارکردگی نہیں مجھ میں۔ بات بھی کرنا نہیں آتا۔ تعلیم کی کوئی جھلک میرے برتاؤ میں نہیں۔ میں یوں ہی ہوں، بیکار! اگر دوڑتی ہوئی جاکر سمندر کی موجوں میں گھس جاؤں تو؟" اس قسم کا ایک بھیانک خیال بجلی کی طرح اس کے دماغ میں چمک گیا۔

مگر فوراً ہی وہ اپنے آپ پر ہنسنے لگی —— رات کی فضاء پر خاموشی چھاتی جارہی تھی —— ابھی تک ناظم کا پتہ نہ تھا۔ اس کا دل برابر کہہ رہا تھا "ابھی تک کیوں نہیں آئے؟"

نو بج گئے، ناظم گھر نہ آیا۔ فہیمہ کے دل پر سیکڑوں اندیشے رینگنے لگے۔ وہ برابر دروازے تک آنے جانے لگی۔ "جو ہوا سو ہوا۔ اب اپنی غلطی کو درست کرنا چاہئے۔ گھر آنے پر انھیں اب خوش ہونا چاہئے۔" یہ سوچ کر فہیمہ نے فوراً اسٹو جلایا۔ پاپڑ تلے، ٹماٹر کی چٹنی بنائی! آج کے کھانے پر دو چیزوں کا اضافہ کردیا

شوہر کی مرضی کے مطابق کھانا تیار کرنے سے فہیمہ کو ایک گونہ مسرت ہوئی۔ اس کے بعد اس نے بالوں کو درست کرکے بڑا ہی اچھا جوڑا باندھا اور اسے وہ جوڑا اور گوری گردن یاد آگئی! غصہ کی ایک تیز رو اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔

لیکن...... غلطی کی اصلاح ہونی ہی چاہئے۔ آخر کسی ایک کو شکست کھانی ہوگا؟ یوں ہی جھگڑا کیونکر مٹے گا؟ ——

پھر ایک بار اس نے اپنے بالوں کا جوڑا جیسا بھی وہ باندھ سکتی تھی باندھ لیا اور منہ دھو کر ساڑی بدل لی! گھڑی نے دس کا گھنٹہ بجایا۔ پھر بھی ناظم نہ آیا! اب البتہ فہیمہ کے صبر کا پرسکون دریا ہلکورے لینے لگا۔ وہ باہر کے برآمدے میں انتظار کرتی کھڑی ہوئی۔

راستے کی آمد و رفت تقریباً بند ہوگئی تھی۔ سامنے کے بڑے پیپل کے نیچے کی ایک قبر رات کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھی۔ آج ہی اس پر ایک سبز غلاف ڈالا گیا تھا جو فہیمہ کو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ قریب ہی ایک دیا جل رہا تھا۔

قبر! —— مزار!!

فہیمہ نے ایک لمبی سانس لی۔ بہت دنوں کی تھی وہ قبر۔ وہ روزآنہ اسے دیکھتی تھی۔ لیکن آج؟۔ آج وہ نئے سرے سے اس کی حقیقت جان گئی ——

"تجھ [illegible] شادی کا کیڑا [illegible] ذہانت، سلیقہ اور امنگوں کو میں نے دفن کردیا!" یہی ناظم کا کہنا تھا جو وہ [illegible] بول گیا! قبر...... قبر...... قبر۔ فہیمہ کا سر چکرا گیا۔ سمجھی تھی کہ دوسروں کی زندگی کی نسبت اپنی ازدواجی زندگی ایک خاص پیغام ثابت ہوگی۔ وہ آزاد رہے گی۔ لیکن بیماری، حمل اور زچگی نے کچھ ہونے ہی نہ دیا! اور آخر کار گرہستی کے جوئے میں جُت جانا پڑا! اب [illegible] سارا دن [illegible] سمجھیں کہ میں [illegible] گیا، اب گھر کے معاملوں میں دماغ کیا کام کرے گا؟ کوئی [illegible] بڑا بوڑھا تو گھر میں ہے نہیں جو بتاوے۔ غلطی ہوجائے تو [illegible] عقلمندی، ذہانت، تعلیم، سلیقہ — سب طنز! غلطیاں بھی کیسی؟ روزمرہ کا مسالہ، گھر کی روٹی سالن کی! کہاں شادی کے فوراً بعد کے سہرے بھرے دن اور کہاں اب یہ خزاں! گزشتہ چھ برسوں میں کچھ لکھی اور نہ پڑھی! قبر نہیں تو اور کیا؟ میری شادی [illegible] ذہانت اور جولانی دفن ہوگئی! —— شادی میں مجھے بھی تو سرخ جوڑا پہنایا گیا تھا جیسے اب بھی لال چادر اوڑھائی جاتی ہے نا! —— اور قبر پر غلاف چڑھا ہوتا ہے۔ بس!!

کسی چیز کے جلنے کی بو آئی اور وہ فوراً باورچی خانے میں چلی گئی۔ دل میں ابال آگیا تھا [illegible] جیسے [illegible] کہہ رہی تھی —

تمھارے خیالات کی ترنگ نے مجھے رسا کر دیا! ـــــ

فہیمہ ناظم کے انتظار میں برآمدے میں ٹہل رہی تھی یکایک اس کی نظر سامنے والے مکان پر پڑی۔ اس نے دیکھا۔ دو کوٹھریاں دو پلنگ کھونٹیوں اور تار پر پھیلی ہوئی ساڑیاں ـــــ بلا گوزا اس گھر کے لوگوں کے متعلق فہیمہ کو بڑی تشویش تھی۔ آٹھ دن پہلے ہی یہ لوگ آئے تھے۔ ناظم نے جس عورت کا ذکر کیا وہ بھی اسی گھر کی تھی! لیکن وہ تو وہاں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ البتہ کوئی آدمی کسی سوچ میں اودھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ فہیمہ نے غور سے دیکھا۔ جیسے وہ اس کا جانا بوجھا تھا۔ دونوں کی پرانی ملاقات تھی ـــــ وہ اس کا پھوپھی زاد بھائی ہی تو تھا ـــــ فہیمہ نے آواز دی ـــــ

" فضلو ـــــ

وہ آدمی فوراً کھڑکی کے پاس آیا۔

" ایں! فمو؟ تم یہاں رہتی ہو کیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

" ہاں میں یہیں رہتی ہوں۔ مگر اتنے دن تم نظر نہیں آئیں؟ البتہ ایک پڑھی لکھی اور کمائی پوت لڑکی سے شادی کرنے کی خبر تھی! کہاں ہے ہماری بھابی!" ـــــ فہیمہ نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

" کمانے والی کا سکھ جھیل رہا ہوں! اس کے مدرسہ میں کوئی پارٹی ہے۔ اب تک نہیں آئی۔ ۱۱ بجنے کو آئے ہیں۔ میں روز چھ بجے آتا ہوں تو وہ ساڑھے سات بجے آتی ہے۔ گھر آنے پر کچھ دیر بیٹھ کر بات چیت کرنے کی توقع تو ہے نہیں! چائے کھانا کچھ بھی تو نہیں!

" تم تو یوں ہی بولتے ہو! اچھی کماؤ بیوی ہے! اور فیشن ایبل بھی۔ دیکھنے والوں کو تو بسمل بنا دیتی ہے۔" فہیمہ کے بچپن کی شوخی اجاگر ہو گئی۔

" فیشن کی طرح سب ویسا ہی ہوتا تو ٹھیک تھا! لیکن تم ہی دیکھو نا ـــــ میرے پیٹ میں چوہے ڈنڈ پیل رہے ہیں! اکیلے کھانے کو جی نہیں چاہتا ـــــ اس سے تو بہتر تھا کہ کسی سیدھی سادھی عورت سے شادی کرتا۔ کم از کم کھانا پکا کر مزے سے کھیں تو کرتا بیٹھا رہتا۔" فضلو نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑ کر اندرونی خلش کا اظہار کیا ـــــ فہیمہ کے لبوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کمرے میں چلی گئی ـــــ

دروازے پر دستک ہوئی۔ فہیمہ نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا۔ ناظم اندر آیا ـــــ دونوں کھانے کے لئے دسترخوان پر بیٹھ گئے ـــــ " یہ کتنا بہت سا ڈال دیا! میں بھی کوئی پیٹو ہوں؟" ناظم نے کہا۔

" لاؤ نکال لوں ـــــ بس نا! ـــــ"

" اتنی جلدی یہ تبدیلی!" چٹنی اور پاپڑ کی طرف اشارہ کرکے اور فہیمہ کے بالوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا ـــــ زندگی میں ایک دوسرے کا خیال، طبیعت اور پسند کا لحاظ رکھیں تو ہماری ازدواجی زندگی ہی جنت ہے ـــــ واقعی فہیمہ تمھیں میرا بڑا خیال ہے۔ مگر میں تو ہر وقت بری طرح پیش آیا۔ میں نے تمھاری قدر نہ کی!"

" توبہ! ـــــ پھر کبھی نہ کہنا! ـــــ وہ سامنے والی فیشن ایبل اور کماؤ عورت کے شوہر کی قبر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ قبر کسے کہتے ہیں!" ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے فہیمہ بولی۔ ناظم نے گھبرا کر تشویش انگیز نظروں سے دیکھا اور پھر .... وہ اس کا پھوپھی زاد بھائی ہے اور کچھ دیر پہلے اس نے جو اس کی گرہستی کی تصویر دیکھی۔ وہ فہیمہ نے ناظم کے سامنے پیش کر دی ـــــ

" میں نے کچھ یوں ہی تم سے شادی نہیں کی! شہرت، نام اور ٹیپ ٹاپ کا خیال کرتا تو میرا بھی یہی حال ہوتا۔" ناظم نے کہا۔

"لیکن اس کی طرف دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے نا؟" فہیمہ نے کھانے کے بعد چھالیہ کاٹتے ہوئے کہا۔"

"تم دیوانی ہو! تمھیں شاید معلوم نہیں کہ مجھے اس لڑکی کا پیام آیا تھا۔ مجھے مجبور کیا جارہا تھا کہ میں اُس سے شادی کروں! لیکن میں آبگینے اور ہیرے میں تمیز کرسکتا ہوں! مجھے تمھارے اخلاق، سلیقہ اور عادتوں کا علم ہوگیا تھا! مگر اخلاق اور عادات کے ساتھ فیشن اور ٹیپ ٹاپ کو بھی ذرا سمودینا چاہیے۔ ایک اعتدال آجائے زندگی میں! دیکھو تو آج تم کتنی اچھی معلوم ہورہی ہو!"

فہیمہ کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ شگفتہ گلاب کی طرح کھل اٹھے۔ ایک بار دونوں کی نظریں ملیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں انھوں نے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

محمد عبدالقادر فاروقی

نیرنگیٔ دنیا

دیکھ! نیرنگیٔ دنیا رنگ وہ لانے لگے
بن گئے ایسے مہذب ناچنے گانے لگے

بھوکے پیاسے مر رہے تھے فاقہ مستانِ جہاں
اس نئی تہذیب میں پینے لگے کھانے لگے

وہ تھے ایامِ جہالت علم کا دورہ ہے یہ
عیب تھے پہلے ہنر اب وہ نظر آنے لگے

لکہائے ابر میں پوشیدہ تھے ذراتِ حسن
برقِ عالم بن گئے عالم کو برقانے لگے

پہلے چھپ چھپ کر ستاتے تھے یہ معشوقانِ دہر
عاشقوں پر اب کھلے بندوں ستم ڈھانے لگے

کش مکش ہائے جہاں سے تنگ آکر یہ حسیں
فارغ البالی کی خاطر بال کٹوانے لگے

قید میں روتے رہے پاکر نجات اس قید سے
کس لئے دیوانگان زلف چلانے لگے

رات کو اختر شماری اور دن کا یہ حساب
عاشقوں کو دن میں اب تارے نظر آنے لگے

زیورِ تعلیم سے ہونے لگے آراستہ
پہلے خود کھنچتے تھے اب تصویر کھنچوانے لگے

دیکھ کر دنیا کا نقشہ عقل چکرانے لگی
ایشیا میں رہ کے یورپ کی ہوا کھانے لگے

اتباعِ غیر نے تہذیب کا دھوکا دیا!
راہ پر آنے لگے یا ہاتھ سے جانے لگے

سید محمد حسین آزاد

سماج

ستم طرازِ مشیت مرے گماں میں نہ تھی — وطن کی خاک پہ غربت مرے گماں میں نہ تھی
میں خار و خس کی تو فطرت سمجھ بھی سکتا تھا — گل و سمن کی اذیت مرے گماں میں نہ تھی
فریب کاریٔ علم و خرد معاذ اللہ " — یہ فکر و ہوش کی ذلت مرے گماں میں نہ تھی
فروغِ علم نے اندھا کیا ہے کس کس کو، — اس آفتاب کی ظلمت مرے گماں میں نہ تھی
یہ ذکر و زہد یہ تسبیح، یہ رکوع و سجود — ان آئینوں کی کدورت مرے گماں میں نہ تھی
تباہ کاریٔ جرم و گناہ کی سوگند " — خدا فریب عبادت مرے گماں میں نہ تھی
جبینِ کفر و گنہ پر شکن تو دیکھی تھی " — عبادتوں کی رعونت مرے گماں میں نہ تھی
حریمِ مذہب و تقدیس و علم و عرفاں میں" — ضمیر و دل کی تجارت مرے گماں میں نہ تھی
فریبِ علم و فضیلت، دروغِ صوم و صلوٰۃ — تباہیوں کی یہ صورت مرے گماں میں نہ تھی
دروغ و کذب تو مردہ شکار تھے لیکن — کفن فروش، عدالت مرے گماں میں نہ تھی
جماعتوں کے جنازے تو میں نے دیکھے تھے، — قیادتوں کی قومیت مرے گماں میں نہ تھی
مرا ہی تیر مرے دل میں ہو چکا پیوست — مری نظر کی جراحت مرے گماں میں نہ تھی،
فریبِ لطف و وفا کھا گئی مری فطرت — کہ عطر و گل کی عفونت مرے گماں میں نہ تھی،
وہ بت کہ جن کو تراشا تھا خود پرستی نے، — انہی بتوں کی امامت مرے گماں میں نہ تھی
بہت فقیر تھے نظروں میں سر تراشیدہ — مگر کسی کی نبوت مرے گماں میں نہ تھی
وہ آدمی کہ جو اخلاق کا پیمبر تھا " — اس آدمی کی رذالت مرے گماں میں نہ تھی

اگر جبلتِ آدم بدل نہیں سکتی
دلوں کی ٹیس دلوں سے نکل نہیں سکتی!

شورؔ

نمودِ زندگی - (جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا دوسرا مجموعہ)
سید علی منظور صاحب نہ صرف حیدرآباد بلکہ تمام ہندوستان میں ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں ان کا کلام ہر معیاری اعلیٰ رسالہ میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کا کلام سادگی و پرکاری، جذب و کشش اور مشاہدات و جذبات کا بہترین مرقع ہے۔ اردو نظم نگاری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری اور مفید ہے۔ صفحات ۲۱۲ قیمت عہ/ سب رس کتاب گھر سے طلب فرمائیے!

"تماما"

بدھو ہمیں بھی گھوڑے پر بٹھا لو۔

آٹھ برس کی چلبلی بچی اپنے دونوں ننھے ننھے ہاتھ پھیلا کر گھوڑے کے سامنے کھڑی ہو گئی لیکن سوار بھی چالاک تھا کترا کر سامنے سے بچ نکلا اور گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا ایک چکر لگا آیا۔

نہیں بٹھاؤ گے بدھو۔

وہ بچی پھر سامنے آ ڈٹی۔ یہ تو کہو گھوڑا بے جان تھا ورنہ مزے کی سواری کرتی گھوڑے کی ایک لات اب تک اسے زمین پر سلا چکی ہوتی۔

بدھو بھی تاؤ میں آ گیا۔ کتنی چالاکی اور لوکا جھپٹی سے تو وہ بوڑھے بابا کی لاٹھی چرا پایا تھا اور اب اسی کو گھوڑا بنا کر دوڑا رہا تھا۔ سوچ بیچ میں جانے کہاں سے رجو ٹپک پڑی۔

چل ہٹ بڑی آئی بیٹھنے والی۔

اور گھوڑا سر سے آگے نکل گیا۔

لیکن راجہ کی بیٹی نہ ہونے پر بھی تو اس کا نام راج کماری تھا — پھر اپنی توہین کیسے برداشت کر لیتی۔

پہلے تو اس نے بدھو بدھو، بدھو کے آوازے کسے لیکن جب اس میں ناکام ہو گئی تو پھر زور زور سے چیخنا شروع کیا۔

بدھو۔ بدھو۔ بدھو۔ گدھو۔ ایک دو تو اس نے سنا لیکن سننے کی بھی تو حد ہوتی ہے۔

گھوڑا رک گیا۔ اور رجو کے بھاگتے بھاگتے تک اس کے گال تین چار طمانچے پڑ ہی گئے۔ تڑا خ۔ تڑاخ — بیچاری چکرا کر گر پڑی — ارے مائی رے۔

تین چار برس کی بات ہے۔

بدھو رام ابھی تک کھیت پر نہیں گیا ہے۔

بابا اسے بدھو رام کہتے۔ لیکن گاؤں کے لوگ بدھو۔

جا رہا ہوں بابا۔

جا بیٹا مٹر گدر گئی ہوگی۔ اس پوس کا مہینہ ہے۔ سب کے گھر کوتاہی ہوگی۔ کوئی نوچ لے جائے گا سیر دو سیر۔

وہ کھیت کی سمت چل پڑا۔

جاڑے کا دن، سورج ڈھل رہا تھا۔ گرام لکشمی لال پیلے نیلے سفید پھولوں کے ڈھیر میں چھپی بیٹھی تھی۔ بھونرے کیڑے اسے ڈھونڈھنے میں سرگرم تھے۔ بدھو رام کھیت کی مڈیر پر آ کر بیٹھ گیا۔ من کی مستی کو روک نہ سکنے کی وجہ وہ ایک گیت گنگنانے لگا۔ وہی جسے کئی سال ہوئے منشی جی کی برات میں لائی ہوئی ایک ممہ دتی نے گایا تھا۔ جس نے گھوڑا گدھا کتے، بلی اور چڑیوں کی بولیاں اور ریل گاڑی کی بھک بھک کی نقل بھی کی تھی۔

میرے من کی بات

بات یہ تھی کہ اب "میرے من کی بات" میں وہ نوچ وہ رس اور وہ سُر تال نہیں تھے کیونکہ گا رہا تھا ایک دیہاتی جس کے نزدیک رامچندر رام کرشن اور کنیو میں کوئی فرق نہ تھا۔

اسے کسی کے آنے کی آہٹ ملی۔ وہ چپ ہو گیا۔ وہیں مڈیر پر چپک گیا۔ آج وہ لوگوں کو دکھا دینا چاہتا تھا کہ کھیتوں کی رکھوالی یوں کی جاتی ہے۔ چور اسی طرح پکڑے جاتے ہیں — کوئی دھیرے دھیرے آیا اور کچھ دور جا کر بدھو کے کھیت میں بیٹھ گیا بدھو یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر سکتا رہا وہ بوٹ مسکی طرح رینگتا ہوا اس سمت چل پڑا جدھر سے پیڑ ملے کھنچنے اور چھیمیوں کے ٹوٹنے کی چٹ۔ چٹ چٹ۔ وہ سن رہا تھا جب وہ بالکل قریب آ گیا تو جھپٹ کر کھڑا ہو گیا۔

کون ہے۔ ... ... چور

آنے والے کو کاٹو تو خون نہیں۔ اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر مٹر کے پیڑ ہوتے ہیں آفت۔ مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ گنجان۔ پاؤں ایسے الجھے کر جھٹکا دیتے ہی منہ کے بل۔

کون رجو۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پر ایسی سکڑی جارہی تھی جیسے کہ زمین دھس جائے گی۔ تیرے مٹر نہیں ہیں، جو چوری کرنے آئی ہے —— بدھو سخت لہجہ میں بولا۔

گدرائی نہیں ہے ابھی —— اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تو کیا کسی اور کا کھیت نہیں تھا جو اسی میں آگھسی۔

پیٹو گے تو نہیں

اور کیا جیسے چھوڑ دوں گا —— باپ کا کھیت ہے نا

اس نے اپنا منہ اوپر اٹھایا —— اس پژمردہ اداس پیلے چہرے نے نہ جانے بدھو کے دل پر کیا اثر کیا۔

وہ اپنے آنچل کا کونہ کس کے پکڑے ہوئی تھی۔ اب چھوڑ دیا۔ ہری ہری پھلیاں نیچے گر پڑیں۔

جانتی نہ تھی کہ تم بھی........ اور وہ دھیرے دھیرے چل پڑی۔

بدھو۔ بدھو بنا وہیں کھڑا رہا۔

وہ آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

جانتی نہ تھی —— کیا نہیں جانتی تھی۔ میں پیٹوں گا نہیں۔ میرے کھیت میں چوری —— چوری کہیں کی —— بوڑھے نے آنے ہی کیوں دیا۔ چوری سکھاتا ہے۔ نہیں۔ بوڑھیا نے بھیجا ہوگا۔ بس یہی بات ہے۔ گھر میں کچھ ہوگا نہیں —— تو کہا کیوں نہیں اس نے۔

ان خیالات نے اسے بہت صدمہ پہونچایا۔

تینوں رات بھر بھوکے رہیں گے۔ چلو تھوڑی سی دے آؤں۔

لیکن لے تب نا —— کہہ دوں گا —— ہماری مٹر گدر گئی تھی۔ سوچا تھوڑی سی پھلیاں رجو کو بھی دے آؤں۔ بس لیں۔ رجو کے نام پر لے لیں گے۔

...

وہ دور پر ہری بھری گدرائی پھلیاں توڑنے لگا۔

ڈھیر ساری توڑ کر اس نے انگوچھے میں باندھ لی۔

اب شام ہوچلی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچے موٹی باریک لکڑیاں بٹورنے میں لگے ہوئے تھے۔ اپنے نرم اور نازک بدن کو سردی سے بچانے کے لئے اور اس کے سوا دوسرا دھندا ہی کیا تھا ان کے پاس۔

رجو کے نانا نانی آگ جلا کر بیٹھے تھے۔ گنگا دین نے بیس ایک آلو بھیج دیئے تھے۔ انھیں کو بھون رہے تھے۔ سوچ رہے تھے کہ انھیں کو کھا کر ایک ایک لوٹا پانی پی لیں گے۔ اس جون کا کام چل جائے گا۔ سویرے کا پرمیشر مالک ہے۔

رجو کی نانی کہنے لگی —— بھنے آلو بڑے میٹھے ہوتے ہیں آبا لنے پر تو........ ارے میں تو نیوتا کھانے جاتا ہوں تو پوری کچوری دیکھ کر گھن لگتا ہے۔ من کہتا ہے۔ بھنے آلو لیں۔ لیکن نون مرچ بنا سواد نہیں لگتا —— ہے نا

رام دہن کے گھر بھیجا تو ہے رجو کو —— مل جائے تو بات کیا گھر ہے۔ نون مرچ بھی نہیں۔

برکت ہو کہاں سے۔ مہینہ بھر ہوا ایک پیسہ کا لائے تھے بوڑھے نے بوڑھی کے کہنے پر کہا۔

نہیں ملا نانی —— بھوں کا کی کہتی تھی —— آج بھر کا ہی تھا۔ یہ کہتی ہوئی رجو آکھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

ادے تو رامو کے گھر چلی گئی ہوتی۔ ڈر کے بھاگ آئی کہ ہم لوگ سب کھالیں گے۔

بھک مری کہیں کی —— پیٹ ہی نہیں بھرتا

نانی بڑبڑانے لگی۔ کیوں بگڑ رہی ہو بیچاری پر نہیں ملتا تو وہ کیا کرے ؟ نانا سمجھانے لگے۔ نانی جواب دینا چاہتی تھی ۔

کاکی' کاکا ہیں کیا۔ بدھو نے باہر سے پکارا اور آکر بیٹھ گیا۔ رجو نے جھٹ گردن نیچے کرلی اور آنسو پونچھنے لگی بے چاری کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

کہو بدھو۔ بوڑھے نے پوچھا۔

ٹھیک ہے کاکا۔ بہت دنوں سے کاکی کی ہاتھ ہونجی پھلیاں نہیں کھائی تھیں تو..... اور اس نے وہیں پر پھلیوں کا ڈھیر لگا دیا۔

اتنی۔ کاکا' کاکی حیرت سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

میں ہی تو ہوں نہیں۔ رجو ہے۔ تم لوگ ہو۔

ارے بیٹا اب وہ پیٹ نہیں رہا۔ تم کھاؤ گے تو بچ جائے گا۔ ہم لوگ کھائیں گے ۔ تو اس جون کا کھانا دھرا رہ جائے گا۔ اور باسی کوسی تو میں کھاتا نہیں۔ اور پھر وہ خراب بھی ہو جاتا ہے۔

کاکی نے دیکھا کام بگڑتا ہے۔ بولی ارے لڑکا ہو کر لایا ہے اس کا بھی مان رکھ لو۔ کھانا رہ جائے گا۔ تو کتے ونے کو ڈال دیں گے۔

رجو۔ نون نہیں ہے۔ کسی گھگری میں گیہوں ہوگا۔ تھوڑا لے کر دھو کے یہاں سے لے آ تو۔

یکا یک گیہوں کی بکھار کہاں سے کھل گئی۔

رجو۔ سمجھ نہ پائی۔ منہ بنائے کھڑی رہی۔ بدھو بدھو تھا پر اتنا تو سمجھ ہی گیا۔

نانا نا۔ رہو بیٹا ٹھیک ہے۔ ایک کلا دھا ہے گا۔ میرے پاس ایک پیسہ ہے۔ اناج کیوں خراب کرتے ہو۔

اور وہ باہر چلا گیا۔

پھاگن کا مہینہ تھا۔ پیلے پیلے پھولوں سے لدے ہوئے ارہر کے پودے بڑے بھلے معلوم ہو رہے تھے ۔ دنیا کے لوگ بڑی سرگرمی سے کھیتوں کی سینچائی میں لگے ہوئے تھے۔ کہیں پوروٹ چل رہے تھے۔ کہیں بینڈے۔ سبزہ زاروں میں زندگی پھوٹ پڑی تھی ۔

بدھو اپنے کھیتوں میں پانی دے رہا تھا۔ اتنے میں رجو اپنے آنچل میں نہ جانے کس چیز کی بڑی سی گٹھڑی باندھے لے جارہی تھی۔

کیا لے جارہی ہے رجو ؟

ارہر کی پتیاں۔ تاپنے کے لئے نانا کو' جاڑا بہت لگتا ہے نا وہ رک گئی۔

گاجی میاں کے میلے نہیں جائے گی۔ تیری سکھی تو کئی دنوں سے تیاری کر رہی ہے۔

سکھی کو تو بیٹا مانگنا ہے۔ میں کیا کرنے جاؤں ؟

اچھا سا دولہا مانگنے۔ وہ ہنس پڑا۔

دولہا تو پا چکی ہوں اور کیا کروں گی لے کے۔

سچ ۔! کہاں ہے تیرا دلہا۔ دکھانا ذرا ؟

اس نے شرارتاً پوچھا۔

تمہیں دکھا دوں ؟ نہیں نظر لگا دوگے اسے۔ وہ مسکراتی ہوئی آگے ہو گئی۔ بدھو بھی مسکراتا ہوا اپنے کام میں لگ گیا۔

بدھو اور رجو کا بیاہ طے ہو چکا تھا۔! رجو اب اس کی منگیتر ہونے والی تھی۔ اس کے نانا ایک دن بدھو کے باپ کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا۔

بدھو اور رجو کا جوڑا بڑا اچھا ہوگا۔ اگر تم. ....

یہ تو میں بھی کہنے ہی والا تھا۔ رام سیتا کی جوڑی۔ پہلے سے من بھی ملا ہوا ہے۔ بھیا ۔ میں تو بڑا خوش ہوں۔ بدھو کا

باپ خوش ہو کر بولا۔ تو پھر اسی بیساکھ میں ہو جائے۔ اور وہ چلم کے دم لگا کر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

لیکن انسان جتنا سوچتا ہے اتنا بہت کم ہوتا ہے۔ ابھی بیساکھ شروع ہونے میں چند ہی دن باقی تھے کہ گاؤں میں چیچک کی وبا پھیل گئی۔ لوگ پٹا پٹ مرنے لگے۔ بدھو کا باپ بھی دس روز بعد چل بسا۔ بدھو اکیلا رہ گیا اس کی دیکھ بھال کرنے والا اب کون تھا۔ سب ہی نفسا نفسی میں پڑے تھے۔ پھر بھی اسے بھروسہ تھا کہ کاکا اور کاکی ورنہ رجو تو ضرور اسے دیکھنے آئیں گی۔ اس برے وقت میں انہی لوگوں کے کام آنے کی امید تھی۔ لیکن انھیں کام نہ آنا تھا نہ آئے۔ بدھو کو زندگی تو ملی لیکن بڑی قیمت ادا کرنے پر۔ اسے اپنی آنکھیں اور خوبصورتی جیسی چیزیں دینی پڑیں جس کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی بدھو ہے جو اب سے چند مہینے پہلے تھا۔

صحت یاب ہو جانے پر ایک دن بدھو بھنبھن سنار کے ہاں گیا۔ لگ بھگ چار میل کے فاصلے پر اس کا گھر تھا۔

بدھو رام کیسے چلے آئے بھگوان بھی اندھے ہیں بنا سوچے چاہے جیسے اپنی چکی میں پیس ڈالتے ہیں۔

اس نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ قصور کرنے پہ ماں بیٹے کو دو چار طمانچے لگا ہی دیتی ہے۔ ساہو جی وہ بڑے دیالو ہیں۔ جو کرتے ہیں ہم لوگوں کے بھلے ہی کا کرتے ہیں۔

بدھو نے بھنبھن کو جواب دیا۔

یہ اچھی بھلائی ہے۔ آنکھیں لے لیں اور بھلائی کیا۔

یہ تو اپنے من کی بات ہے۔ اچھا چھوڑو ان جھگڑوں کو میں ایک کام سے آیا ہوں۔ کام —؟ کہو کیا بنانا ہے

بھنبھن کی بچھا بتنے میں دیر نہ لگی۔

سونے کا چندن ہار۔

چندن ہار۔ سونے کا کس کے لئے بدھو رام۔

کسی کے لئے بھی ہو۔ پر روپیہ میرے پاس نہیں ہے۔

تو ساہو جی کی پیشانی پر بل آ گئے۔

دو گائے اور ایک بیگھا کھیت۔

ہوں۔ ایسا کہیں چندن ہار بنتا ہے۔

آپ کی مرضی۔ اور وہ لاٹھی اٹھا کر چلنے کو تیار ہونے لگا۔

ساہو جی نے دیکھا۔ شکار گیا ہاتھ سے۔ ایسا موقع بار بار نہیں آتا۔ اچھا کتنے دن میں چاہیئے۔

جتنی جلدی ہو سکے۔ لیکن مال میں کھوٹا نہ ہو۔ جس دن لے کر آؤ گے۔ گائے ہانک لے جانا کھیت کی لکھا پڑھی بھی کر دوں گا۔

اور وہ چلتا بنا۔

ساہو جی ہاتھ جوڑ کر بولے بھگوان تم کتنے دیالو ہو۔ داس پر ایسی دیا رکھنا پربھو۔ بدھو رام گھر لوٹا تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹھیر رہے تھے۔ سونے کا چندن ہار جب مجھ سے کانچ کے موتیوں کا ہار ٹوٹ گیا تھا۔ تب میں نے سونے کا بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ میری رجو کتنی خوش ہو گی۔ ابھی نہیں بتاؤں گا۔ بن کے آنے پہ دکھلانے جاؤں گا۔ لیکن جب بیمار تھا تب آئی کیوں نہیں۔ ڈر گئی ہو گی۔ بس یہی بات ہے۔ ابھی ہے ہی کتنے سال کی۔ ایسے ایسے نہ معلوم کتنے خیال اس کے دماغ میں آئے اور گئے۔ دس بارہ دن بعد ہار بن کر آ گیا۔

کیسا بنا ہے دلوا۔ بدھو رام نے اپنے پڑوسی رام دین سے پوچھا۔ بنا ہے؟

ایسا تو رئیسوں کے گھر میں بھی نہ ملے گا۔ چیز بنی ہے۔ اس جواب نے بدھو رام کو اپنی آنکھیں نہ ہونے کا احساس دلا دیا۔ اور وہ بہت غمزدہ ہوا۔ لیکن بھنبھن کی کاریگری کو اس جواب سے

بتا ہی نہ لگا بلکہ اس کی توہین بھی ہوئی۔

گاؤں کی تائن چھوٹا کاکی کی جا رہی تھی۔ بھجن کو بیٹھا دیکھا تو ٹوٹ پڑی۔ اسے گاؤں کی اکثر عورتیں پہچانتی تھیں۔ سنار تھا نا۔

ارے بھجن کیسے آئے دیور۔

بدھورام کی دلہن کا ہار لایا ہوں۔

دلہن، کیسی دلہن؟

بھجن ہنس پڑا۔ سال دو سال سے نیر میں تھی کیا موجی۔

رجو اور کون۔ چپ بھی رہو۔ اس کا تو بیاہ ہونے والا ہے۔ کہتے ہیں بدھو کی دلہن۔ جب تھی تب تھی۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔

بدھو کے سر پر جیسے اولے پڑ گئے۔ اس نے لاٹھی سنبھالی

ساہوجی بیٹھو تو تنی۔ میں من کا بھرم مٹا آؤں۔

اور وہ ہار لٹکائے ہوئے رجو کے گھر جا پہنچا۔

ہم دو پیسے کی ہنڈیا بھی لیتے ہیں تو اچھی طرح ٹھوک بجا کر مگر آدمی کی پرکھ ہم بھاری روپ سے کرتے ہیں۔ اس کے اندر جو ٹھوس اور لگاؤ ہے اس سے نہیں۔

بدھورام لاکھ کوشش کے بعد بھی وہ دن نہ بھول سکا جس دن رجو گاؤں سے وداع ہوئی تھی۔ وہ اپنی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھا تھا۔ پاس میں اس کی لاٹھی دھری تھی۔ اس کی زندگی کا تنہا سہارا۔ اس کے ہاتھ میں وہی ہار تھا سونے کا اسے مسل کر وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سمجھ نہ پاتا۔ وہ وہیں بیٹھا رہا۔ سامنے سے کہار ڈولی سنبھالے گنگناتے چلے گئے۔

باری عمریا میں نیر لگا یو! چھوڑ کے سسرے چلی آونا

گوری سسرے چلی آونا!

اور بدھو بیٹھا من میں کہہ رہا تھا۔ اتنی جلدی بھول گئی۔ لیکن اس سادہ لوح کو کیا معلوم کہ دنیا میں من اسی طرح ایک دوسرے کو بھول جایا کرتے ہیں۔

اس کے بعد بدھورام اپنے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ امیدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ اب اس کے لئے ہنسنے بولنے اور زندگی کے دن جوں توں کاٹنے کے سوا رہ ہی کیا گیا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح تنہائی پسند نہ رہا تھا۔ بلکہ اس کے میل ملاپ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ شام کو بڑی رات گئے تک وہ گھر سے باہر ہی رہتا۔ صبح جب چوپال میں آتا تو لوگ اس سے کہتے۔

بدھو۔ بیاہ نہ ہوا نہ سہی کسی کو بٹھا لو۔

تو وہ ہنس کر کہتا۔ ابھی آرام سے ہوں۔ بٹھا بٹھو کے کون جھنجھٹ لے۔ اس پر لوگ سمجھاتے۔ ارے بھائی۔ چوکا پانی کو تو کوئی چاہئے ہی نا۔ بغیر اس کے بھی تو کام چل ہی رہا ہے۔ لوگ یہ سن کر خاموش ہو جاتے۔ اسی طرح دن بیتتے گئے۔

دریا کے اتار چڑھاؤ کی طرح زندگی میں بھی کئی اتار چڑھاؤ ہیں۔

ایک دن وہ اپنی کالی، کو چراگاہ سے لوٹا کر لا رہا تھا۔ یہ گائے ہی اب اس کی زندگی کی جان تھی۔ بصارت نہ ہونے سے اسے معلوم نہ تھا کہ یہ کالی ہے یا گوری۔ مگر کالی گوری سے اسے مطلب ہی کیا وہ تو ایک پیالہ چاہتا تھا۔ ایسا جس میں اپنے دل کے رس کو نچوڑ کر رکھ سکے۔ وہ اس کو کالی میں مل گیا۔

بدھو یہی سب باتیں سوچتا اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔

بدھورام! ارے بدھورام! ایک راہ گیر نے اس کو آواز دی

کیا ہے بھولا۔ بدھورام نے آواز پہچان کر کہا۔

ارے بھیا! جلدی گھر پہونچ۔ خاطر داری کرنا ہے یا نہیں۔

خاطر۔ کس کی؟

رجو کی۔

رجو کہاں ہے؟

تیرے گھر میں۔ غریب کی آہ بیکار نہیں جاتی۔ انہیں برباد کر کے

گئی تھی نا۔ اب وہ دھوا ہوکر آئی ہے۔

دھوا ہوکر آئی ہے۔

بھولا راستہ ناپتا چلا گیا۔ بدھو گھر کی سمت چل پڑا۔

دھوا۔ میری بلا سے۔ میں نے تو کبھی ہائے نہیں کی۔ یہاں کیوں آئی ہے۔ بدنام کرنے۔ میں اس کا کون ہوتا ہوں جیسے باپ کا گھر ہے۔ آکر بیٹھ گئی۔ ابھی جھوٹا پکڑ کر نکال باہر کرتا ہوں اس کو۔

بدھورام اسی اندھیرے میں گھر آن پہونچا پہلے گائے کو ٹھکانے سے باندھا پھر جھونپڑے کا دروازہ کھول کر اندر گیا۔ کون ہے رجو۔ آٹھ برس بعد یہاں کیا کرنے آئی ہے۔ لیکن کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

اب بولتی کیوں نہیں۔ ؟

مگر کوئی ہو تو بولے۔

چلو اچھا ہوا۔ آپ ہی چلی گئی۔ نکالنا نہیں پڑا۔ اور وہ کھانا پکانے میں معروف ہو گیا۔ کئی دنوں سے ارہر کی دال اور باجرے کی روٹی کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔ آج وہی بنانے بیٹھ گیا۔

مجھے کیا غرض پڑی ہو ڈھونڈنے جاؤں۔ میری ہوتی ہی کون ہے۔ بدھورام باجرے کا آٹا گوندھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ہاں یہاں ہوتی تو ایک دو روٹی ڈالنے کا سہارا ہو جاتا۔ لیکن وہ گئی کہاں؟ چولہے پر دال کھد بد پک رہی تھی۔ وہ آٹا گوندھنے میں معروف تھا۔ اندھیری رات۔ بھوکی پیاسی ایسی ڈرپوک عورت ہے کہ پوچھو مت چلی کیوں گئی؟ میں کیا جان لے لیتا۔ آئی تھی تو رات بھر رہ جاتی کہیں کنواں اوداں میں نہ گر پڑی ہو۔ اس کے ہاتھ خود بخود رک گئے۔ کاکا کے گھر گئی ہو گی۔ لیکن بوڑھا بوڑھی تو کب کے مر چکے۔ اب وہاں کون ہے۔ معلوم نہ ہوگا۔ ذرا دیکھ آؤں نہیں تو یہی گاؤں والے کل کو کہیں گے۔ کہ بھلے مانس آئی تھی تو رات بھر ٹھہرنے

رہنے دیتا۔ اور وہ بغیر ہاتھ صاف کئے ہی بڑبڑاتا چل پڑا۔

رجو کے نانا کا گھر اب کھنڈر ہو چکا تھا۔ وہاں پہونچ کر وہ سوچنے لگا اندر کیسے جاؤں۔ دروازے کا پتہ کیسے لگے آنکھ ہے نہیں۔ پکاروں نہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھاگ جائے۔ ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اندر سے باتیں کرنے کی آواز آئی کوئی بول رہا تھا۔ یہاں اندھیرا ہے تو۔ کوئی بچہ ہے۔ بیٹا کہاں چلوں جہاں جائیں گے۔ وہیں اندھیرا ہوگا۔ ماں بولنے لگی۔ ہمارے لئے تو ہر جگہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے بیٹا۔ جئیں گے تو اندھیرے میں اور مریں گے بھی تو اندھیرے میں۔ ہمارے لئے کہیں بھی اجالا نہیں ہے بیٹا۔ اسی اندھیرے میں اب جیون بتانا ہوگا۔ ہمارے لئے اور کوئی دوسری جگہ نہیں۔

کون کہتا ہے۔ کھنڈر کے ایک کونے سے کسی نے کہا۔ میرے گھر میں تمہارے لئے بہت جگہ ہے رجو۔ ننھا بچہ ڈر کر ماں سے چمٹ گیا۔ رجو کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔

ڈرو نہیں رجو۔ میں ہوں تمہارا بدھو۔ بھوت پریت نہیں۔

بدھو؟ ہاں اندھیری رات میں یہاں کیا کرو گی چلو میرے ساتھ

لیکن؟ وہ سب کل سنوں گا۔ دال چولہے پر چڑھا آیا ہوں۔

مگر لوگ کیا کہیں گے؟

ہاں لوگ کہیں گے۔ آج میں بہت تھک گیا ہوں۔ سینک کر دو روٹی کھلا دو رجو۔ اور بدھو نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے رجو۔

بدھو کے کان پر منہ رکھ کر بچے نے کہا:۔

تم کون ہو۔ تاتا

نہیں رے ماما ہوں تیرا۔

رجو سنتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کے بوند ٹپک رہے تھے

فیض انصاری (ناگپور)

(ہندی کہانی کا ترجمہ)

تنقید و تبصرہ

روح اقبال

مولفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ریڈر شعبۂ تاریخ و سیاسیات۔ جامعۂ عثمانیہ۔ صفحات ۴۷۶ مطبوعۂ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد۔

اس کتاب میں فاضل مولف نے تین عنوانوں۔ اقبال اور آرٹ۔ ۲۔ اقبال کا فلسفۂ تمدن اور ۳۔ اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصورات کو پیش نظر رکھ کر اقبال کی جملہ فارسی و اردو تحریات کی روح پیش کر دی ہے۔ کتاب کا مقدمہ ایک اور فاضل پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی نے تحریر کیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ

"یہ کتاب اقبال کے تمام اساسی خیالات پر حاوی ہے اور اس طرح حقیقی معنوں میں اس کے کلام کا نچوڑ یا روح ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پوری کتاب میں مصنف نے اپنا تمام مواد اقبال کے کلام سے اخذ کیا ہے۔ اگرچہ تشریح کی خاطر دوسرے مفکرین کے خیالات بھی درج کئے ہیں"۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ایک عرصے سے علامہ اقبال کے کلام کا غائر نظر سے مطالعہ کرتے آئے ہیں اور ان سے متعلقہ موضوعوں پر اُن کے متعدد مضامین بھی شایع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے مطالعہ کی سہولت کے لئے اقبال کے خیالات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ آرٹ، تمدن اور مذہب۔ یہ تقسیم نہایت کامیاب ہے کیونکہ اس کے تحت زندگی اور کائنات کے جملہ اہم مسائل زیر بحث آجاتے ہیں۔ اردو ادب میں اس کتاب کی اشاعت سے ایک حکیمانہ تالیف کا اضافہ ہوا اور اس کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل رہے گی کہ اردو شاعر دنیا پر یہ پہلی کتاب ہے جس میں شاعر کے تصور حیات و کائنات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

بیگ حساب

ہمارا ہندستان

مصنفۂ منو مسانی مترجمہ مرزا عصمت اللہ مطبوعۂ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس صفحات (۲۰۱)

یہ با تصویر اور دیدہ زیب کتاب اسی نام کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں ہندستان کے ملکی اور معاشی مسئلوں کو نہایت سادہ اور سلیس انداز میں قلمبند کیا گیا ہے۔ مترجم نے اس خوبی سے ترجمہ کیا ہے کہ پوری کتاب پڑھ جانے کے بعد بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کتاب کسی دوسری زبان سے اردو میں منتقل کی گئی ہے جگہ جگہ موضوع کی مناسبت سے خود مترجم نے اپنی طبعزاد نظمیں بھی شریک کر دی ہیں۔ کتاب میں تصویریں اس کثرت سے ہیں کہ شاید ہی کسی اردو کتاب میں اتنی اچھی اور مفید تصویریں اب تک شایع ہوئی ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس جیسے اعلیٰ درجے کے مطبع ہی میں ایسی بہترین طباعت ہو سکتی تھی تاہم ہمارے دوسرے ناشروں اور اہل مطابع کو چاہئے کہ یہ کتاب نمونے کے طور پر اپنے یہاں رکھیں۔

ہندستان سے متعلق عام فہم انداز میں جتنی زیادہ اور جتنی جدید تر معلومات اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں شاید ہی کسی اور معاشی یا سیاسی مجموعے میں شامل ہوں۔ یہ تالیف اس قابل ہے کہ ہر تعلیم یافتہ ہندستانی اس کا مطالعہ کرے اور سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کی معلومات کے بغیر کوئی شخص تعلیم یافتہ ہی نہیں کہلایا جا سکتا۔

نظام آباد

مرتبہ غلام احمد صاحب نایطی وکیل صفحات ۲۶۸ مطبوعہ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ حیدر آباد۔

یہ کتاب شہر نظام آباد کے تاریخی حالات سے متعلق لکھی گئی ہے۔

اس میں اس مقام کے ماضی اور حال کا ایک نہایت دلچسپ مرقع پیش کیا گیا ہے ۔ اس کا پیش لفظ پروفیسر مولوی عبد المجید صاحب صدیقی استاذ تاریخ جامعۂ عثمانیہ نے لکھا ہے ۔

مولوی غلام احمد صاحب نے یہ کتاب پانچ حصوں میں منقسم کی ہے ۔ پہلے حصے میں جغرافی اور تاریخی حالات ہیں ۔ دوسرا حصہ انتظام مال کے لئے وقف ہے ۔ اور اس کے تحت زراعت آبپاشی اور تعمیرات نظام ساگر جنگلات اور کروڑگیری کے عنوانوں پر بحث کی گئی ہے ۔ دوسرے حصوں میں عدالت، تعلیمات ۔ صنعت و حرفت اور دیگر امور شامل ہیں ۔ پوری کتاب بالتصویر ہے اور جدید طرز تحقیق کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے ۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کے دوسرے مشہور مقامات کی نسبت بھی اگر ایسی ہی تاریخیں لکھی جائیں تو بہت مفید ثابت ہوں گی ۔ اور اہلِ ملک کی ان عام معلومات میں اضافہ کر سکیں گی، جن کی اس وقت خاص طور پر کمی محسوس کی جاتی ہے ۔

ایک معلم کی زندگی | حصہ اول و دوم ۔ مولفہ مولوی عبد الغفار صاحب مدہولی مدرس جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی ۔ مطبوعہ مکتبۂ جامعہ دہلی ۔ تقریباً نو سو صفحات

مولوی عبد الغفار صاحب مدہول ضلع ناندیڑ کے رہنے والے ہیں ۔ تعلیم کے شوق میں دلی کا سفر کیا اور جامعۂ ملیہ میں شریک ہوئے ۔ اس جامعہ کی زندگی نے ان کا ایسا دل موہ لیا کہ وہ بالآخر وہیں کے ہو رہے اور اکیس بائیس سال کے قیام کے بعد اب انھوں نے اپنی زندگی کے حالات ایک نادر پیرائے میں قلمبند کئے ہیں ۔ اس کتاب کا نام یوں تو ایک معلم کی زندگی ہے لیکن یہ اصل میں جامعۂ ملیہ دہلی کی سرگزشت ہے ۔ اس کے مطالعے سے اس عظیم الشان درسگاہ کے آغاز و ارتقاء کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ جس جامعہ کو عبد الغفار جیسے چند طالب علم مل جائیں تو سمجھنا چاہئے کہ اس کے قیام کا مقصد پورا ہو گیا ۔ یہ کتاب نہ صرف طالب علموں اور مدرسوں کے لئے دلچسپ ثابت ہو گی بلکہ ان اصحاب کے لئے بھی اس کا مطالعہ مفید ہو گا جو قوم ساز انجمنوں اور اداروں میں کام کرتے ہیں اور کسی نہ کسی تخلیقی ماحول کے خواہاں ہیں ۔

جامعۂ ملیہ کے مخلص اور با ایثار کارکنوں کا تذکرہ اس سے بہتر پیرائے میں نہیں لکھا جا سکتا تھا ۔ اس کتاب کے ذریعہ سے نہ صرف اس کے مصنف بلکہ جامعہ اور اس کے بہت سے کارکن ہندستان کی تعلیمی اور سماجی دنیا میں عرصۂ دراز تک زندہ رہیں گے ۔

فاسزم | از ہیرلڈ لاسکی مترجمہ باری ۔ ناشر مکتبۂ اردو لاہور ۔ یہ ۶۲ صفحات کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں تین عنوانات یعنی ہم کہاں ہیں ۔ ۲ ۔ فاسزم کیا ہے اور ۳ ۔ ہمیں کیا کرنا ہے کے تحت انگلستان کے اس مشہور پروفیسر نے فاسزم کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں ۔ اس نے اس کتاب میں یہ مرکزی خیال پیش کیا ہے کہ

"صرف ایک یوروپی انقلاب ہی ہٹلر کو تباہ کر سکتا ہے برطانیہ عظمیٰ کو اس انقلاب کی ضرور رہنمائی کرنی چاہئے"

اس مرکزی خیال کے تحت لاسکی نے ان نفسیاتی اور معاشی اسباب سے بحث کی ہے جو نازیت اور فاشیت کے اتحاد کا باعث ہوئی اور صلح جوئی کی پالیسی ہٹلر اور مسولینی کو سمجھنے میں کیونکر ناکام ثابت ہوئی ۔ آخر میں پروفیسر لاسکی وہ طریقے بتاتا ہے جن سے فتح حاصل کرنے میں متحدہ اقوام کو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے ۔ ترجمہ اچھا ہے اور وقت کی ضرورت کے لحاظ سے یہ کتاب قابلِ مطالعہ ہے ۔

"ادارہ"

ادارہ کی خبریں

نتائج اردو امتحانات بابت ۱۹۴۲ء

امیدواران امتحانات اس سال ادارہ کے اردو امتحانات میں حسب تفصیل ذیل امیدواروں نے شرکت کی۔

امتحان	شریک	حاضر	کامیاب	بدرجۂ امتیاز		کامیاب
اردو دانی	۸۳۹	۷۱۸	۶۵۵	۷۰		۵۸۵
				درجۂ اول	درجۂ دوم	درجۂ سوم
اردو زبان دانی	۲۲۷	۱۹۴	۹۶	۲	۱۵	۷۹
خوشنویسی	۸	۷	۲	۰	۰	۲
اردو عالم	۱۹۵	۱۸۰	۱۰۰	۴	۴۶	۵۰
اردو فاضل	۵۵	۴۹	۳۴	۲	۱۴	۱۸

نتائج امتحانات

اردو دانی

حسب ذیل امیدواروں نے علی الترتیب سب سے زیادہ نشانات حاصل کئے۔

رول نمبر	نام	درجہ
۱۵۲	عزیز بانو عرف اختر پاشا (چتیاپور)	اول
۵۳۹	قاضی محمد عبدالستار فاروقی (دہلی)	دوم
۶۲	اختر جہاں بیگم (حیدرآباد)	سوم
۶۹	کنیز حیدر	

مرکز شاہ آباد (ذکور)

حسب ذیل امیدوار کامیاب ہیں۔

۲ - شیخ چاند (مرکز میں اول)

۳ - محمد اسحق

۵ - سید محمد ابوالحسن

۶ - محمد حبیب

۷ - محمد عبدالجبار

۸ - محمد عباس

۹ - محمد نذیر احمد

۱۰ - محمد حامی کریم

۱۱ - عبدالحمید

۱۳ - محمد عبدالغفور

مرکز شاہ آباد (اناث)

کامیاب

۱۸ - سلطانہ نجم النساء بیگم (مرکز میں اول)

۱۶ - سیدہ غوثیہ بیگم

۱۷ - وحید النساء بیگم

مرکز کپیل (ذکور)

۱۹ - محمد عبدالجلیل (مرکز میں اول)

۲۲ - تار پا

۲۳ - سیومورتیا

۴۱۳ - سومورتیا

۴۱۴ - پنپا نگار

مرکز کپیل (اناث)

کامیاب

۲۴ - راج بی (مرکز میں اول)

۲۵ - محبوب بی

مرکز گدوال (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۵۸ - عبدالرزاق (مرکز میں اول)

۳۸ - احمد عزیز اللہ

۵۵ - محمد یوسف

کامیاب

۲۸ - محمد عبدالجبار
۳۰ - سید عطاء اللہ
۳۱ - قاضی محمد دولت
۳۲ - ڈی ہنمنت راؤ
۳۴ - رتنپیا
۳۵ - سید غفور
۳۹ - سید احمد
۵۰ - شیخ محمد
۵۲ - محمد یعقوب
۵۳ - سید فیاض علی
۵۴ - سید جعفر
۵۷ - غلام جیلانی
۵۹ - حسین میاں
۶۰ - چنا ریڈی
۶۱ - محمد عبدالکریم
۶۳ - جی کرشنا سورتی

کامیاب

۶۴ - نیلا انجیا
۶۵ - وشوا ناتھ انجیا
۶۶ - پیا لنگیا
۶۷ - الاڑی پنڈریکم
۶۸ - انڈ نارائن
۶۹ - یس رام لنگم
۷۰ - یالال نارائن ریڈی
۷۱ - یس رنگا ریڈی
۷۲ - لکشمی تپی
۷۳ - محمد عبدالکریم خاں
۷۴ - وٹھل راؤ
۷۵ - امرت راؤ
۸۰ - محمد نذیر علی
۸۲ - رام ریڈی
۸۴ - نرستیا
۸۵ - نرسلو
۸۶ - وینکٹ ریڈی
۸۸ - نرسہوان ریڈی
۸۹ - کستوری دلیپا

مرکز کاماریڈی (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۹۰ - سید محبوب علی (مرکز میں اول)
۹۴ - وینکٹ راملو
۹۵ - میارپہ انجیا
۹۶ - سدیا
۹۸ - گوپ ہرسلو
۱۰۰ - محمد بشیرالدین
۱۰۱ - لچھمن راؤ
۱۰۵ - محمد زین العابدین
۱۱۵ - صدیق حسین
۱۱۸ - محمد یوسف علی

۱۰۲ - عبدالجلیل
۱۰۳ - فقیر محمد
۱۰۴ - میر حمید علی
۱۰۶ - فتح محمد
۱۰۷ - محمد عبدالقادر
۱۱۱ - محمد عبدالرحیم
۱۱۲ - احمد عبدالصمد
۱۱۳ - محمود حسین
۱۱۴ - محمد نذیرالدین
۱۱۶ - چلمل نارائن
۱۱۷ - غلام محمد
۱۲۰ - سی راملو
۱۲۱ - بی سامبیا
۱۲۲ - سید فضل الرحمن
۱۲۳ - ترملیا
۸۴۴ - مرتضیٰ غوری

مرکز کاماریڈی (اناث)

کامیاب

۱۲۴ - ادیب النساء بیگم

مرکز گلبرگہ (ذکور)

کامیاب

۱۲۶ - غلام محمد خاں (مرکز میں اول)
۱۲۷ - محمد شہاب الدین
۱۲۹ - منیر احمد خاں
۱۳۰ - خورشید احمد خاں
۱۳۲ - محمد منیرالدین
۱۳۴ - راج محمد
۱۳۶ - محمد شاہ ید اللہ
۱۳۸ - محمد شائق جنیدی
۱۳۹ - محمد شائق
۱۴۰ - سید سعید اللہ
۱۴۱ - محمد قاسم
۱۴۲ - محمد عبدالعزیز
۴۱۷ - سید یوسف علی
۴۱۸ - محمد عبدالغنی
۴۱۹ - محمد عبدالنبی اول
۴۳۱ - عبدالقدیر

مرکز گلبرگہ (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۱۴۶ - احمدی خاتون (مرکز میں اول)

کامیاب

۱۴۷ - اصغری خاتون
۱۴۸ - عطیہ نصرت

مرکز چیتاپور (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۱۵۴ - عبدالستار خاں یوسف زئی (مرکز میں اول)
۱۵۷ - محمد ضیاء الدین
۱۵۹ - شیخ محبوب
۱۶۰ - چورپا

کامیاب

۱۵۳ - سید محی الدین

۱۶۱ ۔ محمد عبدالحی
۱۶۳ ۔ عبدالنبی
۱۶۶ ۔ محمد نظیرالدین
۱۶۷ ۔ سید مبارزالدین

مرکز چیتاپور (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۱۵۲ ۔ عزیز بانو عرف اختر پاشاہ (مرکز میں اول)
۱۴۹ ۔ رابعہ خانم

کامیاب

۱۵۰ ۔ شمس النسا بیگم
۱۵۱ ۔ صادق النسا بیگم عرف پتلی بیگم
۱۶۴ ۔ اقبال النسا بیگم

مرکز بھوم (ذکور)

کامیاب

۱۶۹ ۔ باباخاں
۱۷۰ ۔ سید مقبول
۱۷۳ ۔ سید کمال الدین (مرکز میں اول)
۱۷۴ ۔ عبدالرزاق
۱۷۵ ۔ اسد اللہ خاں
۱۷۶ ۔ شیخ مظفر
۱۷۷ ۔ گنپت
۱۸۴ ۔ گرو داس
۱۸۵ ۔ بنکٹ
۱۸۶ ۔ نام دیو
۱۸۷ ۔ حسن
۱۹۱ ۔ محمد جعفر

۱۹۰ ۔ غلام دستگیر
۱۹۲ ۔ عبدالرحمٰن
۱۹۳ ۔ انتم

مرکز بھوم (اناث)

کامیاب

۱۹۷ ۔ بی بی بیگم (مرکز میں اول)
۱۹۵ ۔ لطیفہ بی
۱۹۶ ۔ طاہرہ بی

مرکز خانہ پور (ذکور)

کامیاب

۲۱۱ ۔ محمد سلیم الدین (مرکز میں اول)
۱۹۸ ۔ بی دیو داس
۱۹۹ ۔ محمد عبدالحفیظ
۲۰۰ ۔ نواب خاں
۲۰۱ ۔ نرسہا ریڈی
۲۰۲ ۔ ڈی۔ نارائن
۲۰۳ ۔ دیو داس
۲۰۴ ۔ محمد معین الدین
۲۰۵ ۔ مقبول احمد
۲۰۶ ۔ محمد عبدالرشید
۲۰۷ ۔ ست نارائن سنگھ
۲۰۸ ۔ صغیر احمد
۲۰۹ ۔ محمد عبدالمجید
۲۱۰ ۔ محمد فیض اللہ
۲۱۲ ۔ عبدالشکور
۲۱۳ ۔ غلام ۔ باقی

۲۱۴ ۔ محمد غوث

مرکز بالانگر (ذکور)

کامیاب

۲۲۲ ۔ یم رنگیا (مرکز میں اول)
۸۳۸ ۔ یس راملو
۲۱۶ ۔ محمد خواجہ
۲۱۷ ۔ ستیا نارائن
۲۱۸ ۔ محمد عبدالعزیز
۲۱۹ ۔ سید شاہ حسینی
۲۲۰ ۔ غلام دستگیر
۲۲۱ ۔ یم یادگری
۲۲۳ ۔ شبیر خاں
۲۲۴ ۔ کے آر لنگیا
۲۲۵ ۔ رحمت اللہ
۲۲۶ ۔ شنکریا
۲۲۷ ۔ رام کشٹیا
۲۲۸ ۔ سنگپا

مرکز ہنگولی (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۲۳۹ ۔ حضور احمد (مرکز میں اول)
۲۳۰ ۔ محمد عبدالغفار
۲۳۳ ۔ شیخ اسمٰعیل
۲۳۴ ۔ سید نصیرالدین
۲۳۶ ۔ شیخ محمد
۲۳۸ ۔ عبدالرحیم خاں
۲۴۰ ۔ موہن لال

کامیاب

۲۳۱ ۔ شیخ لعل
۲۳۲ ۔ اکبر خاں
۲۳۵ ۔ عبدالمنان
۲۳۷ ۔ سید یوسف
۲۴۱ ۔ محمد عبدالقیوم
۲۴۳ ۔ غلام رسول
۲۴۴ ۔ شیخ حیدر
۲۴۶ ۔ رحیم الدین
۲۴۸ ۔ طیب علی خاں کمالی
۲۴۹ ۔ محمد ابراہیم
۲۵۰ ۔ محمد عبدالرزاق
۲۵۱ ۔ محمد بشیر
۲۵۲ ۔ شیخ عبدالغنی
۴۱۲ ۔ محمد عبدالرحیم

مرکز ہنگولی (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۲۵۶ ۔ عائشہ بیگم (مرکز میں اول)
۲۵۵ ۔ صاحب بی
۲۵۸ ۔ اصغری بیگم
۲۵۹ ۔ رضیہ بیگم

کامیاب

۲۵۴ ۔ رحیم النساء بیگم
۲۵۷ ۔ حفیظ النساء بیگم
۲۶۰ ۔ آمنہ بیگم
۲۶۱ ۔ محمدی بیگم

مرکز بھینسہ (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۲۷۵ ۔ محمد فضل الدین (مرکز میں اول)
۲۷۱ ۔ سید یوسف

کامیاب

۲۶۲ ۔ غلام محی الدین
۲۶۳ ۔ میر احمد علی
۲۶۴ ۔ صوفی احمد
۲۶۵ ۔ سید واحد حسین
۲۶۶ ۔ محمد عبدالصمد خاں
۲۶۷ ۔ سید یٰسین
۲۶۸ ۔ غوث محی الدین
۲۶۹ ۔ محمد عبدالتواب
۲۷۰ ۔ محمد احمد
۲۷۲ ۔ امام خاں
۲۷۳ ۔ سید رکن الدین
۲۷۴ ۔ سعید الدین
۲۷۶ ۔ مرزا قاسم بیگ
۲۷۸ ۔ احمد خاں
۲۷۹ ۔ عبدالواسع عرف عبدالرشید احمد

مرکز بھینسہ (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۲۸۰ ۔ سلمیٰ بی (مرکز میں اول)
۲۹۶ ۔ کلثوم النساء بیگم " "

کامیاب

۲۸۱ ۔ صادق النساء بیگم
۲۸۲ ۔ حاجی بی
۲۸۳ ۔ انوری بیگم
۲۸۴ ۔ ممتاز بیگم
۲۸۵ ۔ یوسف بلقیس شہزادی عرف شہزادی بیگم
۲۸۶ ۔ بسم اللہ بی
۲۸۷ ۔ عابدہ بی
۲۸۹ ۔ اشرف النساء بیگم
۲۹۰ ۔ آمنہ بی
۲۹۱ ۔ اشرف النساء
۲۹۲ ۔ امیر بی
۲۹۳ ۔ احمدی بیگم
۲۹۴ ۔ افضل بیگم
۲۹۵ ۔ زہرہ بی

مرکز کلیانی (ذکور)

کامیاب

۳۰۰ ۔ حافظ الدین (مرکز میں اول)
۲۹۷ ۔ محمد معین الدین
۲۹۸ ۔ محمد عثمان
۲۹۹ ۔ محمد عظمت اللہ
۳۰۱ ۔ اڑپا
۳۰۲ ۔ دھرم پال
۳۰۳ ۔ محمد نذیر الدین
۳۰۴ ۔ نظام الدین
۳۰۵ ۔ شیخ احمد
۳۰۶ ۔ شیخ حیدر
۳۰۷ ۔ پانڈورنگ راؤ

۳۰۸ - شیخ فقیر
۳۰۹ - جگ موہن لال
۳۱۰ - معین الدین خاں
۳۱۱ - محمد اسمٰعیل
۳۱۲ - وید پرکاش
۳۱۳ - شیخ حضرت
۳۱۴ - شیخ حضرت
۳۱۵ - محمد عبدالعزیز
۳۱۶ - غلام رسول
۳۱۷ - محمد عبدالباری
۳۱۸ - سردار الدین
۳۱۹ - شیخ موسیٰ
۳۲۰ - نعیم الدین
۳۲۱ - خواجہ ابوالحسن
۳۲۲ - محمد عطاء اللہ
۳۲۳ - محمد غفور الدین
۳۲۴ - محمد عبدالعزیز
۳۲۵ - نظیر الدین
۳۲۶ - شبیر الدین
۳۲۷ - سید ضمیر الدین
۳۲۸ - محمد احمد
۳۲۹ - سلیم الدین خاں
۳۳۰ - نرمل سنگھ
۳۳۱ - اسمٰعیل خاں
۳۳۲ - پریم چند
۳۳۳ - محمد قیام الدین

۳۳۴ - محمد علیم الدین
۳۳۵ - محمد عبدالقادر
۳۳۷ - ہدایت علی خاں
۳۳۸ - ناگیشیا
۳۳۹ - محمد نصیب
۳۴۰ - وسنت راؤ ویشپانڈے
۳۴۱ - دگمبر راؤ
۳۴۲ - محمد ابراہیم
۳۴۳ - محمد عبدالجلیل

مرکز کلیانی (اناث)

کامیاب

۳۴۴ - خواجہ بیگم (مرکز میں اول)
۳۴۷ - لیاقت بیگم " "
۳۴۸ - خواجہ بیگم " "
۳۴۵ - عظمت النسا بیگم
۳۴۶ - ممتاز بیگم
۳۴۹ - غوثیہ بیگم
۳۵۰ - نزہت بیگم
۳۵۱ - ضامن بیگم
۳۵۲ - احمدی بیگم عرف چھوٹی بیگم

مرکز پربینڈہ (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۳۸۳ - محمد غلام حسین (مرکز میں اول)
۳۷۱ - سید ثناء اللہ قادری
۳۷۸ - محمد ایوب خاں
۳۸۲ - محمد عبدالرشید
۳۸۴ - محمد عبدالقادر
۳۹۶ - ولی محمد

کامیاب

۳۵۳ - جمال الدین
۳۵۸ - محمد عبداللہ خاں
۳۵۹ - گنپت
۳۶۰ - اپا راؤ
۳۶۱ - محمد یٰسین
۳۶۲ - مشیخا
۳۶۳ - محمد رحمت اللہ
۳۶۴ - بھگوان
۳۶۵ - محمد جعفر
۳۶۶ - بابو
۳۶۸ - چندر
۳۶۹ - سید علی
۳۷۰ - کشن
۳۷۲ - محمد حسن علی
۳۷۴ - گوبند راؤ
۳۷۶ - شیخ چاند
۳۷۹ - وٹھل راؤ
۳۸۰ - محمد صدیق
۳۸۱ - محمد اسمٰعیل
۳۸۵ - محمد محمود
۳۸۶ - محمد اسحاق
۳۹۱ - نظام الدین
۳۹۲ - رحیم خاں

۳۹۳ - عبدالرحمٰن
۳۹۴ - شبیر حسین
۳۹۵ - بھاگوجی
۳۹۷ - عبداللطیف
۳۹۹ - عبدالعزیز
۴۰۱ - سید عبدالقدیر

مرکز پرینڈہ (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۴۰۶ - زہرہ بی (مرکز میں اول)
۴۰۲ - شہزادی بیگم
۴۰۵ - سلمیٰ بی

کامیاب

۳۷۵ - رابعہ بی
۴۰۳ - قدیر النساء بیگم
۴۰۴ - زینب بی
۴۰۷ - رحمت بی
۴۰۸ - رحیم النساء بیگم
۴۰۹ - فاطمہ بی
۴۱۰ - خاتون بی
۴۱۱ - اکبری بیگم

مرکز نظام آباد (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۴۳۲ - شیخ حسین (مرکز میں اول)

کامیاب

۴۳۳ - اندیال لنگیا
۴۳۷ - شیخ محبوب

۴۴۰ - عبدالستار
۴۴۱ - علاءالدین
۴۴۲ - محمد عبدالعلی
۴۴۳ - عظیم الدین
۴۴۴ - خواجہ حبیب الدین
۴۴۶ - عبدالغفور
۴۴۷ - جلال بیگ
۴۴۸ - عبدالمجید خاں
۴۴۹ - سید عبدالرزاق
۴۵۰ - فتح محمد
۴۵۲ - عثمان محمد خاں
۴۵۳ - شیخ محبوب
۴۵۴ - عبدالحمید
۴۵۷ - عبدالواحد
۴۵۸ - محمد خواجہ
۴۵۹ - سید یوسف علی

مرکز نظام آباد (اناث)

کامیاب

۴۶۰ - لاڈلی بیگم (مرکز میں اول)
۴۶۱ - کرامت النساء بیگم
۴۶۲ - سلیمہ النساء بیگم
۴۶۳ - فاطمہ بی
۴۶۴ - زیب النساء بیگم
۴۶۵ - سیدہ بیگم
۴۶۶ - ممتاز بیگم
۴۶۷ - خیر النساء بیگم
۴۶۸ - رحیم النساء بیگم
۴۶۹ - قمر النساء بیگم
۴۷۰ - ہاجرہ خاتون
۴۷۱ - حیدری بیگم
۴۷۲ - بدر النساء بیگم
۴۷۴ - سیدہ قمر النساء
۴۷۵ - خواجہ بیگم
۴۷۶ - محمودہ خاتون
۴۷۷ - احمد النساء بیگم
۴۷۸ - عزیز فاطمہ

مرکز اورنگ آباد (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۴۸۶ - چھوٹے خاں (مرکز میں اول)

کامیاب

۴۷۹ - ونائزی بھالے
۴۸۰ - محمد عبدالکریم
۴۸۲ - تلسی داس
۴۸۳ - محمد خلیل اللہ
۴۸۵ - عبدالرحیم
۴۸۹ - اقبال احمد
۴۹۰ - قاضی سید غلام احمد
۴۹۱ - سید عبدالخالق
۴۹۲ - محمد واصف احمد غازی
۴۹۳ - آصف احمد غازی

مرکز اورنگ آباد (اناث)

کامیاب

۴۹۵ ۔ بشیر النساء بیگم (مرکز میں اول)
۴۹۴ ۔ زبیدہ بیگم
۴۹۶ ۔ معراج خاتون
۴۹۷ ۔ افسر النساء بیگم

مرکز پرلی (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۵۳۹ ۔ قاضی محمد عبدالستار فاروقی (مرکز میں اول)
۵۱۰ ۔ سید حسین
۵۱۶ ۔ سید غلام مرتضیٰ
۵۱۸ ۔ سید عبدالخالق
۵۷۴ ۔ شیخ امیر

کامیاب

۴۹۸ ۔ شیخ محمد انجنیر
۴۹۹ ۔ عبدالغفور
۵۰۰ ۔ فتح بیگ
۵۰۱ ۔ محمد قاسم
۵۰۲ ۔ داؤد خاں عرف بابا میاں
۵۰۵ ۔ محمد ضیاء الحق
۵۰۶ ۔ عثمان خاں
۵۰۷ ۔ سید علی
۵۰۸ ۔ شیخ حاجی
۵۰۹ ۔ سید رسول
۵۱۱ ۔ محمد یسین
۵۱۲ ۔ جان محمد
۵۱۳ ۔ محمد نیاز
۵۱۴ ۔ یوسف خاں
۵۱۵ ۔ بشیر خاں
۵۱۷ ۔ بشیر خاں
۵۱۹ ۔ محمد زاہد
۵۲۰ ۔ وزیر خاں
۵۲۱ ۔ امین الدین
۵۲۲ ۔ حبیب الدین
۵۲۳ ۔ مظفر الدین
۵۲۵ ۔ عبدالستار
۵۲۶ ۔ حسیب الدین
۵۲۷ ۔ نجم الدین
۵۲۸ ۔ سید عبدالخالق
۵۲۹ ۔ سید احمد
۵۳۰ ۔ محمد عبدالکریم
۵۳۱ ۔ یسین خاں
۵۳۲ ۔ محمد ابراہیم
۵۳۳ ۔ عظیم الدین
۵۳۴ ۔ یسین خاں
۵۳۵ ۔ خواجہ رسول
۵۳۶ ۔ فرید خاں
۵۳۷ ۔ عیسیٰ خاں
۵۳۸ ۔ امیر خاں
۵۴۰ ۔ محمد مظہر حسین انصاری
۵۴۱ ۔ سید عبدالخالق
۵۴۲ ۔ سردار خاں
۵۴۴ ۔ موسیٰ خاں
۵۴۶ ۔ فضل اللہ صدیقی
۵۴۷ ۔ محمد عصام الدین صدیقی
۵۴۹ ۔ باجے راؤ دیسکھہ
۵۵۰ ۔ کشن
۵۵۱ ۔ وٹھل
۵۵۲ ۔ شنکر
۵۵۳ ۔ گنپت
۵۵۵ ۔ ناگناتھ
۵۵۶ ۔ بھاسکر
۵۵۷ ۔ لکشمن
۵۵۸ ۔ نرہری بھلاری
۵۵۹ ۔ دیوی پرشاد
۵۶۰ ۔ نیورتی بالاجی
۵۶۱ ۔ تکارام
۵۶۳ ۔ سیتارام
۵۶۴ ۔ ویجناتھ
۵۶۶ ۔ مہاردر
۵۶۹ ۔ ناگناتھ موروگری
۵۷۱ ۔ غلام دستگیر خاں
۵۷۲ ۔ عبدالغنی خاں
۵۷۳ ۔ شیخ محبوب
۵۷۵ ۔ محمد حنیف خاں
۵۸۱ ۔ محمد اسماعیل
۵۸۲ ۔ الہیٰ بخش

۵۸۴ - محمد عباس
۵۸۵ - محمد اسمٰعیل
۵۸۶ - عبدالحمید
۵۸۷ - شیخ احمد
۵۸۸ - موتی لال
۵۸۹ - سدرام
۵۹۰ - بھاسکر
۵۹۱ - مانک
۵۹۲ - پنڈھری
۵۹۳ - کیشن
۵۹۴ - سید مظفر علی
۵۹۶ - چراغ محی الدین
۵۹۷ - سید یسین علی
۵۹۸ - نواب علی خاں
۶۰۰ - محمد محبوب الدین انصاری
۶۰۲ - سید عظیم الدین
۶۰۳ - سید شمس الدین
۶۰۴ - سید احمد محی الدین
۶۰۶ - سید غوث علی
۶۰۷ - فرید بیگ
۶۰۸ - محمود خاں
۶۱۰ - وینکٹی
۶۱۲ - راؤ صاحب
۶۱۳ - وٹھل
۶۱۴ - شنکر
۶۱۵ - اسرو با
۶۱۶ - تلسی رام

۶۱۷ - اسرو با
۶۱۸ - رام راؤ
۶۲۳ - شاہ محمد
۶۲۴ - محمد خواجہ
۶۲۵ - سید معین الدین
۶۲۶ - محمد خواجہ
۶۲۷ - سید نواز
۶۲۹ - سید چاند
۶۳۰ - محمد عبدالجبار صدیقی
۸۳۴ - شمس الدین
۸۳۶ - سری رام

مرکز پرلی (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۶۴۸ - فرخ بیگم (مرکز میں اول)
۶۳۳ - بشیر النساء بیگم صدیقی

کامیاب

۶۳۱ - حبیب النساء بیگم
۶۳۴ - فیاض النساء بیگم
۶۳۵ - غوثیہ بیگم
۶۳۶ - مالن بی
۶۳۷ - عائشہ بیگم
۶۳۹ - رحیم النساء
۶۴۰ - اقبال النساء صدیقی
۶۴۱ - عزیز بانو بیگم
۶۴۲ - دولت خاتون
۶۴۳ - فیاض النساء بیگم
۶۴۴ - خدیجہ بی
۶۴۵ - پتلی بی
۶۴۶ - زیب النساء بیگم صدیقی
۶۴۷ - محمودہ بیگم
۶۴۹ - فیروز بیگم
۶۵۰ - بسم اللہ بی
۶۵۱ - طاہرہ بی
۶۵۲ - مالن بی
۶۵۴ - جمیلہ بیگم
۶۵۵ - گوداوری بائی
۶۵۷ - خیر النساء بیگم
۶۵۸ - ظہور النساء بیگم
۶۵۹ - نوازی بیگم صدیقی
۶۶۰ - قمر النساء بیگم
۶۶۲ - اکبر النساء بیگم جعفری
۶۶۴ - بسم اللہ بی
۶۶۵ - خدیجہ بیگم
۶۶۶ - جیلانی بیگم
۶۶۷ - صمدانی بیگم
۶۶۸ - صدیقہ بیگم

مرکز مومن آباد (ذکور)

کامیاب

۶۶۹ - شیخ خواجہ (مرکز میں اول)
۶۷۰ - محمود خاں
۶۷۱ - سیف الدین قادری

مرکز مومن آباد (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۶۷۵ - زبیدہ بیگم (مرکز میں اول)

کامیاب

۶۷۲ - لیاقت بی
۶۷۳ - سکندر بی
۶۷۴ - ممتاز خانم
۶۷۶ - امراؤ بی
۶۷۹ - نفیس النساء بیگم
۶۸۰ - سعیدہ بیگم
۶۸۱ - نجم النساء بیگم

مرکز بردا پور (ذکور)

کامیاب

۷۳۳ - شیخ چاند (مرکز میں اول)
۶۸۲ - ترمبک
۶۸۳ - گنپت
۶۸۴ - رگھوناتھ
۶۸۵ - گنگا دھرا پا
۶۸۸ - سیوانند
۶۸۹ - انباداس
۶۹۱ - ہیرالال
۶۹۳ - گرجیا
۶۹۴ - سیوالنگ
۶۹۶ - ویجناتھ
۶۹۷ - گویند راؤ
۶۹۹ - لکشمن
۷۰۰ - نارائن راؤ
۷۰۱ - نام دیو
۷۰۲ - پنڈت
۷۰۴ - مانک
۷۰۵ - بنڈو
۷۰۶ - سیومورتی
۷۰۷ - رادھاکشن
۷۰۸ - بھوانی
۷۱۰ - شیخ مہتاب
۷۱۱ - سنبھو
۷۱۲ - بوسارام
۷۱۴ - رام
۷۱۵ - ایکناتھ
۷۱۸ - گوپال
۷۲۰ - سداسیو
۷۲۳ - ویجناتھ
۷۲۵ - گیان با
۷۲۷ - نیاز علی
۷۲۸ - شنکر گوبیند جی
۷۲۹ - پرشوتم گوبیند جی
۷۳۰ - رنگ راؤ
۷۳۱ - دگڑو لال
۷۳۲ - ناگپا
۷۳۴ - شنکر

مرکز بلدہ (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۷۶۲ - اختر جہاں (مرکز میں اول)
۷۶۹ - کنیز حیدر (مرکز میں اول)
۷۳۶ - امت القیوم شرف النساء
۷۳۹ - طاہرہ بیگم
۷۴۰ - خلیق النساء بیگم
۷۴۳ - نعیم النساء بیگم
۷۴۴ - شیام کماری بھٹناگر
۷۴۵ - سعید النساء بیگم
۷۴۸ - سعیدہ بی
۷۵۶ - امتیاز بیگم عرف بتول پاشا
۷۶۳ - قدسیہ بانو
۷۶۶ - شہر بانو
۷۶۷ - دردانہ بیگم
۷۶۸ - کاظمی بیگم
۷۷۰ - صادقہ خاتون
۷۷۳ - ناصرہ

کامیاب

۷۳۷ - بدر النساء بیگم
۷۴۱ - بدر النساء بیگم
۷۴۲ - نیر النساء بیگم عرف خواجہ بیگم
۷۴۶ - محبوب بی
۷۴۷ - زینب بی
۷۴۹ - کلثوم بی
۷۵۰ - زہرہ بی
۷۵۱ - سلمہ بی
۷۵۲ - امت القدیر
۷۵۳ - بشیر النساء

۷۵۴ - یٰسین بیگم
۷۵۵ - افضل بیگم
۷۵۷ - غوثیہ بیگم
۷۵۸ - خواجہ بیگم
۷۵۹ - گوہر فاطمہ
۷۶۱ - مرتضیٰ بیگم
۷۶۴ - حسینی خانم
۷۷۱ - رقیہ بی
۷۷۳ - شہزادی بیگم
۷۷۵ - رفیعہ بیگم
۷۷۶ - بانو بی
۷۷۷ - امت الرؤف ولایت النسا بیگم
۷۷۹ - اقبال النسا بیگم
۷۸۰ - کریم النسا بیگم
۷۸۱ - سردار بیگم
۷۸۲ - رفیق فاطمہ
۷۸۵ - احمدی بیگم

مرکز بلدہ (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۸۲۴ - محمد احمد محی الدین (مرکز میں اول)
۷۸۹ - عبدالستار
۷۹۰ - چھوٹے خاں
۷۹۱ - شیخ عبداللہ
۷۹۳ - محمد صدیق
۸۰۰ - محمد بندہ علی
۸۱۰ - احسان اللہ احمد
۸۱۲ - محمد صدیق

کامیاب

---

۷۸۸ - یٰسین بیگ
۷۹۲ - طالب رضا
۷۹۴ - محمد سردار
۷۹۵ - محمد عبدالرحیم
۷۹۷ - محمد خواجہ
۷۹۸ - شیخ محبوب
۷۹۹ - بابو لال
۸۰۱ - محمد عثمان
۸۰۲ - قمر الدین
۸۰۳ - محمد حیات
۸۰۴ - محمد سلطان
۸۰۵ - سلیمان خاں
۸۰۶ - خلیق احمد
۸۰۷ - رستم خاں
۸۰۸ - سید عبدالقادر
۸۰۹ - شریف عبدالرزاق
۸۱۳ - محمد علی
۸۱۵ - شیخ چاند
۸۱۶ - محمد عبداللطیف اشرف
۸۱۹ - سید فاضل علی عابدی
۸۲۰ - سید بضاعت حسین
۸۲۳ - عبدالسمیع
۸۳۹ - کے وینکٹ چاری

مرکز پربھنی (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۲۱۵ - وارث حسین (مرکز میں اول)
۸۳۱ - غلام یزدانی

کامیاب

---

۸۲۵ - محمد غوث
۸۲۶ - محمد خاں
۸۲۸ - علی خاں
۸۲۹ - سید محبوب
۸۳۰ - عبدالسلیم
۸۳۲ - خان محمد
۸۳۳ - سید اسمٰعیل
۴۵۱ - عثمان خاں

مرکز پربھنی (اناث)

کامیاب

۸۳۵ - نجم النسا بیگم

اردو زبان دانی

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات حاصلہ کی گئی ہے۔

رول نمبر	نام	درجہ
۱۳۳	افتخار النساء بیگم صدیقی (دہلی)	اول
۱۳۴	مہر النساء بیگم صدیقی	"

ناموں کی ترتیب بلحاظ رول نمبر کی گئی ہے۔

مرکز شاہ آباد

رول نمبر	نام	درجہ
۱	سید محمد عزیز الحسن محشر	سوم

مرکز کپل (ذکور)

۱۰ - کنتکیا نائک سوم
۱۱ - محمد مخدوم علی سوم

مرکز کپل (اناث)

۱۴ - شریف النساء بیگم سوم
۱۵ - عصمت النساء بیگم سوم

مرکز گدوال (ذکور)

۲۰ - احمد حسین سوم
۲۲ - سید عبدالہادی سوم

مرکز گدوال (اناث)

۲۶ - نفیس فاطمہ (مرکز میں اول) دوم
۲۷ - چشتی بیگم سوم

مرکز گلبرگہ (ذکور)

۳۱ - محمد خواجہ معین الدین دوم
۳۲ - محمد فرید الدین سوم
۳۳ - ملا محمد ابراہیم دوم
۳۵ - ہیم راج دوم
۳۶ - احمد علی بیجاپوری سوم

مرکز گلبرگہ (اناث)

۳۷ - رضیہ نصرت سوم

مرکز چیتاپور

۳۹ - محمد حامی انصاری سوم
۴۱ - خلیل احمد سوم
۴۲ - محمد اسمٰعیل سوم
۴۳ - اللہ بخش دوم
۴۴ - محمد یعقوب سوم

مرکز خانہ پور (ذکور)

۵۰ - محمد عبداللہ خان قائم خانی (مرکز میں اول) سوم
۵۱ - محمد خواجہ سوم
۵۳ - محمد عبدالجبار خان سوم
۵۴ - محمد اسمٰعیل سوم
۵۵ - محمد قطب الدین سوم
۵۶ - محمد عبدالعزیز فاروقی سوم

مرکز خانہ پور (اناث)

۵۲ - محبوب بانو دوم

مرکز یالانگر

۶۱ - رام چندریا سوم

مرکز کلیانی (ذکور)

۶۵ - شیخ احمد بھولے سوم
۷۵ - محمد عبدالرزاق سوم
۸۱ - محمد عبدالغفور سوم
۸۳ - قاضی محمد اظہر الدین سوم
۸۶ - محمد نظام الدین (مرکز میں اول) سوم
۸۹ - قاضی سید نور الحسن سوم
۹۰ - محمد ریاض الدین سوم
۹۱ - عزیز الدین علی خان سوم
۹۲ - دتھل راؤ پٹواری سوم

مرکز کلیانی (اناث)

۹۳ - مالن بی (مرکز میں اول) سوم

۱۰۰ - زاہدہ خاتون سوم
۱۰۱ - زلیخا خاتون سوم

مرکز پرینڈہ (ذکور)

۱۰۶ - محمد اسحق سوم

مرکز اورنگ آباد (اناث)

۱۱۳ - زہرہ بی سوم
۱۱۴ - خدیجہ بی سوم
۱۱۵ - بریرہ بی (مرکز میں اول) دوم

مرکز پرلی (ذکور)

۱۱۶ - قاضی ابوالخیر ممتاز الدین فاروقی (مرکز میں اول) دوم
۱۱۷ - محمد فصیح الدین سوم
۱۱۸ - سید احمد سوم
۱۲۰ - تاج خان سوم
۱۲۱ - سلطان خان سوم
۱۲۲ - محمد قاسم سوم
۱۲۳ - شیخ عبداللہ سوم
۱۲۵ - قاضی نذیر الدین صابر سوم

مرکز پرلی (اناث)

۱۳۵ - اقبال بیگم دوم
۱۳۶ - قمر النساء بیگم دوم
۱۳۷ - امت الہادی بیگم دوم
۱۴۰ - سیدہ صوفیہ بیگم قادری سوم
۱۴۳ - افسر النساء بیگم سوم
۱۴۵ - جیلانی بیگم صدیقی سوم
۱۴۶ - سیدہ ذاکرہ بیگم قادری سوم
۱۵۱ - سندر بائی سوم
۱۵۲ - احمدی بیگم سوم

مرکز مومن آباد

۱۵۴ - احمد النساء بیگم صدیقی سوم

مرکز بردا پور

۱۵۵ - ترمبک راؤ سوم

مرکز بلدہ (اناث)

۱۶۸ - نعیم النساء بیگم سوم
۱۶۹ - انیس النساء بیگم سوم
۱۸۲ - یوسف النساء بیگم سوم
۱۸۳ - اختر النساء بیگم سوم
۱۸۶ - ہاجرہ بانو سوم
۱۸۸ - نواب بیگم سوم
۱۸۹ - تاج سلطان (مرکز میں اول) دوم
۱۹۳ - خیر النساء سوم
۱۹۵ - عابد النساء بیگم دوم
۱۹۶ - وزیر بی سوم
۱۹۸ - خیر النساء بیگم سوم
۱۵۹ - رفعت بیگم صدیقی سوم
۱۶۰ - حمیدہ بیگم فاروقی دوم
۱۶۱ - بلقیس طیبہ بیگم سوم
۱۶۴ - شوکت بیگم صدیقی سوم
۱۶۵ - قدسیہ بیگم صدیقی سوم

مرکز بلدہ (ذکور)

۱۹۹ - سید ابوالفضل عابدی سوم
۲۰۰ - سید عابد علی عابدی دوم
۲۰۲ - سید یوسف سوم
۲۰۳ - ہارون رشید سوم
۲۰۵ - ابوالعلوی میر عبدالجبار سوم
۲۰۸ - سید عزیز اللہ حسینی سوم
۲۰۹ - محمد جلال الدین (مرکز میں اول) دوم
۲۱۰ - محمد زاہد سوم
۲۱۲ - محمد عزیز الدین سوم
۲۱۳ - محمد ابراہیم سوم
۲۱۵ - امیر الدین سوم
۲۱۶ - غلام جیلانی سوم
۲۱۷ - فضیل الدین سوم

مرکز پربھنی

۲۲۳ - محبوب بی سوم
۲۲۴ - رابعہ بی سوم
۲۲۵ - محمدی بیگم (مرکز میں اول) دوم
۲۲۲ - بی جان بی سوم

خوشنویسی

۲ - غلام حسن صدیقی (پرلی) سوم
۴ - محمد معین الدین (پرلی) سوم

اُردو عالم

ناموں کی ترتیب لحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے۔

رول نمبر نام درجہ

٣٧ - محمد عماد الدین (چیتاپور) اول

٤٠ - محمد عمر انصاری "

٤٩ - محمد عبد الجلیل "

١٧٧ - غلام عمر خاں (بلدہ) "

ناموں کی ترتیب لحاظ رول نمبر کی گئی ہے۔

مرکز شاہ آباد

٢ - محمد فخر الدین سوز دوم

٤ - سید بدیع اللہ حسینی قلندر سوم

٥ - محمد عبد السعید اثر (اول مرکز) دوم

٦ - محمد عظیم الدین الفت سوم

مرکز کپل

٨ - محمد عبد المحمود قاضی سوم

٩ - اولیا محی الدین سوم

١١ - محمد عبد المحمود قدا دوم

١٢ - محمد عبد الکریم سوم

١٤ - خواجہ معین الدین سوم

١٦ - محمد عبد الرزاق (اول مرکز) دوم

٢٣ - محمد چندہ حسین سوم

مرکز گدوال

٢٦ - محبوب شریف سوم

٢٨ - محمد حسین (اول مرکز) سوم

مرکز گلبرگہ

٣٠ - محمد عبد الغنی سوم

٣٢ - سید یعقوب سوم

٣٤ - محمد مسعود انصاری الندی دوم

٣٥ - سید خواجہ معین قریشی (اول مرکز) دوم

١٩١ - محمد وجیہہ الدین سوم

١٩٢ - محمد عبد الباسط دوم

مرکز چیتاپور

٣٨ - محمد شمس الدین دوم

٤١ - محمد عبد الکریم انصاری دوم

٤٢ - بشیر الدین احمد دوم

مرکز بھوم

٤٥ - محمد معین الدین صدیقی سوم

٥٣ - محمد علی خان (اول بہ مرکز) دوم

٥٤ - محمد عثمان خان سوم

مرکز خانہ پور

٥٧ - ایل ملیا عرف ملہری (اول بہ مرکز) دوم

٥٨ - محمد حسین دوم

٩٥ - میر محمود علی سوم

مرکز بالاگھر

٦٠ - محمد خواجہ معین الدین انصاری سوم

٦١ - محمد شرف الدین اختر سوم

٦٢ - حرمت علی منظر (اول مرکز) سوم

مرکز ہنگولی

٦٨ - محمد عبد الرؤف حنفی سوم

٦٩ - محمد اسمٰعیل خاں مشتاق سوم

٧٠ - محمد مصطفیٰ خاں طالب دوم

٧٢ - محمد ابراہیم شارق (اول مرکز) دوم

مرکز ہنگولی (اناث)

٧٥ - حمیدہ بیگم (اول مرکز) دوم

٧٦ - پاشا بیگم دوم

مرکز بھینسہ (ذکور)

٧٧ - غلام صمدانی سوم

٧٨ - میر اکرام علی (اول مرکز) سوم

مرکز بھینسہ (اناث)

٧٩ - اقبال النساء بیگم سوم

مرکز کلیانی

٨٣ - محمد عبد الرحمن بھونگے دوم

٨٥ - بابو راؤ دوم

٨٦ - مادھو راؤ (اول مرکز) دوم

مرکز پرینڈہ

٨٨ - سید لیاقت حسین سوم

٨٩ - سید غلام علی (اول بہ مرکز) سوم

٩٠ - محمد وزیر سوم

٩١ - اشونت راؤ سوم

مرکز نظام آباد

١٠٠ - سید محمود عالم حسینی سالک سوم

١٠٣ - مرزا محبوب بیگ ندمی (اول مرکز) دوم

مرکز اورنگ آباد

١٠٤ - محمد غلام صفدر ہاشمی (اول مرکز) دوم

١٠٥ ۔ محمد امیر علی دوم
١٠٦ ۔ محمد اکبر خان دوم
١٠٧ ۔ محمد غلام جیلانی دوم
١٠٨ ۔ احمد محی الدین دوم
١٠٩ ۔ لکشمن راؤ ککرنی دوم
١١٢ ۔ محمد عبدالنبی صدیقی سوم
١١٤ ۔ محمد عبدالجبار خان سوم

مرکز اورنگ آباد (اناث)

١١٥ ۔ اصغری محبوب سوم
١١٦ ۔ آصف جہاں بیگم غازی دوم

مرکز پرلی (اول مرکز)

١١٨ ۔ محمد سعید الدین صدیقی سوم
١١٩ ۔ محمد نیرالدین صدیقی سوم
١٢٠ ۔ حیات خاں دوم
١٢١ ۔ محمد ہاشم کرمانی سوم
١٢٢ ۔ محمد لطف علی فاروقی دوم
١٢٤ ۔ سید مظہر علی جعفری دوم
١٢٦ ۔ سید قاسم سعادت دوم
١٢٨ ۔ محمد نظام الدین صدیقی سوم
١٢٩ ۔ داؤد خاں سوم
١٣١ ۔ بشیر احمد سوم
١٣٢ ۔ ابوالفیض سراج الدین احمد دوم
١٣٤ ۔ محمد ہاشم (اول مرکز) دوم

مرکز پرلی (اناث)

١٣٥ ۔ سلیم النساء بیگم دوم

مرکز مومن آباد

١٣٧ ۔ میر حافظ علی (اول مرکز) سوم
١٣٨ ۔ خواجہ محمد بدیع الدین سوم

مرکز بلدہ (اناث)

١٥٤ ۔ محمد النساء دوم
١٥٦ ۔ وحید النساء سوم
١٥٧ ۔ پرویز جہاں سوم
١٥٨ ۔ صغریٰ بیگم ماہر دوم
١٥٩ ۔ رحیم النساء بیگم دوم
١٦٤ ۔ جہاں آرا بیگم قادریہ دوم
١٦٥ ۔ اقبال النساء بیگم قادریہ دوم
١٦٦ ۔ بشیر النساء بیگم (اول مرکز) دوم

مرکز بلدہ (ذکور)

١٦٨ ۔ میر محمود علی خاں سوم
١٦٩ ۔ خواجہ حسن الدین دوم
١٧٠ ۔ غلام رسول سوم
١٧١ ۔ محمد اکبر شریف دوم
١٧٥ ۔ غلام دستگیر دوم
١٧٦ ۔ سید عثمان سوم
١٧٨ ۔ وشوا ناتھ راؤ دوم
١٧٩ ۔ سید جمال الدین قادری دوم
١٨٠ ۔ محمد عبدالسلیم شمیم سوم
١٨١ ۔ محمد حافظ علی سوم

مرکز پربھنی

١٨٣ ۔ محمد برہان الدین سوم
١٨٤ ۔ محمد عبدالرب سوم
١٩٤ ۔ رام راؤ (اول مرکز) سوم

مرکز پربھنی (اناث)

١٨٥ ۔ انوری بیگم سوم

اردو فاضل

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے۔ ناموں کی ترتیب بلحاظ رول نمبر کی گئی ہے۔

٣٧ ۔ محمود صدیقی (بلدہ) درجہ اول
٤٧ ۔ سید ہاشم علی " "

مرکز گلبرگہ

٤ ۔ نیاز محمود خاں افغانی دوم
٥ ۔ محمد عبدالعزیز سوم
٦ ۔ سید رکن الدین سوم
٧ ۔ غلام محمد شور دوم
٨ ۔ محمد جانی نیر سوم
١٠ ۔ محمد نیاز علی خان نیاز دوم
١١ ۔ محمد عمر خاں خیام دوم
١٢ ۔ محمد عبدالغنی افسر (اول مرکز) دوم

۱۳ - محمد فخر الدین ارمان سوم
۱۴ - محمد حبیب اللہ شیدائی سوم
۱۵ - سید محبوب حسینی تمنا سوم
۱۶ - سید محمد دل باز سوم

مرکز خانہ پور

۱۷ - سید عنایت اللہ خاں علوی سوم (اول پر مرکز)
۱۸ - سید محمد حبیب الرحمن سوم

مرکز ہنگولی

۲۲ - شیخ ملک ذاکر سوم

مرکز پربنڈہ

۲۵ - سید قدرت اللہ قادری دوم (اول بہ مرکز)

۲۶ - محمد رحمت اللہ خاں سوم
۲۹ - سید حفیظ اللہ حسینی چشتی دوم

مرکز پرلی

۳۵ - خورشید بیگم سوم

مرکز بلدہ (اناث)

۳۶ - سیدہ رحیم النساء بیگم سوم

مرکز بلدہ (ذکور)

۳۹ - محمد بن عمر باکلکا ساکت دوم
۴۰ - میر دوست علی سوم
۴۱ - محمد عزیز الدین خاں دوم

۴۲ - محمد حاجی خاں سوم
۴۳ - ناراین داس دوم
۴۴ - سید مراد علی طالع دوم
۴۵ - سید شمس الضحیٰ سلیم علی سوم
۴۸ - عبد الرحمن فاضل دوم
۴۹ - رنگیا دوم
۵۰ - لنگا ریڈی سوم

مرکز پربھنی

۵۲ - سید حسین سوم
۵۴ - سید افتخار احمد رضوی دوم (اول بہ مرکز)

جلسہ تقسیم اسناد مذکورۂ بالا امیدواروں کی سندیں ادارہ کے اُس جلسۂ تقسیم اسناد میں عطا کی جائیں گی جو بمقام دار البلد حیدرآباد ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ کو منعقد ہوگا۔ جو امیدوار خود آکر سند لینا چاہیں وہ ایک ماہ پیشتر دفتر کو مطلع کردیں۔

شعبۂ اُردو انسائیکلوپیڈیا اردو انسائیکلوپیڈیا کی مجلس انتظامی کا ایک جلسہ بتاریخ ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۲ء شنبہ بوقت سہ ۴½ بجے شام ادارہ کے دفتر میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب
پروفیسر عبد القادر صاحب سروری
مولوی سید محمد صاحب
مولوی بادشاہ حسین صاحب
مولوی فیض محمد صاحب صدیقی

ڈاکٹر زور صاحب نے سرپور پیپر ملز کا خط دکھلایا جس میں کمپنی مذکور نے کاغذ کے انتظام کا وعدہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اصل رکاوٹ کاغذ کی وجہ سے تھی اور جب اس کا انتظام ہو سکتا ہے تو پہلی جلد کی اشاعت کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

اس کے بعد ٹائپ کا مسئلہ پیش ہوا اور طے پایا کہ دونوں معتمدین ناظم صاحب دار الطبع سے مل کر اس بارے میں مشورہ کرلیں اور نتیجے سے مجلس کو مطلع کریں۔

طے پایا کہ کتاب کا حجم اندازاً ہزار صفحے ہو۔

طے پایا کہ جو ارکان مجلس انتظامی بغیر کسی خاص وجہ کے مسلسل تین جلسوں میں شرکت نہ کریں، انھیں خارج تصور کیا جائے۔ اور ان کی جگہ دوسرے ارکان کا انتخاب کیا جائے، نیز موجودہ ارکان کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے آیندہ جلسہ سے پہلے نام تجویز کئے جائیں۔

....

....

طے پایا کہ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی اور مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی کو لکھا جائے کہ وہ اپنی تجاویز تحریری طور پر روانہ کریں تاکہ ارکان ان پر غور کرکے آئندہ اجلاس میں اپنی رائے دے سکیں۔

اس کے بعد انسائیکلوپیڈیا کے دیگر امور سے متعلق عملی نقطۂ نظر سے تبادلۂ خیال ہوا۔

شعبۂ نسواں

شعبۂ نسواں کی مجلس انتظامی کا اکیسواں اجلاس دفتر ادارہ میں بتاریخ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۲ء منعقد ہوا جس میں حسب ذیل خواتین نے شرکت کی۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ
محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ
محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ
معتمد شعبہ

گزشتہ روئداد کی تصدیق کے بعد امور ذیل پر غور کیا گیا۔

۱۔ مدرسہ کے لیے مزید امداد کی ضرورت
۲۔ طالبات کی فیس کا مسئلہ
۳۔ مدرسہ کے لیے مکان
۴۔ غیر حاضر ارکان
۵۔ سرکاری امداد برائے مدرسۂ تحتانیہ اڈیکیٹ
۶۔ جلسۂ تقسیم انعامات برائے مدرسۂ تحتانیہ

۱۔ مدرسہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مدنظر یہ مناسب خیال کیا گیا کہ ادارے کو مزید امداد کے لیے توجہ دلائی جائے چنانچہ باتفاق آرا طے پایا کہ شعبۂ نسواں کی طرف سے اور دو سو کے اضافے کے لیے درخواست کی جائے۔

۲۔ طالبات کی فیس کا مسئلہ زیر غور رہا اور تصفیہ ہوا کہ آیندہ جملہ طالبات کے لیے چار آنے (۴ر) فیس مقرر کی جائے اور غیر استطاعت طالبات کی ایک فہرست مرتب کرکے آیندہ اجلاس میں پیش کی جائے تاکہ ان کے لئے فیس کی فراہمی کا کوئی اور انتظام کیا جائے۔

۳۔ موجودہ مدرسہ میں چونکہ کوئی گنجائش کافی نہیں اور مدرسۂ بالغات و تحتانیہ کی کافی طالبات ہیں اس لیے مدرسے کے لیے ایک بڑے مکان کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے علٰحدہ مکان دلوانے کی معتمد صاحب ادارہ سے درخواست کرنے کی تجویز عمل میں آئی۔

۴۔ شعبۂ نسواں کے تیرھویں اجلاس میں معتمد کی پیش کردہ ایک تحریک کی رو سے ایسے ارکان جو بلا کسی اطلاع کے مسلسل تین مہینے اجلاس میں شریک نہ ہوں ان کے نام خود بخود رکنیت مجلس انتظامی سے خارج ہو جانے چاہئیں اس کی اطلاع اکتوبر ۱۹۴۲ء میں جملہ ارکان کو دیدی گئی تھی۔ باوجود اس کے اکثر ارکان نہ تو آتی ہیں نہ تو اطلاع ہی دیتی ہیں۔ ایسی صورت میں مناسب یہ ہے کہ غیر حاضر ارکان .... کو آیندہ مجلس انتظامی سے خارج سمجھا جائے گا۔ ان میں سے آخر الذکر دونوں نے بوجہ بیماری ہونے کے شرکت سے معذوری اول بھی ظاہر کی تھی۔

لطیف النساء بیگم صاحبہ بھی اگرچہ بہت زمانے سے اجلاس میں شریک نہیں ہوئی ہیں لیکن رفیق ادارہ ہونے کی حیثیت سے ایک بار پھر درخواست کرنے کی رہبر شریک معتمد نے زور دیا جس پر دوسرے ارکان نے اتفاق کیا۔

۵۔ مدرسہ تحتانیہ کے لئے یہ طے پایا کہ سرکاری امداد کے لئے تعلیمات میں ختم تعطیل ہی درخواست پیش کریں جس سے اس کے اخراجات میں سہولت ہوگی۔

۶۔ مدرسۂ تحتانیہ اڈیکیٹ کے لیے ایک سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات ترتیب دیے جانے کی تحریک منظور کی گئی اور انعامات مہیا کرنے کا ذمہ معتمد نے لیا۔ یہ طالبات کے حوصلے بڑھانے اور ان کو تعلیم و تدریس کی طرف رغبت کرنے کا اچھا طریقہ ہوگا۔ اس پر سب نے اتفاق کیا کہ ساتھ ہی چند علم دوست خواتین کو اپنے کاموں سے آگاہ کرنے کا موقع بھی دیا جائے تو مناسب ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
من کی بیتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ...	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
راجہ کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
سابل طبیعہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہر ...	۴۰	۰	۴	۰
رتم الکتب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہمدی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
کہر و نسیم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محروم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن ...	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آندورکنندان اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۱	۱۲	۰
سید محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان ...	۳۲	۰	۳	۰
خطابات ...	۱۱۲	۰	۱۲	۰
علم ہائے رازی ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چبوتی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نامی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن

اکتوبر ۴۲ء

حیدرآباد دکن

صفہ ۱۹۴۲ع

ادارہ ادبیات اردو

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیرنگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین بی اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد (۵) بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۴ء شمارہ ۱۰

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین بی اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیرت آباد سے شائع ہوا

سب رس کے قلمی معاونین سے

ادارۂ ادبیات اردو کے ترجمان کی حیثیت سے ماہنامہ سب رس نے اردو دنیا میں جو خاص وقعت حاصل کر لی ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں اس رسالے کا ادبی معیار کسی ہمعصر رسالے سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ اور اس کے افسانے اور نظمیں دیگر رسائل وجرائد میں بھی نقل ہوتی رہتی ہیں۔

افسانوں، نظموں اور غزلوں کے لیے اب تک جتنے صفحات سب رس میں وقف ہوتے رہے ہیں وہ برابر باقی رہیں گے۔ لیکن ان کے علاوہ جو علمی مضامین شایع ہوتے ہیں ان کو آیندہ سے خاص مسائل کے تحت مرتب اور شریک کیا جائے گا۔ فی الحال یہ مسائل حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) حیدرآباد میں ہندو مسلم تعلقات اس سرخی کے تحت زمانۂ ماضی وحال کے متعلق تمام مضامین اور مقالے شایع ہوں گے جن میں واقعات اور مثالوں اور حوالوں کے ذریعے سے حیدرآباد کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ دکن کی تاریخیں اور تذکرے ایسے واقعات سے معمور ہیں۔ ان کو جدید انداز میں پیش کرنے کے علاوہ ذاتی تجربات بھی قلمبند کرنے کی ضرورت ہے۔

(۲) اردو زبان کے مسائل اس سرخی کے تحت اردو زبان کے لسانی اور صوتی پہلو رسم الخط، ٹائپ، مقامی بولیاں، الفاظ، محاورے، ضرب الامثال اور کہاوتیں جیسے مسائل پر معلومات شایع کی جائیں گی۔

(۳) دکن کے آثار قدیمہ سرزمین دکن میں مختلف مقامات پر جو قدیم تاریخی آثار (منادر، مساجد، محلات کے کھنڈر، قلعے، برج، قبریں اور گنبد وغیرہ) ہیں ان کی تفصیلی معلومات جن میں مقامی روایتوں اور کتبوں کی عبارتوں کو وضاحت سے قلمبند کیا گیا ہو۔

(۴) دکنی مشاہیر جن میں مذہبی بزرگ، اور مدبرین، امرا اور ادیب وشاعر سبھی شامل ہیں۔ ان کے حالات اور کارناموں پر مستند اور مجمل تبصرہ۔

توقع ہے کہ آیندہ سے ہمارے فاضل مضمون نگار ان ہی چار مسائل سے متعلق کسی نہ کسی موضوع پر اپنے مضامین سپرد قلم فرمائیں گے۔

ادارۂ سب رس کو توقع ہے کہ وہ ان مضامین کے مجموعے جدا جدا کتابی صورتوں میں بھی شائع کر سکے گا۔ اور اس طرح ہمارے قلمی معاونین کے رشحات قلم مستند اور حوالے کی تحریروں کی شکل اختیار کر سکیں گے۔

مدیر

خریدار اصحاب سے

براہِ کرم اپنے ذمہ کا چندہ جلد ادا فرما دیجئے اور دفتر ہذا کی مطبوعہ نمبری رسید حاصل کئے بغیر چندہ نہ دیجئے۔

مہتمم

اُردو میں غیر زبانوں کے الفاظ کا صحیح تلفظ کیونکر کیا جائے؟

اردو میں غیر زبانوں کے صحیح تلفظ کے اظہار کے لیے معمولی حروف علت و حروف صحیح میں ادارۂ ادبیات اُردو کی مجلس لسانیات کی طرف سے پروفیسر ڈاکٹر سدھیشور ورما صاحب ایم۔ اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ پروفیسر لسانیات و سنسکرت پرنس آف ویلز کالج جموں (کشمیر) کی تجویز پر جو اضافے کیے گئے ہیں ان کو اطلاع عام اور ماہرین فن کی رائے کی غرض سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اگر صاحب ذوق اصحاب ان کے بارے میں کوئی مفید مشورہ عنایت کریں تو اس پر ادارے کی مجلس مکرر غور کرے گی۔

حروف علت

(الف) حرف "ی" اور اس کی آوازیں۔

۱۔ لفظوں کے آخر میں حرف "ی" یائے معروف کی معمولی آواز کے لیے مستعمل ہوگی۔ مثلاً۔ وی (we)۔ ٹی (tea)

۲۔ لفظوں کے آخر میں حرف "ے" یائے مجہول کی معمولی آواز کے لیے مستعمل ہوگی۔ مثلاً۔ گے (gay)۔ ڈے (day)

۳۔ لفظوں کے درمیان میں اگر یائے معروف و یائے مجہول کی مخفف علامت "یـ"

(الف) بغیر کسی مزید علامت کے ہو تو اس کا تلفظ معمولی یائے مجہول کا ہوگا۔

مثلاً ریل (rain)۔ گیل (gale)۔ بوزن بھید۔ دید۔ ٹھیس وغیرہ

(ب) کے نقطوں کے نیچے "یِ" زیر ہو تو اس کا تلفظ معمولی یائے معروف کا ہوگا۔

مثلاً پیل (peel)۔ ٹیم (Team)۔ بوزن گیت۔ ڈھیل۔ وغیرہ

۴۔ اسی طرح ذیل کی علامتیں ان آوازوں کے لیے تجویز کی گئی ہیں جو مقابل کے الفاظ میں موجود ہیں۔

(الف) یٔ (درمیانی علامت ی پر جزم) مثلاً صنید۔ مَیل۔ بھینس۔ سیر وغیرہ

(ب) یَ درمیانی علامت ی پر آڑا خط، مثلاً ہیَٹ (head)۔ کیَٹ (Cat)۔ میَن (man) بیَڈ (bad)

(ج)۔ یٔ (درمیانی علامت یا پر الٹا جزم مثلاً بیَڈ (bad)۔ ایڈیٹر (editor)۔ ہیڈ (head)، الفریڈ۔ Alfred۔ ایڈورڈ (Edward)

(د)۔ یؕ (علامت ی پر چھوٹا حلقہ) مثلاً گیٹے (Goethe)۔ گیرنگ (Goerng)۔

(ہ)۔ یؕ (علامت یائے معروف پر چھوٹا حلقہ) مثلاً ڈیراں (Durand) بلیشر (Blucher)

(ب) حروف "و" اور اس کی آوازیں۔

ذیل کی علامتیں ان آوازوں کے لیے تجویز کی گئی ہیں جو مقابل کے الفاظ میں موجود ہیں۔

(الف)۔ و مثلاً کول (Coal)۔ ڈول (dole)۔ مور (more)۔

بوزن تول - مور - بول - بھروسہ -

(ب) اُوَ (واؤ پیش معمولی پیش) مثلاً ٹُول (cool) - ٹُوُز (tour) - بوزن پُور - سُوراخ -

(ج) وَ (واؤ پر زبر) مثلاً بُوَل (bowl) - پُوَڈَر (powder) بوزن یوم - شُوڈا - رونق -

(د) ۂ (واؤ کو کاٹ کر) مثلاً ہوال (hall) - ۂام (warm) - اسٹوام (storm) -

حروفِ صحیح

ا - ٹ - ڈ - ک -	(نیچے شوشہ)	تالو سے بولے جانے والے حروف صحیح کے لیے اس قسم کی علامتیں ربیا زبانوں میں بھی مروج ہیں -
ڈٔ -	(اوپر ہمزہ)	سندھی زبان کے نیز بعض افریقی زبانوں کے دبی ہوئی آوازوں والے حروف کے لیے - کیونکہ ہمزہ میں ختم حلق کی بندش ہوتی ہے -
چ - ج - جھ	(درمیان میں خط)	بالمقابل یورپی (ε) وغیرہ کے لیے -
ش -	(نیچے نقطہ)	کوزی حرف " ش " کے لیے جس کو رومن حرف (ş) سے ظاہر کیا جاتا ہے -
ث -		آواز (θ) کے لیے کیونکہ یہ بالکل اسی حرف کی عربی آواز کے مطابق ہے -
ذ -		آواز (ð) کے لیے کیونکہ یہ بالکل اسی حرف کی عربی آواز کے مطابق ہے
ح -		" وسرگ " کے لیے کیونکہ عربی ح کی طرح آواز ہے -
ن -	(نیچے جزم)	" ṇ " حلقی ن کی آواز کو جتلانے کے لیے -
ن -	(نیچے الٹا شوشہ)	" ñ " تالو سے بولی جانے والی ن کی آواز کے لیے -
نٓ -	(اوپر جزم)	" ṅ " کل حنکی ن یعنی نون غنہ کے لیے
وْ -	(اوپر چھوٹا حلقہ)	" w " یعنی دونوں ہونٹوں سے بولے جانے والے واؤ کے لیے کیونکہ اردو میں " و " لب دندانی (Labio-dental) آواز دیتا ہے -
م - ن - ر -	(نیچے چھوٹا حلقہ)	ہندیورپی صرف و نحو میں جنکی حروف صحیح (Sonant nasals) کے لیے -
کہ - یٰ - بہ	(اوپر چھوٹا حلقہ)	نیم حروف صحیح کے لیے - رومن رسم خط میں بھی ایسی ہی علامت مستعمل ہے -

ادارہ

ہندوی یعنی ہندی، اُردو، ہندوستانی

(اُردو زبان کے مسائل کا سلسلہ)

ہندی، اردو، ہندوستانی کی موجودہ حالت اور مستقبل کو جاننے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند بنیادی امور واضح طور پر بیان کیے جائیں جن کی بنا پر لسانیاتی حلقوں میں زبانوں اور بولیوں پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

لسانیاتی نقطۂ نگاہ سے زبان کی تین اقسام ہیں۔

(۱) معیاری زبان (۲) تحریری زبان (۳) ادبی زبان۔

(۱) ادبی زبان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مختلف بولیوں کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال کا کام دیتی ہے۔ اگر کسی سماج کی ہر ایک جماعت تمام طبقوں میں اپنی ہی بولی کو استعمال کرے تو نہ صرف سماجی تعلقات ناممکن ہو جائیں گے بلکہ سخت لسانیاتی گڑبڑ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ لہذا کسی معیاری زبان کے زندہ رہنے کی دو شرائط ہیں۔ اول معیاری زبان کو اپنی متعلقہ بولیوں کی طرح سے نفرت اور کڑاپن کے رجحان سے پرہیز کرنا ہوگا۔ ان بولیوں سے بھی لگا ہے گا ہے متعدد الفاظ کو اپنے خزانۂ الفاظ میں شامل کرنا ہوگا۔ دویم بولیوں کو بھی اکثر معیاری زبان کے آگے جھک کر اپنی عصبیت اور درشتی کو چھوڑنا ہوگا۔[1]

صحیح معنوں میں معیاری زبان وہ ہے جس کے ذریعہ زندگی کے سارے پہلوؤں اور پیچیدہ خیالوں کا اظہار ہوسکے۔ اور جس کے ذریعے سے سب لوگ اس قسم کا اظہار کرسکیں۔[2]

(۲) تحریری زبان وہ ہے جو دنیاوی کاروبار کے لیے مستعمل ہوتی ہے۔ مثلاً راجہ اشوک کے کتبے جو کہ عام لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے عام فہم بولیوں میں لکھے گئے تھے۔ یا آج کل کی تجارتی خط و کتابت۔ تحریری زبان کی خاص نوعیت یہ ہے کہ یہ اکثر معیاری زبان کے زیادہ قریب رہتی ہے لہذا اس لحاظ سے تحریری زبان اور ادبی زبان میں بہت فرق ہے۔ تاہم تحریری زبان بھی اکثر معیاری زبان کے ارتقا میں سدِ راہ ثابت ہوتی ہے کیونکہ تحریری زبان کی تشکیلیں کچھ عرصے کے بعد کڑی اور بے جان رہ جاتی ہیں۔ اس کے برعکس معیاری زبان بہت جلد تبدیل ہو جاتی ہے اور اسی لیے کبھی بھی ہمیشہ کے لیے تحریری زبان کے تحت میں نہیں آسکتی۔ اس کی خاصیت ارتقا ہے۔ آخرکار معیاری زبان تحریری زبان کی پابندیوں کو توڑ کر آگے چلتی ہے لہذا اکثر تحریری زبان کو پیچھے مردہ ہی رہ جانا پڑتا ہے۔ واندری کو اندیشہ ہے کہ کہیں فرانسیسی تحریری زبان بھی مردہ نہ ہو جائے۔ کیونکہ فرانسیسی تحریری زبان عام بول چال کی فرانسیسی زبان سے نہایت مختلف ہوگئی ہے۔[3]

(۳) ادبی زبان جو ادبیات میں مستعمل ہوتی ہے اکثر معیاری و تحریری زبان سے دور رہتی ہے۔ متعدد ملکوں میں ادیبوں کی ذات عام لوگوں سے علیحدہ ہوتی ہے۔ ان کی زبان خاص زبان ہے۔ اس "خاص زبان" کی مختلف تشکیلیں ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً سنسکرت زبان زیادہ تر مذہبی زبان تھی۔ سنسکرت کے بعد پراکرت زبانیں جو ہم کو دستیاب ہوئیں محض ادبی زبانیں تھیں۔ اگرچہ ان کی بنیاد بھی اس زمانے کی

---

[1] واندری۔ زبان انگریزی ترجمہ صفحہ ۲۷۳۔ [2] چیٹرجی۔ ہند آریائی اور ہندی صفحہ ۲۱۸۔

[3] واندری۔ زبان صفحہ ۲۷۰۔

بولیاں تھیں۔ ایسی ادبی زبانیں معیاری زبان کی خاص بولیاں کہلائی جاسکتی ہیں۔ معیاری زبان تو ملک کے خاص طبقوں میں میل جول کا ذریعہ ہے لیکن ادبی زبان صرف چند طبقوں میں ہی سمجھی جاسکتی ہے۔ اس لحاظ سے ادبی زبان کو "اصطلاحی بولی" بھی کہہ سکتے ہیں۔ ادبی زبان معیاری زبان سے کتنی دور جاسکتی ہے اس کا اندازہ ٹکسالی سنسکرت کی ایک کتاب "راگھو پانڈوی" مصنفہ کوویراج سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب ایک نظم ہے جو ایک ہی وقت میں رامائن اور مہابھارت کے افسانوں کو بیان کرتی ہے۔ ہر ایک مصرعہ ذومعنی ہے۔ ساتھ ہی مصنف رامائن اور مہابھارت کے معنوں کو جتلاتا ہے۔ اور تمام مصرعے اسی ترتیب میں تیار کیے گئے ہیں۔ ادبیات کے نقطۂ نگاہ سے چاہے ایسی تصنیف سے کمال لیاقت جھلکتی ہو، لسانیات کے نقطۂ نگاہ سے اس قسم کی زبان معیاری زبان سے بہت دور ہے۔ یہ ایک دماغی مداری کا کھیل ہے اور عالموں کے ایک خاص فرقے کی محض ایک بولی ہے[1]۔

اسی خیال کو مدنظر رکھ کر پیرس کے فاضل اجل جولز بلاک نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اپنے زمانے میں ٹکسالی سنسکرت سماج کے محض اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقوں کی زبان تھی لہٰذا اہل لسانیات اس زبان سے براہ راست کچھ حاصل نہیں کرسکتے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ اہل لسانیات کو ٹکسالی سنسکرت سے تقریباً کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا سوائے اس کے کہ سنسکرت طرز تحریر پر روشنی ڈالی جاسکے[2]۔ متذکرۂ بالا بنیادی امور کو مدنظر رکھ کر اب ہم پہلے معیاری ہندوی کی حقیقت پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیاری ہندوی وہ زبان ہے جس میں معیاری ہندوی کی تمام بولیاں (ان پڑھ گنوار کی بولی سے لے کر عالم اور پنڈت کی بولی تک) شامل ہیں۔ لسانیاتی نقطۂ نگاہ سے معیاری ہندوی کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس کو کثیر التعداد انسان سمجھ سکیں۔ وہی صحیح معنوں میں زبان کہلائے گی۔ لہٰذا ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کہ خواندہ لوگوں کی تعداد اتنی کم ہے ادبی زبانیں محض بولیاں کہلائی جائیں گی کیونکہ انھیں چند اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ چند وجوہ سے معیاری ہندوی زبان ہندوستان کی سب سے اہم زبان ہے۔ اگرچہ یہ زبان ہندوستان کے چند صوبوں میں ہی بولی جاتی ہے لیکن اول تو یہ ان صوبوں کی بھی ادبی زبان ہوگئی ہے جن کی مادری زبانیں مختلف ہیں۔ مثلاً پنجاب کا بہت بڑا حصہ، سرحدی صوبہ، راجپوتانہ۔ پندرہ کروڑ سے زیادہ انسان ہندوستان میں ہندوی بطور ادبی زبان استعمال کرتے ہیں۔ دوئم بیس کروڑ سے زیادہ انسان ہندوستان میں ایسے بھی ہیں جن کی مادری زبان اگرچہ ہندوی نہیں لیکن جو ہندوی نہ پڑھنے کے باوجود بھی اسے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اور ٹوٹی پھوٹی شکل میں اسے بول بھی سکتے ہیں۔ لہٰذا ہندوستان کے تقریباً چالیس کروڑ باشندوں میں سے تقریباً پینتیس کروڑ انسان ہندوی کو بول یا سمجھ سکتے ہیں۔

ادبی ہندی اور ادبی اردو کی صرفی ونحوی تشکیل بالکل یکساں ہے فرق صرف رسم الخط اور خزانۂ الفاظ میں ہے۔ ادبی ہندی میں کثیر التعداد الفاظ سنسکرت کے مستعمل ہوتے ہیں جن کی موجودہ تشکیل اہل لسانیات کے لیے نہایت محیر العقول ہے۔ مثلاً ڈیڑھ ہزار برس ہوئے پراکرت زبان میں بھی سنسکرت لفظ [ستری] "عورت" کا [اِتھی] بن گیا تھا۔ اب اس دراز عرصے کے بعد ہندوی میں پھر [ستری] جیسے ہزارہا سنسکرت الفاظ کا بلا تبدیل شامل ہوجانا اہل لسانیات کی آیندہ نسلوں کو تو سخت چکرائے گا کہ ڈیڑھ ہزار سال کے بعد یہ کیا عجوبہ واقع ہوا ؟ ! ایسے ہی اردو زبان میں متعدد

---

[1] مکڈانل۔ تواریخ ادبیات سنسکرت۔ صفحہ ۳۳۱۔

[2] جولز بلاک۔ ہندآریائی صفحہ ۴۔ ۵۔

فارسی اور عربی الفاظ کا اپنی پرانی تشکیل میں ہی شامل ہو جانا اہل لسانیات کے لیے باعث پریشانی ہے۔ لہٰذا اہل لسانیات کے نقطۂ نگاہ سے ادبی ہندی اور ادبی اردو کی موجودہ تشکیل معیاری ہندوی کی قدرتی تشکیل سے بہت دور گھڑت اور بناوٹی معلوم ہوتی ہے۔ یہ دونوں بولیاں ہیں۔ انھیں زبانیں نہیں کہہ سکتے۔ بقول برطانوی انسائکلوپیڈیا (مقالہ "ہندوستانی زبان") عہد حاضر کی ہندی نثر سنسکرت الفاظ کی کثرت سے اتنی بدنما ہو گئی ہے کہ فارسی سے بھری ہوئی اردو کا نصف ثانی ہو گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ دونوں بولیاں سوائے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کی ہندی اور اردو میں کہیں کہیں ہندوی کے صرف کھنڈر نظر آتے ہیں اور وہ کھنڈر زیادہ تر حروف جار یا مصدر "ہونا" کی مختلف تشکیل ہیں۔

لیکن کیا حقیقت میں ہندی اور اردو محض ادبی بولیاں ہیں؟ کیا ان میں معیاری ہندوی کا حصہ بالکل معدوم ہے؟ مندرجۂ ذیل مثال سے ظاہر ہو جائے گا کہ ادبی ہندی اور اردو کو اگر ہم معیاری ہندوی سے بالکل الگ سمجھیں تو یہ بھی سراسر غلطی ہوگی ان میں بیچ بیچ میں معیاری اجزا کی بھی شمولیت ہے۔ مثلاً مندرجۂ ذیل فقرے کو لیجیے۔

معیاری ہندوی (یعنی وہ ہندوی جس کو تقریباً سب سمجھ سکیں) [اس کی جورو چل بسی ہے۔]

ہندی ...... اس کی دھرم پتنی کا دیہانت ہو گیا ہے۔

اردو ...... اس کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا ہے۔

جس حد تک ہندی یا اردو میں "اس کی جورو چل بسی ہے" جیسے فقروں کی شمولیت ہے اس حد تک ہندی اور اردو میں معیاری ہندوی کے جز کا وجود صاف ظاہر ہے۔ اور کبھی کبھی ایسے فقرے بھی مزید ادبی اردو ہندی دونوں میں پائے جاتے ہیں اس نقطۂ نگاہ سے ادبی ہندی اور اردو دونوں معیاری ہندوی کے بہت قریب ہیں۔ اس پیچیدہ مسئلے کے بارے میں واندری صاحب فرماتے ہیں کہ خاص کر ہندوستان کی زبانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بولیوں اور معیاری زبانوں کے باہمی تعلقات کو جتلانا، بولیوں کے حدود کو قایم کرنا، اور ان کے باہمی اثرات کو دریافت کرنا کتنا مشکل ہے۔[1]"

جیسا کہ اوپر کی مثال "اس کی جورو چل بسی ہے" سے ظاہر ہوگا معیاری زبان کا ایک حصہ ادبی بولیوں میں شامل ہے۔ ادبی اردو اور ہندی کے اس معیاری جز (جسے سب لوگ سمجھ سکیں) کو "کھڑی بولی" کہتے ہیں۔ اگر یہ کھڑی بولی کسی پر اسرار طاقت کے ذریعے سے انسان کے تمام خیالات کا اظہار کر سکے تو ہندوستانی زبان کے سارے مسئلے فوراً حل ہو سکتے ہیں۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ کھڑی بولی موجودہ صورت میں نہ تو خیالات کی لطافت اور باریکی کو اور نہ علمی اصطلاحات کی پیچیدگی کو ادا کرنے کے قابل ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی کھڑی بولی کا دائرہ ایسا وسیع ہو جائے کہ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا اظہار کر سکے۔ تب ہندوستان کے سب عقدے حل ہو جائیں گے۔ اس کے متعلق امید کی کرن وہ "ضرورت" ہے جس کو متعدد لوگ اس ملک میں محسوس کر رہے ہیں۔ ضرورت لسانیاتی ارتقا کے لیے ایک نہایت زبردست طاقت ہے۔ چیٹرجی نے اپنی کتاب ہند آریائی و ہندی (صفحہ ۱۹۳) میں چند دلچسپ الفاظ کی مثالیں دی ہیں جن کا تعلق وسائل تہذیب سے ہے لیکن جن کا ماخذ ناخواندہ لوگوں کی بولی ہے مثلاً

کھڑی بولی	انگریزی یا ادبی اردو
آگ بوٹ	سٹیمر

[1] واندری۔ زبان۔ صفحہ ۲۷۹۔

کھڑی بولی	انگریزی یا ادبی اُردو
ٹھنڈا تار	مثبت تار
گرم تار	منفی تار
ہوا گاڑی	موٹر کار
جادو گھر	عجائب گھر
بجلی بتی	بجلی کی روشنی
ہاتھ گھڑی	رسٹ واچ
گرمی ناپ	تھرما میٹر

اس قسم کی مثالیں کھڑی بولی کے آئندہ ارتقا کیلئے بہت امید افزا ہیں۔ اُردو اور ہندی کیلئے زندگی اور موت کا سوال ہے کہ کہاں تک اس قسم کے الفاظ ادبی زبان میں شامل کئے جا سکتے ہیں اور جتنے زیادہ اس قسم کے الفاظ ادبی زبان میں شامل کئے جائینگے ادبی زبان کے اتنے ہی دیرپا ہونے کا امکان ہے لیکن اگر ادبی زبانوں نے ایسے الفاظ کو بازاری الفاظ سمجھ کر بے پروائی کی تو ان ادبی زبانوں کی موت نزدیک ہے۔ یہ ہے لسانیات کا اصل میرے کو مشہور ہندوستانی کا وہ حصہ جس کا صرف و نحو معیاری ہندوی کے مطابق نہیں لیکن جس کو تقریباً بیس کروڑ ہندوستانی لوگ بول سکتے ہیں اور اپنا مطلب ادا کر سکتے ہیں " بازاری ہندوستانی " کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نام پہلے پہل ڈاکٹر چیٹرجی نے استعمال کیا ہے۔ (صفحہ ۱۴۵)۔ ان کی تجویز ہے کہ اس بازاری ہندوستانی کی بنا پر ایک " بنیادی ہندوستانی " کا معیار قایم کیا جائے جس کا استعمال بھی اختیاری قرار دیا جائے۔

انھوں نے اپنی کتاب " ہند آریائی و ہندی " میں (صفحہ ۱۴۲۔۲۴۸) ایک دو کہانیاں ادبی اردو۔ ادبی ہندی۔ اور بازاری ہندوستانی " میں لکھی ہیں جن کے مقابلے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کونسی شکلیں وہ لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں جن کو ادبی اردو یا ہندی کی باقاعدہ تعلیم کا موقع نہیں ملا۔ لیکن بقول چیٹرجی (صفحہ ۲۰۰) بازاری ہندوستانی میں یہ نقص ہے کہ یہ بولی محض معمولی ضروریات کو پورا کرنے کا کام دے سکتی ہے چونکہ اس کا خزانۂ الفاظ نہایت محدود ہے اس لیے اس کا دایرہ اتنا وسیع نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر مندرجۂ بالا کھڑی بولی کے الفاظ کی طرح ' عام فہم الفاظ کی " بازاری ہندوستانی " میں زیادہ شمولیت ہو سکے تو یہ نقص بھی بتدریج رفع ہو سکتا ہے۔ لسانیاتی نقطۂ نگاہ مکمل جمہوریت اور عالم گیر رشتے کا نقطۂ نظر ہے۔ اہل لسانیات کی رائے میں کوئی زبان معیاری زبان نہیں کہلا سکتی جب تک اس کا گہرا اور قریبی تعلق بولیوں کے ساتھ نہ ہو۔ لہذا ادبی بولیوں کا عام لوگوں کی بولیوں کی طرف تکبر اور تعصب کا رجحان حماقت کی انتہا اور خودکشی کا آغاز ہے۔ اگر ادبی بولیاں اپنی ہی شکلوں پر اڑی رہیں گی اور دیگر بولیوں کو " بازاری " سمجھ کر نفرت اور لاپروائی کی نگاہ سے دیکھیں گی، تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو سنسکرت اور پراکرت کا ہوا۔ کیونکہ بقول واندری " زندہ زبان اس دریا کی طرح ہے جو عالموں اور پنڈتوں کی پابندیوں کی چٹانوں کو چیرتا ہوا ارتقا کے بہاؤ سے آگے بڑھتا جائے گا "۔

سدھیشور ورما

ماڈل

کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ ساحل کی آغوش میں مچلنے والی سمندر کی لہریں اور سینۂ گیتی پر کھڑے ہوئے باوقار اور عظیم الشان پہاڑوں کی ہری بھری بلند چوٹیاں اسے دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ فطرت کی ہر چیز دنیا کا ہر واقعہ اس کی نازک انگلیوں کی جنبش کے لئے اپنی آغوش وا کئے ہوئے تھا۔ لیکن ان میں سے ایک بھی مصور کی توجہ کو جذب نہ کرسکا تھا۔

ایک روز شام کے وقت مصور سمندر کے کنارے چہل قدمی کے لئے گیا۔ یہاں کوئی نہ تھا۔ صرف ایک جوان عورت چٹان پر بائیں کہنی ٹیکے اور ہتھیلی میں رخسار رکھے لیٹی تھی۔ اہا! کتنا حسین منظر! حسن بھی کتنا دلکش! اور دل میں اتر جانے والا "پوز"! چٹان کتنی سخت، سیاہ اور کتنی نازک اور صبیح! کتنا تضاد! سمندر کی شریر لہریں دوڑتی ہوئی آکر اس کے قدموں کو چھوتیں۔ لہروں کا مس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی عاشق پہلی ملاقات کے وقت جھجکتے جھجکتے اپنے محبوب کا بوسہ۔ ٹھنڈے پانی کے لمس کے ساتھ وہ کچھ اس انداز سے کپکپاتی جیسے اس کے جسم پر کانٹے آگئے ہوں۔ پانی کے چھینٹوں نے اس کی مہین ساڑی بھگو دی تھی جو اس کے نازک اور لچیلے جسم سے چپک رہی تھی۔ بھیگ رہی تھی لیکن اسے اس کا احساس بھی نہ تھا۔ جس طرح دنیا کے ظالم سے ظالم خونخوار سے خونخوار اور بے جگر انسان کو ایک عورت کا حسن، اس کی موہنے والی ادائیں بندۂ بے دام بنا لیتی ہیں، اسی طرح وہ وسیع سمندر اور اس کی بے پناہ موجیں اس کے قدموں کی داسی بنی ہوئی تھیں۔ وہ کسی خیال میں مگن سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی ساڑی کے ہوا میں لہرانے سے کبھی کبھی نظر آنے والا اس کا مرمریں جسم اور ڈوبتے سورج کی اس پر پڑنے والی زرد اور نرم شعاعیں! گلاب کی پنکھڑیوں جیسے سرخ ہونٹ اور ان سب سے بڑھ کر اس کا انداز نشست و تمکنت! یہ ساری چیزیں اس کے حسن کی بلاخیزی میں پوری طرح حصہ لے رہی تھیں اور مصور بے جھجک بلا پس و پیش اس کا نظارہ کرنے لگا۔ اسے مصور کی موجودگی کا احساس ہوا ساتھ ہی وہ غصے سے گھورتی ہوئی اٹھی اور چلتی بنی۔ چٹان کے بازو ہی اس کی موٹر کھڑی تھی۔ وہ اس میں جا بیٹھی اور موٹر فراٹے بھرنے لگی۔ مصور نے موٹر کا نمبر دیکھ لیا۔ لاٹری کے کامیاب ٹکٹ کا نمبر جیسے کسی کی قسمت کو جگا دیتا ہے ایسا ہی اس موٹر کا نمبر اس کی اپنی زندگی کے آفتاب کو نصف النہار پر پہنچا دینے والا محسوس ہوا۔ وہ حسینہ پیکرِ شعر و شباب کون ہوگی؟ مجھے ماڈل کے لئے مل سکے گی؟ گھر لوٹتے ہوئے مصور سوچنے لگا۔ اس ڈرامے کی تکمیل اس سہانے خواب کی تعبیر صرف موٹر کے نمبر کے ذریعے ہو سکتی تھی۔ مصور نے پولیس کے دفتر میں جا کر پتہ چلا لیا۔

اسے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہ حسینہ ایک "طوائف" ہے اور ماڈل کے لئے اس کا حاصل کرنا چنداں دشوار نہیں۔ اس نے گھر کا پتہ چلایا۔ کسی طرح بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہی۔ بالکل وہی۔ اس کے استقبال کے لئے کھڑی تھی۔ اس کا نام نرگس تھا۔ مصور نے سوچا۔ دوسرے آنے والے نوجوانوں کی طرح وہ اس کا بھی استقبال کرے گی۔ لیکن اس کے چہرہ کے اتار چڑھاؤ نے بتا دیا کہ مصور کی آمد سے وہ خوش نہ تھی۔ اس کا لباس، بناؤ سنگار طوائفوں کا سا نہ تھا۔ مصور نے خیال کیا کہ اس نے یہاں آنے میں کچھ غلطی تو نہیں کی؟ اسے کچھ خوف سا ہوا۔ لیکن اس نے ذرا دیر پہلے اس کے سارے حالات معلوم کر لئے تھے، اس لئے وہ کچھ زیادہ پریشان نہ ہوا۔ اس نے سب کچھ صاف صاف کہہ دیا۔

مصور کا نام سنتے ہی نرگس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ماڈل کے لئے مصور کے سامنے بیٹھنا اس نے قبول کرلیا۔ مصور نے دس دن کے لئے تین سو روپے کا پیش کش کیا تھا۔ سمندر کے کنارے ہر روز شام میں ایک گھنٹے کے لئے ہی۔ مصور نے اسے ساحل پر جس حالت میں دیکھا تھا بالکل اسی "پوز" میں رنگ و آب کے زنداں میں قید کرنے کی ٹھانی۔

حسن ہر روز شام کو سمندر کے کنارے آتا اور مصور بھی اپنا رنگ، پانی، برش اور تختیاں لئے وہاں پہنچ جاتا۔ نرگس اسی مخصوص انداز میں لیٹ جاتی،

سمندر کی ننھی ننھی لہریں اس کے قدموں میں کھیلنے لگتیں اور مصور کی سبک۔ اور نازک انگلیوں میں برش ناچنے لگتا۔ گھنٹہ ہوتے ہی نرگس چلی جاتی اور مصور۔ ریت میں اٹکی سیپی پڑی ہوئی کشتی کی طرح وہیں لوٹتا پڑا رہتا۔

آج آخری دن تھا مصور تصویر ختم کر رہا تھا معاہدہ کے مطابق مصور ۳۰۰ روپے نرگس کو دینے والا تھا اور وہ اقرارنامہ کی پابندی سے آزاد ہو جانے والی تھی۔

کتنے اشتیاق سے مصور نے تصویر میں رنگ بھرنا شروع کیا تھا۔ آج تک کے سارے احساسات کو مصور تصویر میں مدغم کر کے جذبات کے مندر پر کلس چڑھانے والا تھا۔ لیکن اس کی تمناؤں کے خرمن میں یاس کی چنگاری پھٹ پڑی۔ مصور کی توقع کے مطابق تصویر تیار نہ ہو سکی تھی۔ اس کا دل مطمئن نہ تھا۔ اس میں ایک بڑا نقص تھا۔ روح کے بغیر جسم کا حسن کچھ بھی نہیں اسی طرح مصور کے اس شاہکار میں اس کی اپنی دلی کیفیات کے بغیر زندگی کی لہریں کیونکر اٹھتیں؟ اس تصویر میں زندگی کی موجیں نہ تھیں۔ اس میں مصور کا دل نہ تھا۔ اس کی تصویر ایک بے ترنم گیت' استعارہ و تشبیہہ سے خالی عبارت' بے موج سمندر اور محبت سے خالی ایک آواز تھی۔

تصویر میں رنگ بھرتے وقت مصور ایک بے چینی سی محسوس کرتا۔ نرگس نے اپنے دلکش حسن اور مست جوانی کی مقناطیسیت سے مصور کا دل موہ لیا تھا۔ کتنی ہی مرتبہ وہ اس کی طرف دیکھتا رہتا اور تصویر بنانا بھول جاتا۔ پھر یکایک اسے اپنی تصویر کا خیال آتا اور وہ بھاری ہاتھوں سے اپنا کام شروع کر دیتا۔ مجسمہ حسن کی طرف لپکنے والے دل کو واپس کھینچ کر وہ تصویر میں رنگ بھرتا۔ کیف' جذبات و احساسات اور تمنا کا کام مصور کا لا برش کیونکر کرتا؟ اس کی موجودگی کا میٹھا احساس شوقِ بے پایاں کی بے چینی' اس کی میٹھی یاد۔ ان ساری باتوں کے آگے اس کی بنائی ہوئی تصویر خود اسے رحم کی نگاہوں سے دیکھتی معلوم ہوتی۔ اب مصور کا آرٹ خالص اور پاکیزہ فن نہ تھا۔ وہ ملوث ہو گیا تھا۔ "نرگس" تصویر کو اپنے سامنے سے ہٹا کر مصور نے کہا۔ "آج جا رہی ہو نا؟ اب کل تم کیوں آنے چلیں؟" "ہوں" اتنا ہی کہہ کر وہ مسکرانے لگی۔

مصور نے تین سو روپے کے نوٹ اس کے سامنے رکھ دئے اور نرگس نے لے لئے۔ "نرگس" مصور نے پھر کہا۔ "تمہارا عکس' تمہاری پرچھائیں میرے پاس رہے گی! کیا تم میرے پاس نہ رہ سکو گی؟" ہر لفظ کے ساتھ مصور کا دل موجوں پر ہلکورے لینے والی کشتی کی طرح ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ کچھ نہ بولی۔

مصور نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اسے قریب کھینچا' وہ اک دم بگڑ گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دیکھتے دیکھتے نکل گئی۔ یہ کیا کیا میں نے۔ مصور پچھتانے لگا۔

دوسرے روز صبح مصور اپنے بنگلے کے درانڈے میں بیٹھا تھا۔ گہری سوچ میں! آنکھیں بند کئے سوچ رہا تھا۔ طوائف کی لڑکی! پھر اس نے یہ بے اعتنائی کیوں برتی؟ مجھ جیسے مصور سے اسے نفرت ۔۔۔؟ "ایک پیسہ بابا" ان الفاظ نے مصور کے خیالات کی ڈور توڑ دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک پیسے کے لئے التجا کرنے والا بھکاری کھڑا تھا۔ بے کسی اور افلاس کا مجسمہ! اس نے پھٹے چیتھڑوں سے اپنا نحیف و لاغر جسم ڈھانکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ چیتھڑے خود اس کی کوشش پر ہنستے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ ڈاڑھی نے بڑھ کر چہرے کو بھیانک بنا دیا تھا۔ دھوپ سے جھلسا ہوا چہرا اور بھوک سے پچکے ہوئے رخسار!

مصور نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک روپیہ نکالا۔ دینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ لیکن پھر فوراً ہی پیچھے کھینچ کر کہنے لگا۔ "کسی سے اجازت لئے بغیر تو اندر کیسے آ گیا؟"

"پیٹ کے لئے صاحب!" بھکاری نے جواب دیا "بھیک مانگنے کے بدلے کوئی کام کیوں نہیں کر لیتا۔" "ہر شخص یہی کہتا ہے مگر کام تو کوئی دیتا نہیں۔ اور کروں گا بھی کیا۔" مصور نے تھوڑی سی سوچ کے بعد کہا "میں تجھے کام دیتا ہوں' کرے گا؟" "ہاں' میرے کرنے جیسا ہو تو شوق سے کروں گا۔" مصور اس کی طرف گھور رہا تھا اور بھکاری بھی مصور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مصور کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات امڈنے لگے۔ "تصویر کے لئے کتنا بہترین ماڈل" مصور سوچنے لگا حسن اور جوانی کے دلفریب سنگم کی دلآویز تصویر بنائی۔ لیکن حاصل؟ اس تصویر کے ذریعہ میں کون اہم چیز دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ فن سمجھ کر لوگ اس کی طرف ضرور دیکھیں گے اور پھر اپنے کام میں لگ جائیں گے۔ ایسے فن سے کیا حاصل جو محض فن ہو! جو زندگی سے بہت دور! جو تعمیر حیات میں

ایک اینٹ کا بھی کام نہ دے۔ حسن کے سرمائے سے دنیا کا بیوپار نہیں چل سکتا۔ لیکن حسن کے قدموں میں لاکھوں اور کروڑوں روپے بری طرح روندے جاتے ہیں اور ان کا استعمال عجیب عجیب موقعوں پر ہوتا ہے! اور اس کی طرح لاکھوں آدمی بھوکے پیاسے سڑکوں اور گلیوں میں رینگتے دکھائی دیتے ہیں۔ حسن نے موہنی ڈال کر شباب نے ہوش و خرد کو دفن کر کے دنیا کو تباہی کی طرف بڑھایا اور میں اسی کو فنا ہکار بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں! اس کے بجائے دنیا کے دکھ زندگی کی پیہم آہیں اور انسانیت کی دلدوز کراہیں کیوں نہ سماج کے سامنے پیش کروں؟ حسن کے مجسمے ہزاروں میں دو چار ہی ہوں گے۔ ایسی شاذونادر دھندلی تصویروں کو روشنی میں لا کر لوگوں کو بتانے کی نسبت ہزاروں میں سیکڑوں ملنے والے بھکاریوں کو تصویر کے روپ میں اجاگر کر کے سماج کے سامنے رکھنا زیادہ بہتر ہوگا۔!" "صاحب! بتائیے کیا کام" بھکاری نے اپنی تشویش کا اظہار کر کے مصور کو چونکا دیا۔ "دیکھ، میں تیری تصویر بنانے والا ہوں" یہ سن کر بھکاری بھونچکا سا رہ گیا۔ "میری تصویر! کیا ہے کو مالک! تصویر بنانے جیسی بہت سی حسین عورتیں!" "عورتیں جائیں جہنم میں" مصور نے بات کاٹ کر گرجدار آواز میں کہا۔ "بول کیا لے گا" بھکاری نے سوچ کر کہا "دونوں وقت کھانا، پھٹے پرانے کپڑے، جتنی دیر اور جتنے دن چاہو بیٹھا رہوں گا۔ آپ جو چاہیں دیدیں! میں کچھ نہیں مانگتا"۔

کہاں یہ قانع بڈھا اور کہاں فی گھنٹہ ۳۰ روپے مانگنے والی حریص نرگس! اس کے لئے میں نے ۳۰۰ روپے خرچ کئے۔ اتنی رقم میں کتنے ہی بھوکوں کو پیٹ بھر روٹی مل سکتی تھی۔ لیکن ایسے وقت یہ خیال کیوں سوجھنے لگا؟ چند لمحوں کے سکھ کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرنے والے امیر یہ سوچتے ہوتے تو آج انسانیت اس بے بسی میں دربدر بھٹکتی دکھائی نہ دیتی!۔ کتنی دیر تک مصور سوچتا رہا۔ اس دن دوپہر سے مصور بھکاری کی لمبی اور خاک آلود جٹاؤں، سوکھے ہوئے بدن پر ابھری ہوئی رگوں، دھنسی ہوئی آنکھوں، پچکے گالوں، ننگے اور پیٹھ سے لگے ہوئے پیٹ کو رنگ و آب سے اجاگر کرنے لگا۔ اس کی طرف دیکھ کر امنگوں کے طوفانی جذبات کیونکر اٹھتے؟ وہ اپنا کام بغیر کسی رکاوٹ کے کرنے لگا۔ مصور کے پاس بیٹھ کر بھکاری اس کے نگار خانے کی ہر چیز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ بھکاری کی نظریں کمرے کے ہر حصے پر دوڑ رہی تھیں۔ لیکن زبان البتہ کسی قیدی کی طرح اپنی جگہ پڑی تھی۔ مصور کام کرتے ہوئے جب کبھی اس کی طرف دیکھتا تو اس کو نرگس کی تصویر کو گھورتا ہوا پاتا۔ کئی روز تک مصور نے یہی کیفیت دیکھی، مگر کبھی کبھی بھکاری کا چہرہ ضرور پھیکا پڑ جاتا۔ مصور سوچتا کیا ایسے حسن سے فاقہ زدہ بھی جذبات و احساسات سے مجبور ہو کر جھرجھری محسوس کرتے ہیں۔

پندرہ دن بعد تصویر مکمل ہوگئی۔ اس میں انسانی جذبات و احساسات پوری طرح حلول کر گئے تھے۔ انسانی جذبات، احساسات اور تاثر کو اجاگر کرنے میں اس کی انگلیاں مہارت تامہ رکھتی تھیں۔ وہ دور کھڑے ہو کر تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک گونہ تسلی اور سکون محسوس کیا۔ مگر فوراً ہی اس کے دماغ میں ایک خیال ناچنے لگ گیا۔ اس نے بچے ہوئے سارے رنگوں کو کالے رنگ والے ایک پیالے میں ڈال کر نرگس کی تصویر پر زور سے کھینچ مارا۔ رنگوں کے اس آمیزے نے نرگس کی تصویر کے خط و خال کو اس طرح مٹا دیا جیسے زلزلہ کسی بستی کو ——!

محمد عبدالقادر فاروقی

گارساں دتاسی

اردو کے پہلے پروفیسر، فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں، طریقۂ تعلیم، تلامذہ، کتب خانہ، اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کی یورپ کی درس گاہوں، اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے نہایت تحقیق اور جانفشانی سے تالیف کیا ہے۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب

صفحات ۱۲۸ قیمت ۱۲ر

"چاند"

نگاہِ سطح بیں کا محرمِ اسرار ہو جانا — وہ تیرا مسکرانا، روح کا بیدار ہو جانا
زمیں پر بارشیں ہوتی ہیں جب انوارِ باطن کی — نقابِ شب میں چھپ جاتی ہیں جب تاریکیاں دن کی

(۲)

زمیں کروٹ بدلتی ہے ستارے مسکراتے ہیں — ہوائیں رقص کرتی ہیں شگوفے گنگناتے ہیں
چمک جاتی ہے عقل، آسودۂ جام و سبو ہو کر — فضا انگڑائیاں لیتی ہے بیخودِ رنگ و بو ہو کر
ہجومِ بیخودی میں تجھ سے جب آنکھیں ملاتی ہیں — تو موجیں سینۂ بحرِ رواں میں جھوم جاتی ہیں

(۳)

شبِ تاریک میں اے ماہ جب تیری ضیا باری — عطا کرتی ہے خوابِ زندگی کو شانِ بیداری
تو ہر شئے تیرے گردِ عشق جھک جاتی ہے سجدے میں — ترے دامن کو چھونا چاہتی ہیں خاک کے ذرے
وہ پھر پاکیزہ نغمے چھیڑتی ہے تیری رخشانی — ترے قدموں پہ رکھ دیتی ہے دنیا اپنی پیشانی

(۴)

تجھے دیکھا ہے یوں گرمِ تماشا بارہا میں نے!! — جبینِ شوق سے چومے ہیں تیرے نقشِ پا میں نے
نیازِ عشق کے پیروں تجھے منظر دکھائے ہیں — ترے آگے پرستاری کے میں نے گیت گائے ہیں
ترے غم سے محبت کی شرابِ جاں فزا پی ہے — تجھے دیکھا نہیں، تیری پرستش مدتوں کی ہے

(۵)

گراں ہو گر نہ میری جنبشِ لب طبعِ نازک پر — تو پھر اتنا بتا اے ہم نشینِ خسروِ خاور!!
کبھی سینے میں تیرے زخمِ پنہاں مسکراتے ہیں — کبھی تو نے بھی دل پر بے کسی کے داغ کھائے ہیں
کبھی تیری نظر دھندلی ہوئی ہے اشکِ پیہم سے — کبھی ڈوبی ہے تیری نبضِ ہستی کاوشِ غم سے

(۶)

کبھی کانپے ہیں تیرے ہونٹ بھی خاموش آہوں سے — کبھی ٹپکا ہے ارمانوں کا خوں تیری نگاہوں سے
کبھی رو رو کے کی ہے اپنے مرنے کی دعا تو نے — کبھی یعنی اٹھائی ہے محبت کی جفا تو نے
کبھی پی ہے مئے مرگ آزما بھی زندگانی میں — کبھی پیری سے بدتر حال گزرا ہے جوانی میں

(۷)

فضائے نور میں بھی یہ دھندلکے پیش آتے ہیں — وہاں بھی نخلِ ہستی خونِ دل سے سینچے جاتے ہیں
کبھی ملتے ہیں دنیا میں تری غم سہنے والے بھی — خلش سے دل کی واقف ہیں وہاں کے رہنے والے بھی
پتنگے موت کی تاریک وادی سے گزرتے ہیں — تری محفل میں بھی یوں شمع کے جلوے نکھرتے ہیں

(۸)

کبھی چمکا ہے تیرے دل میں دردِ نامرادی بھی — کبھی گرمِ فغاں پایا ہے تو نے سازِ شادی بھی
کبھی خود کو مٹا کر پائی ہیں آسانیاں تو نے — کبھی کی ہیں ضمیر و روح کی قربانیاں تو نے
کبھی تو نے بھی خوش ہو کر پیا ہے زہرِ نادانی — کبھی باطل کے آگے بھی جھکی ہے تیری پیشانی

(۹)

ترے عالم میں بھی ہیں کیا حیات و موت کے چرچے — جبینِ زندگی سے پھوٹتے ہیں موت کے چشمے
فلک پر بھی یہی آئینِ ہمت آزمائی ہے — وہاں بھی قصرِ دولت کیا مقامِ کبریائی ہے
غریبی ہے، غریبی کی یہی پامالیاں بھی ہیں — یہی نالے، یہی آہیں، یہی بے حالیاں بھی ہیں

(۱۰)

تری بستی بھی ہے نامحرمِ اسرارِ ربانی! — وہاں بھی علم ہے شاخِ نہالِ جہل و نادانی
وہاں بھی امتیازِ کفر و دیں کی جنگ ہوتی ہے — صداقت صاحبِ علم و یقیں کو ننگ ہوتی ہے
سنے جاتے ہیں نالے زندگی کی ناتمامی کے — فلک پر بھی چلا کرتے ہیں کیا سکے غلامی کے

(۱۱)

تری دنیا میں بھی ٹوٹے پڑے ہیں بامِ عرفاں کے — وہاں بھی خمکدے آباد ہیں کیا جرم و عصیاں کے
وہاں بھی دل کچھے ملتے ہیں کیا احساسِ پستی سے — یہی نامحرمی ہے کیا وہاں بھی رازِ ہستی سے
یہی آثارِ نادانی، یہی اوہامِ بینش ہیں — فلک کے رہنے والے بھی رہینِ عجز و دانش ہیں

(۱۲)

ہوا کرتی ہیں کیا خوں ریزیاں بھی آسمانوں میں — دلوں کو راحتیں ملتی ہیں خونیں داستانوں بھی
تڑپتی ہیں سرِ خاکِ پریشاں خون کی دھاریں — فضا میں گونجتی ہیں خونچکاں تیغوں کی جھنکاریں
وہاں بھی کیا یہی انداز ہیں جوعِ امیری کے — پھرا کرتے ہیں منہ کھولے درندے ملک گیری کے

(۱۳)

گراں تجھ پر ہوا طولِ بیاں میری کہانی کا — اثر پاتا ہوں میں تیری جبیں پر سرگرانی کا
تجھے معلوم ہے اے ماہ میں کیوں ناشکیبا ہوں — سراپا درد ہے جو، اس کُرے کا رہنے والا ہوں
لٹائے ہیں یہاں صدیوں محبت کے گہر تو نے — ہزاروں سال رخشندہ کئے ہیں بام و در تو نے
یہاں بھی کیا کبھی عشرت جھلک اپنی دکھائے گی — بتا! کیا روحِ انسانی کبھی آرام پائے گی

علی اختر

خون

رادھا چلی گئی۔ میں نے اسے ہر چند سمجھایا مگر وہ نہ مانی۔ میں نے بڑی منت، سماجت کی مگر اس نے ایک نہ سنی۔ میں نے کہا "محبت کی وہ باتیں جو تم کہا کرتی تھیں، کیا سب ختم ہو گئیں۔ اور کیا اب تم مجھے اکیلا چھوڑ جاؤ گی"۔

رادھا رونے لگی اور اس طرح سسکیاں بھریں کہ میں سمجھا اب وہ نہیں جائے گی۔ روتے روتے اسے نیند آ گئی۔ شام کو اٹھی تو بہت دیر ہو گئی تھی منہ ہاتھ دھو، کنگھی چوٹی سے فارغ ہو کر خاموش بیٹھ گئی۔ میں نے ایک آدھ بات کی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ ٹکٹکی لگائے برابر کسی چیز کو دیکھتی اور پھر رونے لگتی۔ پھر چپ ہو جاتی اور پھر رونے لگتی۔ میں نے سوچا کہ ذرا دیر باہر چلا جاؤں سیر بھی ہو جائے گی اور ممکن ہے رادھا کا جی بھی سنبھل جائے۔ باغ عام جا کر بیٹھا تو دیر ہو گئی۔ جانے کس خیال میں محو ہو گیا۔ واپس آیا تو رادھا گھر میں نہیں تھی۔ معلوم ہوا نو بجے کی گاڑی سے چلی گئی ہے۔

رادھا سے میری ملاقات ایک دوست کے ہاں ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ میل جول سے رغبت بڑھی اور اس نے رفتہ رفتہ محبت کی صورت اختیار کر لی۔ میرے دوست پولیس کے افسر ہیں۔ جو نہ میل جول کے قائل ہیں اور نہ محبت کے۔ وہ کھرا کھیل فرخ آبادی کھیلا کرتے ہیں یعنی اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ مگر رادھا سے ان کی وابستگی خلاف معمول تھی۔ اور وہ کہتے تھے کہ یہ عجیب لڑکی ہے۔ میں نے جب زیادہ اصرار کیا اور پوچھا کہ رادھا میں کیا خاص بات ہے تو وہ کہنے لگے تمہیں خود معلوم ہو جائے گا ایسی بات بتائی نہیں جاتی۔ سمجھی جاتی ہے۔ اس وابستگی کے باوجود جو اُن کو رادھا سے تھی اُن کو یہ بات ناگوار نہیں گزرتی تھی کہ میں اور رادھا گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہیں۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ہماری باتیں زیادہ تخلیہ میں ہوا کریں اور ایک دن مجھ سے فرمانے لگے رادھا تمہارے ساتھ جائے گی۔ میں نے رادھا سے پوچھا مگر وہ چپ ہو گئی، لیکن جب میں چلنے لگا تو وہ میرے ساتھ آنے پر راضی تھی۔ اس نے کہا رات کی گاڑی سے چلیں گے۔ صبح کی گاڑی میں بھیڑ بہت ہوتی ہے اور فوج کے لوگ بھی چل رہے ہیں۔ اس لئے رات کی گاڑی اچھی ہے، میں تیار ہو کر اسٹیشن آ گیا گاڑی بھی آ گئی۔ مگر رادھا کا پتہ نہ ملا۔ اس لئے میں مجبوراً اکیلا چلا آیا۔

ایک دن رات کو رادھا اچانک آ گئی۔ میں نے پوچھا تم کیسے آئیں"۔ کہنے لگی "ملنے چلی آئی"۔ میں نے کہا "اس رات کو تو خوب آئیں" کہا "امین صاحب سے ملنے گئی تھی۔ انھوں نے روک لیا۔ مگر اس دن سے برابر آپ کا خیال لگا رہا اور آج چلی آئی"۔ ریل کا رات کا سفر، تھکان اور نیند کے غلبہ کی وجہ سے رادھا لیٹتے ہی سو گئی۔ صبح کو بھی بہت دیر سے اٹھی۔ اٹھی تو سر میں درد تھا۔ کہنے لگی کل واپس جاؤں گی میں نے کہا ایسی بھی کیا جلدی گویا کہ آگ لینے آئی تھیں۔ کیا آئیں کیا چلیں۔ "لیکن امین صاحب کی بدلی ہو گئی ہے ان کو رخصت کرنا ہے" تو پھر رخصت کر کے کیوں نہ آئیں۔ ہاں مگر ایک تو وعدہ خلافی ہو گئی تھی اس کی کھٹک تھی، دوسرے آپ سے ملنے کو بڑا جی چاہتا تھا"۔ "جب اتنا اشتیاق ہے تو پھر کچھ دن تو رہو"۔ "یہ تو سچ ہے مگر ان کا بھی تو خیال ہے وہ کیا کہیں گے۔ انہیں رخصت کر کے میں جلدی آ جاؤں گی۔ آپ خفا نہ ہوں اور نہ کسی قسم کا خیال کریں"۔ میں خاموش ہو رہا وہ اگلے دن واپس چلی گئی۔

کچھ دن کے بعد رادھا حسب وعدہ پھر آ گئی اب کے کپڑوں کا بکس بھی ساتھ لائی۔ میں نے کہا تم آ گئیں کہنے لگی ہاں آ گئی۔ "انہیں رخصت کر آئی" "نہیں وہ نہیں گئے اور اس لئے میں جلدی آ گئی۔ نہیں گئے تو کچھ دن اور ٹھیر جاتیں" "نہیں پھر آپ کا بھی تو خیال تھا آپ نہ کہتے کہ اتنے دن لگا دئیے"۔ اب کے تو بکس لے کر آئی ہو زیادہ دن رہو گی"۔ "ہاں! زیادہ دن رہوں گی۔ کم اور زیادہ کیا اب یہیں رہوں گی"۔

"دیکھوں تمہارے بکس میں کیا ہے" "بکس میں کیا ہے غریبوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے دو چار ساڑیاں دو چار کپڑے" رادھا کو رہتے ہوئے عرصہ ہوگیا اپنی ضروریات سے فارغ ہوکر وہ گھر کے کام کاج میں معروف ہوجاتی ہے باورچی خانے میں جاکر کھانا پکواتی ہے۔ کبھی کبھار خود بھی ایک آدھ سالن تیار کرتی ہے۔ مگر کھانے پینے کا اسے شوق نہیں۔ زیادہ چیزیں میری پسند کی پکواتی ہے۔ اسے سب سے زیادہ زیور پسند ہیں۔ اس کے بعد ساڑیاں' سینما کا شوق بھی اسی لئے ہے کہ زیور اور ساڑیوں کے انتخاب میں آسانی ہوتی ہے۔ رادھا بہت دیر گئے تک سوتی ہے۔ وہ بھی چاہتی ہے اور میں بھی اس سے کہتا رہتا ہوں' مگر سویرے اٹھنا نہ اس کے بس کا کام ہے اور نہ اٹھانا میرے بس کا روگ ہے۔ جوانی کی نیند شاید ایسی ہی ہوتی ہوگی۔ مگر ادھر رادھا سو کر اٹھی اور ادھر گڑبڑ شروع ہوگئی گلشن ملازمہ کا خیال ہے کہ رادھا کے آجانے سے گھر کی رونق بڑھ گئی ہے۔ وہ کہتی ہے گھر منتا رہتا ہے۔ شیخ چاند ملازم کہتا ہے کہ رادھا اچھی ہے اس کے آنے سے گھر کی دولت میں اضافہ ہوگیا ہے ترکاری بیچنے والیاں کہتی ہیں کہ دُرسانی ترکاری خرید لیں تو پھر ان کا ٹوکرا جلد فروخت ہوجاتا ہے۔ اور ساری ترکاری ذرا دیر میں بک جاتی ہے۔

مجھے رادھا کے آرام کا بڑا خیال ہے اُس کی طبیعت نہ گھبرائے اس لئے ہر نئے کھیل میں وہ سینما چلی جاتی ہے۔ کپڑوں اور زیورات کی خریداری بھی خود کرتی ہے، وہ اس معاملے میں اس کی اپنی پسند اور اپنی رائے ہے۔ دوسرے کو دخل دینے کا موقع نہیں اور اگر کوئی رائے کا اظہار کرے تو اس کی کوئی وقعت نہیں۔ شروع میں جب وہ آئی تو میں نے خود ایک ساڑی لاکر دی تھی' مگر اس پر ایسی سخت تنقید ہوئی کہ توبہ بھلی۔ اس کا رنگ کچا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا ململ کو گلابی رنگوا لیا ہو۔ پرانے مال میں سے سستی چیز خرید لائے دو چار روز میں پھٹ پھٹا کر برابر ہوجائے گی۔ روپے مفت کے مل گئے ہوں گے۔ مردوں کو کپڑا خریدنے کا سلیقہ کبھی نہیں آئے گا۔ آپ نے خریداری کی تکلیف کیوں گوارا فرمائی' بہرحال جب تک وہ ساڑی واپس نہیں ہوگئی اور دوسری اپنی پسند کی نہ آگئی رادھا کو چین نہیں آیا۔

ایک دن رادھا نے کہا وہ جانا چاہتی ہے۔ اس نے کہا کچھ نہیں ذرا امین صاحب سے مل کر آؤں گی۔ اب وہ جانے والے ہوں گے کچھ نہیں تو رخصت تو کر آؤں میں نے کہا یہ سلسلہ تو بہت طویل ہوتا جاتا ہے اب ختم ہوجانا چاہئے۔ اس نے کہا کیا معنی' آپ کا مقصد یہ ہے کہ امین صاحب سے ملنا چھوڑ دوں' بے شک اب تمہیں فیصلہ کرلینا چاہئے' ادھر یا ادھر' مگر آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ آپ سے ملاقات کا ذریعہ بھی وہی ہوئے' "ہاں ٹھیک ہے مگر اس کا بدلہ تو بہت کچھ ہوگیا" "اس کا بدلہ تو کچھ بھی نہیں ہوا" "خیر جو تمہاری مرضی مگر اب تمہیں کوئی ایک راستہ اختیار کرلینا چاہئے"! "وہ نہیں یہ نہیں ہوسکتا' میں اپنے دل کی مالک ہوں"۔ "تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ سب تماشا تھا" "معنی آپ کا جو جی چاہے سمجھئے' مگر آپ مجھ سے یہ توقع کیسے رکھ سکتے ہیں کہ جس نے میرے ساتھ احسان کیا ہو اس سے نہ ملوں"۔ میں نے کہا رادھا تم کیسی الٹی الٹی باتیں کرتی ہو اگر تم کو جانے پر اصرار ہے تو پھر تم کو مجھ سے محبت نہیں اس کے علاوہ میں اور کیا سمجھوں۔ "میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ آپ سے زیادہ عزیز مجھے دنیا میں کوئی چیز نہیں میں اتنے دن آپ کے پاس رہی آپ مجھے بالکل نہ سمجھ سکے۔ میں آپ کو ہرگز نہیں بھول سکتی عورت سب کچھ بھول جائے مگر محبت کرکے پھر کبھی نہیں بھولتی"۔ "مگر پھر تم کیوں جاتی ہو رادھا اب تم مت جاؤ"۔

میں نے اسے لاکھ سمجھایا مگر اس نے ایک نہ سنا کہنے لگی جلد واپس آؤں گی میں نے کہا اب گئیں تو واپس آنے کی کیا ضرورت ہے اب مت آنا۔ اس نے کہا "مرد کا دل پتھر کا ہوتا ہے آپ منع کریں تو خیر ورنہ میں تو آپ کی لونڈی ہوں آپ کے قدموں میں رہنا پسند کرتی ہوں" یہ کہتے کہتے رادھا رونے لگی اور آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگی جو کسی طرح نہ رکی۔ میرا کہنا سننا بے کار ہوا وہ برابر روتی رہی اور بالآخر نو بجے کی

گاڑی سے چلی گئی۔

رادھا ایک گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اس کا باپ گاؤں کا پٹیل تھا۔ بچپن میں ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس وجہ سے رادھا یا تو اپنے بھائی، بہنوں کے ساتھ رہتی تھی یا کچھ دن کے لئے ماموں کے ہاں چلی جایا کرتی تھی۔ اس کا شگفتہ چہرا، مضبوط ہاتھ پیر، بھرا ہوا گداز جسم میانہ قد، لمبے لمبے کالے بال یہ سب مل ملا کر کچھ ایسی کیفیت پیدا ہوگئی تھی کہ رادھا کا شمار گاؤں کی خوبصورت لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ رنگ گورا تھا لیکن باہر دھوپ میں پھرنے کی وجہ سے ملگجا سا ہوگیا تھا۔ ماں کے نہ ہونے کے باعث رادھا پر کسی کی نگرانی نہ تھی۔ جوانی کے الھڑ پن نے اس میں اور اضافہ کردیا تھا۔ وہ خود رائے اور ضدی ہوگئی تھی۔ باپ کو کھیتوں کے کام کاج میں باہر رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے اس کے ماموں کی رائے تھی کہ اس کی شادی جتنی جلد کردی جائے اچھا ہے۔ بیٹی پرائے گھر کی چیز ہوتی ہے۔ اپنے گھر رکھ کر کب تک سنگوایا جائے۔ یہاں یہ صلاح و مشورے ہو رہے تھے کہ ایک دن رادھا گھر سے بھاگ نکلی۔

لچھمن گاؤں کے سنار کا نوجوان لڑکا تھا۔ ماں، باپ کا اکلوتا بیٹا بڑے لاڈ پیار سے پلا تھا۔ دبلا، پتلا چھریرا بدن، رنگ کالا، لنک اس قدر کہ کندن کی طرح چمکتا تھا، کام سے رغبت کم تھی۔ طبیعت میں آوارگی تھی۔ رادھا کو زیور کا شوق، آزاد مزاجی الگ، دونوں سینما دیکھنے شہر کو چل دئے۔ چھوٹے سے گاؤں میں اس بات کا چھپنا دشوار تھا۔ معلوم ہوگیا کہ لچھمن اور رادھا غائب ہیں۔ تلاش کرتے کرتے لوگ شہر بھی جا پہونچے۔ اور ان دونوں کو سینما دیکھے دو چار روز بھی نہ گزرے ہوں گے کہ اپنے عزیز و اقارب کے پنجے میں گرفتار ہوگئے۔ لچھمن تو بھاگ نکلا مگر رادھا نے واپس جانے سے انکار کیا۔ باپ تو شرم کے مارے بے چارہ کچھ نہ کہہ سکا مگر اور لوگوں نے بڑا اصرار کیا۔ لیکن رادھا نے کہا ڈوب مروں گی مگر اب گاؤں کو واپس نہ جاؤں گی۔ اس عرصے میں رادھا کی ملاقات امین صاحب سے ہوئی اور کچھ ہی عرصہ بعد میں نے اسے دیکھا۔

شیخ چاند ملازم نے کہا رادھا آئی ہے۔ میں نے کہا، کون رادھا! وہ خاموش ہوگیا۔ رادھا آکر سامنے کھڑی ہوگئی میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں نے کہا تم نے میری محبت کا خون کر ڈالا اور اس لئے میں تمہیں بھول گیا کہ تم کون ہو۔ اب تمہاری یاد آتی ہے تو دو چار آنسو بہا لیتا ہوں اور دل تھام کر بیٹھ جاتا ہوں۔

یاد آئیں گے تو جی بھر آئے گا!		روکنا اشکوں کا مشکل کام ہے

مسٹر سبحان اللہ

رات کا بھولا اور دیگر افسانے ۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی۔ استاد ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں شلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے بھی قابل مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائٹل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے صفحات ۱۶۸ قیمت صرف عہ۔

عید الفطر کے دن

(اپنے شوہر کی بے اعتنائیوں پر ایک سہاگن کے تاثرات)

عید آئی ہے زمانہ شاد ہے مسرور ہے
گوشہ گوشہ باغِ جنت ذرہ ذرہ طور ہے

بچے بھی مسرور ہیں پیر و جواں دلشاد ہیں
گھر امید و آرزوئے شوق سے آباد ہیں!

گلشنِ عالم پہ چھائی ہے بہار اندر بہار
آج اک اک منظرِ ہستی ہے جنت در کنار

آج دنیا اک نشاطِ کیف سے ہے چور چور
آج ہر ساعت ہر اک لحظہ ہے پیغامِ سرور

آج ہر دل شاد ہے ہاں صرف میں مغموم ہوں
عید کے دن بھی الٰہی عید سے محروم ہوں

عید کے دن بھی مجھے حاصل نہیں کوئی خوشی
ان کی بے مہری نے مجھ سے ہر مسرت چھین لی

صبح سے یہ وقت آیا وہ نہ آئے آہ آہ!
عید کے دن بھی نہ دم بھر مسکرائے آہ آہ

عید آئی اور گھر میں رنگ ہے کوئی نہ راگ
میں سہاگن ہوں مگر خوابیدہ ہے میرا سہاگ

یا الٰہی میں رہوں اندوہِ بے تابی میں غرق
اور میری ہم سنیں پہنیں لباسِ زرق برق

کیا یہی انصاف ہے اے خالقِ لیل و نہار؟
عید میں بھی عید کا میں کر رہی ہوں انتظار

اے مرے جذبات کا احساس وہ کرتے نہیں
اپنے آگے دوسرے کا پاس وہ کرتے نہیں

آہ یہ طرزِ تغافل مجھ کو دیکھا تک نہیں
عید کے دن کیا ضرورت ہے یہ پوچھا تک نہیں

لعنت ایسی زندگی پر کون اس صورت جیے
شب کو آئے اور سحر ہوتے ہی گھر سے چل دئے

گھر میں وہ آتے ہی کہتے ہیں کہ فرصت ہی نہیں
جیسے ان کو مجھ سے اب کوئی محبت ہی نہیں

المدد اے ضبطِ غم یہ آج تجھ کو کیا ہوا؟
میرے لب پر اُن کا شکوہ آہ کیسے آگیا!

در طریقِ غم بجز تسلیم دیگر کار نیست
گر بوَد تسلیم شیوہ مشکلے دشوار نیست

دور ہو اے شکوۂ غم مجھ کو ان سے کام ہے
ان کی بے مہری بھی میرے واسطے انعام ہے

زندگی سے ان کی وابستہ ہے میری زندگی
جس طرح مسرور ہوں وہ ہے وہی میری خوشی

ان کی مرضی ہے مسرت میری ہستی کے لئے
ہاں مری تخلیق ہے شوہر پرستی کے لئے

خوش ہوں یا ناخوش الٰہی وہ سدا زندہ رہیں
جس قدر ان کے عزائم ہیں وہ پایندہ رہیں

ان کا نظارہ ہی مجھ کو اک پیامِ عید ہے
اور جو وہ خوش ہوں تو ہر ساعت دوامِ عید ہے

سیدہ اختر

ایک شام

شوکت برآمدہ میں ٹہل رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں ان کی بہن رفعت کی سہیلیاں، منیر اور بلقیس خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ منیر کہہ رہی تھیں "بھئی! میں تو کہتی ہوں چند دن ہنسی خوشی جی لینا ہے تو یہ شادی وادی کا بکھیڑا نہ کیا جائے۔" منیر بے چاری شادی شدہ تھیں دو بچوں کی ماں بن چکی تھیں۔ اور شوکت کو بلقیس کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ان کی شادی محبت کی شادی تھی۔ منیر کے منھ سے ان لفظوں کو سن کر شوکت کو بڑا اچنبھا ہوا۔ اس نے ٹہلنا بند کر دیا اور ان پہاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا جن کے پیچھے سورج ڈوب رہا تھا اور شفق پھولی ہوئی تھی اس کے دیکھتے ہی دیکھتے رات کی تاریکی نے اس رنگین منظر کو دھندلانا شروع کر دیا۔ تارے چمکنے لگے اور پانچویں تاریخ کے چاند نے پھیکی پھیکی چاندنی پھیلا دی۔ منیر کا لہجہ بلند ہو گیا تھا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے اصرار پہ چائے کی دو پیالیاں پی چکی تھی۔ "بلقیس تم تو بھول کر بھی شادی نہ کرنا بھول کر بھی... ہائے.. اس سرخ و سپید رنگت پر، ان نشیلی، ہرن کی سی آنکھوں پر مجھے ترس آتا ہے... میری جان! تو سچ مچ پھول ہے تو شادی مت کر" شوکت سے نہ رہا گیا۔ برآمدہ سے وہ ڈرائنگ روم میں چلے آئے بلقیس سنبھل کر بیٹھ گئی "کیوں صاحب کچھ راز کی باتیں تو نہیں ہو رہی ہیں؟" منیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "راز کی باتیں ہوں یا نہ ہوں.. آپ تو کہیں گی ہی۔ بے چاری بھولی بھالی بچیوں کو ورغلانے بیٹھی ہیں۔" شوکت اپنی بہن رفعت کے قریب جا بیٹھے۔ منیر تیکھی نظروں سے انہیں تاکتی رہی اور بلقیس اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگی۔ "ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں آپ۔ شادی مت کر۔ کیوں مت کر صاحب"۔ منیر نے تیوری چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ "شوکت صاحب آپ بڑے ڈھیٹ ہوتے جا رہے ہیں۔ رفعت بی بی تم اپنے بھائی کو اتنا منہ نہ چڑھاؤ۔ کسی کا ادب نہ لحاظ۔ آئے آپ وہاں سے بحث کرنے کو۔ چلو بلقیس ہم دوسرے کمرے میں چلیں"۔ بلقیس اٹھ کھڑی ہوئی تو منیر نے شوکت کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں نوازش اور مہربانی کی التجائیں تڑپ رہی تھیں۔ منیر نے الائچی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ بیٹھو بیٹھو بلقیس۔ یہ وہاں بھی ہمارا پیچھا نہ چھوڑیں گے۔ دیکھئے جناب اگر آپ چپ سادھے بیٹھے رہتے ہیں تو ہم اور بلقیس بہن بیٹھے رہیں گے۔ بہن! آپ نے الٹی سیدھی حجت شروع کی تو.... سمجھ گئے نا آپ" شوکت نے سر ہلایا" ہاں ہاں سمجھ گئے۔ رفعت نے گفتگو کا رخ پھیرنے کے خیال سے کہا "منیر تم اپنے بچوں کو ساتھ نہیں لائیں۔ بڑے پیارے بچے ہیں۔ چھوٹے پر تو میں جان دیتی ہوں۔ کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے"۔ منیر شرارت سے بولی .... "تو شادی کرے تو تجھے بھی ایسے ہی پیارے پیارے بچے ہوں"۔ رفعت کچھ کہنے ہی کو تھی کہ شوکت بول اٹھے "کیا کہیں ہم تو روز ہی کہتے رہتے ہیں کہ ہمیں ایک دولھے بھائی کا سالا بنا دو۔ مگر انھوں نے تو جیسے قسم کھا رکھی ہے۔ شادی کے نام پر کانوں پہ ہاتھ دھرتی ہیں۔ اماں اصرار کرتی ہیں تو کمرہ میں بند ہو جاتی ہیں۔ روتی ہیں۔ کھانا پینا چھوڑ دیتی ہیں۔ منیر ان کی شادی تو اب تمہارے ہی بس کی بات ہے۔ منیر رفعت کی طرف دیکھ کر سر ہلانے لگی" نہ، نہ رفعت۔ شادی تو ہرگز نہ کرنا.... میں تو عمر بھر تیری شادی نہ ہونے دوں گی۔ اب دیکھو نا بلقیس تم بھی سنو... اور شوکت تم کس دنیا میں گم ہو۔ محفل میں اس طرح کسی کو گھورا نہیں جاتا... ہاں.... اب دیکھو نا..... مجھے کیا پھل ملا اپنی شادی سے۔ دو بچے اور اس کے بدلے۔ مجھے اپنی آزادی، اپنے عزیز اقارب، اپنے ماں باپ سب کو چھوڑنا پڑا۔ خاوند کی ناز برداریاں، تابعداریاں جھڑکیاں۔ یہ تو گویا ہر بیوی کی قسمت میں بدی ہوتی ہیں۔" بلقیس نے اپنی گردن پھیری اور کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگی۔ ہوا کے جھونکے گلاب کے پودوں کو جھلا رہے تھے.. اور بیلیں سہرا رہی تھیں۔ منیر نے بلقیس کی طرف دیکھ کر کہا "تمہیں تو شادی کا بڑا ارمان ہے.. بلقیس نے چونک کر اپنی گردن پھیر لی۔

"مجھے نہیں تو" "اری میں سب سمجھتی ہوں۔ شادی کا ذکر چھڑتے ہی تیری نظروں میں پھول کھیلنے لگے.... رنگینیاں ہرانے لگیں امنگ اٹھنے لگی.... رفعت برا نہ ماننا تم نوجوان لڑکیوں سے یہی مصیبت ہے کہ آگا پیچھا کچھ نہیں سوچتیں بس دل کے اشاروں پر ناچتی ہو" شوکت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "لیکن منیر آپا شادی میں ایسی کیا برائی ہے۔ آپ کی باتیں سن کر تو میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ دیکھئے جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے عورتوں نے مردوں سے راضی خوشی شادی کی۔ بلکہ اگر مردوں نے شادی سے آنا کانی کی تو انھوں نے زہر کھا لیا کنوؤں اور دریاؤں میں ڈوب مریں۔ ہزاروں جتن کئے اور شادی کرکے ہی دم لیا۔ انسانی فطرت کا بھی تو یہی تقاضا ہے۔ پھر عورت یہ کہے "میں چارودتی اشوک کی بیٹی۔ نیپال کے پہاڑوں میں بھکشنی بنی بیٹھی رہوں گی تو یہ دنیا تو اجڑ جائے۔ کیوں بلقیس تمہارا کیا خیال ہے؟" "بلقیس سے کیا پوچھتے ہو.... وہ بے چاری تو تمہاری ہر بات پر آنکھیں بند کرکے گردن ہلا دیتی ہے۔ وہ تو اپنا منہ پھوڑ کر کہہ چکی ہے کہ وہ آپ سے شادی کرے گی"۔ بلقیس نے برا مانتے ہوئے کہا "منیر دیکھو بھئی اب تم بہت بڑھ چلیں۔ ہم نے کب کہا تھا کہ کسی سے شادی کریں گے" رفعت کھکھلا کر ہنسنے لگی "شریر کہیں کی۔ ٹھیر و نا اب دولہا بھائی کو آنے تو دو۔ نہ پٹوا دوں تو میرا نام بلقیس نہیں"۔ "دولہے بھائی۔ منیر نے دیدے مٹکاتے ہوئے کہا "دولہے بھائی! یہاں کون ڈرتا ہے تیرے دولہے بھائی سے مجھے منیر کہتے ہیں۔ سنا ناک چنے چبوا دیئے ہیں' اشاروں پر چلاتی ہوں۔ الٹا تجھی کو نہ پٹوا دوں تو سہی" رفعت کی ہنسی رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اسی طرح ہنستی ہوئی وہ کہنے لگی "منیر آپا' ایک بات آپ سے پوچھتی ہوں.... دولہے بھائی آپ سے محبت تو بہت کرتے ہوں گے.." شوکت نے مسکرا دیا۔ بلقیس کا غصہ بھی جاتا رہا۔ اور ان تینوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں منیر کے خلاف سازش کرلی۔ بلقیس بولی "دولہے بھائی کی محبت کا کیا ٹھکانا۔ کل میں نے انھیں باغ عامہ میں منیر منیر پکارتے سنا.... یہ بے چاری سینما گئی تھی۔ بس یہ جدائی بھی ان کے دل پر شاق گزری۔ کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل پڑے۔ شوکت نے چپکے سے ہی کہا "بہن بلقیس تم مذاق میں نہ اڑاؤ۔ دولہے بھائی سچ مچ منیر سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ ایک ذرا کبھی کبھی منیر کو پیٹ دیتے ہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ بھی تو محبت کی نشانی ہے"۔ منیر کا چہرہ تمتما اٹھا.... دل تو اس کا بھی مسکرا رہا ہوگا۔ لیکن آنکھیں خفگی کا اظہار کر رہی تھیں۔ کچھ کہنے کے لئے اس نے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ رفعت نے کہا "اپنی منیر کو قدر نہیں دولہے بھائی کی۔ بے چارے نمازی پرہیزگار دو بچوں کے باپ منیر کے خاوند.... انھوں نے تو منیر پر کئی شعر بھی لکھے ہیں۔ ایک دفعہ میں منیر کے گھر گئی تھی تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی اسٹیج کے ہیرو اور ہیروئن اپنا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ دولہے بھائی دوزانو بیٹھے ہوئے تھے۔ منیر کرسی پر تھیں۔ اور کروشیا کے کام میں سر جھکائے منہمک تھیں۔ لیکن ساری توجہ دولہے بھائی کی طرف ہی تھی۔ دولہے بھائی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ لئے بے چاروں کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہوں گے۔ کیونکہ ان کی آواز میں بھی آنسو تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "اے میرے بچوں کی ماں" "میں میرے بچوں کا باپ ہوں۔ اس لئے تو میری بیوی ہوئی۔ لیکن پھر بھی میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دے...." بلقیس کا ہنسی کے مارے برا حال تھا شوکت نے دستی میں اپنا منہ چھپا لیا۔ منیر بل کھاتی بیٹھی رہیں۔ شوکت نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا "رفعت! اس کے بعد منیر نے کیا کہا۔ رفعت نے منیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" انہی سے پوچھ لو۔ کیا جواب دیا' منیر تم نے.... منیر نے ہونٹ چباتے ہوئے للکارا "چپ بدتمیز... شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے افسانے پڑھ پڑھ کر تیرا دماغ بھی خراب ہوگیا ہے" "میں کہتی ہوں' میں کہتی ہوں" بلقیس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "چپ رہ بلقیس۔ نہیں تو وہ تیری بات کہہ دوں گی" بلقیس ایک دم رک گئی' کونسی بات میری؟ وہ جو.... آج رفعت کے ہاں آتے ہوئے راستے میں تو نے مجھ سے کہی تھی.... ہاں.... مجھے یاد نہیں پڑتا۔ ذرا کہو تو وہ کیا بات تھی' منیر نے بلقیس کی طرف اور پھر شوکت کی طرف دیکھا "سمجھیں" بلقیس نے گردن جھکالی شوکت شش و پنج کی حالت میں منیر کا منہ تکتے بیٹھے رہے "کیا بات ہے منیر" انھوں نے منیر سے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔ بات یہ ہے کہ وہ.... بات یہ ہے وہ..... رفعت تم بھی سنو!" بلقیس نے شوکت کی طرف دیکھ کر اس کا منہ چڑا دیا "منیر دیکھو بھئی تمہیں میری قسم ہے

وہ بات نہ کہو — میں سمجھی ہوں نہ کہو، میرے متعلق کچھ کہنے والی تھیں نا‘ بلقیس نے توبہ کرنا شروع کیا ”معاف، پلیز، معاف“ شوکت نے اپنی نشست چھوڑ دی۔ اور منیر کے قریب جا بیٹھے ”ہاں منیر کیا بات تھی وہ؟... قسم ہے دیکھو“ بلقیس نے چیخ کر کہا۔ منیر، شوکت کے کان کے قریب اپنا منہ لے گیا۔ میں جاتی ہوں۔ میں جاتی ہوں‘ کہتی ہوئی بلقیس وہاں سے بھاگ نکلی۔ اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

شوکت برآمدے میں ٹہلنے لگے۔ پہاڑیاں سرمئی رنگ کے بادلوں کی طرح دھندلی دھندلی نظر آرہی تھیں۔ چاندنی نکھر رہی تھی۔ تاروں سے سارا آسمان بھرا ہوا تھا۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے گلاب، چنبیلی کی خوشبو اڑائے لئے پھر رہے تھے۔ منیر اور رفعت اپنی کسی سہیلی کے متعلق بات چیت کر رہی تھیں۔ منیر کہہ رہی تھی ”وہ تو سنا ہے نن بن کر پانڈیچری جانے والی ہے۔ کوئی اسے روکے۔ یہ عمر ہے بھلا نن بننے کی“ رفعت نے کہا اور کل ہی تو مجھ سے کہہ رہی تھی کہ ”اس دنیا سے میرا دل اب بیزار ہو گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کسی پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹی جھونپڑی ہو، ندی ہو، میں اکیلی رہوں، اور کیا کیا۔۔ میں تو سمجھتی ہوں اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یا اس کے دل کو کوئی بھاری صدمہ پہنچا ہے“ منیر نے سوچتے ہوئے جواب دیا ”کچھ ہو ہمیں اسے پانڈیچری تو نہ جانے دینا چاہئے۔ کتنی پیاری بچی ہے مجھے تو اس کی حالت پر بڑا ترس آتا ہے۔ رفعت تو کچھ کرو بھئی اس کے لئے“ ”اور تم کس کے لئے کرو گی؟“ ”میں بلقیس کے لئے۔ دیکھ رہے ہیں چہل قدمی کس زوروں پر ہو رہی ہے“ رفعت ہنس پڑی۔ ”مگر دیکھو رفعت ایک بات میں تم سے کہتی ہوں لڑکیاں پہلے تو محبت ہی نہ کریں اور کریں تو اپنا دل بڑا رکھیں۔ رفعت نے کہا ”منیر تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں“ ”تھوڑی دیر میں آجائیں گی“ شوکت برآمدے میں ٹہل نہ سکے۔ باغ میں جا پہنچے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے رفعت کے کمرے کی کھڑکی کے پاس پہنچ گئے۔ جھانک کر دیکھا تو بلقیس بناؤ سنگھار کی میز کے سامنے بیٹھی ہوئی خود اپنی تصویر دیکھ رہی تھی۔ شوکت نے چنبیلی کے پھول توڑ لئے تھے۔ چپکے سے انہوں نے وہ پھول بلقیس کی طرف پھینک دیئے۔ ہلکی سی چیخ کی آواز سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد بلقیس کھڑکی کے پاس آگئی۔ ”کون ہے؟“ شوکت سیدھے کھڑے ہو گئے ”ارے آپ ہیں، میں تو ڈر گئی“ شوکت کی آواز لرز رہی تھی۔ ”بلقیس، تم نے منیر سے کیا کہا تھا؟“ ”کچھ بھی نہیں“ ”چھپاؤ نہیں مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ منیر نے مجھ سے کہہ دیا“ ”جھوٹی ہے وہ“ اتنا کہہ کر بلقیس جانے کے لئے پلٹی۔ شوکت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ”تم نے اس سے کہا تھا۔ منیر آج تم اور رفعت ہم دونوں کو اکیلے چھوڑ دینا“ ”جی نہیں میں نے ایسا نہیں کہا۔ وہ جھوٹ کہہ رہی تھی۔“ شوکت نے بلقیس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ ”بلقیس میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم پسند کرو تو ہم اپنی ایک نئی دنیا بسائیں۔ جہاں حسن اور محبت کے جلوے بکھرے ہوں گے۔ جہاں تم ہو گی۔ جہاں میں ہوں گا، میں تمہاری آزادی نہیں چھینوں گا۔ میں تمہارے سکھ، چین پر ڈاکہ نہیں ڈالوں گا ... میں صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ صرف تمہیں ....“ یکایک پر موٹر کی آواز سنائی دی بلقیس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ زبان نکال کر شوکت کا منہ چڑا دیا۔ اور پلٹ کر جانے لگی۔ دروازے پر بلقیس اور رفعت کھڑی تھیں۔ انہوں نے مبارکبادی کا گیت گانا شروع کیا۔ من کی مرادیں پائی، اے پائی سکھی ری۔ بلقیس کی گردن نیچی ہو گئی، اور وہ شرمائی، نوکر نے اطلاع دی کہ منیر منزل سے موٹر آئی ہے۔ تینوں باہر نکل آئیں۔ برآمدے میں منیر کے خاوند اپنے دونوں بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ چھوٹا کہہ رہا تھا ”پپا میں ممی کے ساتھ شادی کروں گا“ اور اس کے پپا اچھا کہتے جاتے تھے اور بیزارگی سے اپنا منہ ادھر ادھر پھیرتے جاتے تھے۔ منیر کو دیکھتے ہی اس کے خاوند نے کہا ”یہ بھی خوب، سہیلیوں میں گئیں تو بس سہیلیوں کی ہو رہیں۔ گھر کا بھی کچھ خیال ہے بچوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ چلتے چلتے رفعت بہن اب انہیں اجازت دے دو۔ شوکت کہاں ہیں۔ بلقیس تمہارے گھر سے آدمی آیا تھا۔ تم بھی چلو۔ میں تمہیں چھوڑتا ہوا جاتا ہوں۔ بلقیس نے بچوں کو پیار کیا۔ اور چھوٹے کو گود میں اٹھا لیا۔ خدا حافظ خدا حافظ کہتی ہوئیں دونوں موٹر میں سوار ہو گئیں۔ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے شوکت بھی موٹر کے قریب آگئے۔ منیر آپا۔ اتنی جلد چلیں۔ رات کا کھانا کھا کر جاتیں تو اچھا تھا۔ منیر نے

بلقیس کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا "بلقیس تم رک جاؤ نا" بلقیس نے تیزی سے کہا "چلئے دولہے بھائی" موٹر چلنے لگی تو۔ بلقیس نے اپنا سر باہر نکالا۔ اور وہی لال لال زبان اس کے دانتوں سے باہر نکل آئی۔ خود گردن کو جھٹکا سا ہوا۔ پھاٹک کے قریب موٹر کی پچھلی لال روشنی چمکی تو شوکت کو ایسا نظر آیا جیسے وہی زبان اس میں بھی کوند رہی ہے۔ وہ اسی طرح برآمدے میں ٹہلتے رہے اور ٹہلتے رہے۔ محبت یا شادی یا گردہ یا نڈیچی اور ایک جھونپڑی۔ شوکت کا دماغ چکرا گیا۔ لڑکیاں بھی کیا جذباتی ہوتی ہیں۔ کیا منجلی! رفعت نے پکارا۔ بھائی جان کھانا تیار ہے؟

تین پیکر

رشید قریشی

صبح

صبح رو پہری تاروں کی جب جھل مِل کم ہو جاتی ہے
چاند میں چرخہ کاتنے والی بوڑھی جب سو جاتی ہے
نیند نگر کو جاتی ہے جب ٹولی سب مہ پاروں کی
اور یہ ٹولی چھپ جاتی ہے چوٹی پہ کہساروں کی
کرنیں اپنے دامن میں جب اوس کے موتی رولتی ہیں
دور افق پر نیند کی پریاں اڑنے کو پر تولتی ہیں
جب جلوے سے دھندلے دھندلے سائے پیٹے رہتے ہیں
اوس کے موتی کرنوں کے دھاگے میں سمٹے رہتے ہیں
ایسے میں ہل کندھوں پر لے مستقبل کا شہزادہ!
بیلوں کی گھنٹیوں پر کچھ گاتا کھیت کو آتا ہے!!

دوپہر

چاند، ستارے، اوس کے موتی، صبح کے سب راگ گئے!
دھن والے سوتے ہیں اب تک نردھن سارے جاگ گئے
سورج کا ہنس مکھ بچپن اب ہونے لگا چپ چپ کے جوان
اوس کے آنسو بہنے لگے پھولوں کے غمگیں دل کا دھواں
بھاپ کی موجیں رقصاں ہیں، دھرتی کا تنفس بڑھنے لگا
آگ کے دریا کا دھارا اٹھا تھمیں بھرتا چڑھنے لگا!
آگ کے شعلے کہساروں کی پیشانی کو چومتے ہیں!
جیسے جہنم دوش پہ لے کر بھوت زمیں پر گھومتے ہیں
لیکن کھیت کے مالک کو ان سب باتوں سے کام ہی کیا
اپنی دھن میں گانے والا، اپنی دھن میں گاتا ہے

شام

شاہ خاور جا کے شفق کی گودی میں دم توڑ دیا
دنیا کی پرچھائیوں نے بھی دنیا سے منہ موڑ لیا
دور افق پر شب کی دیوی زلفوں کو بکھرانے لگی
نیند کی رانی چھپتے چھپتے ہر اک شئے پر چھانے لگی
اجلی اجلی بدلیوں میں چاند کی پیاری صورت ہے
یعنی مرمر کے مندر میں، چاندی کی اک مورت ہے
دل کی اک بے نام خوشی اب کانوں میں کچھ بولتی ہے
کھیت کا راجہ پھر اس دھن میں گانے کو لب کھولتا ہے
لیکن ایسے میں گرد اور دور سے کچھ چلاتا ہے!!
اس کا نغمہ آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ جاتا ہے!

متین سہروردی

ڈاکیہ

شاید میں اس عمر تک کبھی نہ پہنچ سکوں گا جب کہ ڈاکئے کی آواز میرے اندر ایک سنسنی سی نہ پیدا کرسکے۔ میں بہت شاذ ہی ایسی چیزیں پاتا ہوں جو پلنے کے قابل ہوتی ہیں اور نہ مجھے کوئی ایسے خطوط ہی وصول ہوتے ہیں جو مرنے کے بعد رنگین، ریشمی فیتے میں بندھے ہوئے نکلیں۔ پھر بھی معلوم نہیں کیوں میں ایک توقع میں رہتا ہوں اور کیوں ڈاکئے کی آواز اس توقع کو اور تازہ کردیتی ہے، حالانکہ بارہا اشتہاروں یا کسی شاپ کے بِل نے اس توقع کو مایوسی سے بدل بدل دیا ہے۔ مجھے ٹھیک طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ آخر میں کس خط یا پارسل کے انتظار میں رہتا ہوں! میں اب کسی چیز کی امید میں بھی نہیں کیونکہ تجربے نے مجھے یہ بتایا ہے کہ جو کچھ نہیں چاہتا اس کو کچھ نہیں ملتا۔ پھر بھی ڈاکیہ کی آواز۔ اور یہ ہمارے محلے کا ڈاکیہ کچھ اس زور شور سے دروازے کھٹکھٹاتا اور آواز دیتا پھرتا ہے کہ جیسے کسی جوہری کی دوکان کا کوئی قیمتی پارسل لا رہا ہے۔ حالانکہ وہی کسی کے نام کوئی بِل، کسی کے نام ایک کارڈ یا بہت ہوا تو باتصویر کارڈ، عام طور پر دیتا پھرتا ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ڈاکیہ کی آواز معلوم نہیں کیوں جذبات میں ایک ایسا تموج پیدا کرتی ہے جس کا "طلسم" کم ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ عدم تیقن میں ہمیشہ رومان کا ایک پہلو ضرور ہوتا ہے۔ اور تیقن کی حالت کے ساتھ رومانیت نہیں رہنے پاتی۔

ڈاکیہ آتا ہے، دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور سارا گھر گونج اٹھتا ہے اور اگر مکان کئی منزلہ ہو تو ہر منزل کے کسی نہ کسی کمرے میں ایک ایسا شخص ضرور ہوتا ہے جس کے جسم میں انتظار و شوق کی ایک روسی دوڑ جاتی ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ ہم ایسی صورتوں میں ایک عدم دلچسپی اور بے توجہی کا روپ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کیفیت شاید انسانی اعمال کی تمثیل کا ایک ایسا "ایکٹ" ہے جو ہم کو اپنی زندگی کے بیشتر لمحوں میں دوسروں کے سامنے کرنا پڑتا ہے۔ ہم ایسے موقعوں پر دنیا کو سنانے کے لئے کہہ اٹھتے ہیں کہ "الحمد للہ کہ کم از کم ہفتے میں ایک روز تو اس بلا سے نجات رہتی ہے" گر میں سمجھتا ہوں کہ اس جملے سے ہمارا حقیقی مطلب یہ ہوتا ہے کہ کم از کم ہفتے میں ایک روز تو ہماری روح بلاوجہ کے ارتعاش میں بلند ہو کر اور پھر ایسی معمولی چیزوں کو دیکھ کر دھڑام سے نیچے گر رہنے سے تو بچ جاتی ہے جیسی کہ گشتیاں، دوکانوں کے بِل، اے، آر، پی کے بلٹن۔ یا بعض شناساؤں کے غیر دلچسپ خطوط جن کا جواب بہ اصرار جلد مانگا جاتا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ہم سب ڈاکیہ کی آواز کے ساتھ اپنے اندر ایک سنسنی سی ضرور محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو جلد جلد کسی نہ کسی بہانے اپنے کمروں سے نکل کر "ہال" میں وہاں تک پہنچ جاتے ہیں جہاں خطوط رکھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ کیا آپ نے ان آنے والوں کی نظر اور چال میں چھپے ہوئے اشتیاق و انتظار کو نہیں دیکھا؟ ہاں یہ صحیح ہے کہ شاید ہم مرجانا پسند کریں گے، لیکن ایمانداری کے ساتھ یہ تسلیم نہ کریں گے کہ دراصل اس وقت ہم اپنے کمرے سے یہی دیکھنے کے لئے نکلے تھے کہ آخر کار "وہ خط" آیا کہ نہیں۔ ہم اپنی اس حرکت کی حقیقی غایت کو چھپانے کے لئے بیسیوں عذر تراشیں گے۔ ہم کہیں گے کہ ذرا ہمیں تار گھر جانا ہے۔ یا اپنے کتے کو سیر کرانی ہے یا ہم اپنی چھتری نیچے ہال میں بھول گئے تھے وہ لینے آئے ہیں۔ غرض کہ سوائے حقیقت کے سب کچھ کہا جائے گا۔ اور وہ حقیقت صرف یہ ہوگی کہ ہمیں اپنی قسمت کا فیصلہ معلوم کرنے میں ایک لمحہ کی دیر بھی روا نہ تھی۔ ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ آخر کار اس وقت کی ڈاک نے ہماری زندگی کی راہ کو عمر بھر کے لئے بدل تو نہیں دیا؟

میں نہیں سمجھتا کہ بے چارہ ڈاکیہ اپنے پیشے کی اس رومانی کیفیت کا ذرا سا بھی اندازہ رکھتا ہوگا۔ عام طور پر اور لوگوں کو بھی تو نہیں ہوتا! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ جو بے تار پیام رسانی کا کارندہ ہوتا ہے کبھی رک کر یہ سوچتا بھی ہے کہ وہ دورِ حاضر کی عظیم ترین ایجادوں میں سے ایک کو

کام میں لا رہا ہے؟ نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ جب دنیا کے کسی دوسرے حصے سے کوئی اس حصے کے کسی باشندے کو پیام دینے کے لئے آواز دیتا ہے تو اس کارندہ کی زبان سے غالباً صرف یہ نکلتا ہے کہ "لاحول، پھر کوئی کچھ بکواس کرنا چاہتا ہے"۔ اسی طرح ہمارے ڈاکئے کی نظر میں سب گھر یکساں ہوتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ جس گھر میں ڈاک زیادہ آتی ہے اس کو وہ زیادہ تکلیف دہ یا ڈاک کی مناسبت سے انعام مل جایا کرتا ہے تو زیادہ تسکین دہ سمجھتا ہے لیکن اس کو اس کی مطلق خبر نہیں ہوتی کہ وہ اپنے ہر چکر میں دل شکستگیاں یا مسرتیں یا بیزاریاں اور پریشانیاں تقسیم کرتا پھرتا ہے۔ اور یہ سب کچھ تقدیر کی سی بے حسی کے ساتھ! صرف ہم ہی لوگ جو گھروں میں رہتے ہیں اس کی کھٹ کھٹ کے ساتھ جھٹ سے اچھل پڑتے ہیں۔ غریب بے چارہ! شاید اس کے پاس اتنا وقت بھی تو نہیں کہ وہ چند پوسٹ کارڈ ہی پڑھ لیا کرتا کہ جس سے شاید اس کے پیشے کی بے مزہ اور غیر دلچسپ معمولات میں کچھ تھوڑی سی تفریح طبع کا سامان ہو جاتا۔ وہ بس پھرتا جاتا ہے اور پھرتا جاتا ہے اور پھرتے پھرتے تاش کے پتوں کی طرح خطوط تقسیم کرتا رہتا ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ اس کا پیشہ صحت بخش ہے کیونکہ اس کو ہر موسم میں تازہ ہوا کھانے کا موقع ملتا ہے۔ مگر آہ اس کا پیشہ کس قدر بیزار کر دینے والا ہے؟

مگر یہ بیزار کر دینے والی کیفیت، الحمد للہ کہ مکان کے صدر دروازے کے اس طرف آ جاتی ہے جس طرف ڈاکیہ رک جاتا ہے۔ کیونکہ دروازہ کے اندر کی جانب تو کئی ایسے جذبات کھیلتے ہوتے ہیں، جو دوران خون پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں متوقع چیز کی سنسنی ہوتی ہے اور یہاں یہ امید بھی ہوتی ہے کہ شاید غیر اغلب چیز ممکن ہو جائے۔ بلکہ جہاں تک کہ جس چیز کو ہم ایک عرصے سے ناممکن سمجھ رہے تھے شاید وہ واقع ہی ہو جائے۔ لیکن یقین مانیئے کہ ہم کبھی اپنے جذبات کو چہرے سے ظاہر ہونے نہیں دیتے۔ تا صاحب ہمیں ہم شاید انگریزوں کی طرح اپنے چہرے کے عضلات کو ساکت و صامت رکھنے میں ماہر بن رہے ہیں۔ ہم اس موقع پر صرف یہ کہنا پسند کریں گے "یہ لو! ڈاک آ پہنچی۔ اب شاید چند غیر دلچسپ خطوط کا جواب دینا پڑے گا"۔ اور پھر ہم ڈاک کا انتظار کرنے لگیں گے اور اگر اتفاق سے اس ڈاک میں ہمارے نام کا کوئی خط نہ ہوا تو پھر ہمارے دل کے اندر اندر ایک مایوسی کی لہر دوڑ جائے گی اور ہمیں محسوس ہونے لگے گا کہ بس ڈاک کا رومان ہی ایک تفریحی رومان ہے جو ہمارے لئے باقی رہ گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ڈاک کی آمد ہمارے اندر توقع کے ساتھ امنگ اور جوش کی ایک کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور باوجود اس کے کہ ہم برسوں کسی "مخصوص خط" کا انتظار کرتے رہے ہیں اور ہمیشہ اس کی بجائے کوئی اشتہار یا نوٹس ہی ہمیں ملا کیا ہے پھر بھی امید کا پیدائشی حق ہر ڈاک کی آمد پر عود ہی کر آتا ہے اور ہر ڈاک ہمارے دل کے اندر یہ یقین پیدا کر دیتی ہے کہ آخر کار ہماری زندگی کا ایک "خاص دن" آ ہی گیا۔ اور اس طرح بس امید ہی امید میں ہم جیئے چلتے ہیں۔ یہاں تک کہ "آخری پیام" ہم تک پہنچ جاتا ہے۔

لطیف فاروقی

موجودہ جنگ کے اثرات

(ہندوستانی صنعتی تحقیقات پر)

پہلی ستمبر ۱۹۳۹ء سے جب موجودہ جنگ چھڑ گئی تو اس کے معاشی اثرات دنیا کے ہر حصے میں ظاہر ہونے لگے۔ لیکن یہ اثرات ہندستان کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ اس جنگ کی وجہ سے ملک کے صنعتی نظام میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے دیس کی ایسی کوئی صنعت نہیں جس پر اس جنگ کے گہرے اثرات نہ پڑے ہوں۔ یہ اثرات دو قسم کے ہیں۔ ایک اچھے اور دوسرے برے۔ وہ تمام ہندستانی مصنوعات جن کا فوجی سازو سامان یا جنگی ضروریات سے کچھ بھی تعلق ہے ان کی مانگ اس قدر بڑھ گئی ہے کہ فراہمی میں مشکل پیش آرہی ہے۔ چنانچہ جنگ شروع ہوتے ہی تقریباً ۱۰۰ کروڑ روپیوں کی چیزوں کا آڈر ہندستانی صنعتی اداروں کو وصول ہوا۔ اور اب یہ رقم ۲۸۰ کروڑ روپیوں تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن بعض مصنوعات ایسی بھی ہیں جن کی جنگ سے پہلے مختلف یوروپی ممالک مثلاً اٹلی، ناروے، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ، یوگوسلاویہ اور یونان میں کھپت ہوتی تھی۔ جوں ہی یہ ملک دشمن کے زیر اثر آگئے ہندستان کی یہ تجارت بھی ختم ہوگئی۔ جس کی وجہ سے بعض ملکی، صنعتی اداروں کا دیوالیہ نکل گیا۔ لیکن اب حکومت ہند کی سرپرستی کی وجہ سے یہ صنعتیں پھر سے اُبھر رہی ہیں۔

موجودہ جنگ کی وجہ سے ہندستانی مصنوعات کے حق میں جو چیز سب سے زیادہ فائدہ پہنچانے والی ثابت ہوئی وہ باہمی تبادلۂ خیالات اور اشتراکِ عمل ہے جو حکومت ہند کے تجارتی، صنعتی اور زرعی عہدہ داروں اور ہندوستانی سرمایہ داروں اور مختلف خانگی صنعتی اداروں میں پیدا ہو چکا ہے۔ اسی اسپرٹ کا نتیجہ ہے کہ آج سرکاری اور خانگی صنعتی ادارے، گھریلو اور جنگی ضروریات کی تمام چیزوں کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں۔ موجودہ فوجی ضروریات کی چھان بین کی گئی تو معلوم ہوا کہ لڑائی جاری رکھنے کے لئے ــــ چالیس ہزار چھوٹی اور بڑی مصنوعات کی ضرورت ہے۔ ان میں سے بیس ہزار مصنوعات تو ایسی ہیں جو جنگ چھڑنے کے وقت بھی ہمارے ملک میں تیار کی جارہی تھیں اور باقی مصنوعات کی فراہمی کے لئے سنہ ۱۹۴۰ء سے حکومت ہند نے مختلف قدم اٹھائے۔

سب سے پہلے محکمہ فراہمی رسد آنریبل سر محمد ظفر اللہ خاں کے تحت قائم کیا گیا۔ اس محکمہ کی نگرانی میں ایک وار سپلائی بورڈ قائم کیا گیا تاکہ فوجی ضروریات کے سامان اور مصنوعات کی فراہمی میں آسانی ہو۔ سامان جنگ کی فراہمی سے متعلق تمام صوبوں میں کمیٹیاں قائم کی گئیں اور صنعتی صوبوں مثلاً بنگال، بمبئی، صوبہ متحدہ، مدراس، پنجاب اور سندھ میں رسد کے کنٹرولر مقرر کئے گئے۔

ہندستانی صنعتی کارخانوں کا معائنہ کرنے، انھیں مشورہ دینے اور یہ معلوم کرنے کہ وہ کہاں تک سامان جنگ فراہم کرسکتے ہیں سلطنت برطانیہ کی وزارت رسد نے ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء میں رسد کے متعلق ہر ہر ماہرین کا ایک وفد (Sir Alexander Roger) کے تحت ہندوستان روانہ کیا۔ اس وفد نے ۷۰۰ کارخانوں کا معائنہ کیا اور تقریباً ۵۰۰ مشاورتی جلسوں کے بعد ہندوستانی مصنوعات کی موجودہ حالت اور ان کی فوری ترقی سے متعلق نہایت قیمتی مشورے اور رپورٹیں حکومت ہند کے پاس پیش کیں۔ علاوہ اس کے فلسطین، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی آفریقہ، جنوبی روڈیشیا، برما، ہانگ کانگ، لنکا، ملایا، مشرقی آفریقہ اور ہندوستانی نمائندوں کی ایک کانفرنس۔ مشرقی گروپ کانفرنس کے نام سے ۲۵ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء میں منعقد کی گئی تاکہ یہ تمام ملک کم سے کم وقت اور زیادہ سے زیادہ مقدار میں وہ تمام چیزیں تیار کریں جن کی حکومت برطانیہ کو

موجودہ جنگ میں ضرورت ہے۔

لیکن ان تمام کوششوں سے زیادہ دیرپا اور زیادہ دور رس حکومت ہند کا وہ سائنٹیفک اور صنعتی تحقیقاتی بورڈ ہے جو اپریل ۱۹۴۰ء میں آنریبل سر راما سوامی مدلیار وزیر تجارت کی صدارت میں قائم کیا گیا۔ مسٹر غلام محمد سابق ناظم اشیاء خرید و حال صدر المہام فینانس سلطنت آصفیہ حیدرآباد دکن اس بورڈ کے نائب صدر مقرر کئے گئے۔ صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹیاں قائم کی گئیں تاکہ ہر صوبہ کی مقامی صنعتی پیداوار اور جنگی مصنوعات کی پوری چھان بین ہوسکے۔ یہ صوبہ واری کمیٹیاں نہ صرف مقامی مصنوعات کی تحقیقات کرتی ہیں بلکہ مرکزی بورڈ کو بھی ہر ممکن طریقے سے مدد پہنچاتی ہیں بورڈ کی تحقیقات کو کام میں لانے کے لئے حکومت ہند نے ایک صنعتی تحقیقاتی کمیٹی بھی قائم کردی۔ اس کمیٹی کا پہلا اجلاس ۱۴ر فروری ۱۹۴۱ء کو منعقد ہوا جس میں یہ طے پایا کہ نہ صرف نئی تحقیقاتی اسکیمیں بلکہ پوشیدہ صنعتی راز، دریافت ہونے والی اور دریافت کی ہوئی نئی چیزوں کے متعلق تمام معلومات کارخانوں اور صنعتی اداروں کو مساوی طور پر فراہم کی جائیں تاکہ پیداوار میں فوری اضافہ ہو۔ ہماری روزانہ زندگی کی ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو موجودہ جنگ کی وجہ سے ہندوستان نہیں آسکتیں۔ اس صنعتی بورڈ کا یہ کام ہے کہ وہ ایسی اشیاء کو ملکی مسالوں سے تیار کرے۔ اگر یہ ضروری مسالے ملک میں نہ مل سکیں تو ایسی مصنوعات تیار کرے جو اُن کا بدل ثابت ہوں۔ ان تحقیقاتی انتظامات کا یہ مقصد ہے کہ ملک ان فوجی اور غیر فوجی مصنوعات سے بے نیاز ہو جائے جو باہر سے لائی جاتی ہیں۔

ہندوستان میں بعض ایسے صنعتی تحقیقاتی ادارے موجود ہیں جن میں اچھا کام ہو رہا ہے۔ فارسٹ ریسرچ انسٹیٹیوٹ دہرہ دون لکڑی کے صنعتی استعمال کے کام میں لگا ہوا ہے۔ ہارکورٹ بٹلر ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ میں مختلف تیلوں کی خوبیوں اور خصوصیتوں پر تحقیقات ہو رہی ہیں۔ انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور اور شعبۂ کیمیکل ٹکنالوجی بمبئی یونیورسٹی میں کیمیائی نوعیت کی بعض اہم اور ضروری چیزوں کی تحقیقات ہو رہی ہے۔ علاوہ ان بڑے بڑے اداروں کے بعض تحقیقاتی ادارے ایسے بھی ہیں جو صرف خاص خاص چیزوں کی تحقیقات کے لئے اپنے آپ کو وقف کرچکے ہیں۔ ان میں لاک ریسرچ انسٹیٹیوٹ بہار، صنعت شکرسازی کانپور۔ زرعی انسٹیٹیوٹ، پوسا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سائنٹیفک اور صنعتی تحقیقات بورڈ کے قیام کے بعد ہی بورڈ کے ناظم ڈاکٹر بھٹناگر نے نہ صرف ان تحقیقاتی اداروں بلکہ دوسرے تحقیقاتی کام کرنے والوں، یونیورسٹیوں اور خانگی صنعتی تحقیقاتی اداروں سے تعلقات پیدا کرلئے اور انھیں فوجی مصنوعات کی تیاری کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا۔ اس خصوص میں بورڈ کی جانب سے نہ صرف تحقیقاتی مشورہ بلکہ روپیوں سے بھی مدد کا انتظام کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دو سالوں میں صنعتی اہمیت کی ایسی مفید چیزیں دریافت ہوئی ہیں کہ پچھلے دو سال میں بھی دریافت نہ ہوسکیں۔

جنگ کے پہلے سال میں روئی کے تاجروں کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ تقریباً آٹھ لاکھ گٹھے باہر نہ بھیجے جاسکے۔ اس پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے انڈین سنٹرل کاٹن کمیٹی نے کافی سوچ بچار اور تحقیقات کے بعد روئی کو ہوائی جہاز کے اجزا، چیر نے پھاڑنے کے سامان، شکر کے تھیلوں اور شکر کی صفائی میں استعمال کرنا شروع کردیا۔ نہ صرف یہ کہ روئی کو نئی نئی طرح اور نئے نئے طریقوں سے ملک میں استعمال کیا گیا۔ بلکہ باہر سے آنے والی چیزوں کے بدل کی تیاری میں بھی استعمال کیا گیا۔ مثلاً کپڑوں کے اندر پہننے کے لئے ایک قسم کا جالی دار کپڑا آتا تھا۔ جب اس کی درآمد بند ہوگئی تو محکمۂ فوج کی خواہش پر اس صنعت کے ماہرین نے ہندوستانی روئی سے ایک نیا کپڑا " ماک لیو " کے نام سے تیار کیا جسے برطانوی دفتر جنگ نے بھی بہت پسند کیا۔ (باقی آئندہ)

تاریخ تشکیل شہری

(دورِ قدیم)

تشکیل شہری کی ابتدا اس وقت سے ہوئی ہے جب سے کہ بنی نوع انسان نے سماجی تنظیم کی طرف پہلا قدم اٹھایا اور منجملہ دوسرے کاروبار زندگی کے اپنی رہائشی سہولتوں کو فراہم کرنا شروع کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس فن کی باضابطہ سرگرمیاں صرف گزشتہ نصف صدی سے ظہور پذیر ہوئیں اور اس لئے بعضوں کا یہ خیال کہ یہ ایک جدید فن ہے، درست نہیں۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ آج سے پانچ ہزار سال قبل عراق (MOSO-POTAMIA) میں دریائے فرات (EUPHRATES) اور مصر میں دریائے نیل کی وادیوں میں جہاں دنیا میں پہلی مرتبہ قبیلوں کے متحدہ طور پر رہنے سہنے کی ابتداء ہوئی، کئی مشہور شہر آباد ہوئے اور بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوئیں۔ آثار قدیمہ نے جن شہروں کو برآمد کیا ہے ان سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا اعلیٰ مذاق نہ صرف فن تعمیر ہی کی حد تک محدود تھا بلکہ اجتماعی زندگی کے اصول اور شہروں کی ترتیب میں انہیں خاص مہارت تھی۔

چنانچہ شہر بابل جو دریائے فرات پر واقع تھا ہیرو ڈوٹس (HERODOTUS) نے اس کو نہایت عظیم الشان بتلایا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس شہر کی وضع ایک مربع کی تھی جس کا ہر ایک پہلو تقریباً (۱۴) میل لانبا تھا جس میں کئی بستیاں آباد تھیں۔ مکانات خوش وضع اور چار چار منزلہ تھے۔ سڑکیں نہایت وسیع اور سیدھی تھیں جن پر سے دیوتاؤں کے جلوس گزرتے تھے۔ شاہی محل نہایت مرتفع مقام پر بنائے گئے تھے، جن کے نیچے دنیا کے مشہور باغ جو بابل کے جھولتے باغ (HANGING GARDEN OF BABYLON) سے موسوم ہیں لگائے گئے تھے۔

A COLONY at KAHUN (EGYPT) 3000.BC.
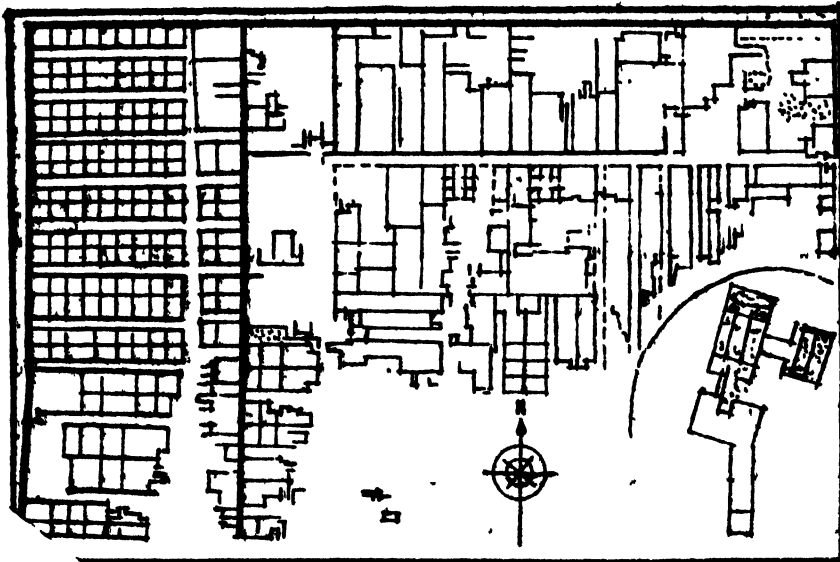
۳۰۰۰ قبل مسیح میں

علاقہ کاہون (مصر) میں معماروں اور کاریگروں کا قریہ۔

مصر اسی طرح مصر میں تین ہزار سال قبل مسیح علاقہ کاہون کے شاندار اہرام کی تعمیر کے زمانے میں حکومت نے معماروں اور کاریگروں کی سکونت کے لئے علاقہ کاہون میں ایک چھوٹا سا قریہ ترتیب دیا جو مستطیلی وضع کا تھا۔ اور جس میں مختلف درجوں کے کاریگروں کے لئے مختلف رقبوں کے قطعات بنائے گئے تھے۔ سڑکیں کشادہ اور

سیدھی تھیں جو ایک دوسرے کو زاویۂ قائمہ پر کاٹتی تھیں ۔ دیوتاؤں اور بادشاہوں کے جلوس کے لئے اہرام تک بڑے بڑے مرکزی راستے بنائے گئے تھے ۔ جو خوبصورت سایہ دار درختوں اور اونچی اونچی ستونوں سے آراستہ کئے گئے تھے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سماجی اور بلدی ضروریات کے تحت عمارات اور شوارع کی ترتیب میں تشکیل شہری کے فوائد کو ملحوظ رکھا گیا ۔

چین ملک چین میں منظم شہروں کی مثالیں تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح سے ملتی ہیں، جن میں شاہی خاندان سے لے کر عام طبقے کے لوگوں کے لئے منقوطہ بستیاں ترتیب دی جاتی تھیں یہ مستطیل یا مربع وضع کے ہوتے تھے ۔ جو برابر رقبوں کے نو قطعات میں تقسیم کئے جاتے تھے ۔ جن کے منجملہ درمیانی قطعہ حکومتی یا امور عامہ کے اغراض کے لئے مخصوص ہوتا اور بقیہ آٹھ قطعات عام رہائشی مکانوں کے لئے دئے جاتے تھے ۔ شہر کے اطراف حصار تعمیر کی جاتی تھی جس میں شہر کی وسعت کے لحاظ سے ایک سے نو دروازوں تک تعمیر کئے جاتے تھے ۔

شہر کے مستطیل خاکے کی بنیاد کا باعث دراصل چینی مکانات کے خاکوں کی اندرونی ترتیب ہوئی جو ایک کھلے صحن کے اطراف مستطیلی کمروں پر مشتمل ہوتی تھی ۔ باب الداخلہ کا رخ عموماً جنوب کی طرف ہوتا تھا ۔ اسی طرح مختلف رقبوں کے مستطیل خاکے ایک دوسرے سے علی الترتیب متوازی بنائے جاتے تھے ۔ حتیٰ کہ پورا شہر ان مختلف رقبوں کے قطعات کا ایک مستطیل مجموعہ بن جاتا تھا ۔ ان شہروں کا مرکزی راستہ سیدھا اور وسیع ہوتا تھا، جو دوسرے راستوں کو زاویہ قائمہ پر کاٹتا تھا، اور یہاں عموماً مینار تعمیر کئے جاتے تھے ۔

ڈوچو خاندان کی حکومت میں تقریباً (۱۰۰۰) شہر اسی وضع پر تعمیر کئے گئے جن میں سیانفو، ہیشنگ فو، ٹیسی نانفو اور فینا نگہائے شہر ہیں، جو آج کل متعدد بستیوں سے گھرے ہوئے ہیں ۔ چنانچہ دارالخلافہ پیکن تین شہروں پر مشتمل ہے ۔ پہلی فصیل جو تقریباً سولہ میل لانبی ہے، تاتاری شہر پر مشتمل ہے ۔ اس کے اندر دوسری فصیل جو نو میل لانبی ہے خاص دارالحکومت اور اس کے وسط میں شہر ممنوع ہے جس میں قصر شاہی ہے ۔

چین کی بڑی شہر پناہ (GREAT WALL OF CHINA) جو ۲۱۴ ق م میں بنائی گئی، تمام دنیا میں مشہور ہے اور دنیا کے سات عجائبات میں گنی جاتی ہے ۔ یہ تقریباً چودہ سو میل لانبی، ۲۵ فیٹ موٹی اور تیس فیٹ اونچی اور متعدد میناروں کے ساتھ بنائی گئی ہے، جو مختلف پہاڑوں، مسطح میدانوں، گہری وادیوں اور وسیع ندیوں پر سے مشتمل ایک زبردست اژدہے کے گزرتی ہوئی جاتی ہے ۔

یونان اس میں شک نہیں کہ ابتداء میں یونانیوں نے مصر اور بابل کے شہروں کا اتباع کیا ۔ لیکن ان کے شہروں میں باضابطہ ترتیب پانچویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوئی، جس کو شہری دور سے یاد کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ اس زمانے کے بنائے ہوئے مشہور شہر سلینیس (SELINUS) ہوڈز (RHODES) اور تھوری (THURii) ہیں جن کو یونانی ماہر فن ہپوڈامس HIPPODAMUS نے ترتیب دیا ۔ ان شہروں کے خاکہ جات کو جانچنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر سڑکیں زاویہ قائمہ بناتی ہیں اور جہاں دو بڑے راستے ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر کاٹتے ہیں وہاں شہر کی بڑی عمارتیں مثلاً ایوان شہر، فروخت گاہ یا عبادت گاہ واقع ہیں ۔ بقول ارسطالیس کے ہپوڈامس ہی ایک پہلا ماہر فن تشکیل شہری تھا جس نے کشادہ اور سیدھی سڑکوں کی بناء ڈالی ۔ رہائشی مکانات نہایت سلیقے سے ترتیب دئے اور شہر کے مختلف حصوں کو کامیابی کے ساتھ مربوط کیا ۔

سکندر اعظم اور اس کے جانشین ڈیاڈوچی (DIADOCHI) نے بھی اپنے زمانے میں کئی شہر بنوائے جن میں قابل ذکر شہر اسکندریہ ہے جس کو تین سو سال قبل مسیح ڈینوکراٹس (DINOCRATES) نے ترتیب دیا جو اس زمانے کا ممتاز ماہر تعمیر تھا ۔ یہ حیثیت بندرگاہ اس کا بہترین جائے وقوع تجارتی نقطۂ نظر سے نہایت موزوں اور سہولت بخش ہے ۔ اس کا رقبہ جو کئی متوازی الاضلاع رقبوں پر مشتمل تھا ۔ تقریباً

سیلینس (اکراپولس) پانچویں صدی قبل مسیح

SELINUS (ACROPOLIS)
.LAID OUT BY HIPPODAMUS
(FIFTH CENTURY.BC)

پندرہ مربع میل تھا جس میں اکثر سڑکیں سو سو فیٹ چوڑی تھیں۔

روما ابتدا میں اہل روما نے بھی شمالی یونانیوں کے شطرنج نما خاکے کو اختیار کیا جو اُن کی فوجی ضروریات کے مدنظر نہایت سہولت بخش تھا۔ مثلاً افریقہ میں ٹمگاڈ (TIMGAD) جس کو آثارِ قدیمہ نے حال میں برآمد کیا ہے اس وضع کے شہر کی بہترین مثال ہے۔ لیکن مابعد کے شہروں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے سیدھی سڑکوں کے قدیم رواج کو باقی رکھتے ہوئے سماجی اور شہری ضروریات کے تحت کمان دار راستے اور عماراتِ عامہ بھی فراہم کئے مستطیل خاکہ جات کی دو بھر یکسانیت کو مدور اشکال کے دلکش قومی بازیگاہ بازار اور شہری ایوانات سے تبدیل کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اہل روما میں یونانیوں کا سا ذوقِ سلیم نہیں تھا جو اپنی عمارات میں متناسب حسن پیدا کرنے کے علاوہ ان کی نشست اور مجموعوں کو مناسب طور پر مربوط کرتے لیکن ساتھ ہی اس کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اہلِ روما نے فنِ تشکیلِ شہری کو مجموعی حیثیت سے کافی فروغ دیا۔ یہ لوگ زیادہ تر عملی ہندسی تھے۔ شہروں کی جائے وقوع کے انتخاب میں نہ صرف فوجی ضروریات پر توجہ کی بلکہ تجارتی نقل وحمل، آب رسانی اور بدر رو کا بھی خاص لحاظ رکھا۔ بندرگاہوں کی تعمیر میں تجارتی سہولتوں کی غرض سے مال کی حفاظت کے لئے بڑے بڑے گودام تعمیر کئے۔ جہازوں کے ٹھیرنے کے لئے سایہ دار مقامات بنوائے۔ اگسٹس اور نیرو کے دوران حکومت میں تشکیلِ شہری کو نمایاں ترقی دی گئی۔ شوارع اور عمارات کے ضوابط مقرر کئے۔ آگ سے محفوظ رکھنے والی اشیائے تعمیر استعمال کو قانوناً لازمی کر دیا گیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ شاہ نیرو نے ان قوانین کی پابجائی کی سہولت کے مدنظر شہر روم کو عمداً شہر کو از سرِ نو بہتر طریقے پر ترتیب دیا جائے۔

اوستا کا قدیم رومن کا شہر
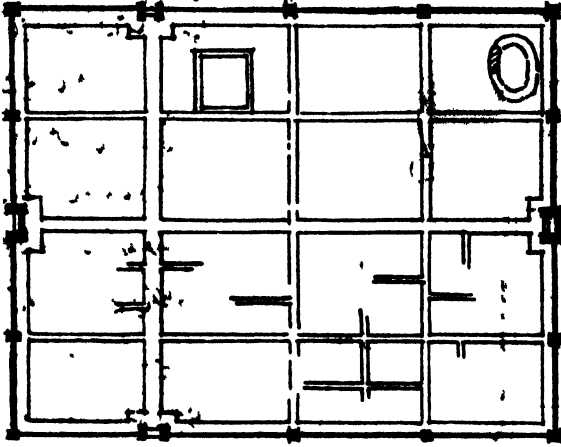
دور متوسط حکومت روما کے زوال کے بعد اس کا شاندار تمدن بھی ختم ہوگیا۔ عرصہ دراز تک فن تشکیل شہری میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی۔ عہد متوسط کے شہروں کی نشو ونما جنگ کی کش مکش کے ساتھ دھیمی رفتار کے ساتھ ہوتی رہی۔ اگرچہ کہ بعض مقامات میں گریکو۔رومن یا رومن شہروں کی داغ بیل سے فائدہ اٹھایا گیا۔ لیکن شہروں کا پھیلاؤ بغیر کسی منظم ترتیب کے خود رو طریقے پر ہونے لگا۔ مکانات کا محل وقوع اور راستوں کی داغ بیل صرف موقتی ضروریات کی سہولت پر موقوف رہی جس میں شہر کی آئندہ بڑھتی ہوئی ضروریات کو نظر انداز کیا گیا۔ شہر کا پھیلاؤ ایوانات یا قلعہ بندیوں کے اطراف ہونا شروع ہوا۔ اس طرح راستوں کا رخ اور ان کی داغ بیل عمارات کی مرکزی اہمیت کی تابع ہوگئی۔ اس میں شک نہیں کہ

اوستا کے قدیم شہر میں بے ترتیب تبدیلیاں۔

ان شہروں کو کسی طرح تشکیل شہری کے اصول کے پابند نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن شہری اور سماجی ضروریات عام معاشی ہوں یا فوجی جغرافی الحقیقت موقتی ضروریات اور بود و باش کو ایک حد تک پورا کرتی تھیں۔ اور مفید ثابت ہوئیں۔ دراصل ان عمارات کی جائے وقوع اور ترتیب کا یا عث نہیں جو فن تشکیل شہری میں ایک تحقیقی باب کا اضافہ کرتی ہیں۔ اس لئے کہ طویل شہروں نے ثابت کردیا کہ منظم خاکہ جات کے ماسوا غیر منظم ترتیب بھی تشکیل شہری میں رائج کی جاسکتی ہے، جو نہ صرف قدیم شہروں کی ترتیب اور پھیلاؤ میں موقتی ضروریات کے مدنظر بہ آسانی اختیار کی جاسکتی ہے بلکہ جائے وقوع کی جغرافی کیفیت سے بھی پوری طرح استفادہ کرتی ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو مشہور جرمن تصنیف (DER STADTEBAU) میں مڈیول شہروں کی ان خصوصیات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

شہر پناہ کی تعمیر، قلعہ بندیوں کی ضرورت شاہی ایوانات کا نمایاں محل وقوع اور ان سب کو مخصوص راستوں سے مربوط کرنا اور مرکزی

اہمیت دینا دور متوسط کے شہروں کی ترتیب کی اہم خصوصیات ہیں۔ متذکرۂ بالا اصولوں کے تحت یہ لازمی نہیں تھا کہ دور متوسط کے شہر کے خاکہ جات ہمیشہ غیر منظم ترتیب کے ہوں۔ چنانچہ تیرھویں صدی میں اڈورڈ اول نے بعض ایسے شہر بنائے جو مستطیل وضع کے تھے۔ جیسے فرانس میں مان پیزیئے (MONTPAZIER) ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مڈیول شہروں کے اصول کے موافق راستوں اور عمارتوں کی مرکزی اہمیت کو برقرار رکھا گیا۔

شاہ اڈورڈ اول کو تشکیل شہر سے گہری دلچسپی تھی چنانچہ اس نے بورڈو (BORDEAUX) سے لندن کے حکام کو لکھا کہ اس کے پاس چار ایسے قابل فن داں اشخاص کو روانہ کیا جائے جو شہروں کے ترتیب دینے اور درست کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ چنانچہ اس کے زمانے میں تقریباً پچاس نئے شہر ترتیب دیئے گئے جن میں قابل ذکر انگلینڈ میں ونچلیسی (WINCHILSEA) اور سلیسبری (SALISBURRY) ہیں۔ چودھویں صدی کے اوائل سے دور متوسط کے شہروں کی درستگی اور پھیلاؤ میں تنظیم کا دور شروع ہوتا ہے۔ گریکو رومن شہروں کی مزید معلومات نے دور رینا سنس (RENAISSANCE) میں فن دانوں کو منظم خاکہ جات کی طرف مبذول کیا۔ اور رفتہ رفتہ سیدھی سڑکوں کے ماسوا اہل روما کی مدور اشکال کی مناسبت سے آڑے راستے ترتیب میں شامل ہوگئے۔ جن کو سب میں پہلے شہر روما نے اختیار کیا۔ چنانچہ اٹلی کے مشہور استاد فن تعمیر برنینی (BERNINI) نے اس وضع کی متعدد تجاویز مکمل کیں جن میں قابل ذکر سینٹ پیٹر (ST PETER) کی درستگی کی تجویز ہے۔

PARIS
A PART OF IMPROVEMENT SCHEME
BY (BARON HAUSSMANN)

شہر پیرس کا ایک حصہ جس میں بیارن ہوسمن کی تجاویز گہری لکیروں سے ہیں
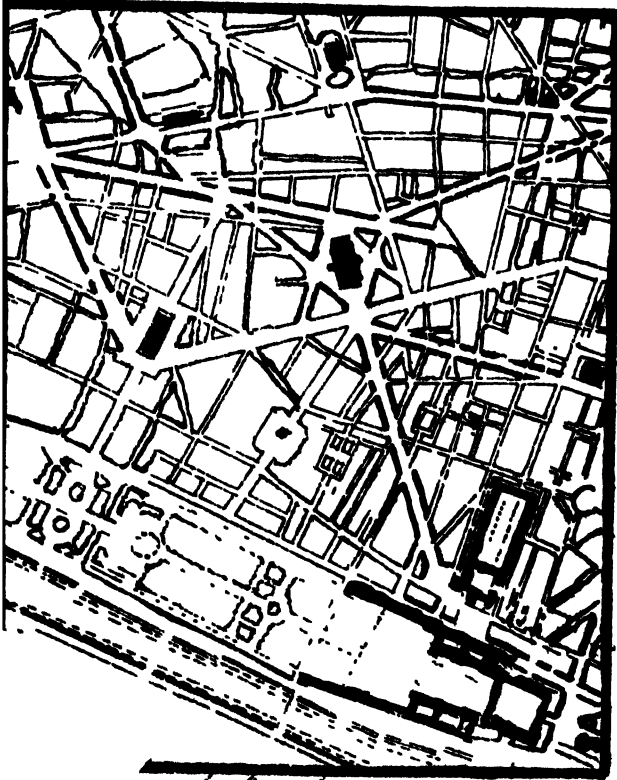
فرانس

فرانس میں شاہ لوئی چہاردہم (LOUIS XIV) کے زمانے سے نپولین اول کے زمانے تک متعدد شہروں کی درستگی عمل میں آئی جن کے منجملہ شہر ورسائلس اور پیرس ہیں۔

نپولین سوم کے زمانۂ حکومت میں فرانس کے مشہور ماہر فن بیارن ہوسمن (BARON HAUSSMANN) کی نگرانی میں پیرس اس قدر درست کیا گیا کہ دنیا کا بہترین شہر بن گیا۔

جرمنی

۱۷۰۰ء کے ابتدائی زمانے میں تیس سالہ جنگ کے اختتام کے بعد جرمنی کے سیاسی اور معاشی دورِ درخشاں کے ساتھ ساتھ تشکیل شہری کو بھی اچھا فروغ ہوا۔ چنانچہ کارلسروہ (KARLSRUHE.) اور مانہیم (MANN HEIM) جیسے عالی شان شہر اسی زمانے میں بنائے گئے۔

ان شہروں کے خاکہ جات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی راستوں کی اہمیت کو برقرار رکھتے ہوئے دوسرے راستے اس طرح ترتیب دیئے گئے کہ ایک دوسرے کو

KARLSRUHE (GERMANY).

شہر کارلسرو (جرمنی) جس میں شاہی محل کی نمایاں حیثیت، مدور اور آڑے راستوں کی ترتیب بتلائی گئی ہے

زاویہ قائمہ پر کاٹنے کے ماسوا مختلف زاویوں پر بھی کاٹتے ہوں۔ اور ایوان شاہی کو بیچوں بیچ نمایاں فوقیت دی گئی۔ جو رینیسانس کے اصول کے موافق ہے۔

انگلینڈ

انگلینڈ کا دور رینیسانس تشکیل شہری کے اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اس لئے کہ چند چیدہ اور محدود تجاویز کے سوا جو لندن۔ برسٹل اور اڈنبرا میں روبہ عمل لائی گئیں کوئی جامع تشکیل شہری کی نظیر نہیں ملتی۔ البتہ سر کرسٹوفر رن (SIR CHRISTOPHER WREN) نے جو رینیسانس دور کا دیوتائے فن تعمیر مانا جاتا ہے لندن کی تشکیل شہری کی مکمل تجاویز کا ایک خاکہ نہایت قابلیت اور جانفشانی سے تیار کیا جس کو آج کل کے اساتذہ فن تعمیر بھی وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ان تجاویز کو "استاد رن" نے لندن کی دہشت ناک آتشزدگی کے بعد ترتیب دیا تھا۔ اگرچہ کہ ان تجاویز کو بادشاہ وقت نے پسند فرمایا تھا لیکن افسوس ہے کہ اس زمانے کے ناعاقبت اندیش شہریوں کے عدم اتحاد اور تجارتی اغراض کی جلد بازیوں نے جو شہر کو سرعت کے ساتھ مکمل کرنے پر مجبور کر دیا، اس بے مثل تجویز کو روبہ عمل لانے سے باز رکھا۔ اور اس زرین موقع کو کھو دیا گیا جس کا کثیر نقصان اہل لندن اب تک برداشت کر رہے ہیں۔ "رن" کی اس تجویز میں بعض نقاط قابل غور ہیں۔ مثلاً کشادہ سڑکوں کا شہر کی مشہور عمارات سے مربوط کرنا اور اس کو ایک مرکزی اہمیت دینا اور سڑکوں کے رخ بدلنے کی جگہ کھلے مقامات کا پیدا کرنا وغیرہ۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی کے یورپین شہروں میں منظم اشکال کی ترتیب کے ساتھ موقتی ضروریات اور عمارات کے محل وقوع کو ملحوظ رکھا گیا۔ لیکن مکانوں کی تعمیر راستوں کے ساتھ مسلسل قطاروں کی وضع پر ترتیب پانے لگی۔ شہروں کی بڑھتی ہوئی سماجی ضروریات نے اراضی کی مانگ اور قیمت کو بدرجہا بلند کر دیا۔ کھلے مقامات عنقا ہونے لگے۔ لالچی زمینداروں اور خودغرض مالکان کارخانہ جات نے بلا لحاظ اصول

سرکرسٹوفر کا خاکۂ تجاویز تشکیل شہری (لندن)
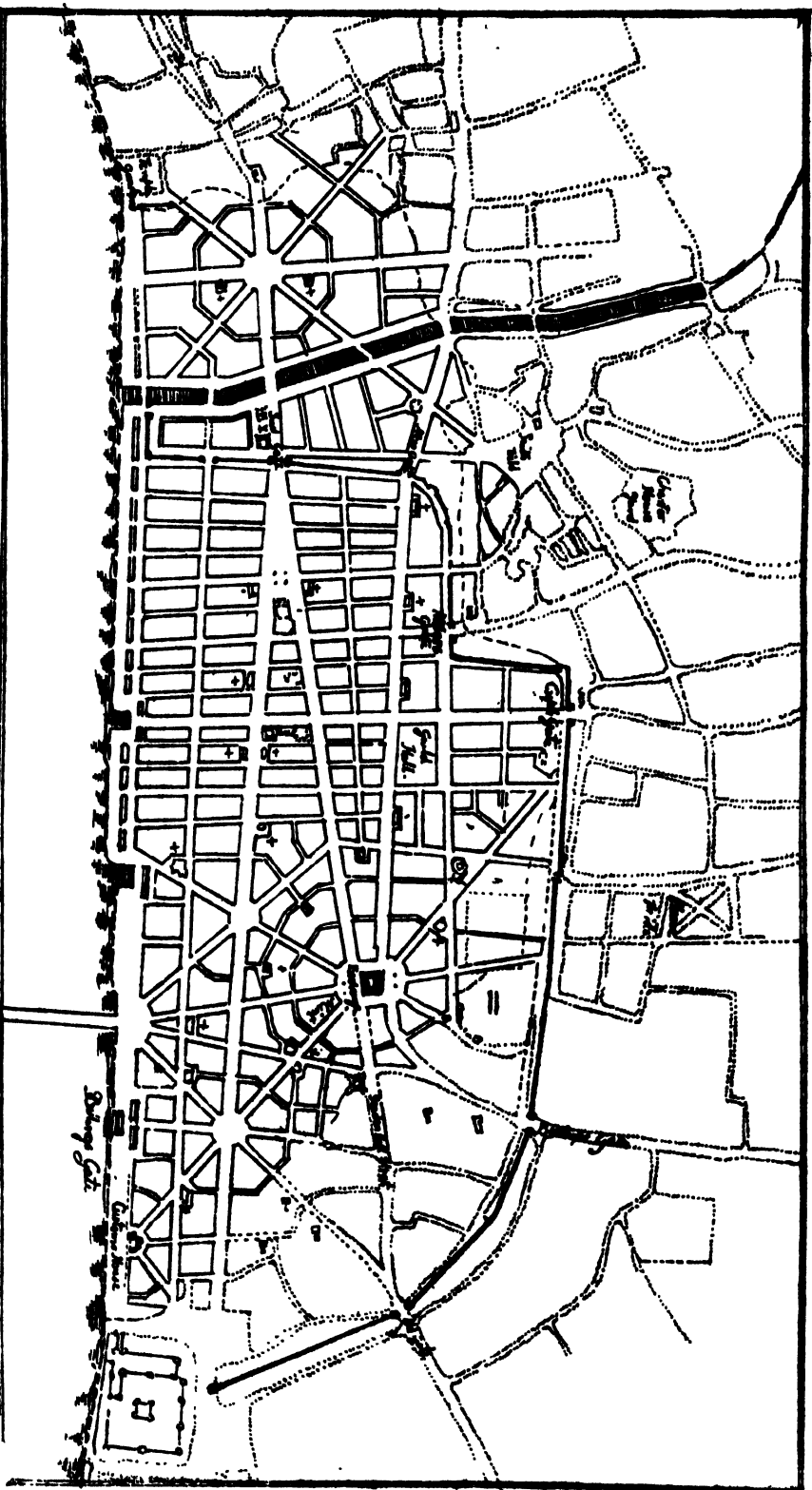
Sir Christopher Wren's Plan for rebuilding London.

حفظان صحت مزدوروں کی رہائش گاہوں کو غیر منظم طریقہ پر کارخانوں سے متصل بنوانا شروع کیا جس میں صرف کاروبار کی سہولت کو پیش نظر رکھا گیا۔ اسی طرح گنجان آبادیاں یورپ کے مختلف شہروں میں بے اصول طریقے پر بڑھنا شروع ہو گئیں۔ البتہ انیسویں صدی کے درمیانی زمانے میں تشکیل شہری کو بین الاقوامی اہمیت حاصل ہوئی اور اس کی شدید ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ رفتہ رفتہ مختلف ممالک نے اپنے اپنے شہروں میں اصلاحی تجاویز مرتب کئے۔ اکثر و بیشتر شہروں کے قدیم دفاعی عمارتوں اور مورچہ بندیوں کو یا تو نکال دیا گیا یا ان کو برقرار رکھتے ہوئے شہر کی توسیع موزوں اور متصل مقامات پر روبہ عمل لائی گئی۔

محمد فیاض الدین

عرب اور عربستان ۔ شعبۂ ادبیات اطفال کی طرف سے یہ نئی باتصویر کتاب شائع کی گئی ہے۔

محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے نے نہایت دلچسپ، سلیس انداز میں مرتب کیا ہے۔ تقریباً ہر صفحہ پر تصویر دی گئی ہے۔ اس کا ٹائٹیل ملک کے مشہور حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ جو نہایت ہی جاذب نظر ہے۔

قیمت صرف ۱۰؍ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد سے مل سکتی ہے۔

چند قابل دید کتابیں

سیرِ کائنات ۔ یہ کتاب انگلستان کے مشہور سائنس داں جی جینیس کی آٹھ تقریروں کا مجموعہ ہے۔ جو موصوف نے رائل انسٹیٹیوٹ آف لندن میں زمین، ہوا اور چاند ستاروں پر کی ہیں قیمت مجلد سا؎

سلطنتِ خدا داد۔ میسور کی نامور سلطنت کے بانی حیدر علی اور اس کے جانشین ٹیپو سلطان کی مکمل تاریخ قیمت للعہ

تاریخ جنوبی ہند ۔ جنوبی ہند کی مکمل تاریخ، بڑی چھان بین کی گئی ہے۔ اندرونی اور خارجی ہر ممکن سند پیش کی گئی ہے۔ قیمت سے ۔

معلم کی زندگی ۔ یہ مولف کی محض آپ بیتی ہی نہیں بلکہ جامعہ کی دلچسپ اور مکمل تاریخ۔ نیز اکیس سالہ تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ قیمت ہر دو حصص صہ روپیہ

محشرِ خیال ۔ سجاد علی انصاری مرحوم کے مجموعہ مضامین کا دوسرا ایڈیشن۔ اس مرتبہ مرحوم کا ہنگامہ خیز ڈرامہ "روز جزا" بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ قیمت مجلد سے؎ عا؎ غیر مجلد عا؎ ۔

مبادی سیاسیات ۔ مصنفہ پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی۔ اس میں تفصیل سے علم سیاست کی ابتدائی معلومات اور عہد حاضر کی سیاسی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۶۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد صہ روپیہ

روح اقبال ۔ یہ کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے تین مقالوں' اقبال اور آرٹ' اقبال کا فلسفہ تمدن' اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصورات پر مشتمل ہے قیمت غیر مجلد عہ

(مکتبہ جامعہ دہلی۔ نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی ۳)

ہندوستان اور جنگ

سیاست، معیشت اور جنگ ـــ ان میں بہت قریبی تعلق رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سیاسی اور اس سے کہیں زیادہ معاشی محرکات ہی عام طور پر جنگ کا سبب ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے جنگ شروع ہوتی اور پھر انہی شعبوں پر اس کے اثرات پڑنے لگتے ہیں۔ جنگ کے ساتھ ساتھ نئے نئے سیاسی اور معاشی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ انہی مسائل کو مفید مطلب طریقے پر حل کرنا قوم کے حاکموں، لیڈروں اور نمایندوں کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔

موجودہ جنگ کی وجہ سے اگر ایک طرف ہندوستانی سیاست میں بڑی ہل چل مچ گئی ہے تو دوسری طرف معاشی زندگی پر بھی اس کے اثرات کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ اب ہم مختصر طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہندوستانی زراعت، صنعت، تجارت، نقل و حمل، زر، بنک، مالیات اور معاشی زندگی پر اس جنگ کے کیا اثرات پڑ رہے ہیں۔

زراعت پر جنگ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ نقل و حمل کی دقتوں اور جنگی اغراض کے لیے پیداوار کی مانگ کی وجہ سے خام اجناس کی قیمتیں بڑھنا شروع ہوئیں چنانچہ اب ان میں نمایاں اضافہ ہوگیا ہے۔ خاص طور پر کھانے پینے کی چیزیں مثلاً چاول، گیہوں اور دالوں کی قیمتوں میں بہت زیادتی ہوگئی ہے۔ اجناس کی قیمتوں میں عام اضافے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ کاشتکار بہت فائدے میں ہوں گے۔ کیونکہ سب اجناس کی قیمتوں میں یکساں اضافہ نہیں ہوا ہے۔ روئی، جوٹ اور تیل کے بیج بونے والے کاشتکاروں پر مجموعی لحاظ سے جنگ کا کوئی مفید اثر نہیں پڑا۔ باہر کے بازار کم ہو جانے، مال کی زیادتی اور مانگ کی کمی کی وجہ سے ایک سے زائد مہینوں میں ان کی قیمتیں گری ہوئی رہیں۔ قحط سالیوں کی وجہ سے اکثر مقاموں میں فصلیں ماری گئیں اور کاشتکار گھاٹے میں رہے۔ قیمتوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ خود کاشتکار کے اخراجات زندگی اور اخراجات کاشت بھی بڑھ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ کاشتکاروں کی مقروضیت، لاعلمی اور جہالت، لین دین کی خرابیاں، ساہوکاروں کی ہوشیاری اور استحصال، آمد و رفت کے ناقص ذرایع، نقل و حمل کی بڑھی ہوئی شرح، منظم مارکٹوں کی کمی اور دوری، زائد از معیار تول ناپ، دلالوں اور اڑتی داروں کی خود غرضی، یہ سب امور مشترکہ طور پر کسانوں کو ان کی محنت کے حقیقی معاوضے سے محروم رکھتے ہیں۔ موجودہ جنگ سے کاشتکاروں کو مجموعی طور پر ضرور فائدہ پہنچ رہا ہے۔ لیکن اتنا نہیں جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ اگر پیداوار کو امداد باہمی کی انجمنوں کے ذریعے بیچا جائے تو کاشتکاروں کو جنگ کی اعلیٰ قیمتوں سے مقابلتہً زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔

جہاں تک صنعت و حرفت کا تعلق ہے مجموعی لحاظ سے اس پر جنگ کا مفید اثر پڑ رہا ہے۔ جنگ سے قبل ہندوستانی مصنوعات کے لیے باہر کی سستی چیزوں کے مقابلے کا مسئلہ بہت اہم تھا لیکن جنگ کی بدولت یہ مسئلہ بہت بڑی حد تک خود بخود حل ہو چکا ہے۔ دشمن ممالک کے ساتھ تجارت قطعی طور پر بند کر دی گئی ہے۔ اور دوست ممالک کی مصنوعات بھی آسانی کے ساتھ اس لیے نہیں آسکتیں کہ وہ خود بخود جنگ میں شریک ہیں۔ خود ہندوستان سے مختلف قسم کی مصنوعات جنگی اغراض کے لیے بکثرت طلب کی جا رہی ہیں۔ ان حالات کے تحت صنعتی سرگرمی کا پایا جانا ضروری ہے۔ بہت سی گھریلو مصنوعات اور اکثر بڑی صنعتوں

کو ترقی کرنے کا موقع ملا ہے خاص طور پر سوتی پارچہ جوٹ لوہے اور فولاد کی صنعتیں بہت ترقی کر رہی ہیں۔ اُن کے علاوہ کاغذ سازی اور کیمیائی صنعتوں کو بھی جنگ سے خوب فائدہ پہنچا ہے۔ کیمیائی صنعتوں میں سوڈا ایش سینتھیٹک امونیا کاسٹک سوڈا کلورین بلیچنگ پوڈر وغیرہ زیادہ مقدار میں پیدا کئے جارہے ہیں۔ مزید براں اسٹک ایسڈ اور ہائیڈرو کلورک ایسڈ کی مقدار پیدائش بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ دواسازی کی صنعتیں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہیں۔ بہت سی ایسی دوائیں جو زیادہ تعداد اور کم مقدار میں باہر سے منگائی جاتی ہیں اب ملک کے اندر تیار کی جارہی ہیں۔ آلاتِ حرب کے کارخانے صبح و شام پیدائش کے کام میں مشغول ہیں۔ چیٹفیلڈ کمیٹی کی سفارش کی بنا پر انھیں مزید وسعت دی جارہی ہے۔ ہوا اور پانی کے جہازوں کی صنعتیں بھی جاری ہو چکی ہیں۔ اگرچہ ان کی نوعیت ابھی ابتدائی ہے لیکن اس کا قرینہ ہے کہ جنگ کی شدت اور طوالت کے ساتھ یہ ترقی کر سکیں۔ پس ماندہ صنعتی ممالک کے لیے جنگ کا زمانہ بہت اچھا ہوتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ موقعوں سے فائدہ اٹھا کر ملکی صنعتوں کو ممکنہ ترقی دی جائے اور بعد جنگ انھیں سنبھالا جائے۔

تجارت خارجہ پر جنگ کے ابتدائی اثرات غیر موافق رہے کیونکہ اعلان جنگ کے ساتھ ہی دشمن ممالک سے ایک لخت تجارتی تعلقات توڑ دئے گئے۔ نقل و حمل کی دقتوں، شرح باربرداری کے اضافے، بیمے کی رکاوٹوں اور راستے کے خطروں کی وجہ سے تجارت خارجہ کی مقدار کا متاثر ہونا ضروری تھا۔ یورپ کے مختلف حصوں پر جرمنی کا قبضہ جوں جوں بڑھتا گیا یورپی بازار ہاتھ سے جانے لگے۔ جاپان کے اعلانِ جنگ نے بازاروں کا دائرہ اور تنگ کر دیا۔ ستمبر اور اکتوبر ۱۹۳۹ء میں تجارت درآمد اور برآمد کی مقدار کم ہو گئی لیکن نومبر کے مہینے میں جنگ اور تجارتی حالات میں مطابقت ہوئی، اور مجموعی لحاظ سے ۳۸-۱۹۳۹ء کے مقابل ۱۹۴۰-۳۹ء میں درآمد اور برآمد کی قیمت زیادہ رہی۔ ۴۱-۱۹۴۰ء میں پچھلے سال کے مقابل برآمد کی مقدار میں تو اضافہ ہوا لیکن درآمد کی مقدار کم ہو گئی تاہم یہ مقدار ۳۸-۱۹۳۹ء کے مقابل زیادہ تھی۔ تجارتی حالات کو بہتر بنانے کے لیے مختلف دوست ممالک کو تجارتی کمشنر روانہ کئے گئے ہیں۔ ایسی پیداواروں کی آیندہ کاشت کو محدود کر دیا گیا جن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ ضرورت سے زاید پیدا کر لی گئی تھیں۔ حکومت اور خانگی افراد کی جانب سے ان کی بڑی مقداریں خرید کر کثرت پیداوار کے مخالف اثر کو روکا گیا اور صنعتی پیدائش میں ممکنہ طور پر ان کی کمیت کی مقدار کو بڑھایا گیا۔

معاشی زندگی کے جو شعبے جنگ سے براہ راست متاثر ہیں ان میں سے ایک شعبہ نقل و حمل کا ہے۔ اس کے بغیر فوجوں کی نقل و حرکت اور جنگ کا دوسرا انتظام ناممکن ہے۔ جنگ شروع ہوتے ہی ہندوستان میں بھی فوجی تنظیم تیزی کے ساتھ ہونے لگی۔ اور نقل و حمل کے ذرایع پر جنگی کاموں کا زیادہ بار پڑنے لگا اور معمولی کاموں کے لیے یہ ذرایع مشکل سے ملنے لگے۔ تجارتی مرکزوں پر مال بروقت نہ پہنچنے کی وجہ سے قیمتوں میں زیادہ اتار چڑھاؤ ہونے لگا کاروباری سرگرمی کے بڑھ جانے کی وجہ سے ریلوں کی آمدنی میں نمایاں اضافہ ہو گیا ہے۔ کرایوں کی شرح بڑھا دی گئی جس کا مقصد ان کے خانگی استعمال کو محدود کرنا ہے تاکہ جنگی اغراض کے لیے انھیں زیادہ استعمال کیا جاسکے۔

زر اور بنک کاری کے شعبے بھی جنگ کے اثرات سے بری نہ رہ سکے۔ جنگ شروع ہونے کے کچھ دن بعد چند بے بنیاد افواہوں کی بنا پر ایک عام خیال یہ پیدا ہو گیا کہ نوٹوں کے عوض سکے رکھنا زیادہ محفوظ ہے۔ چنانچہ اس خیال کے تحت نوٹوں کے بدلے سکے طلب کرنے کا رجحان عام ہونے لگا۔ اس رجحان کو روکنے کے لیے لگاتار سکے دے کر ساکھ کو برقرار رکھا گیا۔ بڑھتی ہوئی کاروباری اہمیت کے پیش نظر نوٹوں کی تعداد بھی پہلے کے مقابل زیادہ کر دی گئی ہے لیکن اس بارے میں محتاط پالیسی سے کام لینا چاہئے تاکہ افراط زر کی کیفیت پیدا نہ ہونے پائے۔ ایک ایک روپے کے نوٹ جاری کیے گئے ہیں اور چاندی کے نئے سکوں میں کھوٹ کا تناسب زیادہ کر دیا گیا ہے۔

جنگ کے پریشان کن حالات کے تحت جس طرح نوٹوں کے متعلق لوگوں میں بدگمانی پیدا ہو گئی تھی اسی طرح بنکوں کے بارے میں بھی بے اطمینانی پھیل گئی۔ سمجھا جانے لگا کہ بنکوں سے روپیہ نکال لینا ہی مفید ہے۔ چنانچہ اکثر کھاتہ داروں نے امانتوں کی واپسی کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ اس رجحان کو امانتوں کی واپسی کے ذریعہ روکا گیا۔ زر اور بنک کاری کے مضبوط نظام کو الٹ دینے میں یہ رجحانات بڑے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ اگر انھیں فوری اور موثر تدبیروں کے ذریعہ روکا نہ جائے تو یہ تیزی کے ساتھ پھیل کر پرسکون نظام کو تتر بتر کر دیتے ہیں۔

جنگ اور مالیات میں بہت قریبی تعلق ہے۔ جنگ کے زمانے میں سب سے اہم معاملہ قومی بچاؤ اور دشمن کے مقابلے کا ہوتا ہے۔ لفظ "بچاؤ" بظاہر بہت معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن اس کام کو عملی طور پر انجام دینا بہت دقت طلب ہے۔ اس بارے میں سب سے اہم سوال مالیات جنگ یا اخراجات جنگ کا ہے۔ فوجوں کی فراہمی، ان کی غذا، لباس، رہائش، فنی تعلیم و تربیت، جنگی ساز و سامان اور فوجوں کی نقل و حرکت کے لیے بھاری اخراجات مطلوب ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اخراجات حکومت کی آمدنی کی معمولی مدات سے کسی طرح پورے نہیں ہو سکتے۔ اس لیے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے حکومتیں معمولی مدات آمدنی اور مدات خرچ میں اس طور پر تبدیلی کرتی ہیں کہ جنگ کے اخراجات کے لیے ضروری گنجایش نکل آئے۔ مثلاً امن کے زمانے میں قومی تعمیر اور اصلاح کی جو مختلف اسکیمیں جاری ہوتی ہیں یا تو ان میں سے اکثر کو ملتوی کر دیا جاتا ہے یا اتنی رقم نہیں خرچ کی جاتی جو امن کے زمانے میں خرچ کی جا سکتی تھی۔ اس طرح جو بچت نکلے اسے جنگی اغراض کی مد میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ مزید برآں پرانے محصولوں کی شرح بھی گنجایش کے لحاظ سے بڑھا دی جاتی ہے اور نئے محصول لگائے جاتے ہیں لیکن جنگ کے بھاری اخراجات کے لیے چونکہ یہ ذرایع کافی نہیں ہوتے ہیں اس لیے حکومتیں قرض کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ تھوڑی بہت آمدنی چندوں اور عطیوں کی شکل میں بھی حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسی چیزوں پر نگرانی رکھی جاتی ہے، جن کی ملک میں قلت ہے یا جو باہر سے بہت کم منگائی جا سکتی ہیں یا نہیں منگائی جا سکتیں اور جن کا استعمال جنگی اغراض کے لیے ناگزیر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حکومتیں رسد بندی کے طریقے پر عمل کرتی ہیں تاکہ جنگی ضروریات کی اہم چیزیں جہاں تک ہو سکے خانگی طور پر کم استعمال ہوں اور جنگی اغراض کے لیے ان کی کافی تعداد مل سکے۔ اگر ہم

جنگ کی ابتدا کے بعد سے حکومت ہند کی مالیاتی پالیسی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حکومت ان تمام طریقوں پر عمل کر رہی ہے۔ نئی اصلاحی اسکیمیں تقریباً ملتوی ہیں اور صرف ضروری کاموں پر دیکھ دیکھ کر رقم خرچ کی جا رہی ہے اکثر پرانے محصولوں میں زیادتی کی گئی ہے اور بعض نئے محصول لگائے گئے ہیں جنگ کے تمسکوں کو بیچ کر قرضے حاصل کیے جا رہے ہیں۔ بڑے بڑے تاجروں رئیسوں امیر امرا، دیسی ریاستوں کے حکمرانوں، راجہ اور مہاراجاؤں سے چندے اور عطیے قبول کیے جا رہے ہیں۔ خاص خاص چیزوں کی رسد بندی کر دی گئی ہے۔ اور ان تدبیروں کے ذریعے جنگ کے بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کی کوشش جاری ہے۔

عام معاشی زندگی پر جنگ کا اہم اثر گرانی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ جنگ اور گرانی ساتھ ساتھ ہیں۔ جنگ کے شروع ہونے کے بعد سے اب تک قیمتوں کی عام سطح مجموعی طور پر بلند ہوتی چلی آرہی ہے جنگ کے پہلے سال گرانی کا بار اس لیے زیادہ نہیں رہا کہ بہت سے لوگوں کے پاس ضرورت کی مختلف چیزیں پہلے کی خریدی ہوئی موجود تھیں۔ جوں جوں یہ چیزیں ختم ہونے لگیں اور نئی چیزیں خریدنے کی ضرورت ہوئی تو گرانی کا بار محسوس ہونے لگا۔ جنگ کے دوسرے سال جب کہ قیمتوں میں اور اضافہ ہوا تو اس کے ساتھ گرانی کا بار مزید بڑھ گیا۔ اور اب تیسرے سال میں یہ خاص طور پر ادنیٰ اور متوسط طبقوں میں بہت شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے جس طبقے میں گرانی کا سب سے زیادہ بار پڑ رہا ہے، وہ معین آمدنی والوں کا طبقہ ہے۔ چنانچہ عام صارفوں کے فائدے کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت کی طرف سے ضروری تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں مثلاً نفع بازی کو روکنے اور قیمتوں کو ایک مقررہ حد سے نہ بڑھنے دینے کے لیے باضابطہ کمیٹیاں قایم کی گئی ہیں جنھیں انگریزی میں پرائس کنٹرول کمیٹیز کہا جاتا ہے۔ ان کمیٹیوں کی جانب سے وقتاً فوقتاً مقررہ قیمتوں کا اعلان کیا جاتا ہے اور اس بات کی ممکنہ نگرانی کی جاتی ہے کہ تاجر زیادہ قیمت وصول نہ کر سکیں۔ جو تاجر خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑے جائیں انھیں قانونی اصول پر سزا دی جاتی ہے۔ مقررہ معیار کے مطابق قیمتوں میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے دوسری تدبیر یہ اختیار کی گئی ہے کہ حکومت کی طرف سے مختلف مرکزی مقاموں پر دوکانیں کھولی گئی ہیں۔ اگرچہ قیمتوں میں یکسانیت پیدا کرنے کا یہ ایک موثر طریقہ ہے، لیکن ایسی دوکانیں اگر تعداد میں بہت کم ہوں تو خاطر خواہ نتائج نہیں نکل سکتے۔ گرانی کے بار کو کم کرنے کے لیے حکومت نے کم تنخواہ پانے والوں کے نام گرانی کا بھتہ منظور کیا ہے لیکن معین آمدنی والے گرانی کے بار سے پورے طور پر اس وقت بچ سکتے ہیں جب کہ گرانی کے تناسب سے آمدنی میں بھی اضافہ کیا جائے۔ فرض کیجئے گرانی ڈیوڑھی ہو گئی ہے تو آمدنی بھی ڈیڑھ گنی زیادہ ہو جانی چاہئے لیکن جنگ کے غیر معمولی حالات ہیں یہ کسی طرح ممکن نہیں جس طرح جنگ کی بدولت خاندانوں کا بجٹ زیر بار ہو جاتا ہے اسی طرح سرکاری بجٹ بھی زیر بار ہوتا ہے جنگ کے اخراجات اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ گرانی بھتے اور اس قسم کے دوسرے کاموں پر معقول رقم خرچ کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جن لوگوں کی آمدنی معین ہے اُن کے لیے گرانی سے بچنے کی سب سے اچھی تدبیر یہ ہے کہ وہ عیش و آرام

کی چیزوں کے استعمال کو ممکنہ طور پر کم کر دیں۔ ضروریات کی چیزوں کے استعمال میں اصول بدل سے کام لیں یعنی زیادہ مہنگی چیزوں کی بجائے کم مہنگی چیزیں استعمال کرنے لگیں اور پھر ان کے خرچ کرنے میں انتہائی احتیاط سے کام لیں تاکہ خرچ ہونے والی چیزوں کا کوئی حصہ محض لاپروائی کی وجہ سے بے کار نہ ہونے پائے۔ عام طور پر لوگ خیال کرتے ہیں کہ بہتر آمدنی ہی سے بہتر زندگی بسر کی جا سکتی ہے لیکن یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہے کہ آمدنی کتنی زیادہ کیوں نہ ہو جب تک اس کو بہتر طور پر خرچ نہ کیا جائے زندگی حقیقی معنی میں خوش حال نہیں ہو سکتی۔ گرانی کا مسئلہ نہ قیمتوں کی تحدید سے اور نہ گرانی بھتے کے ذریعہ معقول طور پر حل ہو سکتا ہے جب تک کہ ہم ان سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مدات خرچ میں موافق تبدیلی نہ کریں۔ (نشرگاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا)

غزل

محمد ناصر علی

اے خوشا وقتیکہ جب جلوہ کسی کا عام تھا
ذرہ ذرہ مے تھا، قطرہ قطرہ مے آشام تھا

چشم ساقی کی نوازش تھی نوید سرخوشی
دستِ ساقی میں نشاط زندگی کا جام تھا

مے کشانِ بزم غافل تھے مگر بیخود نہ تھے
چشمِ ساقی سے غرض تھی میکشی کا نام تھا

ہم جفا سمجھا کیے اس کو تو کیا اُس کی خطا
وہ سراپا ناز تھا اور ناز اُس کا کام تھا

غم ہی جب جزوِ طبیعت بن گیا تو غم کہاں
تو نے جتنے غم دئے اتنا ہمیں آرام تھا

شکوۂ کم فرصتی ہم کو رہا اے مستِ ناز
عشق کا آغاز دورِ بے خودی کا نام تھا

اب نہ وہ مطرب نہ وہ ساز تمنا ساز ہے
جس کا ہر نغمہ حیاتِ نو کا اک پیغام تھا

یاد ہے اب تک محبت کا وہ عہد انتظار
جب ہمارے لب پہ ہر لحظہ کسی کا نام تھا

جب مجھے حسرتؔ کسی کی یاد سے فرصت نہ تھی
دل یہی دل تھا مگر بے فکر صبح و شام تھا

حسرت ترمذی

اطلاع:۔ جو مضامین قابل اشاعت ہوتے ہیں ان کو سلسلہ وار شائع کیا جاتا ہے۔ ناقابل اشاعت مضامین واپس نہیں کئے جاتے۔ براہ کرم مضمون نگار اصحاب اپنے پاس مضامین کی نقلیں رکھیں۔ مضامین کی اشاعت سے متعلق خط و کتابت کرتے وقت جوابی کارڈ یا مہربانی کا ٹکٹ روانہ فرمائیں۔ مدیر

عورتوں کی عید

اگرچہ ہر سال عیدیں بڑی دھوم دھام سے آتی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدتوں کی تمناؤں کے بعد آتی ہیں۔ بچے بوڑھے مرد اور عورتیں سب اس کی آمد کے یکساں منتظر رہتے ہیں۔ عید کا دن دوسرے دنوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے بعض لوگ عید کے دن کو بڑا دن بھی کہتے ہیں۔ مختلف زمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ شروع ہی سے سیر و تفریح کرنے اور خوشی منانے کے سامان کسی نہ کسی صورت میں موجود تھے۔ ہر زمانے میں مختلف سماجوں میں طرح طرح سے ان کا رواج تھا اور یہ عجیب بات ہے کہ ہر جگہ اور اکثر اوقات مردوں سے زیادہ عورتیں ان میں حصہ لیتیں اور عید کے مسرت خیز لمحوں میں اضافہ کرنے کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتیں۔

عورتوں کی عید کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے چند اور باتوں کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ تسلسل اور دلچسپی باقی رہے۔ عام طور پر عیدوں کو دو طرح سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک مذہبی عید اور دوسرے سماجی عید۔ مذہبی عید کا تعلق کسی خاص مذہب سے ہوتا ہے اور سماجی عید تمام ملک اور قوم سے متعلق ہوتی ہے۔

مذہبی عیدوں میں عیسائیوں کے ہاں کرسمس اور ایسٹر، ہندوؤں کے ہاں دسہرہ اور دیوالی، مسلمانوں میں عید رمضان اور بقرعید زیادہ اہمیت رکھتی ہیں ہر فرقے کے لوگ اپنی اپنی عیدوں میں اپنے رسم و رواج کے مطابق خوشیاں مناتے ہیں اور آج ہر مسلمان کے گھر میں رمضان کی عید منائی جا رہی ہے۔ اس عید میں مبارک بادیوں کا سلسلہ نماز عید کے بعد ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور پھر تین روز تک مبارک سلامت کا تانتا بندھا رہتا ہے ان کی تفصیلات کو جن سے ہر شخص بخوبی واقف ہے نظر انداز کرتے ہوئے صرف عورتوں کی عید سے متعلق چند باتیں بیان کی جاتی ہیں کیونکہ یہی اس مضمون کا موضوع ہے۔

رمضان کا چاند دکھائی دینے کے بعد ہی سے عورتوں کی مصروفیات شروع ہو جاتی ہیں اور جیسے جیسے عید قریب آتی جاتی ہے ان کی سرگرمیوں کی رفتار تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ وہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے نئے نئے کپڑے تیار کرتی ہیں۔ اب سے کچھ دن پہلے عورتیں مردوں کے ذریعہ سے کپڑے اور دوسری ضروری چیزیں بازار سے منگواتی تھیں مگر پسند ناپسند کا حکم لگا کر۔ اس حکم کے تحت بیچارے مردوں کو ایک ایک چیز کے لیے بازار کے کئی چکر کرنے پڑتے اور کئی دن کے بعد ان کی فرمائشات کی تکمیل ہوتی۔ لیکن جدید فیشن کی روشن خیال عورتیں اپنا بار مردوں پر ڈالنا نہیں چاہتیں۔ خود بازار جا کر اپنے پسند کی چیزیں خرید کرتیں اور اپنی فرمائشات کی آپ تکمیل کر لیتی ہیں۔ البتہ رقمی بار تو بہرحال مردوں ہی پر عائد ہوتا ہے۔ اور اس دوسری شکل میں پہلے سے کچھ زیادہ ہی۔ خرید و فروخت کا یہ سلسلہ عید کا چاند دکھائی دینے تک برابر جاری رہتا ہے۔

عید کے دن پہلے گھر کی صفائی اور آراستگی کی جاتی ہے اور ہر گھر میں عورتیں اپنے معیار زندگی کے مطابق اپنے گھر

کو آراستہ کرتی ہیں۔ غریب اور پرانے خیال کی عورتیں زمین پر فرش بچھانے کا اہتمام کرتی ہیں اور دالان میں بڑی شطرنجی بچھا کر اس پر سفید سفید چاندنی کا فرش کرتی ہیں۔ اِدھر اُدھر دیوار سے دو تین گاؤ تکیے رکھ دیتی ہیں۔ امیر اور نئی روشنی کی عورتیں طرح طرح سے اپنے مکانوں کی آرائش کرتی ہیں۔ کہیں صوفے اور کرسیوں کا فرش ہے تو کہیں رنگ برنگ کے قیمتی قالین بچھے پڑے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی میزوں پر رنگ برنگ کے میز پوش ڈالے جاتے ہیں جن پر خوشنما پھولوں کے گلدستے دکھائی دیتے ہیں۔ دیواروں پر تصویریں لگائی جاتی ہیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر رنگین پردے ہوتے ہیں مختصر یہ کہ عید کے دن ہر گھر شادی کا گھر بن جاتا ہے۔

عید کا چاند دیکھنے کے لیے عورتیں اور بچیاں کوٹھوں پر چڑھ جاتی ہیں اور آسمان پر ٹکٹکی باندھ دیتی ہیں۔ بڑی کوشش کے بعد جب چاند دکھائی دیتا ہے تو دعا کے لیے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں۔ معصوم بچیاں اپنی ماؤں کے ساتھ دستِ دعا بلند کرتی ہیں۔ اور یہ منظر تقدس اور معصومیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتا ہے اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے گلے ملتی ہیں لڑکیاں اپنی ماؤں اور بڑی بہنوں کو جھک جھک کر بندگی کرتی ہیں اور خوشی سے پھولے نہیں سماتیں۔ ان کی خوشی کا کچھ ٹھکانا نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ عید انہی کی ہوتی ہے۔ دو روز پہلے ہی سے عید کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں اور عید کی رات تو ان کے لیے رت جگا ہوتی ہے۔ ہاتھوں میں مہندی لگاتی ہیں۔ اچھے اچھے کپڑے اور نئی نئی چیزوں کی خوشی میں ساری رات نیند نہیں آتی بار بار اپنی چیزوں کو دیکھتی جاتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں۔ غرض نیند میں بھی ان کو عید کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ جوں توں کر کے رات کاٹی جاتی ہے۔

اب ذرا ان کا صبح کا پروگرام شاعر کی زبان سے سنئے۔

صبح دم اٹھ بیٹھیں ساری بچیاں — سرخ ہیں مہندی سے سب کی انگلیاں
چوڑیاں لائی ہیں چوڑی والیاں — گھیر بیٹھی ہیں انھیں سب بچیاں
پہن لیں ہاتھوں میں سب نے چوڑیاں
سب نہانے میں لگی ہیں لڑکیاں — ہاتھ میں سب کے ہیں کنگھے کنگھیاں
کان میں سب کے ہیں پتے بالیاں
عید کا آداب پھر سب کو کیا — باپ نے جو دے دیا وہ لے لیا
ماں نے بھی خوش ہو کے آخر کہہ دیا — آج جو چاہو وہ مانگو بر ملا
پورا کر دیں گے تمھارا مدعا

عید کے دن خواتین پر بہت زیادہ بار پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ عید کی خوشیوں کا سامان مہیا کرے۔ کھانے پکانے اور مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے میں دن بھر مصروف رہتی ہیں۔ دوسرے دنوں کے مقابلے میں عید کے روز انھیں دگنی زحمت اٹھانی پڑتی ہے لیکن کیا مجال کہ ابرو پر بل آ جائے۔ مردوں کی طرح عید کی مسرتوں سے خود لطف اندوز ہونے کی جگہ عورتیں صبح سے لیکر شام تک مردوں کی خاطر تواضع مہمانوں کی آؤ بھگت اور بچوں کے بناؤ سنگھار میں لگی رہتی ہیں اور تقریباً ہر گھر میں یہی ہوتا ہے۔

عید کی صبح سب سے پہلے عورت ہی بیدار ہوتی ہے؛ خواہ وہ گھر کی ماما ہو یا بیگم۔ حمام کے لیے پانی گرم کیا جاتا ہے۔ اور اس کے

بعد سویاں اور شیر قورمہ تیار کرتی ہیں۔ پہلے مرد اور لڑکے نہا دھو کر نئے نئے کپڑے پہنتے ہیں اور سویاں شیر قورمہ کھا پی کر نماز کے لیے عیدگاہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد لڑکیاں اور عورتیں حمام کر کے نئے نئے لباس پہنتیں اور بناؤ سنگھار کرتی ہیں۔ اپنے مقدور کے مطابق زیور زیب تن کر کے اپنے حسن و زینت میں چار چاند لگاتی ہیں۔ بعض جگہ مثلاً الہ آباد اور کلکتہ میں عورتیں بھی نماز کے لیے عیدگاہ جاتی ہیں۔ ان کے لیے عیدگاہ کا ایک حصہ مختص کر دیا جاتا ہے۔ اور پردہ کا بھی انتظام رہتا ہے۔ مگر عام طور پر عورتیں گھروں ہی میں رہتی ہیں۔

مرد عیدگاہ سے لوٹتے وقت لڑکیوں کے لیے کھلونے خریدتے ہیں۔ لڑکیاں خوش خوش اپنے کھلونے لیتی ہیں اور یہی دراصل ان کی عید ہے۔ عورتیں عید کا لباس پہن کر اپنے رفیق حیات کے سامنے آتی ہیں اور ان کی دید کو اپنی حقیقی عید سمجھتی ہیں۔ مردوں کی واپسی کے بعد دسترخوان چنا جاتا ہے۔ سب مل کر بیٹھتے ہیں۔ مرد عورتوں کو عیدگاہ کے قصے سناتے ہیں جن میں سے بعض عورتوں کے لیے بڑے پر لطف ہوتے ہیں۔ کچھ دیر نہیں گزرنے پاتی کہ محلے والوں اور رشتہ داروں کے پاس سے لال لال پیلے پیلے خوانوں میں سویوں اور شیر قورمے کے حصے آنے شروع ہوتے ہیں۔ اور پھر جواب میں یہاں سے ان کے پاس حصے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ملاقاتیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جن کی تواضع پان چکنی الائچی اور عطر سے کی جاتی ہے۔ قدیم وضع کے گھرانوں میں چونکہ پان معاشرت کے لوازم میں داخل ہے، اس لیے وہاں عطر کے ساتھ پان کی تواضع ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں عورتوں کا زیادہ وقت پان بنانے میں گزر جاتا ہے۔ بعض عورتیں عید کے دن پان کھانے پر اتنا اصرار کرتی ہیں کہ انکار بن نہیں پڑتا۔ عید کے دن برسوں کے بچھڑے ایک دوسرے سے ملتے ہیں ان کے نزدیک درحقیقت قرابت داروں اور سہیلیوں سے ملنے کا نام عید ہے۔ عورتیں جب ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ تو پھولے نہیں سماتیں اور ان کی خوشی میں خلوص اور سادگی جھلکتی رہتی ہے ان کے دل ہر قسم کی کدورت سے پاک رہتے ہیں اور گزری ہوئی باتیں ان کے دل سے محو ہو جاتی ہیں۔ خلوص و محبت کا جذبہ عورتوں میں مردوں کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔

عزیز و اقارب کے بچے عید ملنے آتے ہیں تو ان کو اپنی حسب حیثیت عیدی دی جاتی ہے جو روپیوں یا کھلونوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ عیدی دینے کا طریقہ قدیم سے چلا آتا ہے اور ایک حد تک یہ بہت ہی اچھا طریقہ ہے کیونکہ دنیا میں خوشی کے اظہار کے جو طریقے رائج ہیں ان میں سے ایک اچھا طریقہ یہی ہے کہ آدمی روپیہ جیسی عزیز چیز یا کوئی تحفہ دوسروں کو دے اور خوشی منائے۔ عیدی کا مطلب یہی ہے کہ بڑے چھوٹوں کو عزیز عزیزوں کو سہیلی سہیلیوں کو بطور تحفہ کوئی چیز پیش کرے اور لینے والے کے دل کو ایک قسم کی حقیقی مسرت حاصل ہو عورتیں عموماً اپنی سہیلیوں کو ایسا تحفہ دیتی ہیں جو کچھ مدت تک عید کی خوشی کو تازہ رکھتا ہے۔ قدیم زمانے میں استاد بھی اپنے شاگردوں کو عیدی دیتے تھے۔ اس کی نوعیت بالکل ہی علحدہ ہوتی تھی یعنی ایک سنہری تختی پر کوئی نصیحت آمیز جملہ یا شعر یا مبارکبادی کا قطعہ خوش خط میں لکھا ہوتا تھا لیکن موجودہ زمانے میں عیدی دینے کا طریقہ بہت کم ہو گیا ہے۔ البتہ جہاں عید ملنے جاتے ہیں وہاں کی عورتیں شیر قورمہ پینے پر بڑا اصرار کرتی ہیں۔ لاکھ ان سے کہا جائے کہ ابھی پی کر آئے ہیں بالکل گنجائش نہیں لیکن وہ ایک نہیں سنتیں بالآخر ہار ماننی ہی پڑتی ہے۔

عید کے پہلے دن اتنی مصروفیت رہتی ہے کہ عورتیں عید ملنے کے لیے کہیں جا نہیں سکتیں۔ البتہ دوسرے روز گھر سے نکلتی ہیں۔ اور اپنے عزیز و اقارب اور بالخصوص سہیلیوں سے ملنے کے بعد ان میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ میزبان اپنے مہمان کی دل کھول کر خاطر تواضع کرتے ہیں۔ اور عید ہی ایک ایسا موقع ہے کہ جس میں عورتیں تقریباً اپنی اکثر سہیلیوں اور عزیز و اقربا سے ملاقات کرتی ہیں۔ اور جو قریب نہ ہوں تو عید کارڈ کے ذریعہ نصف ملاقات کا لطف اٹھاتی ہیں۔ بعض دفعہ عید کارڈ کا مضمون اتنا دلچسپ اور مسرت آگیں ہوتا ہے کہ ملاقاتوں میں بھی یہ لطف نہیں آتا۔ عورتیں دل کھول کر اپنی تمناؤں کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کا قلم ان کے دلی جذبات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ کہیں طلبِ شوقِ دید کا ذکر کرتی ہیں، تو کہیں بے التفاتی کا شکوہ۔

کہیں محبت کے پردہ میں شکایت کی جاتی ہے۔ تو کہیں شکایت کے پردہ میں خلوص و محبت۔ غرض عورتوں کی مصروفیت صرف ایک دن کی نہیں بلکہ عید کے چند روز پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے اور کئی روز بعد تک باقی رہتی ہے۔ جن لوگوں کو کثرت کا ہی لطف آتا ہے ان کے نقطۂ نظر سے عورتیں صحیح معنوں میں عید مناتی ہیں۔

خواجہ حمید الدین

مشرق و مغرب

برق تڑپتی ہے پھر دامنِ افلاک میں — ایک نئی زندگی ہے خس و خاشاک میں
لذتِ غم سے کہاں اہلِ فلک آشنا — آتشِ غم ہے مری فطرتِ بیباک میں
عقل کی حد سے پرے میرے جنوں کا مقام — تو کہ اسیرِ ہوس سرحدِ ادراک میں
تجھ کو میسر کہاں گوششِ حقیقت نیوش — سرِ حقایق مرے نغمۂ بیباک میں
کاش عطا ہو تجھے پاکیٔ قلب و نظر — رازِ دو عالم مرے دیدۂ نمناک میں
عرش سے اونچی تری رفعتِ پرواز ہو — یہ کوئی پرواز ہے دامنِ افلاک میں

رنگِ شکستہ مرا فاش نہ کر دے کہیں
راز ابھی اور ہیں سینۂ صد چاک میں

(۲)

عکسِ دلِ مضطرب گردشِ شام و سحر — حسن کی رنگینیاں شوخیٔ ذوقِ نظر
واقفِ اسرارِ غم میرا دلِ مضطرب — لذتِ آلام سے شمس و قمر بےخبر
میں ہوں خلش آشنا تو ہے خلش آفریں — کاش تجھے ہو عطا سوزشِ زخمِ جگر
تیرے قدم پر جھکے آ کے جبینِ فلک — تیری نواؤں میں ہو سوز و گداز و اثر
تیرا نشیمن نہ ہو تیری متاعِ حیات — کھیل ہو تیرے لیے شوخیٔ برقِ شرر

میرے خمستاں میں ہے تیرے جنوں کی دوا
شرق ہے صد چاکِ دل غرب فریبِ نظر

ظفر (عثمانیہ)

جدید چین کا سیاسی ارتقاء

جب کسی ملک یا حکومت میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس ملک کی سیاست میں کچھ ایسی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے بےچینی اور بدامنی کا دور پیدا ہو جاتا ہے اور یہ بحرانی دور اسی وقت ختم ہوتا ہے جب کہ اس ملک کے نظامِ حکومت کو بالکلیہ فنا کر دیا جائے اور ایک نئے دور کا آغاز ہو۔ چین میں بھی یہ افراتفری کا دور اُسی وقت ختم ہوا جب کہ ۱۹۱۱ء میں انقلاب ہوا اور وہاں کی قدیم شاہی کو ختم کر کے ایک جمہوری حکومت تشکیل دی گئی۔

انقلابِ چین سے پہلے تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ چین کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ منچو حکومت کی استبدادیت اور تجارتی برتری کے لیے بیرونی طاقتوں میں جو کشمکش ہو رہی تھی اس سے چینی عوام پر بے حد مظالم ہو رہے تھے۔ ایک تو خود منچو حکمرانوں کا ظلم اور جبر انھیں ہر طرح سے پریشان کر رہا تھا اور دوسرے یہ کہ بیرونی ممالک کی کشمکش سے ان کے روایتی آرام اور علیحدگی پسند زندگی میں خلل پڑ رہا تھا اس لیے جدید چین کو سمجھنے کے لیے یہ نامناسب نہ ہوگا اگر ہم چین کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

چینیوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے ملک میں کسی بیرونی قوم کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنے رواج اور روایات سے ہٹ کر اپنی زندگی گزارنا گوارا نہیں کرتے خواہ ان کا معیارِ زندگی اور ان کا تمدن کتنا ہی پست کیوں نہ ہو۔ ان کی حب الوطنی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس میں وہ خوش رہیں۔ چین کی ترقی کے لیے نہ بیرونی مدبر و سیاس کی ضرورت تھی نہ ان کی تجارت کی۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب شہنشاہ جارج سوم نے چیان لنگ شہنشاہ کے دربار میں ایک مشن بھیجا تا کہ چین اور برطانیہ میں ایک دوستی کا معاہدہ ہو سکے تو جارج سوم کو شہنشاہ چیان لنگ نے یہ جواب بھجوایا کہ "آپ کے سفیر خود دیکھ سکتے ہیں کہ چین میں کسی چیز کی کمی نہیں ہمارے پاس ہر چیز موجود ہے ہم بیرونی اشیاء کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ مجھے آپ کے ملک کی تیار کردہ چیزوں کی ضرورت نہیں۔" شہنشاہ چیان لنگ کے اس قسم کے جواب سے مغربی صنعت چین کے سواحل تک نہ پہنچ سکی اور شاید بعد میں بھی مغرب کی تیار کردہ اشیاء کے لیے چین کی منڈی ہمیشہ بند رہتی اگر چین کو افیون کی ضرورت نہ ہوتی۔ چین میں افیون کی مانگ بہت تھی اور جتنی افیون خود چین میں پیدا ہوتی تھی وہ چینیوں کی ضرورت کی تکمیل نہ کر سکتی تھی۔ افیون کے استعمال میں جو کثرت پیدا ہو گئی تھی اس کو کم کرنے کے لیے چین کے حکمرانوں کو قوانین بھی نافذ کرنے پڑے لیکن حکومت کو ناکامی ہوئی۔ افیون کی اس تجارت سے چینی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا
برطانوی حکومت نے جب یہ دیکھا کہ بغیر افیون کے چینیوں کی زندگی متاثر ہو رہی ہے چین میں ہندوستانی افیون کی تجارت شروع کر دی اور اس ایک چیز کی وجہ سے چین میں بیرونی عناصر داخل ہونا شروع ہوئے۔ اس افیون کی تجارت سے چینی حکومت اور برطانوی تجار میں نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ کیونکہ حکومتِ چین کی طرف سے جو بھی حاکم اس کو روکنے کی غرض سے مقرر ہوتا وہ ناکام رہتا تھا۔ چنانچہ یہ اختلافات جنگ کی صورت اختیار کرتے گئے اور بالآخر ۱۸۳۹ء میں چین اور برطانیہ میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ تین سال تک چلتی رہی اور ۱۸۴۲ء میں شہنشاہِ چین کو شکست ہوئی اور نانکنگ میں صلح کے شرائط مرتب ہوئے۔ صلح نامۂ نانکنگ کی رو سے تقریباً سارا شمالی چین یوروپی تجارت کے لیے کھلا قرار دیا گیا۔ برطانیہ عظمیٰ کی یہ کامیابی دراصل مغربی تمدن اور مغربی طریقۂ جنگ کی کامیابی تھی۔

برطانیہ کی اس فتح سے مغرب کی تجارت کے لیے چین کا دروازہ کھل گیا اور دوسرے ممالک بھی چین میں داخل ہونے لگے۔ جاپان، امریکہ

فرانس، ناروے، بلجیم نے چین سے تجارتی معاہدے کیے اور جب ان کی تجارت ترقی پذیر ہو رہی تھی تو یہ چین سے مزید مراعات طلب کرنے لگے اور ایک دوسری جنگ کے آثار نمایاں ہونے لگے ۔ فرانس اور برطانیہ کو اس وقت چین کے خلاف جنگ کرنا پڑا جب کہ فروری ۱۸۵۶ء میں فرانس کی ایک مشنری کو چین کے باشندوں نے قتل کر دیا۔ اس کے علاوہ اسی سال برطانیہ کے ایک جہاز پر چینیوں نے قبضہ کر لیا چنانچہ ۱۸۵۶ء ہی میں فرانس اور برطانیہ چین کے خلاف کھڑے ہو گئے لیکن ۱۸۵۷ء تک کوئی عملی اقدام نہ کیا جا سکا کیونکہ ہندوستان میں سیاسی آزادی کے لیے غدر کے اثرات نمایاں ہو رہے تھے ۔ ایک ہی سال بعد یعنی ۱۸۵۸ء میں چین کو شکست ہوئی ۔

اس زمانے میں حکومت چین بہت کمزور ہو گئی تھی ۔ کیونکہ ایک طرف تو چین کو مغربی ممالک سے نبرد آزما ہونا پڑ رہا تھا اور دوسری طرف خود چین کی اندرونی حالت بگڑتی جا رہی تھی ۔ حکومت کی بدنظمی اور شہنشاہ چین کی استبدادیت کی وجہ سے عوام میں بغاوت کے جذبات بھڑک اٹھے تھے ۔ اور بالآخر ۱۸۵۱ء میں انقلاب برپا ہوا ۔ ایسے خونین انقلاب کی مثال شاید ہی ہمیں تاریخ میں مل سکے گی ۔ چودہ سال تک حکومت کو اس انقلاب کا مقابلہ کرنا پڑا بیرونی طاقتوں کی مدد سے ٹیپنگ کا یہ انقلاب چودہ سال بعد فرو کیا گیا ۔ اگرچہ کہ اس انقلاب میں عوام کو شکست ہوئی لیکن اس انقلاب سے چینی حکومت بہت کمزور ہو گئی ۔

دوسری جنگ چین کے اختتام اور ٹیپنگ کے انقلاب کے ختم ہونے پر چین پر بیرونی اقتدار بہت ہی بڑھ گیا ۔ چونکہ چین میں مغربی ممالک کا بہت گہرا مفاد مضمر تھا اس لیے وہاں کے مدبروں کا یہ خیال تھا کہ اگر منچو خاندان کی حفاظت کی جائے تو ان کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں میسر آ سکتی ہیں چنانچہ ۱۸۷۳ء میں تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ پیکنگ کے شاہی دربار میں بیرونی ممالک کے سفیر موجود تھے ۔ اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں چین کا ایک قاصد لندن گیا ۔ اس کے بعد تو سارے یورپ میں چین کے سفارت خانے قائم کیے گئے ۔

انقلاب ٹیپنگ کے دوران ہی میں چین کے صوبوں پر دوسرے ممالک نے قبضہ کرنا شروع کیا ۔ چنانچہ روس نے شمالی چین کے ایک علاقے پر قبضہ کر لیا اس کے بعد ہند چینی اور برما پر فرانس اور برطانیہ کا قبضہ ہو گیا ۔ اس موقع پر ہم جاپان کو فراموش نہیں کر سکتے ، کیونکہ جاپان مغربی تہذیب اور تمدن کو تسلیم کر کے مغربی ممالک سے زیادہ ترقی کر گیا ۔ مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ جاپان بھی چین میں تجارتی اغراض کے تحت داخل ہوا اور جاپان کی تجارت دوسروں سے کچھ کم نہ تھی ۔ چنانچہ جب مغربی ممالک چین کے مختلف علاقے اپنے قبضے میں کر رہے تھے تو جاپان بھی اسی پالیسی پر عمل کرنے لگا ۔ جاپان اور چین کے اختلافات بڑھنے لگے اور ۱۸۹۴ء میں جاپان اور چین میں جنگ چھڑ گئی ۔ چونکہ حکومت چین بہت کمزور تھی اس لیے وہ جاپان کا مقابلہ نہ کر سکی اور ۱۸۹۵ء میں جاپان سے صلح کی درخواست کی گئی ۔ صلح کے شرائط کی رو سے جزیرہ فارموسا اور علاقہ کوریا پر جاپان کا قبضہ ہو گیا ۔

جنگ چین و جاپان کے نتیجہ سے دنیا کے ممالک یہ محسوس کرنے لگے کہ چین کے باشندے بہت ہی پست قسم کے ہیں چین کی اس کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے چین سے مراعات طلب کیں ہر ایک ملک اس کوشش میں تھا کہ چین کی لوٹ میں ان کا زیادہ سے زیادہ حصہ رہے ۔ اپنے اقتصادی مفاد کی حفاظت کے لیے روس، جرمنی، برطانیہ، فرانس، امریکہ وغیرہ نے اپنی فوجی طاقت کو زیادہ کیا اور قلعے تعمیر کروائے ۔ بالآخر ۱۸۹۹ء میں چین کی اس بے مایہ حالت کو دیکھ کر اور خود اپنے تجارتی مفاد کے خیال سے ممالک متحدہ امریکہ کی طرف سے ایک اعلان ہوا جس میں چین کی تجارتی اور خارجی پالیسی کو معین کیا گیا ۔ اس معین شدہ پالیسی کو مساوی حقوق تجارت ([illegible])

کہا جاتا ہے جس کی رو سے چین میں تجارت کرنے کے لیے تمام یوروپی ممالک کو مساوی حق اور آزادی دی گئی۔

اس زمانے میں چینی عوام کو بیرونی ممالک سے بے حد نفرت پیدا ہو گئی تھی اور یہ منافرت کے جذبات شمالی صوبوں میں بے حد بڑھتے جا رہے تھے کیونکہ انہی صوبوں میں یوروپی اقوام کی تجارت اور ان کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کے علاوہ خاندان منچو کے حکمرانوں کا یہ خیال تھا کہ ان کی حکومت اور شاہی اسی وقت برقرار رہ سکتی ہے جب کہ وہ یوروپی ممالک کا ساتھ دیں اور ان کی مدد حاصل کریں لہذا جب شمالی صوبوں میں بغاوت کے جذبات ظہور پذیر ہو رہے تھے تو منچو حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ مغربی حکومت کا ساتھ دیا جائے اور عوام کی اس تحریک کو نظرانداز کیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود شمالی صوبوں میں یوروپیوں کی مخالفت روز بروز بڑھتی گئی خفیہ انجمنیں بھی قائم ہوئیں تاکہ بیرونی اقتدار کو روکا جائے۔ چنانچہ یہ تحریک عام ہوئی اور ہر بیرونی چیز کا بائیکاٹ کیا جانے لگا۔ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے سی شی (Tse-Hsi، Dowager Empress) ملکہ ڈاویجر نے کمسن شہنشاہ وانگ سو (Hwang-Su) کو حکومت کے معاملات میں دخل دینے نہ دیا اور خود عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس کے بعد اس نے اپنے کو بیرونی اثرات کی مخالفت کا صدر بنا لیا اور سنہ ۱۹۰۰ء میں سی شی کے حکم سے حکومت کی افواج نے جو کہ پہلے بیرونی ممالک کا ساتھ دے رہی تھیں اب انقلابیوں کا ساتھ دینا شروع کیا۔ ان حالات میں یہ تحریک اور تیز ہو گئی اور حکومت کی فوج سے مل کر چینیوں نے بیرونی ممالک کے سفارت خانوں کو گھیر لیا آخر کار بیرونی ممالک برطانیہ، فرانس، روس، جرمنی، اطالیہ، امریکہ اور جاپان کی متحدہ فوجوں نے ایک ہو کر انقلابیوں کا مقابلہ کیا۔ اس متحدہ قوت کا مقابلہ چینی عوام کے لیے مشکل ہو گیا اور یہ بغاوت ختم ہو گئی۔ اس بغاوت کو باکسر کی بغاوت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بغاوت باکسر کے دوران ہی میں روس کی فوجیں منچوریا بھیجی گئی تھیں۔ اس بغاوت کے بعد جاپان نے روس سے مطالبہ کیا کہ روسی افواج منچوریا سے واپس بلا لی جائیں لیکن روس جاپان کے اعتراضات کو نظرانداز کر رہا تھا۔ روس کا خیال تھا کہ منچوریا میں اپنی فوج رکھ کر اپنے اقتدار کو بڑھایا جائے۔ روس کی اس پالیسی پر کاربند رہنے سے دوسرے ممالک کو خصوصاً جاپان کو روس سے بےحد خوف پیدا ہو رہا تھا چنانچہ سنہ ۱۹۰۲ء میں جاپان اور برطانیہ کے مابین ایک معاہدہ طے پایا کہ اگر ان ممالک میں کسی ایک پر حملہ کیا جائے تو دوسرا ملک بھی اس کی مدد کرے گا۔ اس اثنا میں روس اور جاپان کی مخالفت بڑھتی گئی۔ اور کوریا کے مسئلہ میں آخر کار جاپان کو سنہ ۱۹۰۴ء میں روسی افواج پر حملہ کرنا پڑا۔ اس جنگ میں سنہ ۱۹۰۵ء میں روس کو شکست ہوئی اور جاپان کو جنوبی منچوریا میں وہ تمام اختیارات حاصل ہوئے جو کہ روس کی ملکیت تھے چین نے بھی جاپان کی اس کامیابی اور اس کے اقتدار کو تسلیم کر لیا۔

اس وقت تک چین کی حکومت بہت کمزور ہو گئی تھی حکومت کے خلاف عوام کے جذبات نمایاں ہو رہے تھے۔ مانچو خاندان اور نظام حکومت کے خلاف عوام کے خیالات بدلنے کی واحد ہستی ڈاکٹر سن یات سین کی ہے۔ سن یات سین ایک زمانے سے اس کوشش میں تھے کہ چین کی شاہی کو ختم کیا جائے اور عوام کو شاہی سے نجات دلایا جائے۔ چنانچہ سن یات سین نے خفیہ انجمنیں قائم کرنے کے بعد انقلاب کے جذبات اور خیالات پھیلانے کا منظم کام کیا۔ وہ بیرونی ممالک کا دورہ کر کے چین کے انقلاب کے لیے روپیہ فراہم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

سن یات سین کی اس تحریک میں کامیابی بغیر وانگ سنگ (Hwang-Hsing) کی معاونت کے ممکن نہیں ہو سکتی تھی جس طرح سن یات سین انقلاب کا نظری نقشہ مرتب کرتے تھے وانگ سنگ عملی طور پر اس کو بروئے کار لاتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں یہ دونوں جلاوطن تھے

اسی سال اِن کی ملاقات جاپان میں ہوئی۔ دونوں کے ایک ہی خیالات تھے۔ وہ منچو حکومت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ سن یات سین کیومنگٹنگ جماعت (چینی قومی جماعت) بنا کر انقلاب کے اثرات پھیلا رہے تھے تو وانگ سنگ نے انقلاب کے زمانے میں اپنی ذاتی بہادری اور شجاعت کی وجہ سے منچو فوجوں کی ایک بڑی تعداد کا صفایا کر دیا۔ اسی طرح ۱۹۱۱ء میں انقلابی جماعت لڑنے کے لیے بالکل تیار تھی۔ سن یات سن اور وانگ سنگ اپنی فوجوں کو ہتھیاروں سے لیس کر کے میدان میں کود پڑے۔ سارے چین میں انقلاب برپا ہو گیا اور ۱۹۱۲ء میں یہ انقلاب کامیاب طور پر ختم ہوا۔

انقلاب چین کے بعد منچو حکمرانوں کو تخت سے معزول کیا گیا اور چین میں ایک جمہوری حکومت قائم ہوئی جس کے پہلے صدر سن یات سین مقرر ہوئے۔ لیکن یان شی کائی جو کہ چین کا ایک مکار جنرل تھا سن یات سین کو دھوکہ دے کر خود چین کا صدر بن گیا۔ اور بالآخر ۱۳ اپریل ۱۹۱۳ء کو ایک فرمان کے ذریعے اپنے آپ کو چین کا شہنشاہ اور "پسر جنت" (Son of Heaven) مقرر کر لیا۔ سن یات سین بھی یان شی کائی کی اس مکاری کی وجہ سے اس کے بے حد دشمن ہو گئے کیونکہ یان شی کائی چین میں وہی حالات پیدا کر رہا تھا جو کہ انقلاب سے پہلے چین میں موجود تھے چنانچہ یان شی کائی کی صدارت میں پہلی مرتبہ چین کی پارلیمانی مجلس نے اپنا اجلاس مقرر کیا تو سن یات سین نے یہ پیام بھیجا کہ "تم اپنے ملک اور اپنی قوم کے لیے غدار ثابت ہوئے ہو جس طرح میں نے منچو حکمرانوں کے خلاف جنگ کی اسی طرح میں تمہارے خلاف بھی انقلاب برپا کروں گا۔ اور کامیاب بھی ہوں گا"

لیکن اس وقت تک یان شی کائی نے منظم فوج تیار کر لی تھی اور جولائی ۱۹۱۳ء میں سن یات سین نے اس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو انھیں ناکام ہونا پڑا۔ اس کے بعد ۱۲ دسمبر ۱۹۱۵ء میں یان شی کائی نے اپنے شہنشاہ چین ہونے کا اعلان کیا اور چھ مہینوں کے بعد ۶ جون ۱۹۱۶ء کو مر گیا۔ اس کے بعد سن یات سین چین کے صدر بن گئے اور چین کی حالت درست کرنے لگے۔

۱۹۱۱ء کے انقلاب چین کے بعد ابھی چین اس کمزور حالت میں تھا کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی۔ جاپان اتحادیوں کا ساتھ دے رہا تھا لیکن چین غیر جانب دار تھا۔ جاپان چونکہ جرمنی کا دشمن تھا اس لیے وہ جرمنی کے چینی مقبوضہ علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب کہ چین کی غیر جانبداری باقی نہ رہے۔ چین اپنی غیر جانبداری پر قائم تھا لیکن جاپان اس کے باوجود جرمن مقبوضات پر قابض ہو گیا۔ چین سے مراعات حاصل کرنے کے لیے جاپان بہانے تلاش کر رہا تھا۔ اور یہ موقع بہت ہی مناسب تھا چنانچہ جاپانی حکومت نے چین کی اس غیر جانبدار پالیسی پر سخت اعتراض کیا۔ اور ۱۹۱۵ء میں چین کے سامنے اکیس[۲۱] مطالبات پیش کیے۔ یان شی کائی اس وقت چین کا صدر تھا اور چونکہ اس کی حکومت بہت کمزور تھی اس لیے جاپان کے اکیس[۲۱] مطالبات کو تسلیم کر لیا جس کی وجہ سے جاپان کو بے حد فائدہ ہوا۔ یہ معاہدہ زیادہ تر شخصی تھا کیونکہ اس کو نہ تو چینی حکومت نے نہ تو چینی عوام نے تسلیم کیا ہے۔ لیکن یان شی کائی کی موت کے بعد ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء میں سن یات سین نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جس کی وجہ سے جاپان چین کا بے حد مخالف ہو گیا۔ اگرچہ کہ معاہدہ ورسائی میں چین کو کچھ فائدہ نہ ہوا لیکن مجلس اقوام کا رکن بننے سے چین کو اپنے اندرونی معاملات میں اصلاح کرنے کا موقع نظر آیا چنانچہ وہ اسی نقطۂ نظر سے مجلس اقوام کا رکن بن گیا۔

جنگ عظیم کے بعد اگرچہ کہ دنیا میں ایک عارضی امن رہا لیکن جاپان اپنے اکیس[۲۱] نکات پر سختی سے پابند تھا اور اس سے فائدہ اٹھا رہا تھا اور چین و جاپان کے مسئلہ میں سمجھوتہ کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی چنانچہ ۱۹۲۲ء میں واشنگٹن میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں امریکہ برطانیہ

بلجیم، چین، فرانس، جاپان، اطالیہ، ولندیزی ممالک اور پرتگال شریک تھے۔ اس کانفرنس میں چین کے مسئلہ پر بحث ہوئی اور ایک معاہدہ ترتیب پایا جو نو دولی معاہدے کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کی رو سے جاپان کے بڑھتے ہوئے اثرات کی حدبندی کی گئی۔ اور چین میں تمام ممالک کو تجارت کرنے کا موقع دیا گیا۔

واشنگٹن کانفرنس کے بعد چین کے بیرونی مسائل ایک حد تک حل ہوگئے لیکن اس موقعہ پر چین کے اندرونی معاملات بہت ہی پیچیدہ تھے تمام ملک میں بدامنی اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں سن یات سین کا انتقال ہوا لیکن ان کے بعد جیانگ کائی شک کی بہادری کی وجہ سے پھر ایک مرتبہ چین میں امن قایم کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں ملک کی حالت کو درست کرنے اور بدامنی اور ابتری کو دور کرنے کی غرض سے صوبجاتی حکومتوں اور مرکزی حکومتوں میں جنگ ہوئی اور آخر کار اس جنگ کے بعد مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ چین کا قومی جذبہ اور چین کی قومی بیداری ہی جدید چین کا روشن ترین پہلو ہے۔

چین میں جو انقلابی اثرات پیدا ہوگئے ہیں ہم ان کو نظرانداز نہیں کر سکتے جب چین میں اندرونی خلفشار برپا تھا تو امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے چینی امداد میں کچھ تساہل ظاہر ہوا۔ اس دیری کی وجہ سے چین روس کی طرف متوجہ ہوا جو ایک زمانے سے چین کی مدد کرنے تیار تھا روس کی امداد سے چین میں اشتراکی اثرات ظاہر ہوئے اس طرح روس اور چین میں ایک معاہدۂ دوستی ہوگیا۔ اور اشتمالی اثرات چین میں بہت پھیلنے لگے۔

واشنگٹن کانفرنس کی وجہ سے جاپان کا بہت سا نقصان ہوا۔ اس کے علاوہ چین میں جب اشتمالی اثرات پھیلنے لگے، تو جاپان کو روس سے خوف ہونے لگا کیونکہ اگر روس، ایشیا میں بھی دخل دینے لگے تو جاپان کے لیے بے حد مشکلات پیدا ہوجائیں گی۔ اس لیے وہ چین کی پالیسی کو پسند نہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ جاپان کی بڑھتی ہوئی آبادی اور غیر مکتفی اشیاء خام بیرونی مدبروں کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ تھا اور اس مسئلہ کا حل چین پر حملہ کر کے اس پر مکمل قبضہ جمانے کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہ تھا لیکن چین میں امریکہ اور برطانیہ کے معاشی اور اقتصادی مفادات، روس کے اشتمالی اثرات اور خود چین کی قومیت پسند پالیسی وہ مزاحمتیں تھیں جو جاپان کے ارادوں میں آڑے آرہی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں جاپان نے منچوریا پر حملہ کردیا اور چین پر اپنے اثرات ڈالنا شروع کیا۔ چین کے بڑھتے ہوئے جذبہ قومیت کو کچلنے کی خاطر اور اپنے "نظام نو" کو روبعمل لانے کے لیے جاپان کے لیے ضروری تھا کہ چین پر حملہ کیا جائے اور اس پر مکمل طور پر قبضہ جمالیا جائے۔ چنانچہ ۱۳ آگسٹ ۱۹۳۷ء کو جاپان نے چین پر حملہ کردیا۔ آج جاپان چین کے ایک بہت بڑے حصہ پر قابض ہے اور شمالی چین میں جاپان کا پانچواں کالم بہت کام کر رہا ہے لیکن چین ہر طرح کی دشواریوں کے باوجود جاپان سے آج تک بھی برسرپیکار ہے جاپان کی اس جارحانہ اور "محور پسند" پالیسی کی وجہ سے اس نے ساری دنیا سے دشمنی پیدا کرلی ہے۔ نہ تو اسے ابھی اپنی اقتصادی پالیسی میں کامیابی ہوئی ہے اور نہ تو مفتوحہ ممالک میں نظم قایم کرنے میں کامیابی ہوئی ہے بلکہ اس جنگ سے جاپان کے مالیہ میں بے حد مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کا سلجھانا کسی طرح آسان نہیں۔

جدید چین میں وہ ابتری، وہ بے چینی اور وہ خلفشار باقی نہیں ہے بلکہ آج تمام چینی متحد ہو کر اپنے ملک کو دشمن کے پنجوں سے نجات دلانے کی خاطر پانچ سال سے لڑ رہے ہیں۔ اس طویل جنگ کے باوجود ان کی ہمت اور ان کے عزم میں اور زیادتی ہوتی جارہی ہے۔ اس جنگ کے کامیاب اختتام کے بعد جدید چین کے ما بقی ملتوی شدہ پروگرام کے تحت اصلاحات نافذ ہوں گے جن کی وجہ سے چین بھی ترقی یافتہ ممالک میں شمار کیا جائے گا۔

میر عابد علی خاں

تنقید و تبصرہ

محمدؐ رسول اللہ۔ مترجمہ مولانا عبید الرحمٰن صاحب عاقل رحمانی صفحات ۹۴۔ ناشر کتابستان بمبئی۔

یہ چھوٹی سی کتاب اصل میں مشہور انگریز ادیب ٹامس کارلائل کے انگریزی رسالے کا ترجمہ ہے کارلائل نے پیغمبر اسلام کی سیرت فلسفیانہ انداز میں لکھی تھی اور ان شبہات کے جواب دیے تھے جو آنحضرت کی سیرت پر عیسائیوں کی طرف سے کیے جاتے ہیں۔ یہ کتاب اس قابل تھی کہ اس کا اُردو میں ترجمہ کیا جاتا خوشی کی بات ہے کہ کتابستان نے اس کا ایک اچھا ترجمہ ایک موزوں فاضل سے کرا کے شایع کیا ہے۔ مترجم نے اکثر مقامات پر قرآنی آیتوں کو بھی اصل مباحث کی وضاحت کے لیے شریک کر دیا ہے۔

کتاب۔ کتاب خانہ پنجاب لاہور کی طرف سے ایک ماہنامہ کتاب شروع سال ۱۹۴۲ء سے شایع ہو رہا ہے مگر اس میں اردو زبان کی ترقی اور اچھی کتابوں کا تعارف نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ہر سال کرایا جاتا ہے۔ اس کے مدیر ایم ظہیر الدین اور محمد سرور ہیں۔ اور اس کے معاونین میں بعض مشاہیر ادیب اور شعرا شامل ہیں ستمبر کے شمارے میں مولانا عبید اللہ سندھی کے نظریۂ انقلاب پر ایک بصیرت افروز مضمون کے علاوہ ترکی ادب، سیاح لامکاں، اور آرٹسٹ خاص طور پر دلچسپ ہیں بحث و نظر کا سلسلہ بھی کافی معلومات آفریں ہے۔ کتابوں کے دلدادہ اس ماہنامہ کو نہایت مفید پائیں گے۔

مجموعۂ مقالاتِ علمیہ۔ حیدرآباد اکیڈمی کا ترجمان ہے۔ اس کا چوتھا شمارہ بابتہ ۱۹۴۲ء اس وقت پیش نظر ہے۔ اس کا پیش لفظ فاضل اجل مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب سابق صدر کلیہ جامعۂ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔ اور وہی اس اکیڈمی کی مجلس ادارت و اشاعت کے صدر بھی ہیں صرف یہی نسبت اس مجموعہ کے اعلیٰ معیار کی ضامن ہے۔ پیش لفظ کے بعد اکیڈمی کے سالانہ اجلاس کی افتتاحی تقریر اور پیامات شریک ہیں۔ مضمونوں میں مسئلۂ عدم نسخ قرآن، قرآن اور سیرت سازی، قرونِ وسطیٰ میں عرب و عجم کے حکما کی علمی تحقیقات، نہایت بلند پایہ مقالے ہیں جن کی اشاعت سے اس اکیڈمی کے اعلیٰ معیار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

قرآن اور سیرت سازی۔ یہ مقالہ فاضل ڈاکٹر میر ولی الدین استاد فلسفہ جامعۂ عثمانیہ کا نتیجۂ قلم ہے جو ہفتۂ علمیہ حیدرآباد اکیڈمی میں پڑھا گیا اور اس مجموعہ کے علاوہ معارف پریس اعظم گڈھ سے کتاب کی شکل میں بھی شایع ہوا ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مولف کو مشرق و مغرب کے فلسفیانہ نکات پر عبور حاصل ہے اور وہ مغرب کے الحاد سے متاثر ہوئے بغیر اس کے علوم سے کماحقہٗ استفادہ کر سکتے ہیں۔ قرآنی ادب میں یہ مقالہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور قوموں کی تعمیر کے لیے ایسے ہی مساعی کی ضرورت ہے۔

گرہن۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس کو مکتبۂ اردو لاہور نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے۔ اس میں مصنف کے پیش لفظ کے علاوہ ۱۴ افسانے شامل ہیں۔ اور پہلے افسانے کی رعایت سے پورے مجموعے کا نام گرہن رکھا گیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو ہولی کے نام معنون کیا ہے۔

اس سے قبل بیدی کے افسانوں کے ایک مجموعے دانہ و دام پر سب رس کے صفحات پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ ان کے افسانوں کا یہ دوسرا مجموعہ نقش ثانی کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ اُردو کے ان ادیبوں میں جو ہمارے ادب کو یاس کی فضا سے نکال کر امید کے میدانوں میں داخل کرنا چاہتے ہیں راجندر سنگھ بیدی کو ایک خاص جگہ حاصل ہے۔ وہ کسی واقعہ کے من و عن بیان کرنے کی جگہ رومانی نقطۂ نگاہ سے

قلمبند کرتے ہیں اور حقیقت نگاری کر غلط مفہوم سے گریز کرتے ہیں۔

حیاتِ بے نظیر۔ نواب نذیر جنگ مرحوم کے اخلاق و اوصاف کا ایک مجمل تذکرہ جس کو ان کے عقیدت مند نوجوان دوست محمد اعظم خاں صاحب ایم اے ڈپ ایڈ نے سادہ اور سلیس انداز میں مرتب کیا ہے۔ زبان پاکیزہ اور اسلوب شگفتہ ہے لیکن حالات اتنے اجمال سے لکھے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کی تشفی نہیں ہوتی۔

ٹرانسپورٹ ڈائرکٹری۔ انجمن آسائش مسافرین کی طرف سے شایع کی جاتی ہے۔ یہ اس کا دوسرا شمارہ ہے جن اصحاب کو سیر و سفر کی ضرورت درپیش ہوتی ہو وہ ضرور اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ اردو میں یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے۔ اور خاص سلیقے اور محنت سے اس کو مرتب کیا جاتا ہے۔

میسور میں اُردو۔ اس کتاب میں مولوی عبدالخالق صاحب نے میسور میں اُردو کی عہد بعہد نشو و نما اور وہاں کے ادارو رسائل و جرائد اور مصنفین کی نسبت نہایت مفید اور ضروری معلومات قلمبند کی ہیں یہ کتاب جس سلیقے اور محنت سے مرتب کی گئی ہے اس کے لیے مصنف قابل مبارکباد ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ مدرسوں کے کتب خانوں اور بالخصوص ریاست میسور کے مدرسوں اور کالجوں کے لیے خریدی جائے۔

ادارہ

ادارہ کی خبریں

مرکز مومن آباد بس اسٹانڈ پر تمام امیدوار اور معتمد صاحب شاخ ادارۂ ادبیات اردو نے استقبال کیا۔

مولوی غضنفر علی صاحب صدر شاخ ادارہ ادبیات اردو کے پاس قیام رہا۔ جناب صدر، معتمد صاحب اور مولوی فہیم صاحب کی کوششیں قابل قدر ہیں آیندہ سال ان کی مستعد مزاجی سے تقریباً ۱۰۰ امیدواروں کی شرکت کا یقین ہے۔

جملہ امیدواروں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے محلہ کے جاہل طبقہ کو اردو دانی کی تعلیم دیں گے اور یہ سب آیندہ سال اردو دانی کے امتحان میں شرکت کریں گے۔ مولوی غضنفر علی صاحب وکیل نے ایک دار المطالعہ کے قیام کا وعدہ فرمایا ہے غالباً دو چار روز میں دار المطالعہ قائم ہو جائے گا۔ فرنیچر عمارت کا کرایہ، کتب، اخبارات کی تکمیل بھی صاحب موصوف ہی فرمائیں گے۔ مولوی احسان اللہ صاحب نے اول آنے والے طالب علم کو طلائی تمغہ عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ مولوی فہیم صاحب نے یہ فرمایا کہ وہ جملہ امیدواروں کو آیندہ سال تعلیم دیں گے اور اس سال اردو عالم میں شرکت کرنے والوں کو تعلیم دینے کا طریقہ بتلائیں گے تاکہ وہ دوسروں کو اردو پڑھا سکیں۔ وہاں پہنچا کر مالک صاحب سے توقع ہے کہ اگر ادارہ کی شاخ کامیابی سے کام کرے تو وہ ہر مہینہ ایک روز کی آمدنی کا نصف حصہ ادارہ کی شاخ کو عطا کریں گے۔ مولوی عثمان جعفر صاحب تی بی ایس نے فرمایا ہے کہ وہ بھی ادارہ کے تبلیغی کاموں میں ہاتھ بٹائیں گے۔ مجھے اس شاخ سے بہت بڑی کامیابی کی توقع ہے وہاں جانے کے بعد میرا ارادہ ہوا تھا کہ ہر گھر پر جا کر ادارہ کی تبلیغ کروں اور اردو کی اشاعت کے لئے امیدواروں کو آمادہ کروں مگر مولوی غضنفر علی صاحب اور سید شبیر حسین صاحب معتمد نے فرمایا کہ یہ کام ہم خود کرلیں گے۔ جملہ امیدواروں اور کارکن صاحبان سے کہا کہ وہ شاخ پر آکر معائنہ کرتے رہیں اور باہمی امداد سے اپنی شاخ کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔

مرکز خانہ پور خانہ پور کے بس اسٹانڈ پر جناب مولوی میر ثناء اللہ صاحب مہتمم جنگلات اور منتظم صاحب پولس دیگر عہدہ داران مقامی و مولوی عبد الرشید خاں صاحب معتمد ادارہ مقامی اور طلبہ موجود تھے۔ جناب مولوی ثناء اللہ صاحب کے دولت خانہ پر میرے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔

امتحان کی نگرانی میں جناب میر ثناء اللہ صاحب مہتمم جنگلات نے شروع سے آخر تک تشریف لاکر امداد فرمائی۔ اور مولوی شمس الدین صاحب منتظم پولس اور مولوی عبد الحمید صاحب، مولوی عبد الرشید خاں صاحب معتمد ادارہ مقامی، مولوی عزیز احمد صاحب، جناب شیخ داؤد صاحب، جنسی سنگھ صاحب جمعدار پولس نے بھی امتحانات کی نگرانی وغیرہ میں امداد فرمائی۔ جناب مولوی لائق علی صاحب تحصیلدار، جناب ہیڈ ماسٹر صاحب مدرسہ و مددگار صاحب اول تھانہ بھی تشریف لاتے رہے۔ جناب مسٹر لچھما ریڈی صاحب معزز رکن ہائیکورٹ نے (جو آج کل یہاں رخصت پر تشریف فرما ہیں) امتحانات ادارہ سے خاص دلچسپی لی اور تین دن تک مسلسل ہر روز امتحان گاہ پر تشریف لاکر منتظمین و طلبہ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ مرکز امتحانات کی نگرانی اہلیہ مولوی شمس الدین صاحب نے فرمائی۔

یہاں ادارہ سے متعلق جملہ عہدہ داران مقامی علاقہ پائیگاہ وقار الامراء و معززین نے دلچسپی لی۔ جب ۱۲ مہر کو ادارہ کے تیسرے سال کی، و نہ دعوت دی گئی تو عہدہ داران مقامی و معززین قصبہ موجود تھے جن میں جناب تحصیلدار صاحب و ڈاکٹر محمود حسین صاحب و جناب لچھما ریڈی صاحب معزز رکن ہائیکورٹ و جناب مولوی سید محمد عنایت اللہ خاں صاحب علوی معتمد اتحاد المسلمین (خانہ پور) قابل ذکر ہیں۔ آیندہ سال طلبہ میں خاطر خواہ اضافہ کی امید ہے۔ توقع ہے کہ جناب معتمد صاحب ادارہ و جناب مولوی ثناء اللہ صاحب

د جناب تعلقدار صاحب اور اس سال کے فاضل کے طلبہ امتحانات ادارۂ ادبیات کے لئے خاص طور پر سعی فرمائیں گے۔

مرکز نظام آباد صبح ۹ بجے مولوی غلام احمد صاحب وکیل معتمد شاخ ادارہ سے ان کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ مدرسہ کی عمارت میں امیدواران ذکور و اناث کے لئے علٰحدہ علٰحدہ کمروں میں نشست گاہوں کا انتظام کیا گیا۔ خواتین کے لئے پردے کا معقول انتظام کرنے کے سلسلے میں مولوی حسین خاں صاحب مدرس قلعہ نے بڑی مدد فرمائی اور دفتر مہتمم تعلیمات سے قناتوں اور چلمنوں کی سربراہی کی گئی نیز دو آئین بھی مہیا کی گئیں۔ امیدواروں کی میزوں پر ان کے ناموں کی چٹھیاں چسپاں کی گئیں۔ امتحان گاہ کے جملہ انتظامات میں جناب صدر مدرس صاحب نے میری مدد فرمائی۔ صاحب موصوف ہی کی ذاتی دلچسپی اور توجہ کی وجہ سے بغیر کسی دقت کے سب کام انجام پائے۔

دوسرے روز صبح ½ ۹ بجے مولوی نصیر احمد بیگ صاحب دوم تعلقدار مولوی عبدالرشید صاحب صدیقی مہتمم تعلیمات نائب صدر شاخ نظام آباد اور مولوی غازی الدین صاحب تشریف لائے۔

ان اصحاب کو پرچہ جات سوالات کے سربمہر لفافے بتلائے گئے اور جملہ امتحانوں کی تفصیل بتائی گئی۔ دوم تعلقدار صاحب اور مہتمم صاحب تعلیمات نے سوالات کے پرچے ملاحظہ فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور ارشاد فرمایا کہ پرچے بہت خوبی سے مرتب کئے گئے ہیں۔ بالخصوص اردو عالم کے پانچویں پرچے دفتری معلومات کو پڑھ کر بے حد خوش ہوئے اور فرمایا کہ اس پرچہ سے امیدواروں کو دفتری معلومات حاصل کرنے میں بڑی مدد ملیگی۔ اور تقریباً اکثر اہم دفتری امور کے متعلق سوالات درج ہیں۔ مولوی میر نصرت علی صاحب ناظم عدالت امتحان گاہ پر تشریف لائے اور تمام عہدہ داران کے ساتھ زنانہ و مردانہ مرکزوں کا معائنہ فرمایا آدھے گھنٹے کے بعد یہ اصحاب واپس ہوئے۔ امتحان گاہ کی نگرانی میں مولوی غلام احمد صاحب مولوی غازی الدین احمد صاحب اور مولوی حسین خاں صاحب نصیری مدد فرمائی۔

زنانہ مرکز کی نگرانی کے لئے معتمد صاحب شاخ نے صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ نسواں نظام آباد کو خط لکھا۔ مس مہر اقبال سے معتمد صاحب نے خواہش کی کہ وہ زنانہ مرکز میں بحیثیت صدر نگران کار تشریف لائیں اور محترمہ بیگم صاحبہ میر نصرت علی صاحب کو بھی تشریف لانے کی دعوت دی۔

دوسرے روز ٹھیک پونے نو بجے مہتمم صاحب تعلیمات صدر مدرس صاحب مولوی غلام احمد صاحب اور حسین خاں صاحب بھی تشریف لائے۔ بیگم میر نصرت علی صاحب، مس مہر اقبال اور صدر معلمہ صاحبہ زنانہ مرکز میں تشریف لائیں پونے دس بجے کے قریب ناظم صاحب عدالت تشریف لائے اور میں نے اردو امتحانات سے متعلق تقریر پڑھ کر سنائی۔ زنانہ مرکز میں بیگم میر نصرت علی صاحب کی صدارت میں مس مہر اقبال علی خاں صدر نگران کار نے وہ تقریر پڑھ کر سنائی اور صدر صاحبہ نے حسب ذیل تقریر کی۔

معزز خواتین! آپ صاحبین نے اپنی عنایت سے مجھے اس جلسہ کا جو صدر بنایا ہے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں بھی یہ ضرور کہوں گی کہ مس مہر اقبال نے اپنی تقریر میں جو قیمتی باتیں بیان کی ہیں وہ بالکل حق بجانب ہیں۔ زمانہ کروٹ بدل چکا ہے۔ اس لئے ہم عورتیں جب تک جاہلیت سے نکل کر میدان عمل میں حصہ نہ لیں گی۔ نہ تو شعور زمانہ داری سے واقف ہو سکیں گی اور نہ مردوں کی نظروں میں وقعت پیدا کر سکیں گی۔

ادارۂ ادبیات اردو کا یہ ایک احسان عظیم ہے کہ مردوں کی طرح ہم عورتوں کو بھی دولت علم سے مالا مال کرنے کے لئے باجازت سرکار ملک کے گوشہ گوشہ میں امتحانات کی سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔ اگر اس سے ہم فائدہ نہ اٹھائیں تو یہ ہماری بدبختی ہوگی مستقر نظام آباد پر امتحان لیا جانے کی کامیابی کا سہرا ایک نیک بندۂ خدا مولوی غلام احمد صاحب وکیل کے سر ہے۔ خدا اس کی جزائے خیر ان کو عطا فرمائے۔ اور ہمارے شاہ ظل اللہ کو جن کے سایۂ عاطفت کی یہ سب برکتیں ہیں معہ شاہزادگان بلند اقبال و شہزادیان بلند طالع ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔ آمین ثم آمین۔

مردانہ مرکز میں تقریر سنانے کے بعد مہتمم صاحب تعلیمات سے خواہش کی گئی کہ وہ امیدواروں کو مخاطب فرمائیں۔ میری استدعا پر جناب مہتمم صاحب نے ادارۂ ادبیات اردو اور اردو امتحانات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور اردو امتحانات کی افادیت کو واضح کرتے ہوئے اضلاع کے لوگوں کو ان امتحانات میں شریک ہونے کی تشویق دلائی۔

یہ امر قابل مسرت ہے کہ نظام آباد کے مرکز سے جتنے امیدوار امتحان اردو دانی میں شریک تھے ان میں سے اکثر عمر رسیدہ اور نوجوان تھے۔ زنانہ مرکز میں بھی اکثر شادی شدہ خواتین تھیں جن کے ساتھ دودھ پیتے بچے بھی تھے۔

بڑی مسرت کی بات یہ ہے کہ نظام آباد میں صرف چند ماہ قبل ادارہ کی شاخ کا قیام عمل میں آیا اور اس قلیل عرصے میں ذکور واناث نے یہاں سے کافی تعداد میں امتحانات میں شرکت کی۔ امیدواروں کو شوق دلانے اور ان کی تعلیم وغیرہ کے انتظامات میں مولوی غلام احمد صاحب معتمد مولوی حسین خاں صاحب صدر مدرس و مولوی محمود عالم صاحب مددگار مدرسہ قلعہ نے بطور خاص دلچسپی لی۔ نظام آباد کی خواتین میں اردو امتحانات کی تبلیغ و اشاعت میں مس طاہرا اقبال علی خاں (علیگ) نے بطور خاص دلچسپی لی۔ موصوفہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ ایک اچھی انشاء پرداز اور اردو سے خاص دلچسپی رکھتی ہیں۔ توقع ہے کہ آیندہ سال ان کی توجہ اور دلچسپی سے نظام آباد کی ان پڑھ عورتیں اور دیگر خواتین کثیر تعداد میں اردو امتحانات میں شریک ہوں گی۔

بیگم و مولوی میر نصرت علی صاحب ناظم عدالت، مولوی عبدالرشید صاحب صدیقی مہتمم تعلیمات، مولوی نصیر احمد بیگ صاحب دوم تعلقدار، مولوی سید احمد صاحب صدر مدرس فوقانیہ، مولوی غازی الدین احمد صاحب اور صدر معلمہ صاحبہ بطور خاص شکریے کے مستحق ہیں کیونکہ دوران امتحان میں ہر طرح میری مدد اور امتحان گاہ کے معائنہ کی زحمت اٹھائی۔

مرکز بالا نگر ۲۱ رمہر ۱۳۵۱ف صبح ساڑھے نو بجے مقامی معتبر امتحان اور جملہ امیدواروں کو امتحان گاہ میں جمع کر کے رپورٹ متعلقہ اردو امتحانات کا تیسرا سال سنائی گئی۔ اس کے مقاصد و قواعد اچھی طرح سمجھائے گئے۔ لوگوں نے سن کر بڑی تعریف کی۔ صدر مدرس صاحب مدرسہ تحتانیہ اور ان کے مددگار صاحب کی جانفشاں کوشش ہے کہ طلبہ شریک کرائے گئے یہ لوگ خود اردو عالم کے امتحان میں شریک تھے۔ یہ دونوں اصحاب بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ یقینی طور پر یہ اصحاب قابل تحسین ہیں۔

امتحان کے دوران میں مولوی عبدالعزیز صاحب منشی گرداوری میرے کام میں ہاتھ بٹاتے رہے۔ صاحب موصوف تین روز تک میرے ساتھ برابر امتحان گاہ (مسافر بنگلہ) میں شریک رہ کر نگرانی کرتے رہے ان کے علاوہ مقامی حکیم صاحبان و سیٹھ ساہوکاران میرے کام میں بہت کچھ ہاتھ بٹاتے رہے جس کی وجہ سے میں ان سب کا ممنون و مشکور ہوں

مرکز اورنگ آباد امتحان گاہ کا معائنہ حسب ذیل حضرات نے فرما کر اظہار پسندیدگی فرمایا۔

عالیجناب صوبہ دار صاحب، عالیجناب اول تعلقدار صاحب، رائے چھوٹے لال صاحب ساہو۔ محمد ابراہیم صاحب پروفیسر انٹرمیڈیٹ کالج۔ رضی الدین صاحب ٹاؤن انجنیر۔ جناب غازی معین الدین صاحب معتمد شاخ اورنگ آباد نے زمانۂ قیام میں میری ضیافت نہایت ہی کشادہ پیشانی سے کی۔ اول تعلقدار صاحب نے ٹاؤن ہال کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مولوی غلام ربانی صاحب پرنسپل نے بنیر دو اتیں عنایت فرمائیں۔ غلام جیلانی صاحب ہاشمی لائبریرین کالج نے امتحان گاہ کے انتظام ترتیب نشست نام کے سلپ لگانے اور نگرانی امتحان میں بڑا حصہ لیا۔ مبارک بانو بیگم صاحبہ معلمہ مدرسہ فوقانیہ نسواں نے اناث کی نگرانی فرمائی۔ نور النساء بیگم صاحبہ صدر مہتمہ مدارس نسواں نے مبارک بانو بیگم صاحبہ کو نگرانی کی اجازت مرحمت فرمائی۔

امتحان گاہ کے انتظامات اعلیٰ پیمانے پر تھے۔ امیدواروں میں قابلِ ذکر عبدالنبی امیدوار اردو عالم ہے جس کی عمر ۶۰ سال ہے۔

مرکز کلیانی

میں اور مولوی عبدالصمد صدیقی صاحب ۲۵؍ اگست ۱۹۴۲ء روز سہ شنبہ کی صبح کلیانی روانہ ہوئے اور شام ۵ بجے کے قریب کلیانی پہنچے۔ چندرہ بیس حضرات نے بس کی ہمارا استقبال کیا جو بڑے خلوص اور تپاک کا مظاہرہ تھا۔ کلیانی کے متعدد حضرات سے ملاقات ہوئی۔ نئے حضرات کا ہم سے تعارف کرایا گیا۔ اس کے بعد یہ جلوس مسافر بنگلہ پہنچا اور ہمیں اسی جگہ چھوڑ گیا جہاں دو سال پہلے ادارے کے امتحانات کے سلسلے میں ہمیں ٹھیرنا پڑا تھا۔ چہارشنبہ کی صبح سے امتحان شروع ہونے والا تھا، ہم نے امتحان گاہ کا معائنہ کیا۔ امتحانات کا انتظام حسب سابق مدرسہ کی عمارت میں کیا گیا تھا اور چونکہ کلیانی کے شوقین کارکن پہلے سے تمام انتظامی امور سے واقف تھے، امتحان کے لئے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی گئی تھی۔

دوسرے روز صبح اردو عالم کا امتحان ٹھیک وقت پر شروع ہوا۔ پانچ امیدوار اس امتحان میں شریک تھے۔ دو پرچے ہوئے۔ چہارشنبہ کی شام میں مولوی عطاء اللہ صاحب اور دیگر حضرات تشریف لائے۔ فرمایا کہ آج منصف صاحب اور جناب نواب صاحب کلیانی کے پاس چلنا ہے۔ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد ہم بہت جلد تیار ہو گئے اور ۶ بجے کے قریب منصف صاحب کے مکان پر پہنچے۔ یہاں موصوف، تعلقدار صاحب کلیانی اور تحصیلدار صاحب تشریف فرما تھے۔ چونکہ مولوی سبط نبی صاحب منصف ایک عثمانی طیلسانی ہیں، انھوں نے عثمانیہ برادری کے ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے ہماری آؤبھگت کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم قلعہ جانا چاہتے تھے لیکن بارش اتنی شدت کی تھی کہ تقریباً آٹھ بجے تک ہم کو وہیں ٹھیرنا پڑا۔

پنجشنبہ کی صبح اردو دانی، اردو زبان دانی اور اردو عالم تینوں امتحانوں کے امیدوار جمع تھے۔ اردو دانی اور زبان دانی میں لڑکیاں بھی شریک تھیں۔ اس لئے مدرسہ کے ایک حصہ میں ان کے لئے علیحدہ انتظام کر دیا گیا تھا اور بیگم اسمٰعیل خاں صاحب اور بیگم عطاء اللہ صاحب نے اس کی نگرانی فرمائی۔ امیدوار حسب ہدایت ۹½ بجے جمع ہو گئے۔ ان کے سامنے ایک تقریر کی گئی اور ادارے کے اغراض و مقاصد اور اردو امتحانات کی اہمیت بتائی گئی۔ دوپہر میں اردو زبان دانی اور اردو عالم کا تحریری پرچہ اور اردو دانی کا زبانی امتحان تھا۔ میں نے تحریری پرچوں کی تقسیم کے بعد مولوی عبدالصمد صدیقی، مولوی نوراللہ نوری صدر مدرسہ اور دیگر مدرسین صاحبان وغیرہ کو امتحان گاہ کی نگرانی کے لئے چھوڑا اور اردو دانی کے زبانی امتحان میں مصروف ہو گیا۔ چونکہ اردو دانی میں ۸۴ امیدوار شریک تھے مجھے شام میں ½۴ بجے تک ان کے زبانی امتحان میں مصروف رہنا پڑا۔ آج امتحان کے بعد قلعہ جانے کا ارادہ تھا لیکن ایک تو امتحان دیر سے ختم ہوا اور دوسرے مولوی اسمٰعیل خاں صاحب وکیل اور نوراللہ صاحب نوری و دیگر حضرات ملنے کے لئے آ گئے تھے، اس لئے ہم کہیں نہ جا سکے۔

جمعہ کی صبح اردو عالم کا آخری تحریری پرچہ اور زبان دانی کا زبانی امتحان منعقد ہوا۔ تحریری امتحان کے پرچوں کی تقسیم کے بعد میں زبانی امتحان میں مصروف ہو گیا۔ لڑکیوں کا زبانی امتحان بیگم اسمٰعیل خاں اور بیگم عطاء اللہ صاحب نے لیا۔ جملہ امتحانات ½۱۲ بجے تک ختم ہو گئے۔ نماز جمعہ سے فارغ ہو کر ادارے کا کتب خانہ دیکھنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ شاخ ادارۂ ادبیات اردو کلیانی کا کتب خانہ محلہ قلعہ میں واقع ہے۔ اس کے منتظم مولوی خیرالدین صاحب کے حسن انتظام اور سلیقہ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ کتب خانہ میں باضابطہ رجسٹر اور فہرست وغیرہ موجود ہے۔ ان میں رجسٹر داد و ستد کتب، رجسٹر داد و ستد رسائل، فہرست اخبار و رسائل، فہرست کتب، رجسٹر ناظرین اور کتاب الرائے شامل ہیں۔ ان رجسٹروں کے معائنہ سے بعض دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔ سال ۱۳۵۱ف

میں ابتدائے آذر سے لیکر ۲۲ رمہر یعنی تاریخ معائنہ تک (۳۰۱) کتابیں
اور (۲۴۴) رسائل لوگوں نے گھر پر مطالعہ کرنے کی غرض سے حاصل
کئے۔ اسی طرح ۲۲ رمہر تک ناظرین کی تعداد جنھوں نے کتب خانہ آکر مطالعہ
کیا، پانچ ہزار تھی۔ کتابوں کی ۱۸۰۳ ہے اور اخبار و رسائل جو یہاں مطالعہ
کے لئے رکھے جاتے ہیں، ان میں ہماری زبان، دین و دنیا، سب رس،
اور رہبر دکن وغیرہ شامل ہیں: ناظرین اور مطالعہ کرنے والوں کی یہ
تعداد اس وجہ سے بھی زیادہ قابل لحاظ ہے کہ قریب ہی جامع مسجد کے
نزدیک اتحاد المسلمین کا بھی ایک کتب خانہ موجود ہے۔

یہاں سے واپسی پر مولوی نور اللہ صاحب نوری کی پرتکلف
دعوت میں شرکت کرنا پڑا۔ شام میں ۹ بجے کے قریب مسافر بنگلہ پر
مولوی عطاء اللہ صاحب اپنے ساتھ کلیانی کے چند شاعروں کو لے
آئے۔ ½ ۱۰ بجے تک محفل شعر و سخن گرم رہی۔ مولوی نذیر الدین صاحب
نذیر، مولوی عطاء اللہ صاحب عطار اور دیگر حضرات نے اپنا کلام
سنایا۔ عطار صاحب عمر خیام کے رنگ میں رباعیاں لکھتے ہیں اور خوب
لکھتے ہیں۔ اس محفل سے فارغ ہو کر شام میں مولوی اسمٰعیل خاں صاحب
کی دعوت میں شریک ہوئے۔ حسب روایت قدیم خاص مہمان نوازی کی۔
شنبہ کی صبح میں مسافر بنگلہ پر بہت سے حضرات اپنے ساتھ
پھول لے آئے روانگی سے قبل ایک دو تقریریں بھی ہوئیں اور اس کے
بعد ہم لوگ ½ ۹ بجے صبح کلیانی سے روانہ ہوئے۔ ان لوگوں کے پرخلوص
اور محبت آمیز طرز عمل کی یاد اپنے دل میں لئے ہوئے شنبہ کی شام
میں آٹھ بجے کے قریب ہم حیدرآباد پہنچ گئے۔

اس موقع پر ان حضرات کا تذکرہ ضروری ہے جنھوں نے
ہمارا ہاتھ بٹایا اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ مولوی عبدالکریم صاحب کو میں شاخ
ادارۂ ادبیات کلیانی کی روح رواں سمجھتا ہوں۔ مولوی عطاء اللہ صاحب
عطار کی موجودگی بھی ادارے کے وجود کے لئے ضروری ہے اور موصوف
ہی کی وجہ سے ادارے کا کام اچھے پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ موصوف نے
شروع سے آخر تک ہر طرح ہمارا ہاتھ بٹایا۔ ادارے کے نوجوان کارکن بھی
قابل مبارکباد ہیں جو بڑے شوق و انہماک کے ساتھ کام کرتے اور بڑے فخر
کے ساتھ اردو زبان کی خدمت کرتے ہیں۔ ان نوجوانوں میں مولوی
خیرالدین صاحب، قاضی الدین صاحب، معین الدین صاحب خاص طور پر
قابل مبارکباد ہیں۔ منتظم کتبخانہ مولوی خیرالدین صاحب کے سلیقہ اور
کارکردگی کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ دیگر تمام حضرات نے بھی جن کے
نام مجھے یاد نہیں ہیں، ہر طرح دلچسپی کا اظہار کیا اور ہمارا ہاتھ بٹایا۔
اس خصوص میں کلیانی کے نوجوانوں کا ذوق خدمت گزاری لائق ستائش ہے۔

مرکز کپل

اس سال کپل کا مرکز میرے سپرد ہوا تھا جو حیدرآباد
سے براہ ریل تقریباً چار سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔
امتحانات ۲۶ راگست ۱۹۴۲ء چہارشنبہ سے مقرر تھے اس لئے میں سہ شنبہ
۲۵ راگست کو حیدرآباد سے روانہ ہوا تاکہ شب کو کپل پہنچ جاؤں اور دوسرے
دن یعنی چہارشنبہ سے وقت نامہ کے مطابق امتحانات کا کام شروع
ہو جائے۔ لیکن گنٹکل کے اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ حالیہ فسادات
کی وجہ سے گاڑیاں وقت پر نہیں چل رہی ہیں اور خصوصاً رات کی گاڑیاں
مسدود ہیں۔ مجبوراً مجھے شب کو گنٹکل میں ٹھیرنا پڑا۔
۲۶ راگست چہارشنبہ کو میں تقریباً تین بجے کپل پہنچ سکا۔ تمام
امیدوار اور منتظمین سخت انتظار میں تھے۔ مولوی سید سرفراز علی صاحب سکریٹری
ادارہ چند اساتذہ اور امیدوار میرے استقبال کے لئے اسٹیشن آئے تھے
میرے پہنچنے میں اتنی دیر ہو گئی تھی کہ اسی روز صبح کے پرچے تو کجا شام
کے پرچے بھی انہیں نہ دئے جاسکے کیونکہ پرچوں کے لئے کافی وقت نہیں تھا۔
اس روز تو مجبوراً امتحان ملتوی کرنا پڑا۔ لیکن شام کو مولوی سرفراز علی
صاحب صدر مدرس و مہتمم تعلیمات کپل کے ساتھ مدرسہ گیا جہاں امتحانات
کا انتظام تھا۔ اس کے بعد کپل کے کلب میں مولوی تقی حسین صاحب منصف

سے ملاقات ہوئی۔ موصوف جیسے دیرینہ شناسا ہیں۔ ایک علمی گھرانے کے سپوت ہیں۔ اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں نیز موصوف کو ادارہ ادبیات کی علمی سرگرمیوں سے پوری ہمدردی ہے۔

دوسرے روز ۲۰ اگست سنہ ۴۳ء پنجشنبہ سے امتحان شروع ہوا۔ اردو دانی اور اردو زبان دانی کے امتحان تو اپنے وقت پر ہوئے کیونکہ یہ امتحانات ۲۰ اگست ہی سے مقرر تھے لیکن اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات میرے دیر سے پہنچنے کی وجہ سے وقت پر نہ ہو سکے بلکہ ۲۶ اگست چہارشنبہ کے پرچے ۲۰ اگست کو دئے گئے۔ اسی طرح ہر پرچہ دو دو روز کھلا اور اس کا سلسلہ ۲۹ اگست شنبہ تک چلتا رہا۔ اور مجھے ایک روز اور ٹھیرنا پڑا۔ امتحانات کی نگرانی خاطر خواہ تھی۔ مولوی سرفراز علی صاحب اور مدرسہ کے دوسرے اساتذہ نے نشستوں کی ترتیب اور امتحانوں کی نگرانی میں بہت دلچسپی لی۔ مولوی سرفراز علی صاحب کو ادارہ سے بہت دلچسپی ہے۔ ان کی ذاتی ہمدردی کی وجہ سے ادارہ کی علمی سرگرمیوں میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے اور امتحانات بہت مقبول ہو رہے ہیں۔ مولوی تقی حسین صاحب منصف بھی ۲۰ اگست پنجشنبہ کو امتحان گاہ میں آئے تھے اور ذاتی دلچسپی سے امیدواروں کی حوصلہ افزائی کی۔ چونکہ شنبہ کو مدرسہ کا دن تھا اور مدرسے کی جماعتوں کا حرج ہوتا تھا اس لئے شنبہ کو مولوی سعادت علی صاحب وکیل کے مکان میں جو مدرسہ سے قریب ہے امتحان کا انتظام کیا گیا۔ اس وقت صرف اردو عالم و فاضل کے امیدوار تھے۔ شنبہ کو اردو فاضل کا ایک پرچہ رہ گیا تھا اور اس کا ایک ہی امیدوار تھا اس لئے وہ مدرسہ میں ہی رکھا گیا۔ جن اساتذہ نے امتحانات کی نگرانی کے فرائض انجام دئے تھے وہ یہ ہیں۔ فیض علی صاحب، نارائن راؤ صاحب جوشی، ویربھدرپا صاحب، عبدالسبحان صاحب، حکیم احمد علی صاحب، شرف الدین صاحب، امین الدین صاحب، عبدالرشید صاحب۔ یہ حضرات دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ طالبات کا امتحان مولوی سرفراز علی صاحب کے مکان میں مقرر تھا۔ اردو دانی، اردو زبان دانی اور اردو عالم کے امتحان میں لڑکیاں شریک تھیں۔ اول الذکر دونوں امتحان تو ۲۰ اگست و ۲۸ اگست کو ختم ہو گئے لیکن اردو عالم کا امتحان ۲۹ اگست شنبہ کو بھی ہوا۔ نگرانی خاطر خواہ تھی۔ محل مولوی امین الدین صاحب وکیل نے مرکز اناث کی نگرانی کے فرائض انجام دیئے۔ موصوفہ شکریہ کی مستحق ہیں۔

۲۰ اگست پنجشنبہ کو مولوی تقی حسین صاحب منصف نے مجھے کھانے پر بلایا اور دعوت میں میرے ساتھ تمام سر برآوردہ مقامی عہدہ دار شریک تھے منجملہ ان کے مولوی سرفراز علی صاحب صدر مدرس، مولوی ابراہیم علی بیگ صاحب تعلقدار، مہتمم کوتوالی، اور ڈاکٹر صاحبان شریک تھے۔ ان سب حضرات کو ادارہ کی سرگرمیوں سے دلی ہمدردی معلوم ہوتی ہے۔ تعلقدار صاحب آئندہ سال اپنے فرزند دلبند کو ادارہ کے امتحان میں شریک کرنا چاہتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب خود امتحان میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ ۲۹ کو ویرشیو بورڈنگ کے منتظمین نے مجھے معائنہ کی دعوت دی۔ شام کے چھ بجے امتحانات کے کام سے فارغ ہونے کے بعد میں مولوی سرفراز علی صاحب کے ساتھ بورڈنگ گیا جو ان کے مکان سے قریب واقع ہے یہ ایک چھوٹا اقامت خانہ ہے جو قوم پرست خوش حال اشخاص کی مدد سے لنگایت فرقے کے طلبہ کے لئے قائم کیا گیا ہے اس کے صدر جناب سنگپا صاحب اور نائب صدر ویرنا صاحب خازن سدو سنگپا صاحب اور معتمد سلنگن گوڑہ صاحب ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دیہات کے طلبہ کے لئے جو کپل میں تعلیم پاتے ہیں رہائش کا انتظام کیا جائے۔ اگرچہ اقامت خانہ اس وقت چھوٹے پیمانے پر قائم کیا گیا ہے لیکن اس میں ترقی کے قرائن پائے جاتے ہیں۔ غریب طلبہ کا مفت انتظام ہے اور مستطیع طلبہ سے بہت قلیل رقم لی جاتی ہے۔ اقامت خانہ کے زینوں پر وردی پوش طلبہ نے جو اسکوٹ ہیں ہمیں سلامی دی۔ ہمیں سب انتظام دکھایا گیا اور میں نے اقامت خانہ کے انتظام اور اقامتی زندگی کے متعلق چند ضروری باتیں دریافت کیں۔

بیرونی دالان میں ایک جلسہ ترتیب دیا گیا تھا جہاں طلبہ مقیم و غیر مقیم اقامت خانے کے منتظمین، اور کپل کے دیگر علم دوست حضرات جمع تھے۔ ایک خوش گوار صحبت تھی۔ مجھے کہا گیا کہ میں طلبے کو مخاطب کروں۔ مولوی سرفراز علی صاحب نے پہلے میرا حاضرین سے تعارف کرایا اور اس کے بعد میں نے آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ اس میں میں نے اقامتی زندگی کی اہمیت اور اخلاقی تربیت پر زور دیا اور کرناٹک کی قدیم تاریخ پر روشنی ڈال کر اس بات کو واضح کیا کہ دکن کا قدیم تمدن زیادہ تر اہل کرناٹک کی پیداوار ہے اور اس کی ہر طرح حفاظت کرنی چاہیے اور طلبہ کی اخلاقی تربیت میں ان قدیم تاریخی روایتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

اس کے بعد ہم کلب گئے جہاں تمام عہدہ داروں سے ملاقات ہوئی۔ یہاں ایک مشاعرہ ترتیب دیا گیا جس میں کئی شاعروں نے اپنا کلام سنایا۔ اس ادبی سرگرمی کے بانی مولوی سرفراز علی صاحب ہیں۔ موصوف نے کپل میں اردو کا ذوق بڑھانے کے لئے شعر و سخن کا اچھا مشغلہ شروع کیا اور اب اس کی طرف پڑھے لکھے لوگوں میں رجحان بڑھ رہا ہے اگر اردو کی ترقی دیکھی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ہی اس کے محرک ثابت ہوئے ہیں۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو مجھے تقریر کرنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ تقریر کی اور اس میں ادارہ ادبیات اردو کی تاریخ اور اس کی تمام سرگرمیاں بتائیں۔ اس کی مختلف شاخوں کے لائحہ عمل اور جد و جہد پر روشنی ڈالی اور اس کے بعد امتحانات اردو کی افادیت واضح کی۔ اس تقریر کے بعد حاضرین مولوی سرفراز علی صاحب کے مکان پر روانہ ہوئے جہاں یہ سب رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ تمام مقامی عہدہ داروں کو مجھ سے ملانے کے لئے اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی تھی۔ کھانے کے دوران میں اور اس کے بعد اچھی صحبت رہی اور رات کے دس بجے کے قریب یہ مہمان برخاست ہوئے۔

۳۰ اگست یکشنبہ کی صبح کو میں ماما٘ن جوشی کے ساتھ جو مدرسہ کے مدرس اور تاریخی حالات خوب جانتے ہیں قدیم آثار دیکھنے کے لئے گیا۔ کپل ایک پرانا تاریخی مقام معلوم ہوتا ہے جہاں قدیم اور وسطی زمانے کے کئی آثار پائے گئے اور بعض آثار تو بہت حیرت انگیز ہیں۔ یہاں راجہ اشوک کے عہد کے دو قدیم کتبات پائے جاتے ہیں جو بہت بلندی پر ہیں اور بڑی چڑھائی کے بعد کتبوں تک رسائی ہوتی ہے۔ لیکن کتبوں کو دیکھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دیکھنے کے لئے جس قدر محنت ہو برداشت کرنا چاہیئے۔ یہ کتبات تاریخی معلومات کے بڑے ذخیرے ہیں۔ ان سے راجہ اشوک کی بلند آہنگی اور انتظامی جد و جہد معلوم ہوتی ہے۔ ان کتبات کے علاوہ کپل میں ایک بڑا قلعہ بھی ہے جس کو دکن کے بڑے قلعوں میں شمار کرنا چاہیئے یہ ایک بلند پہاڑ پر بنایا گیا ہے اور اس قلعہ سے سرد و رمیرا کام لیا گیا۔ قلعہ سے قریب اندر قصبے میں کئی بزرگوں کے مزار بھی پائے جاتے ہیں جو وسطی زمانے میں یہاں آئے اور اخلاقی خدمت کی۔ ان مزاروں پر کتبے بھی ہیں جن سے تاریخی حالات معلوم ہوتے ہیں۔

کپل کا موجودہ قصبہ بھی اچھا ہے اس میں صاف ستھری سڑکیں اور اچھے بازار ہیں۔ سرکاری عمارتیں جن میں سرکاری دفتر ہیں اور سرکاری عہدہ دار رہتے ہیں خوش نما ہیں اور مدرسہ کی عمارت بھی اچھی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپل کے نظم و نسق میں بہت دلچسپی لی جاتی ہے اور رعایا کی ضروریات اور دکھ درد کا پورا لحاظ ہوتا ہے۔ تعلیم کا انتظام دیکھ کر بھی بہت دلچسپی ہوئی نہ صرف کپل کے مستقر پر ایک مدرسہ فوقانیہ ہے جس پر کافی روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اپنے حسن انتظام اور ذرایع تعلیم کے لحاظ سے یہ اول درجہ کے مدرسوں میں شمار ہو سکتا ہے لیکن اس کے علاوہ کپل کے پورے ضلع میں بھی کوئی چالیس تحتانی مدرسے موجود ہیں۔ کپل نواب سالار جنگ بہادر کا بڑا ضلع ہے۔ نواب صاحب کو اپنے اسٹیٹ اور اپنی رعایا کے ساتھ گہری دلچسپی اور ہمدردی ہے اور اپنے محاصل کا بڑا حصہ نظم و نسق کو

خوش گوار بنانے میں صرف کرتے ہیں۔ حفظان صحت کا بھی بہت اچھا انتظام ہے دوسرے والیان اسٹیٹ کو نواب صاحب موصوف کی تقلید کرنی چاہیئے۔ ان اچھے تاثرات کے ساتھ ۲۰ اگست کو بھینسہ کو ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے حیدرآباد روانہ ہوا۔ مولوی سرفراز علی صاحب اور مدرسہ کے بعض مدرسین، طلبہ اور مولوی محمد حسین صاحب معتمد ادارہ خداحافظ کہنے کے لئے اسٹیشن آئے تھے۔ میں ان حضرات کا دل سے ممنون ہوں۔

مرکز بھینسہ

۱۹ مہر کو میں بھینسہ کے لئے اسٹیشن باسر پہنچا مولوی عبدالواحد صاحب کلاں وکیل بھینسہ نظام آباد ہی سے میرے ساتھ تھے۔ اسٹیشن پر جناب مولوی مومن الدین صاحب ایم منصف بھینسہ سے ملاقات ہوئی موصوف سے میں نے امتحانات ادارہ ادبیات اردو کا تفصیلاً ذکر کیا وہ ایک ذی علم اور علم دوست عہدہ دار ہیں انھوں نے ادارہ کے کام سے دلچسپی ظاہر فرمائی۔ موصوف کی توجہ سے بھینسہ میں ادارہ کے امتحانات وغیرہ کے کام میں توسیع کی امید ہے۔

بھینسہ اسٹیشن باسر سے ۱۶ میل ہے جب بس اسٹانڈ بھینسہ پر میں پہنچا تو غلام غوث صاحب وکیل ومولوی شجاعت خاں صاحب منتظم پولس وبلیفہ یاب اور طلبہ موجود تھے۔ بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ میری آمد کا انتظار منتظمین وطلبہ ادارہ کو ایک دن پہلے ہی سے تھا میرے پہنچنے پر سب کو بڑی خوشی ہوئی۔ بارش کا سلسلہ یہاں کئی دن سے تھا اس لئے بلالحاظ بارش مجھ کو قیام گاہ تک سب نے پہنچایا۔ جناب مولوی میر ولایت علی صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ نے مدرسہ کی اور صدر معلمہ صاحبہ نے مدرسہ نسواں کی عمارت کی امتحان گاہ کے لئے اجازت دی تھی ۲۰، ۲۱، ۲۲ مہر کو مدرسہ نسواں میں امتحانات ہوئے۔ مولوی بہاء الدین صاحب ومولوی میر شجاعت علی صاحب وکلائے ہائیکورٹ، مولوی میر ولایت علی صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ، مولوی عبدالحفیظ صاحب وکیل مولوی عبدالواحد صاحب تاجر اور صدر معلمہ اور جناب اقبال النساء بیگم صاحبہ معلمہ نے نگرانی امتحانات وغیرہ میں طلبہ کی اور میری ہر طرح امداد فرمائی۔ مولوی غلام غوث صاحب وکیل معتمد ادارہ کی انتھک کوششوں کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ بھینسہ جیسے مقام میں طلبہ کی تعلیم کا انتظام اچھے طریقہ سے ہوئی۔ اور بھینسہ مرکز امتحان قرار پایا۔ اقبال النساء بیگم صاحبہ ادارہ کی جانب سے قابل شکریہ ہیں جنھوں نے طالبات کو اردو دانی اور اردو عالم کی تعلیم دی اور میرے زمانہ قیام میں میرے اور طالبات کے لئے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی۔ مرکز بھینسہ میں امتحان اردو فاضل میں ۲ اردو عالم میں ۲ طلبہ ۳ طالبات اردو دانی میں ۱۰۰ طلبہ اور (۱۰) طالبات شریک ہوئے جنہیں اردو دانی کے صرف ۲ طلبہ غیر حاضر ہوئے بقیہ (۴۰) طلبہ وطالبات نے امتحان میں شرکت کی۔ مولوی محمد ابراہیم خاں صاحب خلیل تحصیلدار کوہیر جاگیر کو ادارے کے کام سے خاص دلچسپی ہے انھوں نے بزمانہ امتحان مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ادارہ ادبیات اردو کی ایک شاخ قصبہ کوہیر میں قایم فرمائیں گے اور آیندہ سال کوہیر سے ایک کثیر تعداد طلبہ کی امتحانات اردو میں شریک ہوگی اور اس طرح مستقر نانڈیڑ سے اپنے فرزندوں اور دیگر شائقین کو امتحانات ادارہ میں شریک کرائیں گے۔ مولوی عبدالسلام صاحب وکیل بھینسہ نے بھی امتحانات کے کام میں خاص دلچسپی ظاہر کی اور شرکت فرمائی۔ امید ہے کہ ان کے اور معتمد صاحب ادارہ کی سعی سے مرکز بھینسہ میں اردو فاضل کے طلبہ کی ایک کثیر تعداد شریک ہوگی۔ یہاں کے وکلا اور عمال و فاتر کو بھی ان امتحانات سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ جامع مسجد بھینسہ میں ادارے سے متعلق میں نے ایک تقریر کی جس میں حاضرین کو عام خواندگی کے اضافہ تعلیم بالغان و امتحانات اردو کی جانب توجہ دلائی گئی اس تقریر کا بہت اچھا

اثر ہوا۔ مولوی عبدالمجید صاحب مدرس نے ایک جگہ تعلیم کا انتظام فرمایا ہے اور مولوی بہاءالدین صاحب وکیل و صدر اتحاد المسلمین بھینسہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ خود مسجد شاہین میں تعلیم کا انتظام فرمائیں گے۔ اور دوسرے مقامات پر بھی تعلیم بالغان کے لئے سعی کریں گے۔ جناب صدر مدرس صاحب وسطانیہ کی توجہ خاص سے یہاں کا مدرسہ تعلیم بالغان کامیاب ہے اور اس کی مزید کامیابی کی توقع ہے۔

جناب مولوی غلام غوث صاحب وکیل قریب میں ادارے کی ایک شاخ بھینسہ میں قایم کرنے کی فکر میں ہیں خدائے تعالیٰ ان کو اپنے اس نیک ارادے میں جلد کامیاب کرے۔

شعبۂ نسواں

شعبۂ نسواں کا بیسواں اجلاس بتاریخ ۳۱ر جولائی ۱۹۴۲ء شام کے پانچ بجے رفعت منزل خیریت آباد میں منعقد ہوا جسب ذیل خواتین شریک تھیں۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، محترمہ سارہ بیگم صاحبہ، محترمہ بشیرالنساء بیگم صاحبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبہ۔

سب سے پہلے مس جیسی نندی کے بے وقت انتقال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

" مس جیسی نندی آنجہانی کی شخصیت سے اہل حیدرآباد نہ صرف باخبر بلکہ اس کی قدر و منزلت کرنے والے تھے۔ علی الخصوص محکمہ تعلیمات جانتا ہے کہ جیسی نندی کی ہستی ملک کے لئے کس قدر وقیع تھی۔ ان کی لیاقت علمی۔ کارگزاری۔ مضبوط کرداری۔ خندہ روئی۔ خوش خلقی۔ انسانی ہمدردی سے قطع نظر کہ اس کو تو ان کے جاننے والے ہی جان سکتے ہیں تعلیم نسواں کے ساتھ ان کی دلچسپی۔ ترقی نسواں کے لئے ان کی ان تھک کوششیں سر رشتہ تعلیمات پر ایسا احسان ہے جس کو تعلیمی دنیا ہرگز نہیں بھول سکتی۔

شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیات اردو بھی مرحومہ کے تعلیمی ۔۔۔ کا بیحد ممنون ہے۔ مدرسۂ تعلیم بالغات اڈیکمیٹ کو سرکاری مدرسہ کا جامہ مرحومہ ہی کے مستعد ہاتھوں نے پہنایا ہے۔

تمام ارکان شعبہ نہایت افسوس کے ساتھ اظہار کرتے ہیں کہ ہم میں سے ایک ایسی چیز گم ہوگئی ہے جو پا تو لی ہی نہیں سکتی یا صدیوں تک آنے والی نسلیں حاصل نہ کر سکیں۔

سالہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود

ہم اہل ملک اہل تعلیمات اور مرحومہ کے اہل خاندان کے لئے پرسوز قرارداد تعزیت پیش کرتے ہیں کہ خدا مرحومہ کی والدہ ماجدہ اور ہمشیرگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔"

۲۔ چندہ رکنیت کے بارے میں دیر تک غور و خوض کے بعد تصفیہ ہوا کہ ادارے سے سفارش کی جائے کہ جو رکن چھ روپے سالانہ ادا کریں انھیں رسالہ سب رس اور جو تین روپے سالانہ دیں ان کو بچوں کا سب رس مفت دیا جائے۔ نیز ادارے کے اکثر معاونین کو قواعد مقررہ کے مطابق ادارے کی مطبوعہ کتب ملنے کا مسئلہ بھی زیر بحث رہا۔

۳۔ مراسلہ نشان (۱۲۱م۴) مورخہ ۲۲ر امرداد ۱۳۵۱ف منجانب صدر مہتمم مدارس بلدہ متعلقہ نصاب تعلیم بالغان پڑھ کر سنایا گیا جس کے بارے میں ارکان کی رائے ہوئی کہ یہ نصاب ہمارے مقررہ اغراض و مقاصد کے خلاف ہے لہذا معتمد صاحبہ اس کے متعلق مناسب مراسلت فرمائیں۔

۴۔ ادارے کے سالانہ اردو امتحانات کے بارے میں یہ تجویز ہوئی کہ حسب ذیل ارکان شعبہ انتظام میں مدد دیں اور امتحان سے ایک ہفتہ قبل انھیں اطلاع نامے بھیجے جائیں۔

محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ، محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، محترمہ سارہ بیگم صاحبہ محترمہ بشیرالنساء بیگم صاحبہ، محترمہ تصدق فاطمہ صاحبہ، محترمہ بلقیس بانو صاحبہ۔

۵۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری کی اس کامیاب ترقی پر کہ جامعہ میسور نے انھیں شعبۂ اردو کا صدر منتخب کیا مندرجۂ ذیل قرارداد تہنیت

پیش کی گئی جو بڑی مسرت سے منظور ہوئی۔

"جناب عبدالقادر صاحب سروری کی خدمت میں جو ادارۂ ادبیات اردو کے مستعد و سرگرم کارکن ہیں اور جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کے پروفیسر ہو کر تشریف لیجا رہے ہیں شعبۂ نسواں کی جانب سے ہدیۂ تبریک پیش کی جاتی ہے۔"

شعبۂ نسواں گلبرگہ

۲۹ اگست ۱۹۴۳ء بروز ہفتہ پانچ بجے شب زنانہ لیڈیز کلب گلبرگہ میں ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے ایک شاندار اجتماع ہوا کلب کے ممبروں کے علاوہ ہر مدارس اور عوام نے بھی شرکت کی۔ ہندو لیڈیز بھی شریک محفل رہیں۔

سب سے پہلے ادارے کی جانب سے صدر کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ جس کو بصد شوق سنا گیا۔

صدر جلسہ و صدر ادارہ محترمہ محمدی بیگم صاحبہ مسز جمیل حسین اول تعلقدار نے ایک دلپذیر تقریر کی جس میں اردو زبان کی اہمیت اور اس "منتشر" زبان کے ذوق کو وسیع کرنے کے فوائد پر بالتفصیل روشنی ڈالی۔ آپ نے ان مشکلات کا بھی ذکر کیا جو ہماری راہ میں سد سکندری بن کر حائل ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ان دقتوں پر عبور حاصل کرنا ہی ہمارا نصب العین ہے۔

پھر معتمد ادارہ حمیدہ بانو صاحبہ مسز اسے کریم خان ناظر تعلیمات گلبرگہ نے ایک پرزور اور موثر تقریر کی۔ ادارے کے مقاصد طریق کار 'امتحانات کی اہمیت' پر اجمالی روشنی ڈالی۔ اور حاضرین کو اشتراک عمل کی پرخلوص دعوت دی۔

مسز علاء الدین صاحب مہتمم تعلیمات' مسز سردار علی صاحب مددگار آبکاری' مسز وزیر احمد صاحب قریشی لکچرار کالج نے پرزور الفاظ میں تائید کی اور ادارے کے مستقبل کو شاندار دیکھنے کی تمناؤں کا اظہار کیا۔

مسز مختار صاحب سول سرجن اور مس بٹ لیڈی ڈاکٹر زنانہ ہاسپٹل نے بھی تائید کی اور دلچسپی لینے کا وعدہ فرمایا بیگمات اور معلمات نے بھی ادارے کے اعلیٰ امتحانات میں شرکت کا شوق ظاہر کیا۔ پھر محترمہ معتمد صاحبہ نے حاضرین کا دلی شکریہ ادا کیا اور جہاں اس "بیٹھتے ہوئے شوق پر اظہار مسرت کیا" وہاں اپنی مدد آپ کرنے" پر مبارکباد بھی پیش کی اور اس طرح یہ شاندار جلسہ جو اپنی نوعیت میں منفرد تھا بخیر و خوبی ختم ہوا۔

شعبۂ نسواں بنگلور

بنگلور کے شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیات اردو نے بسون گٹھی اسلام آباد بنگلور میں تعلیم بالغات کا ایک مدرسہ قائم کیا ہے جس کا افتتاح کرتے وقت محترمہ عقیلہ بیگم صاحبہ ایم آرا ے صدر شعبہ نے ایک تقریر کی جس کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"مجھے نہایت مسرت ہے کہ میری محترم بہنوں حبیب النساء بیگم و رحمانی کی نیک کوشش سے اس مدرسۂ تعلیم بالغات کی فرخندہ بنیاد رکھنے کا فخر حاصل ہوا جس کے لئے میں آپ کی مشکور ہوں۔ علم روشنی ہے اور جہالت تاریکی نور اور ظلمات کبھی یکجا ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔ علم کی طلب حتی الوسع ہر ایک مسلم مرد و عورت پر فرض قرار دی گئی ہے۔ حتیٰ کہ اس مقصد وحید کے لئے حضور اکرم صلعم کا ارشاد مبارک ہے کہ علم چین تک بھی جاؤ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اپنے وطن میں جو ذخیرۂ علم میسر آسکتا ہے اس کو ختم کر کے پھر وطن کے باہر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا لازم ہے۔

بعض تنگ نظر اور وہم پسند لوگوں کا خیال ہے کہ عورتوں کو تھوڑا بہت پڑھنا سکھایا بھی جائے لیکن لکھنا نہ سکھانا چاہیئے۔ یہ ایک بالکل بے بنیاد اور غلط خیال ہے۔ ....

بعض امی لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مسلمانوں کو دنیا کی طلب میں کوشش کرنی ہی نہ چاہیئے بلکہ ان کے لئے انعام و اکرام جیسے حور و قصور اور کوثر و تسنیم سب آخرت پر منحصر ہیں۔ لیکن میری عزیز بہنو! خداوند کریم کی بتلائی ہوئی دعا ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا ربنا عذاب النار۔ سنا کر دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ کیا اس دعا میں خداوند تعالیٰ نے پہلے دنیا

کی بھلائی اور پھر آخرت کی بھلائی اور اس کے بعد عذاب دوزخ سے بچنے کی دعا نہیں تعلیم فرمائی ہے؟ پھر ہم نے یہ شکر گزرت اصول کہاں سے اختیار کر لیا کہ ترک دنیا کر کے آخرت کے انعامات پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں؟ دنیا نہ ملیکا کس کے لئے بھی کوئی مناسب کوشش کرتے ہیں نہ عمل اور انعام حاصل کرنے کے خدا سے امیدوار ہوں۔ وہ فرماتا ہے کہ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ یعنی ہم قوموں کی حالت نہیں بدلتے جب تک کہ وہ آپ اپنی حالت نہ بدلیں۔

پس میری بہنو! اگر ہم مفلس ہیں یا جاہل ہیں یا غیر منظم ہیں تو یہ سب ہماری اپنی بے توجہی غفلت اور بے عملی کا سبب ہے۔ اگر ہم اپنی حالت کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لئے کوشش کرنی لازم ہے۔ بغیر کوشش کے ہمیں کچھ نہیں مل سکتا۔ جناب رسول اکرم صلعم کا ارشاد ہے کہ تمہاری آج کی حالت کل سے بہتر ہو ورنہ تم گھاٹے میں رہو گے۔ یہ مقام مسرت ہے کہ آج آپ کی حالت اس لحاظ سے کل سے بہتر ہے کہ آج آپ نے طلب علم و عمل کی راہ میں ایک عملی قدم اٹھا کر حسنِ نیت اس علمی جلسہ میں شریک ہوئی ہیں اور انشاء اللہ دن بدن آپ بہت جلد زیادہ ترقی کر لیں گی اور امتحانِ اردو دانی کامیاب کر کے اس کی سند اور تمغہ جات طلائی و نقرئی حاصل کریں گی۔

پروفیسر غلام طیب کے تاثرات

مولوی غلام طیب صاحب نے جو ادارۂ ادبیات اردو شاخ اورنگ آباد کے سرگرم رکن ہیں صدر ادارہ کے معائنہ کے بعد اپنے حسب ذیل تاثرات رسالہ نورس اورنگ آباد میں شایع فرمائے ہیں۔

اواخر امرداد میں جب میں حیدرآباد گیا تو مجھے جناب سید محی الدین صاحب قادری زور صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی عنایت سے ادارہ کا کاروبار دیکھنے کا موقع ملا۔

سرگزشتِ ادارہ کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ادارہ اردو ادب کی نہایت مفید خدمت انجام دے رہا ہے لیکن ذاتی طور پر دیکھنے کے بعد میں حیران رہ گیا۔

پہلی بات جس کا مجھ پر غیر معمولی اثر ہوا بانیٔ ادارہ کا خلوص ہے جو اس کے تمام شعبوں میں کار فرما ہے۔ اس کے معاونین اور کارکن سب میں اپنی زبان کا درد پایا جاتا ہے۔ محدود ذرائع اور سرمایہ سے مختصر عرصے میں جو کام انجام دیا گیا ہے اور جو زیر تجویز ہے وہ خلوص اور درد کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کمسن ادارے کی تصانیف کی فہرست بنائی جائے تو منتظمین کے سلیقے کی داد دینی پڑتی ہے پھر ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو مفید نہ ہو۔

ادارے کی دوسری نمایاں خصوصیت کام کی باقاعدگی ہے اس ادارے کو جو کچھ کامیابی ہوئی ہے وہ بڑی حد تک اس کی باقاعدہ کارکردگی کا نتیجہ ہے۔ یہ چیز ہمیں ابھی اہل مغرب سے سیکھنی ہے۔ ہمارے قدیم ادارے کام تو کرتے ہیں لیکن نہ اس میں ترتیب ہوتی ہے نہ کوئی نظام العمل ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔ میں نے بعض مشرقی ادارے دیکھے ہیں جن میں مطبوعہ کاغذات اور کتابیں اس طرح پڑی رہتی ہیں کہ وہ مکان بجاجی کی دوکان معلوم ہوتا ہے گھنٹوں کی تلاش کے بعد وقت پر چیز کا ملنا مشکل۔ اس کے برخلاف اس ادارے میں ہر شعبہ کا حصہ علیحدہ اور باترتیب ہے۔ پرانے کاغذات مخطوطات اور کتابیں باقاعدگی سے رکھی جاتی ہیں۔ ہر شعبہ کی فہرست ہے جس چیز کی ضرورت ہو فوراً مل جاتی ہے۔ بعض پرانی چیزیں نایاب ہیں جن کے مہیا کرنے میں ارباب ادارہ کو یقیناً بڑی محنت کرنی پڑی ہوگی۔ یہ کام جاری ہے اور اس ذخیرہ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جناب زور کے دولت کدہ پر جو ادارے کے لئے وقف ہے میں نے ٹیپو سلطان کے میگذمبر کی زیارت کی اور میر کے فارسی دیوان سے آنکھیں روشن کیں۔

اس عنوان کے تحت اردو انسائیکلو پیڈیا کے کام کا ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کسی زبان میں لغت کا کام ہی صبر آزما ہوتا ہے نہ کہ انسائیکلوپیڈیا کا۔ اس کام کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ کامیابی کا ضامن ہے۔ ہر بہی خواہ اردو کا فرض ہے کہ وہ اس کام میں ادارہ کا ہاتھ بٹائے۔ حیدرآباد کے امرا اگر بیسویں صدی میں

کسی علمی کام کی اعانت کر کے سعادت اور نیک نامی حاصل کرنا چاہیں تو اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا۔

تیسری خصوصیت موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ آج کل اردو تصانیف اور وہ بھی علمی عوام میں بہت کم بکتی ہیں۔ پنجاب والوں کو تو چھوڑیئے اس لئے کہ وہ بازاری ادویہ کا اشتہار بھی چھاپیں تو اس کو کھرے داموں بیچ کر رہیں ورنہ اکثر ادارے اس بات کے شاکی ہیں کہ ادبی تصانیف پر روپیہ خرچ کر کے منافع کمانا بہت مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم اردو میں علمی تصانیف سے جھجکتے ہیں اور اکثر کی مطبع جانے کی نوبت نہیں آتی مگر ادارہ والوں کو خدا جانے کیا دُھن سوار ہے کہ ان کی کتابیں ادارہ پر بار نہیں ڈالتی ہیں اور پھر جب یہ خیال آتا ہے کہ اس میں زیادہ تر نومشق لکھنے والے ہیں تو اس کارگزاری پر بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

ادارہ کا چوتھا کام زبان اردو کے امتحانات (زبان دانی اردو عالم، اردو فاضل، خوشخطی اور خطاطی) کا انتظام ہے۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ یہ امتحانات قبولِ عام حاصل کر رہے ہیں اور ان کے مرکز بڑھتے جاتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ نے اردو کی اصلاح و ترقی کے لئے جو کچھ کیا اس کا کیا کہنا مگر خود نصاب جامعہ میں کسی امتحان کے لئے اردو لازمی نہیں ہے۔ اردو والسنہ کے گروپ کا ایک مضمون ہے جس کو اختیار کرنے میں اکثر طلبہ کو اس لئے تکلف ہوتا ہے کہ بہت سی کتابیں خریدنی اور پڑھنی پڑتی ہیں۔ اس گروپ میں طلبہ کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ ضرورت تھی کہ کوئی ادارہ اردو کے امتحانات کا بیڑا اٹھائے۔ ظاہر ہے کہ امتحانات عام ہوں گے تو یہ زبان بھی پھیلے گی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ امتحانات جن کا معیار اچھا خاصہ ہے بہت جلد حکومت کی توجہ اپنی طرف مبذول کریں گے اور پنجاب اور لکھنؤ یونیورسٹی کے مشرقی اسناد کی طرح یہ بھی جامعہ اور حکومت کی جانب سے

تسلیم کر لئے جائیں گے۔

آخر میں دعا کرتا ہوں کہ خدائے بزرگ حیدرآباد کے اس خادم علم و ادب کو عمر خضر عطا فرمائے تاکہ اس کی زیرِ نگرانی ادارہ ادبیات اردو کی خدمت انجام دیتا اور اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کرتا رہے طلبا سے میں خاص طور پر اپیل کرتا ہوں کہ ادارہ ادبیات شاخ اورنگ آباد کے رکن بنیں اور اس کے کاموں میں حصہ لیں۔

قیام شاخ النَدشریف

شاخ کے قیام کی اجازت صدر مرکز ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد سے وصول ہونے کے بعد انعقاد جلسہ اور قیام شاخ کے لئے مناسب مقام کی تلاش کی فکر رہی اسی جستجو میں چند روز گزر گئے۔ بالآخر باہر پیٹ ہی میں آخری حصہ آبادی میں ایک غیر آباد ویران جگہ اور چوولیاری منتخب کی گئی چہ دیواری کی تعمیر و ترمیم اور میدان کو ہموار کرنے میں کچھ زیادہ دن صرف ہو گئے اب یہ جگہ نہایت ہی پر فضا اور جاذبِ نظر معلوم ہونے لگی ہے۔ اس کو ہم نے اردو میدان کا نام دے دیا ہے اس میں تقریباً چار ہزار نفوس کا اجتماع ہو سکتا ہے۔ ۸ بجے شب سے جلسہ کی کارروائی کرنے کا اعلان کیا گیا تھا جلسہ گاہ میں متعدد پٹرومکس روشن تھے۔ اس جلسہ میں مولوی سید ابراہیم احمد صاحب رضوی بی اے ایل ایل بی دوم تعلقدار صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تھا صاحب موصوف کو باتفاق آرا اس شاخ کا سرپرست گردانا گیا۔ موصوف نے اس ادارہ کی سرپرستی کو خندہ پیشانی اور نہایت فراخ دلی کے ساتھ قبول فرمایا۔ زاں بعد اس جلسہ کی صدارت کے لئے مولوی سید رفیع الدین صاحب ایم اے بی ٹی۔ ایچ صدر مدرسہ وسطانیہ کو منتخب کیا گیا۔ کارروائی جلسہ کا آغاز محمد عبدالرحمن صاحب روغن فروش کی قرأت سے ہوا۔ اس کے بعد محمد عبدالعزیز کمسن خوش الحان طالب علم نے اردو کے عروج و زوال سے متعلق ایک نظم سنائی۔ مولوی سید سلیم الدین احمد صاحب مددگار مدرسہ وسطانیہ نے جو ایک دیرینہ و تجربہ کار مدرس ہیں اسی امتیازی شان کے ساتھ مختصر سی تقریر میں جو تقریباً دس منٹ تک ہوتی رہی

اردو کی اہمیت پر نہایت فاضلانہ تقریر فرمائی۔ اس کے بعد مولوی اکرام الدین صاحب مددگار مدرسہ وسطانیہ نے زبان اردو کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ ولی دکنی کے زمانہ سے اب تک کے تاریخی واقعات اور اس کے گوشوں پر تبصرہ فرمایا۔ اس کے بعد میر حمایت علی عارف متوطن ملدرگ نے تقریر فرمائی۔ آپ نے بھی اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور الند شریف میں اس شاخ کے افتتاح پر اظہار خوشنودی کرتے ہوئے زبان اردو اور اس کی شاعری اور اس کے منازل ترقی پر پہونچانے میں ہندو مسلمانوں کا آپس میں باہم شیر و شکر ہو کر کام کرنا وغیرہ ظاہر کیا۔ اس کے بعد مولوی امیر الدین احمد صاحب وکیل معتمد مجلس اتحاد المسلمین نے اپنی تقریر کو پیشرو مقررین کے اشارات و ارشادات کو ملحوظ رکھ کر اور اشتراک و تعاون عمل کے ساتھ کام کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے ختم کیا۔

تقریر صدارت کے بعد شاخ کے عہدہ داران کے لئے حسب ذیل معزز حضرات کو منتخب کیا گیا جنھوں نے بہ خوشی ان عہدوں کو قبول کر لیا۔ سرپرست جناب دوم تعلقدار صاحب، مولوی محمد ابراہیم صاحب صدیقی سوداگر صدر، مولوی امیر الدین احمد صاحب وکیل نائب صدر، مولوی سید سلیم الدین احمد صاحب مددگار مدرسہ معتمد، عثمان علی صاحب شریک معتمد۔

ارکان محمد عبدالمجید صاحب، عثمان علی صاحب، اکرام الدین صاحب، میر حمایت علی صاحب، جعفر علی صاحب، محمد یعقوب انصاری، عبدالرحیم صاحب صدیقی۔

مولوی عثمان علی صاحب نے مختصر الفاظ میں حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔

قیام شاخ بھوم

ایک جلسہ عام بتاریخ ۲۸ اگست ۱۹۴۲ء بوقت چار بجے شام منعقد کیا گیا جس کی صدارت عالیجناب مہاراجہ سردار سیواجی راؤ صاحب بہادر والئی اسٹیٹ نے کی ڈاکٹر کے نرسنگ راؤ اور مولوی محمد معین الدین صاحب صدر مدرس کی تحریک و تائید صدارت کے بعد حبیب اللہ صاحب قادری نے گزشتہ سال کی روئداد پڑھتے ہوئے اس امر کا اعلان کیا کہ بھوم کو مرکز قرار دینے کے سلسلہ میں اگرچہ انھیں بہت سی دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن وہ حالات سے مایوس نہیں ہوئے۔ بلکہ انھیں اس کام میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی اور آئندہ اس سے بھی زیادہ کامیابی کا یقین رکھتے ہیں میں ان لوگوں کو کسی طرح بھی نہیں بھول سکتا جنھوں نے مرکز کے قیام میں و دیگر انتظامات میں اہم مدد پہنچائی۔ اس خصوص میں ڈاکٹر کے نرسنگ راؤ صاحب اور مولوی محمد معین الدین صاحب صدیقی صدر مدرس جو کہ نظام الدین قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد جناب مولوی شیخ رحیم الدین صاحب کمال ظہیر آبادی صدر نگران کار نے ادارہ کا تعارف کراتے ہوئے اس کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ذکر اور اردو امتحانات کے مقاصد و فوائد نیز آئندہ امکانات بیان کئے۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ بھوم کے مرکز قایم کرنے والوں میں مولوی حبیب اللہ صاحب قادری اور ڈاکٹر کے نرسنگ راؤ میڈیکل افسر اور دیگر شرکا کارکو جن دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے اس سے وہ اور ادارہ ناواقف نہیں ہے۔ یہ دشواریاں بہت کچھ غلط فہمی پر منحصر ہیں جب ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا تو مخالفت خود بخود ختم ہو جائے گی اور کام کرنے والوں کی راہ میں جو دشواریاں حائل ہیں ان سے انھیں کبھی پست ہمت نہ ہونا چاہیے۔ ادارہ ان کی مدد کے لئے ہر طرح تیار ہے اور ان کارکنوں کے ایثار اور خلوص کی قدر کرتا ہے۔ آخر میں صاحب موصوف نے نہایت ہی مسرت سے اس امر کا اعلان کیا کہ مہاراجہ سردار سیواجی راؤ صاحب بہادر والئی اسٹیٹ نے نہ صرف ادارہ کے کاموں اور امتحانات سے دلچسپی کا اظہار کیا بلکہ اس کی شاخ کی سرپرستی بھی قبول فرمائی ہے۔ مسٹر رامچندر راؤ صاحب بی۔ اے ایل ایل بی منصف و مولوی عماد الدین صاحب تحصیلدار و دیگر مقررین کا شکریہ ادا کرتے

ہوئے ان سے خواہش کی کہ وہ آئندہ نہ صرف اس مرکز کے استحکام اور استقلال کے لئے کوشاں رہیں گے بلکہ اطراف و جوانب میں بھی علم کی روشنی کو پہنچانے اور جہالت کی تاریکی کو دور کرنے والوں کے حوصلے بڑھائیں گے۔ اختتام پر دوبارہ مولوی حبیب اللہ صاحب قادری وغیرہ کی پرخلوص خدمات کی ستائش کرتے ہوئے شاخ کے عہدہ داروں کا اعلان کیا۔ مسٹر رامچندر راؤ صاحب بی اے ایل ایل بی منصف نے تقریر کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں اسٹیٹ اور مہارا جہ و دیگر عہدہ داران مقامی کی جانب سے ادارہ اور اس کے صدر نگران کار صاحب امتحانات جناب مولوی شیخ رحیم الدین صاحب کمال ظہیر آبادی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور انتہائی نہایت مسرت سے اس امر کا اعلان کیا کہ وہ ہر ایسی کوشش کو جو ملکی ترقی اور زبان و علم کی ترویج کے لئے ہو قابل مبارکباد سمجھتے ہیں۔ صاحب موصوف نے کہا کہ آج جو معلومات ان امتحانات سے متعلق بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس کے افادے کو پیش نظر رکھتے ہوئے آئندہ سال کے لئے میں اپنے آپ کو بھی امیدوار کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں۔ حاضرین نے صاحب موصوف کے اس اعلان کا تالیوں کی گونج میں خیر مقدم کیا۔ جلسہ کے اختتام سے پہلے ڈاکٹر کے نرسنگ راؤ صاحب میڈیکل افسر نے مہاراجہ سردار سیواجی راؤ صاحب بہادر اور مسٹر رامچندر راؤ صاحب بی اے ایل ایل بی و مولوی عمادالدین صاحب تحصیلدار وغیرہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں مولوی حبیب اللہ صاحب کا نام اس لئے آخر میں لے رہا ہوں کہ وہ اور ان کا کام کسی شکریہ کی خاطر نہیں بلکہ کام کے لئے ہے۔ اس لئے ہمارے شکریہ کے وہ سب سے زیادہ مستحق ہیں اور اس تمام کامیابی کا سہرا انہی کے سر ہے اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

عہدہ داران شاخ ادارۂ ادبیات بھوم جاگیر۔

سرپرست :- رانی گجرا بائی صاحبہ والیۂ اسٹیٹ۔

مہاراجہ سردار سیواجی راؤ صاحب بہادر

مولوی عبدالقادر صاحب قریشی بی اے ایل ایل بی وکیل و ایگزیکٹیو آفیسر اسٹیٹ

اعزازی اراکین :-

۱۔ مسٹر رامچندر راؤ بی اے ایل ایل بی منصف

۲۔ مولوی عمادالدین صاحب تحصیلدار

۳۔ مسٹر رتن سنگھ صاحب منتظم پولس

مجلس عاملہ :-

۱۔ ڈاکٹر کے نرسنگ راؤ صاحب میڈیکل افسر صدر۔

۲۔ مولوی شیخ دریا صاحب نائب صدر۔

۳۔ مولوی حبیب اللہ صاحب قادری معتمد۔

۴۔ مولوی محمود خاں صاحب رکن۔

۵۔ مسٹر گوبند تکارام شالو " "

۶۔ مولوی عیسیٰ خاں صاحب " "

۷۔ سیٹھ نہنو میاں صاحب "

ناگپور میں ترویج اردو امتحانات

ناگپور سے حسب ذیل مطبوعہ اعلان مولوی فیض انصاری صاحب نے روانہ کیا ہے۔

انجمن اشاعت اردو ناگپور کے زیر اہتمام بالغوں کے لئے اردو زبان مفت سکھانے والے ایک شبینہ مدرسہ کا اجرا کیا گیا ہے۔ جہاں قابل مدرس کے ذریعہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے مرتب کردہ نصاب کے مطابق اردو دانی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تین ماہ کے اندر اردو سے ناواقفوں کو اردو سکھا کر اردو دانی کا امتحان دلوا دیا جاتا ہے۔

اردو دانی کے علاوہ اردو فاضل اردو عالم کے امتحانات بھی لئے جائیں گے ان اعلیٰ امتحانات میں شرکت کرنے والوں کو تعلیمی سہولت بہم پہنچائی جائیں گی۔ قواعد و ضوابط امتحان ذیل کے پتہ پر معلوم کیجئے۔

(دفتر انجمن اشاعت اردو، مسلم لائبریری مومن پورہ محمد علی روڈ ناگپور)

اورنگ آباد میں ترویج اردو و امتحانات

محترمہ زہرہ بنت برہان خاں نے حسب ذیل مطبوعہ اپیل شائع کی ہے اور ہم سے استدعا کی ہے کہ ہم بھی اس کو شائع کریں۔

" ادارہ ادبیات اردو اورنگ آباد کا قیام و مرکز امتحان ۱۹۳۵ء میں مولوی قاضی معین الدین صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل کی کوشش سے ہوا جس کے معتمد بھی صاحب موصوف ہی ہیں۔ یہ ادارہ حیدرآباد کے مشہور ادارہ ادبیات اردو کی شاخ ہے جس کے صدر عالیجناب ڈاکٹر نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات اور معتمد ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ ہیں۔ شاخ اورنگ آباد کے سرپرستان عالیجناب سید علی اصغر صاحب بلگرامی صوبہ دار صوبہ اورنگ آباد و نواب سید شہاب الدین خاں صاحب اول تعلقدار ضلع اورنگ آباد و جناب مولوی غلام ربانی صاحب پرنسپل کالج اورنگ آباد اور صدر جناب مولوی محمد عثمان صاحب صدر مہتمم تعلیمات صوبہ اورنگ آباد نائب صدر رائے چھوٹے لال صاحب اور اراکین مولوی محمد صدیق صاحب کنٹرولر اسکول و پروفیسر صاحبان کالج وغیرہ ہیں۔

اردو زبان کی حفاظت و ترقی کے لئے اور ان کی خاطر جو لوگ کسی مجبوری سے مدرسوں میں تعلیم نہیں پا سکتے ان کے واسطے مفید نصاب کے امتحانات اردو دانی۔ اردو زبان دانی۔ اردو عالم۔ اردو فاضل۔ خوشنویسی۔ ادارہ ہر سال لیا کرتا ہے۔ ان امتحانوں میں ہر شخص شریک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۹ء میں (۶۰۷) امیدوار شریک تھے۔ جن میں (۱۴۲) عورتیں اور (۹۸) غیر مسلم تھے۔ کامیاب امیدواروں کو اسناد عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات اور عالیجناب سید علی اکبر صاحب ناظم تعلیمات کی دستخط سے عطا کی جاتی ہیں۔ گزشتہ سال انعام اور اسناد لینے والوں میں ایک صاحب ۶۰ سالہ اور ایک لڑکا ۹ سال کا شریک تھا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں اس ادارہ کے جو امتحانات (۱۴) مرکزوں میں ہوئے ہیں ان میں ساڑھے چودہ سو امیدوار شریک تھے۔

ادارہ کے مفید اغراض و مقاصد اور اہمیت کے لحاظ سے میں اپنے ملک کے ہر علم دوست بھائی اور بہن سے خواہش کرتی ہوں کہ براہ مہربانی ممالک محروسہ کے ہر شہر و تعلقہ و قصبہ میں اس کی شاخ زنانہ و مردانہ اور مرکز امتحانات قائم کرائیں اور ہر گاؤں و شہر میں زیادہ سے زیادہ مردوں عورتوں، بچوں، جوانوں بوڑھوں کی تعلیم کا انتظام کریں اور انھیں ان مفید امتحانات میں شریک کروا کے زبان اردو اور ملک کی خدمت اور یوں براہ ہمدردی ملک میں تعلیم عام کریں۔

ادارہ کے قواعد ایک آنے کا ٹکٹ جناب معتمد صاحب ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد کو روانہ کر کے طلب فرما سکتے ہیں۔"

پٹن میں قیام شاخ ادارہ ادبیات اردو

بتاریخ ۱۹ ستمبر ۱۹۴۱ء بروز شنبہ مولوی غلام حسین صاحب صدیقی معتمد شاخ ادارہ ادبیات اردو پٹن کی تحریک اور چند علم دوست حضرات کے تعاون عمل سے ایک جلسہ بصدارت جناب مولوی محمد قمر علی صاحب وکیل بمکان مولوی سید ظفر مہدی صاحب گنتہ دار پٹن بغرض قیام شاخ ادارۂ ادبیات اردو منعقد کیا گیا اکثر ذی علم اصحاب شریک جلسہ تھے صدارت کے لئے مولوی سید ضمیر الدین صاحب مشائخ نے مولوی محمد قمر علی صاحب وکیل سے درخواست کی اور تائید مولوی محمد ہاشم صاحب ہاشمی نے فرمائی جس کو صاحب معز نے شرف قبولیت بخشا۔

سب سے پہلے مولوی محمد ہاشم صاحب ہاشمی نے قراءت پڑھی اور بعید ازاں نہایت ہی شرح بسط کے ساتھ تقریر فرمائی۔ مقرر صاحب نے فرمایا کہ جس طرح پٹن میں دارالمطالعہ قائم ہے جو بجائے خود اپنے بانیوں کی یادگار ہے اسی طرح اگر ادارۂ ادبیات اُردو کی شاخ بھی قائم ہو جائے تو پٹن کے خوابیدہ علمی ذوق میں بیداری پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ صدر ادارہ نے اردو کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اس کے بعد صاحب ممدوح نے پٹن کی قدامت اور اس کے تاریخی مقام ہونے پر

روشنی ڈالی بعد ازاں یہاں کی چند قابلِ قدر ہستیوں کا ذکر فرماتے ہوئے توجہ دلائی کہ پٹن میں ادارہ کی شاخ کے قیام کے بعد ممکن ہے کہ پھر ایسی ہستیاں پیدا ہوں جن سے پٹن کا نام روشن ہو سکے ۔ زاں بعد اہلِ جلسہ سے مولوی حکیم محمد فخر الدین صاحب (سابق صدر ادارۂ شاخ پرلی) و مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد پرلی کا تعارف کرایا اور ان کی اردو خدمات کو بالتفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ان بزرگ ہستیوں کا ورود پٹن میں ہوا ۔

میری اہلِ حضرات سے درخواست ہے کہ پرلی کی طرح پٹن کو بھی اردو علم و ادب کی خدمت سے سرفراز فرمائیں گے ۔ آخر میں حاضرین جلسہ سے قیامِ شاخ کی استدعا پیش کرتے ہوئے تقریر ختم فرمائی ۔

اس کے بعد مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد شاخ ادارہ پرلی نے حاضرین سے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن اور اس کے بانی عالی جناب ڈاکٹر زورؔ صاحب کا تعارف کرایا جس کے بعد صاحب موصوف نے فرمایا کہ یہ وہی ادارہ ہے جو ۱۹۳۱ء سے اردو کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے ۔ اور تھوڑی سی مدت میں اس ادارہ نے اردو کی ترقی و اشاعت میں پُرخلوص کام کئے اس کے بعد ادارہ کے قیام کے اسباب اور اس کے اغراض و مقاصد کو واضح طور پر ظاہر فرمایا اور پٹن میں شاخ کے قیام کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ میں بہ نسبت پرلی کے یہاں علمی و ادبی ذوق زیادہ پاتا ہوں ۔ اگر یہاں شاخ قائم ہو جائے تو یہ خصوصیت نمایاں ہو جائے گی ۔ اس کے بعد اپنے قابل استاد مولوی حکیم محمد فخر الدین صاحب فخرؔ منشی فاضل کی عالمانہ شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی تقریر ختم فرمائی ۔

بعد ازاں مولانا مولوی حکیم محمد فخر الدین صاحب نے زبان کی اہمیت اور اس کی خصوصیات پر عالمانہ انداز میں جامع اور مدلل الفاظ میں تقریر فرمائی ۔ من بعد صدر صاحب جلسہ نے پٹن میں قیامِ شاخ ادارہ کی ضرورت ظاہر فرماتے ہوئے مولوی شیخ چاند صاحب مرحوم کی یاد دلا کر نوجوانانِ پٹن میں ترقی و جوش عمل کی روح پھونکی اور اپنی بزرگانہ شفقت سے دوش بدوش کام کرنے کا وعدہ فرمایا تاکہ ہمارے حوصلے پست نہ ہونے پائیں ۔ جس کے بعد حاضرین جلسہ نے حسب ذیل عہدہ داری خدمات کا تعین کیا ۔

سرپرست

(۱) مولوی سید قادر پادشاہ صاحب قبلہ مشائخ (۲) مولوی محمد قمر علی صاحب صدیقی وکیل پٹن (۳) مولوی مرزا قربان حسین صاحب (۴) مولوی حکیم محمد فخر الدین صاحب فخرؔ

صدر ۔ مولوی سید ظفر مہدی صاحب گتہ دار پٹن

معتمد ۔ مولوی سید قمر الدین صاحب مشائخ

شریک معتمد ۔ مولوی احمد صاحب ابن حسن صاحب ۔

اراکین

(۱) مولوی محمد ہاشم صاحب ہاشمی (۲) مولوی سید محی الدین صاحب مشائخ (۳) مولوی سید رکن الدین (۴) مولوی محمد عبد اللطیف صاحب صدیقی (۵) مولوی عبد الحمید خاں صاحب (۶) مولوی عبد الحفیظ صاحب ۔ (۷) مولوی احمد عبد السمیع صاحب صدیقی

انتخابات کے بعد مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد پرلی نے شاخ پٹن کے لئے اُردو دانی و اردو عالم کے کورس کی جملہ کتابیں عنایت فرمائیں جس کا شاخ کی جانب سے مولوی محمد ہاشم صاحب ہاشمی نے شکریہ ادا فرمایا اور جلسہ برخاست ہوا ۔

ادارہ

ادارۂ ادبیات اُردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
من کی بپتا ..	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
رند نو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جدت	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو والوں کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
قاعد کی ا و	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	۰	۰
ادی کی ۲ ی	۴۸	۰	۶	۰
مسائل طلبہ	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہر	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۱	۴	۰
دسرتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادہ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
قفس سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
عہد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
ندر وای	۲۴۸	۲	۸	۰
گرد و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہدہ ودد ھا دار	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	
مجرم ناہ	۱۱۲	۱	۰	۰
ندر دن	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
ع ـمر	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
اردو سند ر اور سرود گ	۱۸	۰	۶	۰
اردو عمومی کا ا ما	۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگزشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
مد محمد عوص (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقاں	۳۲	۰	۳	
خطابات	۱ ۲	۰	۱۲	۰
علم ہ مرداری	۱۵۰	۱	۰	۰
سعودی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
شمس بادی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

سب رس

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

سنہ ۱۹۴۲ ع

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین بی۔ اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی۔ ایس۔ سی

جلد ۵ — بابت ماہ ڈسمبر ۱۹۴۲ء — شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین بی اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ زینت منزل خیرت آباد سے شایع ہوا

نظرِ بازگشت

نومبر کے رسالے میں مشاہیرِ ٹیکمال کے مضمون کے سلسلے میں مولوی غلام علی رسا مرحوم کا شجرۂ نسب ضمناً شایع کیا گیا تھا اس لئے اس شجرہ میں تمام افرادِ خاندان کے نام درج نہیں کئے گئے تھے۔ چنانچہ مولوی حبیب الرحمٰن مرحوم تحصیلدار کی اولاد میں حمید الرحمٰن صاحب کا نام چھوٹ گیا تھا۔ اس خاندان سے متعلق ایک مضمون آئندہ شایع ہوگا تو اس وقت مکمل شجرہ بھی شریک کردیا جائے گا۔

محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نے حسب ذیل خط روانہ فرمایا ہے جس کو بجنسہ شایع کیا جاتا ہے۔

بخدمت شریف جناب ایڈیٹر صاحب رسالۂ سب رس!

براہ کرم حسب ذیل مضمون اپنے موقر رسالہ سب رس کی آئندہ اشاعت میں طبع فرماکر مجھے ممنون فرمایا جائے۔

"آپ کے موقر رسالہ سب رس کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۴۲ء میں میں نے جو مضمون بہ عنوان "خلشِ انتقام" طبع کرایا تھا اس کے متعلق مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ یہ افسانہ بالکل غلط اور اصل واقعات سے مغائر ہے جس کا قطعاً علم نہ تھا۔ اور اس سے ہماری سکھ برادری کے احساسات کو صدمہ پہنچا ہے۔ میرا بالکل یہ منشا نہیں تھا کہ اس سے سکھ برادری کے مذہبی احساسات کو ٹھیس لگے۔ لیکن جب ان کو رنج پہنچنے کا مجھے علم ہوا تو اس کو میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتی ہوں کہ میں اس کے متعلق اپنے دلی رنج و افسوس کا اظہار کروں۔ اور سکھ برادری سے معذرت خواہ ہوں۔ نیز سکھ برادری کے پیشرو محترم شری گرو گوبند سنگھ صاحب مہاراج کے متعلق کامل احترام کا اظہار کروں۔

میں نے اس مضمون کا (Hindu Illustrated weekly) سے ترجمہ کیا تھا لیکن اس وقت یاد نہ ہونے سے اس پرچے کے سنہ اور ماہ کا صحیح تعین نہیں کرسکتی۔ لیکن میں اس کی تلاش میں ہوں۔ اور اگر اس کا پتہ چل جائے۔ تو میں اس سے پریسیڈنٹ صاحب صدر گردوارہ صاحب سکھان بلدہ کو مطلع کردوں گی۔

مجھ کو مسرت ہے کہ سکھ برادری نے میری اس معذرت کو قبول کر کے کارروائی ختم فرمادی ہے۔"

جہاں بانو بیگم
لکچرار اردو۔ کلیۂ اناث جامعۂ عثمانیہ

پنڈت دیا نرائن نگم مدیر زمانہ کانپور اور آنریبل سر محمد یعقوب مشیر اصلاحات حیدرآباد کی وفات حسرت آیات پر جانب ادارہ سب رس اظہار تعزیت کیا جاتا ہے۔ دونوں کے دل ہماری مشترکہ قومی زبان کی محبت اور جذبۂ خدمت گزاری سے معمور تھے۔ اور اس طرح دونوں کی وفات نے اردو کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

تاریخ تشکیل شہری

(ہندوستان قدیم)

قدیم ہندوستان کا عظیم الشان تمدن جدید معلومات کے مطابق کم از کم تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے، جس کا بیّن ثبوت بعض اہم اور قدیم شہروں کی کھدوائیوں، پتھر میں تراشی ہوئی عمارتوں اور کتبوں سے ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں اور رومیوں کے دورِ زرین سے کئی سو برس قبل اور آریاؤں کے ورود سے بہت پہلے ہندوستان کے اصلی باشندوں میں تمدن کی جھلک موجود تھی اور منجملہ دیگر علوم کے وہ فنون لطیفہ سے اتنا ہی واقف تھے جتنا کہ جدید مغربی اقوام سائنس سے واقف ہیں۔ ان کی اجتماعی زندگی نہ صرف سماجی تنظیم سے آراستہ تھی بلکہ زمانہ کے رسم و رواج اور طرز معاشرت کے بموجب انھوں نے متعدد شہروں اور بستیوں کو اس سلیقہ سے ترتیب دیا تھا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو دنیا میں قوموں کی ترقی اور تمدن کا معیار ان کی عمارتوں اور شہروں ہی سے ظاہر ہوتا ہے، جو نہ صرف ان کی حقیقی طرز معاشرت اور بود و باش کو واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان کے حوصلوں اور سلیقوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں ان کی سیاست اور تدبر کا اندازہ ان ہی سے ہوتا ہے۔ اگرچہ کہ آج ان کے عالی شان شہر مٹی کے ڈھیر بن چکے ہیں لیکن قدرت نے ان کے تمدن کو اب تک محفوظ رکھا ہے۔

جس طرح دریائے نیل اور دجلہ کے دامن میں دنیا کی متمدن اقوام نے نشو و نما پائی، اسی طرح ہندوستان میں دریائے سندھ اور گنگا کے کناروں کو ان قدیم باشندوں نے اپنے شہروں کے لئے منتخب کیا۔

موہنجوداڑو

چنانچہ سندھ میں موہنجوداڑو کی کھدوائیاں (جن کو آرٹسٹ میاکے نے سرجان مارشل کے زیر ہدایات برآمد کیا ہے) ہندوستان کے دو ہزار سات سو پچاسی سال قبل مسیح کے تمدن کی بھولی ہوئی داستان پیش کرتے ہیں۔ ان حیرتناک انکشافات نے نہ صرف محققین اور مورخین کے اس نظریہ کو کہ ہندوستان کے قدیم باشندے نہایت غیر مہذب اور وحشی تھے بدلنے پر مجبور کر دیا بلکہ ہندوستان کی قدیم تاریخ تمدن میں تیرہ سو سال کا اضافہ کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ آریاؤں کی آمد سے قبل ان قدیم باشندوں نے اپنے موروثی آغوش تمدن میں مدتوں اپنی زندگیاں بسر کی تھیں۔

موہنجوداڑو میں مختلف سطحات کی کھدوائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں متعدد شہر ایک دوسرے پر آباد ہوتے گئے۔ اب تک جو آخری سطح دریافت ہوئی ہے اس کے آثار تقریباً (۲۷۵۰) برس قبل مسیح کے شہر کا پتہ دیتے ہیں یوں تو مزید کھدائیوں سے کئی اور دبے ہوئے شہروں کے طبقات پائے جاتے ہیں لیکن ان کی سطحیں دریائے سندھ کی موجودہ سطح آب کے اس قدر نیچے ہیں کہ ان کی کھدائیاں اب تقریباً ناممکن ہیں۔ برآمد شدہ شہروں کی عمارتوں اور راستوں کی مجموعی ترتیب اور تعمیر نیز آبرسانی اور بدررو کے طریقۂ کار جو متعدد بستیوں اور رہائش گاہوں کی سہولت کے مدنظر با اصول ڈھنگ پر کئے گئے ہیں بجز فنی معلومات اور اعلیٰ ذوق تعمیر کے ہرگز ممکن نہیں۔

نلندا (بہار) اسی طرح ہندوستان کا قدیم شہر جامعہ نلندا موریا دارالحکومت پٹالی پترا سے کئی سو سال قبل موجود تھا۔ یہاں کے فارغ التحصیل بحیثیت مشاہیر و اساتذہ دارالسلطنت پٹالی پتر کو شہری خدمات انجام دینے کے لئے روانہ کئے جاتے تھے۔ مورخین کا خیال ہے کہ
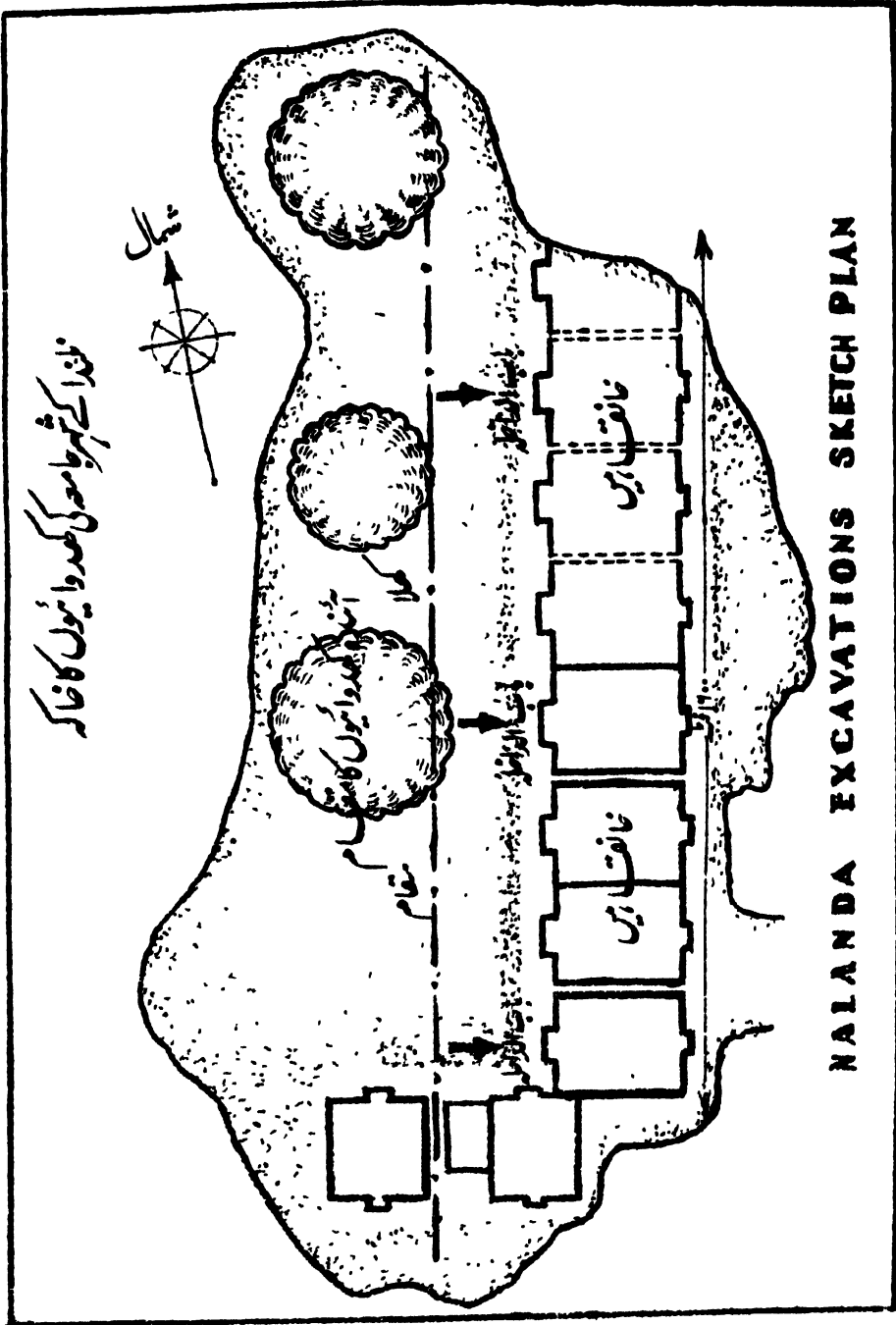
ہندوستان میں اس سے بڑی جامعہ آج تک دریافت نہیں ہوئی۔ جنوبی ایشیاء کے جملہ علاقے اس کے علوم اور فنون سے سیراب ہوئے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ گوتم بدھ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مذہبی مباحثہ کے لئے یہاں کئی مرتبہ آچکے تھے۔ اور راجہ اشوک نے یہاں سب سے پہلے ایک شاندار وہارا (عبادت گاہ) کی بنیاد رکھی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نلندا کو قدیم زمانہ ہی سے مذہبی اور تعلیمی اہمیت حاصل رہی۔ اس کا تعمیری سلسلہ متعدد بادشاہوں کی سرپرستی میں عرصۂ دراز تک جاری تھا۔

یہی وجہ ہے کہ مورخین اور آثار قدیمہ کے ماہرین نے اس شہر کو ایک وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا بتلایا ہے جس کے آثار نلندا کے قرب وجوار میں متعدد مجسموں اور کتبوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مزید کھدوائیوں کے بغیر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا نہایت دشوار ہے۔ اس لئے کہ ساتویں صدی کے اوائل تک اس کی کوئی صحیح تفصیل نہیں ملتی۔ البتہ ۶۲۹ء میں چینی سیاح ہیون تسانگ نے جو یہاں بغرض تعلیم وارد ہوا اور انیس مہینہ قیام کیا اس مشہور جامعہ کی مکمل داستان کو قلمبند کیا ہے اور اس کو تمام مورخین بالاتفاق مستند مانتے ہیں۔

ساتھ ہی آثار قدیمہ کی کھدوائیوں سے اس کی تصدیق ہوتی جارہی ہے۔ ہیون تسانگ جاتی کا بیان ہے کہ یہاں لوگ چین، جاپان اور تبت جیسے دور دراز مقامات سے بغرض تعلیم آتے اور برسوں قیام کرتے تھے۔ اساتذہ اور طلبہ کی تعداد بعض اوقات پانچ ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ عمارتوں کے متعلق اس کا بیان ہے کہ تقریباً پانچویں صدی کے اوائل ۴۱۵ء میں راجہ سکرادیتا (کمار گپتا اول) سے لے کر راجہ وجرا (کمار گپتا دوم) کے زمانہ تک تقریباً پانچ بادشاہوں نے اپنے اپنے عہد میں ویہارا (عبادت گاہ) اور سنگھارام (اقامت خانے اور درس گاہ) تعمیر کئے اور ان کی مالی امداد کے لئے تین سو گاؤں بطور عطیہ وقف کئے۔ ان کے علاوہ اور دوسرے حکمرانوں نے بھی اس میں اضافہ کیا۔ اس طرح اس عالیشان جامعہ میں عبادت خانوں کے علاوہ آٹھ بڑی بڑی درس گاہیں تعمیر کی گئیں جو تقریباً تین سو کمروں پر مشتمل تھیں۔ بعض عبادت خانوں کی بلندی تین سو فٹ تھی اور دیگر عمارتیں تین یا چار منزلہ تھیں۔ ہیون تسانگ کا بیان ہے کہ صبح کے وقت ان کے اونچے اونچے مینار بادلوں سے لپٹے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ان عمارتوں کے علاوہ اس جامعہ میں ایک عظیم الشان "دھرما گنجا" (کتب خانہ) موجود تھا جو تین بڑی بڑی عمارتوں پر مشتمل تھا۔ یہ تینوں رتناساگرا، رتنوداؔدھی اور رتناکرنجیکا سے موسوم تھے۔ رتنوداؔدھی جو صرف مقدس کتابوں سے معمور تھی تقریباً نو منزلہ عمارت تھی۔ آگے چل کر ہیون تسانگ جاتری لکھتا ہے کہ اطراف ایک مضبوط فصیل تھی جس میں تین تین منزلہ عمارت والے چار دروازے تھے۔ جملہ عمارتوں کے آگے بڑے بڑے صحن اور ستون والے ورانڈے تھے۔

اس مشہور جامعہ کی کھدوائیوں کا کام ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر اسپونر نے شروع کیا اور اس عرصہ میں تقریباً پندرہ بڑی بڑی خانقاہیں اور عبادت خانے برآمد کئے۔

یہ عمارتیں اپنی ترتیب میں ایک دوسرے سے متصل مگر متوازی قطاروں میں تعمیر کی گئیں تھیں جن کا طول (۱۶۰۰) فٹ اور عرض (۴۰۰) فٹ مستطیل پر مشتمل تھا۔ اس سے متصل ایک اور قطار شرق کی طرف زاویہ قائمہ بناتے ہوئے تعمیر کی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ

عمارتوں کی ایک دوسری قطار پہلی قطار کے متوازی بنائی گئی تھی۔ اور ان دونوں قطاروں کے درمیان ایک کھلا مقام رکھا گیا تھا۔ ان تمام عمارتوں کی مجموعی ترتیب کا پتہ مزید کھدوائیوں کے بعد ملے گا۔ البتہ یہ یقین ہے کہ برآمد شدہ شہر کی آبرسانی بدررو کی ترتیب نہایت اچھے اصول پر کی گئی تھی۔ جو تقریباً منجودارو سے ملتی جلتی ہے۔ عمارتوں کے خاکے مربع یا مستطیل وضع کے تھے۔ ان کی دیواریں تقریباً سات فٹ موٹی اینٹ اور پتھر کی بنائی گئی تھیں۔ مورخین کے بیان کے بموجب نلندا تقریباً ایک ہزار سال تک عروج پر رہنے کے بعد ہنس اقوام کے ہاتھوں تباہ و تاراج ہوا اور بعد کو سنہ ۱۱۹۹ء میں مسلمانوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

ٹکسلا

ٹکسلا کی کھدوائیوں نے پانچویں صدی قبل مسیح کے اس شان دار بدھ متی شہر کو برآمد کیا ہے۔ جو اپنے زمانہ میں نہ صرف علوم و فنون کا مرکز عظیم تھا۔ بلکہ ایک زبردست تجارتی منڈی بھی رہ چکا ہے۔ اس کا محل وقوع حضرا کے برفانی پہاڑوں کے جنوب و مغرب ہارونڈی کے سرسبز و شاداب وادی میں اس زبردست تجارتی شاہ راہ پر تھا جو وسط ایشیا اور ہندوستان کے درمیان تجارتی حمل و نقل کا اہم ذریعہ تھا۔

شہر نہایت وسیع اور متمول تھا جہاں بڑے بڑے بازار راستوں کے دونوں جانب قرینے سے سجائے گئے تھے۔ یہاں متعدد باغ اور عبادت گاہیں تھیں۔ عمارتوں کے خاکے اکثر و بیشتر مربع یا مستطیل وضع کے تھے جن کی تعمیر کاریاں اعلیٰ درجہ کے نقوش اور مجسموں سے آراستہ تھیں۔ ان عمارتوں کی مجموعی ترتیب مرکزی عبادت گاہ یا درس گاہ کی مناسبت سے نہایت منظم و خوشگوار طریقہ پر کی جاتی تھی۔ آبرسانی کے لئے جا بجا کنٹوں کا انتظام تھا۔

جب سکندر اعظم نے سنہ ۳۲۶ قم اس کو فتح کیا تو اس میں یونانی تمدن کے نقوش بھی ظاہر ہو گئے۔ اس کے بعد چندر گپت اور اشوک کی حکومتوں میں اس کا انتہائی عروج ہوا۔ البتہ مشہور چینی سیاح فاہین نے جب اس کو سنہ ۴۰۰ء میں دیکھا ہے بالکل بے چراغ تھا۔ اس کی عالیشان عمارتیں کھنڈر بن چکی تھیں۔ اس لئے کہ موریا حکومت کے زوال کے بعد ہنس اقوام نے اس کو بھی نلندا کی طرح برباد کر دیا۔

(باقی آئندہ)

فیاض الدین

میرے حالات

مکرمی تسلیم. آپ میرے حالات پوچھتے ہیں. مگر ان میں ایسی کونسی نادر بات ہے جس کو بیان کیا جائے. میں قوم برلاس کا مغل اور عقیدہ کے لحاظ سے سنی ہوں اٹھارویں صدی کے آخر میں میرے پردادا ا پنے والد مرزا جیون بیگ اور ایک بھائی مرزا اکبر بیگ اور ایک بہن کے ساتھ بدخشاں سے ہندوستان آئے. پہلے راجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں مرزا جیون بیگ کمیدان ہوئے. لیکن وہاں نہ بنی تو اکبرآباد چلے آئے اور لارڈ لیک کی فوج میں شریک ہو کر بھرت پور کی لڑائی لڑے. اس کے صلہ میں ان کو دو سو روپے ماہانہ پنشن ہوگئی. میرے پردادا مرزا افضل بیگ دربار دہلی میں مختار کل اور شاہ دہلی اور گورنر جنرل میں واسطہ مقرر ہوئے اور مقرب الدولہ معزز الملک دلاور جنگ بہادر کا خطاب پایا. ان کا انتقال ۳۵ برس کی عمر میں ہوگیا. غدر کے زمانہ میں سارا خاندان چکر میں آگیا. خاندان کا ایک ٹکڑا مرزا اکبر بیگ کے بیٹے مرزا عباس بیگ تعلقدار اودھ کے پاس چلا گیا اور دوسرا ٹکڑا دہلی میں رہا. اس کے بعد خاندان کے سب افراد ایک ایک کرکے حیدرآباد چلے آئے. یہاں آکر شاہ دکن کی نوازش سے اچھی خدمتوں پر مقرر ہوئے اور اب ہمارا سارا خاندان یہیں رہتا. اور شاہ دکن کے دولت و اقبال کو دعا دیتا ہے.

یہ کچھ عجیب بات ہے کہ دہلی آکر میرے بزرگوں کی شادیاں زیادہ تر یہاں کے شعراء کے خاندان میں ہوئیں. مرزا اکبر بیگ کا عقد مرزا غالب کی بہن سے ہوا. مرزا افضل بیگ حکیم مومن خاں مومن کی بھانجی سے بیاہے گئے. ان کے بیٹے اور میرے دادا مرزا علیم اللہ بیگ کی شادی سعادت یار خاں رنگین کی بھتیجی سے ہوئی. اور مرزا جیون بیگ کی صاحبزادی کا عقد خواجہ حاجی خاں سے ہوا جو مرزا غالب کے خاندان میں تھے. ان کے فرزند خواجہ بدر الدین خاں عرف خواجہ امان مترجم بوستان خیال ہیں اور خواجہ امان کی صاحبزادی میری نانی ہوتی ہیں.

یہ تو ہوئے خاندانی حالات. اب میرے حالات سنئے. میں ۱۳۰۳ھ میں خالی کے مہینے کی تیسری تاریخ دہلی میں پیدا ہوا. اس لئے ہمیشہ تین تیرہ کے چکر میں رہ کر خالی ہاتھ رہا اور اب بھی ہوں. انٹرنس تک گورنمنٹ ہائی اسکول میں تعلیم پائی. ایف. اے ہندو کالج سے کیا اور بی اے سینٹ اسٹیفنس مشن کالج میں پڑھا. عربی میں میرے استاد مولوی نذیر احمد مرحوم ہیں. مجھ کو اپنے ذہن اور حافظہ کو اندھا دھند پڑھنے نے ٹھکانے لگا دیا. اور ذہن زمانہ کی کھکیڑوں میں اٹھاکر رخصت ہوا. اب بھی پڑھنے کا سلسلہ جاری ہے. بہت پڑھتا ہوں. مگر یاد کچھ نہیں رہتا ہاں لکھتے وقت کبھی کبھی ان پرانی یادداشتوں کے نقش دماغ میں ابھر آتے ہیں. ورنہ دیکھا جائے تو اللہ کے فضل سے دل و دماغ سنی کے خزانہ کے صندوق ہوگئے ہیں. تعلیم کے زمانہ میں کھیلوں کا بہت شوق تھا. کرکٹ میں نام پایا اور انگریزی میں "غدر کی کہانی. دہلی والوں کی زبانی" لکھ کر کیمبرج سے انعام لیا. ختم تعلیم کے بعد حیدرآباد آکر نوکر ہوا خود داری کی وجہ سے بہت ٹھوکریں کھائیں لیکن کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے ہائیکورٹ کی ججی تک پہنچ گیا. ایک سال ہوا کہ پنشن ہوگئی ہے اور اب مزے سے گزر رہی ہے. اکبر الہ آبادی نے شاید میرے ہی لئے کہا ہے.

فرحت اللہ بیگ کیا کار نمایاں کر گئے — بی اے ہوئے نوکر ہوئے. پنشن ملی اور مر گئے

ان میں سے تین مرحلے طے ہو چکے. چوتھے کو بھی خدا آسان کرے گا.

میرے اردو لکھنے پڑھنے کا سلسلہ حیدرآباد آنے کے بعد شروع ہوا۔ میں نے ابتدا میں اپنے ماموں زاد بھائی مرزا رفیق بیگ کے پرچہ نمایش کے لئے کچھ مضمون لکھے۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق صاحب کی فرمایش پر "مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی" اور "دہلی کا مشاعرہ" لکھا۔ اس کے بعد خیال آیا کہ زبان اردو میں خوش مذاقی (LIGHT HUMOUR) کی کمی ہے۔ اس پر بھی کچھ لکھ ڈالو۔ خیال آنا تھا کہ قلم چلنا شروع ہوا۔ اور آنا چلا آنا چلا کہ ماشاء اللہ چھ جلدیں "مضامین فرحت" کی چھپ چکی ہیں۔ اور ابھی اتنا ذخیرہ باقی ہے کہ بآسانی دو جلدیں اور چھپ سکتی ہیں۔

"مضامین فرحت" کے علاوہ انعام اللہ خاں یقین اور نظیر اکبرآبادی کے دیوانوں کی تصحیح کر کے ان کو انجمن ترقی اردو (ہند) کے حوالہ کیا۔ یقین کا دیوان چھپ چکا ہے۔ نظیر کے دونوں دیوان کچھ دنوں میں نکلنے والے ہیں۔ ڈاکٹر اسپرنگر کے تذکرہ کا ترجمہ کر کے مولوی عبدالحق صاحب کو دے دیا ہے۔ وہ بھی کچھ دنوں میں شایع ہو جائے گا۔ جگ جیون داس ہتہ کی "تاریخ بہادر شاہی" کا خلاصہ بھی بعد صحت طبع کرایا تھا۔ مگر اب یہ کتاب کہیں نہیں ملتی۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر آنجہانی کی ظلما ظلمی شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ بہت کچھ لکھا۔ مگر مجھ سے پوچھو تو یہ سب بیکار ہے۔ نہ میں خود شاعر ہوں اور نہ کسی استاد کا ذلہ ربا۔ جی چاہتا ہے۔ شعر کہتا ہوں۔ جی نہیں چاہتا۔ اٹھا کر پھینک دیتا ہوں۔ اس پر بھی "میری شاعری" کے نام سے ایک دیوان طبع ہو گیا ہے۔ مگر اس دیوان میں نظم سے زیادہ نثر ہے۔ یہ کتاب صرف دوستوں کے لئے چھپوائی تھی۔ انہی میں تقسیم ہو گئی۔ پنشن کے بعد سے اپنی ملازمت کے حالات لکھنے شروع کئے ہیں۔ اس کا نام ہے "میری چونتیس سالہ قید بامشقت کے حالات" میں کوئی ۸۰۰ صفحے لکھنے پایا تھا کہ گورنمنٹ نے پھر سرکاری کام پر لگا لیا۔ اور اس سلسلۂ تصنیف کو بند کرنا پڑا۔ زندگی نے ساتھ دیا تو کبھی نہ کبھی یہ مضمون بھی پورا ہو جائے گا۔ نہیں تو میرے ساتھ اس کا بھی خاتمہ بالخیر سمجھئے۔

لیجئے آپ کی فرمایش پوری کردی۔ والسلام

کمترین

مرزا فرحت اللہ بیگ

بنام ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

نمود زندگی (جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا دوسرا مجموعہ)

سید علی منظور صاحب نہ صرف حیدرآباد بلکہ تمام ہندوستان میں ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں ان کا کلام ہر معیاری اعلیٰ رسالے میں شایع ہوتا رہتا ہے۔ ان کا کلام سادگی و پرکاری، جذب و کشش اور مشاہدات و جذبات کا بہترین مرقع ہے۔ اردو نظم نگاری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری اور مفید ہے۔ صفحات ۲۱۲ قیمت ۸؍

سب رس کتاب گھر سے طلب فرمائیے۔

قلعہ جگتیال

(سلسلۂ آثار دکن)

جگتیال، ضلع کریم نگر کا ایک مشہور اور بڑا تعلقہ ہے، وہاں ایک نہایت عمدہ اور مضبوط زمین دوز قلعہ تعمیر ہوا ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے سارے دکن بلکہ ہندوستان میں بے نظیر ہے۔ یہ آبادی کے شمال مشرقی گوشہ میں واقع ہے جس کا دور تقریباً ایک میل ہے، اس کی تعمیر میں کچھ پتھر اور کچھ اینٹ استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کے دو دروازے ہیں ایک شمال مشرقی گوشہ میں دوسرا جانب غرب ہے قلعہ کی فصیل ۵۰۔۶۰ فٹ بلند اور ۱۰۔۱۲ فٹ عریض ہے اطراف خندق ہے، جس کی گہرائی ۲۵۔۳۰ فٹ اور اسی قدر عریض ہے، دروازے مضبوط لکڑی اور لوہے سے بنائے گئے ہیں، جس کی حفاظت کے لئے جا بجا تیز نوکیلے آہنی میخ جڑ دیئے گئے ہیں ان کے دو جانب آہنی چرخ اور موٹی موٹی زنجیریں ہیں۔ زنجیر کھولنے سے یہ زمین پر بچھ جاتے اور خندق کو پاٹ دیتے ہیں تو ایک قسم کے پل کا کام دیتے ہیں اور زنجیر کھینچ لینے سے پھر بند ہو جاتے ہیں اطراف خندق ہونے سے قلعہ کے اندر داخل ہونا محال ہو جاتا ہے، غالباً بعد میں شمالی دروازہ سے آمد و رفت کے لئے چھوٹا سا پل تعمیر کیا گیا ہے اور غربی دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ دروازے کے قریب ہی ایک چھوٹا سا راستہ خندق میں اترنے کے لئے ہے چھوٹے چھوٹے مضبوط سنگ بستہ سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ فصیل میں جا بجا دراز ہیں۔ ہر دراز میں بڑی بڑی توپیں رکھی ہوئی ہیں۔ توپوں پر "محمد قاسم" کندہ ہے (جو غالباً توپ بنانے والے کا نام ہوگا) با وصف تلاش کے کوئی کتبہ نہ مل سکا، جس سے قلعہ کی تاریخ تعمیر معلوم نہ ہو سکی۔ دور سے قلعہ کی شکل ایک دائرے کی سی معلوم ہوتی ہے، فصیل کے پیچ و خم اس قسم سے بنائے گئے ہیں کہ اگر قلعہ کے اطراف خواہ کسی فاصلے سے اور کسی مقام پر کھڑا ہو کر دیکھا جائے تو وہ مقام برابر پانچ توپوں کی زد میں رہے گا، جو فن تعمیر کا ایک خاص کمال ہے، فصیل کے کنارے کا ڈھال اس قسم کا ہے کہ اگر بندوق سے نشانہ لگایا جائے تو گولی یا تو نیچے لگے گی یا اوپر، لیکن اپنے نشانہ پر نہیں بیٹھ سکتی۔

قلعہ میں ایک سنگ بستہ بڑی باؤلی ہے جس میں اترنے کے لئے دونوں جانب زینے بنے ہوئے ہیں جو "کونیر" کے نام سے موسوم ہے اور ایک تہہ خانہ بھی ہے، جہاں کسی زمانے میں سنگین جرائم کے قیدی رکھے جاتے تھے مشہور ہے کہ اس تہہ خانے سے ایک پوشیدہ زمین دوز راستہ قلعہ سے بہت دور باہر نکلنے کا تھا۔ قلعہ کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جو فاتح سلاطینِ سلف کی یاد میں نوحہ خوانی کر رہی ہے۔ بارود وغیرہ اب تک بھی کوٹھوں میں محفوظ ہے۔ اب سے چار پانچ سال کسی سیاح کی بے احتیاطی سے غالباً جلتا ہوا سگریٹ پھینک دینے سے کوٹھوں میں سخت دھماکا ہوا۔

جب تک قلعہ کے اندر دفتر دوم تعلقداری تھا اور جانان احشام کا پہرہ تھا کافی حفاظت ہو رہی تھی۔ اب وہاں انتظام باقی نہ رہا۔ پرندوں کی بیٹ سے فصیل میں بڑ اور پیپل کے درخت اگ رہے ہیں۔ اگر محکمۂ آثار قدیمہ اس جانب اپنی توجہ مبذول کرے تو مناسب ہے۔

محمد جمال الدین حیدر

قاضی الاولیاء قاضی مہذب الدینؒ

پیدائش قدوۃ الواصلین حضرت قاضی الاولیاء قاضی مہذب الدینؒ ۲ رجب ۶۶۲ھ شب جمعہ بمقام بدخشاں پیدا ہوئے۔ حقایق الاولیا[1] میں درج ہے کہ "پس از ایام معہودہ و مدت معدودہ یعنی نہ ماہ و نہ روز میسر آمد تولد حضرت قاضی الاولیاء در اسعد زمان و بہترین آوان در بلدۂ بدخشاں کہ وطن مالوفۂ بزرگان ایشاں است شب بست و ہفتم رجب سنہ ششصد و شصت و دو ہجری نبوی مقدس یعنی روز جمعہ کہ زمانہ را سعادت و گیتی را بہجت بود بوجود آمد و خانہ افاضت افادت را بہ تہنیت و سرور مباہات و فرح منور ساخت" آپ کے پیدا ہونے سے چند عرصہ قبل آپ کے دادا حضرت شیخ فرید گنج شکرؒ نے اپنے فرزند حضرت شیخ جمال الدین مسعودؒ سے فرمایا کہ مسعود عنقریب تمھارے گھر ایک فرزند پیدا ہوگا جو شہرۂ آفاق ہوگا۔ مصنف حقایق الاولیا نے بھی تحریر کیا کہ "حضرت گنج شکرؒ بحضرت شیخ مسعود میفرمودند کہ در ایام قریب و بزمان سعید فرزند رشید بخانہ شما خواہد شد و بہرۂ فضیلت ظاہر و کمالات باطن خواہد برداشت و بہ اقصا مراتب معرفت الٰہی و غایت ادراک عالم نامتناہی شہرۂ آفاق گردیدہ بدریافت سعادت موانست شیخ المشائخ نظام الدین ولیؒ بداونی بخطاب قاضی الاولیاء ممتاز و سربلند خواہد گشت" اس ارشاد مبارک کے چند عرصہ بعد حضرت شیخ جمال الدین مسعودؒ خواب دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس آراستہ ہے صحابہ کرام تشریف رکھتے ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم امیر المومنین سیدنا حضرت عمر فاروقؓ سے مخاطب ہوکر ارشاد فرماتے ہیں کہ اے عمرؓ تمھارے فرزندوں میں سے ایک مسعودؒ پیدا ہوگا جو کہ مسعود ہوگا اس ارشاد کے بعد حضرت شیخ مسعودؒ کو آنحضرت صلعم نے سامنے طلب فرمایا اور ایک پھول عنایت فرماکر جانے کی اجازت دی۔ حقائق الاولیاء میں اس واقعہ کی تفصیل حسب ذیل ہے "بعد چندے پدر بزرگوار عالم رویا مشاہدہ نمودند کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم با اصحاب و کبار و باہمہ جرین و انصار کہ انوار الٰہی از جبین شان می تافت **بقولہ تعالیٰ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود** در مجلس نشستہ بودند آنحضرت صلعم با امیر المومنین عمر بن الخطابؓ نمودہ امر فرمودند کہ از فرزندان شما مسعود مسعود است از و رکاہ ما ... فرزند ارجمند با و ارزانی و کرامت شدہ است و بیت از جانب کلبیت انوار جاودانی و ستارہ ایست رخشندہ آسمانی ... کیا ... این امر گردد ... حضرت شیخ مسعودؒ بشرف ملازمت قدوم میمنت لزوم ذات مظہر آثار الوہیت و پر تو انوار ربوبیت مشرف شدند آنحضرت صلعم ایشاں را بارشاد کرامت پیش خود طلب فرمودہ گلی از باغ فردوس کہ از شمایم آں سایہ صفا لیشان حضرت معطر بود بدیں عنایات و تفصیلات خود تفویض فرمودہ اجازت رخصت دادند"۔

تسمیہ خوانی و تعلیم آپ کے دادا حضرت شیخ فرید گنج شکرؒ نے آپ کی بسم اللہ پڑھائی۔ تسمیہ خوانی کے بعد آپ نے تعلیم شروع کی اولاً آپ نے اپنے والد کی نگرانی میں قرآن شریف ختم کیا من بعد مولانا حمید الدین ناگوریؒ کے درس و تدریس میں شریک رہے۔ بہت جلد آپ نے استاد کی تربیت اور تعلیم سے تصوف، فقہ، حدیث اور تفسیر میں اعلیٰ

---

[1] حقائق الاولیاء مصنفہ قاضی قیام الدین صاحب قلمی کتب خانہ آصفیہ (۱۲۹۳) فن تاریخ بزبان فارسی۔

مقام حاصل کر لیا۔ مولانا حمید الدین ناگوریؒ کو آپ جیسا شاگرد ملنے پر ناز تھا اور مولانا موصوف کی خاص نظر آپ پر ہمیشہ رہتی تھی۔

بیعت

تیس سال کی عمر یعنی ۶۹۲ھ میں آپ نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ دہلوی سے بیعت حاصل کی اور ایک عرصہ تک اپنے مرشد کی ہدایات کی پابندی کرتے ہوئے مقامات سلوک طے کرتے چلے جا رہے تھے۔ حقائق الاولیاء صفحہ ۲۵۲ پر درج ہے کہ "اکثر مریدان بہ مراتب ولایت رسیدہ اند اما دہ مرید کامل و فاضل خلیفہ صاحب ہدایت و ارشاد شدند یکے امیر خسروؒ دوم خواجہ نصیر الدینؒ سوم برہان الدین غریبؒ چہارم قاضی مہذب الدینؒ پنجم شیخ حسن دہلویؒ ششم سید احمد راجو قتالؒ ہفتم شیخ منتجب الدین زر زری بخشؒ ہشتم اخی سراج الدین کرمانیؒ نہم شیخ شرف الدین بیابانیؒ دہم عماد الدینؒ گویند"۔

دکن میں آمد

آپ کے دکن میں آنے کے متعلق مختلف روایات ہیں۔

روایت اوّل تاریخ الاولیاء مولفہ محمد کلیم اللہ عرف سراج الدین صفحہ ۴۳، پر درج ہے کہ "آپ سات سو پالکی کے ہمراہ دہلی سے اورنگ آباد آئے اور بعد فتح پانے کافروں پر آپ کو خطاب قاضی کا زر زری بخش شیخ منتجب الدینؒ سے عطا ہوا۔ آپ بڑے عالم اور عابد تھے ہزارہا مریدوں کو فیض پہنچا ہے"۔

روایت دوم تاریخ بیجاپور مولفہ بشیر الدین احمد صاحب تعلقدار صفحہ ۲۹۵-۲۹۶ درج ہے کہ "کیج میں حضرت قاضی مہذب الدین صاحب قدس سرہٗ کا مدفن ہونے سے عام لوگ اس قصبہ کو کیج شریف کہتے ہیں۔ حضرت کا گنبد شریف پختہ عمارت ہے۔ حضرت موصوف کے محامد و محاسن و برکات نزدیک و دور مشہور ہیں۔ سنا گیا کہ حضرت کا زمانہ تقریباً سات سو برس کا ہے۔ حضرت زر زری بخشؒ یا برہان الدین اولیاء قدس سرہٗ کے ساتھ اورنگ آباد تشریف لائے تھے اورنگ آباد سے بہ اشارت خاص کیج فائز ہوئے اور یہیں زندگی کے بقیہ ایام یاد خدا میں صرف فرما کر رحلت فرمائی۔ آپ کے وصال کے بہت دنوں بعد آپ کا گنبد تعمیر ہوا۔ اندرون حدود درگاہ عموماً لوگ بہ پاس ادب پلنگ یا چارپائی پر نہیں سوتے"۔

روایت سوم حقائق الاولیاء صفحہ ۲۵۱-۲۵۲ پر لکھا ہوا ہے کہ "شیخ منتجب الدینؒ۔ اور برہان الدینؒ در دکن آمدہ بودند چوں شیخ برحمت حق پیوستند سلطان الاولیاءؒ شیخ برہان الدینؒ پرسیدند کہ عمر شیخ منتجب الدین چہ بود۔ آں چہ بود عرض کردند۔ چوں برہان الدین غریبؒ از زبان مبارک سلطان المشائخ بہ لفظ ماضی ذکر عمر منتجب الدین شنیدند از مجلس برخاستند، برائے فاتحہ ارواح ایشاں خوش بو و شیرینی حضرت آوردند۔ حضرت فرمودند برہان الدین خیر باشد در جواب عرض کردند الخیر فیما وقع۔ سلطان الاولیاء بر ارواح شیخ منتجب الدین فاتحہ خواندند و ہمیں وقت شیخ برہان الدینؒ را با درویشاں صاحب کمال رخصت دکن فرمودند و بر لفظ مبارک راندند کہ آں چہ بود۔ و ایشاں نشستہ اند و استادہ اند ہمہ ہمراہ ایشاں بروند مگر میر خسروؒ کہ ترک او را دل نخواست و نمی خواہد پس اب ارشاد نمود۔ درویشاں را یک یک پیش خود خوانده بخدا سپردہ رخصت کردند و قاضی مہذب الدینؒ را بخطاب قاضی الاولیاء سرفراز فرمودند ہمراہ برہان الدین غریبؒ رخصت فرمودند کہ در تمام درویشاں قاضی ایشاں اند"۔ ہم نے جب پرانے ذخیرے کو اس اختلاف کے نسبت الٹ پلٹ کیا تو معلوم ہوا کہ آپ حضرت برہان الدین غریبؒ کے ہمراہ دکن تشریف لائے چنانچہ تاریخ بیڑ[1] میں یہی درج ہے کہ "یہ قصبہ کیج دھارور سے مشہور ہے۔ اس قصبہ میں شریعت پناہ فضیلت دستگاہ حضرت قاضی الاولیاءؒ کا مزار پرانوار

---

[1] تاریخ بیڑ مولفہ احمد محی الدین صاحب کتب خانہ آصفیہ نمبر (۹۴۲) فن تاریخ اردو مطبوعہ۔

بوسہ گاہ عالم ہے۔ آپ کیج کران کے رہنے والے تھے ۷۲۷ھ میں دہلی سے دولت آباد تشریف لائے آپ کو حضرت نظام الدین اولیاؒ سے ارادت حاصل تھی۔ ہم کو متوسط معتبر روایات سے معلوم ہوا ہے کہ قاضی الاولیاءؒ قصبہ کیج میں ایک مدت تک زندہ رہے اور آپ اسی گروہ کے قاضی تھے جو حضرت برہان الدین غریبؒ کے ہمراہ دہلی سے دولت آباد آیا تھا۔ ۷۴۲ھ تک آپ کا زندہ رہنا ثابت ہوتا ہے اس کے بعد معلوم نہیں کس سنہ میں انتقال فرمایا ہر چند آپ نافذ الحکم قاضی تھے لیکن سماع کو جائز رکھتے تھے اور خود بھی گانا سن لیتے تھے۔"

کیج میں آمد

کیج جینیوں کے زمانہ کا بڑا تیرتھ گاہ تھا جس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ چند سال پیشتر ایک دیوار کی تعمیر کے وقت جب کہ اس کا پایہ کھودا جا رہا تھا مورتی برآمد ہوئی جس کو جینیوں نے ایک سو روپیہ میں خرید کر کنتھل گری تعلقہ کلم ضلع عثمان آباد میں (جہاں جینیوں کا مشہور تیرتھ گاہ ہے) لیجا کر اصلی جگہ پر رکھا اور اس کی پوجا پاٹ کرنے لگے۔ دیکھا تھ جس کا تیرتھ گاہ پرلی میں ہے وہ یہیں کا باشندہ تھا اور اس کی بہنیں کی کئی، کنڈ کالی، کال کالی، جوگائی بھی یہاں پر اور ایک پتھر برآمد ہوا تھا جس پر سنسکرت سے کچھ لکھا ہوا تھا افسوس کہ ایک راج نے اس کے حروف مٹا کر پتھر کو مسجد کے منبر پر لگا دیا سنا گیا کہ اس پتھر کا اصلی عکس ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے بزمانہ مہتمی تعلیمات بہ عین دورۂ کیج لیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کیج کی سرزمین میں آپ کے آنے سے پیشتر خدا کا نام لینے والا کوئی نہیں تھا جس وقت آپ کیج داخل ہوئے تو آپ کو ہندوؤں نے بہت دق کیا آپ ان سے لڑتے رہے۔ آخرش ان پر کامیابی حاصل کی۔

اس کے بعد کیج کی سرزمین اسلامی پرتو سے منور ہو گئی۔ آپ کے ساتھ ہزارہا مرید تھے یہ سب کے سب کیج ہی میں رہے۔

وصال

آپ کے وصال کی صحیح تاریخ ہمیں بھی معلوم نہیں ہوئی اور نہ حقائق الاولیاء میں درج ہے اور نہ پرانے کاغذات میں جہاں تک ہم نے دیکھا نظر آئی۔ اس لئے ہم کو بھی تاریخ بیڑ کے مولف احمد محی الدین صاحب کے بیان سے اتفاق کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۷۴۲ھ تک زندہ رہے اس کے بعد معلوم نہیں کس سنہ میں وصال ہوا۔

اولاد

آپ کو ایک فرزند اور ایک لڑکی تھی۔ شجرۂ خاندان آخر صفحہ پر درج ہے۔ حضرت قاضی شفاع الدینؒ اور حضرت نور النساءؒ۔ پرانے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سلطان محمد تغلق شہنشاہ ہند حضرت قاضی شفاع الدینؒ کے مرید خاص تھے۔ اس خاکسار کا سلسلۂ نسب حضرت قاضی شفاع الدین صاحبؒ سے پندرہویں واسطہ پر ملتا ہے۔

حضرت نور النساءؒ کا مختصر حال ایک شکستہ کاغذ پر ملا ہے جس کا اندراج یہاں نامناسب نہ ہوگا "خود را گوشۂ صحرا سکونت اختیار کردند اکثر جانوران ...... می آمدند ..... و ہرگز بہ ایشاں مضرت نمی رسانیدند حضرت نور النساءؒ مدت ہفت سال بیک وضو بیاد الٰہی نشستہ بودند۔ می گویند کہ مواجہ ہائے ...... از ہر چہار سو برآمدہ زمین . .... آں را در زبان ہندی ..... می گویند برائیاں .... کردند مدتے ہمیں قسم ایشاں اندروں ..... زمین بودند و چشم ہائے خود باز نکردند خود حضرت قاضی الاولیاؒ از سفر باز آمدید و در آں صحرا رسیدند .... کرامات ...... ہمیں ..... باید طلبید ہمہ درویش در صحرا می کردند ....

خلیفہ

آپ کے خاص خلیفہ حضرت شہنشاہ شاہ کوچک ولیؒ ہیں (جن کا مزار بیڑ میں بوسہ گاہ خلائق ہے) تاریخ الاولیا جلد دوم صفحہ ۲۴۴، میں درج ہے کہ "بابا شاہ کوچک صاحب خوارق و عادات تھے۔ ریاضت شاقہ میں مشغول تھے آپ مرید و خلیفہ قاضی مہذب الدین کے ہیں۔"

حقائق الاولیا اور پنج گنج کے مولف نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔ حضرت شاہ کوچک ولیؒ اپنے مرشد کی خدمت میں ایک عرصہ تک رہے اور ریاضتیں کیں آخر ش حصول نعمت کے بعد حسب الحکم مرشد ۳۲۵ھ میں بیڑ روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں منہ کیج کی جانب اور پشت بیڑ کی طرف کئے ہوئے راستہ طے فرماتے تھے۔"

حضرت خواجہ گیسو درازؒ کی کیج میں آمد

حضرت سید محمد گیسو درازؒ کیج شریف بغرض ملاقات حضرت قاضی الاولیاؒ تشریف لائے تھے، لیکن آنے کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت قاضی الاولیاؒ کا وصال ہو چکا ہے اس لئے آپ نے حضرت قاضی شفاع الدین صاحبؒ سے اجازت چاہی کہ بیڑ جانے کی اجازت دیں چنانچہ حقائق الاولیاؒ صفحہ ۴۰۲۔۴۰۳ میں درج ہے کہ "بعد زیارت فاتحہ وختم قرآن روانہ سمت گلبرگہ شدند و بہ رہنموئی مرشد دش بہ ملاقات قاضی الاولیاؒ قاضی مہذب الدین قدس سرہٗ بہ قصبۂ کیج شریف تشریف آوردند۔ چنانچہ قاضی الاولیاؒ نیز برحمت حق واصل شدہ بودند وقت رحلت بہ حضرت شفیع الملت والدین کہ خلف جانشین بودند فرمودند کہ ہرگاہ سید محمدؒ خواہند رسید از ایشاں ملاقات نمایند و بقصبۂ بیڑ رخصت سازند کہ با خواجہ ابو الفیض شاہ کوچکؒ ملاقات کنند۔ آنچہ از اسرار الٰہی وانوار حضرت ناتمناہی کہ سپرد امانت وارشاد وہدایت القا است بالمشافہ گزارش خواہند آورد۔ بحسب مقسوم از مخزن الانوار یعنی بمعدن انوار صوری منتقل گردد۔"

پرورش یافتہ

مولف تاریخ بیڑ نے لکھا ہے کہ اباجی خوش باش قاضی مہذب الدین قاضی الاولیاؒ کا پرورش یافتہ تھا جس وقت حضرت قاضی الاولیاؒ نے باباکوچک کو رخصت فرمایا اس وقت اباجی آپ کے ہمراہ کر دیا گیا تھا اور اس کو قاضی الاولیاؒ نے وقت رخصت یہ کہا کہ (باباکوچک خوش باش) اس روز سے اباجی کا لقب خوش باش کے ساتھ مشہور ہوا۔ اباجی کی قبر حضرت شاہ کوچک کے پائین میں واقع ہے۔

کرامت

آپ کے گنبد مبارک میں مکھی نظر نہیں آتی۔ اگر آپ کا حسب ذیل نام لے کر کوئی شخص مکھی کھالے تو قے کبھی نہ ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قاضی مہذب الدینؒ سچے　　　جو کھائے سو بچے
قاضی مہذب الدینؒ لال　　　نہ رہے مکھی نہ رہے بال

دیگر۔ ڈھائی سو سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ مجاہد نامی ایک ظالم شخص نے حضرت محمدؒ مادرویش دہلویؒ (جو کہ عالم اور متقی تھے جنھیں سورۂ حدیدہ کا عمل یاد تھا اور جو قاضی امام الدین صاحبؒ کے بہنوی تھے) کو درگاہ شریف میں رات کے دو بجے جب کہ آپ نماز تہجد میں مشغول تھے شہید کر دیا دوسرے دن علی الصباح عنایت جاروب کش بغرض جاروب کشی درگاہ شریف آیا دیکھا پریشان ہوا لوگوں کو بلوایا۔ لوگوں نے عنایت پر ہی شبہ کیا کہ اسی نے ان کو شہید کیا ہر چند عنایت اپنی بے گناہی بتلاتا تھا لیکن لوگ کب ماننے والے تھے۔ آخر کار عنایت کو پکڑ لیا کہ اتنے میں گنبد سے آواز آئی کہ "چھوڑ عنایت پکڑ مجاہد" اس آواز پر سب لوگ متحیر ہو گئے ابھی حیرت ہی میں تھے کہ پھر دو مرتبہ آواز اسی قسم کی آئی۔ اس کے بعد خود مجاہد نے آکر اپنے جرم کا اقبال کیا اور کہا کہ جب حضرت خواجہ صاحبؒ کو یہ منظور ہے کہ میں ظاہر ہو جاؤں تو بھلا میں کیسے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ حکام وقت نے اسے قتل کا حکم دیا۔ مجاہد اتنا طاقتور قوی ہیکل جوان تھا کہ جلاد کے دو وقت مارنے پر بھی

اس کی گردن پر ایک اینچ کا زخم نہ آیا آخرش محمد ما درویش کے فرزند نے اسے تیغ دفتح آباد کے درمیان ایک ٹیلے پر (جہاں کہ اس کو قتل کرنے کے لئے لیجایا گیا تھا) گلے پر تلوار چلائی اور یہ اپنے کیفر کردار کو پہونچ گیا۔

گنبد مبارک حضرت قاضی شفاع الدینؒ کی ایما اور سلطان محمد تغلق کے حکم سے گنبد مبارک تیار ہوا۔ گنبد مبارک کے پتھر از منۂ قدیم کے ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۳۱۷ھ میں آپ کے گنبد مبارک پر بجلی گری اور تین مرتبہ مزار اقدس کی زیارت کرکے واپس چلی گئی۔ بجلی کے گرنے سے چاندی کا شمعدان جل کر بھسم ہو گیا۔ باوجود گنبد میں شگاف آنے کے گنبد ابھی اصلی حالت ہی میں ہے۔

عرس شریف آپ کا عرس شریف ۹ ربیع الاول تا ۱۱ ربیع الاول ہوتا ہے۔ عرس میں فقرا و زائرین کثیر تعداد میں آتے ہیں پانچ روز تک لنگر رہتا ہے۔

چاندنی اندرون گنبد مبارک اندرون گنبد مخمل کی چاندنی ہے یہ ایک عزیز اسعد الدین صاحب متعلقہ نے چڑھائی ہے جو اچھی حالت میں ہے۔

عطائے انعامات حضرت قاضی الاولیاءؒ کے عرس وغیرہ وگل کے لئے ہمت خاں و مفتخر خاں و شہنشاہ عالمگیرؒ و اسد خاں مرید شاہ عالمگیرؒ نے سندیں دیں جن کی نقلیں درج ذیل ہیں۔

اللہ اکبر   آلہی

خلد مکان   قاضی مہذب الدین قدس اللہ سرہ نبیرہ شیخ فرید گنج شکر قدس اللہ سرہ

نقل

فرمان والاشان عہد حضرت   پیش از جلوس از قرار تاریخ ہفت دہم ذیحجہ ۱۰۲۶ ہجری

بارک آنکہ دریں وقت نشان عالی شان شرف صدور و عز ظہور یافت چوں بعرض رسید بموجب اسناد حکام سابق موضع سالیگاؤں در روبست با مقدمی و موازی بست چاور زمین نگر از سواد قصبۂ تیغ معمولہ پرگنہ فتح آباد عمارو در وجہ اخراجات عرس و لنگر فقرا و روشنائی درگاہ متبرکہ حضرت و مدد معاش قاضی امام الدین سجادہ نشین وغیرہ فرزندان و مجاوران و خادمان درگاہ مقرر است ۔ در نیولا مشار الیہ وغیرہ بحضور آمدہ و معلوم شد کہ وجہ معیشت ایں جماعہ کثیر و اخراجات درگاہ بہمیں مقرر بود الحال اوقات بعسرت میگزرانند۔ امر والا قدر شرف نفاذ یافت کہ موضع مذکور در روبست با مقدمی و آراضی بست چاور زمین نگر از سواد قصبہ مسطور از نصف ربیع ئیلاں ئیل از روبہ اخراجات درگاہ و مدد معاش مشار الیہ وغیرہ بموجب ضمن مقرر باشد کہ حاصلات آں را فصل بفصل سال بسال صرف معیشت خود ہا نمودہ بدعاگوئے دوام دولت ابد پیوند اشتغال نمائند۔ باید کہ حکام و عمال و جاگیرداران و کروڑیان حال و استقبال در استمرار و استقرار حکم والا کوشیدہ موضع مذکور و اراضی مسطور را بہ تصرف آنہا واگزارند اصلاً تغیر و تبدیل بداں راہ ندہند و بہ علت مالوجہات و اخراجات مثل مسلعہ و پیشکش و جریبانہ و ضابطانہ و مہرانہ و داروغانہ و بیگار و شکار و دہ نمی و صدی دو و نی و قانون

گوئی و کل تکالیف دیوانی مطالبات سلطانی معاف مرفوع القلم دانستہ مزاحمت نرسانند و ہر سال سند مجدد نطلبند و اگر در محل دیگر چیزی واشتہ باشد آں را اعتبار نہ کنند تحریر صدر رستہ صدر
آلہی

مقرر شرح ضمن

از قرار یادداشت واقعہ تاریخ روز چہار شنبہ ششم شہر ذیحجہ سنہ ۲۶ جلوس مبارک موافق سنہ مطابق دو ثم از داوہ اہ الہی سالہ صدارت پناہ فضائل دستگاہ صداقت و معارف آگاہ حکیم محمد ہاشم و نوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان عبدالرحیم آں کہ بعرض عالی رسید کہ بموجب سند نظام الملک و ملک عنبر و سند شرف الدین ہمت خاں و معتنحر خاں دیوان و جان سپار خاں وغیرہ حکام سابق موضع سلے گاؤں ددوبست با مقدمی و موازی بست چاور زمین نگر از قصبہ کیج پرگنہ دھارور در وجہ اخراجات عرس و لنگر و فقراء و روشنائی درگاہ متبرکہ حضرت و مدد معاش قاضی امام الدین ولد قاضی حسن سجادہ نشین وغیرہ فرزندان و مجاوران درگاہ مقرر است. مشار الیہ وغیرہ بحضور آمدند و معلوم شد کہ وجہ معیشت ایں جماعہ کثیر و اخراجات درگاہ بر ہمیں مقرر بود الحال اوقات بعسرت تمام می گزرانند امر عالی متعالی صادر شد کہ موضع مذکور ددوبست با مقدمی و اراضی بست چاور زمین نگر آلہی از قصبہ مسطور در وجہ مصارف درگاہ متبرکہ و مدد معاش مشار الیہ وغیرہ بفراغ خاطر بدعا گوئی دوام دولت ابد پیوند اشتغال می نمودہ باشند بموجب تصدیق یادداشت قلمی شد شرح بہ خط وزارت پناہ کفایت دستگاہ قابل العنایت والمرحمہ والاحسان مدار المہامی حقوط اہر آنکہ داخل واقع نمایند. شرح دیگر بخط مدار المہامی آں کہ بعرض عالی رسانید شرح بخط عرض مکرر آنکہ بتاریخ دوئیم شہر ذیحجہ سنہ ۲ جلوس مبارک مطابق سنہ مکرر بعرض عالی متعالی رسید شرح بخط مدار المہامی آنکہ نشان عالی شان قلمی نمایند.

دہ در و بست با مقدمی زمین چاور زمین نگر الہی از قصبہ کیج مذکور ہ | شرح بخط صاحب رسالہ آنکہ: داخل واقعہ نمایند شرح دیگر بخط رسالہ آنکہ ثانی فی الحال اگر مشار الیہ وغیرہ بحسن سعی و تردد خود با آباد ساختہ باغ ہا

بسازند مزاحمت نرسانند.

اللہ اکبر

الہی | ظل سبحانی | قاضی مہذب الدین قدس سرہ

نقل

پروانہ بمہر اسد خاں مرید شاہ عالمگیر | مرقوم بست و ہفتم شہر رجب سنہ ۳

گماشتہ ہائے جاگیرداران و متصدیان و مستقبل و دیسمکہاں و دیسپانڈیاں پرگنہ فتح آباد عرف دھارور سرکار مذکور صوبہ خجستہ بنیاد دانند بموجب فرمان والا شان قبل از جلوس مرقوم ہفت دہم شہر ذیحجہ سنہ ۲۶ و سند بہ مہر ہمت خاں و معتنحر خاں جاگیرداران سابق عہد حضرت برطبق اسناد حکام دکن موضع سالیگاؤں در و بست با مقدمی و موازی بست چاور زمین نمارج جمع نگر از سواد قصبہ کیج پرگنہ مذکور در وجہ اخراجات عرس و عود و گل و روشنائی درگاہ و لنگر فقراء و مدد معاش بنام قاضی امام الدین ولد قاضی حسن سجادہ نشین وغیرہ فرزندان و خادمان و مجاوران قدوۃ العارفین حضرت | مقرر است. درینولا مشار الیہ وغیرہ بہ حضور پر نور رسیدہ بعرض مقدس معلیٰ رسانیدند کہ گماشتہ ہا

جاگیرداران پرگنہ مسطور بہ معاش دعاگویان مزاحم و متعرض می شوند امر جلیل القدر صادر شد کہ موضع مذکور در روبست اراضی قصبہ مزبور بدستور سابق تر
این ہا مقرر داشتہ مزاحم نشوند لہٰذا موضع مسطور در روبست بامقدمی و موازی بست چاور زمین از سواد قصبہ مذکور مفصلہ فی ضمن بدستور سابق بحال و
مسلم داشتہ شد. سبیل جاگیرداران و زمینداران پرگنہ مرقوم آن کہ برحکم فیض شیم عمل نمودہ کل تکالیف دیوانی و مطالبات سلطانی معاف و مرفوع القلم
دانستہ بہ ہیچ وجہ من الوجوہ مزاحم و متعرض احوال آں ہا نشوند باید کہ موضع مذکور و در روبست بامقدمی و اراضی قصبہ مسطور بہ تصرف مشار الیہ وغیرہ واگزارند
کہ محصلات آں را صرف اخراجات درگاہ متبرکہ و معیشت خود ہا نمودہ بدعاگوئی دوام دولت ابد پیوند مواظبت می نمودہ باشند اگر در محل دیگر چیزی
داشتہ باشند از اعتبار ساقط کنند درینباب تاکید تمام و قدغن بلیغ دانستہ حسب المسطور بہ عمل آرند تحریر صدر سنہ صدر۔

قاضی مہذب الدین صاحب قدس سرہٗ

الٰہی

خلل سبحانی

ضمن نویسہ (ہ)

مقرر شد بموجب فرمان والا شان قبل از جلوس حضرت وسند بہرہمت خاں و مفتخر خاں جاگیرداران سابق عہد حضرت
بر طبق اسناد حکام دکن موضع سالیگاؤں در روبست بامقدمی و موازی بست چاور زمین خارج جمع تنگر از سواد قصبہ کیج
پرگنہ دہارور صوبہ خجستہ بنیاد اورنگ آباد در وجہ اخراجات درگاہ متبرکہ و مدد معاش قاضی امام الدین سجادہ نشین وغیرہ فرزندان و خادمان و
مجاوران قدوۃ العارفین حضرت مقرر است در ینولا حسب الامر جلیل القدر بدستور سابق از محل قدیم و برقرار داشتہ شد

شرح دستخط

عمدۃ الملک آنکہ

حسب الامر جلیل القدر پروانہ قلمی نمایند

اراضی از سواد قصبہ کیج از محل قدیم

عـــہ چاور

موضع سالیگاؤں بامقدمی در روبست

قطعات قطعہ

عـــہ چاور طعہ چاور

تباریخ ۹ ۲ رجب سنہ ۳۷ جلوس والا
نقل بدفتر دیوان رسند

تباریخ ۹ ۲ رجب سنہ ۳۷ جلوس والا
حضور نمودہ شد

بست و نہم رجب سنہ ۳۷ جلوس
نقل بدفتر استفسار رسند

قاضی مہذب الدین قدس سرہ العزیز

بندگان عالی الٰہی

نقل

بمہر خواجہ محمد سلطان خاں بہادر

بتصدیان مہمات حال و استقبال و دیسمکھاں و دیسپانڈیاں و مقدمان و پٹواریاں قصبہ کیج دھارور سرکار مذکور صوبہ خجستہ بنیاد نوشتہ می شود کہ موازی دوازدہ چاور زمین خارج جمع لائق زراعت از سواد قصبہ کیج مذکور موضع سائیگاؤں و موضع چیچولی محلہ پرگنہ مذکور معہ اشجار انبہ بموجب اسناد بمہر حضرت از قدیم الایام در وضۂ مدد معاش و خرچ عرس وغیرہ بشرط خدمت قضاء و خطابت و احتساب و نرخ نویسی را از آبا و اجداد بنام شریعت و فضیلت پناہ قاضی فخرالدین قاضی پرگنہ مذکور و محمد سراج الدین ولد محمد غالب سجادہ نشین فرزندان و خادمان درگاہ قطب العارفین زبدۃ الواصلین حضرت بطریق انعام مقرر است ظاہرا مردمان درگاہ بصیغہ پٹی ہر سال مزاحمت نرسانند۔ مقرر او یت مشار الیہما شود لہٰذا پٹی و مال ضبطی و حوالداری وغیرہ ابواب اراضی انعام معاف نمودہ شد۔ باید کہ از مشار الیہم بہ علت پٹی و مال و ضبطی و حوالداری وغیرہ معاف داشتہ وجہوہ ہر سال متعرض نشوند کہ بہ خاطر جمع محصول و اراضی مذکور متصرف شدہ بدعائے ازدیاد عمر و دولت ابد مدت مشغول موظف باشند دریں باب تاکید اکید دانستہ حسب السطور آرند تحریر بتاریخ ہفتم ربیع الثانی سنہ ۱۱۹۳ھ ہجری فقط (شجرۂ خاندانی دیکھو صفحہ ۱۸۔۱۹ پر)

تاریخ گولکنڈہ۔ حیدرآباد کے مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات دکن کا تمدنی ارتقاء' بادشاہوں اور امیروں کے حالات' لڑائیاں' علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم مآخذ اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنی تمدن" بھی عنقریب شایع ہو کر منظر عام پر آجائے گی۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ قیمت ؎

گارساں دتاسی:۔ اردو کے پہلے پروفیسر' فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں' طریقۂ تعلیم' تلامذہ' کتب خانہ' اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کی یورپ کی درس گاہوں' اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا اجمالی تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے نہایت تحقیق اور جانفشانی سے تالیف کیا ہے۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔

صفحات ۱۲۸۔ قیمت ؎

شجرہ از بطنِ زوجۂ ثانی

- محمد شریف صاحب
  - دوام الدین لاولد
  - جلال الدین
    - خواجہ محمد غلام محی الدین
      - خواجہ محمد شریف الدین
        - خواجہ غلام محی الدین لاولد
        - خواجہ محمد امام الدین
          - خواجہ محمد تمیز الدین
          - خواجہ غیاث الدین
    - خواجہ قبول احمد
      - خواجہ غلام محی الدین
        - شیخ سبحن صاحب
        - میاں جان
      - خواجہ محمد حسن الدین
      - خواجہ وزیر الدین
        - خواجہ شیخ نظام
          - کریم الدین
            - شفیع الدین
            - افضل الدین
              - جلال الدین
              - شمس الدین
              - محمد فصیح الدین
            - محمد وحید الدین لاولد
        - خواجہ شیخ ملوک
          - شیخ نظام
            - شیخ قلندر لاولد
          - شیخ احـــ
  - مصاحب الدین لاولد
- محمد عبد الواحد صاحب لاولد
- محمد مقیم الدین لاولد

ابوالفیض قاضی سراج الدین احمد [illegible]
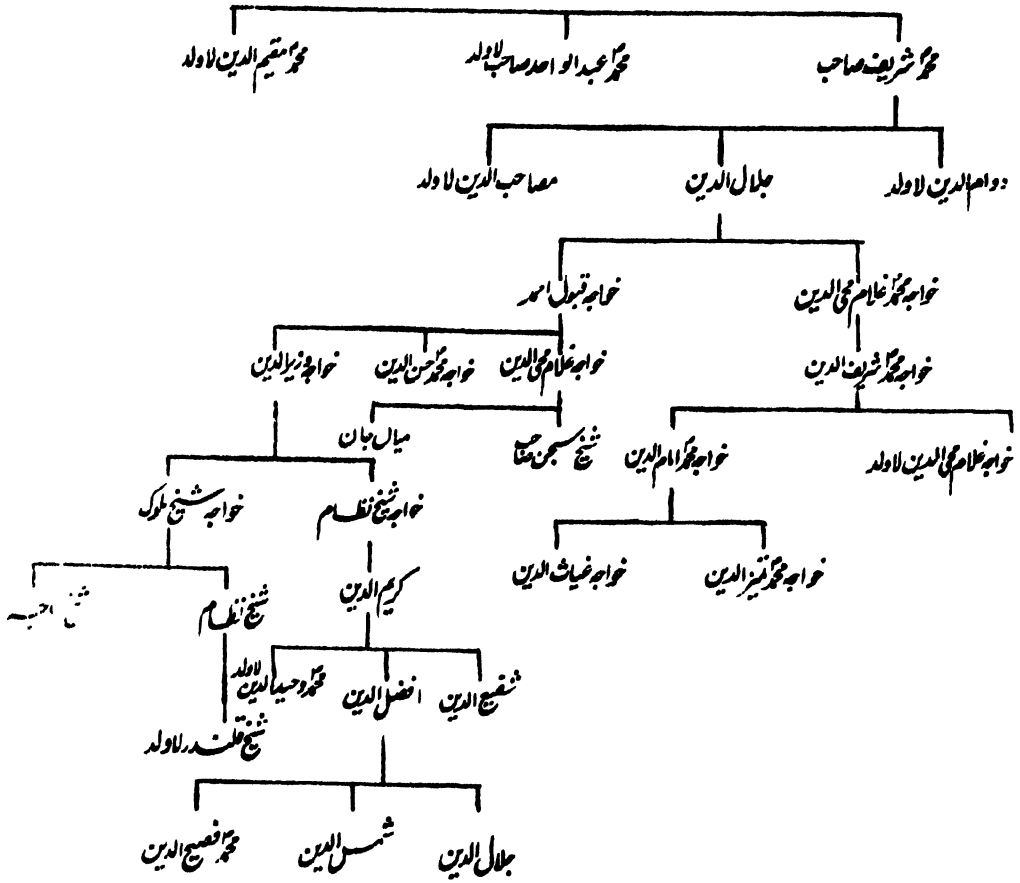
میر محمد مومن :- سلطنت قطب شاہیہ کے مشہور پیشوا سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم حیدر آباد کے مشہور تعمیر کار اور مصلح اور بانی دائرہ میر محمد مومن کے حالات زندگی اور علمی و رفاہی اور سیاسی کارناموں کا مفصل تذکرہ ہے۔ جس کو جناب ڈاکٹر زور صاحب صدر شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ نے مرتب کر کے ادارہ کی طرف سے شایع کیا ہے۔ یہ ضخیم کتاب ۲۰۰ سے زیادہ صفحات اور ۲۴ عکسی تصاویر پر مشتمل ہے۔ دکن کی علمی و سیاسی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حیدرآباد کے اس سابق وزیر اعظم کے کارناموں کے مطالعہ سے مفید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ قیمت مجلد (عمہ)

کیا ہوا معلوم؟

"آپا! کل کیا ہوا معلوم؟" معصومہ کی آپا ــــ فرزانہ معصومہ کو گھورنے لگی... "کیا ہوا معصومہ۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ کیا ہوا کل؟" معصومہ کچھ گھبرائی۔ کچھ شرمائی۔ رکتے رکتے کہنے لگی "آپا۔ کل وہ... کیا ہوا معلوم؟...." فہمیدہ نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔ "اری کیا ہوا معلوم کی بچی۔ کچھ بولے گی بھی۔ یا اسی طرح 'کیا ہوا معلوم'، کیا ہوا معلوم کرتی رہے گی۔" "جی نہیں آپا۔ آپ کو معلوم نہیں۔ کل ایک عجیب بات ہوگئی.. مجھے شرم آتی ہے آپا۔ آپ خفا تو نہ ہوجائیں گی.... دیکھئے آپا .. آپ میری طرف دیکھئے" فرزانہ معصومہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں پیار اور ترحم جھلک رہا تھا۔ معصومہ کی ہمت بندھی۔ نظریں نیچی کئے وہ کہنے لگی.... "کل ... کیا ہوا معلوم" فرزانہ نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ معصومہ نے برا مانتے ہوئے کہا۔ "سنیئے آپا۔ اس طرح نہ ستائیے۔ دیکھئے نہیں تو ہم رو دیں گے....." فرزانہ نے اپنے کان اسی طرح بند رکھے۔ "روؤ تو سہی۔ دیکھیں کس طرح روتی ہو.... یہ روئی۔ یہ روئی۔ یہ آنکھوں میں آنسو، یہ، یہ آنسو ..." معصومہ فرزانہ کو بے بس نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت التجائیں تڑپ رہی تھیں۔ کوئی اس کی بات سنتا۔ کوئی اس کی دلجوئی کرتا۔ کوئی اسے مشورہ دیتا ــــ وہ کہہ رہی ہے کہ "کل کچھ ہوا ہے" ــــ اور وہ کسی کو بھی نہیں معلوم۔ لیکن فرزانہ تو اس کی باتوں کو ہنسی میں اڑا رہی تھی۔ آخر اس نے اپنی چھوٹی بہن کو رلا کر ہی چھوڑا۔ "آنسو، آنسو، " اور معصومہ کی آنکھوں سے دو بڑے بڑے آنسو بہہ نکلے۔ "کیا ہوا۔ ارے معصومہ، تو تو سچ مچ رو رہی ہے ... اے ہے، میں نے ایسا کیا برا کیا .. نہ رو... اچھی، پیاری۔ پیاری بہن۔" معصومہ اپنی بہن سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کچھ طبیعت سنبھلی تو فرزانہ کے اصرار پر وہ کہنے لگی: "آپا کل رفیق آئے تھے۔ رفیق کا نام سنتے ہی فرزانہ چونک پڑی۔ "دیکھو معصومہ، رفیق مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔. نہ جانے کیوں اس کو دیکھتے ہی میرے دل میں نفرت کی ایک لہر سے دوڑ جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں مجھے خباثت اور بدطینتی کے زہریلے سانپ پھنکارتے نظر آتے ہیں۔ اوہ خدا ایسے شخص سے بچائے، ہر لڑکی کو بچائے خدا! رفیق! ہاں تو کل رفیق آئے تھے!" ــــ معصومہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ اپنے آپ بل کھاتی بیٹھی رہی۔ سوچ رہی تھی کہ رفیق کے بارے میں ایسا خیال رکھنے والی کے سامنے وہ کس طرح کچھ کہے۔ کس طرح کل کا واقعہ زبان پر لائے۔ فرزانہ معصومہ کے چہرہ سے اس کے خیالات کا اندازہ لگاتی بیٹھی تھی۔ ایک دم سے وہ کہنے لگی "میں نہیں سمجھ سکتی، رفیق صاحب کو اتنی تاکید کے باوجود قدم رنجہ فرمانے کی ہمت کیسے ہوئی؟ ان کے لئے مجھے کیا اور سخت ہونا پڑے گا؟ اچھی بات ہے، جیسا دیو ہوگا ویسی ہی پوجا بھی ہوگی ــــ" "مگر آپا" ــــ "تم دیوانی نہ بنو معصومہ! تم ابھی بچی ہو، رفیق جیسے نوجوان کے ہتکنڈوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ تمھیں تباہی کے راستے پر لئے جارہا ہے اور تم کو تو جیسے کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔ کدھر جارہی ہو تم؟... عورت کا ہر قدم اس کی منزل کو متعین کرنے والا ہوتا ہے۔ ذری سی لغزش اسے تباہی کے کھڈ میں جھونک سکتی ہے۔ خیر تم میری باتوں سے بیزار سی نظر آرہی ہو ــــ لیکن میں نے تمہارے کان کھول دیئے ہیں۔ اچھا تو کل ــــ" "کل کچھ بھی نہیں آپا۔ ہوا یہ کہ رفیق آئے تھے۔ کچھ دیر بیٹھے اور چلے گئے" "تم ہم سے اڑ رہی ہو۔ رفیق آئیں اور کچھ دیر بیٹھ کر ہی چلے جائیں؟" "آپا آپ تو ان سے خواہ مخواہ بدظن ہیں۔ کتنے

اچھے ہیں۔ کتنے خوش اخلاق، کتنے شریف اور آپ نے ان کی باتیں نہیں سنیں؟" "جی ہاں کیوں نہیں، بڑے ہی خوش اخلاق، بڑے ہی شریف، اور ان کی باتوں کا کیا پوچھتی ہو۔ پھول جھڑتے ہیں.... تو...." معصومہ اب کچھ کچھ کھلنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ کچھ یاد کر رہی تھی۔ اور کچھ اسے یاد آرہا تھا۔ "رفیق نے مجھے ایک بہت اچھا گانا سنایا۔" فرزانہ غور سے سنتی بیٹھی تھی۔ معصومہ نے اس کی طرف سے اپنی نظریں ہٹالیں اور دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر کو دیکھنے لگی۔ اس تصویر کی سرخی تھی "حاصل تلاش" باغ کے ایک گوشہ کا منظر دکھایا گیا تھا.... حوض کے کنارے سبزہ پر ایک لڑکی سہمی سہمائی لیٹی ہوئی تھی۔ ایک پھول دار درخت اسے چھپائے ہوئے تھا۔ حوض میں تیرنے والی بطخیں گردنیں اٹھا اٹھا کر اس کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ حیران تھے کہ آخر یہ کیوں اس طرح اپنے آپ کو چھپارہی ہے.. اتنے میں شاید کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ لڑکی نے فوراً اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ گویا اپنی آنکھوں کے اندر چھپ گئی اور کوئی اسے پا نہیں سکتا۔ اسی طرح آنکھیں بند کئے وہ لیٹی رہی۔ اور.... ڈھونڈنے والا جھک کر اس کی آنکھوں کو چوم رہا تھا .... "آپا وہ گاتے بھی خوب ہیں۔ ان کی آوازیں ان کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ اور میرا دل جھومنے لگتا ہے۔ جیسے کوئی پھول ہوا کے جھونکوں میں.. انھوں نے مجھ سے بھی گانے کی فرمائش کی مجھے گانا نہیں آتا لیکن میں گانے لگی... پہلے میں گنگنانے لگی۔ میری آواز تھرا رہی تھی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ لیکن ان کی آواز کے سہارے میری آواز بلند ہونے لگی۔ میں گانے لگی.. میں اتنا اچھا کبھی نہ گاتی تھی۔ ... انھوں نے میرے گانے کی تعریف کی۔" فرزانہ نے تیوری چڑھاتے ہوئے پوچھا "میں کہاں تھی اس وقت..؟" "آپ کو میں نے اپنا بلوز سینے کو دیا تھا۔" "ہوں" وہ پوچھنے لگے معصومہ سنا ہے کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ میں نے کہا "ہاں ہورہی ہے" انھوں نے پوچھا "کس سے" میں نے جواب دیا "ایک بہت بڑے آدمی سے"۔ کہنے لگے "ہم بھی چھ فٹ کے سرحدی جوان ہیں۔ ہم سے بڑا آدمی کون ہوگا" میں نے کہا "آئینہ میں صورت دیکھ لیجئے.... اپنی... بڑے آدمی... ایک فوجی سے۔ بڑا آدمی" "کون؟" انھوں نے تشویشناک لہجہ میں پوچھا۔ "آپا یہ مرد تو بڑے شکی ہوتے ہیں۔ جب کبھی عورتوں سے انھیں پالا پڑتا ہے تو کسی دوسرے مرد کے نام ہی سے بھڑکنے لگتے ہیں" فرزانہ کہنے لگی "لیکن تجھے یہ نہیں معلوم کہ یہ خود ایک چھوڑ کئی عورتوں کے پیچھے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں اور کوئی عورت اگر کسی کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے تو غضب ہو جاتا ہے۔ یہ تو بڑے ظالم ہوتے ہیں معصومہ" "آپا وہ تو ایسے نہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ معصومہ تم ہی اکیلی میری محبت کی مالکہ ہو۔ آج تک میں نے کسی کے آگے اپنے ہاتھ نہیں پھیلائے کسی سے میں نے محبت کی بھیک نہیں مانگی۔ کسی کو اپنا دل نہیں دیا۔ تم اور صرف تم۔" "جھوٹا کہیں کا" فرزانہ بول اٹھی "وہ تو قسمیں بھی کھا رہے تھے۔ ہاں تو آپا، انھوں نے اس فوجی کا نام پوچھا۔ میں نے بتلا دیا۔ انھوں نے کہا۔ فوجیوں کے سینوں میں دل نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو پتھر کا ہوتا ہے۔ وہ تجھے کھلونے کی طرح توڑ مروڑ کر پھینک دے گا۔ جان لے لیگا تیری" "اوہو تو اب "تجھے اور تیری" پر بھی وہ اتر آئے ہیں معصومہ تو بڑی رحم دل ہوتی جارہی ہے۔" "آپا میں کیا کروں۔ ان کو دیکھ کر میرا دل میرے بس میں نہیں رہتا۔ میں خود کو بھول جاتی ہوں وہ جو کہتے ہیں، میں سنتی ہوں اور میرے کانوں میں سریلے باجے سے بجتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا "اچھا خیر، فوجی کو چھوڑ دیجئے، ایک شریف دکاندار ہے۔" ہنستے ہوئے کہنے لگے "ہائے اب تو قسمت پھوٹنے والی ہے تیری۔ وہ بیوپاری تجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ تجھے خرید لے گا اور تو خود دیکھ لے گی کہ وہ سوداگر بچہ، تجھے کتنے دام مول

خریدیتا اور تجھ سے کس طرح فائدہ اٹھاتا ہے۔" میں اس کے اس جملہ پر ذرا تیز ہوگئی۔ "کیوں جناب اپنے آپ کو سمجھ کیا رکھا ہے۔ دوسروں کے متعلق آپ اس طرح کی بدگوئی کرنے کے کیسے حق دار ہوگئے؟ اب تو آپ مجھ پر نوازش فرمانے لگے۔ کچھ میں بکاؤ مال تو ہوں نہیں جو آپ اس طرح بڑھ بڑھ کر بولنے لگے لیکن انھوں نے معافی چاہی تو میں نے معاف کر دیا۔" "اچھا پھر کیا ہوا" فرزانہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے پوچھا۔ "پھر وہ تھوڑی دیر چپ رہے۔" معصومہ بھی خاموش ہوگئی۔ "ہاں۔ میں سن رہی ہوں۔ پھر اس نے کیا کیا؟" "آپا" معصومہ نے فرزانہ کی طرف جھکتے ہوئے نظر ڈالی۔ "آپا اس کے بعد انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری رگ رگ میں بجلیاں سی کوند رہی ہیں مجھے کسی نے آسمان کی طرف اچھال دیا۔ اور میں بلند ہوتی جارہی ہوں۔ ایک عجیب سنسناہٹ سی میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ایک دم سے گھڑیال بجنے لگی۔ میں اپنے ہوش میں آگئی۔ میں نے رفیق کو ایک طمانچہ لگایا اور اندر چلی آئی ——"

"پھر اس کے بعد" فرزانہ نے آہستہ سے پوچھا۔ لیکن معصومہ وہاں سے جاچکی تھی۔ فرزانہ نے گردن اٹھائی۔ کمرہ کے اندر چاروں طرف دیکھا اور روہانسے لہجہ میں کہنے لگی۔ "پھر اس کے بعد بھی کیا کیا ہوا خدا معلوم" "خدا معلوم! کیا ہوا معلوم؟ کیا ہوا معلوم" اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس نے ایک صندوقچہ کھولا۔ اس میں سے کاغذوں کا ایک بلندہ نکالا —— اور انگیٹھی میں پھینک دیا۔ ماما آئی تو اس نے اسے بستر درست کرنے کو کہا۔ پلنگ پر لیٹ گئی تو ماما نے چادر اڑھادی۔ چادر اڑھاتے ہوئے ماما نے چپکے سے کہا: "فیروز میاں کے ہاں سے ان کا نوکر آیا تھا۔ آج شام کو وہ آپ کا انتظار کریں گے" —— فرزانہ چادر کے اندر کچھ اس طرح بیکل نظر آئی جیسے کوئی کانٹوں پر لوٹ رہا ہو۔ اس کی ہچکیوں کی آواز سن کر ماما دبے پاؤں کمرے کے باہر نکل گئی۔

رشید قریشی

تنقید و تبصرہ

نقش فریادی | از فیض احمد صاحب فیض۔ ناشر مکتبہ اردو لاہور صفحات ۱۲۵۔ یہ دیدہ زیب مجموعہ پنجاب کے ایک اہل ذوق شاعر فیض احمد فیض کے اشعار، غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے نظمیں تاریخ وار ترتیب کے ساتھ درج کی گئی ہیں اور اس وجہ سے شاعر کے ذہنی ارتقاء کے سمجھنے میں سہولت ہوگئی ہے۔ یوں تو فیض احمد عرصہ سے مشق سخن میں مصروف ہیں لیکن گزشتہ چند سالوں میں ان کی شاعری اس جسمانی اور ذہنی کشمکش کی ترجمان بن گئی ہے جس میں ہندوستان کی جدید نسلیں مبتلا ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم کا ابتدائی اور انتہائی حصہ ملاحظہ ہو۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات

ترا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے

تری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات

تری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

آخر میں لکھتے ہیں:-

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے ۔ اور بھی دکھ ہے زمانہ میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا ۔ مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

فیض کی غزلیں سادگی اور روانی خیال کی وجہ سے بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔

روٹی کس نے پکائی | از عبدالواحد صاحب سندھی۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی صفحات ۴۸۔ اس چھوٹی سی باتصویر کتاب میں پانچ سے چھے سال کی عمر کے بچوں کے لئے دلچسپ کہانیاں نہایت ہی سلیس اور سادہ زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اردو میں بچوں کیا ادب کی جو کمی ہے اس کو رفع کرنے میں جامعۂ ملیہ کی اس قسم کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ چھوٹے بچوں کے ماں باپ یہ کتاب ضرور منگوائیں گے۔

یادگار حضرت شاد | مرتبہ راجہ نرسنگ راج بہادر عالی مطبوعہ عماد پریس حیدرآباد صفحات ۴۸۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت کی یاد میں ہر سال ان کی برسی کے دن ایک مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے جس میں ملک کے اکثر مشاہیر شعرا شرکت کرتے ہیں اور چونکہ مہاراجہ بہادر نے اپنی پوری زندگی شاعروں اور اہل علم وفن کی قدردانی میں گزار دی تھی اس لئے ان مشاعروں میں کثرت سے اہل ذوق شریک ہوتے ہیں۔ جو اصحاب حیدرآباد کے معیاری غزل گو شعراء کے کلام سے محظوظ ہونا چاہتے ہوں ان کے لئے یہ موقع اسی طرح مفید ثابت ہوگا۔ جس طرح ربع صدی پیشتر میر شمس الدین محمد فیض کے یادگاری شاعروں کے گلدستے جو سالہا سال تک پابندی کے ساتھ شائع ہوتے رہے ثابت ہوتے تھے۔

جگ بیتی | حصۂ اول۔ از پنڈت جواہر لال نہرو ترجمہ محمود علی خاں صاحب۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی صفحات ۵۵۲۔

یہ کتاب پنڈت جواہر لال نہرو کی مشہور تاریخ عالم کا اردو ترجمہ ہے۔ اور اس میں جواہر لال نے اپنے نقطۂ نگاہ سے دنیا کی تاریخ پر خطوں کی شکل میں نظر ڈالی ہے۔ ترجمہ اچھا اور محنت سے کیا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ کتاب ظاہری شکل وصورت میں اصل انگریزی کتاب کے مقابلہ میں بہت گھٹیا نظر آتی ہے۔ ضرورت تھی کہ یہ بھی اسی اہتمام کے ساتھ شائع کی جاتی جو ایک اور انگریزی کتاب ہمارا ہندوستان کے ترجمہ کی اشاعت کے وقت آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ملحوظ رکھا ہے۔

بگولے | از احمد ندیم قاسمی ناشر مکتبہ اردو لاہور صفحات ۲۴۴

احمد ندیم قاسمی پنجاب کے ایک ترقی پسند انشا پرداز ہیں انھوں نے دیہاتی زندگی اور کسانوں کی دنیا کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کیا ہے اور ان کی زیر نظر کتاب ایسے ہی افسانوں کا مجموعہ ہے جنھیں گرد وپیش کا ماحول شاعر کے ذہنی ادراک سے منطبق ہوکر افسانوں کی

شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کتاب میں ان کے دو تین افسانے طلائی مہر، بھوت اور سپنوں کا محل خاص کر قابل ذکر ہیں۔

کتاب بہت دیدہ زیب اور پاک صاف شایع ہوئی ہے۔

جالب مراد آبادی کے سو شعر ۴۲ صفحات نامی پریس میرٹھ اس کتاب میں ابتدائی ۵ صفحات منظور حسین خاں صاحب مضطر ایم اے لکچرار فیض عام انٹر کالج میرٹھ کے مقدمہ کے لئے وقف ہیں جس میں انھوں نے جالب صاحب کو حضرت جگر کی طرح ایک حقیقی اور معیاری شاعر ثابت کیا ہے اور مختلف عنوانات کے تحت ان کے منتخب اشعار پیش کئے ہیں۔ بعد کے نو صفحات میں خود شاعر کے سو شعر درج ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تناسب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ ایک تصویر بھی شریک ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کی ہے یا مقدمہ نگار کی۔

شمیم عشرت ۲۸۴ صفحات نظامی پریس لکھنو۔ یہ ضخیم کتاب سید احمد علی عشرت مرحوم رئیس گیا کے کلام کا مجموعہ ہے جس کو ان کے سعادت مند شاگرد سید حسن امام صاحب نے بڑی محنت سلیقے، اور اہتمام کے ساتھ شایع کیا ہے۔ ابتدا میں مرتب نے کتاب کی ترتیب میں اور مصنف کے حالات سے متعلق تقریباً ۱۹ صفحات لکھے ہیں۔ خود شاعر اور ان کی تحریر کا عکس بھی شریک کتاب ہے۔ ۲۲۴ صفحات غزل کے لئے۔ ۱ صفحات ابیات کے لئے ۱۶ صفحات مخمسوں کے لئے اور تقریباً ۳ صفحات رباعیوں اور قطعوں کے لئے وقف ہیں۔

عشرت گیاوی قدیم طرز کے اساتذہ سخن میں سے ہیں۔ ان کو بہار کے اردو صاحبان کمال میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ انھیں حسن امام جیسا شاگرد مل گیا جس نے ان کے کلام کو ضایع ہونے سے بچا لیا اور اردو شاعری کی دنیا میں ایک نفیس کتاب کا اضافہ کیا۔

کلام حرماں چھوٹی سائز ۱۸۰ صفحات اتحاد پریس لاہور۔ یہ حرماں خیر آبادی صاحب کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے اور پنجاب کی عام مطبوعات کی طرح نہایت کھلا اور دیدہ زیب چھپا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر غزل اور نظم پر مقام و تاریخ تصنیف بھی درج ہے۔ حرماں صاحب جدید طرز سخن گوئی سے متاثر ہیں۔ غزل بھی اچھی لکھتے ہیں اور نظم بھی۔ ابتدا میں خود انھوں نے چند صفحات میں اپنے حالات قلمبند کئے ہیں اور حیدرآباد اور لاہور کے کرم فرماؤں کا اجمالی تذکرہ بھی کیا ہے۔ حیدرآباد میں یہاں کے مشہور علمی سرپرست مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت نے ان کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا تھا۔

رہنمائے قرآن ۶۸ صفحات جید برقی پریس دہلی۔ یہ الحاج نواب سر نظامت جنگ بہادر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جو ڈاکٹر میر ولی الدین استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ کا نتیجہ قلم ہے۔ ندوۃ المصنفین مکتبہ برہان کے زیر اہتمام دہلی سے نہایت پاک و صاف اور مجلد شایع ہوا ہے۔ اصل کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے اس میں زیادہ تر غیر مسلم افراد اور خاص کر انگریزوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر اسلام کے حقایق و معارف بیان کئے گئے ہیں۔ وحی اور نبوت قرآن کا دائرہ عمل اور رابطہ وحدت خلق جیسے عنوانات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ ابتدا میں قرآن شریف اور صاحب کتاب کے متعلق بھی فلسفیانہ انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے جو اصحاب حکیمانہ اور فلسفیانہ انداز سے اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کو مفید پائیں گے۔

آئینہ مصحف چھوٹی سائز ۱۰۰ صفحات مطبوعہ سلطانی فائن آرٹ لیتھو پریس بمبئی۔ آقا نکہت شیرازی کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے جس کا مقدمہ محمد حسین نجفی مجتہد الاسلام نے قلمبند کیا ہے جو در اصل عبد السمیع خاں صاحب نکہت شاہجہاں پوری کے حالات اور خدمات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں چند نظمیں ہیں اور بقیہ کتاب شاعر کی فارسی رباعیوں پر مشتمل ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نکہت صاحب کو فارسی کا بڑا اچھا ذوق ہے اور انھوں نے اس سے قبل اس زبان میں موازنہ صلیب و ہلال اور بصائر القرآن جیسی کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔

ادارہ

حیدرآبادیوں کے سفرنامجات یورپ

اب اردو زبان میں علم و فن کا ذخیرہ کثرت سے مل سکتا ہے سائنس اور ادب کی کوئی شاخ ایسی نہ ہوگی جس کے متعلق اردو میں مواد دستیاب نہ ہوسکے، اردو زبان کی فن وار فہرست خاصی ضخیم ہوسکتی ہے

مختلف فنون کے منجملہ بعض تو ایسے ہیں جن پر قدیم زمانے سے کتابیں مرتب ہوئی ہیں اور کثرت سے ان سے متعلق کتابیں دستیاب ہوسکتی ہیں، اور بعض فنون ایسے ہیں جن پر اردو میں جنگ عظیم (۱۹۱۴ء ۱۹۱۸ء) کے بعد کتابیں مرتب ہونے لگی ہیں، بہرحال اب اردو زبان کی کتابیں ایک دریائے بے پایاں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سفرنامہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر دنیا کی ہر زبان میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اور لکھی جارہی ہیں، اردو زبان میں بھی ایسا ذخیرہ کثرت سے مل سکتا ہے۔ ان سفرناموں کو دو طرح پر تقسیم کرسکتے ہیں، ایک تو وہ سفرنامے ہیں جو غیر زبان سے اردو میں ترجمہ کئے گئے ہیں، اس قسم کے ترجموں میں ابن بطوطہ اور محمد ابن جبیر کے عربی سفرنامے، مارکوپولو کا انگریزی سفرنامہ، ٹیورنیر کا فرانسیسی سفرنامہ زیادہ شہرت رکھتے ہیں، دوسرے سفرنامے وہ ہیں جن کو ذاتی سفرنامے کہنا چاہئے جو تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں، ایسے سفرنامے اردو میں بہت ہیں، اس قسم کے سفرناموں میں بڑا حصہ حجاز کے سفرناموں کا ہے، فریضۂ حج کے باعث کئی اصحاب نے اپنے تجربات اور معلومات کو پیش کرکے سفرناموں کی تعداد زیادہ سے زیادہ کردی ہے، اس کے بعد دوسرا درجہ ایسے سفرناموں کا ہے جو عراق و ایران سے متعلق ہیں، چونکہ شیعہ برادری حج کے ساتھ عراق کا سفر بھی مذہبی حیثیت سے کرتی ہے، اس لئے اس قسم کے سفرناموں کی تعداد بھی خاصی ہے۔

تیسرے سفرنامے وہ ہیں جو دیگر ممالک اسلامیہ یا خود ہندستان سے متعلق ہیں، ایسے سفرناموں کی بھی اردو میں کمی نہیں ہے، چوتھے سفرنامے وہ قرار دئے جاسکتے ہیں جو ممالک یورپ اور امریکہ سے متعلق ہیں۔ ایسے سفرناموں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔

یہ امر تعجب سے خالی نہیں ہے کہ یورپ کی سیر ہر سال بیسیوں اصحاب کرتے ہیں اور سیکڑوں نے تعلیم کی خاطر یورپ کا سفر کیا ہے، لیکن اس کے باوجود سفرناموں کی قلت تعجب انگیز ہے، لیکن یہاں اس سے زیادہ تعجب خیز یہ امر ہے کہ اردو میں جس قدر یورپ کے سفرنامے دستیاب ہوتے ہیں ان میں کا ایک بڑا حصہ حیدرآبادی اصحاب کے سفرناموں کا ہے، ذیل ان کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے۔

شمار	نام سفرنامہ	مصنف	سنہ سفر	سنہ اشاعت
۱	مجائبات فرنگ	یوسف خاں کمل پوش	۱۸۳۶ء	۱۸۴۷ء
۲	روزنامچہ سفر یورپ	نواب بشیر الدولہ آسمان جاہ مرحوم	۱۸۸۶ء	۱۹۰۵ء
۳	گلگشت فرنگ	مہدی حسن فتح نواز جنگ	۱۸۸۹ء	۱۸۸۹ء
۴	سفرنامہ	نواب مہدی نواز جنگ	۱۹۲۶ء	۱۹۲۴ء
۵	سفرنامہ یورپ	صغرا ہمایوں مرزا	۱۹۲۴ء	۱۹۲۶ء
۶	رہبر سفر یورپ	راقم	۱۹۲۸ء	۱۹۳۰ء
۷	پردیس کی باتیں	مرزا حسین احمد بیگ صاحب	۱۹۲۹ء	۱۹۳۰ء
۸	یورپ کی ڈاک	نواب شہید یار جنگ	۱۹۳۵ء	۱۹۳۵ء
۹	روزنامچہ سفر یورپ	راجہ خواجہ پرشاد	۱۹۳۳ء	۱۹۳۴ء

شمار	نام سفرنامہ	مصنف	سنہ سفر	سنہ اشاعت
۱۰	سیاحت نامہ	نواب ظہیر الدین خاں بہادر	۱۹۳۳ء	۱۹۳۵ء

اب اس فہرست کے بعد ان سفر ناموں پر مختصر طور پر روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ ان کے متعلق کسی قدر وضاحت سے معلوم ہوسکے۔

عجائبات فرنگ یہ نہ صرف ایک حیدرآبادی کا پہلا سفرنامہ ہے بلکہ اردو زبان میں پہلا سفرنامۂ یورپ ہے، اس حیثیت سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔

یوسف خاں حیدرآباد کے متوطن تھے ۱۸۳۳ء (۱۲۴۲ھ) میں سیاحت کے لئے گھر سے نکلے اولاً شمالی ہند کی سیر کی چنانچہ پٹنہ، ڈھاکہ، گورکھپور، نیپال، اکبرآباد، شاہجہاں آباد، لکھنؤ وغیرہ ہوتے ہوئے کلکتہ پہونچے وہاں سے ۳۰ مارچ ۱۸۳۷ء کو انگلستان روانہ ہوئے، ایک سال چار ماہ کے بعد ۲۵ جولائی ۱۹۳۶ء کو واپس ہوئے۔ انگلستان اور فرانس کا سفر کیا تھا۔ بقید تاریخ اپنے سفر کے حالات قلمبند کئے ہیں، راستے کے ہوٹل، لندن کے محلوں کے نام اور نمبر مکان تک درج کئے گئے ہیں، انگریزوں کے اخلاق کے بے حد مداح ہیں، یورپ کے حسن وجمال کی قصیدہ خوانی کی ہے، وہاں کی عورتوں کو "پریوں" سے مخاطب کیا ہے، بدکاری کے چشم دید واقعات بیان کئے ہیں، رقص و سرود کا حال لکھا ہے اور اس کی مذمت کی ہے۔

یہ سفرنامہ پہلی مرتبہ ۱۸۴۷ء میں دہلی میں طبع ہوا، اور اس کے بعد دوسری مرتبہ مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۷۳ء میں شایع ہوا۔

اس سفرنامے کی زبان آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے کی ہے، لیکن واقعات دلچسپ ہیں، ان کے ذاتی تاثرات رنگینی اور لطافت سے پُر ہیں، ان کی دلکشی اور انداز بیان کی دل آویزی پُر لطف ہے، بعض مقامات سے عبارت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

"نویں تاریخ دسمبر کی پکچر آف اوس (ارٹس) میں گیا، وہ تصویر خانہ تھا، ایسا مکان کہ بلندی میں آسمان سے باتیں کرتا، ستون اس کے زرنگار اور مطلا، فرش اس کا شفاف خوش رنگ لکڑی کا پل کی طرح پٹا ہوا، اگر کوئی غافل اچانک اس پر قدم رکھتا یقینی ہے کہ بسبب چکناہٹ کے پھسل پڑتا، اس مکان میں تصویریں مصورانِ کامل اگلے زمانے کی زیب پذیر تھیں، سب کی سب بے نظیر تھیں، استادوں کے ہاتھ کی بنی، بموجب تخمینہ قریب دو لاکھ کے نظر آئیں، اس جائے عشرت فزا کو دیکھ کے میں بہت خوش ہوا۔ بعد ازاں ایک گاڑی کرایہ کرکے معہ بوچر صاحب کے اس پر سوار ہو کر پیالیس وریل کو چلا، وہ مقام پارس سے چھ کوس فاصلے پر ہے، یہ مکانِ جشن اگلے بادشاہ کا تھا، وہاں آکر معشوقوں کے جشن جمشیدی کرتا۔ یعنی شراب پی کر ان کے ساتھ عیش و نشاط میں مشغول ہوتا"

صفحہ (۶۱)

...."وہاں جاکر سب معروف تماشا ہوئے، دو رنڈیاں کہ ناچنے گانے میں یکتائے زمانہ تھیں، رقص و سماع میں مشغول ہوئیں،

سلہ شمالی ہند کے جن اصحاب نے اردو میں یورپ کے سفرنامے قلمبند کئے ہیں ان میں سید مظفر الدین حیدر کا سفرنامہ موسومہ "سیر فرنگستان" سب سے قدیم ہے جو ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں شایع ہوا ہے

اس کے علاوہ منشی محبوب عالم صاحب مرحوم اڈیٹر پیسہ اخبار، عبدالرحمٰن امرتسری۔ ٹھاکر دت شرما۔ محمد امرت دھارا، بیگم صاحبہ جنجیرہ، نوبل شیخ عبدالقادر صاحب وغیرہ کے سفرنامے شایع ہوئے ہیں، جہاں تک ہماری معلومات ہیں ان کی تعداد دس کے اندر ہے۔

ایسے کرتب دکھائے کہ سب سرد ہو گئے، مگر مجھ کو ایک امر اُن کا پسند نہ آیا، وہ یہ کہ انھوں نے ناچتے وقت ایسا کپڑا نہیں ریشمی پہنا کہ تمام بدن خصوصاً...... ان کا صاف نظر آتا، ناچتے ناچتے جب پاؤں اٹھاتیں گویا لوگوں کو...... اپنی دکھاتیں۔" صفحہ ۵۰

فرانس کی پریوں کو دیکھا کہ کوچوں پر بیٹھی باجے بجاتیں۔ کیا خوب باجے تھے کہ آواز اُن کی سے مردے جی اٹھتے، اتنے میں دور جام شروع ہوا، بعد اس کے ہر ایک مست ہو کر ایک ایک پری کا ہاتھ پکڑ کر ناچنے لگا، چونکہ بندہ تمام عمر کبھی ناچا نہ تھا ان صاحبوں کے سامنے اجنبی معلوم ہوتا۔ مگر اس حیلے سے کامیاب مطلب تھا۔ اس بڈھے نے بھی ہاتھ بڈھیا کا کہ مثل پیرے اور قد میں اس سے دگنی تھی پکڑ کر ناچنا شروع کیا...... میں نے اور بوچڑ صاحب نے تمام شب خوشی سے بسر کی مگر وہ رات ایسی جلد کٹی کہ تھوڑی معلوم ہوئی" صفحہ ۹۰

گلگشت فرنگ اگرچہ اس کے مصنف مہدی حسن حیدرآباد کے نہیں تھے مگر حیدرآباد کے ایک ذمہ دار عہدہ دار کی حیثیت سے انھوں نے یورپ کا سفر کیا تھا، اس لئے اس سفرنامہ کو حیدرآبادی کہا جاسکتا ہے۔

مہدی حسن فتح نواز جنگ کے خطاب سے سرفراز تھے، ہوم سکرٹری (معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ) کی خدمت پر مامور تھے۔ اسی خدمت کے زمانے میں بعض سیاسی اغراض کے تحت نواب محسن الملک کے ساتھ ۱۸۸۹ء میں انگلستان گئے تھے، واپسی کے بعد انھوں نے انگریزی میں اپنا سفرنامہ قلمبند کیا تھا، اس کو مولوی عزیز مرزا مرحوم نے اُردو میں ترجمہ کر کے شایع کیا، انگلستان کے متعلق دلچسپ حالات درج ہیں۔

روزنامچہ سفر یورپ نواب آسمان جاہ مرحوم امیر پائیگاہ نے ۱۸۸۷ء ملکہ وکٹوریا کی سالگرہ کے موقع پر سلطنت آصفیہ کی جانب سے شرکت فرمائی تھی، انگلستان اور فرانس تشریف لے گئے تھے، آپ نے اپنا روزنامچہ قلمبند فرمایا تھا، اس کو رائے تیج رائے نے جو نواب صاحب مرحوم کے علاقے میں جاگیردار تھے اپنی مولفہ کتاب "صحیفۂ آسمان جاہی" (یہ کتاب نواب آسمان جاہ کی سوانح زندگی ہے) میں شامل کر دیا ہے، یہ روزنامچہ اس حیثیت سے قابلِ قدر ہے کہ ایک حیدرآبادی امیر کا پہلا اردو روزنامچہ ہے۔

سفرنامہ نواب نذیر نواز جنگ بہادر پائیگاہ کے ایک فرد ہیں، نواب وقار الامرا اقبال الدولہ کے پوتے اور سلطان الملک کے فرزند ہیں، ۱۹۲۴ء میں آپ نے مقاماتِ مقدسہ اور یورپ کا سفر کیا تھا، بعد واپسی اسی سنہ میں آپ نے اس کو شائع فرمایا۔ یورپ میں انگلستان، فرانس، جرمنی، آسٹریا، قسطنطنیہ وغیرہ کی آپ نے سیاحت فرمائی۔

یہ سفرنامہ اس حیثیت سے بھی قابل قدر ہے کہ باوجود فرد پائیگاہ ہونے اور بچپن سے ناز و نعم میں پرورش پانے کے آپ نے تنہا اتنا طول طویل سفر کیا۔ کسی مصاحب حتیٰ کہ خدمت گار کو بھی ہمراہ نہیں رکھا تھا۔ یہ سفرنامہ دلچسپ اور پُراز معلومات ہے۔

سفرنامۂ یورپ صغرا ہمایون مرزا کی ہستی محتاج تعارف نہیں ہے۔ ۱۹۲۴ء میں آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ ممالک یورپ کا سفر کیا۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، اٹلی اور ہالینڈ وغیرہ ملکوں کی سیر کی۔

اور حسب عادت آپ نے اپنا سفرنامہ مرتب کیا جو ۱۹۲۶ء میں شایع ہوا ہے کافی ضخیم سفرنامہ ہے جو دو حصوں میں منقسم اور معلومات کا بیش قیمت خزانہ ہے۔ اس میں تاریخی اور قابلِ دید عمارات، مشہور مقامات، عجائب گھر، معذور خانے، نسوانی ادارے

سیاسی انجمنوں وغیرہ کی پوری تفصیل درج ہے، دوران سفر میں جرمنی اور کیمبرج میں بیگم صاحبہ نے اردو میں تقریر فرمائی ہے، جس کو عام و خاص نے نہایت پسند کیا تھا۔

جہاں تک ہماری معلومات ہیں اردو زبان میں عورتوں کے دو ہی سفرنامے ہیں ایک تو بیگم صاحبہ جنجیرہ کا سفر نامۂ یورپ ہے جو ایک مختصر سفرنامہ ہے۔ دوسرا سفرا بیگم کا جو کافی ضخیم اور معلومات کا گنجینہ ہے۔

۶۔ رہبر سفر یورپ یہ راقم الحروف کا سفرنامہ ہے، ۱۹۲۸ء کے اواخر میں میں نے یورپ کا تعلیمی سفر کیا، واپسی کے بعد ۱۹۳۰ء میں یہ سفرنامہ شائع ہوا۔ یہ ایک مختصر سفرنامہ ہے، اس میں ایسی باتوں کا تذکرہ ہے جو یورپ جانے والے طالب علموں یا سیاح کے لئے ضروری اور کارآمد ہو سکتی ہیں، اس کے مطالعہ سے ایک ناواقف شخص کو پوری سہولت حاصل ہو سکتی ہے۔ چونکہ میرا قیام زیادہ تر لندن میں رہا اس لئے لندن کے متعلق زیادہ تفصیلی معلومات ہیں۔ اس کے علاوہ انگلستان اور فرانس کی معاشرت، تجارت وغیرہ پر بھی مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۷۔ پردیس کی باتیں مرزا حسین احمد بیگ صاحب بی اے۔ ایچ سی ایس نے "پردیس کی باتیں" کے نام سے اپنا سفرنامہ یورپ مرتب اور شائع کیا ہے، مرزا صاحب کا یہ سفر ۱۹۲۹ء میں ہوا اور ۱۹۳۰ء میں آپ نے اس کو شائع فرمایا، اس سفرنامے میں اٹلی، فرانس، جرمنی، انگلستان وغیرہ کا تذکرہ ہے، اس میں دلچسپ اور دلکش انداز میں سفر کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں، جرمنی کے برہنہ کلب کی بھی صراحت ہے۔ مرزا صاحب کی دلچسپ تحریر اور دلکش انداز بیان عام و خاص کے لئے جاذبیت رکھتا ہے۔

۸۔ یورپ کی ڈاک یہ کتاب نواب تہنیت یار جنگ بہادر کے خطوط کا مجموعہ ہے جو اڈیٹر صاحب رسالہ شہاب کے نام یورپ سے ارسال کئے گئے ہیں، نواب صاحب شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر کے ہمراہ رکاب ۱۹۳۵ء میں یورپ تشریف لے گئے تھے اس سفرنامہ میں سوئٹزرلینڈ، فرانس اور اٹلی کے حالات درج ہیں، یہ خطوط اپنی رنگینی اور دل آویزی کے باعث ہی نہیں بلکہ دلچسپ انداز بیان اور پُرلطف حالات سفر کے باعث بھی مقبول ہوں گے۔

۹۔ روزنامچہ سفر یورپ راج کمار راجہ خواجہ پرشاد بہادر فرزند مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت نے ۱۹۳۳ء میں یورپ کی سیاحت فرمائی تھی، انگلستان، اسکاٹ لینڈ، فرانس، اٹلی اور استنبول وغیرہ کا سفر کیا۔ یہ کتاب آپ کے سفر کا روزنامچہ ہے جو ۸ رمئی ۱۹۳۳ء سے شروع ہو کر ۹ رنومبر ۱۹۳۳ء کو ختم ہوتا ہے۔ یہ ایک راج کمار کا روزنامچہ ہے اس سے ان کے روزانہ مشاغل اور ان کی مصروفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آرٹ پیپر پر نہایت عمدگی سے شائع ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی سفرنامہ نزاکت اور صفائی میں اس کا مقابلہ کر سکے۔

۱۰۔ سیاحت نامہ نواب ظہیر الدین خاں بہادر میر پائیگاہ آسماں جاہی کا یہ سفرنامہ ہے، اس کے نو باب ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

باب اول میں حیدرآباد سے لندن تک کے حالات سفر مذکور ہیں، اس میں عدن، پورٹ سعید، نیپلز، جینوا وغیرہ کے حالات بیان

کئے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں لندن، پیرس اور جنوبی فرانس کا تذکرہ ہے، باب سوم میں شمالی اور وسطی یورپ کا ذکر ہے۔ اس میں بلجیم، ہالینڈ، جرمنی کے حالات مذکور ہیں، باب چہارم میں لندن سے نیویارک کے حالات درج ہیں۔ باب پنجم میں امریکہ کا تذکرہ ہے، اسی باب میں آبشار نیاگرا، شیکاگو اور اس کی مشہور نمائش کا حال لکھا ہے۔ باب ششم میں ہالی وڈ کا ذکر ہے۔ باب ہفتم میں ہالی وڈ سے لندن تک واپسی کے حالات بیان کئے گئے ہیں، باب ہشتم سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے حالات پر مشتمل ہے، اور باب نہم نیپلز سے حیدرآباد کی واپسی تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ یہ سفرنامہ یورپ کے ساتھ امریکہ کی سیاحت پر بھی مشتمل ہے، جہاں تک میرا خیال ہے امریکہ کی نسبت یہ پہلا سفرنامہ ہے، کسی اور نے اردو میں امریکہ کے سفر کے حالات درج نہیں کئے ہیں، جس طرح نواب آسمان جاہ مرحوم نے سیاحت یورپ کے دوران میں اپنا سفرنامہ مرتب کیا تھا اور حیدرآبادی امیر کا پہلا سفرنامہ تھا اسی طرح آپ کے پوتے نواب ظہیر یار جنگ بہادر نے امریکہ کے حالات سفر پہلی مرتبہ اردو میں قلمبند فرمائے ہیں۔

مندرجۂ بالا تفصیل سے حیدرآبادی سفرناموں کی وضاحت ہوسکتی ہے۔ اردو زبان میں یورپ کے جو سفرنامے موجود ہیں ان میں بڑا حصہ اہل حیدرآباد کا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ حیدرآبادیوں نے نہ صرف یورپ کا سفر کرکے وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا بلکہ انھوں نے اپنے ہم زبانوں کے لئے بھی تفریح کا سامان پیدا کردیا، انھوں نے نہ صرف یورپ کی سیر سے خود استفادہ کیا بلکہ اردو زبان میں جس چیز کی کمی تھی اسے پورا کرکے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔

نصیر الدین ہاشمی

کیف تغزل

محبت آنسوؤں کی داستاں معلوم ہوتی ہے
مری غمگینیوں کی ترجماں معلوم ہوتی ہے

وہ اک رنگیں خلش جس کا محبت نام ہے شاید
کہاں معلوم ہوتی تھی کہاں معلوم ہوتی ہے

جہاں کی ہر مصیبت میں خوشی کا ایک پہلو ہے
یہاں کی ہر مسرت غم نشاں معلوم ہوتی ہے

یہ کس نے ہاتھ رکھا میری نبض ذوق عشرت پر
کہ دنیا میری نظروں میں جواں معلوم ہوتی ہے

مراد دنیاں ہے آشکارا میری صورت سے
خوشی بھی مری نجمہ فغاں معلوم ہوتی ہے

آنسہ نجمہ تصدق

اُردو زبان کی اشاعت کے وسائل

(اُردو زبان کے مسائل کا سلسلہ)

سرکاتون کی یہ مبارک یادگار ہے کہ انھوں نے اردو، ہندی کا جھگڑا کھڑا کیا اور آج اردو کو مسلمان بھاشا یا بدیشی زبان کہہ کر ہندستان سے نکالنے اور سنسکرت آمیز ہندی کو رائج کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ سرسید مرحوم نے بھی اس بحث میں کافی حصہ لیا اور یہ ثابت کیا کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ زبان ہے۔ مولوی بشیر الدین اڈیٹر "البشیر" نے اپنے اخبار میں اس موضوع پر مسلسل مضامین لکھے اور کچھ عرصہ کے لئے یہ فتنہ دب گیا۔ لیکن جب کانگریس تحریک نے زور پکڑا، تو اس نے اپنا یہ مسلک قرار دے دیا کہ اردو کو مٹا دیا جائے۔

زبان کی اہمیت

زبان کسی قوم کی تہذیب و تمدن، خیالات و محسوسات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اردو زبان کو چھوڑنے کے یہ معنی ہیں کہ اپنے ماضی کو حرف غلط کی طرح مٹا دیں۔ حال و استقبال ان کے لئے نئی تہذیب، نیا کلچر اور نئی زبان ہو۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ زبان کے ساتھ ساتھ قوموں کی تہذیب اور ثقافت بدل جاتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں نے دیکھا کہ اگر ان کو تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے مسلمان رہنا ہے تو ان کے لئے یہ امر بھی لازمی ہے کہ وہ اردو کی حفاظت کریں اور اس کی نشر و اشاعت کے لئے وسائل اختیار کریں۔

اُردو زبان

اُردو زبان کیا ہے؟ یہ اس خوش قسمت و خوش نما زمانے کی یادگار ہے، جب ہندو اور مسلمان ہندستان میں برادرانہ حیثیت سے رہتے تھے۔ نہ اِن میں آپس میں مخالفت تھی نہ جھگڑا۔ آئے دن کے فساد جن سے ہندستان بدنام ہے نہ تھے۔ محبت اور یگانگت کا دور دورہ تھا۔ ایک قوم دوسری قوم کے رنج و راحت میں برابر کی شریک تھی۔ اس عہد زرین کی واحد نشانی کو مٹانا برادرانِ وطن کا سب سے بڑا ظلم ہے اور اس یادگار کو قائم کرنا اور ترقی دینا اہلِ وطن کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اردو کی خدمت ہندو اور مسلمانوں نے مل کر کی ہے۔ اس اعزاز میں دونوں قومیں برابر کی شریک ہیں۔ اردو شاعروں اور مصنفوں کی فہرست دیکھئے ہندو شعراء اور مصنفین کے نام بھی اسی تابناکی سے نظر آئیں گے جیسے کہ مسلمانوں کے۔

اُردو کے قیام کے وسائل زمانۂ ماضی میں

سب سے پہلے اردو کی ترقی کا خیال کلکتہ میں انگریزوں کو پیدا ہوا۔ انھوں نے تعلیم و تعلم کے لئے ایک مدرسہ کھولا۔ اُردو کے قابل نثار ملازم رکھے۔ اکثر کتابیں فارسی سے اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۸۴۲ء کا دکن کا اشاعت اردو کا اولین کارنامہ ایسی حیثیت رکھتا ہے کہ جس کی گراں قدر خدمات کا اعتراف نہ کرنا اور اسے فراموش کر دینا سخت ناانصافی ہوگی۔ شمس الامراء امیر کبیر نے اس کی ابتدا کی اور اس دارالترجمہ میں انگریزی، فرانسیسی زبانوں سے بہت سی کتابیں اردو میں منتقل کی گئیں۔ مثلاً ستہ شمسیہ۔ رسالہ علم کیمسٹری وغیرہ۔ اسی سے کچھ پہلے کلکتہ میں اردو کی ترقی کی طرف توجہ کی جا رہی تھی۔ صرف فرق اتنا ہے کہ وہاں زیادہ تر ادبی کتابیں ترجمہ ہوئیں اور یہاں علمی۔ یہ وقت وہ تھا جب کہ نہ کوئی سوسائٹی قائم ہوئی تھی اور نہ کسی میں اس طرف خیال یا توجہ کرنے کا احساس بھی پیدا ہوا تھا۔ یہاں جو کچھ بنیادی کام اس وقت کیا گیا اس پر آگے چل کر بڑی بڑی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور ہندو مسلم اُردو پسند طبقہ کو آئندہ

چل کر اردو کی ترقی و حفاظت کی نئی نئی شاہراہیں نظر آنے لگیں۔

مرحوم دہلی کالج میں اردو زبان ہی تعلیم کا ذریعہ تھی۔ اس کالج نے بڑے بڑے مصنفین پیدا کئے۔ ان میں شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ اور شمس العلماء مولانا نذیر احمد بہت مشہور ہیں۔

سرسید نے اپنی تعلیمی جدوجہد شروع کرنے سے پہلے ایک ترجمہ کا محکمہ قائم کیا تھا جس میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ لیکن چونکہ اس محکمہ کو گورنمنٹ کی سرپرستی حاصل نہ تھی اس لئے اس میں زیادہ کامیابی نہ ہو سکی۔ اس کوشش کی یادگار عمارت باقی رہ گئی ہے جو اب بھی علی گڑھ میں سوسائٹی کے نام سے مشہور ہے۔

سرسید نے ایک رسالہ بھی اردو میں جاری کیا تھا جس کا نام "تہذیب الاخلاق" تھا۔ مسلمانوں کی اصلاح کے لئے مضامین اس میں شایع ہوتے تھے۔ اس رسالہ کے مضمون نگار ہندستان کے مشہور اہلِ قلم تھے۔ ان میں نواب وقار الملک، مولوی مشتاق حسین، محسن الملک اور خود سرسید زیادہ مشہور ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے بعد علی گڑھ سے ایک اور رسالہ نکلا جس کا نام معارف تھا۔ اس کے اڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم مرحوم تھے اور مضمون نگاروں میں نواب موسیٰ خاں، نواب اسمٰعیل خاں، اور مولوی رشید احمد سالم وغیرہ کے نام قابلِ یادگار ہیں۔ تہذیب الاخلاق و معارف کے قبل اور بعد کئی اخبار نکلے۔ لیکن اردو اشاعت کی یہ تمام کوششیں اب تک خانگی اور انفرادی تھیں ان کو اجتماعی شکل نہیں دی گئی تھی۔

اجتماعی شکل (انجمن ترقی اردو) مسلم کانفرنس نے اپنے ایک اجلاس میں یہ طے کیا کہ اردو کی اشاعت کے لئے ایک شعبہ کھولا جائے۔ اس انجمن کے معتمد مولانا شبلی، عزیز مرزا اور پھر مولوی عبدالحق قرار پائے۔ موخر الذکر کا تعلق چونکہ حیدرآباد سے تھا اور موصوف اورنگ آباد میں انسپکٹر مدارس تھے۔ اس لئے اس انجمن کا دفتر اورنگ آباد میں منتقل کر لیا۔ یہ مولانائے موصوف کی اَن تھک کوششوں سے خوب پھلی پھولی اور مقبول ہوئی۔ یہاں بہت سی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ قدیم اُردو شعرا کے دیوان تصحیح اور مقدمہ کے ساتھ شایع ہوئے۔ اور اردو میں جو تحقیقاتی و معیاری کام اس عرصے میں ہوا، پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اب یہ انجمن اورنگ آباد سے دہلی منتقل کر دی گئی ہے۔

دار المصنّفین اعظم گڑھ علامہ شبلی مرحوم نے لکھنو میں ندوہ قائم کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اس انجمن کی بنیاد ڈالی۔ دار المصنفین میں ملک کے اچھے لکھنے والوں کو شریک کیا گیا۔ لیکن ارکان کی زیادہ تعداد ندوہ کے فارغ التحصیل علماء کی رہی۔ دار المصنفین کی توجہ زیادہ تر ادبیات اسلامیہ پر منعطف رہی اور اسلامیات میں بھی اساتذۂ اسلام کے سوانح حیات پر بہت کام کیا گیا۔ اس انجمن کا ایک ماہانہ رسالہ معارف کے نام سے نکلتا ہے جس کے مضامین زیادہ تر مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ نہایت سنجیدہ و متین رسالہ ہے اور بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔

دار الترجمہ جامعۂ عثمانیہ جب حیدرآباد کے تعلیمی ماہروں نے عثمانیہ یونیورسٹی کی تشکیل کی اور اپنا نصب العین یہ قرار دے لیا کہ تعلیم کا ذریعہ اُردو زبان ہوگی تو سب سے پہلے ایک دار الترجمہ کی بنیاد ڈالی جس میں ملک کے تمام مشہور اہلِ قلم اور ادیب شریک کئے گئے۔ دار الترجمہ سے اب تک کئی سو کتابیں مختلف علوم فنون کی مختلف زبانوں سے

اردو میں منتقل ہو کر شایع ہو چکی ہیں اور ایک بڑی تعداد ایسی کتابوں کی پریس میں ہے جو عنقریب شایع ہو جائیں گی۔ دارالترجمہ کے قیام کی مختلف زمانوں میں کوششیں ہوئیں لیکن اب تک تین ہی کوششیں کامیاب ہوئیں ایک دورعباسیہ کا دارالترجمہ دوسرے حیدرآباد کا دارالترجمہ تیسرے دور امانیہ کا دارالترجمہ۔

پنجاب میں اشاعت اُردو کی کوشش

پنجاب میں اردو کی اشاعت کے لئے جو جدوجہد کی گئی وہ کسی حال میں فراموش نہیں کی جا سکتی۔ حیدرآباد کی کوشش کو چھوڑ کر ہندستان کے تمام صوبوں کی متعدد کوششیں بھی پنجاب کی سعی کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ پنجاب کے محسنان اردو میں سب سے پہلے دو نام درخشندہ نظر آتے ہیں۔ ایک اڈیٹر تہذیب نسواں اور دوسرے اڈیٹر مخزن۔

جنت مکانی محمدی بیگم کے اخبار تہذیب النسواں سے پہلے اردو اشاعت کی تمام تر کوششیں بیرون پردہ صرف مردوں تک ہی محدود تھیں۔ انجمن کا تو ذکر کیا۔ صحافتی آواز تک پس پردہ نہ پہنچ سکتی تھی اور تعلیم یافتہ مسلم آبادی کا نصف حصہ اردو کی اشاعت کی جدوجہد سے ناواقف ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ بات کافی اہم تھی۔ محمدی بیگم نے اخبار تہذیب نسواں جاری کر کے ایک زبردست وقتی ضرورت کا احساس عام طور پر "پس پردہ" پیدا کر دیا۔ اس اخبار میں اصلاحی مضامین کے علاوہ ہر نوعیت کے مضامین لکھے جانے لگے اور مستورات میں اردو لکھنے کا ذوق پیدا ہونے لگا۔ اس زمانے میں ہندستانی مسلمان طبقۂ اناث ایک عجیب و غریب مسحور کن دور سے گزر رہا تھا۔ مستورات خود تو خواب غفلت سے سرشار تھیں ہی لیکن ان کی اس گراں خوابی کا اثر کافی حد تک مردوں پر بھی پڑ رہا تھا۔ مرد پستی اور گم نامی کے قعر سے نکل کر بام ترقی پر گامزن ہونا چاہتے تھے۔ لیکن عورتیں انھیں اس راہ ترقی میں مدد دینے کے بجائے اور حائل رہتی تھیں۔ اس میں قصور کس کا تھا اس پر آئندہ کسی الگ مضمون میں بحث کی جائے گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عورتوں کا مردوں کے دوش بدوش فوراً شریک کار نہ ہونا ہی سیاسی دوڑ میں مردوں کے پیچھے رہ جانے کی بین دلیل ہے۔ ان میں احساس غفلت اس قدر زور پر تھا کہ جب تہذیب نکلا تو گھر کی بڑی بوڑھیاں اس بات کی کوشاں رہتی تھیں کہ کنواری بچیوں کے ہاتھ میں پرچہ جانے سے پہلے گھر کے مرد یا کوئی اور بزرگ اسے پڑھ لیں تاکہ انھیں اطمینان ہو جائے کہ "تہذیب" میں جو کچھ لکھا ہے وہ عورتوں کے پڑھنے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔

مخدومہ محمدی بیگم مرحومہ کی یہ کوشش بالکل مجاہدانہ کوشش تھی اور اس نے بھی طبقۂ اناث کے لئے بالکل ویسی ہی ابتدائی بنیاد قائم کر دی جیسی کہ ۱۸۰۰ء کے دکن اور کلکتہ کے دارالترجمہ نے طبقۂ ذکور کے لئے کی تھی۔

محمدی بیگم کی یہ کوشش خوب پھلی پھولی اور مرحومہ کی زندگی ہی میں ان کے اخبار نے ہندستان کے طول و عرض اور ہر گوشے میں اپنی رسائی پیدا کر کے ایک ایسی قابل قدر خدمت انجام دی جو ہمیشہ قابل یادگار رہے گی۔

سر عبدالقادر صاحب نے رسالہ مخزن جاری کر کے ہندستان میں رسالہ نگاری کا مذاق پیدا کیا۔ یہ رسالہ بلند ادبی معیار رکھتا تھا یہ اسی کا طفیل ہے کہ آج پنجاب سے بیسیوں رسالے نکل رہے ہیں۔

ہندوستانی اکیڈمی یہ پہلی انجمن ہے جو حکومت کی سرپرستی میں قائم ہوئی۔ اردو، ہندی دونوں زبانوں میں اب تک چند ترجمے اور تالیفات شایع ہوچکی ہیں۔ اکیڈمی کی طرف سے سالانہ مختلف عنوانات پر ملک کے قابل حضرات سے تقریریں کرائی جاتی ہیں۔

ادارۂ ادبیات اُردو ۱۹۳۱ء سے سرگرم کار ہے۔ اس کی طرف سے تین ماہانہ رسالے "سب رس" "سب رس معلومات" "بچوں کا سب رس" نکلتے ہیں۔ اس ادارے نے ملک کے تاریخی اور ادبی آثار کی حفاظت کے لئے بھی بہت کام کیا ہے۔ اس کا مقصد ملک میں ادبی ذوق نیز عوام میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کرنے کے علاوہ دکن میں اردو زبان کی حفاظت و توسیع ہے۔ اسی غرض سے اس ادارہ نے چار امتحانات اردو فاضل، اردو عالم، اردو زبان دانی اور اردو دانی قائم کئے ہیں جو بہت مقبول ہو رہے ہیں۔ ان امتحانات کی وجہ سے عوام میں اردو دانی کا ذوق پیدا ہو رہا ہے۔

کارکنان ادارہ میں قابلِ ذکر ڈاکٹر زورؔ، پروفیسر سروری، مولوی نصیر الدین ہاشمی، مولوی عبدالمجید صدیقی وغیرہ ہیں۔ اس ادارے کا ایک زنانہ شعبہ بھی ہے جس کی معتمد سکینہ بیگم صاحبہ ہیں۔

ادارے سے قریب ایک سو کتابیں مختلف موضوع پر شایع ہوچکی ہیں اور کچھ زیر طبع ہیں۔ جن میں اردو انسائیکلوپیڈیا خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ امید ہے کہ یہ انسائیکلوپیڈیا ادارے کا شاہکار اور ایک ایسی چیز ہوگی جو ادارے کو حیاتِ جاوید بخشے۔ اس میں ادارے نے اپنے ساتھ تمام ہندوستان کے ادیبوں اور فاضلوں کو شریک کار کرلیا ہے جو اس کی مقبولیت کی روشن دلیل ہے۔

اس مختصر مضمون میں ان تمام کوششوں کا ذکر کرنا ناممکن ہے جو انفرادی، اجتماعی یا صحافتی طریقے سے اردو کی اشاعت و ترقی کی معاون رہ چکی ہیں یا آج بھی سرگرم عمل ہیں۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاچکا اور لکھا جائے گا۔ لیکن اس وقت داستانِ ماضی کو باربار دہرائے جانے سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ زمانۂ موجودہ میں کون سے ذرائع اختیار کئے جائیں جن سے زبان اردو کی ترقی و اشاعت اور حفاظت ہوسکے۔ اس موضوع پر بہت کہا اور لکھا جاسکتا ہے۔ ذیل میں چند امور مختصراً تحریر کئے جاتے ہیں۔

اُردو زبان کی ترقی کے وسائل جو اب اختیار کرنے چاہئیں

(۱) اردو داں پبلک میں اردو اخبارات کو زیادہ ہر دل عزیز بنانا چاہئے ان کے ذریعہ سے عوام میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کیا جائے۔

(۲) ریڈیو کے پروگرام کا زیادہ حصہ اردو میں ہو اور ریڈیو پر اردو کی اشاعت و ترقی کے لئے تقریریں کی جائیں۔

(۳) جہاں جہاں اردو کا چرچا نہیں ہے، وہاں مدارس قائم کئے جائیں خصوصیت کے ساتھ تعلیم بالغان کا انتظام کیا جائے اور ان مدارس کی نگرانی کے لئے ہر صوبے میں ایک انجمن قائم کی جائے جو اپنے حلقے کے مدارس کے طریق کار وغیرہ پر نظر رکھے۔

(۴) ڈاک خانے میں منی آرڈر فارم وغیرہ اردو زبان میں ہو اور اردو داں طبقے کو چاہئے کہ ان فارم کی خانہ پری اردو میں کرے نیز تار وغیرہ کے فارم بھی اردو ہی میں لکھے جائیں۔

(۵) بنک وغیرہ کی تمام کاروباری زبان اردو ہی قرار دی جائے۔

(۶) ریلوے کے تمام کاروبار مثلاً پارسل وغیرہ کے پتے اور جملہ امور اردو میں لکھے جائیں۔

بلقیس بانو

کردار

زندگی کے طوفان سے بچ نکلنے کے لئے کردار ہی ایک زبردست قوت ہے۔ انسانی کردار ایک طاقت ہے، اثر ہے، وہ احباب پیدا کرتا ہے ہمدرد اور مدد کرنے والوں کی تخلیق کرتا ہے۔ دولت، عزت اور سکھ چین کی شاہراہیں کھول دیتا ہے۔ بغیر کردار کے کسی بات کی رتی برابر بھی قیمت نہیں۔ اس سائنس کے دور میں کلوں، انجنوں اور دنیا کی مختلف قوتوں کی کم سے کم پیمائش کی جا سکتی ہے۔ قوتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن انسان کی پراسرار قوتوں کا اندازہ کون لگاسکتا ہے؟ تھیوڈر پارکر کہا کرتا تھا کہ سقراط کی قیمت جنوبی فارولینا کی سے بہت زیادہ ہے۔ گو وہ ننگے پاؤں پھرتا تھا اور چالیس برس کی عمر میں شادی کی تھی پھر بھی وہ ایک قابل تعظیم انسان تھا۔ اس نے کچھ ایسے کام کر دکھائے ہیں کہ جو بہت کم لوگوں سے ممکن تھے۔ اس نے اپنے کردار کے بل پر سارے نظریات کو اک دم بدل دیا، ذہنی سوتوں کے دھارے پلٹ دئے۔ آج ۲۴ صدیاں گزرنے پر بھی بڑے بڑے مدبر اس کا نام عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔

روس کے دارالسلطنت ماسکو سے ایک فوجی دستہ بھاگ رہا تھا۔ اس کا سردار ایک جرمن نوجوان تھا۔ اس کے اعلیٰ کردار کی بدولت سارے فوجی اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ایک سرد اور برفانی رات میں یہ دستہ مع اپنے سردار کے ایک ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں ٹھیرا۔ برف گر رہی تھی۔ ہوا نہایت تیز و تند تھی، یہ سب لوگ تھکے ماندے اور بھوکے پیاسے تھے۔ سردار کو نیند لگ گئی۔ صبح وہ اپنے اوپر پڑے ہوئے گرم کپڑوں کو الگ پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ برف باری شدت کی تھی۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو آواز دی لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ ہوا کی بھنبھناہٹ میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔ اس نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ چاروں طرف سارے سپاہی اکڑے پڑے ہیں۔ ان کے جسم پر کپڑے نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے سردار کو سردی سے بچانے کے لئے اپنے کپڑوں سے ڈھک دیا تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو قربان کرکے پیارے سردار کو زندگی بخشی۔

والٹیر انہی لوگوں کو بڑا سمجھتا تھا جنھوں نے اپنی قوم کی کچھ خدمت کی ہو۔ جن سے کسی دکھیا کا دکھ کم ہوا ہو۔ جنھوں نے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں سے بے سہارا، یتیم و لیسیر بچوں اور بیواؤں کی مدد کی ہو۔ اس کے نزدیک وہی لوگ قابل تعظیم تھے جنھوں نے رو بہ تنزل قوم کو نئے نئے نظریات بتائے اور تحقیق و تجسس کے بعد ان کے لئے ترقی کی شاہراہیں کھول دیں۔ جنھوں نے سب کو اپنا بھائی سمجھ کر ان کے آرام و راحت کا سامان مہیا کیا۔ جن کا دل اپنے ہم جنسوں کی تکلیف اور درد سے پسیجتا ہو اور جو ملک و قوم اور ابنائے جنس کی فلاح و بہبود کے لئے ایثار و قربانی سے دریغ نہ کرتے ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ آدمی اپنی عادتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ کیا تم اس بڑی موٹی صورت والے کو ایک کامیاب انسان سمجھتے ہو؟ کیا اس توندیل کو ایک بڑا آدمی سمجھتے ہو؟ غریبوں کو چوس کر اس کے روپئے جمع کرنے کی عادت سے تم واقف نہیں؟ کیا تم اس کے چہرہ پر یتیم بچوں اور بیواؤں کے دکھ، درد کی پرچھائیں نہیں دیکھتے؟ تم اسے انسان کہتے ہو جو دوسروں کو مٹا کر خود قائم ہو۔ جو دوسروں کے گھر ڈھا کر اپنی عمارت کھڑی کرے؟ لوگوں کی حق تلفی کرنے اور ان کو بے دست و پا کرنے والا انسان حقیقت میں بڑا آدمی ہے، دولتمند ہے؟ کیا کبھی وہ سکھی رہ سکتا ہے؟ جس کی رگ رگ میں خود غرضی، مکاری، عیاری اور حرص و آز ہے! جس کی شریانیں تعفن اور گندگی سے بھری ہیں۔ کیا تم خط و خال کی دلفریبی کو اس کے ضمیر کی صفائی سمجھتے ہو؟ ہرگز نہیں!! دنیا کے کامیاب ترین انسانوں میں بہت ہی کم ایسے ہیں جن کے

چہرے خوبصورت، جاذبِ نظر اور پُرسکون ہیں۔ ان کی فطرت ان کے دل میں امنڈنے والی ترنگوں کا سایہ ان کے چہروں پر ڈال دیتی ہے دل کا اضطراب اور بے چینی بشرے سے عیاں ہو جاتی ہے۔

انسانی زندگی کا مقصد کھانا، پینا اور دولت جمع کرنا نہیں ہے۔ صرف اپنے بچوں کی فکر و پرداخت تو جانور بھی کرتے ہیں۔ اگر اسی کو انسانیت کا شرف سمجھا جائے تو یہ انسانیت کی ہتک ہے! شرافت کی پیشانی پر زبردست داغ ہے۔ انسانیت کے جسم پر برص (کوڑھ) کا دھبہ ہے! دنیا کو اِن لوگوں سے کیا فائدہ جو صرف کھانا، پینا اور اپنا جیون سکھی بنانا چاہتے ہیں جنھوں نے کبھی دکھیا کے آنسو نہیں پونچھے۔ کبھی ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا نہیں، ان کے دل پتھر کے ہیں۔ اور وہ دھرتی کے سینے پر ایک بوجھ ہیں۔

دنیا کو ایسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے جو دولت کے لئے اپنی خوشی نہیں سمجھتے اور جن کا رواں رواں صداقت و دیانت میں ڈوبا ہوا ہے۔ جن کی خودی قطب نما کی سوئی کی طرح اپنی سمت نہیں چھوڑتی۔ جو صداقت کے اظہار کے لئے بڑی بڑی قوتوں سے ٹکر لے سکتے ہیں۔

ایک صحابی کا واقعہ ہے کہ جنگ میں وہ زخمی ہو گئے۔ جسم سے ہو کے فوارے چھوٹ رہے تھے، ناتوانی بڑھ گئی تھی۔ زبان کانٹا بن گئی تھی۔ انھوں نے العطش، العطش پکارا کچھ دیر کے بعد ایک خاتون نے پانی پیش کیا وہ پیالہ منہ سے لگانا ہی چاہتے تھے کہ بازو سے کسی نے آواز دی۔ العطش، العطش، آپ نے فوراً وہ پانی اس دوسرے شخص کے پاس بھیج دیا اور خود جان دے دی۔ اس قسم کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے، کوئی کہاں تک بتائے؟

قوت، وقت اور اپنی زندگی کو دوسروں کے لئے۔ چاہے وہ ملک ہو، قوم ہو یا عام جنسِ انسانی — تج دیتا ہو۔ وہ یقیناً زبردست انسان ہے۔

یہ دور سرمایہ کا دور ہے۔ چاروں طرف دولت کی پکار ہے۔ پھر بھی ایک غریب مصنف، ایک آرٹسٹ یا مدبر اور فلسفی کی کروڑ پتیوں سے زیادہ عزت ہوتی ہے۔ دولت و سرمایہ ہر وقت برائیوں کی طرف کھینچتا ہے۔ سرمایہ کی دنیا میں ایک کی کامیابی ہزاروں کو ناکامی کا شکار کر دیتی ہے۔ عقل و دین کی دنیا میں کامیابی سماج کی عمارت کی تعمیر کا ذریعہ ہے امیر و غریب دونوں ہی اخلاقی سرمایہ کے برابر حقدار ہیں سماج کو دونوں سے اعلیٰ کردار اور پاکیزہ اخلاق کی توقع ہے۔ لیکن سرمایہ دار دولت کے گھمنڈ میں اپنے اخلاق کھو بیٹھتا ہے اور دوسرا اسے ہی سب کچھ سمجھ کر اپنا تا ہے۔ کتنا بُعد! کتنی دوری!!

ہر ملک میں چند ایسی عورتیں اور مرد ملتے ہیں، جو زبان ہلانے سے قبل ہی لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں۔ ہر قوم کے اخلاق و کردار اور روایات اس کی قوت اور ترقی کی بنیاد ہیں۔ سنگِ مرمر کے فرش پر سیتیز، روم چھرے سے گھائل ہو کر گر پڑا تو ہر ایک دل اس کے لئے تڑپ اٹھا اور آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں ——— کیا یہ ایک پاکیزہ کردار کا کرشمہ نہیں؟

آج بچہ بچہ لنکن اور واشنگٹن کے نام سے واقف ہے۔ یہ محض اپنے کردار کی بدولت صوبہ متحدہ امریکہ کے پریسیڈنٹ ہوئے تھے۔

مشاہیر کے اخلاق و کردار میں ایک خاص خصوصیت ہوتی ہے۔ وہ ایک اٹل پہاڑ اور زبردست چٹان ہوتے ہیں۔ چاروں طرف طوفان اٹھتے ہیں، موسلا دھار مینہ برستا ہے، آندھیاں اور بگولے اٹھتے ہیں لیکن وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں ہٹتے اگر دنیا میں کوئی قوت، ہے

جو بغیر متاثر کئے نہیں رہ سکتی تو وہ صرف کردار ہے۔ چاہے علم کا زیور نہ ہو، چاہے ذہنی قوتیں وسیع نہ ہوں، خواہ وہ مفلس ہو یا سماج میں اس کی کوئی جگہ نہ ہو پھر بھی ایک بلند کردار شخص کامیاب ہو کر رہے گا۔ لوئی چہارم نے اپنے وزیر سے کہا "ہماری سلطنت بہت مالدار ہے ہماری قوت بھی کافی ہے، پھر بھی ہم ایک چھوٹے سے ملک ہالینڈ کو زیر نہ کرسکے!!"

وزیر نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "حضور! کسی ملک کی قوت و طاقت اور اہمیت اس کے طول و عرض پر نہیں اس کے بسنے والوں کے اخلاق و کردار پر منحصر ہے۔

محمد عبدالقادر فاروقی

غزل

شکایت بھی کہیں الفت میں منہ پر لائی جاتی ہے
مدد اے ضبطِ غم دل سے زباں شرمائی جاتی ہے

یہ آخر کیوں مری ہر التجا ٹھکرائی جاتی ہے
ابھی دل کے کسی گوشے میں حسرت پائی جاتی ہے

یہ کہہ کہہ کر طبیعت ہجر میں بہلائی جاتی ہے
فغاں آساں ہے لیکن دور تک رسوائی جاتی ہے

مجھے اس کم نگاہی نے تری پامال کر ڈالا!!
مگر مجرم وہی پہلی نظر ٹھہرائی جاتی ہے

نگاہِ شرمگیں میں ہے نگاہِ اولیں پنہاں
کہانی پھر دبے الفاظ میں دہرائی جاتی ہے

غمِ ہستی بجز تمہید عشرت کچھ نہیں ہوتا
سکونِ دل کی خاطر زندگی تڑپائی جاتی ہے

یقینِ عشق سے آخر طلسم کجروی ٹوٹا
مرے دل سے محبت کی نظر ٹکرائی جاتی ہے

ہر اک ساعت وہی نغمہ ہر اک لمحہ وہی جلوہ
مرے دل پر محبت ہی محبت چھائی جاتی ہے

جھجک کر گفتگو کرنا ہے اپنا راز کہہ دینا
اسی نازک سے پردے میں تمنا پائی جاتی ہے

خلافِ مصلحت ہے ان سے شرحِ آرزو کرنا!
طبیعت کب ٹھہرتی ہے مگر ٹھہرائی جاتی ہے

یہ منظر زندگی بھر مجھ کو رلوائے گا اے نخشب
کہ آج ان کی بھی آنکھوں میں نمی سی پائی جاتی ہے

نخشب جارچوی

نواب سالار جنگ اعظم کی تعلیم سے دلچسپی

(سلسلۂ مشاہیر دکن)

نواب سالار جنگ اعظم نے ۲۴ سال کی عمر میں وزارت دکن کا جائزہ لیا۔ اس وقت حیدرآباد کے نظم و نسق کی حالت بہت خراب تھی۔ متواتر وزراء تبدیل ہوتے رہے مگر کسی سے بھی اس کی اصلاح نہ ہو سکی اور آخر برابر ہاتھ سے جاتا رہا۔ نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع نے ملک کے امراء و جاگیرداران پر نظر ڈال کر نواب میر تراب علی خاں (سالار جنگ) کا انتخاب فرمالیا اور غایت مسرت سے ارشاد فرمایا کہ میں نے ہیرا چن لیا۔ اچانک آپ کا تقرر ہونے سے لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ کہتے تھے کہ ایک نوجوان ناتجربہ کار سے کیا توقع ہے کہ وہ نظم و نسق پر حاوی ہو کر ملک کی خرابیوں کو دور کرے اور پیچیدہ مسائل سلطنت کو حل کرے۔ لیکن خود نواب ناصر الدولہ اپنے انتخاب سے خوش اور مطمئن تھے۔ سرکار انگریزی کو بھی اس سے مسرت ہوئی وہ جانتی تھی کہ سالار جنگ بہت دانشمند اور مدبر امیر ہے۔ البتہ رشوت خوار اور خود غرض اشخاص افکار میں مبتلا ہو گئے وہ سمجھ گئے کہ ان کی خرابی کے دن آ گئے۔ ان کی تدبیر سب رفو چکر ہو گئی اور اپنی ناجائز آمدنی سے وہ قطعاً محروم ہو گئے۔ نواب صاحب کی خوبیوں اور نظم و نسق کے بیان کرنے کے لئے ضخیم جلدوں کی ضرورت ہے۔ اور قابل اصحاب اس فریضہ کو انجام دے سکیں گے۔ یہاں صرف شعبۂ تعلیم سے متعلق کچھ بیان کرنا مقصود ہے جس میں نواب صاحب نے امکان بھر کوشش و سعی فرمائی۔ نواب صاحب کی وزارت کے نصف حصۂ آخر سے مجھ کو نواب صاحب کی خوبیوں سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ نواب صاحب نے منجملہ اور انتظامات کے رعایا کی تعلیم کے لئے مدارس کی ضرورت محسوس کی۔ اس وقت کوئی سرکاری مدرسہ نہ تھا، البتہ نامور علماء کے مکان پر طالب علموں کا مجمع رہتا تھا۔ فارسی، عربی کی تعلیم ہوتی تھی۔ ان کی تعداد بھی قلیل تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ علم پڑھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے، علماء کے خاندان کے لوگ اس کے مستحق ہیں یہ بات بھی دماغوں میں جمی ہوئی تھی کہ علم حاصل کرنا غرباء کا کام ہے۔ اعیان سلطنت و جاگیردار ہرگز اس طرف رخ نہیں کر سکتے علم پڑھنے سے انسان منشی یا متصدی ہو گا۔ مالداروں کو اس کی ضرورت ہی کیا ہے وہ خود منشی و متصدی کو نوکر رکھ سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خیالات کی اصلاح کے لئے نواب صاحب کو کس قدر مشکلات کا سامنا ہوا ہو گا۔ اس خیال کے لوگ کوئی معمولی اشخاص نہ تھے بہت بڑے درجے کے اصحاب تھے، غرض نواب صاحب نے اپنے زمانۂ وزارت کے دوسرے یا تیسرے ہی سال ناف شہر میں دار العلوم قائم فرمایا۔ عربی، فارسی، انگریزی کے لئے قابل و ماہر مستند اساتذہ مقرر فرمائے گئے۔ اور جو علماء اپنے مکان پر لوگوں کو پڑھاتے تھے ان کے نام تنخواہ، منصب جاری کر کے فکر معیشت سے مطمئن کر دیا۔ جیسے مولوی نیاز محمد صاحب بدخشانی، مولوی عبدالصمد صاحب قندھاری، مولوی محمد عبداللہ صاحب نقشبندی حیدرآبادی، مولوی محمد حسن علی صاحب صدیقی نقشبندی۔ مولوی نیاز محمد صاحب کی نسبت فرماتے تھے کہ وہ میرے استاد کے استاد ہیں۔ مولوی محمد زماں خاں صاحب شہید جو بعہد نواب افضل الدولہ تین سو روپے تنخواہ پاتے تھے نواب سالار جنگ نے بعد میں مولوی صاحب کی تنخواہ ایک ہزار روپے کر دی۔ مولوی صاحب آخر عمر تک حضرت غفران مکاں کے استاد رہے۔ چند سال کے بعد نواب سالار جنگ نے دار العلوم سے ایک فہرست طلب کی جس سے معلوم ہو کہ قیام دار العلوم سے ۱۲۹۰ھ

تک کتنے لوگ کس علم میں کتنے زمانے تک تعلیم پائے بالآخر وہ کہاں مامور ہوئے اب کہاں متعین ہیں۔ فہرست سے معلوم ہوا کہ تقریباً چھ سو اشخاص نے تعلیم پائی۔ ابتداءً میں کم تنخواہ پر مامور ہوئے' لیکن بعد میں ان لوگوں نے بڑی ترقی کی اور عہدوں پر فائز ہوئے۔ منجملہ ان کے چند نام یہ ہیں۔ مولوی سید ابوتراب صاحب نائب اول عدالت دیوانی بلدہ مولوی سید عبدالصمد صاحب مدرس عربی۔ مولوی محمد حنیف صاحب مدرس عربی' مولوی شیخ احمد حسین صاحب (نواب امین جنگ) مددگار معتمد مالگزاری جو بعد میں صوبہ دار ہوئے۔ مولوی محمد صدیق صاحب (عماد جنگ) رکن مجلس عالیہ جو بعد میں میر مجلس ہوئے۔ سید عبدالرزاق صاحب آصف نواز الملک معتمد صدر المہام مالگزاری جو بعد میں معتمد صرف خاص ہوئے۔ عبدالقادر صاحب (قادر نواز جنگ) ناظم ریلوے جو بعد میں صوبہ دار ہوئے۔ میر عبدالسلام خاں مقتدر جنگ تعلقدار رائچور جو بعد میں صوبہ دار ہوئے رحمان شریف صاحب (رحمان یار جنگ) ناظم دفتر ملکی محمد فرید الدین صاحب ناظم اول عدالت فوجداری بلدہ ۔

نواب صاحب نے ملک کے نامور علماء کے لڑکوں کے نام وظائف تعلیمی جاری کئے جیسے (۱) محمد عبدالسلام صاحب فرزند حکیم غلام حسین خاں صاحب (۲) محمد عابد علی صاحب صدیقی فرزند مولوی محمد فضل علی صاحب (۳) محمد ابوالفیض صاحب فرزند مولوی احمد علی خاں۔ ان وظیفہ پانیوں نے دس سال سے زیادہ عرصہ تک خاص دارالعلوم میں تعلیم پائی ہے مولوی شیخ احمد حسین صاحب نے دارالعلوم میں آٹھ سال تک تعلیم پائی۔ اس زمانے میں دارالعلوم علماء کا مرکز تھا۔ آپ نے عربی' فارسی میں درسی کتابوں کی تعلیم ختم کرکے انگریزی شروع کی تھوڑے ہی دنوں میں نوشت وخواند میں مہارت حاصل کرلی اس لئے نواب صاحب نے مددگاری معتمد صدر المہام مالگزاری پر مامور فرمادیا۔ آپ نے دارالعلوم کو اتنے بڑے ملک کے لئے ناکافی خیال کرکے ایک غیر سرکاری مدرسہ کے قیام کے لئے اقوام سے اپیل کی امراء و مقتدر اصحاب اور خود نواب صاحب نے کافی چندہ دینے کا وعدہ فرمایا اور سرکاری طور سے بھی امداد کا وعدہ کیا گیا اور مولوی شیخ احمد حسین صاحب کی اس تجویز پر اظہار مسرت فرمایا اور تحسین وآفریں سے مولوی صاحب کی ہمت بڑھائی اور اس کے کچھ عرصے بعد ہی مدرسہ اعزہ قائم کیا گیا۔ مدرسے کے افتتاح کے روز نواب صاحب نے عمدہ لکچر دیا اور کاہلوں اور بدشوقوں کی خوب خبر لی۔ اس مدرسے کے قیام کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے کہ بعض شاہی خاندان کے افراد نے جو تعلیم کے مخالف تھے نواب صاحب کے اصرار و فہمائش پر ایک عرصے کے بعد اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ ان کے لڑکوں کے لئے خاص مدرسہ قائم کیا جائے' جس میں کم درجے کے لوگوں کے لڑکے شریک نہ ہوں۔ خدا کی قدرت کہ جو لوگ تعلیم سے گریز کرتے اور اپنے لڑکوں کو معمولی مدارس میں شریک کرنا نہیں چاہتے تھے آج ان کی اولاد نے عام مدارس میں تعلیم پاکر ڈگریاں حاصل کیں اور سرکاری عہدوں پر مامور ہوگئے (یہ نواب صاحب کا احسان ہے) ان کے سابقہ اشغال (مرغ بازی' بلبل بازی' مردم آزاری' ملک خانوں کی سرپرستی) یکسر متروک ہوگئے۔ چونکہ یہ لوگ بڑے خاندان کے کہلاتے تھے اس لئے نواب صاحب نے ان سب کے مدرسہ جانے کے لئے سواری کا انتظام فرمادیا اور ان کے ایک ایک فعل کی اطلاع نواب صاحب کو ہوتی اور نواب صاحب اس کا انسداد فرمادیتے تھے' بعضوں کو تعلیمی تنخواہ میوہ خوری کے نام سے دی جاتی تھی۔ نواب صاحب کے ان سارے انتظامات سے حضرت غفران مکان خوش ہوتے اور اپنے وزیر کی خیر خواہی پر محمول فرماتے۔

ان لوگوں کے اعمال وافعال کا پتہ جریدہ ۵ رجب ۱۲۹۶ھ سے مل سکے گا۔

ف جریدہ غیر معمولی ۹ نومبر ۱۲۹۲ف کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے اپنی آخر عمر میں تربیت اولاد معززین بلدہ کے لئے خاص انتظام فرمادیا' لیکن اس کے بعد آپ کا انتقال ہوگیا۔ نواب صاحب کے مجوزہ انتظامات بعد میں ظہور پذیر ہوئے۔ یعنی

معززین بلدہ بغرض تعلیم یورپ اور غیر ممالک کو بھیجے گئے۔

ف جریدہ ۲۵ ربیع الثانی ۱۲۹۲ھ ۱۹ ارتیر ۱۲۸۴ف کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی تعلیم سے بھی نواب صاحب کو بڑی دلچسپی تھی ترقی علم و فن کے لئے ترغیبی وظائف مقرر کئے گئے اور یہ ہدایت ہوئی کہ جو شخص مدارس انگریزی بلدہ میں مدراس یونیورسٹی کی جماعت میٹرک میں اول درجے میں نکلے گا اس کو سرکار عالی کی طرف سے طلائی تمغہ دیا جائے گا اور مدارالمہام اپنی ذاتی رقم سے دو سو روپے کی سونے کی زنجیر دیں گے اور پیالہ سیمیں قیمتی یک صد روپیہ صدرالمہام کی طرف سے عطا ہوگا۔ اس کے علاوہ عہ ۲۵ روپے ماہانہ دو سال تک جاری رہے گا، مگر یہ رعایت اس حالت میں ہے کہ طالب علم ایف اے کی تیاری میں مصروف ہو اور جو شخص درجہ دوم میں کامیاب ہوگا اس کو عہ ۱۵ روپے دو سال تک وظیفہ دیا جائے گا۔ اور سونے کی گھڑی سرکار عالی کی طرف سے اور تمغہ سیمیں معتمد تعلیمات کی طرف سے دیا جائے گا۔ جو شخص درجۂ سوم میں کامیاب ہوگا عہ ۱۰ روپے وظیفہ دو سال تک اور انعامی کتب عہ ۲۵ روپے کے سرکار عالی کی طرف سے دئے جائیں گے۔

ف۔ جریدہ ۹ محرم ۱۲۹۵ھ کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ رائچور کے مدرسے کے طلبہ کو خریدی کتب کے لئے بعض عہدہ داروں نے انعام دیا اور رقمی سلوک کیا۔ اس لئے منجانب سرکار عالی ان سب کا شکریہ ادا کیا گیا۔ جن میں نواب میر عبد السلام خاں معتمد جنگ بہادر، حکیم محمد مولٰنا صاحب، سید جعفر صاحب ناظر صفائی کا نام ہے۔

ف مدرسۂ طبابت کے طلبہ کی کامیابی سے نواب صاحب کو بڑی مسرت ہوئی جس میں تراب خاں صاحب، محمد حمید صاحب (لقمان الدولہ) عبد الحسین صاحب (ارسطو یار جنگ) ڈاکٹر مظہر حسین صاحب ہیں حقیقت میں ان چاروں اشخاص نے اپنے فن کے لحاظ سے خوب نام نکالا اور ملک میں شہرت حاصل کی۔ افسوس ہے کہ اب ایک بھی ان میں کا نہیں رہا۔

ف ضمیمہ جریدہ ۱۲ ربیع الاول ۱۲۹۶ھ کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے محرم ۱۲۹۶ھ میں اورنگ آباد کا سفر کیا سب سے پہلے صدر تعلقدار کا دفتر ملاحظہ فرمایا گیا اس کے بعد مدرسہ میں تشریف فرمائی ہوئی۔ معائنہ کے بعد نواب صاحب نے لکھا ہے کہ مدرسے کے طلبہ کی تعداد (۱۳۰) ہے لیکن بوقت معائنہ ۸۵ حاضر تھے۔ فارسی اور مرہٹی کے درجوں کی تقسیم باقاعدہ نہیں ہے، مسلمان لڑکے انگریزی پڑھنے پر راغب نہیں ہیں اس لئے نواب صاحب نے مسلمان لڑکوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ مسلمانوں کو اس زمانے میں انگریزی اور ملکی زبان سے ناواقف رہنا اور صرف عربی و فارسی پر قناعت کرنا آئندہ کی بہبودیوں سے محروم رہنا ہے۔ زبان انگریزی ہندوستان کے لئے بادشاہی زبان ہے دنیا کے بڑے بڑے حصوں میں انگریزی بولی جاتی ہے اور حقیقت میں مخزن علوم اور کلید تجارت ہے اور بغیر اس کے سیکھنے کے علوم مفیدہ حاصل نہیں ہوتے۔ انگریزی کا سیکھنا ضروریات زندگی میں داخل ہے۔ خود ہمارے مالک حضرت بندگان عالی انگریزی پڑھتے اور لکھتے ہیں خود میں بھی انگریزی پڑھتا اور لکھتا ہوں اور بات چیت کرتا ہوں۔ ہمارے ملک کے امرا بھی لکھتے پڑھتے ہیں۔ بہرحال انگریزی زبان سے احتراز کرنا نامناسب ہے۔ اس کے علاوہ مرہٹی کا جاننا ضروری ہے۔ وسیع حصہ ملک میں یہ زبان بولی جاتی ہے۔ پٹواری کے دفتر سے لے کر اول تعلقداری کے دفتر تک اس سے سابقہ پڑتا ہے۔ مدرسے کا انتظام اچھا نہیں ہے۔ صدرالمہام تعلیمات کی خاص توجہ کا محتاج ہے۔ نواب صاحب کے بعد بھی نواب صاحب کے جانشین نواب صاحب کے مجوزہ انتظامات پیش نظر

رکھ کر کاربند رہے۔

ف باورنگ آباد ہائی اسکول میں جو لڑکا مڈل کلاس میں سب سے زیادہ نمبر لے گا اس کو نواب مقتدر جنگ بہادر صوبہ دار ماہانہ پانچ روپے وظیفہ دیں گے۔ اس اعلان سے مطلع ہو کر نواب مدارالمہام سرکار عالی نے لکھا کہ نواب مقتدر جنگ بہادر کے اس نیک ارادہ سے مدارالمہام اظہار خوشنودی فرماتے ہیں (جریدہ یکم امرداد ۱۲۹۹ف)

ف جریدہ ۱۸ تیر ۱۲۹۹ف کے ذریعہ سے اس بات کا اعلان کیا گیا کہ ہر سال تیس طالب علم طبابت و انجینیری کے لئے بخرچ سرکاری انگلستان روانہ کئے جائیں گے۔ بمقدم شرط یہ تھی کہ طالب علم حیدرآبادی ہو خاندانی اور خوش رو یہ بھی ہو۔

ف جریدہ ۱۲ تیر ۱۲۹۶ف نوزدہ رمضان ۱۳۰۴ھ میں سول سروس کلاس کے احکام و قواعد ہیں۔ امتحان ۱۸۸۶ء میں ہوا ۱۱ لڑکے منتخب ہوئے۔ محمد صادق خاں صاحب، شیخ حبیب الدین صاحب، لچھمی کانت راؤ، مشید الدین صاحب، رستم جی فردون جی، سید احمد اللہ، سید اسد اللہ، رنگا ریڈی، امداد الدین، ایاز حسین، سید احمد رضوی۔

ف معزز ہندوستانیوں کے زمانہ تعلیم میں نگرانی کے لئے ایک انجمن لندن میں قائم ہے اس کے اخراجات کا اندازہ حسب ذیل ہے۔ معمولی تعلیم کے لئے سالانہ دوسو پونڈ معادل سکہ حالی یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے سالانہ ۲۵۰ پونڈ سول سروس کے لئے سالانہ ۳۰۰ پونڈ۔ بارسٹری کے لئے سالانہ ۳۰۰ (جریدہ یکم شہریور ۱۲۹۶ف)

ف سرکار کے خیالات کا اثر ضرور عہدہ داروں پر پڑتا ہے۔ سرکار کو ملک کے لڑکوں کی کامیابی امتحان سے مسرت ہوتی ہے تو سرکاری عہدہ دار ایسے خوش کن مواقع کے منتظر رہتے ہیں یہ موقع ملتے ہی فوراً سرکار کو اطلاع دے دیتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر ہڈسن پرنسپل نظام کالج نے اطلاع دی کہ اس مدرسے کے تین شاگرد امام الدین خاں، محمد صدیق، عبدالمجید مدراس یونیورسٹی کے امتحان میٹرکیولیشن میں کامیاب ہوئے اس لئے مدارالمہام خوشنودی ظاہر کرتے ہیں زیادہ تر خوشنودی کی وجہ یہ ہے کہ منجملہ کامیاب طلبہ کے امام الدین خاں (دائم جنگ) نواب تہنیت یار الدولہ کے پوتے نے بھی کامیابی حاصل کی (جریدہ ۳۰ فروردی ۱۲۹۰ف)

ف۔ نواب اظہر جنگ کے والد مولوی محمد اکبر صاحب اپنے زمانۂ طالب علمی میں تین بجے رات کے محلہ کالی کمان سے اپنے استاد کے گھر واقع فتح دروازہ جبالالانہ ادام جاتے تھے۔ اس زمانے میں راستوں پر سرکاری روشنی مطلق نہیں رہتی تھی۔ مولوی محمد اکبر صاحب جب چار مینار کے پولیس کے تھانہ پر سے گزرے تو جوان نے قاعدہ کے مطابق پوچھا کون ہو؟ جواب دیا گیا راستہ والا ہوں۔ اس طرح دو یا تین دن گزرے اس کے بعد جوان نے تھانے پر بلایا قندیل سے اس نے صورت دیکھی اور نام پوچھا ولدیت وسکونت دریافت کی اور کہا آپ ہر روز کہاں جاتے ہیں مولوی صاحب نے کہا اپنے استاد کے پاس پڑھنے جاتا ہوں۔ یہ سن کر رخصت کیا۔ صبح میں حسب عادت مولوی محمد فضل اللہ صاحب ناظم عدالت دیوانی بزرگ نواب صاحب سے ملنے گئے۔ نواب صاحب نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ آپ کے کون سے فرزند مولوی محمد حمید الدین یا مولوی محمد عبدالقادر اتنی بڑی رات کو پڑھنے جاتے ہیں۔ مولوی صاحب نے عرض کیا فدوی کا تیسرا لڑکا محمد اکبر جاتا ہے۔ نواب صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ استاد شاگرد دونوں قابل تعریف ہیں۔ غرض اسی زمانے میں یہ واقعہ یاد رکھ کر کچھ [illegible] کے بعد نواب [illegible] محمد اکبر صاحب کے نام تنخواہ منصب جاری فرمادی اور پھر وہ زمانہ آیا کہ محمد اکبر صاحب کو

نواب سالار جنگ نے نائب ناظم محکمۂ قضایائے عرب کا عہدہ دیا بعد وظیفہ یابی کے مبارک عہد عثمانی میں چھ سو روپے تنخواہ سے مہتمم اعراس و نیاز مقرر ہوئے۔ ان کے انتقال پر حضور نے مولوی صاحب کی مستعدی و صداقت کی تعریف کی اور حکم دیا کہ سرکاری خرچ سے تجہیز و تکفین عمل میں آئے۔ ان کے دو لڑکے نواب اظہر جنگ اور نواب صدیق یار جنگ نے اپنے باپ کا نام نکالا اور شہرت حاصل کی۔

محمد شمس الدین صدیقی

نئی کتابیں

۱۔ معلومات جنگ (موجودہ جنگ کے حالات) از پنڈت گوند سہائے ۴۰ صفحے قیمت ۸؎ زم زم بک ایجنسی۔ لاہور

۲۔ جدید ترکی (قدیم و جدید ترکی کے حالات) از صدیق حسن قیمت ۸؎ سلطان حسین تاجر کتب۔ بمبئی

۳۔ اسلام کا نظام حکومت (اسلام کا نظریہ سیاست و سلطنت) از حامد الانصاری غازی ۵۰۰ صفحے قیمت صہ اردو بک اسٹال۔ لاہور

۴۔ چراغ لالہ (مجموعۂ کلام) از صائب عاصمی ۱۲۰ صفحے قیمت ۸؎ ۔ اردو بک اسٹال لاہور۔

۵۔ کشمکش (رابندر ناتھ کے ناول کا ترجمہ) از پریم چند لاہوری ۳۲۰ صفحے قیمت عا؎ اردو بک اسٹال لاہور

۶۔ دیہاتی سماج (سرت چندر چیٹرجی کے ناول کا ترجمہ) از یزدانی جالندھری ۱۷۶ صفحے قیمت ۸؎ اردو بک اسٹال لاہور

۷۔ ہمارے بچے (تعلیم و تربیت) از جگدیش سنگھ ایم اے۔ قیمت ۸؎ ۔ اردو بک اسٹال۔ لاہور۔

۸۔ آخری فیصلہ (ناول) از قیسی رامپوری قیمت عسعہ ۔ اردو بک اسٹال۔ لاہور۔

۹۔ دل کی آواز (ناول) از قیسی رامپوری قیمت ۸؎

۱۰۔ دیہات میں تعلیم (کسانوں کو تعلیم دینے کے طریقے) از عبد الشکور۔ ایم اے۔ پرنسپل حلیم مسلم کالج کانپور۔ ۱۰۴ صفحے قیمت سعہ۔

۱۱۔ صبح انقلاب (ہندوستان کی مفلسی کا نقشہ) از انعام اللہ خاں ناصر قیمت ۱۲؎ اردو بک اسٹال۔ لاہور

۱۲۔ تراجم علمائے حدیث ہند جلد اول (علما کا تذکرہ) از ابو یحییٰ امام خاں ۵۷۶ صفحے قیمت عا؎ ۔ اردو بک اسٹال۔ لاہور

۱۳۔ ساز شکستہ (ناول) از رشید اختر ندوی قیمت عہ۔ اردو بک اسٹال لاہور

۱۴۔ قصص القرآن حصہ دوم از محمد حفظ الرحمن سیوہاروی۔ قیمت للعہ ۔ اردو بک اسٹال۔ لاہور

۱۵۔ محشر خیال۔ دوسرا ایڈیشن (مجموعہ مضامین سجاد علی انصاری مرحوم) قیمت عا؎ ۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔

۱۶۔ وحی الٰہی (وحی کے منجانب اللہ ہونے کے دلائل) از سعید احمد ایم اے۔ ۱۹۲ صفحے قیمت ۱۲؎ ندوۃ المصنفین۔ دہلی

۱۷۔ ہماری غذا (انگریزی کتاب کا ترجمہ) از مبارز الدین احمد ۱۵۲ صفحے قیمت ۸؎ ۔ انجمن ترقی اردو۔ دہلی۔

۱۸۔ فارسی بھگوت گیتا۔ (بھگوت گیتا کا فارسی منظوم ترجمہ) از محمد شفیع ۲۳۲ صفحے۔ ایم۔ ایس کمبوہ۔ خیالستان۔ گڑھی شاہو۔ لاہور

۱۹۔ رضا شاہ پہلوی (مختصر سوانح) از محمد اشرف خاں ۶۷ صفحے قیمت ۶؎ مکتبۂ اردو۔ لاہور

۲۰۔ منظر و پس منظر (افسانے) از اختر اورینوی۔ قیمت عا؎ ۔ مکتبۂ اردو۔ لاہور

مرزا سیف علی خاں

غزل

تو دور ہے اور تجھ کو بھلایا نہیں جاتا
دامن ترے ہاتھوں سے چھڑایا نہیں جاتا

ہر آنکھ سے پوشیدہ نہیں حالِ محبت
ہر آنکھ کو یہ حال دکھایا نہیں جاتا!

ہر رند نہیں تشنہ لبِ جامِ محبت
ہر رند کو یہ جام پلایا نہیں جاتا

بے وجہ نہیں حسن حجاباتِ حرم میں
اور ذوقِ طلب یوں ہی بڑھایا نہیں جاتا

بربادیٔ دل عشق میں دیکھی نہیں جاتی
یہ نقشِ تمنا ہے مٹایا نہیں جاتا

وہ دل جو کبھی بن نہ سکا سازِ مسرت
کیوں سوزِ مجسم ہی بنایا نہیں جاتا

دیوانگیٔ جوشِ محبت کا گلہ کیا!
دیوانے کو جب ہوش میں لایا نہیں جاتا

سوزِ غم بھلا دیتا ہے انسان جہاں میں
اک زخم مگر دل کا بھلایا نہیں جاتا

ہر لحظہ تری یاد سے بڑھتی ہے خلش اور
اور بھولنا چاہیں تو بھلایا نہیں جاتا!

پنہاں نہیں رہتا نگہِ حسن سے حسرت
وہ رازِ محبت جو بتایا نہیں جاتا!

حسرت ترمذی

مجبوری

کرم ہے، مہربانی ہے، کہ تم کو یاد ہوں اب تک
مگر مجبور ہوں، فرصت نہیں، میں آ نہیں سکتا
مرا دل ان دنوں لطفِ محبت پا نہیں سکتا
تمہیں معلوم ہے ناشاد تھا، ناشاد ہوں اب تک
وہی ہیں زندگی کی الجھنیں، برباد ہوں اب تک

(۲)

ابھی ممکن نہیں اس قید سے آزاد ہو جاؤں
میں تم تک آ نہیں سکتا، بجھا دو مشعلِ امید
نہیں ہے دل میں اب وہ گرمیٔ جذباتِ ذوقِ دید
یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا کہ آسائش میں کھو جاؤں
گھڑی بھر کے لئے آغوشِ مدہوشی میں سو جاؤں

(۳)

پریشاں، بے اماں، حیراں ہوں دل سوز آہوں سے
یہ دنیا ہے، یہاں آرامِ جاں یوں ہی نہیں ملتا
یہاں دل کا کنول عیش و مسرت سے نہیں کھلتا
کچھ اکتا سا گیا ہوں زندگی کی سخت راہوں سے
ان آلام و مصائب سے، جہاں کی حشرگاہوں سے

(۴)

وہی ناکامیاں ہیں، مرکزِ بیداد ہوں اب تک
تمہیں معلوم ہے ناشاد تھا، ناشاد ہوں اب تک

تحسین سروری

خطبۂ صدارت !

(ایک طالب علم نے اساتذہ کی مجلس میں پڑھ کر سنایا)

معزز اساتذہ ! آج یہ پہلا موقع ہے کہ ایک طالب علم کو اساتذہ کی مجلس میں افتتاحی تقریر کرنے کا موقع ملا ہے۔ ہماری موجودہ تعلیم کی یہ بڑی خرابی ہے کہ پڑھے، لکھے لوگوں کی زبان زور سے چلتی ہے۔ اور ہاتھ، پیر شل ہو جاتے ہیں۔ تقریر سننے اور تقریر کرنے کا مرض عام ہے۔ تقریر کے چٹخارے کے بغیر زبان بے جان معلوم ہوتی ہے۔ کان اس لذت کے حاصل کرنے کے ہمیشہ آرزومند نظر آتے ہیں۔ یہ بات مستحسن نظر سے دیکھے جانے کے قابل ہے کہ آپ نے مجھے بولنے کا موقع عطا فرمایا۔ نوجوان خون کے شرارے اٹھتے ہوئے دیکھ کر یقین ہے کہ آپ کے بے حس اور ساکن خون میں بھی جوش پیدا ہو جائے گا۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ نہ ہو تو پھر آپ اپنے جلسوں کا افتتاح رقص و سرود کی محفل اور موسیقی کے پروگرام سے فرمایا کریں۔

اس مرتبہ اس منصب کو ادا کرتے ہوئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ مل کر تعلیم کے مسئلہ پر غور کروں اور اس کے بعض تاریک پہلوؤں کو اجاگر کروں۔

ہندوستانی گھرانوں کی جو حالت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہر فرد جہالت کا پتلا بنا رہتا ہے۔ صبر و شکر، قناعت اور ایمان اس جہالت کی جڑ بنیاد ہیں جس میں عورت، مرد سب مبتلا رہتے ہیں۔ خدا پر بھروسہ، تقدیر پر قناعت ان کا روزمرہ کا اصول ہے جس پر یہ کاربند رہتے ہیں۔ اٹھتے، بیٹھتے "انشاء اللہ" اور "خدا نے چاہا" کہتے رہتے ہیں۔ اب اگر مغربی طرز تعلیم میں ہمت اور جوش اور اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنا سکھایا جائے تو اس کا اثر اس لئے نہیں ہوتا کہ مدرسے کا ماحول جدا اور گھر کی فضا مختلف ہوتی ہے۔

حضرات ! ہندوستانی لوگ آب و ہوا کے اثرات کے تحت آرام طلب ہو جاتے ہیں، زیادہ کام کرنے میں تھکن محسوس کرتے ہیں۔ کام کم اور وقت زیادہ ہو تو کام کی جلدی بھی نہیں ہوتی اور پھر آج ہوا تو کیا اور کل ہوا تو کیا۔ کھانے کو روٹی مل جائے تو بس ہے۔ اس سے زیادہ کام کی ضرورت نہیں لیکن اس کے باوجود ہندوستانی کاریگر نے جیسی چیزیں پیدا کیں دنیا میں اب تک ناپید ہیں۔ اس کی دستکاری کے اعلیٰ نمونے آج بھی عجائب روزگار ہیں اور اس سے ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔ یورپ نے آدمی کو آدمی نہیں سمجھا، مشین کا پرزہ بنا دیا۔ باوجود اس کے بعض ناسمجھ حضرات یورپ کی مثالیں دے کر ہندوستان کے لوگوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنانا چاہتے ہیں، کیا آج ہٹلر نے یورپ کا نظام شمسی تہ و بالا نہیں کر ڈالا اور کیا یورپ کے اکثر ممالک کی زمین پر آسمان نہیں ٹوٹ پڑا۔ بہتر ہوگا کہ ہمارے رہنا یورپ کے پڑھے، لکھے اور تہذیب یافتہ وحشیوں کی مثالیں دینا چھوڑ کر ملک و قوم پر احسان کریں۔ حضرات ! ہر ملک کا رسم و رواج جدا ہوتا ہے۔ ہمارے کھانے پینے اور شادی بیاہ کے رسم و رواج بھی مختلف ہیں۔ آخر ہماری ہر بات قابل نفرت کیوں ہے اور یورپ والوں کی ہر بات قابل تقلید اور قابل تعریف کیوں نظر آتی ہے۔ شادی بیاہ کی دعوتوں میں ہمارے ہاں ہمارے سب عزیز و اقارب امیر ہوں یا غریب، موٹر نشین ہوں یا ہل چلانے والے سب شریک ہوتے ہیں۔ پھر وہ دعوت کھا کر چلتے پھرتے نظر نہیں آتے بلکہ عزیز و اقارب سے ملتے ہیں، چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں، اور "صبح تا نصف النہار" کام میں معروف رہ کر دوپہر میں ایک نیند سو رہتے ہیں۔ شادی کے

کاموں سے فارغ ہوکر دن چھپے اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ اگر آپ نے ولایت میں الکشن کے زمانے میں شراب نوشی کے جلسے دیکھے ہیں۔
تو آئندہ باضابطگی اور باقاعدگی اور اصول کی تلقین فرمانا بھول جائیں گے۔ یہ صحیح ہے شور کرنا اور چلانا بری بات ہے۔ یورپ میں لوگ
کمروں میں بند رہتے ہیں۔ زور سے بات کرنے اور چلانے کی ان کو ضرورت نہیں مگر ہندوستان میں آب و ہوا کے اثرات کے تحت ہم میدان
میں کھلی ہوا میں رہتے ہیں۔ کھیت کی زندگی آپ کو گزارنی پڑے تو معلوم ہو کہ کمروں میں کانا پھوسی کرنا آسان ہے کہ دوسرے کھیت سے
اپنے ساتھی کو وہی بلا سکتا ہے، جس کے پھیپھڑے مضبوط ہوں۔ تنہائی میں بیٹھ کر پڑھنے والا آج اس قدر نازک مزاج ہو گیا ہے کہ بچوں کا
چلانا بھی اس کی طبع نازک پر گراں گزرتا ہے۔ میں اکثر ولایت پلٹ لوگوں سے سنا کرتا ہوں کہ ٹکٹ لینے کے وقت وہاں لوگ ایک لکیر بنا کر
کھڑے ہو جاتے ہیں اور نمبروار ٹکٹ خریدتے ہیں اول تو یہ بات صرف انگلستان میں ہے۔ یورپ کے دوسرے ممالک میں ایسا کچھ
نہیں ہوتا۔ انگلستان میں بھی چارلی چیپلین کے ایک تماشے میں لوگ سب لائن وائن بنانا بھول گئے اور ٹکٹ خریدنے میں ایک کے
اوپر ایک گرنے لگے۔ پھر دوسری بات آپ نے کبھی یہ بھی سوچی کہ وہاں ریل میں صرف دو درجے ہوتے ہیں! سچ بتائیے آپ میں سے
کتنے حضرات ایسے ہیں جو اپنا ٹکٹ خریدنے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر کمبل پوش کے پیچھے کھڑا ہونا گوارا کریں گے۔ تعلیم پاکر یا عہدہ دار
بن کر عوام کو آپ اپنے برابر تو کیا سمجھیں گے، آدمی بھی نہیں سمجھتے اور چاہتے ہیں کہ ٹکٹ خریدتے وقت ایک لکیر میں کھڑے ہو جائیں۔
انگلستان میں ایک قوم ہے اور فرق مراتب اتنا نمایاں نہیں۔ یہاں ذات پات کے جھگڑوں کو چھوڑئے اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر
بتائیے کہ ایک غریب کا آپ کی نگاہ میں کیا درجہ ہے۔ باتیں بنانے سے اچھا ہے کہ آپ خود نمونہ بن کر پیش ہوں۔ آپ کی مثال
دوسروں کے لئے نمونہ ہوگی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوگوں میں غرور اور تمکنت پیدا نہ ہو تو کیوں نہ آپ
خود بسم اللہ کریں اور منہ سے کرامات کرنا چھوڑ دیں۔ استاد کا طرز عمل شاگرد کے لئے سنگ راہ کا کام دیتا ہے۔ باتیں بھول جاتے ہیں عمل
یاد رکھتے ہیں اور خود بھی ویسا ہی کرتے ہیں۔ چلنے میں زاویہ قائمہ بنائے یا زاویہ منفرجہ مگر یہ بات یاد رکھئے! اگر آپ کے دل میں غرور
نہیں ہے تو کسی زاویہ سے غرور کا شائبہ تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ چلنے اور بیٹھنے کے طریقوں سے زیادہ اہم بات کرنے کا طریقہ ہے۔ سلام
کرنے اور ہاتھ ملانے میں دل کی گرمجوشی اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ بالکل صحیح ہے کہ "جس طرح دوسروں کی نظریں ہمیں دیکھ سکتی ہیں
کاش ہم خود بھی اپنے آپ کو ویسے ہی دیکھ سکتے"

جدید، لذیذ، نئی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ جب ایسا ہو جاتا ہے تو میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اس سے کیسا پیچھا چھڑاؤں اور
یہی حال کپڑوں اور برتنوں کی دوسری چیزوں کا ہے۔ اس کے لئے ہم اپنی زندگی وقف کر دیتے ہیں، اور نئے نئے فیشن اور نئی نئی چیزیں
پیدا کرتے رہتے ہیں۔ غالب مرحوم تو ہر موسم بہار میں پرانی چیزیں تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ ان کو یہ مقولہ پسند نہیں تھا کہ "رکھی
ہوئی چیز کام آتی ہے" بچوں کا دل جب کسی چیز سے بھر جاتا ہے تو اسے ضائع کر دیتے ہیں۔ غرض چھوٹے بڑے سب میں پرانی اشیاء کے
بدلے جدید اشیاء حاصل کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ اسی خیال کے تحت میرے بعض ساتھیوں نے کرسیوں کی ہیئت کاٹ ڈالی۔ اس میں کوئی
ہرج نہیں۔ ہیئت کے پرانے ہونے ٹوٹ جانے اور تبدیل کرانے تک بہت زمانہ لگتا۔ اب ہر جماعت میں نئی کرسیاں نئی ہیئت کی فراہم کی جائیں گی۔
اب میں اس تحریر کو ختم کرتا ہوں مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس طرح کوئی دو انسان صورت میں ایک دوسرے سے نہیں ملتے اسی طرح کوئی

دو آدمی ایک خیال پر متفق نہیں ہوتے اور پھر مشرق تو مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ ممکن نہیں کہ یہ ایک دوسرے سے مل جائیں۔ لیکن تعلیم حاصل کرنے سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک ہم اپنے پیارے وطن ہندستان سے محبت کرنا نہ سیکھیں۔ اس کی برائی کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔ اور اس کے سورماؤں کی حقیقی عظمت نہ کریں۔ اگر کسی بات پر غور کرنا ہو تو بجائے بدیسی نقطۂ نگاہ کے خالص دیسی نظر نہ ڈالیں۔ جب تک ہمارے خیال میں غیروں کا رعب و دبدبہ جما رہے گا ہمارا ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ اے خدا تو ہمیں توفیق دے کہ ہم غیروں سے مرعوب نہ ہوں اپنے ملک اور ملکی بھائیوں سے محبت کرنا سیکھیں۔

سبحان اللہ

افسانے کی موت

عرصے سے کوئی تازہ فسانہ نہیں لکھا
جنبش کسی نے سازِ تخیل کو دی نہیں
دوشیزۂ غریب، نہ کالج کی نازنیں!!

روداد حسن و عشق زمانہ نہیں لکھا!
مدت ہوئی دوبارہ نہ محسوس کرسکا
پتھر ہو جب کہ رات کی خاموش کائنات
مسجد کے پاس قصرِ حسیں کے تاثرات

میں پھر نہ ان نظاروں کو مانوس کرسکا!
کچھ دن ہوئے رباب تاثر خموش ہے
حالانکہ دیکھتا ہوں فضاؤں میں انتشار
حالانکہ سن رہا ہوں زمینوں پہ اک پکار

لیکن مجھے نہ فکر ہے کوئی نہ ہوش ہے
آخر یہ موت میرے فسانے کی کس لئے
پابندِ فکر بھی ہے زمانے کی کس لئے

سلام (مچھلی شہری)

آزادی

لکھا پڑھا نوکر ہوا پنشن بھی لی مرجاؤں گا
سب کام تو میں کرچکا یہ کام بھی کرجاؤں گا
مرنے ہی کو پیدا ہوا مرجاؤں تو چھٹی ملے
اسکول میں آیا تھا میں اسکول سے گھر جاؤں گا

آزاد (حیدرآبادی)

شمس الامرا امیر کبیر

محمد فخر الدین خاں نام۔ ابو الخیر خاں، امام جنگ، خورشید الدولہ، خورشید الملک، شمس الامرا، امیر کبیر خطابات ہیں۔ آپ اپنے پدر بزرگوار نواب شمس الامرا اول کے انتقال پر جانشین ہو کر امیر پائیگاہ کہلائے اور دادا کا نام ابو الخیر خاں پایا۔ ۱۱۹۵ھ میں بمقام بلدۂ حیدر آباد دکن پیدا ہوئے۔ پدر بزرگوار کے انتقال کے وقت آپ دس سال کے تھے کم عمری سے ہی نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی نوازشات آپ پر مبذول ہوتی رہیں۔ آپ کی ممتاز ہستی نہ صرف امرائے پائیگاہ بلکہ تاریخ دکن میں بھی اہم حیثیت رکھتی ہے اور تاریخ دکن اپنے اس قابلِ فخر سپوت پر ہمیشہ بجا طور پر فخر کرے گی۔ امرائے پائیگاہ میں آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جو بادشاہ کی دامادی کے رشتے میں منسلک ہوئے اور آج تک آپ کی اولاد کو بھی یہ فخر حاصل ہے کہ وہ خاندان آصفی کی شاہزادیوں کے ساتھ ازدواج کا امتیاز حاصل کرتے ہیں۔ حضرت بشیر النساء بیگم پہلی شاہی خاتون تھیں جو اس خاندان میں بیاہی گئیں۔ چنانچہ ۱۲۱۵ھ ۱۸۰۰ء میں آصف جاہ ثانی نے اپنی صاحبزادی بشیر النساء بیگم کو آپ کے عقد میں دے کر دس ہزاری ذات اور دس ہزار سوار کے منصب سے سرفراز فرمایا۔ یہ منصب مغل شاہنشاہوں کے دربار میں تمام مناصب سے ارفع و اعلیٰ سمجھا جاتا تھا اور ایسا جلیل القدر تھا کہ شاہنشاہ اکبر نے اپنے اکاون سالہ دورِ حکومت میں شاہزادۂ سلطان سلیم کو اس سے ممتاز فرمایا تھا۔

۱۲۴۳ھ ۱۸۲۷ء میں آپ کو امیر کبیر اور شمس الامرا کے خطابات عطا ہوئے۔ آپ قدامت پسند اور اچھے عالم، سخن پرور اور ریاضی داں امیر تھے۔ اسی لئے امیر کبیر کی ذات شعرا و مصنفین کی ملجا و ماویٰ تھی۔ علم و فن کی ترویج کے لئے اربابِ کمال کی ہمت افزائی کا پورا پورا سامان مہیا فرماتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے مشہور شاعر حضرت میر شمس الدین محمد فیضؔ کی خاص طور پر آپ نے سرپرستی فرمائی اور دربارِ شاہی تک پہنچا دیا۔ فیضؔ بھی آپ کے ذوقِ علم و عمل کے مداح تھے۔ لیکن یہ مدحت طرازی محض حرص و ہوس کا نتیجہ نہ تھی بلکہ خلوص اور علم دوستی کی خاطر تھی، امیر کبیر کی اکثر تصانیف کے قطعات تاریخی بھی فیضؔ نے لکھے ہیں۔ چنانچہ مشہور کتاب "ستۂ شمسیہ" کی تاریخ تالیف اس مصرعہ میں نکالی ہے۔ "شمس الامرا کی ہے یہ تالیف"

عہد حاضر کا سب سے بڑا اور درخشاں کارنامہ زبان اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے جامعہ عثمانیہ کا قائم کرنا ہے مگر حقیقت میں اس کی تحریک نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کے عہد میں آج سے سو سال پہلے ظہور میں آئی تھی جس کے محرک امیر کبیر شمس الامرا نواب محمد فخر الدین خاں تھے۔ آپ بڑے فیاض، نیک دل اور علوم و فنون کے سرپرست ہونے کے علاوہ خود بھی نہایت ذی علم اور علوم مشرقی و مغربی کے زبردست عالم تھے۔ علم ہیئت اور جدید سائنس سے آپ کو گہری دلچسپی تھی۔ آپ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ علوم جدیدہ کو حاصل کئے بغیر اہلِ حیدر آباد کا ترقی کرنا محال ہے۔ اس لئے آپ نے فرانسیسی اور انگریزی زبانوں سے علم جر ثقیل، علم ہیئت، علم اسطرلاب علم مناظر و مرایا، علم اقلیدس، علم جبر و مقابلہ، علم حساب، علم آب، علم ہوا، علم برق، علم مقناطیس، علم کیمیا، علم طب جدید، علم ادویہ جدیدہ وغیرہ پر متعدد کتابیں خود ترجمہ کیں، اور متعدد کتابیں دوسرے اربابِ علم سے ترجمہ کرائیں۔ ان علوم و فنون کی تعلیم کے لئے ایک عالی شان

مدرسہ قائم کیا۔ اس کا نام مدرسۂ فخریہ رکھا۔ مدرسین اور طلبہ دونوں کے اخراجات اپنے ذمہ لئے۔ ۱۸۴۲ء میں چار سو اٹھائیس (۴۲۸) طلبہ اس مدرسے میں زیرِ تعلیم تھے۔ اور چھبیس ۲۶ ہزار روپے سالانہ کا خرچ اس پر عائد ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ہیئت کی علمی تعلیم اور اجرام فلکی کے مشاہدات کے لئے ۱۸۳۵ء میں پندرہ لاکھ روپے کے صرفے سے قصر جہاں نما کی تعمیر عمل میں آئی۔ قصر جہاں نما اور اس کے بازارات کی تعمیر میں جو جدت پیدا کی گئی تھی اور جس کا شہرہ ہندستان سے گزر کر یورپ تک پہنچ چکا تھا آپ کے ذوقِ تعمیر کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا۔ علم ہیئت سے متعلق قدیم و جدید آلات اور بڑی بڑی دوربینیں یورپ سے منگوا کر اس رصد خانے (جہاں نما) میں نصب کیں۔ غرض کہ آپ نے تعلیم جدید کے رواج دینے میں ایسی جد و جہد کی کہ اس کی وجہ سے حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں آپ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں بعہد نواب ناصرالدولہ آصف جاہ چہارم آپ منصب مدارالمہامی پر بھی فائز ہوئے جس کی تاریخ سرفرازی حضرت فیضؔ نے یوں کہی تھی "وزیر مطلق شاہ دکن امیر کبیر" لیکن چھ ماہ نہایت کامیابی کے ساتھ کام کرنے کے بعد ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں آپ نے خود ہی استعفاء پیش فرمادیا۔ ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) بعہد نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس چوراسی سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔ "دلا کوئی ایسا پایا نہیں" (۱۲۷۹ھ) مصرعہ تاریخ وفات ہے۔

شمس الامرا امیر کبیر کے پانچ صاحبزادے تھے جن میں سے ایک کا بہت ہی کم سنی میں انتقال ہوا اور نواب حافظ محمد بدرالدین خاں معظم الملک تیرؔ اور نواب محمد سلطان الدین خاں سیف جنگ بھی پہلے فوت ہو چکے تھے اس لحاظ سے اب صرف دو صاحبزادے نواب محمد رفیع الدین خاں عمدۃ الملک اور نواب محمد رشید الدین خاں وقارالامرا باقی رہ گئے تھے۔ اس لئے وفات کے بعد مرحوم کے تیسرے صاحبزادے نواب محمد رفیع الدین خاں عمدۃ الملک اپنے والد بزرگوار کے جانشین اور شمس الامرا امیر کبیر بنائے گئے۔

سید مراد علی طالعؔ

چاند

(بیوہ کی زبانی)

اے چاند! آسماں سے مکھڑا دکھانے والے
اپنی کہانی واں سے مجھ کو سنانے والے

رکھتا ہے سوگ کس کا ہر دم اداس تجھ کو
کیا اب بھی ہے کسی کے آنے کی آس تجھ کو

تو ڈھونڈتا ہے کس کو تاروں کے کارواں میں
امید کی جھلک ہو باقی تری فغاں میں

مت ڈھونڈھ اب کسی کو، اے چیت کے پجاری
بادل میں چھپ کے ہو جا مصروفِ غم گساری

تو داغِ دل دکھاتا پھرتا ہے آسماں میں
پر میری آہ کوئی سنتا نہیں جہاں میں

تیری اداس نظریں تڑپا رہی ہیں مجھ کو
تصویر زندگی کی دکھلا رہی ہیں مجھ کو

رنج و محن کی آتی ہر سمت سے صدا ہے
درماندگی ہی شاید ہر دکھ کا آسرا ہے

اس آسماں میں کوئی دکھیا نہیں ہے تجھ سا
آجا یہاں زمیں پر دکھیوں کے دیس میں آ

دنیا کے غم کدے پر ماتم گسار ہو جا
آ کر یہاں کسی کی شمعِ مزار ہو جا

محمد نعیم الدین صدیقی

سلطان محمد قلی قطب شاہ

یہ کتاب، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، دکن کے قطب شاہی خاندان کے پانچویں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کی سوانح عمری ہے۔ اس کے مصنف عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے فاضل پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ہیں۔ کتاب دس حصوں میں تقسیم کی گئی ہے، جس میں محمد قلی کی زندگی کے مختلف پہلو اور اس کے کارنامے تفصیل کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے زیادہ اس ملک کی ادبی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اردو کا سب سے پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ اس کے علاوہ فارسی اور تلنگی زبانوں میں بھی شعر کہتا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کے اردو دیوان کے کئی قلمی قدیم نسخے اب بھی موجود ہیں۔ سب سے اچھا اور سب سے زیادہ مکمل نسخہ وہ تھا جو محمد قلی کے جانشین محمد قطب شاہ نے مرتب کرکے اپنے کتب خانے کے لئے نقل کروایا تھا۔ یہ نسخہ چند سال پہلے تک حیدرآباد کے کتب خانۂ آصفیہ میں موجود تھا مگر زیرِ تبصرہ کتاب میں مصنف نے کئی جگہ نہایت افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ اب وہ نسخہ کتب خانے میں موجود نہیں ہے۔ بہرحال مصنف نے اس کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں محمد قلی قطب شاہ کے دیوان کے تین مختلف نسخوں کا مطالعہ بہت غور کے ساتھ کیا ہے، اور اس بادشاہ کے حالاتِ زندگی فراہم کرنے میں خود اس کے کلام سے بہت کام لیا ہے۔ اس چیز نے ان کی کتاب کی قدر و قیمت میں بہت اضافہ کردیا ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کو بہت محنت سے لکھا اور سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ انھوں نے واقعات اور حالات پر گہری نظر ڈالی ہے اور ان کو پیش کرنے میں بڑی وسعتِ نظر سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کی تحریروں میں ایک خوبی ہمیشہ نظر آتی ہے۔ یعنی ان کا مقامی اور مذہبی تعصب سے آزاد ہونا۔ یہ خوبی ان کی اس تصنیف میں بھی بہت نمایاں ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے مذہبی عقائد اس کے عہد کی مذہبی تقریبیں اور اس کا بڑے بڑے منصبوں پر دکھنیوں کو چھوڑ کر ایرانیوں کو مقرر کرنا، یہ ایسے مقامات تھے کہ اگر مصنف ذرا بھی مقامی یا مذہبی تعصب کو دخل دیتا تو صحیح نتیجوں تک ہرگز نہ پہنچ سکتا۔ مگر ڈاکٹر زورؔ نے ان مقامات پر جس رواداری اور غیر جانب داری کا ثبوت دیا ہے۔ وہ آج کل کے لکھنے والوں میں کمیاب ہے۔ ان کی یہی صفتیں ہیں جو ان کو ایک کامیاب محقق بنا دینے کی ضامن ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ نے محمد قلی قطب شاہ کا کلیات بھی مرتب کردیا ہے، جس کو حیدرآباد کی "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات" نے شائع کیا ہے مگر اس شاعر بادشاہ کی سوانح عمری اس کی شاعری کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اس کتاب میں بھی اس کی زبان اور شاعری کی خصوصیتوں کا مختصر تذکرہ آگیا ہے اور اس کے اردو اور فارسی کلام کا مختصر انتخاب بھی شامل کردیا گیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کا کلام آج سے ساڑھے تین سو برس پہلے کی اردو شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ صدیوں پہلے کی زبان آج کی زبان سے بہت کچھ مختلف ہوگی، لیکن اس اختلاف کے باوجود ہم اس کو اردو کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔

یہ کتاب اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے، جس کے لئے حضرت مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(یہ اس طویل تقریر کا اقتباس ہے جو پروفیسر صاحب نے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے اس کتاب پر نشر کی تھی)

سید مسعود حسن رضوی

ادارہ کی خبریں

مجلس انتظامی ادارہ

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس پنجشنبہ ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۴۲ء شام کے ساڑھے چار بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔ مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری نے صدارت اور حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱۔ مولوی عبد المجید صاحب صدیقی
۲۔ مولوی عبد القادر صاحب سروری
۳۔ مولوی عبد القادر صاحب صدیقی
۴۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
۵۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ معتمد ادارہ۔

مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب نائب صدر ادارہ نے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دی کہ وہ اس وقت کسی دوسری کمیٹی میں مصروف ہیں اس لیے کسی اور صاحب کی صدارت میں جلسہ شروع کر دیا جائے۔

مولوی سید محمد اعظم صاحب نے بذریعہ فون اور مولوی سید علی اکبر صاحب نے بذریعہ خط شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

۱۔ گزشتہ اجلاس کی روئداد پڑھ کر سنائی گئی اور اس کی توثیق عمل میں آئی۔

۲۔ گزشتہ مجلس انتظامی کے بعد سے ادارے کی جو شاخیں حسب ذیل مقامات پر قائم ہوئیں اور جن کا اجازت نامہ معتمد نے منجانب ادارہ روانہ کیا تھا ان کے قیام کی منظوری کی توثیق کی گئی۔

اورنگ آباد ۲۔ الند شریف ۳۔ بالا گھاٹ ۴۔ بھیوم ۵۔ رینا پور ۶۔ پٹن ۷۔ بیشرم ۸۔ سائے گاؤں ۹۔ مومن آباد ۱۰۔ نظام آباد۔

۳۔ عمارت ادارہ سے متعلق ناظم صاحب آرائش بلدہ و معتمد صاحب سیاسیات سے جو مراسلت ہوئی تھی پڑھ کر سنائی گئی اور طے پایا کہ اس معاملہ میں پہلے معتمد ادارہ مولوی محمد میر خاں صاحب معتمد باب حکومت سے تبادلۂ خیال کریں اور اس کے بعد حسب ضرورت مراسلت کی جائے۔

۴۔ ادارے کے نمائش گھر کے لیے صدر المہامی صرف خاص سرکار سے گولکنڈے میں زمین حاصل کرنے کے سلسلہ میں جو مراسلت جاری ہے پڑھ کر سنائی گئی اور طے پایا کہ شرائط نمبر (۱) اور (۳) میں کچھ تبدیلی کے بعد تحت شرائط پٹہ کرا لیا جائے۔

۵۔ کتاب ہندستانی تمدن کی تاریخ مولفہ ڈاکٹر ایشور ناتھ صاحب ٹوپا کا مسودہ پیش کیا گیا۔ طے پایا کہ یہ کتاب ادارے کی طرف سے چھپوائی جائے بشرطیکہ زبان کے لحاظ سے نظر ثانی ہو اور حجم ممکنہ حد تک گھٹا یا جائے۔ نیز یہ کہ ادارہ پر پانچ سو روپے سے زیادہ کے اخراجات کا بار عائد نہ ہو۔

۶۔ ادارے کے سالانہ جلسے اور جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات کے لیے ۲۱ اور ۲۲ ڈسمبر م ۱۲ ر اور ۱۳ ر ذیحجہ کی تاریخیں متعین کی گئیں اور جلسوں کی صدارت وغیرہ سے متعلق تبادلۂ خیال کیا گیا۔

۷۔ شعبۂ نسواں کی تحریک بابت اضافۂ امداد سالانہ پیش ہوئی اور طے پایا کہ آئندہ سال سے اس شعبہ کی امداد میں مزید ایک سو روپے کا اضافہ کیا جائے اور موازنہ ہی میں اس کی گنجایش رکھی جائے۔

۸۔ اردو امتحانات کے نتائج پیش ہوئے اور آمد و خرچ کے حساب منظورہ مجلس انتظامی اردو امتحانات کی توثیق کی گئی۔

۹۔ مجلس امتحانات کے اراکین کی تبدیلی و اضافہ سے متعلق مجلس امتحانات کے تصفیہ کی توثیق کی گئی۔

۱۰۔ مطبوعات ادارہ کے اشتہارات روزنامہ رہبر دکن میں ۶ ماہ تک یعنی اڑتالیس اندراجات ہر ہفتہ اور منگل کو پہلے صفحہ پر بائیں طرف ۶ انچ کی جگہ میں شایع کرنے کے لیے منظوری عطا کی گئی۔

۱۱۔ اردو انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد کی طباعت کے لئے سرلوپر پیپر پروسے کاغذ کی فراہمی اور نرخ وغیرہ سے متعلق کاغذات پیش کئے گئے۔ طے پایا کہ خریدی کاغذ کا آرڈر دیدیا جائے اور مطلوبہ پیشگی رقم ارسال کردی جائے۔

شعبۂ شعرا و مصنفین دکن

۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء کو شام کے ساڑھے چھ بجے دفتر ادارۂ ادبیات اردو میں شعبۂ شعرا و مصنفین دکن کا جلسہ منعقد ہوا۔ مندرجۂ ذیل ارکان نے شرکت کی۔

نواب عزیز یار جنگ بہادر۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور۔ مولوی عبد القادر سروری صاحب۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ نواب میر سعادت علی صاحب رضوی۔ سید محمد صاحب مدرشعبہ۔ مولوی عظیم الدین صاحب محبت اور قاضی اکبر الدین صاحب صدیقی بھی خاص طور پر مدعو کئے گئے تھے جو شریک جلسہ تھے حسب ذیل امور طے ہوئے۔

۱۔ قرار پایا کہ مرقع سخن جلد اول و دوم کے مماثل تقریباً (۸۰) شاعروں کا ایک تذکرہ مرقع سخن جلد سوم کے نام سے مرتب کیا جائے اور (۸۰) شاعروں کی جو فہرست مرتب کی گئی ہے وہ سب رس میں شایع کرکے قارئین سب رس سے ان شعرا کے حالات وغیرہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس جلد کی ترتیب کا کام نواب میر سعادت علی صاحب رضوی نے اپنے ذمہ لیا۔ شعرا کی تعداد میں مرتب صاحب اپنے صوابدید سے کمی اور بیشی بھی کرسکتے ہیں۔

۲۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے جن شاعر عورتوں کی فہرست مرتب کی ہے اس میں سے بھی چند کا ذکر تذکرے میں کیا جائے۔

۳۔ مرقع نثر کی ترتیب کا کام مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کی نگرانی میں مولوی عظیم الدین صاحب محبت انجام دیں گے۔

۴۔ توفیق اور عبد العلی ولا کی قبروں پر منجانب ادارہ کتبے لگائے جائیں۔

۵۔ نواب لقمان الدولہ دل کی قبر پر کتبہ لگا دینے کے لئے ان کے ورثا کی تحریک منظور کی گئی۔

دوسرا اجلاس

۶ نومبر ۱۹۴۲ء کو شام کے پانچ بجے دفتر ادارۂ ادبیات اردو میں شعبۂ شعرا و مصنفین دکن کا جلسہ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب۔ مولوی عظیم الدین صاحب محبت۔ ان کے علاوہ مولوی مراد علی صاحب طالع نے بطور رکن زائد شرکت کی۔

نواب عزیز یار جنگ بہادر اور راجہ نرسنگ راج بہادر عالی نے فون پر عدم شرکت کی اطلاع دی۔ گزشتہ جلسے کی روئداد سنائی گئی اور حسب ذیل امور طے ہوئے۔

۱۔ ڈاکٹر زور صاحب نے تحریک کی کہ مولوی مراد علی صاحب طالع کو اس شعبہ کا رکن بنا لیا جائے جس کو دیگر ارکان نے قبول کرلیا۔

۲۔ مولوی محمد صدیق صاحب مدرس گولکنڈہ اور مولوی محمد سلطان صاحب مددگار دار العلوم کے نام رکنیت کے لیے پیش کئے گئے جن کو قبول کیا گیا۔

۳۔ طے پایا کہ مولوی سعادت علی صاحب رضوی سے دریافت کیا جائے کہ انہوں نے مرقع سخن جلد سوم کی ترتیب کا کام کس حد تک انجام دیا ہے اور اس کی تکمیل میں کتنی مدت درکار ہے۔

۴۔ مولوی عظیم الدین صاحب محبت کے ذمہ "مرقع نثر" کا جو کام تفویض کیا گیا تھا اس کے بارے میں انھوں نے کہا کہ (۱) مضمون تیار ہو گئے ہیں بعض اصحاب کے حالات باوجود کوشش کے فراہم نہیں کئے جاسکے جو حسب ذیل ہیں۔ ۱۔ مولوی سرور علی صاحب ۲۔ سراج الدین صاحب طالب ۳۔ مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب اور عبد الرحمن خاں تمنا ان کے حالات کی فراہمی میں معتمد صاحب ادارہ نے مرتب تذکرہ کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ مرتب صاحب نے اسفندار کے آخر تک مرقع نثر کی تکمیل کا وعدہ کیا۔

۶. توزیق. عبدالعلی والا اور لقمان الدولہ دکی کی قبروں پر کتبے لگانے کا انتظام کیا جائے۔

۷. "سچ کا جادو" ڈراما شعبۂ اطفال میں بھیجنے کے لئے معتمد صاحب ادارہ کے حوالہ کیا گیا۔

۸. "سماج سدھار" از جے آر دیسائی صاحب کا مسودہ بغرض اظہار رائے مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کے حوالے کیا گیا۔

۹. "قواعد اردو" مولفہ عطاء الرحمٰن خاں صاحب کا مسودہ معتمد صاحب کے حوالے کیا گیا۔ یہ کتاب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری اور ملا فخر الحسن صاحب کے پاس بغرض رائے روانہ کی گئی اور معتمد شعبہ نے بھی سرسری طور پر اس کو دیکھا ہے تینوں کی رائے یہ ہے کہ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے لیکن اس قسم کی کتابیں محض نصابی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں اور ادارہ نے اب تک نصابی کتابوں کی طرف توجہ نہیں کی ہے اور نہ اس کتاب کے شریک نصاب ہونے کی توقع ہے اس لئے شعبے کی رائے میں ادارے کی طرف سے اس کی اشاعت سردست مناسب نہیں ہے۔ اگر ادارہ کوئی شعبۂ کتب نصابی قایم کرے تو اس شعبے کی طرف سے اس کی اشاعت ہو سکتی ہے۔

۱۰. موجودہ معتمد شعبہ نے اپنی دیگر مصروفیات نیز پروفیسر سروری صاحب کے میسور جانے کی وجہ سے شعبۂ امتحانات اردو کی پوری ذمہ داری کے باعث اس شعبہ کی معتمدی کے لئے اپنی بجائے مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کو منتخب کرنے کی تحریک کی جس کو جلسہ نے منظور کرلیا۔

۱۱. مولوی ہاشمی صاحب نے توجہ دلائی کہ ادارے کے اس عام قاعدے پر آئندہ سے شعبۂ شعرا و مصنفین میں بھی عمل کیا جائے کہ اگر کوئی رکن بلا اطلاع متواتر تین جلسوں میں شریک نہ ہو تو اس کو مستعفی سمجھا جائے۔

شعبۂ تنقید ۳۱ اکتوبر ۴۲ء کو بروز شنبہ بوقت ساڑھے چار ساعت شام منعقد ہوا جس میں ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

مولوی عبدالقادر صاحب سروری، مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی، مولوی فیض محمد صاحب صدیقی، ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، مولوی مجتبیٰ حسین صاحب، محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ، خواجہ حمید الدین صاحب میر سعادت علی صاحب رضوی معتمد شعبہ۔

نواب مرزا سیف علیخاں صاحب نے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دی کہ دیگر مصروفیات کی وجہ سے وہ کچھ دیر میں آئیں گے۔

پروفیسر سروری صاحب نے توجہ دلائی کہ شعبۂ تنقید کے جو ارکان مسلسل تین اجلاسوں میں بلا کسی اطلاع کے تشریف نہ لائیں ان کو نیت سے مستعفی سمجھا جائے۔

باتفاق آرا طے پایا کہ پروفیسر فضل حق صاحب اور پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری سے دریافت کیا جائے کہ تھینسیو ارنلڈ کے مقالات کا ترجمہ جو انھوں نے اپنے ذمہ لیا تھا اس کو کس حد تک سرانجام کو پہنچایا ہے۔

مولوی مجتبیٰ حسن صاحب نقوی، مولوی میر حسن صاحب اور خواجہ حمید الدین صاحب شاہد کا بحیثیت رکن شعبۂ انتخاب عمل میں آیا۔ نیز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ کی تحریک پر رضیہ بیگم صاحبہ بی اے کو شعبۂ تنقید میں شریک کرلیا جانا باتفاق آرا منظور ہوا۔

طے پایا کہ آئندہ جلسہ میں مولوی فیض محمد صاحب صدیقی "جدید ادب میں عورتوں کا حصہ" کے عنوان پر ایک مقالہ سنائیں گے جس پر بحث مباحثہ ہوگا۔ اور آئندہ جلسہ ۲۰ دسمبر ۱۹۴۲ء روز جمعہ ساڑھے چار بجے شام بمقام دفتر ادارہ منعقد ہوگا۔

اس وقت تک جو اصحاب بحیثیت رکن منتخب ہوئے ہیں ان سب کی خدمت میں یہ روئداد بھیجکر استدعا کی جائے کہ وہ بھی سال میں کم از کم ایک بار اپنی دلچسپی کے کسی موضوع پر اس شعبہ کے جلسہ میں اپنا تنقیدی مضمون سنائیں۔ اور دفتر کو مطلع فرمائیں کہ وہ کس عنوان پر اور کس ماہ میں مضمون سنائیں گے تاکہ قبل از قبل اس کی اطلاع دی جائے۔

پروفیسر سروری صاحب کی یہ تحریک منظور کی گئی کہ شعبۂ تنقید کے جلسوں کا اعلان مقامی اخباروں میں بھی کیا جائے کہ ادارے کے جلسوں میں شرکت کی

عام اجازت ہوگی۔

ذیلی کمیٹی مجلس امتحانات

ادارۂ ادبیات اردو کے مجلس اردو امتحانات کی ذیلی کمیٹی بتاریخ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۲ء بروز دوشنبہ شام کے ساڑھے چار بجے منعقد ہوئی۔ مولوی محمد سجاد مرزا صاحب ایم اے کنٹب نے صدارت اور مولوی سید محمد صاحب ایم اے اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے شرکت کی۔

مجلس انتظامی اردو امتحانات نے جو امور اس ذیلی کمیٹی کے تفویض کئے تھے ان پر غور و خوض کیا گیا اور حسب ذیل امور طے پائے۔

ا۔ امتحان اردو زبان دانی کے پہلے پرچے کے لئے اردو کی چھٹی کتاب کی جگہ اردو کی پانچویں درسیہ عثمانیہ کا مرحمہ ایڈیشن شریک نصاب کیا گیا۔

۲۔ سال میں دو بار ادارے کے امتحانات منعقد کرنے کی تحریکات پر غور کیا گیا اور طے پایا کہ یہ امر فی الحال نامناسب اور ناقابل عمل ہے۔

۳۔ اردو دانی کی پہلی اور دوسری کتابوں کے رسم الخط سے متعلق تحریک پیش ہوئی اور طے پایا کہ یہ تحریک ایک اصولی تعلیمی مسئلہ سے تعلق رکھتی ہے اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ تحریک کی نقل مولف کتاب کو روانہ کردی جائے تاکہ بوقت نظر ثانی خیال رکھیں۔

۴۔ اردو زبان دانی کے نصاب خانہ داری کے لئے ایک آسان کتاب کی تلاش کی گئی اور طے پایا کہ کتاب "معاون خانہ داری" مطبوعہ ملک اللہ اجوکیشنل پبلشرز کنیت روڈ لاہور کی سفارش کی جاتی ہے۔

۵ کتاب سائنس کے کرشمے جو اردو عالم کے نصاب میں شریک ہے اس کے حسب ذیل مضامین آئندہ شریک نصاب نہ رہیں گے۔ ا۔ ہوا ۲۔ ٹیلیویژن

۶۔ اردو عالم اور اردو فاضل کی کتابوں میں حسب ذیل تبدیلی عمل میں آئی۔

سابقہ کتاب	حالیہ کتاب
اردو عالم چوتھا پرچہ۔ اجتماعی زندگی کی ابتدار۔	ہمارا ہندوستان مترجمہ مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب
اردو فاضل چوتھا پرچہ۔ سیاست کی پہلی کتاب	شہریت از پروفیسر احمد علی خاں صاحب
اردو فاضل چوتھا پرچہ۔ ہندستانی برطانوی حکومت۔	تاریخ ہند برائے جماعت دہم از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب
" " ۔ فلسفہ جذبات۔	ہماری نفسیات مطبوعہ انجمن ترقی اردو

۷۔ اردو فاضل کے چوتھے پرچے کے لئے مبادی معاشیات کے ساتھ علم دولت بطور متبادل کتاب کے شریک نصاب کی جائے اسی طرح دنیا کی کہانی کے ساتھ ایک کتاب تاریخ عالم متبادل کتاب کے طور پر شریک نصاب رہے۔ موخر الذکر کتاب مولوی سجاد مرزا صاحب مرتب کرا دیں گے اور وہ ادارہ کی طرف سے شایع ہوگی۔

۸۔ اردو زبان دانی کے پرچہ دوم کے پہلے حصہ میں مضمون نویسی کے لئے قواعد اردو و فن انشا پردازی شریک نصاب کی گئی۔

۹۔ اردو امتحانات کے دو مرکز یعنی کاماریڈی اور خانہ پور صدر نگراں صاحبان سے ان پرچوں کے متعلق استفسار کیا جائے جن کو ممتحنین نے مشتبہ قرار دیا ہے۔

شاخ بالانگر

بتاریخ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۴۲ء روز جمعہ ساعت صبح ایک غیر معمولی اجلاس بصدارت جناب مولوی حرمت علی صاحب منظر معتمد شاخ ہذا منعقد ہوا جس میں اراکین انتظامی کے علاوہ مقامی علم دوست حضرات بھی شریک رہے مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری اردو عالم رکن انتظامی نے دوران تقریر میں شاخ کے سال حال کے کاروبار سے متعلق اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور صدر جلسہ سے استدعا کی کہ سال حال بھی اردو فاضل اردو عالم۔ اردو زبان دانی اور اردو دانی کی تعلیم کا معقول انتظام فرما کر اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد میں ایک معتد بہ اضافہ فرمائیں گے۔

مسٹر ناگ لنگیا حکیم نے شاخ کے سال حال کے انتظامات پر تبصرہ کرتے ہوئے گزشتہ سال کے نتائج پر اظہار افسوس فرمایا۔ خصوصیت سے اردو زبان دانی۔ اردو عالم کے نتائج غیر متوقع برآمد ہوئے۔

مولوی حرمت علی صاحب منظر صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اردو کی خدمت ہر ملکی کا فریضہ ہے زبان اردو قومی اور ملکی زبان ہونے کے

علاوہ ہر دو فریق یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کا متروکہ ہے آپ ہی لوگوں کے جوش اور استقلال کا نتیجہ ہے جو شاخ کے جملہ کاروبار باحسن الوجوہ سرانجام پائے اور پا رہے ہیں اور پاتے رہیں گے میں آپ حضرات کا بہ دل مشکور ہوں کہ آپ نے ہر معاملہ میں میرا ہاتھ بٹایا خصوصیت سے مسٹر ڈی ونکیا شریک معتمد نے مرکز کے قیام کے جملہ انتظامات جانفشانی و دلدہی سے فرمائے جس کی میں ان کو مبارک باد دیتا ہوں۔ میں دوسرے ارکین انتظامی کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے میرا ہاتھ بٹایا اور آڑے وقت میں کام آئے تقریر جاری رکھتے ہوئے جناب صدر نے فرمایا کہ حتی الامکان سال حال بھی اردو فاضل، اردو عالم، اردو زبان دانی اور اردو دانی کی جماعتیں قائم ہو جائیں۔

اعلیحضرت بندگان عالی و شہزادگان بلند اقبال و شہزادیاں فرخندہ فال کی عمر و اقبال کی دعا سلامتی پر جلسہ برخواست ہوا۔

شاخ منگولی اس ماہ میں شاخ ہذا نے ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں اور عوام کا زیادہ سے زیادہ تعاون عمل حاصل کرنے کے نئے شعبوں کے قیام کی طرف توجہ کی ہے۔

بحمد اللہ "بزم مباحثہ" کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ جس کی کمیٹی حسب ذیل اصحاب پر مشتمل ہے۔

صدر۔ جناب ملک ذاکر صاحب امیدوار اردو فاضل۔ معتمد جناب شیخ محبوب صاحب فروشاہ جنٹ۔ شریک معتمد۔ محمد ابراہیم صاحب بشارق اراکین۔ شیخ عبد اللہ صاحب، محمد حسین صاحب پہلوان، قاسم علی صاحب، آدم علی خاں صاحب کمالی، پیر محمد صاحب، اسمٰعیل خاں صاحب مشتاق۔

بتاریخ ۵ ستمبر ۱۹۴۲ء اس کا پہلا جلسہ بمقام "اردو منزل" منعقد ہوا۔ محمد عثمان خاں کمالی معتمد شاخ کے تجویز کئے ہوئے عنوان "خاموشی بہتر ہے اس سے کہ کچھ کہا جائے" پر بحثیں جاری رہیں۔

صدر نے بیانات پر تنقیدی روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا کہ انسان محض اپنے نطق کی وجہ سے مخلوقات پر شرف رکھتا ہے۔ بعض اوقات ہی خاموش رہنا مفید ثابت ہوتا ہے۔

مخالف اور موافق رائیں لی گئیں۔ مخالفت میں (۵) اور موافقت میں (۴) رائیں تھیں۔ تحریک بغلبۂ آرا ناکام رہی۔

شعبۂ طلبہ پرلی تقریری جلسہ بصدارت مولوی لطف علی صاحب منعقد ہوا۔ تقریر کا عنوان زراعت و تجارت تھا جلسہ چار بجے سے شروع ہو کر سات بجے اختتام کو پہونچا۔

حافظ ظہیر الدین صاحب قادری مشائخ کی قرارت عبد الکریم صاحب کی جہور اور اظہر الدین صاحب کی نعت سے جلسہ شروع ہوا۔ پہلے محمد نصیر الدین صدیقی معتمد شعبہ نے گزشتہ جلسہ کی روداد سنائی۔ زراعت پر حسب ذیل طلبہ نے تقریریں کیں۔

محمد نصیر الدین صاحب صدیقی معتمد۔ محمد نجم الدین صاحب معتمد کتب خانہ دار۔ عبد الرب صاحب قریشی۔ لطف علی صاحب صدر جلسہ۔ تجارت کی حسب ذیل طلبہ نے تائید کی۔

محمد سعید الدین صاحب صدیقی دار المطالعہ شعبۂ طلبہ۔

محمد عبد الستار صاحب ستار۔ محمد ہاشم صاحب کرمانی نائب صدر۔ محمد نجم الدین صاحب نے تقریریں کیں اور یہ طے پایا کہ تجارت و زراعت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

گلبرگہ میں اردو کا کام سنہ ۱۹۴۰ء میں مولوی محمود حسین صاحب عثمانیہ نے گلبرگہ میں ادارہ کی بنیاد رکھی۔ ابتدا میں مشکلات اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگ اجنبیت کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ لیکن عالیجناب نواب غوث یار جنگ بہادر صوبہ دار صوبہ گلبرگہ نے ادارہ کی سرپرستی قبول فرما کر لوگوں کو ادارہ سے مانوس فرمایا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ عہدہ داران مقامی اس کی رکنیت قبول کرتے گئے نواب غوث یار جنگ بہادر جب تک گلبرگہ میں رہے ادارہ کی مالی و علمی امداد فرماتے رہے۔ صاحب معزکے تبادلہ کے بعد گلبرگہ کے نئے صوبہ دار عالیجناب مولوی امیر علی خاں صاحب نہج سی ایس نے ادارہ کی

سرپرستی قبول فرمائی۔

۱۹۴۲ء کے امتحانات میں گلبرگہ سے منجملہ ۲۵ امیدوار اردو عالم میں (۱۱) اردو دانی میں (۱۴) شریک رہے۔ جن میں سے اردو عالم کے ۸ اور اردو دانی کے ۱۳ امیدوار کامیاب ہوئے۔ اس سال امتحانات کی تعلیم مولوی محمود حسین صاحب کے مکان پر ہی ہوتی رہی ہے۔ مولوی نصیر الدین صاحب نظامی ایم اے نے محمود صاحب کا بہت ہاتھ بٹایا۔ ابھی دوسرا سال شروع ہوا ہی تھا کہ محمود حسین صاحب کا تبادلہ گلبرگہ سے کشتگی برگل میں آیا جس کی وجہ سے یہاں کے کاروبار کا تمام بوجھ نوجوان طبقہ پر پڑا لیکن صدر ادارہ کی ہمت افزائی اور دیگر شاخوں کی ترقی دیکھکر یہاں کے نوجوان بھی کمربستہ ہوگئے اور اس سال بھی گلبرگہ کو امتحانات کا مرکز بنایا گیا۔ ۲۵ امیدوار شریک امتحانات رہے جن میں سے اردو فاضل میں ۳ اردو عالم میں ۴۔ اردو دانی میں ۱۸ امیدوار تھے۔ اردو فاضل میں ۲۔ اردو عالم میں ۴ اور اردو دانی میں ۱۳ امیدواروں نے کامیابی حاصل کی اس سال امتحانات کے قریب قریب صدر ادارے گلبرگہ کیلئے معتمد کا انتخاب عمل میں آیا۔ مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے لکچرار انگریزی گلبرگہ کالج یہاں کے معتمد منتخب ہوئے۔ موصوف خود نوجوان ہیں اور نوجوانوں سے کام لینا خوب جانتے ہیں۔ ان کے زمانے میں گلبرگہ کی تعلیمی چہل پہل میں خوب رونق پیدا ہوئی اور آج گلبرگہ ایک علمی مرکز بن گیا ہے۔

ادارہ نے جہاں کہیں قدم جمایا وہاں کے جاہلوں کو جھنجھوڑا اور وہاں کے عالموں کو میدان عمل میں لاکھڑا کیا علمی حیثیت سے جو تعطل دکن کے اضلاع و دیہات میں پیدا ہو چکا تھا، ادارہ کی سعی و کوشش سے دور ہوگیا۔ اردو دانی کے امتحان کے فروغ سے اردو داں حضرات کی تعداد روز بروز ترقی کرتی جارہی ہے۔ اردو "ہندو مسلم اتحاد کی مقدس یادگار" ہے ہندو ہو یا مسلمان دونوں کو اردو سکھانا ادارہ کا فرض ہے چنانچہ ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات کی ترویج میں ہندو حضرات بھی برابر کا حصہ لے رہے ہیں۔

۱۹۴۲ء سے ادارہ ادبیات اردو گلبرگہ کا تیسرا سال شروع ہوتا ہے۔ گلبرگہ کے نئے معتمد مولوی محمد بن عمر صاحب اور مولوی نصیر الدین صاحب نظامی نے اس سال امتحانات کو کامیاب بنانے کی بے انتہا کوشش فرمائی۔ ان حضرات نے ادارہ کی تبلیغ و اشاعت کے لئے یہاں کے نوجوانوں کو از سر نو چنا اور ان کے تفویض ایک ایک کام کر دیا گیا شعبۂ طلبہ کا قیام یہاں پہلے ہی سے موجود تھا سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ مولوی محمد بن عمر صاحب اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس شعبہ کے تحت کئی علمی جلسے مناظرے اور انعامی مباحثے ہوئے جن میں گلبرگہ کے تمام اسکولوں کے طلبہ شریک ہوتے رہے۔ آخر سال میں جب شعبہ طلبہ کے انتخابات عمل میں آرہے تھے تو تحریکات روانہ کرنے کے سلسلہ میں گلبرگہ میں وہ دھوم مچی کہ انتخابات کے وقت کا صحیح خاکہ نظروں کے سامنے موجود تھا۔ رائے دینے والے حضرات دعوتوں پر دعوتیں اڑا رہے تھے۔ ایک اسکول کے طلبہ دوسرے اسکول کو جاتے اور وہاں کے طلبہ کو اپنے منتخب شدہ شخص کو رائے دینے کے لئے مجبور کرتے۔ بازاروں اور شاہ راہوں پر پوسٹر طبع کرا کے چسپاں کئے گئے۔ جلوس نکالے گئے۔ غرض طرح طرح کے دلچسپ تماشے ہوتے رہے مقررہ تاریخ پر ایک عظیم الشان اجتماع کے سامنے خفیہ رائے دہی کے ذریعہ جناب محمد بن عمر صاحب مولوی نصیر الدین صاحب اور مولوی سید ذوالفقار علی صاحب حقانی نے عہدہ داروں کا انتخاب کر کے اعلان فرمایا۔ گلبرگہ میں یہ پہلا انتخابی جلسہ تھا، جو نظیر کے طور پر ہمیشہ پیش نظر رہے گا۔

اسی سال ادارہ کی جانب سے مولوی محمد بن عمر صاحب نے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسے کے لئے متعدد مشاہیر ہند کے پیامات وصول ہوئے۔ اس طرح گلبرگہ کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہوئی اس کے بعد گلبرگہ کے ارباب ادارہ نے اپنی تمام تر توجہ اردو

امتحانات کی تیاری پر صرف کی۔ اس خصوص میں شاخ رونتین کا نام پیش پیش رہے گا۔

شاخ رونتین

مولوی خواجہ معین الدین صاحب بی اے ایل ایل بی ناظم اسٹیٹ رونتین وصدر شاخ ہٰذا قابل مبارک باد اور مستحق شکریہ ہیں کہ موصوف نے شاخ رونتین کو بڑھانے اور ترقی دینے میں بہت امداد فرمائی۔ صاحب موصوف نے اس شاخ کے کتاب خانہ کے لئے (۵۰۰) مجلد کتابیں۔ دو ساگوانی الماریاں اور فرنیچر عطا کیا اور ادارہ کی ہر وقت مالی اعانت فرماتے رہتے ہیں۔

اس سال شاخ رونتین سے کئی نادار طلبہ شریک امتحان ہوئے۔ ان تمام طلبہ کی فیس مولوی خواجہ معین الدین صاحب نے بھی اپنی جیب خاص سے مرحمت فرمائی اور ادارہ کے ان غریب طلبہ کے قیام وطعام کا بلا معاوضہ اپنے ہاں انتظام فرمایا جو دور دراز مقامات سے بغرض تعلیم یہاں آئے ہوئے تھے۔ حال ہی میں موصوف نے ادارہ کو چالیس روپے بطور عطیہ دیئے تاکہ ادارہ مالی مشکلات میں نہ پھنسے اس سال امتحانات کی تعلیم کا انتظام بھی شاخ رونتین کے تفویض کیا گیا تھا۔ شاخ ہٰذا نے اردو امتحانات کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کیا۔ امتحانات کی تیاری کے سلسلہ میں مولوی نصیر الدین صاحب نظامی ایم اے لکچرار اردو گلبرگہ کالج قابل مبارکباد ہیں کہ موصوف اپنے خانگی کاموں کو پس پشت ڈال کر روزانہ شاخ رونتین تک قدم رنجہ فرما کر درس دیا کرتے رہے۔ مولوی احمد عبدالعزیز صاحب ایم اے بھی مستحق شکریہ ہیں کہ وہ بھی معاشیات وسیاسیات کے درس روزانہ دیتے رہے۔ اور فلسفہ کی تعلیم مولوی علی بن غالب صاحب بی اے بی ٹی نے دی۔ اس طرح اردو فاضل کا ادنیٰ نصاب امتحان کے قبل پائیہ تکمیل کو پہنچا۔ تکمیل نصاب کے سلسلہ میں مولوی محمد بن عمر صاحب بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ موصوف بھی بلا پس وپیش شاخ رونتین کو آتے رہے اور "ادب وتنقید" کے نصاب کی تکمیل میں امداد فرمائی۔

اس خصوص میں گلبرگہ کالج کے ہر دلعزیز پرنسپل اور ادارہ کے صدر مولوی سید ذوالفقار علی صاحب حقانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جنھوں نے اپنے کالج کے اسٹاف کو ترغیب دی کہ وہ امیدواران امتحانات کو ان کے نصاب کی تکمیل میں مدد دیں۔ صاحب معز ادارہ سے بہت خلوص رکھتے ہیں۔ کالج کی عمارت کا ایک حصہ ادارہ کے کتاب خانہ اور دارالمطالعہ کے لئے دیا گیا ہے۔ نیز ماہانہ (عه) روپیہ چندہ جناب والا کی جانب سے بلا ناغہ ادارہ کو ملتا رہتا ہے۔ ہم عالیجناب کے ان احسانات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور متمنی ہیں کہ ہمیشہ جناب والا کا ادارہ سے یہی سلوک رہے گا۔ اس سال شاخ رونتین سے جملہ ۴۲ امیدوار اردو فاضل ۱۹۔ اردو عالم ۱۱۔ اردو زبان دانی ۸۔ اردو دانی ۴۔ شریک امتحانات رہے۔ شاخ رونتین کے لائحہ عمل میں یہ بھی ہے کہ ماہانہ اردو کے جلسے مباحثے اور مشاعرے منعقد کئے جائیں۔ اس سلسلہ میں اب تک کئی مشاعرے اور مباحثے منعقد ہو چکے ہیں، جن کی صدارت عالیجناب نواب صوبہ دار صاحب صوبہ گلبرگہ مولوی محمد غوث صاحب صدیقی ڈی سی ایس سپرنٹنڈنٹ پولس عالیجناب سجادہ صاحب روضہ بزرگ عالیجناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری صدر اردو جامعہ میسور وغیرہ نے فرمائی۔ اس ادارہ کے نوجوان کارکنوں میں حسب ذیل نوجوان قابل مبارکباد ہیں۔

۱۔ نور الحسن صاحب انور ۲۔ عبدالغنی صاحب افسر ۳۔ حبیب اللہ صاحب شیدا ۴۔ محبوب حسینی صاحب تمنا ۵۔ عمر خاں خیام ۶۔ فخر الدین آرمان ۷۔ مولوی سید مخدوم صاحب داروغہ درگاہ شریف وغیرہ

شاخ نسواں

اس سال گلبرگہ میں شعبۂ نسواں کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جس کی ابتداً کا سہرا محترمہ محبوبی بیگم صاحبہ بی اے (اہلیہ جمیل حسن صاحب اول تعلقدار گلبرگہ) کے سر ہے۔ موصوفہ خود ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں اور دیگر خواتین کو بھی اسی نہج پر دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس شاخ کی

سرگرم معتمد محترم حمیدہ بانو بیگم صاحبہ تحفیؔ ہیں۔ موصوفہ ایک اچھی شاعرہ اور مقررہ ہیں۔ ادارہ کے کاموں سے آپ کو بے انتہا دلچسپی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ شعبہ نسوان اور ترقی کرے گا اور دیگر اضلاع کے لئے نظیر ثابت ہوگا۔

شاخ بسمت نگر مجلس انتظامی شاخ بسمت نگر کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام ۱۶ اکتوبر ۴۲ئہ زیر صدارت عالیجناب الحاج مولوی محمد عبد الحی صاحب منصف بسمت نگر اعلیٰ پیمانے پر منایا گیا۔ جلسہ گاہ کے انتظامات مولوی احمد سعید الدین صاحب وکیل اور مولوی عنایت اللہ خاں صاحب سوداگر پارچہ کی سعی عمل سے مکمل کئے گئے۔ ٹھیک ۵ بجے جلسہ کا آغاز ہوا۔ جناب مولوی فرید مرزا صاحب بی اے عثمانیہ تحصیلدار بسمت نگر کی تحریک اور مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیداؔ معتمد اعزازی شاخ بربھنی کی تائید کے بعد صدر جلسہ نے مسند صدارت کو زینت بخشی۔ مولوی احمد سعید الدین صاحب وکیل نے جناب صدر اور جناب تحصیلدار صاحب کو پھول پہنائے۔ جناب رحیم الدین صاحب نے نظم سنائی۔ مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیداؔ نے تقریر فرمائی جس میں ادارۂ ادبیات اردو اور ارباب ادارہ سے حاضرین کو روشناس کرایا۔ موصوف نے اردو زبان و ادب کی ابتدائی تاریخ سناتے ہوئے کہا کہ جس چراغ کو دکن میں محمد تغلق اور اس کی فوجوں نے روشن کیا تھا اور گولکنڈے اور بھاگ نگر کی پریمی بستی میں محمد قلی قطب شاہ نے منور کیا تھا آج انہی علمی اور ادبی خزانوں سے دکن کے مایۂ ناز سپوت ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ اور ان کے رفقار کار ہم سب کو روشناس کرا رہے ہیں اور اردو امتحانات اور اس کی افادیت کو بتلاتے ہوئے آخر میں بسمت نگر کے تحصیلدار مولوی فرید مرزا صاحب بی اے عثمانیہ نے اردو زبان و ادب پر بہترین تقریر فرمائی اور ادارۂ ادبیات اردو سے بھی روشناس کرایا۔ موصوف نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اردو زبان ہندو مسلم اتحاد کی ایک نشانی ہے اور یہ دونوں کی کوششوں سے ہی پروان چڑھی اور آئندہ بھی ترقی کرتی رہے گی۔ قیام شاخ کے متعلق موصوف نے فرمایا کہ ادارۂ ادبیات اردو کی سعی پیہم سے جب کہ جہالت کی تاریکی علم کی روشنی تبدیل ہو رہی ہے اور اس مقصد عظیم کو بروئے کار لانے میں جب کہ دیگر اضلاع و تعلقات بھی برابر سرگرم عمل ہیں تو بسمت نگر میں بھی اس کی شاخ ہونی چاہیئے۔ موصوف نے یقین دلایا کہ بسمت نگر میں صرف شاخ ہی قائم نہیں ہوگی بلکہ اس سال بسمت نگر امتحان کا مرکز بھی ہوگا آخر میں موصوف نے مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیداؔ کو ان کی اردو خدمات پر مبارکباد دی اور شکریہ ادا کیا کہ ان کی کوششوں سے ہم ادارہ اور اس کی اردو خدمات سے واقف ہوئے۔

اس کے بعد بسمت نگر کے نوجوان شاعر مولوی عنایت اللہ خاں صاحب عنایتؔ نے اپنے خاص ترنم میں ایک نظم سنائی۔ بعض اشعار کو جناب صدر نے بار بار پڑھوایا جس سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ مسٹر دتاتری راؤ صاحب وکیل نے دوران تقریر میں فرمایا کہ اردو کی خدمت ہم سب کا فریضہ ہے قیام شاخ کے متعلق موصوف نے فرمایا کہ شاخ کو قائم کر کے اور اس کو کامیابی سے چلانا ہی ہماری اصل کامیابی ہے۔ اس کے بعد مولوی سبحانی صاحب مدرس نے اردو زبان سے متعلق نظم سنائی۔

جناب مولوی محمد عبد الحی صاحب منصف صدر جلسہ نے اپنی صدارتی تقریر فرمائی جس سے حاضرین بہت متاثر ہوئے موصوف نے اپنے خاص انداز میں، باغ اور مالی، پودے اور اشجار کی مثالوں سے اردو زبان کی اہمیت اور ترقی اور ہمہ گیر مقبولیت سے حاضرین کو روشناس کرایا۔ دوران تقریر میں موصوف نے فرمایا کہ اس دور عثمانی میں جہاں ہر شعبۂ زندگی میں نئی تڑپ اور بیداری پیدا ہو رہی ہے اسی طرح زبان اردو کو بھی حکیم السیاسیات

حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ کی سرپرستی حاصل ہے۔ ارباب ادارۂ ادبیات اردو کی ستائش کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ علم کی روشنی پھیلانے اور تعلیم بالغان کو فروغ دینے کا یہ ایک بہترین ذریعہ ہے آخر میں موصوف نے شاخ کے قیام کے ساتھ ساتھ دار المطالعہ کے قیام کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ اس کے بعد مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیدا نے حسب ذیل کابینۂ شاخ بسمت نگر کا اعلان فرمایا۔

سرپرست۔ عالیجناب الحاج مولوی محمد عبد الحی صاحب منصف بسمت نگر۔

صدر۔ عالیجناب مولوی فرید مرزا صاحب بی اے تحصیلدار " "

نائب صدر۔ جناب مولوی فخر الحسن صاحب۔

معتمد۔ مولوی شیخ محمد صاحب عمودی۔

شریک معتمد۔ مولوی عنایت اللہ خاں صاحب عنایت

خازن۔ مولوی حمید اللہ خاں صاحب سوداگر پارچہ

کتب خانہ دار۔ مولوی رحیم الدین صاحب۔

ارکان انتظامی۔

مسٹر ڈماتری راؤ صاحب وکیل، مسٹر ہنمنت راؤ صاحب وکیل جناب مولوی محمد شریف صاحب صدر مدرس۔ جناب مولوی فرید الدین صاحب وکیل۔ جناب مولوی اسحاق الدین صاحب وکیل۔ مولوی افضال احمد صاحب ایم اے۔ مولوی مظفر الدین صاحب مبلغ۔ مولوی محسن صاحب

شاخ بلولی

مستقر تعلقہ بلولی میں شاخ ادارۂ ادبیات اردو کا قیام عمل میں آیا۔ باتفاق رائے حسب ذیل مجلس انتظامی قایم ہوئی۔

مولوی عبد البصیر صاحب صدر مدرس، صدر۔ مولوی شیخ احمد صاحب معتمد۔ مولوی معین الدین صاحب وکیل۔ الحاج مولوی عبد الرحیم صاحب ڈاکٹر مولوی مرزا ناصر علی بیگ صاحب سوداگر۔ مولوی سید بشیر احمد صاحب۔ مولوی بہاء الدین صاحب۔ مولوی ریاض الدین صاحب۔ مولوی محمد حسن عبد اللہ صاحب مولوی مرزا یوسف بیگ صاحب مولوی احمد الدین صاحب

مولوی محمد جلال صاحب۔ ارکان انتظامی۔

سال حال ادارہ ہذا امتحانات اردو دانی و اردو عالم کا انتظام کرنا چاہتا ہے۔

شعبۂ طلبہ پرلی کا معائنہ

مولوی سید عظمت اللہ حسینی صاحب بی اے صدر مدرس مدرسۂ فوقانیہ پرلی نے ۱۲ ستمبر ۴۲ء کو شعبۂ طلبہ شاخ ادارۂ ادبیات اردو پرلی کا معائنہ کیا اور حسب ذیل تاثرات کا اظہار کیا۔

"شعبۂ طلبہ کا معائنہ کرکے مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی اس وقت تقریباً بیس طلبہ موجود تھے کمرہ میں رسالہ جات و اخبارات قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ آمد و خرچ کا عمل باضابطہ کردی میں موجود ہے۔ معتمد شعبہ مولوی محمد نصیر الدین صاحب صدیقی خطیب متعلم جماعت ہشتم مدرسہ وسطانیہ پرلی اور مولوی محمد سعید الدین صاحب صدیقی معتمد دار المطالعہ شعبۂ طلبہ و دیگر طلبہ سے مختلف امور شعبۂ طلبہ و دیگر طلبہ سے مختلف امور شعبہ پر گفتگو رہی طلبہ کی گفتگو میں کام اور کارکردگی کی خوبی دیکھ کر مجھ کو بہت خوشی ہوئی۔ میری رائے میں اگر اس شعبہ میں اور وسعت پیدا کی جائے تو اس کو اور عام مقبولیت حاصل ہوگی اور مقاصد شعبہ میں خاطر خواہ کامیابی ہوگی۔ قابل تعریف ہیں وہ لوگ جو اس شعبہ کے قیام کے باعث ہوئے۔"

شعبۂ معاشیات اردو انسائیکلوپیڈیا

اس مجلس کا ایک جلسہ ۲ نومبر ۱۹۴۲ء کو پانچ بجے شام دفتر ادارہ میں منعقد ہوا حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی صدر شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ۔

مولوی عبد القادر صاحب بی ایس سی (لندن) ریڈر معاشیات

مولوی ناصر علی صاحب ایم اے۔ لکچرار معاشیات۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور۔

مولوی سید بادشاہ حسین صاحب۔ مولوی فیض محمد صاحب صدیقی۔

اردو انسائیکلو پیڈیا میں معاشیات کی جن اصطلاحوں اور اسمار پر مضامین درج کئے جا رہے ہیں ان کا جائزہ لیا گیا۔ مولوی حبیب الرحمن صاحب ناظم معلومات عامہ، سابق صدر شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ نے جو مکمل فہرست روانہ فرمائی تھی اس کی تنقیح کی گئی اور طے پایا کہ ڈاکٹر انور اقبال صاحب جامعہ کے اساتذہ صاحبان معاشیات کی مدد سے ان فہرستوں کو اس طرح مرتب کر دیں گے کہ یہ کام بالکلیہ اختتام کو پہنچ جائے۔

معاشیات سے متعلق جو مقالے انگریزی اور دیگر زبانوں میں وصول ہوئے تھے۔ وہ بھی ڈاکٹر صاحب موصوف کے سپرد کر دیئے گئے تاکہ وہ اپنی صوابدید پر ان کے ترجمے کرائیں۔

طے پایا کہ معاشیات کی جملہ مصطلحات و اسمار پر اگر جلد مقالے وصول ہو جائیں تو اردو انسائیکلو پیڈیا کی جملہ جلدوں کی اشاعت تک انتظار نہ کیا جائے۔ بلکہ ایک یا دو جلدوں میں معاشیات کا ایک علحدہ انسائیکلو پیڈیا بھی شایع کر دیا جائے۔

مطبوعات ادارہ اس سال ادارے کے مختلف شعبوں نے بعد نظر ثانی جن کتابوں کی اشاعت کی سفارش کی تھی اور جو شایع ہو چکی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

شعبۂ تاریخ دکن مولوی سید مراد علی صاحب طالع اردو فاضل نے سلاطین آصفی پر نظام علیخاں آصفجاہ ثانی سے غفراں مکان آصفجاہ سادس تک ہر بادشاہ پر عوام اور طلبہ کے لئے جو پانچ کتابیں مرتب کر دی ہیں ان میں سے دو کو پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی کی نظر ثانی اور شعبہ کی سفارش کے بعد شایع کر دیا گیا ہے۔ پہلی کتاب نظام علیخاں آصفجاہ ثانی ۸۴ صفحات پر مشتمل ہے اور دوسری نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث پر لکھی گئی ہے جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دونوں باتصویر ہیں۔ اور ہر ایک کی قیمت چھ آنے رکھی گئی ہے

اس سلسلہ کا مقصد یہ ہے کہ عوام کم قیمت میں ایسی کتابیں حاصل کر سکیں جن میں مشاہیر دکن کی زندگی کے نمایاں خد و خال اور ضروری کارنامے درج ہوں۔

شعبۂ ادب اطفال اس شعبہ کی مجلس انتظامی نے یوں تو کئی کتابوں کی اشاعت کی سفارش کی ہے لیکن اس سال صرف دو کتابیں یعنی کشمش نانی اور عرب اور عربستان شایع ہوئی ہیں۔

کشمش نانی جدید قسم کی کہانیوں کا ایک باتصویر مجموعہ ہے جس کے مولف مولوی شجاع احمد صاحب قائد ہیں۔ یہ مجموعہ بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر سلیس و سادہ زبان دلچسپ تصویروں اور جلی کتابت کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ مولوی میر حسن صاحب ایم اے نے مجلس کی خواہش پر اس کتاب کی نظر ثانی فرمائی ہے۔ ۸۰ صفحات قیمت ۱۰ آنے۔

عرب اور عربستان یہ کتاب نہ صرف بچوں بلکہ بالغوں کے لئے بھی مفید ہے یہ ایک انگریزی کتاب سے ماخوذ ہے جس کو محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ لکچرار اردو نے سلیس و سادہ زبان میں مرتب کیا ہے۔ یہ بھی باتصویر ہے اور خاص اہتمام سے ڈاکٹر زور صاحب کی نظر ثانی کے بعد شایع کی گئی ہے۔ ۸۰ صفحات قیمت ۱۰ آنے۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ کی مطبوعات اس شعبہ سے متعلق ایک کتاب گارساں دتاسی کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس اثنا میں دو اور کتابیں ادارے کی طرف سے شایع ہوئی ہیں یعنی بلاغت اور آریائی لسانیات۔

بلاغت کے مولف مولوی سید کلیم اللہ حسینی صاحب مولوی فاضل منشی فاضل اردو فاضل ہیں۔ آپ نے ادارے کی استدعا پر عروض کی بھی ایک کتاب قلمبند کر دی ہے جس پر منجانب ادارہ نظر ثانی کی جا رہی ہے۔ کتاب بلاغت اردو ادب و انشاء کی جدید ترین ضروریات کو

پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے اور جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اس کی نظر ثانی کی ہے۔ اردو شعر و انشا سے دلچسپی رکھنے والے اس کو خاص طور پر مفید پائیں گے۔ صفحات ۸۸ قیمت آٹھ آنے۔

آریائی لسانیات۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا سے دلچسپی رکھنے والوں اور خاص کر بی اے، ایم اے و اردو فاضل کے طلبہ کی ضروریات کے پیش نظر ادارے نے پروفیسر ڈاکٹر سد سیشورورما ایم اے شاستری، ڈی لٹ پروفیسر سنسکرت و لسانیات و صدر انجمن لسانیات ہند سے یہ کتاب خاص طور پر مرتب کرائی ہے۔ اس میں آریائی زبانوں اور خاص کر فارسی، اردو اور ہندی کے ماخذوں پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ابتدا میں پروفیسر موصوف نے اردو، ہندی اور ہندستانی کے قضیے پر بھی معنی خیز نظر ڈالی ہے۔ ۱۴۴ صفحات قیمت ۱۲؍

شعبۂ شعرا و مصنفین دکن

اس شعبہ کی جانب سے تین کتابیں اس سال زیر ترتیب رہیں یعنی مرقع نثر مرتب مولوی عظیم الدین محبت صاحب ایم اے مرقع سخن جلد سوم مرتب نواب سعادت علی رضوی صاحب ایم اے اور شاد و اقبال مرتب ڈاکٹر زور صاحب۔ ان میں اول الذکر دونوں کتابیں ابھی زیر ترتیب ہیں۔ آخری کتاب چھپ چکی ہے۔

کتاب شاد و اقبال میں علامہ اقبال اور مہاراجہ شاد کی قلبی و روحانی زندگی بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس مجموعہ کو ڈاکٹر زور صاحب نے بڑی محنت اور سلیقے سے مرتب کیا ہے اور اس کے مقدمے میں دونوں کے آپس کے تعلقات پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ صفحات تقریباً ۲۲۰ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

معتمد صاحب ادارہ و مدیر سب رس کا دورۂ پربھنی

بتاریخ ۸؍ نومبر ۱۹۴۲ء شاخ پربھنی کی جانب سے ایک جلسۂ عام منعقد کیا گیا تھا اور اس شاخ کے سرپرست مولوی سید عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری نے ڈاکٹر زور صاحب اور ادارے کے دیگر ارباب کار کو خاص طور پر شرکت کی دعوت دی تھی۔ اس تقریب میں ایک علمی نمائش اور دو علمی اجلاس منعقد کئے گئے۔ جن کی صدارت مولانا ابرار حسین صاحب ایم اے فاضل صدر مدرسۂ فوقانیہ پربھنی نے انجام دی۔ صبح اور شام کے دونوں جلسوں میں اول تعلقدار صاحب ضلع، ناظم صاحب عدالت، مہتمم صاحب تعلیمات، مہتمم صاحب پولس، اور جملہ عہدہ داران مقامی نے شرکت کی۔ قریب کے تعلقات کے تحصیلدار صاحبان اور ادارے کی شاخ ہائے پرلی، ہنگولی اور بسمت وغیرہ کے معتمدین اور دیگر نمائندوں نے بھی خاص طور پر شرکت کی۔ اس طرح پربھنی میں دن بھر علم دوست اصحاب کی ایک چہل پہل سی رہی۔ صبح میں ڈاکٹر زور صاحب نے علمی نمائش کا افتتاح فرمایا۔ مولوی محمد یحیٰی صاحب ایم اے سی ایس مہتمم پولس نے حاضرین جلسہ سے اپنی ایک طویل تقریر میں ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرایا اور صدر جلسہ نے اپنی جامع و مانع تقریر میں ڈاکٹر صاحب سے مجمع کو مخاطب کرنے کی استدعا کی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا کو اجمال کے ساتھ بیان کر کے دکن میں اردو ادب کی نشو و نما پر تبصرہ کیا اور عہد حاضر میں اس زبان کی ترقی کے وسائل بتلائے۔ آپ نے اپنی شاخوں کے جملہ ارباب کار کو مخاطب کر کے ادارۂ ادبیات اردو کے اس مطمح نظر کو واضح کیا کہ اور کسی زبان کی مخالفت اور کسی قسم کے مقامی یا نسلی یا لسانی تعصب کے اظہار کے بغیر اردو کی خدمت کرنی چاہیے اور اس قسم کی خدمت کیونکر کی جا سکتی ہے۔

دوسرا اجلاس شام کے پانچ بجے سے شروع ہوا جس میں حاضرین اور صدر جلسہ کے اصرار پر ڈاکٹر صاحب نے ایک اور تقریر فرمائی جس کے آخر میں ان تمام اصحاب کا شکریہ ادا کیا جو اب تک ادارے کا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور باشندگان پربھنی سے اپیل کی کہ وہ عہدہ داروں کی دلچسپیوں پر اکتفا نہ کریں بلکہ شاخ پربھنی کے کام کو خود اپنے ہاتھ میں

ہیں کیونکہ عہدہ داروں کا وقتاً فوقتاً تبادلہ ہوتا رہتا ہے چنانچہ سنا جاتا ہے کہ مولوی عارف الدین حسن صاحب کا تبادلہ ہونے والا ہے جو اس شاخ کے سرپرست اور روح رواں ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے مولوی ولی حسن صاحب تعلقدار، مولوی مہدی حسین صاحب زبیری مہتمم تعلیمات، مولوی محمد یحییٰ صاحب مہتمم پولس اور مولانا ابرار حسین صاحب کے علاوہ پربھنی کے معتمد روکار مولوی مظہر علی خاں صاحب، مولوی محبوب علی صاحب، مولوی خیر الدین صاحب، ڈاکٹر آر ایم جی صاحب وغیرہ سے استدعا کی تاکہ یہ اصحاب ادارے کے کام میں دلچسپی لے کر شاخ کو اسی طرح ادارے کی دوسری شاخوں میں سرخ رو رکھیں جس کی طرف مولوی حمید اللہ خاں صاحب رشید معتمد شاخ نے صبح کے اجلاس میں سالانہ روداد سناتے وقت اشارہ کیا تھا۔

مختلف تقریروں کے بعد مولانا ابرار حسین صاحب نے اپنی صدارتی تقریر کی جس میں ڈاکٹر صاحب کی اردو خدمات کو تفصیل سے واضح کیا اور اس انفرادی اور نمایاں حیثیت پر نظر ڈالی جو ڈاکٹر صاحب نے اردو کے محسنوں میں حاصل کرلی ہے۔ یہ تقریر ڈھائی گھنٹوں تک جاری رہی۔ حاضرین نے اپنے فصیح و بلیغ مقرر کا ایک ایک جملے کی دل کھول کر داد دی۔

روداد مجلس شعبۂ ادبیات اطفال

مجلس ادبیات اطفال کا ایک جلسہ بتاریخ ۱۸ نومبر ۱۹۴۲ء شام کے ۴ بجے نرائن کالج میں زیر صدارت محترمہ مسنر زین یار جنگ بہادر منعقد ہوا جس میں حسب ذیل خواتین و حضرات نے شرکت کی۔

۱۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ۔
۲۔ " رفیعہ سلطانہ صاحبہ
۳۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔
۴۔ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد۔

گزشتہ اجلاس کی روداد سنائی گئی جس کی صدر صاحبہ نے توثیق فرمائی۔

آج کے جلسے میں خاص طور پر جہاں بانو بیگم صاحبہ، رفیعہ سلطانہ صاحبہ اور سعیدہ مظہر صاحبہ کو مدعو کیا گیا تھا ان کا انتخاب بحیثیت رکن شعبہ عمل میں آیا۔

۱۔ شعبہ کی بڑھتی ہوئی مصروفیات کے پیش نظر خواجہ حمید الدین صاحب کا بحیثیت نائب معتمد شعبہ انتخاب عمل میں آیا۔

۲۔ طے پایا کہ سیدہ جعفری بیگم صاحبہ، رضیہ بیگم صاحبہ، نافعہ بیگم صاحبہ، سلطانہ عزیز صاحبہ، خدیجہ نور الحسن صاحب کو آئندہ جلسے میں شرکت کی دعوت دی جائے۔

۳۔ حیدرآباد پر عربستان کی طرح کتاب لکھنے کا کام رفیعہ سلطانہ صاحبہ کے تفویض کیا گیا۔ یہ کتاب جنوری کے دوسرے ہفتے تک مرتب ہوجائے گی۔

۴۔ جہاں بانو بیگم صاحبہ نے وعدہ فرمایا کہ ۲۰ جنوری سے قبل سونے اور کوئلے کی دونوں کتابیں مرتب کردیں گی۔

۵۔ کتاب شمال کے اس پار محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ کو نظر ثانی کے لئے دی گئی جو ایک ہفتے کے اندر نظر ثانی کے بعد ڈاکٹر زور صاحب کے پاس روانہ کردی جائے گی تاکہ اسے چھاپ دیا جائے۔

۶۔ نظر صاحب کی نظموں کا مجموعہ نظر ثانی کے لئے ڈاکٹر زور صاحب کو دیا گیا اور طے پایا کہ اس کتاب کا معاوضہ بشکل نقد نظر صاحب کو دیا جائے اور بعد نظر ثانی یہ کتاب چھاپ دی جائے۔

۷۔ طے پایا کہ مشاہیر اور شعرا کی سوانح حیات کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے جس میں فی الحال اکبر، اشوک، گرونانک، چاند بی بی اور شعرا میں غالب، اقبال، نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی اور ٹیگور پر مذکورہ بالا خواتین سے کتابیں لکھوائی جائیں اور کون کس پر لکھیں گی اس کا تعین جہاں بانو بیگم صاحبہ تبادلۂ خیال کے بعد کریں گی۔

۸۔ طے پایا کہ اقبال پر خواجہ حمید الدین صاحب کتاب لکھیں گے۔

۹۔ ڈرامہ "سیج کا جادو" چھپوا دینے کی منظوری دی گئی اور اس کے چند منظروں کی تصاویر قیوم صاحب سے بنوانے کا تصفیہ ہوا۔

۱۰۔ شجاع بیگم صاحبہ کی کتاب "کہانیاں ہی کہانیاں" جہاں بانو بیگم صاحبہ کو نظر ثانی کے لئے دی گئی ہے۔ ۱۵ر جنوری تک نظر ثانی کے بعد واپس کر دی جائے گی۔

شاخ بھوم

شاخ ادارۂ ادبیات اردو بھوم کا جلسہ مجلس انتظامی بتاریخ ۱۵ر ستمبر ۱۹۴۲ء بروز سہ شنبہ بوقت (۵) بجے سہ پہر منعقد ہوا جس میں ذیل احباب نے شرکت فرمائی:

مولوی محمود خاں صاحب رکن۔ مولوی عیسیٰ خاں صاحب رکن۔ پنڈت کھنڈیراؤ صاحب رکن۔ سید حبیب اللہ قادری صاحب معتمد۔ کے نرسنگ راؤ صاحب صدر۔ مولوی شیخ وریا صاحب نائب صدر۔

امور تصفیہ شدہ

بالاتفاق شاخ ہذا کی مراسلت صدر شاخ کے نام سے جانا طے پایا۔ اس لئے شاخ کی طرف سے صدر صاحب مراسلت کریں گے۔

چونکہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد نے مرکز بھوم کے ضمن میں بھوم کو شاخ ادارۂ ادبیات اردو بنانے کی اجازت دی ہے اس لئے مجلس انتظامی شاخ بھوم کی طرف سے ادارہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا طے پایا۔

شاخ ہذا کا مقصد یہ ہے کہ جاگیر ہذا کی عوام میں علمی و ادبی ذوق کی اشاعت کیجائے بایں وجہ حسب ذیل انتظام کے ذریعہ شاخ کا مقصد پورا کرنا طے پایا۔

الف۔ امتحانات ادارۂ ادبیات اردو کو برقرار رکھنا اس کے لئے امیدواروں کی تعلیم کا باضابطہ انتظام کرنا۔

ب۔ تعلقہ بھوم کے مدارس کا انتظام شاخ ہذا کے زیر نگرانی رکھا جانا اور شاخ کی کامیابی کیلئے شاخ کی صدر والیہ صاحبہ اسٹیٹ سے حتی الامکان اجازت حاصل کرنا۔

ج۔ مطالعہ خانہ کا قیام عمل میں لانا۔

روئداد شعبۂ سائنس

شعبۂ سائنس ادارۂ ادبیات اردو کا ایک اجلاس شنبہ ۱۴ر نومبر ۱۹۴۲ء شام کے ساڑھے پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔ اس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱۔ پروفیسر محمد سعید الدین صاحب۔ ۲۔ پروفیسر سید محمد علی خاں۔ ۳۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ ۴۔ مولوی عبد الباری صاحب۔ ۵۔ مولوی سید مہدی علی صاحب۔ ۶۔ مسٹر مہندر راج سکسینہ۔ ۷۔ مولوی عبد السلام صاحب۔ ۸۔ مسٹر ستیا نارائن۔ ۹۔ مولوی فیض محمد صاحب صدیقی

حسب ذیل امور طے پائے۔

۱۔ اس شعبہ کے آئندہ اجلاس میں ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب، مولوی شرف الدین صاحب، مولوی خلیل الرحمٰن صاحب اور مولوی خواجہ محی الدین صاحب کو شرکت کی دعوت دیجائے۔

۲۔ حسب ذیل عام فہم کتابیں اس شعبہ کی جانب سے اوائل ۱۹۴۳ء تک مرتب کیجائیں۔

(۱) پودوں کی کہانی	پروفیسر سعید الدین صاحب
(۲) سحر آفریں شعائیں	مولوی محمد علی خاں صاحب
(۳) موسیقی سائنس کی روشنی میں	
(۴) پودوں کی اہم بیماریاں	مولوی عبد الباری صاحب
(۵) جراثیم	مسٹر مہندر راج سکسینہ
(۶) جدید کیمیا گری	مسٹر ستیا نارائن
(۷) زہریلے پودے	مولوی عبد السلام صاحب
(۸) کھی	مولوی مہدی علی صاحب
(۹) پرواز	مولوی فیض محمد صاحب صدیقی

۳۔ حشرات سے پھیلنے والی بیماریوں کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کا ایک سلسلہ اس شعبہ کی طرف سے مرتب کر کے شائع کیا جائے اس سلسلے کی پہلی کتاب "مکھی" ایک ماہ کے اندر مولوی سید مہدی علی صاحب تیار کریں گے۔

۴۔ مسٹر سیبیا ایم ایس سی سے استدعا کیجائے کہ بعنوان "زہریلی گیسیں اور جنگ" اس شعبہ کے لئے ایک کتاب مرتب کریں۔

شاخ گدوال - مورخہ [illegible] نومبر سنہ ۴۳ء بصدارت جناب مولوی محمد علیخاں صاحب ڈویژنل افسر بوقت ۵ بجے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ آغاز جلسہ سے قبل جناب ڈویژنل افسر صاحب نے اردو کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب گنڈے راؤ صاحب ناظم عدالت ضلع کی صدارت کے لئے تحریک فرمائی۔ تائید صدارت کے بعد جناب ناظم صاحب ضلع نے کرسی صدارت کو زینت بخشی۔ اس کے بعد احمد عزیز اللہ صاحب فرزند احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری نے تقریر کرتے ہوئے اردو زبان کی تاریخ بیان کی اور اردو کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ادارۂ ادبیات اردو کا ذکر کیا۔ اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور یہاں پر اس کی شاخ کے قیام کی ضرورت بتائی۔ اردو کے امتحانات کی اہمیت پر کافی روشنی ڈالی اس کے بعد شاخ کی مجلس انتظامی کے لئے عہدہ دار و ارکان انتظامی کے انتخابات بہ غلبۂ آرا حسب ذیل عمل میں آئے۔

جناب پنڈت شیش ریڈی صاحب بی اے ایل ایل بی منصف صدر نشین۔ احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری معتمد۔ جمال الدین صاحب پیرو کار پولس شریک معتمد۔

حسب ذیل ارکان انتظامی منتخب ہوئے۔ مولوی محمد علیخاں صاحب ڈویژنل افسر۔ مولوی سید حسین صاحب ترمذی مدرس مدرسہ فوقانیہ۔ میر واحد علی صاحب سب انسپکٹر آبکاری۔ پنڈت مادھو راؤ صاحب وکیل۔ پنڈت ناگیا صاحب وکیل۔ پنڈت یوگیندر راؤ صاحب وکیل۔ مولوی سید یوسف علی صاحب وکیل۔ مولوی عبدالقادر صاحب وکیل۔ مولوی جمیل احمد صاحب سررشتہ دار عدالت منصفی۔

بشیر اللہ صاحب نائب معتمد صفائی اور جناب سروار یڈی صاحب کپتان نے شاخ کی سرپرستی قبول فرمائی۔ اس کے بعد جناب صدر صاحب جلسہ نے ایک فاضلانہ تقریر فرمائی۔ یہ تقریر نہایت معلومات آفریں تھی اور انداز بیان سادہ اور دلکش تھا۔ جلسہ بہت کامیاب رہا اور احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری کے شکریہ کے بعد برخواست ہوا۔

شاخ بھینسہ بتاریخ ۲ فروری سنہ ۴۲ء مولوی محمد عبدالحفیظ صاحب وکیل کے کوٹھے پر ایک جلسہ ہوا اور یہ طے ہوا کہ حیدرآباد میں جبکہ ادارۂ ادبیات اردو قائم ہے اور زبان اردو کے بقاء، استحکام، ترقی، تبلیغ اور کامیابی کے لئے کام انجام دے رہا ہے تو اس کی ایک شاخ یہاں مثل دیگر مقامات کی شاخوں کے قائم کی جانی ضروری ہے۔ حاضرین میں مولوی علی الدین صاحب مدرس۔ مولوی محمد افضل صاحب مدرس۔ مولوی محمد عبدالحفیظ صاحب وکیل اور غلام غوث صاحب وکیل نے بعد مباحث اس پر اتفاق کیا اور حسب ذیل تجویزیں پاس ہوئے۔

۱۔ قصبۂ بھینسہ میں ادارۂ ادبیات اردو کی ایک شاخ قائم کی جائے۔

۲۔ اس شاخ کے باضابطہ انعقاد کے لئے ایک جلسۂ عام کیا جائے۔

۳۔ مذکورہ جلسہ میں یہ خاکہ کھینچ لیا جائے کہ باضابطہ شاخ قائم کرنے کے لئے اخراجات کی کس طرح سبیل ہو۔

۴۔ قیام شاخ کے لئے فی الحال بطور ایثار کام کرنے والوں کا تعین اور تقرر۔

۵۔ فراہمی چندہ، فراہمی امیدواران امتحان، فراہمی مکان اور ان کے متعلق تکمیلی امور کا انتظام۔

ف۲ - بالاتفاق طے پایا کہ رزولیوشن نمبر ۲ کے متعلق اس کے بعد دو جلسے ہوں ایک خاص۔ دوسرا عام۔

۱۔ خاص جلسہ کے لئے حاضرین میں سے غلام غوث صاحب اور مولوی محمد عبدالحفیظ صاحب وکیل کوشش کرکے بااثر لوگوں کو فراہم کریں۔

۲۔ جب شق اوّل موافق مرام طے ہو جائے تو عام کمیٹی کی جائے۔

ف۳ - قیام شاخ کے لئے فراہمی چندہ کا سوال اہم تھا پس نہایت طویل

بحث مباحثہ کے بعد طے پایا کہ عام چندوں کی طرح در بدر بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا قوم کے علم دوست، ہمدرد اور اردو زبان کے اہل سرپرستوں سے بعد تفہیم مفادات زبان دامی امداد کے طالب ہونا چاہئے۔

۱۔ دامی امداد سالانہ کم از کم (عہ) روپے ہو جو یکمشت وصول کر لی جائے۔

۲۔ مذکورہ (عہ) سالانہ سے بڑھ کر دے سکنے کی حیثیت رکھنے والے جو اصحاب ہمارے سرپرست نہیں انھیں ان کے حسب مراتب و عدد ول سے سرپرست شاخ بنا لیا جائے۔

۳۔ ان کے علاوہ جو اشخاص دوامی چندے مختلف پیمانوں پر دینا قبول فرمائیں انھیں بھی شریک کر لیا جائے۔

ت ۔ شاخ امتحانات میں فی الوقت غلام غوث صاحب، مولوی علی الدین صاحب مدرس، مولوی کریم احمد خاں صاحب مدرس، مولوی محمد عزیز صاحب وکیل اور مولوی محمد ریاض الدین صاحب بی اے ۔ ایل ایل بی وکیل شب کے لوئی دو گھنٹے مقرر کر کے تعلیم دیں۔

ث ۔ حسب فقرہ ۲ فراہمی چندہ ایک اہم معاملہ تھا اس لئے مولوی محمد عبد الحفیظ صاحب کی موٹر میں وہ اور غلام غوث صاحب بروز شیوراتری با سراسٹیشن جناب مولوی محمد حفیظ الحق صاحب تحصیلدار وقت کے پاس گئے جہاں وہ سرسوتی (دیوی) کی جاترا کے انتظام میں مصروف تھے انہیں واقعات سمجھا کر اس کار خیر میں امداد فرمانے کی استدعا کی گئی موصوف نے وعدہ فرمایا کہ عنقریب دورہ پر میں بھینسہ آؤں گا اور وہاں ۳ ۔ ۴ مقام کروں گا اس عرصہ میں اطراف و اکناف کے دیسکمھوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کو جمع کر کے ان سے اغراض، مقاصد و مفادات شاخ بیان کر کے دوامی چندوں کا انتظام کروں گا۔ مگر افسوس کہ ان کے حسب وعدہ بھینسہ دورہ نہ ہونے پایا تھا کہ موصوف کا تبادلہ کھمم ضلع ورنگل ہو گیا جن کی جگہ الحاج مولوی سعادت حسین خاں صاحب دہولی متبدل ہوئے۔

ف ۔ (الف) چونکہ امتحانات کا زمانہ قریب آرہا تھا اس لئے تعلیم امیدواران کی طرف رجوع ہونا ضروری ہوا۔ دیگر متذکرہ اشخاص بد نصیبی سے پابندی کے ساتھ اپنا کوئی وقت نہ دے سکے مجبوراً غلام غوث صاحب نے یہ عمل کیا کہ اپنے فرزند غلام صمدانی اور دختر اقبال النساء بیگم کو اردو عالم کی تعلیم شب میں مکان پر دینی شروع کی۔ اقبال النساء بیگم چونکہ مدرسہ نسواں میں معلمہ بھی ہیں وہ گھر پر اپنے بھائی کے ساتھ پڑھتیں اور مدرسہ جا کر اپنے ذمگی کلاس کو نصاب سرکاری کے موافق پڑھا کر اپنی ڈیوٹی انجام دیتیں اور اوقات مدرسہ ختم ہونے پر دو گھنٹہ مدرسہ میں زیادہ ٹھیر کر امیدواران امتحانات اردو دانی و اردو عالم کو تیار کیا کرتی تھیں۔ ان کی یہ شبانہ روز کی مستعدی و محنت شاقہ باعث فخر ہے۔ یہ ناشکری ہوگی اگر محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ کا اس جگہ ذکر نہ کروں۔ ان خاتون نے جونہی کہ حالات سنے اور امیدواران امتحانات کی تعلیم و انتظامات کا حال معلوم کیا فوراً اس طرف متوجہ ہو کر امیدواروں کو فراہم کیا۔ اردو عالم کی کتب منگوائیں اور خود بھی تیاری امتحان شروع کر دی اور اقبال النساء بیگم کا بہت بڑی حد تک ہاتھ بٹایا فیس شرکت کے وصول و جمع کرنے میں خاطر خواہ حصہ لیا مگر اتفاق وقت کہ امتحانات کے قریب تر زمانہ میں موصوفہ کا انتخاب بغرض تعلیم نارمل اسکول ہو گیا اور وہ یکم امرداد ۱۳۵۱ف سے بلدہ تشریف لے گئیں اگر سچ پوچھا جائے تو یہ کہنا موزوں ہوگا کہ امیدواران اناث کی شرکت کے بانی مبانی یہی ہیں۔

ب ۔ امتحان اردو دانی ذکور کا یہ انتظام رہا کہ یہاں مدرسہ بالغان گورنمنٹ کا امدادی ہے جس میں مولوی غلام نبی صاحب نقل نویس عدالت شب میں تعلیم دیا کرتے ہیں اور انھیں سرکار سے ایک قلیل سا ماہانہ معاوضہ ذریعہ مدرسہ وسطانیہ ملتا ہے۔ اس خصوص میں یہ خیال کیا گیا کہ مولوی قاضی سیادت علی صاحب بی اے ۔ بی ٹی ہیڈ ماسٹر مدرسہ وسطانیہ سے رجوع کیا جائے۔ چنانچہ ان سے عرض حال کرنے پر موصوف نے فوراً بطیب خاطر اس نیک کام میں ہر طرح حصہ لینے کا وعدہ فرمایا۔ مدرسہ بالغان مذکورہ میں

کتب اردو دانی و ضروریات کی بہم رسانی فرمائی نیز وہاں کے معلم صاحب کو ادارہ کے نصاب میں تعلیم دیکر تلامذہ کو امتحان کے لیے تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ وہاں امیدوار تعلیم پانے لگے اور ہفتہ میں ۲۔۳ مرتبہ خود شب میں جاکر مدرس صاحب کی حتی الامکان امداد کرتا طلبہ کو طرز وطریقۂ امتحان سے آگاہ کرکے ہر جگہ میں آموختہ کا امتحان لے لیا کرتا۔

ف۔ قصبہ بھینسہ ایک آباد و تجارتی مقام (عدالت منصفی کا مستقر) ہے یہاں کے اکثر باشندے تجارت پیشہ۔ فوائد علم سے بے بہرہ۔ نہایت غیر حساس واقع ہوئے ہیں۔ انھیں ذریعۂ علم طبقۂ متعدد مرتبہ تفہیم تفہیم۔ وعظ و نصیحت کرنے پر بھی اپنے بچوں کو صرف ایک دو گھنٹے شام میں مدرسہ بھیجنا ایسا تھا گویا کہ ان کی اولاد جنگی جبریہ بھرتی میں لیجا رہی ہے۔ یہ جملۂ معترضہ اس واسطے عرض کیا گیا کہ جہاں حصول علم کی یہ حالت ہو وہاں فراہمی فیس ایک کار دشوار چیز تھی۔ خیر کچھ بچوں نے تو بڑی مصیبت سے لادی مگر یہاں نہ نصاب فیس پورا ہوتا نظر آتا ہے نہ مطلوبہ تعداد امیدواران۔ خواہ مخواہ چندہ کرنے کی نوبت آئی جس میں مولوی محمد عبدالحفیظ صاحب وکیل اور ان کے والد بزرگوار مولوی محمد عبدالواحد صاحب سوداگر نے ایک حد تک حصہ لیا اور باقی تکملہ خود کو کرنا پڑا۔ اتفاق کی بات کہئے یا میری خوش قسمتی کہ اس موقع پر میرے ایک ہم وطن دوست محمد ابراہیم خاں صاحب تحصیلدار اسٹیٹ کوہیر مقطعہ اور میرے ہمزلف مولوی محمد عبدالسلام صاحب وکیل پہونچ گئے اور حالات، اہمیت اور نزاکت حال کو دیکھ کر اپنے اپنے دلی شوق سے خود کو امیدواران فاضل کے لئے پیش کیا اور اپنی اپنی فیس اسی وقت داخل کر دیں۔ اب مجھ سا خوش اقبال [illegible] نصیب کون ہو سکتا تھا [illegible] امیدواران امتحانات [illegible] [illegible]

ش ۱) جناب [illegible] صاحب صدر معلم مدرسہ [illegible] کا مکان مدرسہ لیا گیا اور اسی میں ذکور و اناث کے امتحانات لئے گئے۔

(۲) منجانب معزز ادارہ یہاں کے مرکز کے لئے صدر نگران جناب مولوی محمد خیرالدین صاحب وکیل و واعظ سرکاری کا انتخاب ہوا تھا۔ موصوف نے اپنی نگرانی میں امتحانات لئے نہایت پابندی اوقات اور قیام نظم کے ساتھ امتحانات اختتام کو پہونچے۔

ف۔ (الف) آئندہ سال [illegible] کے لئے مدرسہ بالغان میں اردو دانی کی تعلیم جاری ہے۔ [illegible] کے امتحان کا نتیجہ بہترین صورت میں ظہور پذیر ہونے سے بچوں میں شوق پیدا ہو چلا ہے اور جوق در جوق شرکت کر رہے ہیں۔

(ب) اردو دانی کے کامیاب نیز پانچویں چھٹی جماعت تک تعلیم پاکر مدرسہ چھوڑ دینے والے (آوارہ) بچے اردو عالم کے نتیجہ کو دیکھکر حصول تعلیم "عالم" کے لئے راغب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ فاضل کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔

(ج) بڑی مسرت کی بات یہ ہے کہ عالی جناب مولوی محمد مومن الدین صاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ) منصف کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرنے پر معزالیہ نے ہماری سرپرستی قبول فرمائی اور ازراہ نوازش اپنے ماتحت چپراسیوں اور جوانان طلبانہ وغیرہ کو حصول تعلیم اردو دانی کے لئے حکم دے دیا ہے جو اپنے فرائض سے فارغ ہوکر مدرسہ بالغان میں شب کو تعلیم پایا کریں گے۔

ف۔ تقسیم اسناد کا جلسہ بصدارت عالیجناب منصف صاحب یا اگر ممکن ہوا تو بصدارت عالیجناب اول تعلقدار صاحب ضلع نانڈیڑ منعقد کرنے کا خیال ہے۔

سب رس
ادارہ ادبیات اردو
حیدرآباد دکن
سنہ ۱۹۴۲ع

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۲
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

جلد ۵ بابت ماہ جولائی ۱۹۴۲ء شمارہ ۷

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین بی اے کے اہتمام سے زراتی مشین پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

بے وقت آمد

افق پر صبح کی ضو چھا رہی ہے عروسِ شب کھڑی شرما رہی ہے
بساطِ انجستاں ہولے ہولے فلک پر سے اٹھائی جا رہی ہے

مری امید کی رخشندہ شمعیں کسی کی یاد میں سر دھن رہی ہیں
تمنائیں کچھ ایسی دم بخود ہیں کسی کی چاپ جیسے سن رہی ہیں

پپیہا نیم کی شاخوں پہ بولا مرے خوابوں کا رنگیں سحر ٹوٹا
وہ پورب کی طرف زریں کماں سے لپکتا، سنسناتا تیر چھوٹا

ہواؤں کے خنک جھونکوں کی تلوار کلیجے میں اتر کر تھرتھرائی
وہ ظالم صبح کی پرنور مشعل اندھیرے آسماں پر جگمگائی

چلو اے مردہ امیدوں کے بھتنو! چلو سنسان ویرانوں میں جائیں
خیالی سیج پر کلیاں سجا کر افق کی دھار پر نظریں جمائیں

کبھی تو ختم ہو جائے گا یہ کھیل کبھی تو رحم آئے گا کسی کو
یہ جذبِ دل سے مجھے ہے ناز جس پر کبھی تو کھینچ لائے گا کسی کو

میں اس بستی سے رخصت ہو رہا ہوں مگر میرا قدم کیوں رک رہا ہے
یہ کس کا عکس ابھرا چار جانب مرا سر کس کے آگے جھک رہا ہے

خلاؤں میں یہ کس کے گیت گونجے یہ ہر سو کس کا آنچل پھڑپھڑایا
یہ کس دھن میں بچھی جاتی ہیں آنکھیں خدارا دیکھنا یہ کون آیا

احمد ندیم قاسمی

اقبال و شاد

لاہور یکم نومبر ۱۶ء

سرکار والاتبار۔ تسلیم مع التعظیم

نوازش نامہ مل گیا ہے۔ سرکار کی بندہ نوازی کا سپاس گزار ہوں کہ اس دور افتادہ دعاگو کو بالتزام یاد فرماتے ہیں۔

لاہور سے ایک ماہ کی غیر حاضری کا مقصد سیاحت نہ تھا۔ اگر سیاحت کے مقصد سے گھر سے باہر نکلتا تو ممکن نہ تھا کہ اقبال آستانۂ شاد تک نہ پہونچے۔ مقصد محض آرام تھا۔ لاہور کورٹ میں تعطیل تھی۔ کچہری بند تھی۔ اور میں چاہتا تھا کہ کسی جگہ جہاں لوگ میرے جاننے والے نہ ہوں چلا جاؤں اور تھوڑے دنوں کے لئے آرام کروں۔ پہاڑ جانے کے لئے سامان موجود تھا مگر صرف اسی قدر کہ تنہا جاسکوں تنہا جا کر ایک پرفضا مقام میں آرام کرنا اور اہل و عیال کو گرمی میں چھوڑ جانا بعید از مروت معلوم ہوا۔ اس واسطے ایک گاؤں چلا گیا جہاں ویسی ہی گرمی تھی جیسی لاہور میں مگر آدمیوں کی آمد و رفت نہ تھی۔

اس تنہائی میں مثنوی اسرار خودی کے حصۂ دویم کا کچھ حصہ لکھا گیا اور ایک نظم کے خیالات یا پلاٹ ذہن میں آئے جس کا نام ہوگا "اقلیم خاموشاں" یہ نظم اردو میں ہوگی۔ اور اس کا مقصود یہ دکھانا ہوگا کہ مردہ قومیں دنیا میں کیا کرتی ہیں ان کے عام حالات و جذبات و خیالات کیا ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بس یہ دو باتیں میری تنہائی کی کائنات ہیں۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ سرکار کے لئے ہمیشہ دست بدعا ہوں حیدر آباد کے ارباب حل و عقد خوابیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے اور "حقیقت مضمر" پر ان کی آنکھ کھولے۔ ایسا ہو تو آپ کی قدر ان کو معلوم ہوگی اور داغ مرحوم کا یہ قول صادق آئے گا۔ "تو مجھ کو چاہے اور مجھے اجتناب ہو"

کیا خواجوئے کرمانی کا دیوان سرکار کے کتب خانے میں قلمی یا طبع شدہ موجود ہے؟

خادم دیرینہ محمد اقبال لاہور

مائی ڈیر اقبال ۱۰ اکتوبر ۱۶ء

آپ کا خط موخہ یکم اکتوبر ۱۶ء مجھے ملا۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔ جواب میں دس روز کا عرصہ ہوا جس کا سبب میرے چھوٹے علاتی بھائی راجہ گوبند پرشاد کا انتقال تھا۔ آنجہانی کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔ ہائے۔ ع

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

متوفی کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ماہ ربیع الاول میں اس کے اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ مگر افسوس کہ چار مہینے قبل ہی وہ عروس اجل سے ہمکنار ہو گیا اور عزیزوں کو داغ دائمی جدائی کا دے گیا۔ مرحوم نہایت منکسر المزاج، ملنسار، خلیق اور نیک طبیعت تھا۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

عبرت ہوتی ہے جب ہم انسانی زندگی میں قضاو قدر کے احکام کے نتیجے پر نظر ڈالتے ہیں۔ جس وقت یہ یاد آجاتا ہے کہ انسان آج زمین پر چلتا پھرتا ہے کل زمین کے نیچے ہوگا تو پاؤں کے نیچے سے مٹی نکل جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں ہے کہ مرنے والا مٹی کے ایک بھاری بوجھ کے نیچے دبا پڑا ہوگا۔ بلکہ فنا اس کو اس ہیبت ناک مقام میں لے جا کر کھڑا کرتی ہے جہاں کوئی آگے ہوگا نہ پیچھے۔ نہ کوئی دوست ہوگا جس کے آگے اپنا دردِ دل ظاہر کرے۔ نہ کوئی مونس ہوگا جو اس کا حال دیکھ کر دو آنسو بہائے۔ حقیقت میں موت قضا و قدر کا بنایا ہوا قدیمی فری میسن ہوس کچھ ایسا طلسمی مکان ہے اس کا راز آج تک نہ ظاہر ہوا۔ یہ وہ راز ہے جس کے معلوم کرنے کی ہوس ہر دل میں موجود ہے مگر بے نتیجہ۔ زیادہ غور کیا تو حاکم قضا و قدر کے اسلامی دستور العمل کا یہ ایک فقرہ پڑھ لیا۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۔ یہی فقرہ وجہ تسلی دل ہو جاتا ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

آپ کی نظم "اقلیم خاموشاں" کے دیکھنے کا مجھے بے چینی کے ساتھ انتظار رہے گا۔ مگر مجھے امید ہے کہ اقلیم خاموشاں اسم بامسمیٰ ہوگا۔ ایسا نہ ہو اقلیم حشر ہو جائے اور دار و گیر کی صدائیں ہر طرف سے گونج کر مہر خموشی کو توڑ دیں۔

یہاں کے حالات بدستور ہیں۔ کل یوم بدتر۔ خاموش ہوں

خموشی معنئے دارد کہ در گفتن نمی آید۔

نظلیوں پہ ہر اک کی خموش رہتا ہوں　　مجال بحث نہیں فرصتِ جواب نہیں

آج کل طبیعت بہت گھبرا رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ روز وں باہر ہی رہ کر مناظرِ قدرت سے دل بہلاؤں۔ مگر یہاں بھی چپ ہو جانا پڑتا ہے خدا اس...... پاسبانی سے نجات دے کر آزاد کر دے۔ حیران ہوں کہ بے کار رکھا جاتا ہوں بے کار سمجھا جاتا ہوں تو پھر کیوں آزادی نہیں ملتی......

رہی نہ طاقتِ پرواز اور اگر ہے بھی　　تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

فقیر شاد

سرکار والا تبار تسلیم　　لاہور ۲ اکتوبر ۱۹۱۶ء

والا نامہ مل گیا ہے جس کے لئے میں سرکار کا سپاس گزار ہوں۔ راجہ گوبند پرشاد مرحوم و مغفور کی خبر رحلت معلوم کر کے افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔ کتنے رنج و قلق کی بات ہے کہ ایسا نوجوان اس دنیا سے ناشاد جائے۔ لیکن گوبند پرشاد باقی ہے اور یہ جدائی محض عارضی ہے۔

ہستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم　　عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

لاہور کے حالات بدستور ہیں۔ سردی آ رہی ہے۔ صبح چار بجے کبھی تین بجے اٹھتا ہوں۔ پھر اس کے بعد نہیں سوتا۔ سوائے اس کے کہ مصلیٰ پر کبھی اونگھ جاؤں۔ یہ موسم نہایت خوش گوار ہے۔ اور پنجاب کی سیر و سیاحت کے لئے موزوں۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو پنجاب کی خاک کو قدم بوسی کا موقع دیجئے۔ یہاں کے دلوں پر آپ کا نقش ابھی تک موجود ہے۔

کبھی اس راہ سے شاید سواری تیری گزری ہے — کہ میرے دل میں نقش پاترے توسن کے نکلے ہیں

"اقلیم خاموشاں" تیار ہو جائے تو سرکار کی خدمت میں ارسال کروں۔ مقصود اقلیم خاموشاں سے محشر ہے نہ کہ دیدار الٰہی نصیب ہو کہ یہ موقوف بہ محشر ہے۔

'طالب دیدار محشر کا تمنائی ہوا — وہ سمجھتے ہیں کہ جرم ناشکیبائی ہوا'

زیادہ کیا عرض کروں کہ سرکار سے دور ہوں اور جیتا ہوں!

مخلص محمد اقبال

ہاں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ لاہور میں کچھ عرصے سے ایک بہت بڑے ایرانی عالم مقیم ہیں۔ یعنی سرکار علامہ شیخ عبد العلی طہرانی۔ معلوم نہیں کبھی حیدرآباد میں بھی ان کا گزر ہوا یا نہیں۔ عالم متبحر ہیں۔ مذہباً شیعہ ہیں مگر مطالب قرآن بیان فرماتے ہیں تو سمجھنے سوچنے والے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ علم جفر میں کمال رکھتے ہیں کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا ہوں۔ اگر اس موسم میں سرکار لاہور کا سفر کریں تو خوب ہو کہ یہ آدمی دیکھنے کے قابل ہے۔

محمد اقبال

مائی ڈیر اقبال — ۱۱ نومبر ۱۶ء

آپ کے خط رقمزدہ ۳۱ اکتوبر ۱۶ء کا آج گیارہ نومبر کو جواب لکھ رہا ہوں۔ مگر سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں زمانے کی نیرنگیوں کا مشاہدہ کر رہا ہوں اور انگشت بدنداں ہوں۔ کبھی اپنی پابندیوں پر نظر ڈالتا ہوں۔ گو آزادی کا نگراں ہوں۔ احباب کی حالت کا اندازہ کر رہا ہوں اور حیران ہوں۔ اعدا کی سینہ زوریوں کو دیکھ رہا ہوں مگر خاموش ہوں۔

بسکہ لذت دو ستم یک لخت دل — بر متاع صد نمکداں می زنم

موجودہ زمانے پر کچھ منحصر نہیں۔ ہمیشہ سے یہ ایک استمراری قانون چلا آرہا ہے کہ اس عالم میں انسان کے اقتدارات جس قدر زیادہ وسیع ہیں اس کی ذمہ داریاں بھی اسی قدر زیادہ ہیں۔ یہ جس قدر زیادہ مقتدر ہے اسی قدر زیادہ محتاج ہے جس قدر دنیا قوی ہے دوسری حیثیت سے اسی قدر ضعیف ہے۔ جس قدر ترقی اور بلندی کی طرف پرواز کرسکتا ہے۔ اتنا ہی پستی کی طرف تنزل کر سکتا ہے۔ اور وہ چیز جو اس کو بلندی و ہدایت کی طرف ابھارتی ہے یا پستی و ضلالت کی طرف ڈھکیلتی ہے اس کی معلومات، اس کا دل، اس کے اختیارات، اس کی خواہش، اور اس کا ارادہ ہے۔ جب میں اپنے پچھلے زمانے پر نظر ڈال کر اس زمانے سے موازنہ کرتا ہوں تو میں موجودہ حالت کو اس راہ رو کی حالت کی ایک مثال پاتا ہوں جس کا گزر ایسے پل پر ہو جس کے دو طرفہ زخار سمندر موجزن ہوں اور پل کی راہ اس قدر دشوار گزار ہو کہ اگر وہ اپنی ہوشیاری اور مستقل مزاجی سے قدم نہ اٹھائے تو گر کر ڈوب جائے۔

اگرچہ آزادی کا دلدادہ ہوں لیکن پابندی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ بایں ہمہ صرف اپنی ہی کوشش، اپنی ہی سعی

اپنی ہی غرض سے، اپنے اعلیٰ مقصد (آزادی۔ خویشتن داری) کے حاصل کرنے کی خواہش کو اپنے دل میں مستقل طور پر جگہ دے سکتا ہوں۔ اور دے رہا ہوں۔ مگر کیا کروں جہاں اختیار ہے وہاں مجبوری بھی ہے۔ "آناں کہ غنی تر اند محتاج تر اند"۔
آج کل میری یہ کوشش ہے، خدا مجھے اس میں کامیاب کرے، کہ سفر کروں اور اپنے کعبۂ مقصود کا طواف۔ یعنی بارگاہ حضرت خواجہ پر پہونچ کر اپنی امیدوں کا چراغ روشن کروں۔ اس شہر کی آب و ہوا میں آج کل طاعونی رو دارت کی شکایت بھی بستی جارہی ہے۔ خدا محفوظ رکھے۔ اگر اجمیر آنا ہوا تو آپ سے ملاقات ضرور کروں گا۔ اگرچہ میں خود لاہور آؤں یا آپ کو اجمیر بلاؤں۔
آپ کے اس فقرہ پر کہ "صبح چار بجے کبھی تین بجے اٹھتا ہوں۔ پھر اس کے بعد نہیں سوتا سوائے اس کے کہ مصلیٰ پر کبھی اونگھ جاؤں" مجھے ہنسی آئی۔ پیارے اقبال! تم تو ۸۔ ۹ بجے سے چار بجے یعنی سات آٹھ گھنٹے سوتے بھی ہو۔ مصلیٰ پر بیٹھ کر اونگھ بھی جاتے ہو۔
یہاں بقول غالب مرحوم

دکھ جی کے پسند ہوگیا ہے غالب — دل رک رک کے بند ہوگیا ہے غالب
واللہ شب کو نیند آتی ہی نہیں — سونا سوگند ہوگیا ہے غالب

خواب میں بھی نیند نہیں آتی۔ ع جب سے لگی ہے آنکھ ترستی ہے خواب کو

"اقلیم خاموشاں" کا منتظر ہوں۔ ابھی مجھے سرکار علامہ شیخ عبدالعلی طہرانی سے آپ کے خط میں ملاقات کرنا باقی ہے۔ میں ان کا غائبانہ مشتاق ملاقات ہوں۔ مجھے علم نہیں نہ یاد ہے کہ حیدرآباد میں یہ کبھی آئے ہوں۔ میری طرف سے سلام شوق ملاقات مزاج پرسی کیجیے۔ اور کہیے کہ "علم جفر کے مبارک احکام کے اثر سے مجھے بھی کچھ تسلی بخش حصہ ملنا چاہیئے"۔

فقیر شاد

غزل

(یہ غزل ادارہ کے اس مشاعرے میں پڑھی گئی تھی جو مولانا حسرت موہانی کی آمد حیدرآباد کے موقع پر منعقد ہوا تھا)

آپ ہی کا خیال ہے شاید — جب ہی دل کو ملال ہے شاید
وہ تو وہ موت کیوں نہیں آتی — یہ بھی امر محال ہے شاید
مجھ کو دیکھا تو چڑھ گئی تیوری — میری صورت سوال ہے شاید
بے سبب ہچکیاں نہیں آتیں — ان کو میرا خیال ہے شاید
قصۂ کوہکن پہ حیراں ہیں — جان دینا کمال ہے شاید
چارہ گر منہ پھرا کے رونے لگا — میرا بچنا محال ہے شاید

زیر لب گنگنا رہے ہیں سعید
کچھ طبیعت بحال ہے شاید

عابد علی سعید

سوزِ نومیدی

الجھی سلجھی سانسوں سے، اب زیست کا ساماں کیا ہوگا
جینا تو مر مر کے ہوا تھا، مرنا آساں کیا ہوگا

ہوگا کیا جینے کا سہارا زیست کا ساماں کیا ہوگا
لاگ نہیں اب تجھ سے بھی دل کو اے غمِ پنہاں کیا ہوگا

آنسو بن کر ٹپکا بھی تو کارِ نمایاں کیا ہوگا
اے غمِ پنہاں اے غمِ پنہاں اے غمِ پنہاں کیا ہوگا!!!؟

غرق ہوئے تو ہو جائیں گے کارِ نمایاں کیا ہوگا؟
موج کے اٹھنے گرنے سے نقصانِ طوفاں کیا ہوگا

الٹے سیدھے شکووں پر وہ کافر حیراں کیا ہوگا
عشق ہی آنکھیں نیچی کر لے حسن پشیماں کیا ہوگا

حسنِ بہاراں کیفِ بہاراں جوشِ بہاراں کیا ہوگا
دیوانے گلشن میں نہیں مرکز پہ گلستاں کیا ہوگا

طوفاں طوفاں بہتے پھرنا رسوائی ہے کشتی کی
بچ نکلے تو دنیا کو اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

کشتی نذرِ موج بلا ہے موجِ بلا کا کیا کہنا
ساحل تک پہونچا بھی دیا تو ہم پر احساں کیا ہوگا

ہوش گریزاں، شکوے لرزاں گویائی کی تاب نہیں
شوق کے ان طوفانوں میں وہ شوخ پشیماں کیا ہوگا

روتی ہوئی آنکھوں کی جگہ کچھ اشک نہیں نگیں نگیں سے
اس سے زیادہ سوزِ محبت اور نمایاں کیا ہوگا

کعبۂ دل آثارِ شکستہ ان کی نگاہیں کفر بت م
شیخ و برہمن کچھ تو کہو انجامِ ایماں کیا ہوگا

شام و سحر وہ برق کی چشمک گلشن کا وہ جل بجھنا
سب یہ چراغاں ہم سے تھا اب جشنِ چراغاں کیا ہوگا

ان کی مرضی جبرِ مسلسل، ہستی سرتاپا مجبور!
اپنے بس میں کچھ بھی نہیں تا حدِ امکاں کیا ہوگا

قیدِ حیات و جبرِ مشیت اس پہ فریبِ مختاری!
تجھ سے بڑھ کر اے غمِ ہستی کوئی زنداں کیا ہوگا

ان کا قصّہ بھید نہیں کچھ دل کا فسانہ راز نہیں
میرے دو اک اشکوں سے یہ اور نمایاں کیا ہوگا

موسمِ گل میں ٹکڑے کرنا اور ہوا میں اُڑ جانا
اس سے زیادہ اے غمِ وحشت مصرفِ داماں کیا ہوگا

کوئل ہو یا بلبل ہو یا جھرنے ہوں کہساروں کے
کوئی بھلا ساغر کی طرح مستی میں غزل خواں کیا ہوگا

ساغر نظامی.

اُردو کا دشمن کون ہے

سب سے پہلے تو مجھے جناب اڈیٹر صاحب ماہ نامہ "سب رس" کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انھوں نے میرا ایک مضمون جو تلخ حقائق سے لبریز تھا شائع کردیا۔ ورنہ اس نوع کے مضامین سے اُردو رسائل وجرائد کو سخت نفرت ہے۔ لاہور کے ایک مشہور ماہ نامہ کے اڈیٹر صاحب نے میرا اسی قسم کا ایک مضمون پڑھ کر فرمایا تھا "اس کی اشاعت سے رسالہ کو مالی نقصان ہوگا۔ خریدار ناراض ہوجائیں گے۔" اس سے ظاہر ہے کہ مسلمان اب سچی باتیں سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ وہ دوسروں کو گالیاں دینے اور بدنام کرنے کے لئے شیر ہیں مگر اپنی خامیوں کی اصلاح کرنا گناہ جانتے ہیں۔ ان کی خواہش یہی ہے کہ اپنی تمام لغزشوں اور کوتاہیوں کا سارا الزام مخالفین کے سرتھوپ دیں اور اپنے لئے خود کچھ نہ کریں۔ ان کی یہی خواہش ان کی اپنی تباہی وبربادی کا سب سے اہم باعث بنی ہوئی ہے۔ اس لئے جناب اڈیٹر صاحب ماہ نامہ "سب رس" کی ہمت وجرأت کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے کہ انھوں نے کسی کے ناراض ہوجانے کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی زبان اور اپنی قوم کے ایک سچے خادم کی حیثیت سے چند تلخ اور ناگوار باتیں بھی چھاپ دیں۔ اور اب چونکہ یہ معاملہ زیر بحث آگیا ہے اس لئے اڈیٹر صاحب ماہ نامہ "سب رس" کا فرض ہے کہ وہ اِس اہم ترین معاملے کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کی اجازت دیں کیونکہ اس طرح ممکن ہے کہ کوئی دردمند اور حساس دل ان خرابیوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوجائے اور اس نازک ترین وقت میں بھی ہماری قوم کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کنارے لگ جائے۔

اپنے سابقہ مضمون میں عرض کیا تھا کہ ہندستان کے مسلمانوں کو برادرانِ وطن سے منجملہ دیگر شکایتوں کے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ وہ عمداً اور دیدہ ودانستہ اُردو سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ مسلمان کہتے ہیں کہ اردو ایک قومی زبان ہے اسے وجود میں لانے اور پروان چڑھانے میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی برابر کے شریک ہیں' لیکن برادرانِ وطن کی ایک جماعت کا جس میں گاندھی جی ایسے "قوم پرست" حضرات بھی شامل ہیں قول ہے کہ چونکہ اُردو "قرآن کے حروف" میں لکھی جاتی ہے۔ اس لئے وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ سردست مجھے اس سے بحث نہیں کہ اُردو قومی زبان ہے یا صرف مسلمانوں کی لیکن اگر بالفرض محال یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ ہماری یہ شکایت کہ برادرانِ وطن اُردو کو حرفِ غلط کی طرح مٹادینے پر تلے ہوئے ہیں کہاں تک درست ہے۔

میں یکم جنوری ۱۹۲۹ء یعنی گزشتہ تیرہ سال سے بطور ایک اخبار نویس کے زندگی بسر کررہا ہوں۔ اور اپنے قلم سے اُردو کی بری یا بھلی خدمت کرنے کا فخر تو مجھے ۱۹۲۴ء یعنی گزشتہ اٹھارہ سال سے حاصل ہے۔ اِس دوران میں میں نے لاہور، لکھنو، الہ آباد، کلکتہ، مدراس، بمبئی اور دہلی میں قیام کرکے کام کیا ہے۔ میں نے ہزاروں لیڈروں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ملاقات کی ہے۔ میرا تلخ تجربہ تو یہی ہے کہ اردو کے بدترین دشمن اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں۔ وہ مسلمان جن کی

تعلیمی قابلیت بہت معمولی یا نہ ہونے کے برابر۔ اب بھی حسب توفیق بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اپنی زبان کی خدمت کر رہے ہیں
جس کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت یہی ہے کہ جو رسالے اور اخبار عوام کے مذاق کے مطابق مضامین اور افسانے شائع کرتے ہیں،
ان کی تعداد اشاعت بمقابلہ ان رسائل و جرائد کے جن میں سنجیدہ اور معیاری مضامین شائع ہوتے ہیں بیس گنا زیادہ ہے۔
ممکن ہے کہ آپ نے بھی اخباروں میں یہ خبر پڑھی ہو کہ ۱۹۳۶ء میں یو۔ پی کی مجلس قانون ساز کے ایک انگلو انڈین
ممبر نے یہ تحریک پیش کی تھی کہ تمام ممبر اپنی اپنی مادری زبان میں تقریر کریں۔ اس کے جواب میں بہت سے ہندو اور کئی انگلو انڈین
ممبروں نے فصیح و بلیغ اُردو میں تقریریں کی تھیں، مگر آفریں ہے ایک مشہور مسلمان تعلقدار پر کہ اس نے اس تحریک کی مخالفت کی
اور اُردو میں تقریر کرنے سے انکار کر دیا۔ اور آج بھی موقعہ بے موقعہ انگریزی میں ہی تقریریں کیا کرتے ہیں۔ اب آپ ہی ایمان
سے کہیں کہ ہمارے اس مسلمان تعلقدار کی یہ حرکت اُردو سے دشمنی نہیں ہے۔ اور یہ بات صرف اسی پر منحصر نہیں، بلکہ نوے
فی صدی اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان اُردو میں تقریر کرنا یا اُردو رسائل و جرائد پڑھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔
اگر آپ نے کبھی ہندوستانی مسلمانوں کی فطرت کا نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی امتیازی
خوبی یہی ہے کہ وہ چیختے چلّاتے تو بہت ہیں، لیکن عمل کے نام سے صفر ہیں۔ انھیں دوسروں کو گالیاں دینے اور چیخ چیخ کر
آسمان سر پر اٹھا لینے میں مہارتِ تامہ حاصل ہے، مگر میدانِ عمل میں ان کا نام و نشان تک ملنا مشکل ہے۔ اور یہی وجہ ان کے
زوال اور موجودہ پست حالت کی ہے۔ کیونکہ اس دنیائے کشاکشی میں صرف وہی قومیں زندہ رہ سکتی ہیں جو زندہ رہنے کی اہل
ہوں۔ بے عملوں اور نااہلوں کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ جس قدر بھی جلد فنا ہو جائیں بہتر ہے۔ اگر ہندستان کے
مسلمانوں نے اب بھی یہ بات نہ سمجھی تو ان کے لئے زیادہ نقصان دہ ہوگا۔ وہ اپنی بے عملی اور نااہلیت سے صرف اپنی زبان ہی
کو نہیں بلکہ اپنے وجود کو بھی مٹا رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کو میرا یہ قول عجیب معلوم ہو کہ اُردو کے بدترین دشمن خود مسلمان ہیں۔
لیکن اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حقیقتِ حال یہی ہے۔
برادرانِ وطن ہندی کو اپنی قومی یا کم از کم مادری زبان کہتے ہیں۔ اس لئے وہ اسے بڑھا رہے ہیں اور ایسا کرنے
کا انھیں ہر وقت حق حاصل ہے۔ پھر برادرانِ وطن باعمل انسان ہیں۔ اس لئے وہ نہایت خاموشی کے ساتھ ہندی کی
نشر و اشاعت کے لئے ہر ممکن کوشش سے کام لے رہے ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ صوبہ مدراس کے لوگوں کو خواہ وہ ہندو
ہوں یا مسلمان، ہندی سے کوئی تعلق نہیں اور وہ ہندی کو اپنی زبان بنانا بھی نہیں چاہتے۔ لیکن اسی صوبہ کی سابق
کانگریسی حکومت نے مسٹر راج گوپال چاری کی قیادت میں اہل صوبہ کے اعتراض کے باوجود اپنے اقتدار کی طاقت سے انھیں
ہندی سیکھنے پر مجبور کیا۔ یو۔ پی کی سابق کانگریسی حکومت کے وزیر تعلیم بابو سمپورنانند نے تحریر و تقریر کے ذریعے اپنے صوبے میں
ہندی رائج کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ، گاندھی جی، بابو راجندر پرشاد وغیرہ کی کوششوں سے
آج ہندستان کی ہر ہندو ریاست میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا جا چکا ہے۔ اور وہاں حکومت اور عدالت کا تمام کام
ہندی میں ہی ہوتا ہے۔ غضب تو یہ ہے ریاست جموں اور کشمیر میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ۸۰ فی صدی ہے نہایت خاموشی

کے ساتھ ہندی رائج کی جا رہی ہے۔

اسی طرح اب اگر مسلمان اُردو کو قومی زبان نہ سہی اپنی مادری زبان ہی سمجھتے ہیں اور اپنے مستقبل کے لئے اُردو کے وجود کو ضروری جانتے ہیں تو وہ اُسے پروان چڑھائیں، کس نے انھیں ایسا کرنے سے روکا ہے اور کونسا قانون ایسا ہے جو انھیں اُردو کو ترقی دینے سے منع کرتا ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ مسلمان "اردو مٹ رہی ہے" "اردو مٹ رہی ہے" کے نعرے تو ضرور لگا رہے ہیں، لیکن اُردو کو مٹنے سے روکنے کے لئے کوئی کام نہیں کر رہے ہیں۔ لڈو کہنے سے منہ میٹھا نہیں ہوتا۔ صرف باتیں بنانے اور دوسروں کو مجرم قرار دینے سے مسلمانوں کو یا اُردو زبان کو نہ پہلے کبھی فائدہ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اُردو کے بدترین دشمن خود مسلمان ہیں وہ اپنی بے عملی سے اپنی قبر آپ کھود رہے ہیں۔ آپ ہندستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست حیدرآباد کو ہی لے لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم عثمان علی خاں بہادر خسروِ دکن و برار نے اُردو کی نشر و اشاعت کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔ اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا جا چکا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں اُردو ہی ذریعہ تعلیم ہے مگر جیسا کہ یکم اور پندرہ نومبر کی اشاعتوں میں "ہماری زبان" دہلی میں شائع شدہ مضمون سے ظاہر ہے حکومت حیدرآباد کے اکثر شعبوں میں آج بھی اُردو کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور تمام دفتری کام انگریزی میں ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ریاست گوالیار کو لے لیں اگرچہ گزشتہ دو ماہ ہوئے مسلمانوں کے زبردست اعتراض کے جواب میں حکومت گوالیار کو اعلان کرنا پڑا تھا کہ ریاست میں اُردو اور ہندی کو مساوی حیثیت حاصل ہے۔ مگر عملی طور پر دفتروں اور عدالتوں کی تمام کاروائیاں صرف ہندی ہی نہیں بلکہ "سمپورانندی ہندی" میں ہوتی ہیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ برطانوی ہند میں مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے۔ مگر آج بھی اردو کے ساتھ یہ اسلامی درس گاہ سوتیلی ماں کا سلوک روا رکھے ہوئے ہے۔ ایکاڈیمک کونسل کے جلسوں میں ممبر صاحبان انگریزی میں ہی تقریریں کیا کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹیں بھی انگریزی ہی میں شائع ہوتی ہیں۔ الغرض ہر حیثیت سے یہ یونیورسٹی ہندستانی مسلمانوں کی نہیں بلکہ انگریزوں کی تعلیمی درس گاہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ ہندو یونیورسٹی بنارس کو لے لیجئے۔ مجھے دو ایک مرتبہ اس کی ایکاڈیمک کونسل کے جلسوں میں شرکت کا موقعہ مل چکا ہے اور یہ دیکھ کر مجھے انتہائی خوشی ہوئی تھی کہ کونسل کے ممبر اپنی اپنی مادری زبان میں تقریریں کر رہے تھے۔ اسی یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پنڈت مدن موہن مالویہ ہمیشہ ہندی میں ہی تقریر کیا کرتے ہیں اور ہندی کو بڑھانے کے لئے ہر ممکن کوشش سے کام لے رہے ہیں۔ اور صرف اس لئے کہ وہ ہندی کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں۔ اور ہندی کی ترقی سے اپنے مستقبل کو وابستہ کئے ہوئے ہیں۔

گزشتہ سال (۱۹۴۱ء) مجھے ایک ضرورت سے ناگپور جانے کا اتفاق ہوا۔ ریلوے اسٹیشن سے میں تانگہ میں سوار ہو کر قیام کرنے کے ارادہ سے محمد علی سرائے میں گیا۔ نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس جگہ سوائے مسلمانوں کے اور کوئی نہ ٹھیرتا ہوگا۔ لیکن ڈیوڑھی میں اس سرائے کا کارندہ ہندی میں مسافروں کے نام درج رجسٹر کر رہا تھا۔ میں نے یہ دیکھ کر اس سے کہا "برائے کرم میرا نام اُردو میں درج کیجئے" فوراً جواب ملا "یہاں اُردو کوئی نہیں جانتا" اس پر میں نے کہا "لائیے میں خود اپنا نام و پتہ

؎ ابھی ابھی حضور نظام سے تمام دفاتر میں اردو کے استعمال کے متعلق احکام صادر ہوئے ہیں

اُردو میں لکھ دوں" جواب ملا "اُردو میں لکھنے کی اجازت نہیں" یہ سن کر مجھے اس قدر صدمہ ہوا کہ اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔
میں نے اس سرائے میں قیام کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا' اور سامان لے کر ریلوے ویٹنگ روم میں واپس آگیا۔ دوسرے دن میں نے اپنے ہم وطن اور عزیز جناب مولانا ابوالحسن صاحب ناطق سے اس کی شکایت کی۔ وہ اس سرائے کی مینجنگ کمیٹی کے ممبر ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس طرف توجہ دیں گے۔ مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا یا نہیں۔

اگر آپ وسط ہند، سی۔ پی، گجرات اور کاٹھیاواڑ وغیرہ کی سیر کریں۔ اُجین، اندور، مہو، رتلام، بڑودہ، احمد آباد، ناگپور، جبل پور وغیرہ کے شہروں میں جائیں تو آپ کو محسوس ہی نہ ہو گا کہ یہاں کوئی مسلمان بھی آباد ہے' بڑے بڑے شاندار بازاروں' سربفلک عمارتوں اور سامان جدید سے آراستہ دکانوں میں لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے مسلمان بیٹھے تو ضرور نظر آئیں گے' مگر اُن کی دکانوں پر آپ کو انگریزی، گجراتی اور ہندی کے سائین بورڈ نظر آئیں گے۔ اور اُردو کا کوئی سائین بورڈ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گا۔ ان سائین بورڈوں پر انگریزی میں نام لکھوانا تو اس لئے ضروری ہے کہ وہاں کوئی انگریز سامان خریدنے نہیں آتا ہے البتہ ہماری اپنی غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہو جاتا ہے۔ اور اُردو اس لئے غیر ضروری ہے کہ یہ ایک بے عمل قوم کی زبان ہے۔ اب میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ جب مسلمان اُردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں لیکن وہ خود اسے اپنے سائین بورڈوں پر بھی جگہ دینے کے لئے تیار نہیں تو پھر مسلمانوں کی یہ توقع کہ برادران وطن اُردو کو بڑھائیں سراسر حماقت ہے۔ پہلے آپ خود اپنی اور اپنی زبان کی عزت کیجئے اس کے بعد ہی دوسروں سے توقع رکھئے کہ وہ آپ کی اور آپ کی زبان کی عزت کریں۔

وسط ہند میں اتنا تو ضرور ہے کہ چائے خانوں اور ہوٹلوں کے سائین بورڈوں پر انگریزی ہندی اور گجراتی کے ساتھ اُردو میں بھی ہوٹل کے نام تحریر ہیں۔ مگر گجرات اور کاٹھیاواڑ میں یہ بھی نہیں۔ ایک مرتبہ مجھے بڑودہ کی سیر کرنے کا موقع ملا۔ یہ بہت ہی عالی شان اور خوبصورت شہر ہے۔ آبادی بھی اس کی تقریباً دو لاکھ ہے۔ یہ یقینی ہے کہ یہاں مسلمان بھی آباد ہوں گے لیکن میں کامل چھ گھنٹے شہر کے بازاروں میں ایک ایسے ہوٹل یا چائے خانہ کی تلاش میں گھومتا رہا جس کے سائین بورڈ پر اُردو میں ہوٹل کا نام تحریر ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں اپنی اس جستجو میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اب آپ دیکھیں اور غور کریں کہ خود مسلمانوں کا سلوک اُردو کے ساتھ کیا ہے۔

مسلمان کہتے ہیں کہ اردو ایک عالمگیر زبان ہے۔ یہ کسی خاص صوبے تک محدود نہیں بلکہ ہندستان کے ہر صوبے اور شہر کی زبان ہے۔ مگر ہندو مسلمانوں کے اس دعوے کو نہیں مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مسلمان جھوٹ بولتے ہیں۔ اُردو شمالی ہند کے صرف چند لاکھ مسلمانوں کی زبان ہے اور وہ اپنے اس قول کی تائید میں پنجاب اور یو۔ پی کو چھوڑ کر بقیہ تمام صوبوں کے مسلمانوں کے نجی کاروبار کے رجسٹر دکھاتے ہیں کہ دیکھئے اس میں ہندی لکھی ہوئی ہے۔ اگر مسلمانوں کی زبان اُردو ہوتی تو وہ اردو میں کم از کم اپنا خانگی کام تو کرتے مگر چونکہ وہ اُردو سے واقف ہی نہیں اس لئے وہ ہندی میں اپنا کام کرتے ہیں' لہٰذا یہ ان کی مادری زبان ہے۔ اب آپ ہی ایمان سے کہیں کہ کیا ہندو جھوٹ بولتے ہیں۔ حیرت ہے کہ مسلمان خود تو اردو کی اتنی قدر بھی نہیں کرتے کہ اپنے نجی کاروبار میں ہی اسے استعمال کریں اور پھر کہتے ہیں کہ برادرانِ وطن اردو کو مٹا رہے ہیں۔ آپ کا یہ دعویٰ

بلا دلیل کون مانے گا۔ دوسروں کو اپنایا اپنی زبان کا دشمن قرار دینے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ اپنی اور اپنی زبان کی عزت کرنا سیکھیں۔ ہندوؤں کو تو بعد ہی میں اردو سکھانا پہلے مسلمانوں کو اُردو سکھائیے۔

اب اس کے مقابلہ میں ذرا برادران وطن کا اپنی زبان کے ساتھ سلوک بھی دیکھ لیجئے۔ آپ دوسرے صوبوں کو چھوڑ دیجئے اور دیکھئے کہ دہلی جسے اُردو کا مولد اور گہوارہ ہونے کا فخر حاصل ہے وہاں کیا حالت ہے۔ اگرچہ اس صوبے کے تمام ہندو نہایت فصیح و بلیغ اردو لکھ اور پڑھ سکتے ہیں لیکن اگر آپ کسی ہندو کی دکان سے سودا خریدیں گے تو وہ آپ کو ہندی میں رسید لکھ کر دے گا۔ صرف اس لئے کہ وہ ہندی کو اپنی مادری زبان سمجھتا ہے۔ مگر کیا کوئی ایسا مسلمان بھی ہے جو ہندی میں رسید لینے سے انکار کر دے۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو بہت معمولی بات ہے اسے اٹھانا مناسب نہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ بھائی معمولی باتوں سے ہی بڑے بڑے نتائج مرتب ہوا کرتے ہیں۔ یہی معمولی باتیں کل کو ایک خاص اہمیت حاصل کرلیں گی۔ اب آپ اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی سن لیجئے۔ ۴ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو جناب حکیم محمد تقی صاحب اڈیٹر ماہ نامہ مشہور دہلی کاغذ خریدنے بازار گئے۔ اتفاق سے میں بھی ساتھ تھا۔ حکیم صاحب نے ایک ہندو کی دکان سے کاغذ خریدا۔ دکاندار نے ہندی میں رسید لکھ کر دی۔ اس پر میں نے اعتراض کیا "بھائی ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے لئے اُردو میں رسید لکھئے" فوراً جواب ملا "ہم اُردو نہیں جانتے" میں نے حکیم صاحب کو اس طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا "آپ حیرت زدہ ہیں کہ اُردو ایک "عالمگیر" زبان ہوتے ہوئے اپنے ہمدردوں کی تعداد محدود کیوں رکھتی ہے۔ اس کا جواب یہ دکاندار ہے" حکیم صاحب نے اسے بہت معمولی بات سمجھی اور ہنس کر ٹال دیا۔ لیکن اگر وہ اس وقت میرا ساتھ دیتے تو یقیناً اس کا اچھا اثر پڑتا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آج ہم میں یہ اسپرٹ پیدا ہو جائے کہ ہم اپنی زبان کی خود عزت کریں اور دوسروں سے کرائیں تو پھر اُردو بہت جلد ایک عالمگیر زبان بن جائے۔ اب باتیں بنانے کا زمانہ نہیں ہے، عمل کیجئے عمل۔

اردو کس طرح ترقی کرے جب کہ اُردو داں حضرات خادمانِ علم و ادب کی قدر کرنا جانتے ہی نہیں۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے نام سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ وہ اُردو کے سب سے بڑے "لکھار" اور مقبول مزاح نگار تھے۔ انھوں نے اپنی عمر کے آخری تین سال دِق اور دمّہ کے عارضہ میں مبتلا ہو کر گزارے بیماری نے ان کی مالی حالت اس قدر کمزور کر دی تھی کہ وہ قوت لایموت تک مہیا کرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ پیٹ نے بیماری کی حالت میں بھی قلم چلانے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن وہ اس وقت زیادہ تر ہندی رسائل و جرائد میں لکھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جودھپور میں میری مرزا صاحب سے ملاقات ہوئی، میں نے شکایت کی کہ وہ اردو کی جگہ ہندی کو کیوں بڑھا رہے ہیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے منی آرڈروں کی رسیدیں، ہندی داں حضرات کے خطوط اور تحائف کی فہرست میرے سامنے ڈالدی اور کہا "مورخ صاحب دیکھ لیجئے کہ میں کیوں ہندی میں لکھ رہا ہوں میں بھی آخر انسان ہوں اور عیالدار۔ اُردو میں قلم چلا کر کب تک فاقہ کروں" ۱۹۳۱ء میں میری منشی پریم چند سے نولکشور پریس لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس زمانے میں نولکشور پریس کے ہندی شعبہ کا انتظام ان کے سپرد تھا۔ اور رسالہ "مادھری" کی ترقی بھی انہی کے مساعی کی ممنون تھی۔ میں نے منشی صاحب سے دریافت کیا کہ انھوں نے اُردو کی بجائے ہندی کو کیوں اختیار کیا؟ منشی جی نے فوراً جواب دیا "پیٹ" اب آپ ہی انصاف سے کہیں کہ ان حالات میں اُردو کس طرح ترقی کرسکتی ہے، کیا اس سے بھی زیادہ اور کوئی ثبوت مسلمانوں کی اُردو سے دشمنی، اور مسلمانوں کی بے علمی اور ناقدردانی کا ہو سکتا ہے۔

سید محمود مورخ

غزل

محبت میں جنوں کی حد کا کس کو ہوش رہتا ہے
مگر ہاں کچھ دنوں سے سر و بالِ دوش رہتا ہے

کوئی دانستہ ان کے، و برو خاموش رہتا ہے
وہ جب تک سامنے رہتے ہیں کس کو ہوش رہتا ہے

جمالِ یار چشمِ شوق سے روپوش رہتا ہے
مگر دل ہے کہ اس پر بھی خرابِ ہوش رہتا ہے

کوئی ان کو سمجھ بھی لے تو پھر سمجھا نہیں سکتا!
جو اس حد پر پہنچ جاتا ہے وہ خاموش رہتا ہے

مقامِ بے خودی قربِ حریمِ ناز ہے شاید!
اسی کو وہ نظر آتے ہیں جو بے ہوش رہتا ہے

اٹھا سکتی نہیں نظریں یقیناً بارِ نظارہ
کوئی تو مصلحت ہے وہ اگر روپوش رہتا ہے

مزاجِ رازداں ناآشنائے غم سے کیا کہئے!
کہ مرجاتا ہے دل لیکن نظر میں جوش رہتا ہے

جدا مسلک ہے دنیا سے جہانِ حسن و الفت کا
یہاں بے ہوش کہلاتا ہے جس کو ہوش رہتا ہے

نظر پابندِ رسمِ شوقِ نظارہ نہیں تو کیا!
تلاش اس کی ہے کیوں جو دل سے ہم آغوش رہتا ہے

ازل ہی سے ہے تحریکِ جنوں پر حسن آمادہ
کہ ہر گل فطرتاً کھولے ہوئے آغوش رہتا ہے

مقامِ عشق میں نخشبؔ کہاں یہ ظاہری باتیں
نہ میں بے ہوش رہتا ہوں نہ مجھ کو ہوش رہتا ہے

نخشب چارجوئی

افکارِ کاوش

دل اپنی خطا پر نادم ہے اب دل کو فغاں کا ہوش نہیں
ہاں، ہوش بقدرِ مستی ہے، بے وجہ تو میں خاموش نہیں

یہ مئے کے جھکولے ہیں ساقی یا جوش پہ ہے دریائے شفق
اس درد کی دنیا میں بتلا دہ کون ہے جو مئے نوش نہیں

جب تک وہ ستم پر مائل تھے تسکینِ طپش ہو جاتی تھی!
شاید وہ کرم پر مائل ہیں صہبائے سکوں میں جوش نہیں

میں اپنی تباہی کے ساماں ہر سانس فراہم کرتا ہوں
ناکامِ ازل ہے اے ہمدم وہ دل جو مصائب کوش نہیں

مرنا تو زمانے میں آساں ہے، راہِ وفا پھر بھی ہے کٹھن
جو سر کو وبالِ دوش کہیں، سر ان کو وبالِ دوش نہیں

پھر جراتِ نظارہ کر اے دل، گلشنِ ہستی فانی ہے!
لیکن جو ازل میں دیکھا تھا وہ جلوہ ابھی روپوش نہیں

ہستی سے عدم تک اے کاوشؔ کتنے ہی مقامِ خاص ملے
ہر جلوہ مگر افسانہ رہا اب مجھ کو کسی کا ہوش نہیں

کاوش

سماج

ضلع برنا پور کے چھوٹے سے قصبۂ اعظم گڑھ میں دو نیک طینت کسان کشور اور سیرت رہتے تھے۔ ان کی نیک مزاجی اور ہر دلعزیزی کا چاروں طرف چرچا تھا۔ حسن اتفاق سے ان کے دل ہی نہیں بلکہ کھیت بھی ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ اور ان دونوں کی باہمی محبت نے درمیانی دیوار کو گرا کر ان کھیتوں کو گویا ملا ہی دیا تھا۔

کئی برس گزرے، کئی برساتیں گزریں۔ ان کی زندگیوں میں بھی کئی انقلاب آئے اور بالآخر جوانی سے گزر کر انھوں نے پیری میں قدم رکھا۔ ان کے محبت بھرے دلوں میں جوش و ہمت کی بجائے پستی و آرام طلبی پیدا ہونی ایک فطری بات تھی۔ اس لئے اب وہ چاہنے لگے تھے کہ کھیتیاں اپنے بچوں کے حوالے کرکے باقی زندگی سکون سے گزاریں۔ بھگوان کی دیا سے ان کے بچے بھی اچھے اٹھے تھے، اس لئے انھوں نے اطمینان سے سب کام ان کے سپرد کر دیا۔

(۲)

بھدرا سیرت کی اکلوتی لڑکی تھی، اور رامو کشور کا اکلوتا لڑکا۔ رامو سویرے ہی اٹھ کر کھیتوں پر چلا جاتا۔ بھدرا کچھ دیر بعد رامو کے لئے کھانا لے کر کھیت پہنچی، اور رامو کے ساتھ جوتی ہوئی زمین پر بیج بوتی، اور دن بھر کام کرکے شام ہوتے رامو کو اپنی بنڈی میں بٹھا کے لے جاتی۔ ان دونوں کے اتحاد نے ترقی کرنی شروع کی۔ اور رفتہ رفتہ ان کی شرمیلی طبیعتوں میں وہ بھڑک بھی پیدا ہونے لگی جسے شاید محبت بھی کہتے ہیں۔

اتفاقاً ایک دن بھدرا نے رامو کا توشہ کھول کے دیکھ لیا۔ جواری کی روٹی اور سوکھی چٹنی تھی۔ جانے اس کو کیوں بہت رنج ہوا، اور اس دن سے اس نے روزانہ اپنا توشہ رامو کو پیش کرنا شروع کر دیا۔ رامو اس راز سے بے خبر، اچھے کھانوں سے خوش ہونے لگا، اور بھدرا کو بھی اپنے کھانے میں شریک کر لیا۔ غرض اسی طرح ہنسی خوشی ان کے دن گزرنے لگے، اور کئی خیالات ان کے ذہن میں پکنے لگے۔ لیکن یہ خود اس سے بے خبر تھے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔

(۳)

کئی دن بعد رامو حسب معمول کھیت پر آیا، کھیت کی نگرانی میں اس کے مختلف حصوں پر پہنچا۔ یکایک کسی کونے میں کپڑے کی چند پوٹلیاں ننھے ننھے پودوں کے نیچے چھپی ہوئی پائیں۔ کھول کر دیکھا۔ ان میں کیا تھا؟ وہی سوکھے ٹکڑے اور روکھی ترکاریاں، اسے معاً ایک خیال سا آیا اور اس کی آنکھیں حیرت و مسرت سے چمکنے لگیں۔ اور اس کے سانولے اور بھولے چہرے پر ایک نئی زندگی معلوم ہونے لگی۔ اس نے اسی مسرت میں نظر جو اٹھائی تو دور، کھیت کے ایک کونے سے بھدرا آرہی تھی۔ یہ بے اختیار سا اس کی طرف لپکا۔ پھر قریب پہنچ کر کچھ ٹھٹک سا گیا۔ نظریں اپنا کام کر رہی تھیں۔ اس نے آہستہ سے بھدرا کے بازو تھامے، اور بولا "بھدرا!"

دل کے جذبات کو سنانے میں زبان جتنی پیچھے ہوتی ہے، اتنی ہی آنکھیں سمجھنے میں آنکھیں اور دل آگے ہوتے ہیں۔ شاید بھدرا نے وہ سب سمجھ لیا تھا جو رامو کہنا چاہتا تھا، اس لئے وہ شرم و ہیبت سے ساکت تھی۔ اس نے رامو اور اس کے ہاتھ میں پوٹلیوں کو دیکھا تو یکدم نظریں جھکا لیں۔ رامو نے رکتے ہوئے پوچھا "بھدرا، یہ سب کیا ہے؟" بھدرا خاموش تھی۔ اس نے پھر پوچھا "بھدرا، تم نہیں بولو گی؟

کہ یہ کیا ہے؟"

اب بھدرا بولنے پر مجبور تھی۔ اس نے ترنم سے کہا "تمہیں نہیں معلوم؟"

"معلوم تو ہے، لیکن میں تمہاری زبان سے بھی سننا چاہتا ہوں بھدرا! ۔ کیا تم میری اتنی بنتی بھی نہیں سنو گی؟"

بھولی بھدرا کو حجاب نے عجیب کشمکش میں ڈال دیا تھا، لیکن حجاب سے زیادہ اس کے دل پر ایک عرصے سے راموکی شخصیت غالب ہو رہی تھی، اس لئے اس نے رکتے ہوئے راموکی طرف نظریں اٹھاتے ہوئے کہا "تم کیا سننا چاہتے ہو؟ یہی نا؟ کہ یہ دل کے ٹکڑے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں پھر یکدم جھک گئیں۔

راموکے دل و دماغ کی اس وقت جو کیفیت ہو گی اُسے کون بیان کر سکتا ہے۔ اس کو اپنی قسمت پر ناز ہو رہا تھا، مسرت اور ہیجان سے اس نے پھر پوچھا "تو پھر تم نے انھیں اس طرح چھپایا کیوں؟" بھدرا نے اس کی طرف ایک مسکراتی نظر سے دیکھا اور بولی "تو کیا دل کو بھی تمہاری طرح کوئی زبان پہ لئے پھرے گا؟" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ راموبولا "تم کتنے اونچے وچاروں کی عورت ہو بھدرا!"————

اس کے بعد سے ان میں جو ایک تکلف کا پردہ سا تھا وہ بھی اٹھ گیا۔ اور وہ بڑی خوشی سے اپنے اچھے مستقبل کے متعلق مختلف خیالات قائم کرنے لگے۔ کبھی وہ موجودہ مسرتوں میں کھو جاتے، اور کبھی انجام کے فکر میں متوحش بھی ہو جاتے، خصوصاً بھدرا کو، جانے کیوں اس کا زیادہ سوچ تھا۔ شاید وہ ہونی کی کرنی سے واقف تھی، جو ہو کے رہی————

(۴)

دن گزرتے جاتے تھے۔ ادھر یہ ان خوابوں میں تھے، اور ادھر ان کے ماں باپ الگ تیاریاں کر رہے تھے۔

ایک دن صبح ہی صبح کشور سیرت کے گھر میں داخل ہوئے۔ سیرت اشنان کی تیاری میں تھے، اور بھدرا ان کے لئے پانی سمو رہی تھی، کشور قریب ہی کی چوکی پر بیٹھ گئے، اور حقہ سنبھالا۔ بھدرا پانی کا گھڑا لے آئی۔ کشور کو جو دیکھا، گھڑا نیچے رکھا، اور نہایت ادب کے ساتھ قریب آ کر ان کے چرنوں کو دھول لی، اور چلی گئی، کشور بھدرا کی صورت و سیرت پر پہلے ہی سے ریجھے ہوئے تھے، اور اب تو ان کی دانست میں یہ کچھ اور بھی ہو چکی تھی، خوشی سے پھول گئے، دعائیں دیں اور سیرت سے بات چھیڑ ہی دی "بھیا، ایک مدت سے جو بات من میں چھپائے ہوں، جی چاہتا ہے کہ آج کہہ دوں، اگر تم کہو!"

"ہاں ہاں بھئی، ضرور کہو، وہ ایسی کیا بات ہے جو تم مجھ سے بھی اب تک چھپائے ہوئے تھے؟"

"بھدرا کتنی سندر اور گُن وتی لڑکی ہے، سوچتا تھا کہ اگر بھدرا اور راموکی جوڑی ہو سکتی تو کیسا تھا؟"

"ہاں ہو سکتی تو اچھا تھا، لیکن مجبوری ہے کہ نہیں ہو سکتی!"

"کیوں؟"

"بھیا، کیا تم نہیں جانتے کہ بچپن میں ہی مادھو کے پتا نے اس کی بات لگائی تھی، اور میں نے بھی کچھ رضامندی سی ظاہر کر دی تھی، پھر اب بات ٹالوں تو سماج میں میری کیا لاج رہ جائے گی؟"

"اجی چھوڑو سماج کی! ۔ اب رہی بچپن کی بات،

سو بچپن میں ہی گئی' اور اگر برا نہ مانو بھیا' تو ایک بات کہوں ؟ کیا ہم بچوں کے بارے میں بچپن ہی میں فیصلہ کرکے ان پر ظلم نہیں کرتے ؟ یہ تو ان کے جیون کا سودا ہے' ان ہی کی مرضی سے ہونا چاہئے' سماج اور ہماری مرضی سے نہیں ۔ بھدرا' رامو بچپن سے ایک ساتھ کھیلتے ہیں ۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں' اور میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے نزدیک بھی رامو میں کوئی برائی ہے ؟"

سیرت کسی قدر تیکھے ہوکر بولے "میرے نزدیک تو مادھو میں بھی کوئی برائی نہیں ۔ برا نہ ماننا' بھیا' اپنی لڑکی کا سبھی بھلا چاہتے ہیں ۔ مادھو سندر ہے' جوان ہے' اور پھر آج کل تو وہ زمیندار ہے !"

کشور پر گویا گھڑوں پانی پھر گیا ۔ انھیں آج معلوم ہوا کہ سیرت اور ان کی دوستی کا اصلی وزن کیا ہے ۔ وہ اپنے سوال پر نادم ہوکر بولے "بھیا' مجھے معاف کرنا' میں اپنی ہستی کو بھول گیا تھا' اور اس سے بڑھ کر یہ بھولا کہ بھدرا جیسی تمہاری لڑکی ہے ویسی ہی میری بھی ۔ مجھے زیبا نہیں کہ اسے زمیندار کے گھر سے بچھڑا کر اپنے جھونپڑے تک گھسیٹوں' اور روٹی' پانی کو ترساؤں ۔ اب تم اطمینان رکھو میں بھی تمہارے خیال کا ساجھی ہوں' اور کوشش کروں گا کہ میری بھدرا کا بیاہ اونچے گھرانے میں ہو' اور وہ سکھی رہ سکے ۔"

سیرت خوش ہوکر بولے "یہی تو بھیا' کیا میں تمہیں نہیں جانتا' اسی لئے تو صاف صاف کہہ دیا ۔ اس ڈھٹائی کے لئے تم مجھے معاف کرنا !"

"نہیں بھیا' تم نے ٹھیک ہی کیا کہ میری آنکھیں کھول دیں ۔ میں خود بھی ہمت نہ کرتا' پر خیال ہوا کہ ان دونوں میں ملاپ بڑھتا جارہا ہے' بلکہ مجھے تو ایسا کھٹکتا ہے کہ ــــ پریم بھی ہوگیا ہے' اس لئے ــــــ"

سیرت ترش ہوکر بولے "اس لئے آج سے بھدرا کھیت کو بھی نہ جاسکے گی !"

"ارے نہیں نہیں بھیا' ایسا نہ کرو ! بھگوان کی کرپا ہے ۔ دونوں بھی نیک ہیں' اور پھر بھدرا کچھ ایسی ویسی لڑکی نہیں ۔ یہ نہ جائے گی تو کھیتی کا سب کام خراب ہوجائے گا ۔"

"نام خراب ہونے سے تو کام خراب ہونا اچھا ہے بھیا' یہ اب نہ جانے پائے گی ۔" ــــــــ

(۵)

ادھر ان میں یہ باتیں ہورہی تھیں اور ادھر بھدرا دروازے کی آڑ میں کھڑی سب سن رہی تھی ۔ یہ لوگ ان کی خوشی کے خواب دیکھ رہے تھے' اور بھدرا کی آنکھوں میں بربادی ایک بھیانک بھوت بن کر سما رہی تھی' اور وہ عجیب عجیب خیالات اور فیصلوں میں کھو گئی تھی ۔

وہ بے تاب تھی کہ جلد سے جلد اس کی خبر رامو کو کردے اور اپنے غم کو اس کی شرکت سے کچھ ہلکا کرے' لیکن اب تو گھر اس کے لئے قید ہوگیا تھا' اور وہ باہر نہ جاسکتی تھی' اور گھر والوں کی خاص نگرانی تھی ۔

شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں' اور سب ہی خوش تھے لیکن بھدرا کچھ عجیب حال میں تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رنج سے زیادہ اس پر انتقام کا جذبہ غالب ہے ۔ چنانچہ جب کبھی اسے اس کا خیال آجاتا کہ وہ کسی کو اپنے مقابلے میں بڑھنے نہ دے گی' تو بے اختیار ایک مسکراہٹ سی اس کے لبوں پر کھیل جاتی ۔

شادی کو چند دن باقی رہ گئے تھے' گھر کے لوگ نیوتے میں گئے ہوئے تھے ۔ صرف بھدرا اور اس کی ماں گھر میں رہ گئی تھیں ۔ بھدرا نے بہ اصرار سہیلی کے گھر جانے کے بہانے سے اجازت لی اور سیدھی کھیت کی طرف چل پڑی ۔

رامو کئی دن سے اسے دیکھنے کے لئے بے تاب تھا اور اس سے بڑھ کر اسے تشویش تھی کہ بھدرا کیوں نہیں آرہی ہے ۔

بعض اوقات مختلف خیالوں کے ساتھ اس کے دل میں بھدرا کی بے وفائی کا بھی خیال آتا، لیکن پھر جب اسے اس کی مجبوریوں کا خیال آتا تو اپنے اس خیال پر نادم ہوتا، اور اپنی بدقسمتی پر رو پڑتا، کیونکہ اسے بھدرا کی شادی کے متعلق معلوم ہو چکا تھا۔ اب جو اسے دیکھا تو بے ساختہ گلے اور طعنے اس کی زبان سے نکل گئے۔ بھدرا اس کے آگے شرم و شرافت کی مورت بنی کھڑی تھی۔ رامو کو جو اس کا خیال آیا تو ایکدم اس کا لہجہ نرم ہو گیا، اور اس نے لجاجت سے کہا "بھدرا مجھے معاف کردو، میں نے تم پر زیادتی کی۔ تم سندری نہیں دیوی ہو، مجھے سب حال معلوم ہو چکا ہے۔ سچ ہے کہ میں تمہارے لایق نہیں، ایشور کرے تم سکھی رہ سکو! مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تمہارا بیاہ اونچے گھر میں ہو رہا ہے!"

بھدرا یہ سب سن کر خاموش تھی، اور وہ کچھ بول بھی نہ سکتی تھی۔ رامو خاموش ہو گیا اور پھر بھدرا کو خاموش دیکھ کر بولا "بھدرا، تم نہیں بولتیں؟ لیکن تمہاری خاموشی بھی میرے لئے امرت ہے۔ سنا ہے کہ شادی کی خوشی میں تمہارے پتا بہت سے غریبوں کو تمہارے ہاتھ سے دان دلوا رہے ہیں، بتاؤ ہمیں بھی کچھ دو گی؟"

بھدرا نے رامو کی طرف نظریں اٹھائیں اور پوچھا "کیا دوں؟"

"جو میں کہوں!"

"اچھا کہو!"

"بھدرا جب سے میں نے تمہاری شادی کے بارے میں سنا ہے، سچ مانو، مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تمہارا بیاہ بڑے گھرانے میں ہو رہا ہے، لیکن ایشور جانے، اس خوشی سے بڑھ کر مجھے یہ دکھ کیوں کھائے جاتا ہے کہ میں تمہارے لایق نہ ہو سکا، اور تمہیں نہ پا سکا۔ اس دکھ سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے وہاں جانا طے کرلیا ہے جہاں میری آتما کو شانتی مل سکے، اور کسی کے ظالم ہاتھ میری تمناؤں کا خون نہ کرسکیں۔ تم سے میری صرف اتنی بنتی ہے کہ جس طرح تم اب تک میرے اَن کو زمین میں چھپایا کرتی تھیں، اسی طرح اب میرے انگ کو بھی اپنے سندر اور پوتر ہاتھوں سے زمین میں چھپا دو، جیون میں تمہاری کوئی سیوا نہیں کرسکا، اور اب مر بھی رہا ہوں تو تمہیں سے دان لے رہا ہوں۔ کہو، تم میری خواہش پوری کرو گی؟"

بھدرا یکایک کچھ ایسی خوش تھی کہ گویا اسے زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا ہو۔ اس نے کہا "ہاں، پوری کروں گی، لیکن میری بھی ایک بنتی ہے، کہو، مانو گے؟"

"ہاں ضرور!"

"تو پھر تم مجھے بھی وہیں لے چلو، جہاں تم جانا چاہتے ہو!"

رامو کی جیسے آنکھیں کھل گئیں، کیونکہ اسے تو یہ باور کرایا گیا تھا کہ بھدرا بھی اس بیاہ سے راضی ہے، اس نے تعجب اور مسرت سے پوچھا "بھدرا، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی کہہ رہی ہوں جو تم کہہ رہے ہو!"

"لیکن بھدرا" اب تو تم دوسرے کی ہو چکی ہو، مجھے اس کا کیا حق ہے؟"

بھدرا نے جھٹ ایک پوٹلی کھولی، اس میں سے ایک خوبصورت پھولوں کا ہار نکالا، سیندور اور ٹیکہ لگالیا، اور مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر رامو کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتے ہوئے اس کے قدموں پر جھک گئی "کہو، اب تو حق ہو گیا تمہیں؟"

رامو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جانے یہ غم کے زیادہ تھے یا خوشی کے۔ اس نے فوراً نوجوانوں کی طرح تجویز پیش کردی "بھدرا میں کتنا بھاگوان ہوں۔ تو پھر ہم کہیں بھاگ کیوں نہ چلیں؟"

بھدرا نے سنجیدہ ہو کر کہا "تم جانتے ہو تمہاری بھدرا کتنے اونچے وچاروں کی عورت ہے؟ ایسی نیچی باتیں کرتے ہو! کیا تم نہیں جانتے کہ میں ایک بڑے گھر کی بیٹی ہوں، میرے باپ کو

کام سے زیادہ نام پیارا ہے؟ وہ میرا سکھ بھی چاہتے ہیں، ان کے
داماد زمیندار ہیں؟ پھر میں ایسا کس طرح کر سکتی ہوں؟ البتہ
ایسے باپوں اور ان کے بچوں کے لئے بلیدان دے سکتی ہوں
اور یہی میری سب سے بڑی کامنا ہے کہ میری موت مجھ جیسی
ابھاگن لڑکیوں کے لئے جیون سدھار کا کارن ہو، اور
یہی میری زندگی بھی ہے کہ آپ سے مر کر دوسروں کے لئے زندہ
رہوں، گو اس طرح مرنا ایک کمزوری ہے، لیکن اس طرح جینا
بھی تو میرے نزدیک اس سے بڑی کمزوری بلکہ پاپ ہے۔"

"اب میں سمجھا بھدرا، سچ مچ تم کوئی دیوی ہو، میں
تمہارا ضرور ساتھ دوں گا"______

سہاگ کا سامان ایک کشتی میں رکھا، اس پر
وہ پھولوں کا ہار چڑھایا اور دونوں ندی میں کود پڑے ____

(۶)

لوگوں کو خبر ہوئی کہ بھدرا اور رامو دونوں غائب
ہیں۔ سیرت خون کے گھونٹ پی رہے تھے کہ ان کی برسوں
کی پالی ہوئی آبرو اور نام جس کی خاطر وہ اپنا سب کچھ قربان
کرنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے، اب خود فنا ہو رہے ہیں۔ اس سے
بڑھ کر لوگوں کے طعنے اور ہمدردیاں انھیں زمین میں گاڑے دیتی
تھیں۔ کوئی کہتا "اچھا ہوا کہ سیرت کا غرّہ ٹوٹا" کوئی کہتا "نا بھئی
ایسی بیٹی ہونے سے تو اینٹ پتھر ہونا بھلا" کوئی کہتا کہ "میری بیٹی ہوتی
تو چیر پھینکتا" کوئی کہتا "میں تو پانی میں ڈوب مرتا" اور کوئی کہتا
"اسی لئے تو کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو آزادی دینی اچھی نہیں، ان پر
تو جتنا ظلم کیا جائے اتنی ہی وہ بھلی رہیں......" غرض جتنے منہ
اتنی باتیں۔ سیرت غم میں ڈوبے جاتے تھے، لیکن انھیں بیٹی کے جانے
کا اتنا غم نہیں تھا جتنا کہ اپنی عزت اور نیتی کے جانے کا۔ سب کی
نظروں میں بھدرا اور رامو انتہا درجہ مجرم اور گنہگار تھے۔ لیکن
بڑی تلاش کے بعد دوسرے تیسرے دن ہاتھ سے ہاتھ بندھی
ہوئی ان کی لاشیں ملیں۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا ___
غصے اور انتقام کی بجائے اب ہمدردی کا دور تھا، کئی لوگ
پرسے کے لئے آئے، اور سب کی زبان پر چرچے، دبے یہی تھا کہ
"کشور نے بڑا ظلم کیا جو ایسے ہونہار اور بھولے بچوں کی جان لی"
خود سیرت بھی اپنے کئے پر رہ رہ کے پچھتاتے اور سر پیٹ لیتے تھے
یہ سب سماج والے تھے۔

شاکر

خزانہ

مجھے افسوس ہے! بے حد افسوس!! مسٹر شاہد نے کہا
"لیکن مجھ کو اپنی لڑکی کی آسودگی کا لحاظ بھی تو کرنا ضروری ہے۔
تمہارا مستقبل بھی تو کچھ اچھا نہیں ـــــ میں آج تک یہ سمجھتا
رہا کہ تمہیں اپنے ماموں کی جائداد ملی ہے۔ اور یہ کہ اس کی وجہ
سے تمہارا مستقبل بہتر بن چکا ہے"۔

علیم تصویرِ حسرت بنے ہوئے مسٹر شاہد کا جواب سنتا رہا۔
اس کو پہلے ہی سے سوچ لینا چاہیئے تھا کہ وہ مقامی بنک کا ایک
معمولی سا ملازم ہے جس کی تنخواہ صرف ایک سو روپے ماہانہ ہے
بھلا مسٹر شاہد اس کی بات کیونکر مان لیتے۔ گو خود سلمیٰ
اس کو دل سے چاہتی تھی اور وہ خود بھی پہلی ملاقات کے
بعد سے ہی نہایت شفقت سے پیش آتے رہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے

"ماموں صاحب کے اور بھی ورثاء تھے" علیم نے کہا
"ان کی ہی مہربانی سے مجھ کو یہ ملازمت ملی" تھوڑی دیر تک
دونوں خاموش رہے۔ اس کے بعد مسٹر شاہد نے کہا۔

"علیم! مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ لیکن اس معاملے میں میں
مجبور ہوں ـــــ اور ہاں میں سمجھتا ہوں کہ اب تمہارا اور سلمیٰ
کا ملنا بھی ٹھیک نہیں"

"جی درست ہے" علیم نے کہا "لیکن اس وقت وہ دوسرے
کمرے میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ یہ ملاقات ہماری آخری ملاقات ہوگی"

سلمیٰ اپنے باپ کا فیصلہ سننے کے لئے بے چین تھی کہ علیم داخل ہوا۔
"کیا ہوا؟" سلمیٰ نے سوال کیا۔
"انکار" علیم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"مگر میں دوبارہ کوشش کروں تو؟! ـ کیا میرے آنسو بھی
سفارش نہ کر سکیں گے؟"
"کوئی فائدہ نہ ہوگا سلمیٰ! ـ کیا تم نہیں جانتیں کہ وہ ایک ضدی انسان ہیں"
"کیوں؟ ابا نے آخر کہا کیا؟"
"یہی کہ میں تم سے آخری بار مل لوں"
"کیا ان کا فیصلہ اٹل ہے؟"
"بالکل!"

سلمیٰ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی "اچھا یوں ہی سہی ہم خط لکھا کریں گے۔
ٹیلی فون پر بات چیت کریں گے ـ مگر ملاقات ـــ ہاں تمہارے
بنک میں ٹیلی فون تو ہے نا؟"
"ہے مگر!؟"
"بہتر ہے۔ میں روزانہ تم سے بات کروں گی"
"کاش میں کسی طرح اپنے آپ کو تمہارے قابل بنا سکتا
دولت کو مجھ سے بیر ہے .... میرے کسی کام میں فائدہ نہیں
ہوتا' انعامی مقابلوں میں ہمیشہ ناکامی ہوئی.... ایک ناول کو
تھیٹر کے قابل بنانے میں مہینوں محنت کرتا رہا لیکن اس کا بھی
کچھ نتیجہ نہ نکلا!"
"کونسا ناول؟"
"سفید گلاب!"
"کس کا لکھا ہوا ہے؟"
"ایک عورت نے لکھا ہے' تحسین نیازی اس کا نام ہے"
"کیا تم اس سے واقف تھے؟ کیا تم دونوں میں گہری دوستی تھی"
"نہیں نہیں میں اس سے بالکل ناواقف ہوں۔ آج تک ملا
بھی نہیں۔ اتفاقی طور پر کتاب خرید لی تھی۔ قصہ اچھا نظر آیا تھیٹر
کے لئے بہت موزوں تو تھا۔ لیکن ممکن ہے کہ میرا مسودہ بالکل
ناکارہ ہو مگر رنج اس کا ہے کہ اس کے پہونچنے کی مصنف نے اطلاع
تک نہ دی"۔

"اس کو ملا ہی نہ ہوگا"

"مسودہ بذریعہ رجسٹری روانہ کیا گیا تھا"

"پھر تو وہ عورت بدنیت ہے۔ لیکن مجھ کو اس سے خوشی ہوئی۔ حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ اگر تمہاری قسمت بدلنے میں کسی اور عورت کا ہاتھ ہوتا تو میں رشک سے دیوانی ہوجاتی"

دفتری گھس گھس کی وجہ سے انسان کی رومان پسندی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ یہی حال علیم کا ہوا "موصولہ، مجاریہ، اور کھتیاونی وغیرہ" کو رومان سے کیا واسطہ؟ ممکن تھا کہ علیم رومانی دنیا کی سرحد ہی سے گزر جاتا، اگر سلمیٰ اپنے وعدہ کے مطابق روزانہ ایک مرتبہ بلکہ بعض دن تو کئی مرتبہ ٹیلیفون نہ کرتی۔ ٹیلیفونی محبت کا راز بنک کے کارکنوں میں عام ہوچکا تھا۔ بلکہ منیجر نے تو ایک آدھ مرتبہ اشارتاً یہ بات ظاہر کردی تھی کہ بار بار ٹیلیفون پر بات کرنے سے بنک کے کاروبار میں ہرج ہوتا ہے۔

یوں تو یہ ٹیلیفونی گفتگو دلچسپ ہوتی، لیکن اس کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، مگر ایک صبح سلمیٰ کی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اہم خبر سنانے کے لئے بے قرار ہے

علیم! علیم!! کیا تم نے آج کا اخبار پڑھا؟" نہیں ——
اچھا سنو۔ میں پڑھتی ہوں۔ کیا تم سن رہے ہو۔ دلکشا تھیٹر کا شاندار افتتاح۔ افتتاحی پروگرام تحسین نیازی کے مقبول عام ناول سفید گلاب پر تیار کئے ہوئے ڈرامے سے ہوگا۔ جس کو خود مصنف نے ڈرامایا ہے۔ اچھا بتاؤ اب تم کیا کروگے؟"

"میں، میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"کیوں کیا تم نہیں جانتے کہ اس بدنیت عورت نے تمہارے ڈرامے کو ہضم کرلیا۔ وہ اتنے دن خاموش اسی لئے رہی کہ تم اس کو بھول جائیں ... کیوں یہ ہنسی کا کیا موقع ہے؟

"نہیں تو"

"نبھانے کی ضرورت نہیں۔ مگر یاد رکھو کہ اگر دوبارہ میرا مذاق اڑایا تو میں چلی جاؤں گی۔ تمہیں میری بات پر یقین نہیں آتا۔ اچھا تم خود دیکھ لینا۔"

"تحسین نیازی ایسی عورت نہیں"

"میرا خیال ہے کہ تم نے ایک مرتبہ تحسین نیازی سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا تھا"

"ہاں میں اس سے شخصی طور پر اب بھی ناواقف ہوں، لیکن اس کے ناول پڑھ چکا ہوں۔ اس کا ہر کردار دلوں میں گھر کر جاتا ہے۔ اس کا ہر بیان گھنٹوں آنسو بہانے کا پیام ہوتا ہے۔ ایسی عورت کبھی بدنیت نہیں ہوسکتی"

"تصانیف کے مصنف کو جانچنے کی توقع ایک بڑی توقع ہے۔ بہرحال تم کو وہ ڈراما دیکھنے جانا پڑے گا، اور اس کے بعد تم کو معلوم ہوجائے گا کہ کس کا خیال درست ہے۔ پھر ہنسی لو میں چلی!"

بنکوں کے کارکنوں کی خوش نصیبی سے ان کے افسراب یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ انھیں کاروبار کو ٹھیک طور پر انجام دینے کے لئے ہر سال چند دن آرام کے لئے بھی ملنا چاہئے، اسی لئے ہر بنک کو اب سالانہ دو ہفتوں کی مسلسل تعطیل ملتی ہے۔ اس مرتبہ تعطیلات شروع ہوتے ہی علیم اپنی عادت دیرینہ کے مطابق قریب کے ایک پرسکون گاؤں کو روانہ ہوگیا۔ اس گاؤں کے ایک مالدار زمیندار سے اس کی دوستی تھی۔ اسی لئے وہ اس کے ہاں مقیم ہوگیا۔ مکان میں زمیندار اور اس کی بوڑھی ماں رہتے تھے۔ سارے گاؤں میں یہ بات مشہور تھی کہ زمیندار کی ماں کو ہاتھ دیکھ کر ماضی و مستقبل کے حالات بتانے میں عدیم المثال قدرت حاصل تھی۔ یہ بھی مشہور تھا کہ وہ جو حکم لگاتی تھی وہ ہر صورت میں پورا ہو کر رہتا تھا۔

علیم نے سمجھ رکھا تھا کہ اس مکان میں مالکان مکان کے علاوہ کوئی اور مقیم نہیں۔ لیکن ایک خوشگوار صبح وہ اپنے سفری گراما فون کو چالو کیا ہی تھا کہ زمیندار داخل ہوا اور کہنے لگا۔

"معاف کیجئے علیم صاحب، میں آپ سے یہ بات کہنا بھول ہی گیا تھا کہ بازو کے کمرے میں ایک مصنف مقیم ہے، وہ کسی علمی کام میں مصروف ہے اور بالکل خاموش فضا چاہتا ہے"

اس کے ساتھ ہی بازو کے کمرے سے میز پر ہاتھ مارنے کی آواز بھی آئی۔

"اچھی بات ہے" علیم نے کہا "مگر وہ ہے کون؟"

"پروفیسر شریف اس کا نام ہے"

علیم کے اپنے خیال میں اس نام کا کوئی مصنف موجود نہ تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ مشہور آدمی ہو یا نہ ہو مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ اگر سکون چاہتا ہے تو چاہے لیکن میں نے اب تک اس کا نام بھی نہیں سنا۔

دن گزرتے گئے مصنف سے کبھی ملاقات کا موقع نہ آیا گو اس کے وجود کا ثبوت کبھی کبھی کمرے سے آنے والی آوازوں سے ملتا تھا۔ اور نہ اس دوران میں، علیم زمیندار کی ماں سے ہی ملا۔ اس کی تعطیلات ختم ہو رہی تھیں اور اس کے قیام کا آخری دن آپہونچا تھا کہ اس صبح ایک کم سن لڑکا علیم کے کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا ہے"

"زمیندار کی ماں تمہارا ہاتھ دیکھنا چاہتی ہے"

"وہ کہاں ہے"

"کھانے کے کمرے میں"

علیم اس لڑکے کے ساتھ ہو گیا۔ کھانے کے کمرے میں زمیندار اور اس کی ماں دونوں موجود تھے۔

"علیم صاحب ذرا ہاتھ تو دکھانا۔ میری ماں تمہاری قسمت بتلائے گی۔ ابھی ابھی اس نے پروفیسر شریف کا ہاتھ دیکھا ہے۔ اور وہ بات بتا چکی ہے جو اُن کی مرضی کے خلاف تھی۔ یعنی یہ کہ دو مہینے کے اندر اندر ان کی شادی ہو جائے گی"۔

"اگر مجھ سے بھی یہی کہا جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں"

بوڑھی عورت ہاتھ دیکھنے لگی۔ اور تھوڑی ہی دیر کے بعد کہنے لگی "اس ہاتھ میں تو ایک خزانہ ہے"

"ہاں ہاں، ماں کا کہنا ہمیشہ سچ ہوتا ہے"

"مگر میری آمدنی تو مختصر ہے"۔

اس کی ماں نے دوبارہ کہا "اس ہاتھ میں تو ایک خزانہ ہے خزانہ" اس کے بعد علیم ہنستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اپنے کمرے کو جاتے ہوئے اس نے آسمان کی طرف جو نظر اٹھائی تو سماں دیکھ کر بے اختیار گنگنانا شروع کیا تھا اور آخر میں تو باقاعدہ طور پر گانے لگ گیا۔

چمن کی سمت کر نظر سماں تو دیکھ بے خبر
وہ کالی کالی بدلیاں افق پہ ہوگئیں عیاں

اتنے میں کوئی چیز بھناتی ہوئی اس کے کان پر سے گزری اور دروازے کا شیشہ توڑ دیا، گھوم کر جو دیکھا تو علیم کے مقابل میں ایک موٹا سا آدمی کھڑا ہوا تھا جس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے غصہ سے کہا۔

"بکواس بند کرو"

علیم سکتہ کے عالم میں تھا کہ اس نے دوبارہ کہا۔

"یہ شور بند کرو" اور ساتھ ہی وہ دوبارہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔

علیم کو بھی غصہ آرہا تھا۔ ہر مصنف سکون کا خواہاں ہوتا ہے۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے، کہ ساری دنیا اس کے لئے خاموش ہو جائے۔ بہر حال وہ اس کا آخری دن تھا۔

علیم جس وقت اپنے کام پر واپس آگیا تو اسے معلوم ہوا کہ سلمیٰ شہر میں موجود نہیں۔ گو علیم اس سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ٹیلی فون پر گفتگو بہرحال ہو سکتی تھی۔ علیم اور بھی مایوس ہو گیا۔ اور وہ غیر معمولی طور پر سست ہوتا گیا۔ بنک کے کاروبار پر بھی اثر پڑنے لگا جس کی وجہ سے اس کو پہلی جگہ سے ہٹا کر صیغہ مجاریہ میں بھیجا گیا۔ وہاں بھی سست ہی رہا اور اکثر مرتبہ خطوط پر ٹکٹ چسپاں کرنا بھول جاتا تھا۔ ایک دن وہ کام پر آیا ہی تھا کہ ٹیلی فون پر اس کی طلبی ہوئی۔

سلمیٰ بات کر رہی تھی "علیم کیا تم "سفید گلاب" دیکھنے گئے تھے؟"

"نہیں تو"

"میں دیکھ چکی ہوں! خوب ہے! مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارا ہی تیار کردہ ڈراما ہے۔ آج رات تم کو جانا چاہئے ورنہ میں تم سے کبھی بات نہ کروں گی۔ نہیں۔ ٹیلی فون پر بھی نہیں"۔

"کیا مجھ کو جانا ہی پڑے گا"۔

"ہاں ضرور جانا ہوگا۔ اچھا لو میں ابھی تمہارے لئے ایک ٹکٹ خریدتی ہوں اور تمہاری جگہ محفوظ کروا دیتی ہوں۔ دیکھو اس سے تمہاری قسمت بدل سکتی ہے۔ ڈراما نہایت کامیاب ہے"

علیم اب بھی مایوس صورت بنائے اپنے کام پر واپس ہو رہا تھا کہ۔ منیجر کا چپراسی قریب آیا اور علیم کی طلبی کی اطلاع دی علیم نے فوراً منیجر کے کمرے کا رخ کیا۔

"کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں"

"آجاؤ"

کمرے میں ایک موٹا سا آدمی بھی موجود تھا۔ علیم فوراً پہچان گیا کہ یہ وہی مصنف ہے شریف۔ ہاں۔ اس دوران میں علیم کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ شریف یونیورسٹی کا پروفیسر نفسیات ہے شریف، منیجر سے مخاطب ہوا۔

"کیا یہی وہ بے وقوف ہے۔ صاحبزادے میں بیوقوفوں سے گفتگو کرنے کا زیادہ خواہش مند نہیں ہوں لیکن اس معاملے میں تمہارا جواب طلب کرنا ضروری ہے۔ تم نے میری بیوی کے نام اب تک گیارہ خطوط بغیر ٹکٹ چسپاں کئے روانہ کئے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری حماقتوں کی سزا دوسروں کو ملنی چاہئے؟"

"ہا ہا تو جناب شادی کر چکے ہیں، خوب تب تو زمیندار کی ماں نے درست کہا تھا"

منیجر اور شریف ایک منٹ تک خاموش رہے۔

"خوب یاد آیا تم وہی ہو۔ ہاں میں نے اس دن تمہارے ساتھ ناانصافی کی تھی"۔

"کوئی مضائقہ نہیں"

"بات یہ ہے کہ اس وقت میں ایک اہم منظر لکھ رہا تھا۔ خیالات کو اکٹھا کرنے کی لاکھ کوشش کرتا رہا۔ لیکن کچھ بن نہ پڑتا تھا کہ تم گانے لگے"۔

"جی ہاں میں قصوروار تھا"

"اچھا ہم پھر فرصت سے ملیں گے۔ یہ لو یہ میرے نام کا کارڈ ہے، اس پر میرا پتہ بھی درج ہے۔ آج شام کے کھانے پر ہی کیوں نہ آجاتے"

"میں مجبور ہوں جناب آج مجھ کو تھیٹر جانا ہے"

"کوئی بات نہیں تھیٹر سے واپس آجاؤ دیری کا خیال نہ کرو"

منیجر اس دوران میں حیران تھا۔ لیکن اب اس نے موقع پر قابو پا لیا تھا۔

"علیم صاحب آپ اب اپنے کام پر جا سکتے ہیں۔ ہاں آئندہ سے خطوط پر ٹکٹ ضرور چسپاں کرنا۔

"ہاں منیجر صاحب میں تو بھول ہی گیا۔ اس نوجوان کو اس عمر میں اس قدر غائب دماغ نہ ہونا چاہئے۔"

شام میں علیم تھیٹر پہونچا اور خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھا ہوا پردہ اٹھنے کا انتظار کرتا رہا۔ سارا ہال تماشائیوں سے بھرا پڑا تھا۔ نچلے درجوں سے بار بار چلانے اور سیٹیاں بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پان سگریٹ بیچنے والے لڑکے بھی پوری قوت سے چلا رہے تھے۔ اتنے میں پردہ اٹھا اور ڈراما شروع ہوا۔ علیم ایک بے تعلق تماشائی کی طرح بیٹھا رہا۔ منظر پر منظر بدلتا گیا لیکن وہ بدستور بے تعلق ہی رہا۔ یہاں تک کہ تیسرے پردے کا پہلا منظر شروع ہوا۔ علیم کو خوب یاد تھا کہ اس نے ناول کو ڈرامانے میں اس ہی منظر میں کچھ تغیر کیا تھا۔ وہ اسی چیز کو دیکھنے کا منتظر تھا۔ اس نے ایک نیا کردار اپنی جانب سے شریک کردیا تھا۔ اور اس کے لئے یہ ایک ہی طریقہ تھا جس سے ڈرامے کے اصل مولف کا پتہ چل سکتا تھا۔ منظر شروع ہوا ہی تھا کہ وہ اس کردار کے داخل ہونے اور وہ مخصوص مکالمے کا جس کو کہ خود اس نے شامل کیا تھا انتظار کرنے لگا۔ علیم کی حیرانی کی کوئی حد نہ تھی جب کہ وہ کردار مع مکالمہ اسٹیج پر بجنسہٖ موجود تھا۔ وہ سوچنے لگا "سلمیٰ کا خیال بالکل درست تھا "تحسین نیازی" حقیقتاً ایک بدنیت عورت ہے۔ وہ بار بار اسی فقرے کو دہرا رہا تھا۔ اور بے چینی سے ڈرامے کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈرامے کے اختتام پر اس نے اپنے میزبان پروفیسر شریف کے ہاں جانے کے لئے ایک وکٹوریہ کرایہ پر لی۔

مسٹر شریف اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کہنے لگے۔

"اف تم نے بڑی دیر کی، بے انتہا دیر کی۔ میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ تم اپنی عادت کے مطابق سب کچھ بھول چکے۔ خیر چلو کھانا تو کھالیں۔"

علیم اب بھی اپنی دماغی الجھن میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس کو کیا کرنا چاہئے۔ اس دوران میں ملازم نے میز تیار ہونے کی اطلاع دی اور دونوں میز پر پہونچ گئے کھانا کھاتے ہوئے علیم یہ سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہئے اور کیا نہ کرنا چاہئے۔ اتنے میں اس کو خیال آیا کہ کیوں نہ اس معاملے میں شریف سے تبادلہ خیال کرلوں۔ اتنے میں ملازم نے ریڈیو چالو کردیا۔

"پروفیسر صاحب آپ تجربہ کار آدمی ہیں۔ اب بتائیے ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں۔ میں آج تھیٹر گیا اور میں کیا دیکھتا ہوں کہ"

"اہا کتنا اچھا گیت ہے۔ کیوں علیم صاحب آپ کو موسیقی کا بھی کچھ ذوق ہے"؟

علیم اس بے موقع جواب سے مایوس ضرور ہوا لیکن سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں کیا دیکھتا ہوں کہ اس ڈرامے کو خود میں نے ہی لکھا ہے"

"کیا مطلب"؟

"یعنی یہ کہ میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ میرا ہی تیار کردہ ڈراما ہے"

"کونسا ڈراما"

"سفید گلاب" اور اس نے محسوس کیا کہ پروفیسر اب اس کی بات کو دھیان دے کر سن رہا ہے۔ اس نے اپنی گفتگو کو زیادہ تفصیلی طور پر جاری رکھا۔ اور تمام تفصیلات سنا ڈالیں۔ ناول کا پڑھنا، ڈرامائی صورت میں تیار کرنا، پھر سلمیٰ کی محبت اپنی ناداری کا دکھڑا۔ غرض ہر چیز، اور پروفیسر نہایت ہی خاموشی سے ان تفصیلات کو بغور سنتا رہا۔ اور اختتام تک کوئی اعتراض نہ کیا۔

لیکن آخر میں اس نے کہا۔

"لیکن تم کو یہ کیسے معلوم کہ یہ ڈراما تمہارا ہی تیار کردہ ہے"

علیم نے تیسرے پردہ کے اس کردار کا حال کہا جو بالکلیہ اسی کے تخیل کا مرہون منت تھا۔

"تم اپنے مسودہ کی نقل بھی گم کرچکے ہو"

"ہاں میں اس کو نذرِ آتش کرچکا ہوں"

پروفیسر شریف نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم جیسے انسان سے ایسی ہی توقع ہوسکتی ہے۔ صاحبزادے میں تمہارے بیان میں صداقت کی بُو پاتا ہوں لیکن یہ یاد رکھو کہ تمہارے ہاں کوئی ثبوت موجود نہیں۔ تم کسی عدالت میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ مگر ہاں میں تو تم میں اس کام کی قابلیت نہیں پاتا۔

علیم نے بھی طنزیہ لہجے میں پروفیسر کا شکریہ ادا کیا۔

"ہاں اگر تم میرے ایک سوال کا جواب دے سکو تو میں تمہاری بات مان لوں گا۔"

"جی آپ تو مان لیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا "تحسین نیازی" بھی مان لے گی۔"

"تحسین نیازی؟ میں ہی تحسین نیازی ہوں"۔

"آپ؟ آپ تحسین نیازی ہیں"۔

"ہاں ہاں پریشان ہونے کی کون بات ہے۔ یہ میرا قلمی نام ہے۔ یہ راز صرف میں اور میرا پبلشر جانتے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ تم سے بھی نہ کہوں۔ لیکن اب مجبور تھا۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں"۔

"جی لیکن ــــــــ"

"ہاں ہاں میری بات مانو میں ہی تحسین نیازی ہوں۔ اچھا سنو تمہارا مسودہ مجھ کو جس وقت ملا میں ساحل کے کنارے مقیم تھا۔ مسودہ پر تمہارا نام نہ تھا۔ یہی ایک چیز ہے جس کی وجہ میں تمہاری بات یقین کرنے پر آمادہ ہوں۔ بھلا تمہارے سوا کوئی شخص مسودے پر بغیر نام لکھے بھی بھیج سکتا ہے"۔

"میں نے اس کے ساتھ ایک خط بھی تو ملفوف کیا تھا"

"ہاں خط بھی تھا۔ میں نے خط کھولا تھا اور صرف تمہارا پتہ اور "عزیز خاتون" کی حد تک پڑھا تھا کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اس خط کو میرے ہاتھ سے اڑا کر سمندر میں جا پھینکا۔ البتہ تمہارا پیشہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ہاں تو"

"جی وہ پیشہ میں اب بھی بتا سکتا ہوں۔ مجھ کو شہر میں آئے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے اور میں "پُرفضا ہوٹل" میں تھا۔

ٹھیک ٹھیک!! پُرفضا ہوٹل"

علیم کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"پھر تو آپ کو میری بات ماننا ہی چاہئے"

"ہاں ہاں مجھے یقین ہوچکا ہے۔ مگر سفید گلاب تو اس شہر میں کامیاب نہ ہوسکا"

"جی کامیاب نہ ہوسکا! کیوں میں نے ابھی تو سارے ہال کو کھچا کھچ بھرا دیکھ آیا ہوں" "ٹھیک ہے لیکن اکثر تماشائیوں نے مفت کے ٹکٹ حاصل کئے تھے۔ مجھ کو یقین تھا یہ ڈراما اس شہر کی پبلک کے لئے موزوں نہ ہوگا"

علیم کو دوبارہ مایوسی سے دوچار ہونا پڑا تھا اسی کوفت میں وہ گھر جانے کے لئے کھڑا ہوگیا اور سیڑھیوں پر سے اتر رہا تھا کہ اس کو یہ بات یاد آئی کہ اس نے میزبان کا شکریہ ادا کرنا بھول گیا ہے۔ اس لئے اس نے میزبان کی طرف پلٹ کر کہا۔ "پروفیسر صاحب میں آپ کا ممنون ہوں۔ آپ نے خواہ مخواہ تکلف سے کام لیا" "کوئی بات نہیں۔ ہاں مسٹر علیم آپ کو مایوسی ہوئی نا۔ ڈرامے کی کامیابی کے متعلق" "جی کچھ مضائقہ کی بات نہیں" پروفیسر شریف کمرے میں جاتے ہوئے رک گئے اور پھر علیم کی طرف پلٹ کر انھوں نے کہا "ہاں میں تم سے یہ کہنا بھول گیا کہ یہ ڈراما دوسرے بڑے شہروں میں نہایت کامیاب رہا اور مہینوں تک اسٹیج ہوتا رہا مہینوں۔ کیا تم کل مجھ سے مل سکتے ہو۔ اس وقت مجھے اعداد یاد نہیں لیکن یقین مانو تم کو ایک خزانہ ملے گا ایک خزانہ"

(ماخوذ)

غلام جیلانی

حسن و عشق

نگاہِ حسن نے تو دور کر دیا ہے نقاب — زبانِ عشق پہ لیکن ہے اب بھی ایک حجاب

مزاجِ حسن نزاکت سرشت ہے لیکن! — مزاجِ عشق ہے محتاط اور عقل مآب

خوشامدیں ہیں نگاہوں میں حسن کی لیکن! — جواں نگاہوں کو پہچان لیں وہ ہیں کم یاب

وہاں یہ حال کہ محتاجِ عشق ہے ہر حسن — اور عاشقوں کی طلب میں ہے مضطر و بے تاب

مگر یہاں جو نہیں عشق کی نظر میں وقار! — تو سمجھے حسن کو بس اک یہی ہے عالی جناب

مسائلِ نظر و غمزہ وہ سمجھ نہ سکے!! — چمک سے حسن کی جو ہو چکے ہیں خانہ خراب

شراب بس کی نہیں ہے اگر ہر اک پی لے! — شراب اس کی ہے جو خود ہو راز دارِ شراب

اسی طرح سے ہر عاشق کو چاہئے ہے مزاج — مزاج بھی وہ معزز کہ ہو نہ اس کا جواب

یہی وہ دولتِ رنگیں ملی ازل سے مجھے — کہ جس کا تابع فرماں ہے غمزۂ شاداب

مرے وقارِ محبت پہ ہے نثار و فدا! — غرورِ شوکتِ خورشید و طلعتِ مہتاب

مری نظر سے سنورتا ہے غمزۂ روشن! — نہیں تو کانٹوں میں رہتا ہے جوشِ حسنِ گلاب

غلط نہیں ہے کہ پریوں کو عشق ہے مجھ سے — یہ اس لئے ہے کہ خود دار تر ہے میرا خطاب

مرا ہی نغمۂ رنگیں ہے ان کا حسن ادا — مرا ہی حسنِ بیاں ان کا ہے نقیبِ شباب

طلب میں بھی میں وقارِ طلب نہیں کھوتا — سجی ہوئی ہے اسی سے مری غزل کی کتاب۔

ہے اس کا غمزہ اگر غمزۂ غزل افروز
تو میرا عشق سکھاتا ہے غمزے کو آداب

ملا رموزی

ماں

شہر سے دور ایک تنگ و تاریک جھونپڑی میں پڑی ہوئی وہ موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا تھی۔ طاق میں ایک مٹی کے تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ مگر اس طرح جیسے وہ بھی اس کی تکلیف سے متاثر ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لینا چاہتا ہے۔ جھونپڑی کی خاموشی اور پرسکوت فضا میں بڑھیا کی دلدوز کراہیں گونج پیدا کر کے بھوتوں کے قہقہے کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ بڑھیا ایک خود دار اور سرفروش نوجوان پکھراج کی ماں تھی۔

شوہر کے مرنے کے بعد اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنا خون پلا پلا کر پرورش کیا تھا۔ دنیا کی کوئی مشقت ایسی نہ تھی، جو اس نے نہ کی ہو اور نہ ایسی مصیبت جو اس نے پکھراج کی پرورش کے سلسلے میں نہ جھیلی ہو۔ جاڑوں میں صبح ۵ بجے جب کہ کسی کو باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے محلے میں اہیر گھاس کا گٹھا سر پر رکھ کر مویشیوں کے اصطبل میں لے جاتی۔ اور ان کے آگے گھاس ڈالتی، گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہر میں وہ اونچے اونچے فلک بوس محلوں کی تعمیر کے لئے مٹی اور چونے میں لت پت نظر آتی۔ اور بارش کے زمانے میں جب کہ چاروں طرف سے بادل گھر گھر کر آتے وہ اپنے پکھراج کو گھر میں اکیلا کھیلتا چھوڑ کر مزدوری کرنے چلی جاتی تھی۔ اتنی محنت و مشقت کے باوجود کبھی فاقہ کی مصیبت تو اس سے مانوس ہی ہو گئی تھی۔ جس روز اس کو کام نہ ملتا یا بیمار ہو جاتی وہ اپنے بیٹے کو پتہ بھی نہ ہونے دیتی کہ آج اس کی ماں بھوکی ہے۔ اور وہ اس کو کھلا پلا کر سرِ شام ہی سلا دیتی تھی۔ دنیا میں اس سے کسی کو ہمدردی نہیں تھی۔ اور نہ وہ سوائے پکھراج کے کسی سے خوشگوار امیدیں قائم کئے ہوئے تھی۔ اس کو صرف اپنی محنت اور طاقت پر بھروسہ تھا اور اس کو یقین تھا کہ اس کا بیٹا جوان ہو کر اس کی تمام محنت کا معاوضہ ادا کر دے گا اور وہ دن کس قدر نشاط آگیں ہوں گے کہ جب اس کا بیٹا کمائی کر کے گھر میں داخل ہوا کرے گا اور جب وہ اپنی تنخواہ اس کے ہاتھ میں دے گا تو وہ فرط مسرت سے بے خود ہو کر اس کی بلائیں لے لیا کرے گی۔ بعض مرتبہ ان ہی تصورات میں کھوئی ہوئی وہ جوش میں آ کر پکھراج کو سینے سے لگا لیتی اور اس کا منہ چوم کر کہتی

"میرا لال! —— میرا راجہ —— بیٹا!!"

دن، ہفتے، مہینے، سال گزرتے گئے۔ اور رفتہ رفتہ اس کو اپنی تمام امیدیں اور آرزوئیں جو اس نے پکھراج سے قائم کر رکھی تھیں، پوری ہوتی معلوم ہونے لگیں۔ پکھراج تیزی کے ساتھ جوانی کی منزل کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اس کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی۔ اس کی مردانہ تمکنت اور خوبصورت چہرہ دیکھ کر وہ اپنی آنکھیں جھکا لیتی کہ کہیں پکھراج کو اس کی نظر نہ لگ جائے۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے پکھراج کی عقل و فہم میں بھی ترقی ہوتی جا رہی تھی۔ اور اب وہ بھی سمجھنے لگا تھا کہ ماں مجھے آرام دینے کے لئے خود تکلیفیں سہ لیتی ہے مگر اپنی مصیبتوں کا اظہار نہیں کرتی۔ ایک روز بہت رات گئے جب وہ مزدوری کر کے گھر آئی تو پکھراج نے اس سے کہا

"ماں! اب تم مزدوری کرنے نہ جایا کرو۔"

بیٹے کے منہ سے یہ الفاظ سن کر وہ خوشی سے کھل گئی۔ اور اس نے پیار سے اس کے گال تھپکتے ہوئے کہا۔

"میرے لال! اب اس کو چھوڑنا ہی سمجھو"

اس وقت اس کا یہ جواب سن کر بکھراج خاموش ہوگیا۔ مگر چند روز کے بعد اس نے اس کو بتایا کہ وہ ایک مِل میں سوت کے گٹھے اٹھانے پر ملازم ہوگیا ہے اور صبح سے اپنے کام پر جائے گا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ بکھراج اس کی تکلیفوں کا اس قدر احساس کرے گا اور ان کو ختم کرنے کی تدبیر بھی خود ہی سوچ لے گا۔ اچانک یہ خبر سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ اس کو گلے لگا کر بہت دیر تک روتی رہی۔

اور اب اس کا تمام دن بجائے مٹی اور پتھر ڈھونے کے اپنے بیٹے کے آرام اور راحت کی تدبیریں سوچنے میں صرف ہونے لگا۔ شام کو جب بکھراج مِل سے واپس ہوتا اور دونوں ماں بیٹے کھانا کھا رہے ہوتے تو بکھراج اس کو دن بھر کے واقعات سناتا۔ سانچوں کا حال، ان کی ترتیب، پھر وہ اپنی محنت کا قصہ سناتا کہ آج اس نے کتنے بڑے بڑے گٹھے ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل کر دیئے۔ مگر اس کو ان باتوں سے دلچسپی نہیں تھی اور وہ یہ سن کر تو کانپ جاتی تھی کہ بکھراج کو اس قدر وزنی گٹھے اٹھانا ہوتا ہے۔ ہاں یہ سن کر وہ ضرور خوش ہوتی کہ مِل کے تمام افسر بکھراج کے اس محنت سے کام کرنے کی تعریف کرتے ہیں۔

کچھ روز کے بعد جب بکھراج کو مِل کے کاموں سے اچھی طرح واقفیت ہوگئی اور سب لوگ اس کو جاننے لگے تو اس نے گٹھے اٹھانا چھوڑ کر سانچہ چلانا سیکھ لیا۔ آمدنی کم ہونے کی وجہ سے پہلے گھر کا خرچ اٹھانے میں جو اس کو تکلیف ہوتی تھی، وہ بھی اب دور ہوگئی اور ایک سال کے بعد تو وہ خیال کرنے لگی کہ اب گھر کی لکشمی کو لے آنا چاہئے۔

بڑھیا نے ایک کراہٹ کے ساتھ کروٹ بدلی۔ چراغ ہوا کے جھونکے سے جھلملایا۔ مگر پھر تاریکی اور ہوا کے تند و سخت جھونکوں کا مقابلہ کرنے لگا۔ مگر اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کی بہار کو لٹا دیا۔ بکھراج کی منگنی کے بعد جب کہ وہ چند دنوں میں اپنی بہو کو لانے والی تھی اچانک ایک انقلاب آیا۔ ایسا سخت! ۔ جس نے اس کی زندگی کے اوراق پھر پیچھے پلٹ دیئے۔

مِل میں مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ کیونکہ وہ کم تنخواہ پر کام کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر مِل کے ارباب اقتدار اسی بات پر مُصر تھے کہ وہ اسی تنخواہ پر کام کریں۔ مِل کی حفاظت کے لئے پولیس آگئی اور "مِل ایریا" میں قانون نافذ کر دیا گیا۔

تمام مزدور اپنی تجویز پر متفق تھے۔ اور بکھراج بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔ وہ روز ماں سے جلسوں کی کارروائیاں بیان کرتا اور ان کے جوش و استقلال کی داستانیں سناتا۔ وہ بہت غور سے ان واقعات کو سنتی اور پھر اس سے کہتی۔

"دیکھو بیٹا سمجھ بوجھ کر کام کرو، اگر مزدوروں کا مطالبہ جائز نہیں ہے تو تم ان سے علحدہ ہو جاؤ"

یہ سن کر وہ جواب دیتا۔ "نہیں ماں! میں نے خوب سوچ لیا ہے اور میں ان کے ساتھ ہی رہوں گا"

مزدوروں کا خیال تھا کہ بہت جلد مِل کے مالکوں سے سمجھوتہ ہو جائے گا اور وہ ہمارا مطالبہ منظور کرلیں گے۔ مگر ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور دو ہفتے گزرنے کے بعد بھی ہنوز روز اول ہی رہا۔ اور روز بروز الجھن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ایک روز بکھراج شام کو اس کے پاس آیا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آج مل کے مالک نے کہا ہے کہ مزدوروں میں جو اپنی تجویز واپس لے کر ان کا ساتھ دے گا انعام بھی دیا جائے گا۔

"پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟"

"میں نے چند ساتھیوں کو تیار کیا ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔"

شائع ہو چکے ہیں۔

"ہیں!" وہ چونک پڑی اس کا بیٹا اور مزدوروں کا ساتھ چھوڑ کر روپے کے لالچ میں ان کا ساتھ دے گا، جنھیں ان سے ہمدردی نہیں تھی۔ وہ ان کا ساتھ دے گا، جو اُن کے خون کا آخری قطرہ تک پھوڑنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اس کا بیٹا ان کے لالچ میں آرہا ہے جو مزدوروں کی کمائی کو اپنی تجوریوں میں بھر کر ان کو فاقوں کی موت مرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کا پیارا بیٹا جس نے محنت اور مزدوری کے پیسے سے پرورش پائی ہے، جس کو مفلسی نے پروان چڑھایا ہے اور جو ایک غریب مزدورنی کا دودھ پی کر جوان ہوا ہے، آج مزدوروں کے ساتھ غداری کرے گا، جو افلاس و نکبت سے تنگ آکر اپنی تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کر رہے ہیں!

وہ جوش میں آکر نہ معلوم کیا کیا کہہ گئی۔ اپنے اس بیٹے سے جس کو معمولی دکھ پہونچانا بھی وہ اپنی زندگی کی موت سمجھتی تھی، آج اسی کے نازک دل میں اس نے اپنی باتوں سے سیکڑوں نشتر چبھو دئیے۔ جسے آج تک اس نے زمانے کی خراشوں سے بچائے رکھا تھا۔ یہ صرف اس لئے کہ وہ اپنے بیٹے کی طرح مزدوروں کو انسان سمجھتی تھی۔ اس نے خود بھی محنت و مشقت کی تھی اور وہ ان کے مصائب و آلام کا احساس بھی کر سکتی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پکھراج نے اپنی ماں کو اپنے اوپر غصہ کرتے ہوئے دیکھا۔ پہلے تو وہ گھبرایا مگر جب اس نے اس کو غیرت دلائی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپالیا۔ مگر اس کی ماں پھر بھی چپ نہیں ہوئی اور اب اس کو محسوس ہوا کہ اگر اس کی ماں جلد خاموش نہیں ہوئی تو وہ پورا زمین میں دھنس جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور کہا۔

"ماں ایشور کے لئے معاف کرو۔ میں مزدوروں کے ساتھ ہی رہوں گا۔" وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے باہر چلا گیا۔

اس روز پکھراج رات بھر گھر نہ آیا۔ اپنا غصہ سرد ہونے کے بعد وہ بہت پریشان ہوئی اور دوسرے روز دوپہر تک انتظار کرتے کرتے جب وہ گھبرا گئی تو اچانک ایک مزدور نے آکر اس سے کہا۔

"مزدوروں کے مجمع پر لاٹھی چارج ہونے کی وجہ سے پکھراج سخت مجروح ہو گیا ہے۔" یکایک یہ خبر سن کر اس کے دل پر ایک دھکا لگا۔ اور وہ پریشان و مضطرب گھبرائی ہوئی ہسپتال پہونچی جہاں پکھراج بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کے چند ساتھی اور بھی تھے مگر ان کے اس قدر شدید چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ ایک مزدور نے اسے بتایا کہ پکھراج ایک کمسن بچے کو بچانے کے سلسلے میں اس قدر مجروح ہوا ہے جو مزدوروں کے مجمع میں پھنس گیا تھا۔ وہ شام تک اس کے پاس اسی خیال سے بیٹھی رہی کہ شاید پکھراج ہوش میں آکر اس سے باتیں کرے۔ مگر بے چاری پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جب رات کو نو بجے کے بعد اس نے سنا کہ پکھراج کی یہ عارضی غفلت دائمی بے ہوشی میں تبدیل ہو چکی ہے، اور ڈاکٹر نے یہ اجازت دیدی کہ وہ اس کی لاش کو گھر لے جا سکتی ہے۔ پکھراج کی موت کے کچھ روز بعد تک تو اس کو سوائے رونے دھونے کے اور کوئی کام نہیں رہا تھا۔ مگر کہاں تک؟ رفتہ رفتہ پھر وہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئی۔ دن بھر وہ

ساتھ باجا اور عرب وغیرہ بھی ہوتے ہیں اور بعض میں صرف موٹروں کا جلوس ہوتا ہے۔"

عقد کا وقت آج کل عقد صبح نو دس بجے اور شام میں ۵ بجے ہوتا ہے، لیکن پہلے ایسا نہیں تھا صرف بیوہ کا عقد ثانی ہو تو سہ پہر یا شام میں ہوتا تھا، ورنہ عقد عموماً صبح سویرے طلوع آفتاب کے ساتھ ہی ہوتا تھا، دولھا مکان سے نکل کر راستے میں کسی مسجد میں صبح کی نماز ادا کرکے دلہن کے گھر جاتا اور طلوع آفتاب یا زیادہ سے زیادہ آٹھ نو بجے تک عقد ہو جاتا تھا۔

کھانے کا طریقہ نکاح کے بعد عموماً کھانا کھلانا شروع کردیا جاتا، دوسرے تیسرے روز ولیمہ کی دعوت ہوتی اور اس کا وقت بعد مغرب ہوتا تھا۔ کھانے کا طریقہ اول تو یہ رہا کہ ایک طویل دسترخوان پر ہر شخص کے لئے علٰحدہ علٰحدہ لوازم چُنا جاتا، اس کے بعد اس میں یہ اصلاح ہوئی کہ بجائے ایک ایک شخص کے چار چار آدمیوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ لوازم چنا جانے لگا، موجودہ زمانہ میں اس میں زیادہ ترمیم نہیں ہوئی ہے، صرف یہ ہوا ہے کہ آٹھ آٹھ آدمیوں کا علٰحدہ علٰحدہ دسترخوان چنا جاتا ہے، اور پھر یہ دسترخوان زیادہ تر بجائے فرش پر ہونے کے ایک اونچی چوکی پر چنا جانے لگا ہے اور فرش پر بیٹھ کر کھایا جاتا ہے۔ ولیمہ کی دعوت کا طریقہ اب بہت شاذ ہو گیا ہے۔

ایٹ ہوم شادی کے موقع پر بجائے کھانے کے ایٹ ہوم کا طریقہ پہلے پہل نواب افسرالملک کے خاندان میں ہوا، جس کو آج تقریباً چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے، اس کے بعد ایک عرصۂ دراز تک اس کا رواج نہیں ہوا، مگر اب گزشتہ دس بارہ سال کے عرصے سے اس کا رواج عام ہوتا جارہا ہے، اکثر شادیوں کی تقریب میں عقد کے دن بجائے کھانے کے ایٹ ہوم ہونے لگا ہے، بعض جگہ کھانا اور ایٹ ہوم دونوں ہوتے ہیں۔ چونکہ ایٹ ہوم میں زیادہ انتظام صاحب خانہ کے سر نہیں ہوتا، اور یہ سہولت ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو کھانے پر ترجیح دی جاتی ہے، ورنہ کوئی رقمی کفایت نہیں ہوتی۔

تقسیم پان وان آج کل پان کے بیڑے یا چکنی، الائچی اور سگریٹ وغیرہ مہمانوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ مگر پہلے پان کے پورے لوازمات ایک پاندان رکھ کر تقسیم کرتے تھے، ٹین کا خوش نما آئینہ دار پاندان ہوتا اور اس میں سپاری، الائچی، جائپھل، لونگ، کھنہ وغیرہ بیس پچیس پانوں کے ساتھ ہر ایک مہمان کی خدمت میں خواہ مرد ہو یا عورت پیش کیا جاتا تھا، اس کے بعد بجائے پاندان کے مختلف وضع اور مختلف سائز کی ڈبیاں تقسیم ہونے لگیں۔ ان میں صرف چکنی اور الائچی ہوتی تھی، اس قسم کی ڈبیاں جرمنی سے آتی تھیں اور اکثر پر "جرمنی کی بناوٹ" اردو میں لکھا ہوتا تھا۔

موسیقی آج سے نصف صدی قبل کوئی رسم یا شادی بغیر موسیقی کے نہیں ہوتی تھی۔ زنانہ میں مراثیوں اور مردانہ میں طوائفین کا گانا ضرور ہوتا تھا، فی صد دس پندرہ گھر ایسے ہوتے تھے جہاں طوائف کا گانا نہیں ہوتا تھا، عورتیں طوائف کا گانا نہیں سنتی تھیں اور اس کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اب فی صد پچاس بلکہ اس سے کم گھر ایسے ہوں گے جہاں طوائف کا گانا ہوتا ہے، بہرحال اب موسیقی کے رواج کی بہت کمی ہوگئی ہے، جہاں طوائف کا گانا ہوتا ہے وہاں کی عورتیں پس پردہ ان کا گانا سنتی ہیں، اب اس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

پہلے زمانہ میں طوائفین کے ساتھ بھانڈ بھی نقل کرتے تھے، اب یہ کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ غرض سب باتیں اب افسانہ ہوگئی ہیں۔ تقاریب کے جو رسومات ہوتے تھے ان میں سے بھی اب بہت کچھ متروک ہوگئے ہیں۔ پرانی معاشرت اور تہذیب رفتہ کی باتیں جب تک محفوظ نہ ہوں، ان سے ہماری نئی نسل واقف نہیں ہوسکتی، اپنی پرانی تہذیب اور معاشرت سے واقف رہنا نہایت ضروری ہے، ورنہ دوسروں کو اس امر کا موقع ملتا ہے کہ وہ ہماری معاشرت اور تہذیب پر نکتہ چینی، اور ہمارے تمدن اور کلچر پر حرف گیری کریں اور اس کو دوسروں کی تقلید قرار دیں۔

نصیرالدین ہاشمی

طاقت

چمن کے ایک گوشے میں ایک کہنہ سال چیل اپنی حاصل کردہ غذا کھانے میں مصروف تھی ـــــ اور چمن کے بھوکے کوّے اس منظر "خور و نوش" کو حسرت تیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ـــــ

آخر کار ایک چالاک کوّے نے ڈرتے ڈرتے چیل کے قریب جاکر خوشامدانہ سلام کرتے ہوئے کہا ـــــ چیل نانی اچھی رہیں! بہت دنوں میں ادھر آنا ہوا ـــــ آپ کو یہاں ہم سب بہت یاد کرتے تھے اور آپ کی سلامتی و زندگی کی دعا مانگا کرتے تھے۔ خدا کا شکر کہ آج آپ کا دیدار نصیب ہوا ـــــ!!

چیل نے کوّے کی باتوں پر مطلق اعتنا نہ کی ـــــ اور اپنی غذا کھانے میں مصروف رہی ـــــ وہ جانتی تھی کہ کمزور ایسی ہی باتیں بنایا کرتے ہیں۔ کوا لجاجت سے کہتا جارہا تھا اور ـــــ چیل نانی کی غذا کو یاس و امید کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ـــ بارہا اس کا جی چاہا کہ ایک جھپٹا مار کر غذا کو لے اڑے ـــــ لیکن چیل نانی کی طاقت و عظمت کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ گئی ـــ

چیل نانی کی خبر آمد پاکر اور دوسرے کوّے بھی یکے بعد دیگرے جمع ہوگئے اور کچھ ممتاز کوّے با ادب ہوکر آگے بڑھے اور اپنی چونچوں کو از راہِ انکساری زمین پر رگڑتے ہوئے بولے: ـــ

چیل نانی آپ کا آنا مبارک ہو ـــــ ہم کو عرصے سے آپ کی آمد کا انتظار تھا ـــــ ہم روزانہ آپ کی آمد کی دعائیں مانگا کرتے تھے ـــــ شکر خدا کہ آج آپ کا شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ آپ کے جانے کے بعد سے آج تک اس چمن کے تمام کوّے سخت اقتصادی مشکلات میں گرفتار ہیں۔ اب تو ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا بھی میسر نہیں آتا۔ آپ کچھ دن چمن میں مہمان بن کر ہمیں خدمت کا موقع دیجئے اور ہماری اقتصادی رہنمائی کیجئے: ـــ

چیل نے حقارت کے ساتھ کوؤں کو دیکھتے ہوئے اپنی غذا کا آخری حصہ ختم کیا اور پھر فضائے آسمانی میں مائلِ پرواز ہوگئی ـــــ

چالاک کوّے اپنی ناکامی و نامرادی پر کفِ افسوس مل کر رہ گئے اور انھیں باتیں بنا کر غذا کا ایک دانہ بھی حاصل نہ ہوا ـــــ

کاش وہ ـــــ ان لمحات کو چیل نانی کی خوشامد میں ضایع کرنے کے بجائے "تلاشِ غذا" میں صرف کرتے تو یقیناً ـــــ ان کو غذا میسر آجاتی ـــــ لیکن افسوس کوّے اپنی تمام عملی قوتوں سے غافل تھے اور انھیں چمن کی محدود دنیا سے باہر فکر و جستجو کرنے کی تمنا نہ تھی ـــــ

کیا اس تمثیل کے اندر کمزور قوموں کے لئے سرمایۂ بصیرت نہیں؟ اور طاقتور قوموں کی سربلندی و خوش حالی کا راز مخفی نہیں ....؟ یقیناً اس تمثیل کے اندر "کمزور و طاقتور" دونوں کے لئے پیام حیات پوشیدہ ہے ـــــ طاقتور اس "پیام حیات" کو سن رہا ہے اور کمزور اپنی قوتِ سامعہ کو فنا کرچکا ہے۔ یہ ہے طاقتور اور کمزور کی زندگی کا فرق ـــــ

سیدہ اختر

اب کیا ہوگا

کھڑکیاں کھلی ہوئیں، رات، خاموشی، کمرہ پھولوں کی خوشبو سے مہکا مہکا۔ سامنے دلہن، سمٹی سمٹائی گٹھڑی کی طرح نہیں ——— بولتی، گاتی، اور ہنستی ہوئی دلہن۔ میں اور وہی کھلی ہوئی کھڑکیاں اور ان میں سے جھانکنے والی کرنیں۔ میں نے اس کی باہوں میں باہیں ڈال دیں۔ چہرے کو کسی قدر قریب کر کے ——— اونچی اونچی سانسوں کے سہارے ——— آہستہ آہستہ بولا۔

اب تو ہماری شادی ہوگئی نا۔!

اس نے یکایک اپنے آپ کو میری باہوں سے دور کرلیا۔ اور کسی قدر تاریکی میں چلی گئی۔ میں حیران مگر خوش ایک کھڑکی کے پاس کھڑا ہوگیا۔ سامنے باغ تھا۔ چاندنی کے جھولے میں جھولتا ہوا باغ، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور اس کے میٹھے میٹھے بول۔!!

اب وہ ——— میرے قریب آگئی۔ سرخ دوپٹے کو سنبھالتی ہوئی، مسکراتی، قدموں کو جھنجھناتی ہوئی۔ اب اس نے ——— اپنے ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیئے۔ چمک دار چوڑیاں کسی قدر بجیں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری روح میں کوئی ناچ رہا ہے۔ ایک جھنکار تھی جو جسم کو کپکپانے دیتی تھی ——— ! ——— اب وہ ——— اونچی اونچی سانسوں کے سہارے ——— آہستہ آہستہ بولی ———!

اب تو ہماری شادی ہوگئی نا ——— ہاں ——— اب کیا ہوگا ———!! اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہوگا۔ اب کیا ۔۔۔!!! جانے کتنی بار یہ منحوس سوال میرے ذہن میں آیا تھا اور مجھے ——— نہ صرف مجھے بلکہ ہمیں اس نے رلا رلا کے گھبرا دیا تھا۔ اور اب اتنے سہانے اور ایسے پیارے وقت ——— پھر یہ سوال۔! میں کچھ گھبرا سا گیا، ایک سناٹا چھا گیا۔ اونچی اونچی سانسوں میں سکون آگیا۔!! کچھ خواب مجسم ہوگئے۔ میں دیکھ رہا تھا۔ بہت دن ہوئے دنیا ایک نئے شاعر کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ نہایت فراخدلی سے۔ دعوتیں تھیں اور شعر خوانی شعر خوانی تھی اور داد دیں۔ شرماتی ہوئی دادیں، حوصلہ افزا دادیں، ان ہی شرماتی ہوئی دادوں میں سے ایک داد، اس ادا سے دی ہوئی داد جو نقش بن جایا کرتی ہے۔ ایک سہانا اور غیر فانی نقش۔!! لیکن کہاں؟ یہ داد بڑے بڑے محلوں اور جگمگاتی ہوئی محفلوں میں نہیں ملی تھی۔ آسمان سے سرگوشیاں کرنے والی پہاڑی کے سیکڑوں تاج محلوں میں نہیں ملی تھی عثمان ساگر کے کنارے پھولوں کی آبادی میں پازیب کی جھنکار سے تواضع کرنے والوں سے نہیں ملی تھی۔ یہ داد ——— شاعر کو ایک نئی دنیا بخشنے والی داد ———!! شہر کے ایک تنگ محلے میں ایک ایسے گھر میں جس کی چھتوں میں سے چاندی کی کرنیں جھانکا کرتی ہیں۔ ہاں ان ہی جھانکتی ہوئی کرنوں کی آڑ سے دی گئی تھی۔ شرماتے ہوئے، گھبراتے ہوئے۔ ایک "آزادی کا گیت" "سن کر غریب گھرانہ" آزادی کا گیت" اور یہ داد ———!! شاعر اس سادہ مگر نظر نواز دعوت سے فراغت پاکر اپنے گھر لوٹا۔ جھومتا، رقص کرتا، گاتا ہوا ———!

اب شاعر کی دنیا بدل گئی تھی۔ دنیا اس سے روز ایک نئی نظم سننے لگی۔ نہایت پیاری، نہایت بلند، نہایت پاکیزہ ———! شائد اب وہ محبت کرنے لگا تھا۔ وہ اکثر اس گھر کی طرف دیکھا جانے لگا جہاں سے وہ جھومتا، رقص کرتا ایک دفعہ نکلا تھا ———!

یہ وہ زمانہ تھا جب شاعر اور وہ ایک دوسرے سے بہت قریب ہوگئے تھے۔ ایک دوسرے کا انتظار ہونے لگا تھا۔ کبھی راتوں کی خاموشی میں گھر کی کھڑکیوں میں اور کبھی گھر کے پیچھے کے میدان میں املی کے درختوں کے نیچے ——!

ایک رات گھر کے پیچھے کے میدان میں املی کے درختوں کے نیچے شاعر کے زانو پر سر رکھے وہ لیٹی ہوئی تھی۔ گم صم۔ شاید مستقبل سے متعلق کچھ سوچ رہی تھی۔ دور کسی کا سایا نظر آیا۔ وہ گھبرا کر کہنے لگی: "اب کیا ہوگا" اس نے شاید ہمیں دیکھ لیا ہو! شاعر نے اسے تسلی دی اور اس رات کی ملاقات ختم ہوئی۔!

ایک دفعہ —— بہت رات گئے، وہ دیوان خانے کی نیم وا کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہے تھے کہ اندر سے کسی دروازے کے زور سے بند ہونے یا کھلنے کی آواز آئی۔ وہ گھبرا گئی: "اب کیا ہوگا" اس نے انتہائی خوف و ہراس کے عالم میں کہا، بات پھوٹ چکی ہے۔ شاعر بھی کچھ گھبرا گیا ——!

بہت دن بعد —— اسی نیم وا کھڑکی کے پاس، آدھی رات کی خاموش تاریکی میں وہ کھڑے ہوئے تھے۔ لڑکی آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی: "اب کیا ہوگا" آپ نے "پیام" تو بھیجا مگر یہاں عجیب گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔ بھائی جان راضی ہیں لیکن ابا اور امی جان نہیں ——!! شاعر رونے لگا ——!!!

وقت گذرا ہی کرتا ہے۔ گزر گیا۔ چوری کی ملاقاتیں ختم ہوگئیں۔ دن کے نالے اور شب کی آہیں گئیں۔ یعنی ہماری شادی ہوگئی۔ شبِ عروسی ہے۔ کمرہ پھولوں کی خوشبو سے مہکا مہکا۔ کھڑکیاں کھلی ہوئیں۔ اتنا سہانا اور پیارا وقت پھر یہ سوال ——!!

"اب کیا ہوگا"

نظر حیدر آبادی

قطعات

جدائی بھی وفا کا اک قدم ہے　　تمھیں یہ رازِ دل سمجھا رہا ہوں
غلط، بالکل غلط، آنسو تو پونچھو　　یہ کس نے کہہ دیا میں جا رہا ہوں

نہ ہوگی متفق، اس سے محبت　　جو کچھ ساری خدائی چاہتی ہے
محبت چاہتی ہے ان سے ملنا　　محبت ہی جدائی چاہتی ہے

کسی سے دور ہوتا جا رہا ہوں　　جہاں تاریک ہوتا جا رہا ہے
یہ تاریکی، بڑی شئے ہے، کہ شاہد　　کوئی نزدیک ہوتا جا رہا ہے

شاہد صدیقی

مغربی تہذیب

یہ عجیب بات ہے کہ اہلِ مغرب مادّی اور ذہنی ترقی کے اعلیٰ ترین معیار پر پہنچنے کے بعد بھی اپنی زندگی میں ایک قسم کا انتشار، بے چینی اور پریشانی محسوس کرتے رہے ہیں۔ اس اضطراب کی اصلی وجہ موجودہ مغربی تہذیب کی وہ چند خصوصیتیں ہیں جن کا تجزیہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اکثر مغربی ممالک میں گھریلو زندگی میں مرد کی برتری اور عورت کی کم تری کے قدیم تصورات اب ختم ہو چکے ہیں۔ شوہر اور بیوی دونوں پر معاشی اور سماجی حیثیت سے مساوی ذمہ داریاں عائد ہو چکی ہیں۔ دونوں کے وقت کا بہت بڑا حصہ گھر کے باہر گزرتا ہے۔ امن کے زمانہ میں عام طور پر دن کارخانوں، صنعتی اداروں یا معاشی مصروفیتوں میں گزرتے ہیں، شام تفریح میں اور رات سینما گھروں یا رقاص خانوں میں۔ زندگی کی تمام ضروریات کی تکمیل گھر کے باہر ہوتی ہے۔ کسی ہوٹل میں کھانا کھا لیتے ہیں، کپڑے کسی سلوائی گھر میں تیار ہو جاتے ہیں، دھلوائی اور رنگوائی کسی کارخانہ میں ہو جاتی ہے، جسمانی آرائش و زیبائش کا کسی فنی دکان میں انتظام ہوتا ہے، تفریح اور دلچسپی کے لئے کلب موجود ہیں اور رات میں قیام کے لئے بے شمار قیام گاہیں مع لوازمات کے حاضرِ خدمت ہیں۔ اس آزادانہ طرزِ زندگی کا یہ نتیجہ نکلا کہ شوہر اور بیوی کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی جو روز بروز وسیع ہو کر بسا اوقات طلاق کی شکل اختیار کرنے لگی۔ خاندان کے دوسرے افراد میں بھی ایک دوسرے کے لئے خلوص و محبت، اتفاق و ایثار کے وہ جذبات موجود نہیں جو سابقہ نسلوں میں موجزن تھے۔ ازدواج کی کثرت، طلاق کی ارزانی عروسی زندگی میں انقلاب پیدا کر چکی ہے۔ شادی کے آئین میں اب نہ دلکشی ہے نہ رومانیت نہ تقدیس۔ فرانس، روس اور امریکہ میں تجرباتی شادیوں کا رواج عام ہو رہا ہے۔ غرض کہ گھریلو زندگی کے تمام محرکات سوائے بچوں کے یکے بعد دیگرے غائب ہوتے جا رہے ہیں اور بیچارے بچوں اور بچیوں کا یہ حال ہے کہ روشن خیال ماں باپ کی ایک بڑی تعداد ان کی ضرورت تسلیم ہی نہیں کرتی اور اگر مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے تو یہ یتیم خانوں، دایہ گھروں یا بچوں کے چھوٹے مدرسوں کی زینت بن جاتے ہیں۔

مغرب کے موجودہ صنعتی دور سے پہلے علماء و فضلاء، شعراء و فلسفی سماج کے رہبر و ہادی سمجھے جاتے تھے لیکن اب لکھپتیوں اور کروڑپتیوں نے یہ جگہ حاصل کر لی ہے۔ آج کل مغربی معاشرہ میں وہی ہستیاں قابلِ احترام اور ممتاز سمجھی جاتی ہیں جو دولت مند ہیں اور پیدائشِ دولت کے طریقوں میں شاق۔ اہلِ مغرب کو یقین ہے کہ نہ صرف ارضی جنتیں بلکہ فردوسی نعمتیں بھی دولت اور صرف دولت سے حاصل کی جا سکتی ہیں اس لئے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اور ہر قیمت پر دولت پیدا کرنے کی فکر میں منہمک رہتے ہیں۔ علم سائنس کے انکشافات و ایجادات اور علم میکانیت کی اختراعات ان کے لئے باعثِ نعمت ثابت ہوئیں۔ اور یہی ان کے جذبات جاہ پرستی و زرپرستی کے لئے مہمیز بنی ہوئی ہیں۔ یورپ کے موجودہ صنعتی دور کے آغاز میں یہ توقع کی جا رہی تھی کہ صنعت و حرفت، تجارت و زراعت میں مشینوں کے استعمال کی وجہ سے غربت و افلاس میں کمی ہوگی مگر یہ معصوم توقعات شرمندۂ تعبیر نہ رہیں۔ کیونکہ مشینوں کے استعمال کے لئے مقابلتہ کم لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جس کی وجہ سے بیروزگاری عام ہونے لگی اور پیدائش بہت زیادہ۔ یہ پیدائش اتنی زیادہ ہوتی رہی کہ اشیاء کی قیمتوں کو برقرار رکھنے کے لئے یا تو متجاوز مقدار کو تلف کر دینا پڑا جیسا کہ ممالک متحدہ امریکہ نے کیا یا پھر ان کی کھپت کے لئے دوسرے ملکوں اور دوسری چراگاہوں کی فکر ہوئی جیسا کہ آج کل جرمنی، اٹلی اور جاپان کو ہے۔ آج کل مغرب کا ہر صنعتی ملک اس فکر میں ہے کہ

نئی نئی صنعتوں کے ذریعہ نئی نئی خواہشات کی تکمیل کرے لیکن چونکہ ہر ملک اپنی اشیاء کی ایک خاص مقدار ہی صرف کر سکتا ہے اس لئے دوسرے ممالک کی مستقل تلاش اور دوسری قوموں کو غلام بنانے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ موجودہ بین قومی نازک صورت حال اسی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ مادی ترقی کی وجہ سے معیار زندگی بہت بلند ہو چکا ہے اور نفسانی خواہشات میں بے حد اضافہ۔ ہر ملک میں مزدور پیشہ افراد کی ایک بڑی اکثریت ہوتی ہے اور معاشی کساد بازاری کی وجہ سے اس بڑی اکثریت کی اجرت میں کمی اور اوقات کار میں تدریجی اضافہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے ان میں ایک عام بددلی اور ہیجان پھیلتا جا رہا ہے۔ لیکن قوانین کی سختی کی وجہ سے عارضی طور پر سطح آب پر کسی قدر سکون چھایا ہوا ہے جو یقیناً ایک مہیب طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ ان لوگوں کو کارخانوں، گرنیوں، اسلحہ خانوں اور صنعتی اداروں میں جو کام کرنا پڑتا ہے وہ اتنا میکانیکل ہوتا ہے کہ انھیں اس سے نہ تو ہمدردی ہوتی ہے نہ دلچسپی اور نہ کوئی خاص لگاؤ۔ انسان خود مشین بن جاتا ہے۔ اس کے تمام اعلیٰ احساسات مردہ ہو جاتے ہیں۔ فنون لطیفہ میں بھی وہ فنی خوبصورتی، حسن اور روحانی مسرت کی بجائے محض دولت اور نام و نمود کو تلاش کرتا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے پہلے ربع میں مختلف علوم مثلاً عمرانیات، حیاتیات، نباتیات و نفسیات کی مغرب میں جو حیرت انگیز ترقی ہوئی اس سے مذہبی عقائد کو ٹھیس لگی اور مذہبی احساسات کمزور ہونے لگے۔ سائنس کی ترقی نے اس رفتار کو تیز تر کر دیا۔ مادیت کی اندھا دھند ترقی نے بے اعتقادی کی جڑوں کو مضبوط کر دیا۔ غیر مساوی تقسیم زمین اور دولت کی وجہ سے کسان اور مزدور ربانی تاویلات مساوات اور انصاف پر ہنسنے لگے اور دہریت عام ہونا شروع ہوئی۔ ہر مغربی ملک میں ان دہریوں کی ایک مضبوط جماعت موجود ہے جو اشتمالی کہلاتی ہے۔ مختلف ملکوں نے سیاسیات کو مذہب سے علحدہ کر لیا۔ اس نے گرجاؤں اور معابد کی جگہ کتاب گھر رقاص خانے اور سینما گھر تعمیر کئے اور مذہب کو ملک سے نکال باہر کیا۔ روسیوں نے نہ صرف اپنے ملک میں یہ انقلاب برپا کیا بلکہ دنیا کے تمام مزدوروں کو اس کی دعوت دی اور اس انقلاب کے لئے اکسایا۔ مذہب سے اس بے راہ روی کی وجہ سے لوگ مذہبی روایات، معتقدات اور احساسات سے بیگانہ ہو گئے اور مادیت کی آغوش میں روحانی امراض کا مداوا تلاش کرنے لگے جہاں انھیں نہ تو اطمینان قلب نصیب ہوا اور نہ اطمینان روح۔ مغربی تہذیب کے موجودہ اضطرابی دور میں اس روحانی بے چینی کا بھی بڑا حصہ ہے۔

مغربی تہذیب کے بعض محققین کا خیال ہے کہ مغرب کی بین قومیت تاریخ تمدن میں ایک درخشاں باب کا اضافہ کرتی ہے۔ جب ہم اس نام نہاد بین قومیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر یوروپی قوم بین قومی ذمہ داریوں اور تعلقات کے راگ زور شور سے الاپتی تو ہے لیکن ہر جائز اور ناجائز طریقہ سے صرف اپنی قوم اور اپنے ملک کی خاطر تمام دوسری اقوام اور ممالک کو دھوکہ اور فریب سے نقصان پہنچانے کے درپے رہی ہے۔ تمام اقوام یورپ بین قومی امن و عافیت، صلح و آشتی کا پرچار نہایت دھوم دھام سے کرتی رہیں لیکن جنگی تیاریوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی فکر میں لگی رہیں کیونکہ انھیں نہ اپنے قول و فعل پر اعتماد تھا اور نہ دوسروں کے وعدوں پر بھروسہ۔ مخصوص قومیت کا تخیل اس شدت کے ساتھ حکومتوں کی جانب سے لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کیا جاتا ہے کہ ہر قوم دنیا میں محض اپنے آپ کو پرعظمت، تہذیب یافتہ اور بہادر خیال کرتی ہے اور تمام دوسری اقوام کو حقیر، وحشی اور بزدل۔ چنانچہ اٹلی ایک زمانہ میں حبشہ کو ہضم کر کے اسی مغربی تہذیب کا سبق دے رہا تھا۔ جاپان بھی درس چین میں دہرا رہا ہے۔ جب یہ دوسروں کو مہذب بنانے کی مہم شروع کرتے ہیں تو نہ بچوں کا خیال کرتے ہیں نہ بوڑھوں کا نہ عورتوں کا مضافی اور

غیر مصافی حصوں کو جہنم بنا دیتے ہیں۔ شہروں کو ویرانوں میں اور گاؤں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان کی داستان تہذیب اور دعوئے شائستگی آنا خونچکاں ہے کہ اگر انسانیت اپنے آنسوؤں سے ان کے کارنامے مٹانے کی کوشش بھی کرے تو نہ مٹیں۔ جب تک یہ حیوانی جذبات، بہیمانہ احساسات اور وحشیانہ حرکات ختم نہ ہوں گے اس وقت تک مغربی تہذیب کے یہ گندہ ناسور بھی مندمل نہیں ہو سکتے۔

جنگ عظیم کے بعد بہت سے مغربی ممالک میں جمہوری طرز کی حکومتیں قایم ہوئیں۔ جمہوریت کو نظام حکومت کی آخری ارتقائی صورت تصور کیا جانے لگا۔ لیکن چند سالہ کارگزاری سے معلوم ہوا کہ اپنی فعلیت کے اعتبار سے یہ غیر جمہوری ہے۔ پہلے تو یہ کہ بہت سے لوگ محض دولت اور سستی شہرت کی وجہ سے پبلک نمایندگی کے لئے منتخب ہو جاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان منتخب شدہ نمایندوں کی ذاتی رائے بہت کم ہوتی ہے۔ ان کے خیال اور ان کی رائے پر بعض جماعتوں اور آمرانہ قائدوں کا تسلط ہوتا ہے۔ وہ جس طرف چاہتے ہیں انھیں ہانک لیجاتے ہیں۔ اس طرح جمہوریت کے اثاثی اصول کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے۔ حکومتی ایوانوں میں لمبی چوڑی تقریریں محض ایک فریب ہے۔ پر جوش مباحثے ایک دلچسپ دھوکہ اور جمہوریت ایک سازش ہے جس کے ذریعہ سرمایہ دار طبقہ غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کو بے وقوف بناتا رہتا ہے۔ اسی قسم کے احساسات اور عملی ناکامیوں کی وجہ سے یورپ کی بعض جمہوری حکومتوں نے اپنے طرز حکومت کو آمرانہ قرار دیا۔ لیکن یہ نظام حکومت بھی عوام کے لئے اپنے اندر بنیادی کمزوریوں، شکوک اور شبہات کی ایک دنیا رکھتا ہے تمام قوت اور اقتدار صرف ایک شخص کے پنجہ میں دیدیئے جاتے ہیں جو ازمنہ وسطیٰ کے مطلق العنان بادشاہوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ تمام لوگ اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ اس کی ہر خواہش مقدس امانت اور ہر اشارہ ایک ربانی حکم ہوتا ہے۔ جس کی فوری تکمیل ان کا فرض منصبی تصور کیا جاتا ہے خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔ آج کل مغربی ممالک ان ہی دو متضاد سیاسی نظریات میں بٹے ہوئے ہیں۔ جمہوری اور آمری حکومتیں نہ صرف سیاسی بلکہ معاشی اور سماجی نظریوں میں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اہل مغرب نہ تو جمہوریت سے مطمئن معلوم ہوتے ہیں اور نہ آمریت سے خوش۔ وہ نہ جمہوریت کے خلاف صف آرا ہو سکتے ہیں نہ آمریت کے خلاف علم بغاوت بلند کر سکتے ہیں۔ ان دونوں متضاد سیاسی نظریوں کے باوجود عوام میں وہی مایوسی، بے اطمینانی اور انتشار موجود ہے جو پہلے تھا اور اپنے حالات سے اسی طرح شاکی اور غیر مطمئن ہیں جس طرح پہلے تھے ــــــ لیکن باوجود ان تمام شکایتوں اور تکالیف کے ان میں بعض ایسی خصوصیات، جذبات و احساسات موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنی تہذیب کو تباہی کے طوفان سے کسی نہ کسی طرح بچاتے رہے ہیں۔ ان کا سب سے زیادہ قابل احترام جذبہ ــــــ جذبۂ حب وطن ہے۔ ملکی خدمت کا جب وقت آتا ہے تو بلالحاظ فرقہ و نسل اور مذہب و ملت سب کے سب بیک جان و دل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور قومی ناموس کی حفاظت میں اپنی ہر چیز۔ جان، مال اور عزت کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ایسے وقت نہ تو وہ جماعت واری اختلافات کا خیال کرتے ہیں نہ طبقہ واری عداوتوں کو خاطر میں لاتے ہیں اور نہ سیاسی، مذہبی یا معاشی مناقشات کا لحاظ کرتے ہیں۔ ملکی اور ملی معاملات میں وہ کبھی ذاتیات یا انفرادیت کو دخیل ہونے نہیں دیتے۔ ان کی زندگی ملک اور قوم کے لئے ہوتی ہے نہ کہ اپنے لئے۔ اہل علم و فکر ہمیشہ اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ علوم و فنون، صنعت و حرفت، تجارت و زراعت کے ذریعہ اپنی قوم کو اقوام عالم کی صف میں اولین مقام پر لے آئیں۔ اور عوام محنت اور مشقت کرتے وقت بھی باوجود اپنے اندرونی اضطراب، پریشانی اور انتشار کے صرف اس خیال سے زیادہ سے زیادہ کام کرتے ہیں کہ ان کی محنت شاقہ کی وجہ سے ان کا ملک تمام دوسرے ملکوں سے بازی لے جائے۔ وہ اپنے اوقات بہتر طریقہ سے استعمال کرتے

عادی ہیں۔ ان میں انتہائی ضبط اور تنظیم موجود ہے۔ غرض کہ اہل مغرب کی یہ وہ نمایاں خصوصیات ہیں جو ہمارے لئے نشان منزل بھی ہیں اور باعثِ عبرت بھی۔

محمد بن عمر

یاد

چاندنی ہے، بہار ہے، میں ہوں!　　عقل کو مل رہا ہے درسِ جنوں
مئے نے الٹا ہے پردۂ اوہام　　پارہا ہوں سکونِ دل کا پیام
حسنِ گیتی ہے بے حجاب و درنگ　　اف! ہجوم شراب و رامش و رنگ
بادہ افشاں ہوا ہے ابرِ بہار　　میں ہی کیا! کائنات ہے سرشار

روح کو خواب سے جگاتا ہے
آج پھر کوئی یاد آتا ہے

اف یہ موسم یہ اہتمامِ جمال　　ساری دنیا ہے اک لطیف خیال
وہ نہ موجود ہوں تو پھر ہے کیا　　چاندنی کیا، بہار کیا، مئے کیا
اشک کی سرگزشت قصۂ آہ　　ہجر کی رات، ارے معاذ اللہ

غنچۂ آرزو کھلا جاتے!
کاش ایسے میں وہ بھی آجاتے

علی اختر

حضرت بابا شرف الدینؒ

حضرت بابا شرف الدین ان بزرگان قوم میں سے ہیں جو اپنے صلح کل مسلک اور جان گسل ایثار کی وجہ سے اپنی زندگی کو زندگی جاوید بخشتے ہیں۔ وہ خلق اللہ کی خدمت کے لئے وقف تھے اور بلا امتیاز مذہب و ملت جملہ بنی نوع انسان کے کام آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک دکن کے ہندو اور مسلمان دونوں ان کے معتقد ہیں۔ اور اگرچہ آج ان کو وفات پائے ہوئے چھ سو تہتر سال گزر چکے لیکن اس سرزمین کے بسنے والے اب تک ان کو نہیں بھولے۔ ان کی درگاہ آج تک مرجع خلائق ہے اور ان کا وہ فیضان برابر جاری ہے جس نے ان کو ایک ایسے زمانہ میں رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنادیا تھا جب کہ اس ملک میں مسلمانوں کا وجود ہی نہ تھا

سلطان محمد غوری کی فوجوں کو دہلی میں قدم جمائے ہوئے ابھی عرصہ نہیں گزرا تھا اور خود شمالی ہند مسلمانوں کی تہذیب اور مذہب سے برابر روشناس نہ ہونے پایا تھا کہ بابا شرف الدین اپنے بھائی شہاب الدین کے ساتھ دکن میں تشریف لائے۔ اس وقت گولکنڈا ایک پالیکار کی راج دہانی تھا۔ اور اس پہاڑی قلعے کے باشندوں کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کسی روز اس قلعہ پر بابا شرف الدین کے ہم مذہبوں کا قبضہ ہو جائے گا۔

یہ دونوں بھائی (یعنی بابا شرف الدین اور شہاب الدین) عراق کے رہنے والے تھے۔ اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس سرزمین پر آگے چل کر سلاطین آصفی کا پایہ تخت حیدرآباد جیسا شہر آباد ہونے والا تھا اس پر پہلے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی ہی کے حلقہ بگوشوں اور ارادت مندوں کے قدم پڑتے ہیں۔ گویا قدرت کی طرف سے آج سے سات سو سال قبل ہی یہ پیشین گوئی کردی گئی تھی کہ یہ ملک خاندان شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کے چشم و چراغ میر قمر الدین خاں آصفجاہ کی اولاد کے زیر نگیں رہے گا۔

یہ تحقیق سے معلوم نہ ہوسکا کہ بابا شرف الدین اور ان کے بھائی شہاب الدین اور دیگر ساٹھ، ستر مسلمان جوان کے ہمراہ تھے دہلی کی طرف سے دکن میں داخل ہوئے یا راست سمندر کی راہ سے ساحل پر وارد ہوئے اتنا ضرور معلوم ہے جیسا کہ شیخ قطب الدین نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں دکن کے باشندے اتنے سخت مذہبی اور چھوت چھات کے پابند تھے کہ علی الصباح کسی مسلمان کی صورت دیکھنا کروہ سمجھتے اور کھانے پینے کا سامان اس کے ہاتھ فروخت نہ کرتے تھے، بلکہ اس امر کی کوشش کرتے تھے کہ یا تو وہ واپس چلا جائے یا اس ملک ہی میں فقر و فاقہ کی زحمتیں اٹھا کر ختم ہو جائے۔

ان حالات کے تحت بابا شرف الدین کو ابتدا میں جن دشواریوں سے سابقہ پڑا ہوگا اس کا صحیح اندازہ آج ہم نہیں لگا سکتے۔ انھوں نے ہر قسم کی تکلیف گوارا کی اور رفتہ رفتہ اپنے اخلاق اور فروتنی سے یہاں کے باشندوں کا دل موہ لیا۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوا کرتا ہے سب سے پہلے غریب لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوئے۔ دکن آنے کے بعد آپ نے موجودہ شہر حیدرآباد کے جنوب مغرب کی طرف چار پانچ میل کے فاصلہ پر جس پہاڑی پر قیام کیا تھا وہ خوفناک درندوں کا مسکن تھی اور لوگ اس کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے تھے لیکن آپ کی جرأت اور بے خوفی نے سب لوگوں کو محو حیرت بنا دیا۔ یہ پہلا کام تھا جس کی وجہ سے اس ملک کے

باشندے آپ سے مرعوب ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کی اصل مقبولیت کا دور شروع ہوتا ہے۔ آپ میں ملنساری، کسرِ نفسی اور فروتنی کی اتنی فراوانی تھی کہ ہر غریب سے غریب شخص آپ سے دل کھول کر باتیں کرتا تھا۔ قرب وجوار کے چرواہے اور کسان آپ سے بہت جلد مانوس ہو گئے اور اپنی ہر چھوٹی بڑی ضرورت یا مشکل میں آپ سے رائے اور مشورہ لینے لگے۔ ایک بار ایک دھوبی کا بیل کسی طرف کو نکل گیا وہ پریشان ہو کر آپ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ

"بابا میرا بیل کھو گیا۔ ہر جگہ اس کی تلاش کی کہیں پتہ نہ چلا۔ میں مفلس و تنگدست ہوں۔ بال بچے زیادہ ہیں مشکل سے زندگی بسر ہوتی ہے۔ بیل میرا قوت بازو تھا۔ اب نہ مجھ میں اتنی سکت کہ دوسرا بیل خریدوں اور نہ مزید تلاش کرنے کی ہمت ہے۔ اب آپ ہی کچھ مشورہ دیجئے کہ کیا کروں۔"

بابا شرف الدین نے تھوڑی دیر تامل کر کے ایک ٹھیکری پر کوئلے سے کچھ لکھا اور کہا کہ۔

"یہ ٹھیکری ہنومان کے اس بت کے پاس لیجا وہ تیرا بیل دیدے گا۔"

غریب دھوبی بڑا پریشان ہوا کہ ہنومان پتھر کی مورت نہ اپنی جگہ سے چل سکتا اور نہ حرکت کر سکتا وہ کیونکر بیل دے گا۔ لیکن بابا شرف الدین کی باتوں پر اس کو اتنا یقین تھا کہ وہ اس ہنومان کی مورتی تک پہنچا اور ٹھیکری اس کے سامنے رکھ دی۔ کچھ دیر تک انتظار کیا کہ دیکھوں ہنومان بیل کیونکر لا دے گا۔ آخر کار جب وقت گزرنے لگا اور مایوسی بڑھ گئی تو وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی نکلنے نہ پایا تھا کہ ہنومان کی مورتی کے پیچھے حرکت محسوس ہوئی۔ اور دھوبی نے دیکھا کہ اس کا بیل چرتا ہوا کھڑا ہے۔ دوڑ کر اس کو پکڑ لیا اور خوش خوش اپنے گھر پہنچا۔ اسی وقت دور دور کے گاؤں تک چرچا ہو گیا کہ تمام مورتیاں اور دیوتا بابا شرف الدین کا حکم مانتے ہیں۔ اس واقعہ نے بابا صاحب کو مرجع خلائق بنا دیا اور اطراف واکناف کے غریب اور حاجت مند لوگ آپ کی خدمت میں جوق در جوق آنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک بار خود گولکنڈہ کے پالیکار یعنی رئیس وینکٹ ریڈی کا لڑکا سخت بیمار پڑ گیا۔ اور ملک کے تمام اطبا اس کا علاج کر کے مایوس ہو گئے تو اس کے مشیروں نے اس کو رائے دی کہ ایسی نازک حالت میں اگر کوئی مدد کر سکتا ہے تو وہ بابا شرف الدین ہی ہیں۔ مجبوراً رئیس کو بھی آخر کار حضرت سے استدعا کرنی پڑی۔ بابا شرف الدین نے ایک تعویذ لکھ دیا اور دم کر کے پانی دیا۔ تعویذ باندھنے کے تیسرے روز ہی لڑکا صحت مند ہو گیا۔ اب بابا شرف الدین کی مشکلات رفع ہونے لگیں۔ دور دور سے امیر و غریب ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور بہت سے لوگوں نے آپ کی پاکیزہ زندگی کو اپنے لئے نمونہ بنایا اور رفتہ رفتہ آپ کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔ لیکن اس اقتدار کے باوجود آپ کی طبیعت میں اتنی صلح پسندی تھی کہ آپ نے اپنے معتقدین کو گائے ذبح کرنے اور گائے کا گوشت کھانے سے ہمیشہ کے لئے منع کر دیا۔ چنانچہ آپ کی اس ممانعت کا اثر اب تک اس ملک میں باقی ہے۔ اور محبوب الزمن میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ قدیم دکنی مسلمان اب بھی گائے کا گوشت نہیں کھاتے۔

یہی وہ رواداری اور تالیف قلوب تھی جس کی وجہ سے بابا شرف الدین کی یاد چھ سو ستر سال گزر جانے کے باوجود دکن کے ہندوؤں کے دلوں میں بھی تازہ ہے۔ اور وہ ہر جمعرات اور خاص طور پر ہر ہجری مہینے کی پہلی جمعرات کو مسلمانوں کے دوش بدوش اب بھی ان کی درگاہ میں خراج عقیدت ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔

یہ ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ حضرت بابا شرف الدین کس سنہ میں وارد دکن ہوئے لیکن تذکروں میں ان کی تاریخ وفات انیس۱۹ ماہ شعبان ۶۸۷ھ

درج ہے۔ اس وقت دہلی میں شہور پاکباز سلطان ناصر الدین محمود ابن شمس الدین التمش سریرآرائے ملکوت تھا۔ اور خلجیوں کے خاندان کو برسر اقتدار آنے میں ابھی تین چار سال باقی تھے۔ علاء الدین خلجی اور اس کے سپہ سالار ملک کافور نے حضرت بابا شرف الدین کے انتقال کے سات آٹھ سال بعد دکن پر حملہ کیا۔ اور سلطان حسن گنگو بہمنی نے آپ کی وفات کے اڑتیس سال بعد دکن میں ایک خود مختار اسلامی سلطنت قایم کی۔ یہ تمام تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ بابا شرف الدین گویا بطور ہراول یا مقدمتہ الجیش کے دکن میں وارد ہوئے۔ انھوں نے مسلمان حملہ آوروں کی آمد سے قبل ہی اس ملک کو اسلامی طرز معاشرت اور تہذیب سے واقف کرا دیا تھا۔ حدایق الاولیا میں لکھا ہے کہ:۔

> آپ کی تشریف آوری سے یہ غرض تھی کہ دین محمدی کی اشاعت ہو بنا۔ علیہ آپ اہل اصنام کے ساتھ حسن اخلاق استعمال فرماتے تھے:

چونکہ بابا شرف الدین صادق القول اور نیک نفس تھے اور صاحب کشف و کرامات بھی اس لئے ان کو اپنے مقصد میں وہ کامیابی حاصل ہوئی جو بڑے بڑے بادشاہوں اور سپہ سالاروں کو بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

آپ کی کرامتوں کے عجیب و غریب اور طویل قصے کتابوں میں درج ہیں۔ لیکن ہماری نظر میں ان کی سب سے بڑی کرامت ان کی خدمت خلق ایثار، ملنساری، ان کا تقوی، دوسروں کے کام آنا اور عام تالیف قلوب تھی۔ روحانی کمال اور کشف و کرامات کی قوتیں اسی وقت جلوہ گر ہوتی ہیں جب خلق اللہ کی خدمت اور ہدایت پیش نظر ہو۔ یہاں فیض رسانی مفقود ہوا اور ذاتی نمود و نمائش کی جلوہ آرائی ہو وہاں ممکن ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے دنیوی کمال کا دور دورہ ہو لیکن جاودانی زندگی اور عظمت نصیب نہیں ہوتی۔

بابا شرف الدین کے بعد سے اب تک دکن میں بڑے بڑے مشاہیر پیدا ہوئے یا باہر سے وارد ہوئے جن میں متعدد اولیا اور صاحبان عرفان بھی شامل ہیں۔ لیکن بابا شرف الدین کی عظمت اور یاد ہر دور میں باقی رہی۔ غفراں مکان میر محبوب علیخاں آصف جاہ سادس کے عہد میں بابا شرف الدین کی پہاڑی شریف کے اطراف واکناف میں بڑے بڑے محل اور مکان تعمیر کئے گئے اور یہ حصہ بہت آباد ہو گیا۔ غفراں مکان اکثر پہاڑی شریف پر مزار حضرت بابا شرف الدین کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ اور عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ان کی زندگی مستعار کی آخری گھڑیاں بھی اسی کے دامن میں گزریں۔ اور وہ غمگین وقت اب بھی بہت سے لوگوں کو یاد ہے کہ جب حضرت غفراں مکاں کا جنازہ بابا شرف الدین کی پہاڑی سے مکہ مسجد کو لایا گیا تھا۔

اعلیٰ حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ بھی حضرت بابا صاحب کے ویسے ہی معتقد ہیں۔ آپ بھی بارہا اس درگاہ میں نذر عقیدت پیش فرما چکے ہیں اور پہاڑی کی پختہ سیڑھیوں کی تعمیر بھی اسی بابرکت عہد حکومت کی لامتناہی فیوضات میں شامل ہیں۔ ادھر کچھ عرصہ سے حضرت بابا شرف الدین کی مزار مبارک پر گنبد اور خانقاہ بھی زیر تعمیر ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ مستقبل قریب میں دکن کے ایک اور بہت بڑے بزرگ میر محمد مومن کے الفاظ میں ہم یہ کہنے کے قابل ہو جائیں کہ ؎ ع

کہنگی پوشید تشریف نوی

حضرت بابا شرف الدین کے بھائی بابا شہاب الدین نے پہاڑی کے جانب مغرب چند میل کے فاصلہ پر اس مقام پر قیام کیا جہاں اب موضع شمس آباد واقع ہے۔ آپ نے بابا شرف الدین کے چار سال بعد ۲۱ محرم ۶۹۱ھ میں وفات پائی۔ اور اسی مکان میں مدفون

ہوئے جو آپ کا اقامت کدہ تھا۔ آپ کی درگاہ بھی اب تک زیارت گاہ عام و خاص ہے۔ چنانچہ اسی کو دیکھ کر نواب فخر الدین خاں امیر کبیر شمس الامراء نے گزشتہ صدی میں اس جگہ پختہ بازار اور مکانات بنوا دیئے۔ چنانچہ یہ مقام اب انہی کے نام کی نسبت سے شمس آباد مشہور ہے۔

سید محی الدین قادری زورؔ

انسان اور کائنات

مجھے خدا نے خلافت کا مجد بخشا ہے — مرے ہی زیر نگیں اس جہاں کو رکھا ہے

مگر نظامِ جہاں کی عجیب حالت ہے — مرے ہی دوش پہ عالم کا بارِ خدمت ہے

مشقتیں ہی لکھی ہیں مرے مقدر میں — نہیں سکون کبھی میرے قلبِ مضطر میں

مری حیاتِ دو روزہ تلاشِ پیہم ہے — جہاں مرے لئے جنت نہیں، جہنم ہے

ہے قصد اب کہ کروں اک جہانِ نو آباد

رہوں تفکرِ فردا و دوش سے آزاد

جہاں کہ کشمکشِ زیست کا نشان نہ ہو — حیات، صبر و مشقت کا امتحان نہ ہو

یہ سرزمیں، یہ سمندر، یہ آسماں نہ رہے — درونِ دام و قفس میرا آشیاں نہ رہے

جہاں کہ غم کی گھٹا روح پر نہ چھانے پائے — جمود، عالمِ احساس پر نہ آنے پائے

جہاں کہ نور رہے میرے دل کی بستی میں — شباب و شعر کے جلوے ہوں میری ہستی میں

وہاں میں عشق و محبت کے گیت گاؤں گا

وہاں میں حسن کو اپنا خدا بناؤں گا

محمد نعیم الدین صدیقی

نئی کتابیں

۱۔ کلیات میر (نیا ایڈیشن) مرتبہ نول کشور پریس۔ لکھنو ۹۰۶ صفحے قیمت ۔

۲۔ محاسن سجاد مرتبہ مسعود عالم ندوی ۱۰۰ صفحے قیمت ۔ الہلال بک ایجنسی۔ پٹنہ۔

۳۔ یاران میکدہ (مزاحیہ مضامین) از عبد الشکور ۱۵۱ صفحے مکتبہ جامعہ دہلی

۴۔ گرام سدھار (دیہات سدھار) " " ۱۲۰ "

۵۔ سہارا (افسانے) از شفیق بانو شفیق ۱۴۴ صفحے قیمت ۔ شفیق بانو۔ جامع مسجد۔ نجیب آباد۔

۶۔ نو بہار (افسانے) از رام سروپ کوشل ۱۶۰ صفحے قیمت ۔ رام نرائن تاجران کتب الہ آباد

۷۔ اصول مضمون نگاری از اختر صدیقی ۹۴ صفحے قیمت ۔ قریشی بک ہاوس۔ امرتسر۔

۸۔ سوز و گداز (مجموعہ کلام) از خان بہادر حافظ محمد ولایت اللہ ۲۳۰ صفحے قیمت عالی محمد الطاف اللہ۔ چھاؤنی ناگپور۔

۹۔ نگارش حالی (رقعات) از صوفی محمد عزیز اللہ قیمت ۔ ادبی پریس۔ میرٹھ۔

۱۰۔ شعرستان (مجموعہ کلام) از اختر شیروانی قیمت ۱۲ اردو اکیڈیمی لاہور

۱۱۔ آج کا مصر از محمد حسن الاعظمی عبد السلام خورشید ۲۰۱ صفحے قیمت ۔ اردو اکیڈیمی۔ لاہور۔

۱۲۔ میں ہوں خانہ بدوش از دلیندر ستیارتھی قیمت ۔ مکتبہ اردو۔ لاہور

۱۳۔ جلوہ گاہ (مجموعہ کلام) از محمود جالندھری ۲۵۰ صفحے قیمت ۔ مکتبہ اردو لاہور

۱۴۔ قوس (نظمیں) از مسعود اختر جمال قیمت ۔ مکتبہ ادبستان۔ پانڈے حویلی بنارس

۱۵۔ مضامین عظمت از محمد عظمت اللہ خاں مرحوم مرتبہ زبیدہ بیگم ۲۵۸ صفحے قیمت عالی سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدر آباد

۱۶۔ نشریات (ریڈیائی تقریریں) از پروفیسر ہارون خاں شروانی ۱۹۰ صفحے قیمت عالی۔ سید عبد القادر اینڈ سنز تاجران کتب حیدر آباد

۱۷۔ حج زینب (ایک نومسلم یورپین خاتون کا سفرنامہ حرمین شریفین) مترجمہ محسن بن شبیر ۹۶ صفحے مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدر آباد

۱۸۔ سیرت رسول (مصری ڈرامے کا ترجمہ) از ایڈیٹر روزنامہ ہند شیخ آبادی ۳۵۲ صفحے قیمت ۔ دفتر ہند ۱۳ ساگر دت لین کلکتہ

۱۹۔ نگاری (افسانے) از شاہد صدیقی الہ آبادی ۲۰۰ صفحے قیمت ۔ ادارہ ارم۔ سلطنت منزل۔ سیف آباد۔ حیدر آباد دکن۔

۲۰۔ آبشار (افسانے) از صابر کوسگوی ۲۰۰ صفحے قیمت ۔ ادارہ ارم سلطنت منزل سیف آباد۔ حیدر آباد دکن۔

۲۱۔ تذکرۂ ذاکرین دکن (دکن کے مرثیہ خوانوں کا باتصویر تذکرہ) مرتبہ محمد علی خاں ۲۳۲ صفحے قیمت ۔ شیر عالم پریس چادر گھاٹ۔ حیدر آباد۔

۲۲۔ نگار نامہ (خطوط) مرتبہ شاکر نظامی ۴۴ صفحے قیمت ۔ ادبی مرکز میرٹھ۔

۲۳۔ لائبریری اور اسکی تنظیم (باتصویر) از سید سجاد حسین رضوی ۱۹۲ صفحے رستوگی اینڈ کمپنی۔ میرٹھ۔

۲۴۔ نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث (بالتصویر) از مراد علی طالع ۴۴ صفحے قیمت ۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدر آباد

مرزا سیف علیخاں

تنقید و تبصرہ

نشریات:۔ از پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد۔ ۲۰۵ صفحات قیمت عال۔

اس کتاب میں پروفیسر صاحب موصوف کی وہ اٹھارہ تقریریں جمع کی گئی ہیں جو حیدرآباد کے محکمہ لاسلکی کی دعوت پر انھوں نے وقتاً فوقتاً کی ہیں۔ یہ مختلف موضوعوں پر ہیں لیکن زیادہ تر تاریخی اور سیاسی مباحث پر مشتمل ہیں۔ اور اگرچہ بعض موضوع کافی وقت طلب ہیں لیکن ہر تقریر میں پروفیسر صاحب نے اس امر کا التزام کیا ہے کہ زبان آسان اور عام فہم ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔ تمام تقریریں نہایت سلیقہ کے ساتھ تاریخ وار مرتب کی گئی ہیں۔ لیکن چھاپتے وقت اس امر کا خیال نہیں رکھا گیا کہ ہر تقریر کو ایک نئے صفحہ سے شروع ہونا چاہیے۔ مطبع کی اس لاپروائی کی وجہ سے کتاب میں ایک ایسا نقص پیدا ہو گیا ہے جو اس کی دوسری خوبیوں کو متاثر کرتا نظر آتا ہے۔

فن شاعری:۔ از ارسطو مترجمہ مولوی عزیز احمد صاحب بی اے آنرز لندن۔ ۱۱۵ صفحات ناشر انجمن ترقی اردو قیمت عہ

ارسطو کا مقالہ فن شاعری ادبیات عالم میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ تنقید نگاری کے اصول و ضوابط کی ترتیب اسی کی مرہون منت ہے۔ اگرچہ اردو ادب میں جگہ جگہ اس کتاب کا ذکر اور اس کے اقتباسات کے ترجمے نظر سے گزرتے ہیں لیکن ارسطو کی یہ پوری کتاب اب تک اردو میں مکمل حیثیت سے شایع نہیں ہوئی تھی۔ مولوی عزیز احمد صاحب نے اس کا بڑا اچھا ترجمہ کیا ہے اور اردو میں ادب عالیہ کی ایک ایسی کتاب کا اضافہ کر دیا ہے جس کے مطالعہ سے ہمارے نوآموز مصنفین ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔ انھوں نے ابتدائی ۴۴ صفحات میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں ارسطو کی اس معرکۃ الآرا کتاب کا تاریخی پس منظر اور افلاطون اور ارسطو کے نقاط نظر کے اختلافات کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ اور آخری حصہ میں ان ترجموں کا ذکر کیا ہے جو گزشتہ چند صدیوں میں مختلف زبانوں میں کئے گئے۔

اصل کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے جن میں شاعری کی قسمیں ٹریجڈی، رزمیہ شاعری، نقادوں کے اعتراض اور ان کے جواب وغیرہ کے اصول وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔ ترجمہ نہایت پاکیزہ اور دلچسپ ہے۔ ناظرین کی سہولت کے لئے مترجم نے حاشیہ پر ہر بحث اور نکتے کا عنوان اور بعض صورتوں میں مختصر خلاصہ سلسلہ وار لکھ دیا ہے جس کی وجہ سے کتاب کے پڑھنے اور اصل مباحث کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں حروف تہجی کے لحاظ سے ان تلمیحوں اور اشاروں کی تشریح کی گئی ہے جو ارسطو کی کتاب میں جگہ جگہ نظر سے گزرتے ہیں۔

الرق فی الاسلام یعنی اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ حصہ اول مولفہ مولانا سعید احمد صاحب ایم اے فاضل دیوبند مطبوعہ جید برقی پریس دہلی صفحات ۲۷۲۔

یہ کتاب سلسلۂ ندوۃ المصنفین دہلی کی تیسری کڑی ہے۔ اس میں غلامی کی حقیقت، اس کے نفسیاتی، اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا۔ پھر اسلام نے اس قدیم رواج کو کن مجبوریوں اور کن حالات کی وجہ سے باقی رکھا اور اس میں کیا کیا اصلاحیں کیں۔ اور ان سب سے اسلام کا اصل منشا کیا ہے۔ اس کے بعد مشہور مصنفین یورپ کے بیانات اور یورپ کی اجتماعی غلامی پر مفصل اور محققانہ تبصرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ابتدا میں ایک مقدمہ درج ہے جس میں غلامی کی تعریف اور اس کی اقسام نفسیاتی حیثیت اجتماعی. تمدنی اور اقتصادی پہلو مختصر طور پر بیان کئے گئے ہیں. پہلے باب میں غلامی پر ایک تاریخی نظر ڈالی گئی ہے اور مختلف اقوام عالم اور مذاہب عالم میں اس کو جو مقبولیت حاصل رہی اس کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں قرآن مجید میں جہاں جہاں اور جس طرح سے غلامی کا ذکر آیا ہے اس کو واضح کیا گیا ہے۔ اسی باب کے آخری حصہ میں آنحضرت پیغمبر اسلام اور صحابۂ کرام کے غلاموں کے ساتھ طرز عمل پر تبصرہ کیا گیا۔

تیسرا باب وسائل حریت و آزادی کے لئے وقف کیا گیا ہے اور تاریخ کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے غلاموں کو آزاد کرنے میں کتنی سہولتیں ہیں اور آزاد ہونے کے بعد خود غلاموں کی زندگیاں کس معیار پر گزریں۔

چوتھا باب غلاموں کے حقوق پر مشتمل ہے۔ اس میں بعض حصے بڑے دلچسپ ہیں۔ مثلاً غلام آزاد عورتوں سے شادی کرسکتا ہے. غلام کتنی عورتوں سے نکاح کرسکتا ہے. بعد کے دو ابواب میں غلاموں کے بارے میں اسلام اور مسیحیت میں جو فرق ہے اس کو واضح کرنے اور بعض اعتراضات کے جوابات دینے کی طرف توجہ کی گئی ہے۔

آخری باب یورپ کی اجتماعی غلامی پر لکھا گیا ہے۔ غرض پوری کتاب اس قابل ہے کہ سنجیدگی سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔ اور اس کی مدد سے اسلامی تمدن اور یورپی تہذیب کے بعض مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

فلم نما:- از نصیر الدین صاحب ہاشمی مطبوعہ شمس المطابع حیدرآباد۔ یہ چھوٹی سی کتاب سلسلۂ تالیفات ہاشمی کی پندرھویں کڑی ہے۔ اور فلم کے متعلق اصلاحی اور تنقیدی مضمونوں کا مجموعہ۔ ادھر کچھ عرصہ سے فلمی رسالے بڑی مقبولیت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی رنگین اور سادہ تصویروں کی کثرت ہوتی ہے۔ لیکن فلمی پرچوں کے ایڈیٹروں کو سنجیدہ مضمون نگاروں کی بڑی تلاش رہتی ہے اور ان کی وجہ سے بعض علمی و ادبی مقالہ نگاروں کو بھی فلموں کے دیکھنے اور ان پر مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے مولف کو بھی اسی کی شکایت ہے کہ انہیں خواہ مخواہ فلمی رسالوں کے ایڈیٹروں نے علمی و ادبی میدان سے گھسیٹ کر فلمستانی دنیا میں لا کھڑا کیا ہے۔ صحیح معنوں میں کسی فلم پر تنقید کرنا آسان کام نہیں ہے۔ فلمی رسالوں کے اکثر مضامین جانب داری اور مضمون نگاروں کے شخصی رجحانات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہاشمی صاحب نے بعض مضمون ایسے لکھے ہیں جن کے مطالعہ سے اداکاروں اور ادا آموزوں اور کمپنی کے مالکوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

سالنامۂ نظامیہ:- مرتبہ مولوی ابوالخیر صاحب کنج نشین مولوی فاضل نظامیہ۔ مطبوعہ شمس الاسلام پریس صفحات ۱۹۶۔

مدرسۂ نظامیہ کے طلبائے قدیم نے ایک ادارہ ترقی تعلیم اسلامی قایم کیا ہے جس کی طرف سے مجلۂ نظامیہ ہر مہینے شایع ہوا کرتا ہے۔ یہ اسی کا سالنامہ ہے جو مدرسہ نظامیہ کے یوم تاسیس کے موقع پر شایع کیا گیا ہے۔

اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ درس گاہ نظامیہ کو حیدرآباد میں اسلامی علوم و فنون کی اشاعت اور مذہبی ذوق کے پھیلانے میں کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں حیدرآباد میں جو علمی چہل پہل رہی اس کا بھی یہ سالنامہ ایک مناسب اندازہ پیش کرتا ہے۔ اس کے بعض مضامین بجائے خود چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں

محدثین کرام کا حافظہ۔ تجوید اور قرأت کی تعریف۔ آزادیٔ نسواں اور مسئلہ حجاب زبان عربی اور اس کی اہمیت اور جامعہ نظامیہ کی تاریخ وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن کے مطالعہ سے کافی اور ضروری معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق :۔ مولفہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سہواروی رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین۔ مطبوعہ جید برقی پریس دہلی صفحات ۴۴۴۔ قیمت للعہ

اس کتاب میں اخلاق کے اصول اس کی قسمیں اور فلسفہ کے تمام گوشوں پر دلچسپ انداز میں بحث کی گئی ہے اور اسلامی اخلاق کی علمی تشریح کرکے اس کی برتری نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ علم و تحقیق کے معیار پر دوسری ملتوں کے اخلاقی ضوابط سے مقابلہ کرکے واضح کی گئی ہے۔

پہلا باب اخلاق کے نفسیاتی مباحث پر مشتمل ہے اس میں کردار کے مبادیات اور عادت کی خصوصیتیں اس کی قوت اور اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔ اسی سلسلے میں وراثت۔ ماحول اور ارادہ کی ذیلی سرخیاں دے کر ان کے تحت متعلقہ مضامین شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ آخر میں خلق اور وجدان کی نسبت مفید معلومات درج ہیں۔

دوسرا باب علم اخلاق کے نظریوں اور اس کی تاریخ کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف نظریئے پیش کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی نظریوں کا علمی زندگیوں سے کیا تعلق رہتا ہے اس کے بعد یونان قرون وسطیٰ مسیحیت اور اسلام کی اخلاقیاتی تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈالی گئی ہے

تیسرا باب عمل اخلاق سے بحث کرتا ہے۔ اس میں پہلے فرد کا تعلق جماعت کے ساتھ قانون اور رائے عامہ آزادی مطلق، حق ملکیت اور عورت کے حقوق جیسے موضوعوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عورت کے حقوق کے سلسلے میں مولف نے عہد ماضی عہد متوسط اور اسلامی عہد کی خصوصیات کا دلچسپی سے مقابلہ کیا ہے۔ اس کے بعد اخلاق کے دوسرے اجزا مثلاً شجاعت، عفت، عدل، میانہ روی اور وقت کی حفاظت جیسے موضوعوں کو پیش کرنے کے بعد اخلاقی امراض اور ان کے علاج بیان کئے ہیں یہ حصہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔

چوتھا باب اخلاق سے متعلق اسلام اور علمائے اسلام کے نظریوں کی وضاحت اور ان کی نسبت مفید معلومات کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ اس کا آخری حصہ جو اخلاق اسلامی کے عملی مظاہر سے بحث کرتا ہے تاریخی شواہد کی وجہ سے بہت دلچسپ ہو گیا ہے۔

کیا خوب آدمی تھا :۔ ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی صفحات ۱۴۱ قیمت ۸ر۔ اس چھوٹی سی کتاب میں ہندستان کے گیارہ سیاسی و ادبی مشاہیر سے متعلق وہ تقریریں شامل ہیں جو آل انڈیا ریڈیو سے ۱۹۴۱ء کے اواخر و ۱۹۴۲ء کے اوائل میں نشر کرائی گئی تھیں۔ اردو کے ادیبوں میں راشد الخیری، الطاف حسین حالی، نذیر احمد اور پریم چند۔ شاعروں میں داغ، چکبست اور اقبال اور دیگر مشاہیر میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور سر راس مسعود سے متعلق چشم دید حالات اور خانگی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ مضمون نگاروں میں اکثر مشاہیر اہل قلم مثلاً ــــ مولانا عبدالماجد، ملا واحدی بے خود دہلوی، خواجہ غلام السیدین اور پنڈت کیفی شامل ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ آل انڈیا ریڈیو نے یہ سلسلہ قایم کرکے اردو ادب میں چند نئے اور دلچسپ مضامین کا اضافہ کر دیا لیکن ان کی اشاعت سے قبل حالی پبلشنگ ہاؤس کو چاہیے تھا کہ وہ اصل مضمون نگاروں کے یہاں ان تقریروں کو نظر ثانی کے لئے روانہ کرتا۔

ممکن ہے کہ بعض ایسی ضروری باتیں اس میں شامل ہو جاتیں جو ریڈیو کی ضرورتوں اور وقت کی تحدید کی وجہ سے لکھتے وقت شامل نہ ہو سکیں یا لکھنے کے بعد محکمۂ ریڈیو کے احتساب کی زد میں آ گئیں۔ کتاب میں کتابت اور طباعت کی بھی بے حد غلطیاں اور خامیاں نظر آتی ہیں اور ایک کمی جو زیادہ محسوس ہوتی ہے یہ ہے کہ جملہ مشاہیر کی تصویریں بارہا چھپ چکی ہیں اور اس کتاب میں بھی بآسانی شریک کی جا سکتی تھیں جن کی وجہ سے کتاب کی دیدہ زیبی اور افادیت میں اضافہ ہو جاتا خاص کر جب کہ ان تقریروں میں ان مشاہیر کے عام طور پر شخصی اور خانگی حالات اور زندگی کے پہلو پیش کئے گئے ہیں۔

ہندستانی کھیل

از مولوی خواجہ الطاف علی صاحب نگران تربیت جسمانی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ صفحات ۱۸۰۔ قیمت عہ

یہ کتاب ان ہندستانی بچوں کے لئے لکھی گئی ہے جن کی عمر سات اور چودہ سال کے درمیان ہے۔ اور اس کو لکھتے وقت اس امر کا خیال رکھا گیا ہے کہ ایسے کھیلوں کی تفصیل نہیں کی جائے جن کے لئے کسی خاص ساز و سامان کی ضرورت نہ پڑے اور جو بہت معمولی سامان کے ساتھ کم سے کم صرفہ میں کسی جگہ بھی کھیلے جا سکتے ہیں۔

مختصر سے دیباچہ کے بعد مولف نے ہمارا جسم اور اس کی دیکھ بھال کے عنوان سے بعض نہایت مفید اور ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔ اس میں جسمانی تربیت کی تاریخ اور طریقے اور کھیل سکھانے کے نئے ہدایتیں لکھی ہیں۔

اصل کتاب چھ عنوانات پر مشتمل ہے۔ پہلے دیسی کھیل بیان کئے گئے ہیں۔ اور ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو بہت ہی دلچسپ اور مفید ہیں۔

دوسرے باب میں دائرے کے کھیل سمجھائے گئے ہیں۔ ہر کھیل کی وضاحت کے لئے بڑی اچھی تصویریں اور نقشے اتارے گئے ہیں۔ جن کو دیکھ کر بچے آسانی کے ساتھ پورا کھیل سمجھ سکتے اور کھیل سکتے ہیں۔ آخری تین باب چھوٹے کے کھیل۔ انفرادی کھیل اور دوڑوں پر منحصر ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں ورزش کی اصطلاحات اور طبی معائنے کے فارم وغیرہ شریک کئے گئے ہیں۔ پوری کتاب اس قابل ہے کہ اس کا بچے اور بوڑھے دونوں مطالعہ کریں اور ہر اس گھر میں اس کا ایک نسخہ منگا کر رکھا جائے جس میں سات برس سے زیادہ عمر کے بچے اور بچیاں موجود ہیں۔

ادارہ کی خبریں

ادب اطفال ادارہ کی مجلس ادبیات اطفال کا ایک اجلاس ۹ر جون ۱۹۴۲ء کو شام کے ساڑھے پانچ بجے بصدارت محترمہ رقیہ بیگم صاحبہ منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور، محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ ایم اے، خواجہ حمید الدین صاحب بی اے اور مولوی میر حسن صاحب ایم اے معتمد نے شرکت کی حسب ذیل امور باتفاق آرا طے پائے۔

۱۔ "عربستان" کا مسودہ خواجہ حمید الدین صاحب مہتمم ادارہ کے حوالہ کیا جائے تاکہ بقیہ تصویروں کے وصول ہوجانے پر طباعت کا کام شروع کردیا جائے۔

۲۔ لطیف النسا بیگم صاحبہ کی نظموں کا مجموعہ موصوفہ کو واپس کردیا جائے تاکہ تمام نظموں کو دو مجموعوں کی شکل میں مرتب کرکے تصویروں کی وضاحت کے ساتھ طباعت کے لئے روانہ فرمائیں۔

۳۔ عربستان کی طرح حیدرآباد پر بھی مولوی فیض محمد صاحب یاکسی اور اہل انشا پرداز سے ایک کتاب لکھوائی جائے۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے مشہور تاریخی اصلاح اور مشہور مقامات کے بارے میں بھی بچوں کے لئے اچھے لکھنے والوں سے چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھوائی جائیں۔

۴۔ متین صاحب کی نظموں کا مجموعہ معتمد شعبہ اپنی رائے کے ساتھ ڈاکٹر زور صاحب کے پاس بھیج دیں گے تاکہ ڈاکٹر صاحب اس بارے میں کوئی قطعی تصفیہ فرمادیں۔

۵۔ ٹیپو سلطان کے بارے میں طے پایا کہ مسودہ مصنف کو واپس کردیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرا مسودہ بچوں کی دلچسپی نقطۂ نظر اور سمجھ بوجھ کو پیش نظر رکھ کر تیار کریں۔

۶۔ طلسمی انگوٹھی کا مسودہ معتمد شعبہ کو نظرثانی کے لئے دیا گیا۔

۷۔ تنظر صاحب کی نظموں کا مجموعہ معتمد شعبہ لطیف النسا بیگم صاحبہ کے پاس نظرثانی کے لیے روانہ کریں۔

۸۔ بچوں کے لئے معتمد شعبہ مختلف ہم عصر شاعروں کے کلام سے ایک ایک یا دو دو منتخب نظموں کا ایک مجموعہ مرتب کرکے ڈاکٹر زور صاحب کی خدمت میں پیش کریں۔

۹۔ محترمہ لطیف النسا بیگم کی رائے میں نغمۂ معصوم کی بیشتر نظمیں زبان اور خیال دونوں اعتبار سے بچوں کے لئے ناموزوں ہیں اس لئے مسودہ خواجہ حمید الدین صاحب کو دیا گیا تاکہ مصنف کو نظرثانی کے لئے واپس کریں۔

۱۰۔ مولوی بادشاہ حسین صاحب سے شجاع احمد صاحب فائد کے مسودہ بابت جنت کے بارے میں تحریری رائے حاصل کی جائے۔

۱۱۔ مہندر راج صاحب سکسینہ کو لکھا جائے کہ وہ کتاب "سانپ" کا مسودہ جلد روانہ فرمائیں۔

۱۲۔ مولوی خواجہ حمید الدین صاحب نے مجلس ادبیات اطفال کی آمد و خرچ کا حساب کتاب پیش کیا جس کو مجلس نے پوری طرح اطمینان بخش پایا۔

اردو امتحانات ادارہ کے شعبۂ اردو امتحانات کی ذیلی کمیٹی کا ایک اجلاس ۱۶ر جون ۱۹۴۲ء کو بصدارت عالیجناب مولوی سجاد مرزا صاحب نائب صدر شعبۂ اردو امتحانات عثمانیہ ٹریننگ کالج میں منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، مولوی عبدالقادر صاحب سروری اور خواجہ حمید الدین نے شرکت کی۔ اردو زباں دانی کے امتحان کے لئے ممتحنین کا انتخاب عمل میں آیا۔ آئندہ سال کے لئے زباں دانی کے امتحان میں قواعد اردو حصہ اول مرتبہ محمد اسمٰعیل کی بجائے قواعد اردو و انشا پردازی حصہ اول مطبوعہ نولکشور پریس شریک نصاب کی گئی مجلس انتظامی میں پیش کرنے کے لئے یہ تحریک منظور کی گئی کہ اردو عالم کے امتحان میں خوش نویسی کا پرچہ جو بطور مضمون اختیاری رکھا گیا ہے اس کا نام خوش خطی رکھا جائے۔ امتحان خوشنویسی کے دوسرے ممتحن کا انتخاب عمل میں آیا۔ مجلس انتظامی اردو امتحانات کی ایک رکن محترمہ مس حسینی سندی کی وفات حسرت آیات پر قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

ظہیرآباد میں اردو کا کام:۔ ۱۵ر مئی ۱۹۴۲ء سے ادارے کے

شعبہ طلبہ کے ایک دار المطالعہ کا قیام کیا گیا ہے۔ جس میں ہر روز تقریباً بیس پچیس طلبہ مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ مدرسین اور دیگر حضرات بھی اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔

صدر مدرس صاحب مدرسہ کی مہربانی سے فی الوقت مدرسہ کے ایک علٰحدہ کمرے میں اس کا انتظام کیا گیا ہے۔ مختلف حضرات سے پرانے رسالے اور کتابیں فراہم کی گئی ہیں جن کی تعداد تقریباً ایک سو سے زائد ہے۔ جناب تحصیلدار صاحب اپنی مہربانی سے "رہبر دکن" "رسالہ مولوی" "شہاب" "تفسیر القرآن" عنایت فرماتے ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب قادری نے شہاب نامہ جاری کروایا ہے اور چار چھ حضرات نے بھی ایک ایک رسالہ ادارہ کے نام جاری فرمانے کا وعدہ کیا ہے

اردو دانی کے لئے دس امیدوار اور زبان دانی کے لئے آٹھ امیدوار اس سال تیار ہو سکتے ہیں۔

خانہ پور میں جلسۂ تقسیم اسناد نسواں

۲۲ مئی ۱۹۴۲ء ۵ بجے شام کو بہ مکان مسٹر سید نور الدین صاحب بی اے ایل ایل بی تحصیلدار جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا جلسہ کا آغاز آیات قرآنی کی تلاوت سے ہوا۔ کامیاب شدہ طالبات کو اسناد تقسیم کئے گئے اور امتیازی کامیاب شدہ لڑکیوں کو انعامی کتب دئے گئے امتیازی طور پر امتحان اردو دانی میں چھ لڑکیوں نے کامیابی حاصل کی تھی ادارہ کی جانب سے ان لڑکیوں کو انعام دینے سے ہمت افزائی و ترغیب کا باعث ہوا ہے۔ بعد تقسیم انعامات محبوب بانو نامی ایک لڑکی نے اپنی جانب سے شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک مختصر تقریر کی۔ اس کے بعد خیر النسا بیگم نے اردو زبان کی خوبیوں پر تقریر کی اور سب سے آخر میں صدر جلسہ مسٹر سید نور الدین صاحب نے حسب ذیل صدارتی تقریر کی۔ اس کے بعد اردو دانی کی طالبات نے شاہ ذیجاہ حضرت سلطان العلوم کے لئے دعائیہ نظم پڑھی اور جلسہ ٹھیک سات بجے برخواست ہوا۔

تقریر صدارت مسٹر سید نور الدین صاحب تحصیلدار

میری عزیز بہنو اور بچیو۔ آج مجھے ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے تقسیم اسناد کے لئے اس جلسہ کی صدر مقرر کر کے اپنی خدمات پیش کرنے کا موقع دے کر مشکور کیا گیا ہے۔ اس خدمت کا انجام دینا میں خود بھی اپنے لئے قابل فخر سمجھتی ہوں۔ اردو کی ہر خدمت بالخصوص ایسے زمانہ میں جب کہ زبان اردو ایک مستقل زبان ہو کر قدیم زبانوں کے مقابل ایک وسیع زبان کہلانے کی مستحق ہو گئی ہے ایسے حالات میں اس کو کسی جانب سے کوئی دھکا پہنچنے سے بچانا یقینی ہمارا فرض ہے نہ صرف یہی بلکہ اردو زبان کی ترویج اور اس کو پھیلانے میں ہماری کوشش کبھی کمزور نہ ہونی چاہئیں ہندوستان میں حیدرآباد کی حیثیت اردو کو ترقی دینے میں امتیازی اور خصوصی ہے اس لئے بھی حیدرآباد کے ہر تعلیم یافتہ شخص پر اس کی ذمہ داری ہے کہ زبان اردو کو ہر دل عزیز بنانے میں ممکنہ کوشش کرے اور جہاں تک ہو سکے اپنے عزیز ناواقف کار بھائیوں اور بہنوں کو زبانِ اردو کے سکھانے میں دریغ نہ کریں اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے جہاں جہاں جس قدر امکانات اجازت دیتے ہوں اردو کی مدد میں ہاتھ بٹایا کریں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اردو کے جاننے والوں کی نہ صرف حیدرآباد میں بلکہ تمام ہندوستان اور دیگر ممالک میں ایک شدید ضرورت محسوس کی جائے گی کیونکہ یہی ایک ایسی زبان ہے جس کے ذریعہ سے ہندوستان کی ہر قوم اور ہر فرقہ کی ضرورت پوری ہوتی ہے اور ہر زبان کا آدمی اس کی مدد سے بلا کسی تکلیف کے اپنا مفہوم ادا کر کے اپنی روزمرہ کی زندگی میں تکمیل ضروریات کے متعلق جو سہولتیں پاتا ہے وہ کسی اور زبان کے ذریعہ ناممکن ہیں کہ پوری ہو سکیں۔ میں خدا کا شکر ادا کرتی اور اپنے دل میں مسرت محسوس کرتی ہوں کہ اس خانہ پور جیسے چھوٹے سے مقام پر بھی زبان اردو سے محبت رکھنے والی آپ جیسی قابل قدر ہستیاں موجود ہیں۔ اب میں ان عزیز بچیوں اور خواتین کو مبارکباد دیتی ہوں۔ جنہوں نے اردو کی تعلیم پا کر کامیابی حاصل کی ہے۔ اور بالخصوص

ان خواتین اور بچیوں کو جو امتیازی طور پر کامیاب ہو کر انعامات حاصل کئے ہیں۔ اس کے بعد میں آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتی ہوں کہ امتحان کا کامیاب کر لینا ہی کسی زبان کے ماہروں میں شریک ہونے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی مطالعہ جاری رکھنا اور معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہنا ضروری ہے کہ کچھ عرصے میں آپ کی معلومات وسیع ہو کر اردو کی دنیا میں آپ کا درجہ بلند ہو جائے اب آخر میں میں اپنے شاہ ذیجاہ حضرت سلطان العلوم اور ان کے شہزادوں اور شہزادیوں کی سلامتی کی دعا کرتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ سب میرے ساتھ اس دعائے خیر میں شریک رہیں گی۔

ادارۂ ادبیات اردو اورنگ آباد میں ۱۱ رجون سنہ ۴۲ء

روز پنجشنبہ ۹ بجے شام کو قیام شاخ ادارۂ ادبیات اردو کا جلسۂ عام بمقام ٹاؤن ہال بصدارت عالیجناب سید علی اصغر صاحب بلگرامی صوبہ دار اورنگ آباد منعقد ہوا۔ پروفیسر مولوی سید احمد صاحب ندوی لکچرار کالج نے تحریک صدارت کرتے ہوئے فرمایا کہ "بلحاظ نوعیت جلسہ جس کا مقصد خالص علمی اور ادبی ہے اور اس کا کام عوام میں ذوق پیدا کرنا ہے اس کی صدارت کے لئے بھی ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جس کو فطری ذوق علم و ادب ہو اس چیز کو میں نواب صوبہ دار صاحب بہادر میں کامل پاتا ہوں جو لحاظ عہدہ و فرائض اس صوبہ کے حاکم مقتدر ہیں جن کے ذمہ رعایا کی فلاح و بہبودی ہے اور اس میں علم و ادب کی سعی بھی داخل ہے لہذا نواب صاحب ممدوح کی صدارت کی تحریک کرتا ہوں"۔

جناب رائے چھوٹے لال صاحب ساہو اورنگ آباد نے تحریک کی تائید کی۔ نواب صاحب کے کرسئ صدارت پر رونق بخشنے کے بعد مولوی غازی معین الدین صاحب وکیل نے رسم گلپوشی ادا کی اور ادارہ کے مختلف شعبوں کے اغراض و مقاصد بتلاتے ہوئے ادارہ کی کارگزاری کا خلاصہ پیش کیا اور کہا کہ یہ سب اس کے بانی جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی پُرخلوص سعی و دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ امتحانات منشی فاضل و مولوی فاضل کے مماثل اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات جاری کئے جن کی وجہ سے ملک کے ہونہار طلبہ جو کسی مجبوری کی وجہ جامعہ یا مدارس کے امتحانات میں شریک و کامیاب نہیں ہو سکتے ادارہ کے ان امتحانات کو بلا کسی ہرج کار قلیل عرصہ کی خانگی تیاری میں کامیاب کر سکتے ہیں۔ ان کو اسناد اور انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔ یہ ادارہ مسلمہ سرکار بھی ہونے کی توقع ہے اورنگ آباد جیسے تاریخی مقام پر اس کی شاخ نہ ہونے سے بڑی کمی محسوس کی جا رہی تھی خصوصاً اس لئے بھی کہ یہ کسی زمانہ میں گہوارۂ علم رہ چکا ہے اور اب بھی علماء او علم و ادب و شعر و سخن کا ذوق کچھ کم نہیں ہے ایں وجہ ادارہ کی شاخ کی ضرورت ہے" اس مختصر تقریر کے بعد قیام شاخ کی تحریک پیش کی جس کی تائید جناب مولوی سروش صاحب لکچرار کالج نے کی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔ پروفیسر محمد ابراہیم صاحب لکچرار کالج نے یورپ کی علمی ترقی کے اسباب بحوالہ تاریخ بتلاتے ہوئے انسائیکلوپیڈیسٹس کی کارگزاری کا ذکر کیا بالخصوص ویدرو کا جس نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا اور بصارت بھی نذر کر دی تھی دنیا نے اس کے اس علمی کارنامۂ عظمیٰ کے مقابلہ میں سر جھکا دیا۔ اسی طرح حیدرآباد میں اردو انسائیکلوپیڈیا کا کام ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے شروع کر کے ملک پر احسان عظیم کیا اور ادب میں وہ چیز داخل کر دی جس کی اردو کو سخت ضرورت تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کے سر پر حقیقی معنیٰ میں تاج رکھ دیا۔ ڈاکٹر صاحب اگرچہ کہ عمر سے بہت جونیر ہیں لیکن ان کے اس بے پناہ انہماک اور پُرخلوص سعی کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ ایسے ادارہ کے مشاغل علمی و ادبی کی ترقی کے لئے ہمارے اورنگ آباد میں بھی کام ہونا ضروری تھا۔ اور یہاں کی شاخ کے لئے ایک سرپرست کی بھی ضرورت ہے جس کی رہنمائی میں اس کو استحکام بھی حاصل ہو اور جس کے سرپرستانہ ہاتھوں میں یہ پروان چڑھے۔ میں شاخ کی سرپرستی کے لئے معزز صدر جلسہ نواب صوبہ دار صاحب کو موزوں پاتا ہوں جن کا ذوق علم نہایت اچھا ہے اور جنھوں نے برسوں مہینوں مطالعہ کیا ہے اور اب بھی جاری ہے۔ معلومات

نہایت وسیع ہیں جذبۂ عمل بدرجۂ اتم رکھتے ہیں۔ ممدوح سے میری مودبانہ
درخواست ہے کہ اس کی سرپرستی کو قبول فرمائیں۔" اس کی تائید پروفیسر
مولوی سید احمد صاحب ندوی نے فرمائی۔ نواب صاحب نے شرف قبولیت بخشا۔

چونکہ شاخ کے سرپرست عالیجناب نواب شہاب الدین صاحب
اول تعلقدار اور عالیجناب پرنسپل صاحب کالج بھی ہیں اس لئے محرک صاحب
نے اس قدر ترمیم کی کہ نواب صوبہ دار صاحب شاخ کے سرپرست اعلیٰ رہیں گے۔
ترمیم کی تائید بھی تحریک کے موید صاحب نے کی اور بالاتفاق منظور ہوئی۔
زاں بعد پروفیسر ابراہیم صاحب کی تحریک پر حسب ذیل مجلس انتظامی کا
انتخاب عمل میں آیا۔

آخر میں بانیٔ جلسہ مولوی غازی معین الدین صاحب نے حاضرین
کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا خصوصاً نواب صاحب کا جنھوں نے صدارت کو قبول
فرمایا اور زحمت گوارہ کی۔ جلسہ ۷ بجے شام کو برخاست ہوا۔

مجلس انتظامی:-

(۱) صدر۔ عالیجناب محمد عثمان صاحب صدر مہتمم تعلیمات
(۲) نائب صدر۔ " رائے چھوٹے لال صاحب
(۳) معتمد۔ غازی معین الدین صاحب
(۴) خازن رائے چھوٹے لال صاحب

اراکین۔ پروفیسر غلام طیب صاحب لکچرار کالج۔ سروش صاحب لکچرار
کالج۔ عبدالرب صاحب کوکب لکچرار کالج۔ سید احمد صاحب ندوی لکچرار کالج۔
محمد ابراہیم صاحب لکچرار کالج۔ شرف الدین صاحب ہیڈ ماسٹر وسطانیہ
محمد علی صاحب منتظم کلب۔ جناب محمد یحییٰ صاحب منتظم صوبہ داری معتمد ادبستان
اصغر علی صاحب وکیل۔ محمد صدیق صاحب کنٹرولر اسلکی۔ محمد امیر صاحب
لکچرار نارمل اسکول۔

تقریر صدارت جناب صوبہ دار صاحب اورنگ آباد | حضرات۔ مرکزی
ادارۂ ادبیات اردو تقریباً دس سال سے خاموشی کے ساتھ
ملک کی جو خدمات انجام دے رہا ہے اس کا احساس و اعتراف اب
بیرون جات میں بھی ہونے لگا ہے۔ خوش قسمتی سے اس کو چند
ایسے کارکن مل گئے ہیں جن میں ذوقِ ادب اور جوشِ عمل
بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کے موسس ڈاکٹر زور کی نسبت
ایک شاعر نے اپنے وارداتہائے قلبیہ کا یوں اظہار کیا ہے۔

کام سے رسم و راہ رکھتا ہے　　جذبۂ بے پناہ رکھتا ہے
توڑ لانے کو ایک دن تارے　　آسماں پر نگاہ رکھتا ہے

اورنگ آباد میں اس ادارہ کی شاخ کے قیام سے ایک بڑی کمی
پوری ہو گئی۔ اس شاخ کو قائم کرکے جو ذمہ داریاں آپ نے قبول
کی ہیں امید ہے کہ بوجہ احسن ان کو پورا کرنے میں بلالحاظ قوم و ملت
آپ لوگ حصہ لیں گے اور اردو زبان و ادب کی ایسی ٹھوس خدمات
انجام دیں گے جو اورنگ آباد کے تاریخی روایات کے شایان شان ہوں۔"

بالانگر میں جلسۂ تقسیم اسناد | بالانگر میں ۳ر مئی سنہ ۴۲ء شنبہ کو
ایک جلسۂ عام بصدارت مسٹر کنول پرشاد جیسوال منعقد کیا گیا جس میں مقامی
علم دوست حضرات نے شرکت کی۔ مولوی شرف الدین صاحب اختر نے قیام
شاخ کی تحریک پیش کی۔ اس کی تائید میں مولوی حرمت علی صاحب مظہر صدر
مدرس نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور بغلبۂ آرا تحریک منظور ہوئی۔ جناب صدر نے
صدارتی تقریر میں فرمایا کہ

"مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ اکثر نوجوان اس ادارہ کا تعاون
کر رہے ہیں جو حقیقی معنوں میں سچا رہبر کہلانے کا مستحق ہے۔ ایسے
زمانے میں بالخصوص ملک اور قوم کو ایک ٹھوس کام کرنے والے ادارے
کی ضرورت تھی۔ خدا نے ہمیں ایک ایسا ادارہ عطا فرمایا جو نہایت خاموشی
سے قیمتی ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ قابلِ مبارکباد ہیں
جناب زور صاحب جنھوں نے اپنی انتھک کوششوں سے اس ادارہ
کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ ہمیں امید ہے کہ اس ادارہ کی موجودگی
میں ملک اور قوم دولت علم سے مالا مال نظر آئے گی۔"

شاخ کے لئے حسب ذیل عہدہ دار بغلبۂ آرا منتخب ہوئے۔

صدر۔ مسٹر کنول پرشاد جیسوال کنول

معتمد۔ مسٹر حرمت علی منظر صدر مدرس

شریک معتمد۔ مسٹر ڈی ونیکیا

اراکین انتظامی۔ مولوی خواجہ معین الدین صاحب۔ مسٹر ناگ لنگیا شیٹر۔ حکیم مسٹر رام لنگیا۔ مولوی عبدالصمد صاحب تاجر۔ مولوی محمد اشرف الدین صاحب اختر۔

کاماریڈی میں جلسۂ تقسیم اسناد ۲۲ مئی سنہ ۱۹۴۲ء روز جمعہ تقسیم اسناد ادارۂ ادبیات اردو کا جلسہ بصدارت مولوی محمود احمد صاحب مینائی منصف کاماریڈی منعقد ہوا۔ رعایا و ساہوکار و ملازمین سرکار و عملۂ تحصیل و منصفی وغیرہ نے شرکت کی۔ کافی تعداد میں اشخاص شریک جلسہ تھے۔ تشویق و دل افزائی کے اظہار کے بعد اسناد دیئے گئے۔ اور اعلیٰحضرت سلطان العلوم کی عمر و اقبال میں ترقی کے لئے دعا کی گئی۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب کی عدم شرکت کا افسوس رہا۔ وہ اس لئے کہ جس کوشش کے ساتھ انھوں نے کاماریڈی کے لوگوں کو ترغیب دلا کر ادارۂ ادبیات اردو کی مدد فرمائی اس کا نتیجہ دیکھنے کا یہی موقع تھا۔

شاخ پرلی کی اردو خدمات اہل دیہات کو اردو زبان کی اہمیت سے واقف کرانے اور اردو امتحانات کے لئے امیدوار فراہم کرنے کی غرض سے ۱۴ مئی سنہ ۴۲ء کی صبح کو مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد اور مولوی اشرف الدین صاحب فیضی دورہ پر روانہ ہوئے۔

گھاٹ ناندورہ ضلع بیڑ یہ اصحاب گھاٹ ناندورہ اور پانگاؤں ہوتے ہوئے رینا پور پہنچے۔ خوشی کی بات ہے کہ گھاٹ ناندورہ جیسے مقام پر بھی اردو امتحانات کے لئے امیدوار فراہم کئے گئے ہیں۔

رینا پور ضلع بیڑ رینا پور میں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ حسب ہدایت شاخ ہذا خوش اسلوبی سے کام ہو رہا ہے۔ مولوی سید عبدالرحمٰن صاحب اور مولوی سید شبیر علی صاحب نائب قاضی توجہ اور دلچسپی سے مصروف عمل ہیں۔ حسب خواہش معززین قصبہ اشرف الدین صاحب فیضی نے شاخوں کے قیام اور اس کے طرز کار اور اردو امتحانات پر روشنی ڈالی چنانچہ شاخ کا قیام بھی عمل میں آیا۔ مولوی غلام حسن صاحب صدیقی نے از راہ علم دوستی اردو دانی اور اردو عالم کی جلد کتابیں شاخ رینا پور کو عطا کرنے کا اعلان فرمایا۔

بردا پور ضلع بیڑ ۱۲ مئی سنہ ۴۲ء کو شاخ بردا پور کا معائنہ کیا گیا۔ پنڈت رنگنا تھ راؤ صاحب جوشی کی صدارت اور قاضی مولوی سید غیاث الدین صاحب کی معتمدی میں یہاں پر اردو زبان کی حقیقی تبلیغ اور اشاعت ہو رہی ہے۔ فیضی صاحب کی ترغیب سے معمر اور کمسن چرواہے تک رات میں آکر اردو سیکھ رہے ہیں۔ اس سال یہاں سے کثیر تعداد میں امیدوار شریک امتحان ہو رہے ہیں۔ اگر یہیں مرکز قایم ہو جائے تو یقین ہے کہ مزید امیدوار بھی شریک امتحان ہو جائیں۔

ہنگولی ضلع پربھنی ۱۳ مئی سنہ ۴۲ء کو صبح نو بجے معتمد صاحب اور مولوی اشرف الدین صاحب فیضی ہنگولی پہنچے۔ جناب مولوی مسعود حسن خاں صاحب غوری بی اے (عثمانیہ) بی۔ٹی (علیگ) سرپرست شاخ ہنگولی کے پاس قیام رہا۔ ادارۂ ادبیات اردو اور اس کے اردو امتحانات سے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ امید ہے کہ صاحب ممدوح کی توجہ سے مقامی شاخ بہت ترقی کرے گی۔ اسی دن مولوی عثمان خاں صاحب کمالی معتمد، مولوی ملک ذاکر صاحب نائب معتمد اور مولوی محمود علی صاحب یزدانی سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ شاخ کا کتب خانہ اور دار المطالعہ دیکھا گیا۔ ۱۴ مئی کو اردو دانی کی تعلیم پانے والے امیدواروں میں اکثر معمر لوگ بھی تھے۔ جس سے خوشی ہوئی۔ لیاقت علی خاں صاحب اور آدم علی خاں صاحب تعلیم دیا کرتے ہیں۔ معتمد صاحب کے دیوان خانے میں تدریس کا انتظام ہے۔ کمالی صاحب کا ایثار اور جذبۂ عمل قابل قدر ہے۔ مزید امیدواروں کی فراہمی کی کوشش کی گئی جو کامیاب ثابت ہوئی۔

بسمت نگر ضلع پربھنی ۱۵ مئی کو بسمت نگر پہنچے۔ مولوی فریدالدین صاحب وکیل کے پاس قیام رہا۔ دو دن مختلف علم دوست حضرات سے فرداً فرداً ادارۂ ادبیات اردو کا تعارف کرانے میں گزرے۔ آخر ۱۶ مئی کی رات میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ ادارہ اور اس کے امتحانات پر تفصیلی

روشنی ڈالی گئی۔ اور شاخ کا قیام عمل میں آیا۔ نمائندگان شاخ پہلی کی ترغیب سے بہت سارے امیدواروں نے شرکت امتحان پر آمادگی ظاہر کی۔ امید ہے مولوی فخرالحسن صاحب کی صدارت اور مولوی اسحاق الدین صاحب وکیل کی معتمدی میں یہ شاخ چل نکلے گی۔

مجلس انتظامی شاخ دھانورہ

۲۹ رمئی ۱۹۴۲ء کو بصدارت پنڈت دتاتری راؤ صاحب وکیل شاخ دھانورہ کی مجلس انتظامی منعقد ہوئی جس میں تقریباً جملہ اراکین شریک تھے۔ یہ طے پایا کہ مولوی محمد ریاض الدین صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ دھانورہ بزرگ (جو ادارہ ہذا کے رکن ہیں) کو معتمد شاخ منتخب کیا جائے۔ کیونکہ بوجہ تبادلہ سابق معتمد ناگو راؤ صاحب اب دھانورہ میں مقیم نہیں ہیں۔

شاخ روضتین گلبرگہ

اردو دانی، زبان دانی، اردو عالم و اردو فاضل کی تا طرخواہ تعلیم ہو رہی ہے۔ خصوصاً اردو فاضل و عالم کی کلاس بلاناغہ روزانہ دو مرتبہ لیجاتی ہے۔ مولوی نصیر الدین صاحب نے ادارہ کی جو خدمت کی، اس کا اندازہ خود امتحانات کے نتائج سے ہوسکے گا۔ صاحب موصوف ادارہ کے لئے اس سے زیادہ اور کیا ایثار کرسکتے ہیں کہ روزانہ ۸ گھنٹے کاروبار ادارہ اور اردو امتحانات کی تیاری کے لئے مختص کردیئے ہیں، اور خود ایک دور دراز مسافت کو طے فرما کر دن میں دو دفعہ ادارہ روضتین تشریف لا کر تعلیم سے بہرہ مند فرماتے ہیں۔ مولوی احمد عبدالعزیز صاحب بھی آج کل روزانہ کلاس لیکر اپنے کورس کی تکمیل فرما رہے ہیں۔ معتمد شاخ بھی اردو عالم کی کلاس لیکر جہاں تک ہوسکے امتحانات سے پہلے کورس کی تکمیل میں کوشاں ہیں۔ امتحان اردو زبان دانی میں طبقہ اناث سے بھی کچھ طالبات شریک ہو رہی ہیں۔

سیڑم میں شاخ ادارہ کا قیام

۲۰ رمئی ۱۹۴۲ء روز شنبہ بعد مغرب ادارۂ ادبیات اردو شاخ سیڑم کی مجلس انتظامی کے انتخاب کے لئے ایک جلسہ عام زیر صدارت پنڈت جگناتھ راؤ صاحب بی اے ایل ایل بی منصف منعقد ہوا جس میں معززین، تجار، وکلا اور عہدہ داران مقامی بھی شریک تھے۔ مولوی محمد ارادت اللہ خاں صاحب تحصیلدار سیڑم کے علاوہ مولوی حسن عطاء اللہ صاحب مددگار مہتمم پولیس گلبرگہ اور جناب سرکل انسپکٹر صاحب یادگیر نے بھی جو بسلسلۂ دورہ تشریف لائے تھے جلسہ میں شرکت فرمائی۔ شاخ سیڑم کی دعوت پر مولوی محبوب خاں صاحب یوسف زئی بی اے ڈپٹی معتمد ادارہ ادبیات اردو شاخ چیتاپور اور مولوی نورالحسن صاحب انور شاہ آبادی نے بھی اس جلسہ میں شریک ہو کر ارباب ادارہ کا ہاتھ بٹایا۔ عالیجناب منصف صاحب کے کرسئ صدارت پر فائز ہونے کے بعد مولوی شہاب الدین صاحب سوداگر نے زبان اردو اور مولوی سید نورالحسن صاحب انور نے ڈاکٹر زور کے عنوان سے نظمیں سنائیں۔ مولوی محبوب خان صاحب یوسف زئی نے زبان اردو کی تاریخ اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ادارۂ ادبیات اردو کے اغراض و مقاصد سے حاضرین کو روشناس کرایا اور دارالمطالعہ کے قیام اور اردو امتحانات کے ذریعہ تعلیم بالغاں کے مشکل مسئلہ کو حل کرنے پر ڈاکٹر زور اور ان کے رفقاء کار کو ملک و قوم کے شکریہ کا مستحق اور قابل مبارکباد ثابت کیا۔ محمد قاسم طالب علم نے انور کی نظم پیام سنائی جس کے بعد سید نورالحسن صاحب اردو فاضل نے اردو زبان کی خدمت کو قومی خدمت اور مقدس فریضہ قرار دیا اور عالیجناب تحصیلدار صاحب کی علم دوستی اور موصوف کی بیگم صاحبہ کی علمی دلچسپیوں کا حال بیان کر کے توقع ظاہر کی کہ یہاں شعبۂ نسواں بھی جلد سرگرم عمل ہوگا۔ قاضی خواجہ عطاء اللہ صاحب نے کیفی کی نظم "نوجوانوں کے نام پیام" ترنم سے سنائی بعد ازاں عالیجناب تحصیلدار صاحب نے حاضرین سے اپیل کی کہ وہ ایک حیدرآبادی کی حیثیت سے سوچیں اور شاہ ذیجاہ کی اردو نوازیوں اور جامعہ عثمانیہ کی برکات سے مالا مال ہوں اور جو بدنصیب دولت علم سے کسی نہ کسی وجہ سے محروم رہ گئے ہیں انھیں بھی اس دولت سے فیضیاب کریں۔ عبدالرشید صاحب طالب علم کی نظم خوانی کے بعد حسب ذیل انتخابات عمل میں آئے۔

صدر۔ عالیجناب پنڈت جگناتھ راؤ صاحب بی اے ایل ایل بی منصف عدالت۔

نائب صدر۔ مولوی عابد حسین صاحب بی اے پیشکار تحصیل سیڑم۔

معتمد۔ مولوی سید اکبر علی صاحب سررشتہ دار عدالت سیڑم

شریک معتمد۔ پنڈت گنڈے راؤ صاحب وکیل سیڑم۔

خازن۔ مولوی محمد امیر الدین صاحب سوداگر۔

اراکین مجلس انتظامی:۔ عالیجناب مولوی محمد ارادت اللہ خاں صاحب تحصیلدار تعلقہ سیڑم۔ سیٹھ رگھوناجی صاحب سوداگر۔ مولوی محمد مولانا صاحب وکیل۔ مولوی محمد عطاء اللہ صاحب قاضی۔ پنڈت کشن راؤ صاحب وکیل مولوی عبد القادر صاحب شطاری صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ سیڑم۔

انتخابات کے بعد عالیجناب منصف صاحب نے حسب ذیل پر مغز خطبۂ صدارت پڑھا۔ آخر میں مولوی عابد حسین صاحب بی اے پیشکار تحصیل سیڑم نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ مولوی محمد رکن الدین صاحب صدر مدرس اور مولوی سید اکبر علی صاحب سررشتہ دار کی مساعی جمیلہ کی بدولت یہ جلسہ بہت کامیاب رہا جس کے لئے ہر دو اصحاب مستحق مبارکباد ہیں۔

<u>خطبۂ صدارت پنڈت جگناتھ راؤ صاحب بی اے ایل ایل بی</u> | یہ امر باعث مسرت ہے کہ سیڑم میں عامۃ الناس کو ایک ادبی ادارہ کی شاخ قائم کرنے کا ارادہ ہوا۔ اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آج کا یہ جلسہ منعقد ہوا ہے۔ اس ادارہ کے اغراض و مقاصد کے متعلق فاضل مقررین نے اپنی تقریروں میں نہایت عمدگی سے وضاحت فرمائی ہے اور قیام ادارہ کی ضرورت کو اچھی طرح روشناس فرما دیا ہے۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام ایک ایسی زبان کی ترویج و اشاعت کا کام انجام پائے گا جس کو بہ مقابلہ دیگر مختلف زبانوں کے ایک مشترکہ زبان کی حیثیت ہندوستان میں حاصل ہے یہ زبان اردو ہے۔ یہ کسی خاص قوم یا حصہ ملک کی ملک نہیں ہے بلکہ تمام ہندوستان کی ایک قومی زبان ہونے کا درجہ اس کو حاصل ہے۔ اس کی ترقی و اشاعت میں حصہ لینا ہر ایک ہندوستانی کا فرض ہے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا فرد ہو کیونکہ یہ زبان ہند و مسلم اتحاد کا خوشگوار نتیجہ و یادگار ہے ایسی زبان کی ترقی و اشاعت کی کوشش فی زمانہ ہندوستان میں جاری ہے۔ اس ریاست ابد مدت میں اس کو خاص درجہ حاصل ہے۔ حیدرآباد میں زمانہ ماضی میں اردو کی ترقی و اشاعت میں کافی حصہ لیا گیا ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں ہندوستان کی مشترکہ زبان ہونے کے علاوہ ریاست حیدرآباد میں سرکاری زبان ہونے کا اس کو امتیاز حاصل ہے۔ اس کی ترقی کے لئے بادشاہ ذیجاہ سلطان العلوم نے شاہانہ نوازشات سے جامعہ عثمانیہ قائم فرمایا اور اس کے قیام کے بعد سے اس ریاست میں اس قلیل مدت ربع صدی میں اردو کی جو نمایاں ترقی ہوئی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ سیکڑوں طلبہ جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ ملک کے تعلیم یافتہ مؤلفین اور مصنفین کے لئے ایک مرکز کی ضرورت حیدرآباد کے بعض علم دوست حضرات نے محسوس کی اور جو نوجوان علم و ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں ان کی صحیح راستہ پر رہنمائی کرنے اور انکی تصنیفات و تالیفات کو طبع کر کے ان کی علمی و ادبی قوتوں کو بر سر کار لانے کے لئے ۱۹۳۱ء میں ایک ادارہ الموسوم بہ ”ادارہ ادبیات اردو“ بمقام بلدہ حیدرآباد قائم فرمایا اس ادارہ کا بنیادی مقصد یہ ہے اردو زبان و ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا جائے۔ حیدرآباد کی علمی و ادبی کوششوں کو اجتماعی شکل دی جائے۔ مقامی نوجوانوں کی قابلیت کو اجاگر کر کے ان میں اردو ادب کی خدمت کا شوق بڑھایا جائے۔ اور ملک کے قدیم شاعروں اور انشاء پردازوں کی یاد تازہ کر کے ان کے ادبی سرمایوں کو منظر عام پر لایا جائے۔

اس نیک مقصد کے تحت ادارہ بلدہ حیدرآباد میں گزشتہ دس گیارہ سال سے نہایت مفید کام کر رہا ہے تخمیناً ایک صد کتب مختلف علوم و فنون کی شائع کی گئی ہیں ادارہ کا ترجمان ”سب رس“ رسالہ جاری کیا گیا ہے۔ اور بچوں کے لئے ”پھلواری“ کا

"سب رس" بھی شائع ہورہا ہے نہایت خوشی کے ساتھ حیدرآباد
کے بعض علم دوست حضرات اس کو چلا رہے ہیں۔ اور اس ادارہ
کو ملک کے مائیہ ناز قابل افراد کی سرپرستی و اعانت اور ہمدردی
حاصل ہے اور اس ادارہ کا مستقبل نہایت درخشاں ہے اردو
زبان کی ترقی و اشاعت کی غرض سے اس ادارہ کی شاخیں مختلف
مقامات میں اس ریاست میں قایم ہوئی ہیں۔ اور ان کے ذریعہ
اچھا کام ہو رہا ہے۔ عام لوگوں کو اردو زبان کی تعلیم دینے
کے لئے جماعتیں کھولی جاتی ہیں۔ بلالحاظ مذہب و ملت اردو
کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اردو دانی۔ اردو عالم۔ اردو فاضل۔
خوش نویسی اور خطاطی۔ و کتابت میں امتحانات لئے جاتے ہیں۔
اور کامیاب شدہ امیدواروں کو ادارہ کی طرف سے سندیں
دی جاتی ہیں اور انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ مطالعہ کا ذوق
بڑھانے کے لئے دارالمطالعہ قایم کیا جاتا ہے۔

سیڑم میں ان اغراض کے لئے انتظام کرنا اور صحیح اصول
و طریقہ پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے یوں تو کسی ادارہ یا انجمن کے
قیام کے وقت ابتدا میں بہت کچھ بلند پروازی کیجاتی ہے۔
لیکن چند روز کے بعد وہ جوش و خروش باقی نہیں رہتا۔
اور کام کی رفتار بہت سست ہو جاتی ہے۔ ایسے کاموں
میں دشواریاں بہت کچھ لاحق ہوتی ہیں۔ لیکن مستقل مزاجی
ثابت قدمی سے دشواریوں کو رفع کر کے انجام دیں تو ضرور ہم کو
اپنے ارادے کی تکمیل میں کامیابی ہوگی۔ اس لئے
میری گذارش ہیکہ سیڑم میں اس ادارہ کے کام کو ابتداء
ہی سے نہایت مستعدی سے اچھی طرح چلانا چاہیے آغاز چھوٹے
پیمانہ پر کیوں نہ ہو۔ نہایت محنت۔ صداقت اور اتحاد و
اتفاق سے کام کیا جائے تو اس کے نتائج بہت عمدہ ہوتے
ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ میرے معزز دوست جناب مولوی ارادت اللہ
خاں صاحب تحصیلدار اور دیگر منتخبہ رفقار کار کی ہمدردی، توجہ اور
اعانت سے اس شاخ ادارہ کا کام سیڑم میں عمدگی سے چلے گا اور
اس کے اچھے نتائج رونما ہوں گے۔ یہ امر مخفی نہ رہے کہ میں ہر وقت
ہر طریقہ سے اس ادارہ کے کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے حتی المقدور
تیار رہوں۔

چیتاپور | مولوی غلام محمود خاں صاحب ڈویژن افسر و صدر ادارہ
ادبیات اردو شاخ چیتاپور ۴ جون ۴۲ء کو ادارہ میں تشریف لاکر
ایک گھنٹہ تک معائنہ فرماتے رہے۔ کتب خانے کے لئے دو الماریوں کے
بنوانے کا وعدہ فرمایا۔ سب رس معلومات کو جاری کرا دینے کا اور مرکز میں
اردو عالم میں اول آنے والے کو ایک نقرئی تمغہ عطا فرمانے کا وعدہ بھی
فرمایا۔ افسوس ہے کہ صاحب موصوف نے اپنے معائنہ کے ٹھیک ایک ہفتہ
بعد ۱۱ جون کو بعارضہ فالج وفات پائی۔ اور ادارہ کو ان کی بے وقت وفات سے
صدمہ پہنچا۔

برداپور | مولوی غلام حسن صاحب صدیقی اور مولوی اشرف الدین
صاحب فیضی نے ۸ مئی کو اس شاخ کا معائنہ کیا۔ ۸ جون ۴۲ء کو
مجلس انتظامی کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں شاخ کے رکن مسٹر پانڈورنگ
ساہو کے تین چار یوم کی علالت کے بعد انتقال کر جانے پر اظہار افسوس
کیا گیا۔ آنجہانی سے شاخ ہذا کی بہت سے امیدیں وابستہ تھیں۔ ان کی
جگہ مولوی احمد علی صاحب جاگیردار کا انتخاب رکنیت مجلس انتظامی پر
عمل میں آیا۔

رینا پور میں قیام شاخ ادارہ | اہالیان قصبہ کی خواہش
تھی کہ رینا پور میں بھی
ادارہ کی شاخ قایم کی جائے۔ چنانچہ بتاریخ ۶ مئی ۴۲ء کو گوبند راؤ
صاحب صدر مدرس کی صدارت میں ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا۔

مولوی غلام حسن صاحب صدیقی اردو فاضل (ادارہ) معتمد شاخ پرلی نے اردو زبان کی ابتدا اہمیت اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد جس کو ملک دکن کی مائیناز ہستی عالیجناب ڈاکٹر زور نے ۱۹۳۱ء میں چند علم دوست اصحاب کی مدد سے قایم فرمایا ہے آج گیارہ سال سے اردو زبان اور ادب کی خدمت میں خاموشی سے سرگرم عمل ہے اور آج ادارے کو نہ صرف حیدرآباد میں مرکزی حیثیت حاصل ہے بلکہ حیدرآباد کے باہر پورے ہندوستان میں اس کے کام کی شہرت ہے۔ ہمارے اس ادارے کو یہ فخر حاصل ہے کہ حضرت اعلیٰحضرت بہادر ولی عہد سلطنت آصفیہ اس کے سرپرست اعلیٰ ہیں اور عالیجناب نواب صاحب چھتاری صدر اعظم باب حکومت، عالیجناب نواب سالارجنگ بہادر اور عالیجناب راجہ شامراج راج ونت بہادر اسکی سرپرستی فرما رہے ہیں۔

تسہیل کار کی خاطر ادارے کے کام کو بارہ شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر شعبہ اپنے داعی اور بانی ادارہ کی رہنمائی میں سرگرم عمل ہے اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ قلیل مدت میں بلدہ سے باہر اضلاع میں جگہ جگہ اس کی شاخیں قایم ہو چکی ہیں۔ فاضل معتمد کی تقریر کے بعد مولوی اشرف الدین صاحب فیضی نے ادارے کی شاخوں کے قیام اور اس کے طرز کار اور اس کے اغراض و مقاصد پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی آپ نے فرمایا کہ ان بالغ اور معمر اشخاص کے لئے جو مدرسوں میں جاکر تعلیم حاصل نہیں کرسکتے جو اپنی درخواستیں اور خطوط تک لکھ پڑھ نہیں سکتے جن کو جاہل اور ان پڑھ کہہ کر ذلیل نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان بھائیوں کی دماغی و اخلاقی اصلاح و درستی کی خاطر ہمدرد قوم اور فخر وطن عالی جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ و بانی ادارۂ ادبیات اردو نے شعبۂ امتحانات قایم فرمایا ہے جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہر سال اس میں بلا تفریق مذہب وملت امیدوار شریک ہو رہے ہیں اور یہی اس شعبہ کا سب سے بڑا مقصد ہے چنانچہ بانی ادارہ کی اس خیر جاریہ کی بدولت پہلے سال ۱۹۴۰ء میں ۱۹۵ ان پڑھ اور جاہل افراد نے ناخواندگی اور جہالت کا ٹیکا اپنے ماتھے سے دور کیا اور دوسرے سال ۱۹۴۱ء میں ۴۲۵ ہندو مسلم اور کرسچن بھائی بہنوں نے اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔

شاخوں کا یہ کام ہے کہ اس مقبول عام و خاص سرکاری، کاروباری اور ہندو مسلم اتحاد کی واحد زبان اردو کی خدمت کریں۔ ادارے کے اردو امتحانات کا پرچار کریں۔ اور اس کے لئے امیدوار کو تیار کریں۔ خاص طور پر بالغوں اور معمر لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ اردو مطالعہ گھر قایم کر کے عوام کو اس سے استفادے کا موقع دیں۔ اس کے بعد فیضی صاحب نے نمونہ کا سبق دیا۔ جو نہایت کامیاب رہا۔ بعد ازاں باتفاق آرا شاخ کی مجلس انتظامی کا حسب ذیل انتخاب عمل میں آیا۔

صدر ۔ مسٹر گوبند راؤ صاحب صدر مدرس

نائب صدر ۔ مسٹر وتاتری بھجنگ راؤ صاحب پٹیل ۔

معتمد ۔ مولوی شبیر علی صاحب نائب قاضی

شریک معتمد ۔ مولوی عبدالرحمن صاحب

اراکین ۔ مسٹر گنپت راؤ صاحب پٹیل ۔ جناب الانور خاں صاحب شیخ امیر صاحب ۔ مسٹر نارائن راؤ صاحب پٹیل ۔ مولوی احمد محی الدین صاحب صدیقی ۔ محمد امجد الدین فاروقی ۔

آخر میں مولوی غلام حسن صاحب صدیقی نے غریب امیدواران اردو امتحانات کو نصابی کتب دینے کا وعدہ فرماتے ہوئے خسرو دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ و خاندانۂ آصفی کے لئے دعا مانگی اور جلسہ برخاست ہوا۔

سانگاؤں میں شاخ ادارہ کا قیام | ۱۲ جون ۱۹۴۲ء

قیام شاخ کے لئے معززین قصبہ ہذا نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ مولوی

اشرف الدین صاحب فیضی و مولوی شیخ حسین صاحب نے ادارۂ ادبیات اردو کے اغراض مقاصد اور شاخ کے طرز کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اردو امتحانات میں شرکت کی ترغیب دلائی۔ شاخ کی مجلس انتظامی کے لیے حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے۔ دارالمطالعہ کا بھی افتتاح آج ہی سے کیا گیا۔

صدر۔ سید رحیم الدین صاحب

معتمد۔ سید منصور علی صاحب

اراکین۔ خواجہ معین الدین صاحب، محمد شمس الدین صاحب سوداگر

شعبۂ طلبہ پرلی | شعبۂ طلبہ پرلی کے سرگرم رکن معتمد، نائب معتمد، شریک معتمد، نائب صدر وغیرہ نے امتحان جماعت ہشتم کامیاب کیا ہے اور اب یہ طلبہ بغرض تعلیم دوسرے مقامات کو چلے گئے ہیں۔ اس لئے شعبہ کے لئے حسب ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر۔ مولوی فخرالدین صاحب منشی فاضل صدر ادارہ ادبیات اردو پرلی

نائب صدر۔ محمد ہاشم کرمانی

معتمد۔ محمد نعیم الدین خطیب پرلی

خازن۔ محمد عبدالستار اختر

کتب خانہ دار۔ محمد نجم الدین متوحد

اراکین۔ محمد اظہرالدین صدیقی۔ سید غلام مرتضیٰ۔ واسدیو راؤ۔ محمد عبدالکریم۔ محمد سرور علی فنڈس ریلوے پرلی۔ محمد عبدالرحیم عبدالوکیل۔ محمد فصیح الدین معلم دست کاری پرلی۔ حبیب الدین۔ صدر معلم صاحبہ۔ اسداللہ حسینی ولد سید عظمت اللہ حسینی صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ پرلی۔

مشاعرہ | شعبۂ طلبہ کی جانب سے مدرسہ وسطانیہ پرلی میں ۲ محرم ۱۳۶۱ھ بصدارت مولوی فخرالدین صاحب منشی فاضل مشاعرہ منعقد ہوا طرح مصرعہ حسب ذیل تھا۔ "بزم جہاں سے جو گیا باچشم تر گیا"

شعبۂ طلبہ کی جانب سے معزز حضرات کو مدعو کیا گیا تھا۔ ۵۰ رقعے تقسیم کئے گئے تھے ۵ مہمانوں کے علاوہ اردو عالم کے امیدواروں نے بھی کافی تعداد میں شرکت کی معتمد ابوالظفر محی الدین نے گزشتہ کی روداد سنائی۔ تمام حضرات نے شعبہ کی خاموش ترقی دیکھتے ہوئے اظہار خوشنودی فرمایا اور ادارہ کو ترقی دینے کی کوشش کرنے کا وعدہ فرمایا۔

شاخ اورنگ آباد | ۲۵ رجون ۱۹۴۲ء روز پنجشنبہ ۱/۲ ۵ بجے شام بدولت خانہ پروفیسر محمد ابراہیم صاحب لکچرار کالج مجلس انتظامی کا معمولی اجلاس زیر صدارت عالیجناب پنڈت رائے چھوٹے لعل صاحب نائب صدر ادارہ منعقد ہوا۔ حسب ذیل معزز ارکان صاحبان مجلس انتظامی نے شرکت فرمائی۔

۱۔ نائب صدر۔ پنڈت رائے چھوٹے لعل صاحب

۲۔ معتمد۔ نمازی معین الدین صاحب

ارکان۔ پروفیسر محمد ابراہیم صاحب لکچرار کالج۔ پروفیسر شرف الدین صاحب صدر مدرس وسطانیہ۔ غلام طیب صاحب لکچرار کالج۔ پروفیسر عبدالرب صاحب کوکب۔ پروفیسر صادق علی صاحب سروش پروفیسر سید احمد صاحب ندوی۔ مولوی محمد صدیق صاحب کنٹرولر لاسلکی محمد یحییٰ صاحب منتظم صوبہ داری۔ محمد علی منتظم کالج۔ عبداللہ صاحب معتمد اوبتان۔

حسب ذیل تحریکات پیش ہو کر بالاتفاق آرا منظور کی گئیں۔

تحریک ۱ ۔ پروفیسر غلام طیب صاحب لکچرار کالج۔

مرکزی ضابطہ کی پابندی کرتے ہوئے شاخ ہذا کے لئے سب سے پہلے ارکان فراہم کئے جائیں اور اس کے لئے اہل ذوق حضرات سے اپیل کی جائے تاکہ شاخ کے لئے مایہ کا انتظام ہو اور اس سے فرنیچر اخراجات اور دفتری ضروریات کی پابجائی ہو سکے۔

تائید۔ پروفیسر محمد ابراہیم صاحب نے اس کی تائید فرمائی بالاتفاق آرا تحریک منظور کی گئی۔

تحریک ۲۔ پروفیسر غلام طیب صاحب۔
شاخ کے لئے کسی مقام کا انتظام ضروری ہے جس میں دفتر دارالمطالعہ اور دیگر امور انجام پاسکیں۔
تائید۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب رضوی نے اس کی تائید فرمائی۔ باتفاق آرا تحریک منظور کی گئی۔
تحریک ۳۔ پروفیسر محمد ابراہیم صاحب لکچرار کالج۔
ادارہ کے مختلف شعبہ جات کا کام ہے اور آئندہ اضافہ بھی ہوتا جائے گا اس لئے شریک معتمد کا عہدہ قایم کرلیا جائے اور مولوی عبداللہ صاحب معتمد ادبستان کا نام پیش کرتا ہوں۔
تائید۔ مولوی شرف الدین صاحب نے تائید فرمائی۔ باتفاق آرا تحریک منظور کی گئی۔
تحریک ۴۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب رضوی منتظم صوبہ داری اورنگ آباد
اغراض ادارہ کے لحاظ سے شعبہ امتحانات کا قیام ضروری ہے اشاعت اردو اس کا خاص مقصد ہے جو اس شعبہ کے قیام سے بدرجہ احسن حاصل ہوسکتا ہے اس سال کم از کم امتحان اردو دانی کے لئے مرکز قایم کرکے امیدوار فراہم کئے جائیں۔
تائید۔ پروفیسر ابراہیم صاحب نے تائید فرمائی۔ کافی مباحث و غور کے بعد باتفاق آرا تحریک منظور ہوئی ہے اور طے پایا کہ شرکت امتحان کے لئے فارم معتمد صاحب فوراً طلب کرکے ارکان مجلس میں تقسیم کریں۔
امیدوار جلد از جلد اندرون تاریخ معہ فیس داخلہ و فہرست داخل کرکے شریک کرا دیے جائیں۔ اگر اس دوران میں تعداد مشروط کی تکمیل نہ ہوسکے تو مرکز سے توسیع تاریخ فیس داخلہ کی اجازت حاصل کرنے پر غور کیا جائے گا۔
۲۔ نصاب اردو دانی بھی جلد از جلد طلب کرلیا جائے سر دست ۳۰ عدد سکم نہ ہو اور فارم شرکت بھی طلب کرکے تقسیم کردیے جائیں۔
۳۔ فارم رکنیت اور رسائل بھی جلد طلب کرکے تقسیم کردیے جائیں تاکہ بہ تعجیل ممکنہ ارکان بنائے جائیں۔
حسب ذیل ارکان نے معاون بننا قبول فرمایا۔
نائب صدر۔ پنڈت رائے چھوٹے لعل صاحب۔
رکن۔ پروفیسر غلام طیب صاحب لکچرار۔
مولوی محمد صدیق صاحب کنٹرولر اسلکی ضلع اورنگ آباد۔
حسب ذیل ارکان نے رکنیت (لے) روپیہ سالانہ کی قبول فرمائی۔
ارکان۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب۔ سید احمد صاحب ندوی۔ محمد علی صاحب منتظم کالج۔ عبدالرب صاحب کوکب۔ صادق علی صاحب سروش۔ محمد یحییٰ صاحب منتظم صوبہ داری۔ محترمہ بیگم محمد یحییٰ صاحب۔ مولوی شرف الدین صاحب۔ عبداللہ صاحب معتمد ادبستان۔ غازی معین الدین صاحب معتمد ادارہ۔
صدر صاحب جلسہ نے ارکان مجلس انتظامی شریک اجلاس کی دلچسپی اور توجہ کا شکریہ ادا فرمایا اور معتمد صاحب ادارہ نے شرکت جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ اجلاس ۶½ بجے شام کو برخاست ہوا۔

شاخ روضتین میں عصرانہ

۱۹ امرداد ۱۳۵۱ف روز چہار شنبہ

بوقت ۵ ساعت شام منجانب ادارہ ادبیات اردو شاخ روضتین جناب مولوی محمود حسین صاحب عثمانیہ سابق معتمد گلبرگہ کے اعزاز میں ایک پرتکلف عصرانہ ترتیب دیا گیا اردو فاضل کے طلبہ ایک گھنٹہ قبل سے انتظامات میں منہمک تھے۔
اردو فاضل کے طلبہ حبیب اللہ شیدائی منصب دار، عمر خان حلیم فخر الدین بیتاب، عبدالعزیز، محمد جانی، عبدالغنی افسر، غلام محمد، رکن الدین نے مہمانوں کا شاندار استقبال کیا۔
مہمانوں میں مولوی نصیر الدین صاحب نظامی بی اے بی ٹی مولوی احمد عبدالعزیز صاحب ایم اے مولوی خواجہ معین الدین صاحب

بی اے ایل ایل بی مولوی عبدالغفور صاحب صیغہ دار صوبہ داری وغیرہ قابل ذکر تھے۔

گل پوشی کے بعد نیاز علی خاں نیازؔ معتمد ادارہ نے صاحب معز کی خدمات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا اور استدعا کی کہ صاحب موصوف جہاں کہیں بھی رہیں ادارۂ ادبیات اردو کی خدمت اپنا خوش گوار فریضہ سمجھیں گے۔

فخرالدین صاحب تاجؔ کی تقریر کے بعد مولوی محمود حسین صاحب نے اپنی مختصر سی تقریر میں ادارہ کے ارباب کار کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ "محمود حسین کی زندگی ادارۂ ادبیات اردو کے لئے وقف ہے" عبدالغنی آفسرؔ کے شکریہ کے بعد ادارہ کی یہ دلچسپ صحبت ۶ ساعت شام برخاست ہوئی۔ وہاں سے صاحب معز ادارہ کے کثیر طلبہ کی معیت میں کتب خانہ روضتین تشریف لے گئے صدر ادارہ اور معتمد نے استقبال کیا۔ کتاب خانہ کے تفصیلی معائنہ کے بعد اپنی انتہائی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک سو مجلد اور قیمتی کتابیں کتب خانہ کو عطا کرنے کا اعلان فرمایا۔

شاخ روضتین کو عطیہ | مولوی خواجہ معین الدین صاحب بی اے ایل ایل بی ناظم اسٹیٹ محلہ روضتین و صدر ادارہ ادبیات اردو شاخ روضتین نے ازراہ اردو پروری مبلغ چالیس۴۰ روپیہ سکہ عثمانیہ نقد شاخ روضتین کو مرحمت فرمایا اور شاخ کے کتب خانہ کو اتنی ہی قیمت کی نئی اور قابل مطالعہ کتابیں مرحمت فرمائیں۔ جس کا ادارہ تہ دل سے مشکور ہے۔

دیوان اشرف | مولوی سلطان محی الدین صاحب نے ایک قدیم اردو شاعر اشرفؔ کے دیوان کا غیر مطبوعہ قلمی نسخہ ادارہ کے کتب خانہ کے لئے عطیہ دیا ہے۔ جس کے لئے منجانب نواب مرزا سیف علی خاں صاحب ناظم اعزازی کتب خانہ ادارہ شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

شاخ چیتاپور میں جلسۂ تعزیت | افسوس کہ پنجشنبہ ۶ امرداد ۱۳۵۱ف کی منحوس صبح کو عالیجناب مولوی غلام محمود خاں صاحب ڈویژنل افسر و صدر و سرپرست شاخ چیتاپور نے بعارضۂ فالج صدر شفاخانہ یونانی میں پانچ روز کی علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کی ادب نوازی اور علمدوستی کا سرسری اندازہ قارئین سب رس کو اس شاخ کی پچھلی روداد سے ہوسکے گا چنانچہ ۳۰ تیر ۱۳۵۱ف کو موصوف نے ادارہ میں تشریف لاکر ایک گھنٹہ تک معتمد سے ضروریات ادارہ کے بارے میں گفتگو کی دو تین دن بعد بلدہ سے واپس ہوکر کتب خانہ کے لئے دو الماریاں خرید دینے اور سب رس معلومات جاری کرانے کا وعدہ فرمایا اور اردو عالم کے امتحان میں مرکز میں اول آنے والے کو نقرئی تمغہ مرحمت کرنے کا اعلان کیا۔ لیکن آہ۔ "آں قدح بشکست وآں ساقی نماند" کم از کم جاگیری علاقوں میں مغفور جیسے علمدوست اور روشن خیال رفاہ عام کے کاموں میں دلچسپی لینے والے اور قومی فلاح و بہبود امور میں پیش پیش رہنے والے عہدہ دار ہماری نظر سے اب تک نہیں گزرے۔ اس لئے مرحوم کی وفات سے یقیناً شاخ چیتاپور کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

۱۴ امرداد کو بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں منجانب ادارہ ختم قرآن مجید ہوا۔ اور ۲۰ کو زیر صدارت عالیجناب مولوی محمد خواجہ صاحب وکیل جلسۂ تعزیتی منعقد کیا گیا جس میں تمام اراکین مجلس انتظامی، وکلاء و اساتذہ صاحبین اور دیگر معززین چیتاپور شریک تھے۔ اولاً محترمی ڈاکٹر زورؔ مدظلہٗ کا مندرجہ ذیل مکتوب محمد مشائخ صاحب عارفؔ نے حاضرین کو پڑھ کر سنایا۔

۱۷ امرداد ۱۳۵۱ف

بخدمت شریف جناب مولوی محبوب خاں صاحب یوسف زئی بی اے ڈپ ایڈ معتمد شاخ ادارۂ ادبیات اردو چیتاپور۔

"یہ خبر معلوم کرکے انتہائی الم ہوا کہ مولوی غلام محمود خاں صاحب سرپرست شاخ چیتاپور کی وفات کی وجہ سے آپ سب حضرات بے انتہا غمگین ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مرحوم جن خوبیوں کے حامل تھے

وہ بہت کم انسانوں میں نظر سے گزرتی ہیں۔ آپ کے اس رنج والم میں ہم لوگ بھی برابر کے شریک ہیں۔ ان کی وفات کی وجہ سے چیتا پور کی شاخ کی اہم ذمہ داری آپ کے سر منتقل ہوگئی ہے توقع ہے کہ آپ جب تک چیتا پور میں رہیں ان کی تمناؤں کو پورا کرتے رہیں گے اور ادارے کا کام خراب نہ ہونے پائے گا اس واقعہ سے متاثر ہونے کے بعد آپ سب کا اولین فریضہ یہی ہے کہ مرحوم کی توقعات کے مطابق چیتا پور کی شاخ کو دوسری شاخوں کے مقابلہ میں نمایاں اور ممتاز کریں۔"

آخر میں مندرجہ ذیل قرارداد تعزیت کو حاضرین نے ایستادہ ہوکر سنا اور ایک منٹ کی خاموشی کے بعد بالاتفاق آراء منظور کیا۔

> "اراکین مجلس انتظامی ادارہ ادبیات اردو شاخ چیتا پور عالیجناب مولوی غلام محمود خاں صاحب مرحوم ڈویژن افسر و سرپرست و صدر ادارہ کے سانحہ ارتحال پر دلی رنج والم کا اظہار کرتے ہیں اور حاضرین جلسہ سے متوقع ہیں کہ مغفور کی یادگار شاخ ادارۂ کو زندہ رکھنا اور ادارہ کے بارے میں مرحوم کی توقعات کو پورا کرنا اپنا مقدس فریضہ سمجھیں گے۔ دعا ہے کہ خدائے پاک مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

شعبۂ طلبہ پرلی شعبۂ طلبہ کا ایک عام جلسہ بصدارت مولوی بشیر الزماں صاحب شہید واعظ سرکار عالی منعقد ہوا جلسہ کا عنوان "قدیم تہذیب جدید تہذیب" رکھا گیا تھا جلسہ ٹھیک ۵ بجے شروع ہوکر ۸ بجے شام کو اختتام کو پہنچا۔ جلسہ کا آغاز مولوی حافظ بشیر الزماں صاحب شہید کی قراءت سے ہوا۔ بعد میں سید شریف الحسن اشفاق نے حمد سنائی۔

موافقت میں سعید الدین صدیقی۔ ابوظفر محی الدین۔ سید شریف الحسن اشفاق۔ سید نبی اور مخالفت میں محمد نجم الدین محمد عبدالستار، عبدالخالق خلیل، محمد ہاشم کرمانی، محمد عبدالرب قریشی نے تقریریں کیں آخر میں مولوی اشرف الدین صاحب فیضی۔ مولوی غلام حسین صاحب معتمد ادارۂ ادبیات اردو اور مولوی فخر الدین صاحب منشی فاضل صدر ادارہ نے تقریریں کی آخر میں صدر جلسہ نے مفصل تقریر کی جس سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ آخر میں صدر جلسہ نے ادارہ کی شاخ شعبۂ طلبہ کی سرگرمی دیکھ کر اظہار خوشنودی فرمایا۔

دوسرا جلسہ مولوی فخر الدین صاحب منشی فاضل کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جلسہ کا آغاز حافظ ظہیر الدین صاحب قادری مشائخ اور سید شریف الحسن اشفاق کی حمد سے شروع ہوا جلسہ ۵ بجے شروع ہوکر، بجے شام ختم ہوا۔ مباحثہ کا عنوان "تقریر اور تحریر" مقرر تھا۔ موافقت میں محمد نیر الدین صدیقی۔ سید نبی۔ محمد نجم الدین۔ عبدالستار مخالفت میں سعید الدین۔ ابوظفر محی الدین۔ عبدالخالق خلیل محمد ہاشم۔ محمد عبدالرب قریشی نے تقریریں کیں آخر میں اظہر الدین۔ مولوی غلام حسین صاحب معتمد ادبیات اردو پرلی فیضی صاحب اور صدر جلسہ نے تقریریں کیں آخر یہ طے پایا کہ انسان کو دونوں کی مہارت ضروری ہے اور ہمارے ادارہ کا بھی یہی مقصد ہے۔

اول مددگار صاحب مدرسہ وسطانیہ جلسہ میں ضروری کام ہونے کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکے اس لئے "تحریر" پر مضمون لکھ کر روانہ فرمایا جس کو فیضی صاحب نے سنایا۔

شنجاپور میں اردو کا کام ۲۲ جون ۴۲ء کو مولوی محمد علی خاں صاحب نے اردو دانی کے تعلیم کے سلسلے میں موضع شنجاپور کا دورہ کیا اور اردو دانی کی تعلیم کے متعلق مشورہ دیا۔ مسلمانان موضع شنجاپور کی جہالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ مخالفتوں نے مایوسی کی صورت اختیار کرلی ہے یہاں تعلیم نہایت ہی اعلیٰ پیمانہ پر جاری ہے یہاں کے لوگوں کا شوق، جوش استقلال

اور محبت زبان اردو، قابل تعریف ہے۔ باشندگان شیجا پور نے
رات میں ۹ بجے مولوی محمد علی خاں صاحب کی تقریر کا انتظام کیا۔

تقریر | اے محبان اردو! اور برادران وطن، خادم آپ کی
سعی کامل کو دیکھ کر نہایت صدق دل سے مسرور اور مشکور ہے
اور آپ کی تعلیم اور تحقیق کی نظیر بہت کم مل سکتی ہے آپ کو معلوم
ہے کہ یہ صدی وہ نہیں جب کہ اسلاف زر کثیر چھوڑ جاتے تھے،
وہ زمانے کی رفتار اب جاتی رہی ہے اب سوائے اپنے قدم پر
کھڑے ہونے کے کوئی چارا نہیں ہے آپ کی غفلت اور جہالت
روز بروز متجاوز کرتی جارہی ہے موضع ہذا کی جہالت اور غفلت کو
مدنظر رکھتے ہوئے اردو دانی کے اس مدرسہ کا افتتاح عمل آیا جس کو
آج قائم کئے ہوئے دو ماہ کا عرصہ گزرتا ہے اس بات کا خادم کو
ہمیشہ افسوس ہوتا رہا ہے کہ طلبائے اردو دانی موضع شیجا پور
کے علاوہ نوجوانوں میں علمی شوق نہیں ہے۔

باد مخالفت کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلقہ بھوم بلی جاگیر میں
اردو تعلیم عام کرنے کے لئے خادم اور دیگر حامیان اردو کو جس میں
ان کا کوئی ذاتی فائدہ نہیں تھا، ہزاروں اغیار سے مقابلہ کرنا
پڑا۔ اور آج خدا کے فضل سے بھوم جاگیر میں اردو تعلیم کا ذوق
عام ہوگیا ہے اور وہاں اردو امتحانات کا مرکز بھی قائم ہوگیا ہے۔

برادران شیجا پور آپ جانتے ہیں کہ ہماری زبان اردو
ہے جس کو ولادت پاکر ۷ صدی کا عرصہ ہوتا ہے اردو زبان نے
ادب بلاغت انشاء، فلسفہ، کیمیا وغیرہ میں کافی ترقی کی۔ یہ زبان
ہماری ہی ایجاد کی ہوئی ہے اس زبان کی خدمت کرنا ہمارا فرض
ہے زبان کی وسعت اور استحکام کے لئے خون کا آخری قطرہ بہانے
تک دریغ نہ کرنا چاہیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر اس زبان
کی خدمت کرتا رہوں گا۔ اس خدمت میں ہر چیز قربان کردوں گا۔
افسوس کہ ہمارے نوجوان اس دائرۂ ادب سے کوسوں دور ہیں۔

محفل شعر و سخن | ادارۂ ادبیات اردو میں مولانا حسرت موہانی
کی آمد حیدرآباد کی تقریب میں جو محفل شعر و سخن چہارشنبہ ۱۲ رمئی ۱۹۴۲ء
کو منعقد ہوئی اس میں مولانا کے علاوہ ملک کے متعدد مشاہیر شعراء،
مثلاً نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز، نواب تراب یار جنگ بہادر سعید،
نواب اصغر یار جنگ بہادر اصغر، حضرت امجد، حضرت صفی اورنگ آبادی،
حضرت علی اختر، راجہ نرسنگ راج عالی، مولوی قاضی زین العابدین
عابد، مولوی عبدالمقتدر خاں ناظم، حسرت ترمذی، مولوی سراج الحسن
ترمذی، آزاد، تجید، آسیہ، نظر، ذکی، میر بہادر علی جوہر حیدرآبادی
تاج، خلیل، نواز، زیبا، وحشی، سالک، قدر، شاہد صدیقی،
خیرات، مشتاق، ست گرو پرشاد رہبر، عابد علی سعید، گروچرن داس
سکینہ ماجد، نواب عباس علی خاں، نواب معین خاں نعیم، نواب
ناصر الدین احمد ناصر وغیرہ اور علم دوست اصحاب مثلاً سر محمد یعقوب
نواب بہادر یار جنگ بہادر، نواب زین یار جنگ بہادر، نواب خوش بلد
جنگ بہادر، نواب دوست محمد خاں، نواب اکبر علیخاں بیرسٹر،
ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر انور اقبال قریشی، ڈاکٹر راحت اللہ
خاں، مولوی سید عارف الدین، پروفیسر فضل حق، پروفیسر ضیاء الدین
انصاری، مولوی ظہیر الدین احمد، مولوی کرم اللہ خاں، مولوی
مرزا نجف علی خاں، مولوی خواجہ محمد احمد اور ادارہ کے معتمدین و
ارکان نے شرکت کی۔

ابتدا میں زیر سما مشاعرہ ہوتا رہا لیکن بعد کو بارش کی وجہ
سے ادارے کے ہال میں ڈیڑھ بجے رات تک جاری رہا، حاضرین
کی تعداد پانچسو تک پہنچ گئی تھی۔ خواتین نے بھی شرکت کی۔

امتحانوں کے متعلق معلومات | اس وقت تک اضلاع
میں پربنی، بردا پور، مومن آباد، شاہ آباد، بھینسہ، ہنگولی، بالانگر،
بھوم، پرینڈہ، کپل، کلیانی، وغیرہ مقامات پر حسب قاعدہ اردو
امتحانات ۱۳۵۱ف کے مرکز قائم ہوچکے ہیں اور توقع ہے کہ قریب میں

اورنگ آباد، گلبرگہ، پربھنی، کاماریڈی، گدوال، خانہ پور، وغیرہ کے مرکزوں کا بھی اعلان ہوسکے گا۔

امتحانات ۲۰ تا ۲۳ مہر ۱۳۵۱ف م ۲۶ تا ۲۸ اگست ۱۹۴۲ء ہر مرکز میں ایک ساتھ لئے جائیں گے۔ ہر مرکز کے لئے ادارہ سے ایک صدر نگران کار صاحب امتحانات کے پرچے وغیرہ لیکر روانہ ہوں گے۔ جو اپنی نگرانی میں اور مقامی اصحاب کے تعاون سے امتحانات لیں گے۔ توقع ہے کہ ہر مرکز کی جانب سے ان صدر نگران کار صاحبان کا استقبال کیا جائے گا۔ اور ان کے قیام و طعام میں ممکنہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گے۔

تاریخ امتحان سے دو روز قبل ہی امتحان گاہ سے متعلقہ جملہ انتظامات (مثلاً نشستوں، دواتوں، مقامی نگران کار صاحبوں، اور رضا کاروں سے متعلق) مکمل کرلئے جائیں گے۔ تاکہ عین وقت پر کوئی دقت پیش نہ آئے۔

سیاہی اور کاغذ اور جوابی بیاضوں کی سربراہی منجانب ادارہ کی جائے گی۔

ان امتحانات میں جو امیدوار شریک ہونا چاہیں وہ اپنی درخواستیں فیس کے ساتھ ۳۰ شہریور تک دفتر ادارہ رفعت منزل خیرت آباد پر روانہ کردیں۔

(صرف شاخوں کو مزید چار روز کی مہلت دی جاتی ہے۔ تاکہ ان کو مجتمعہ فیس اور حساب کتاب کی تکمیل میں موقع ملے)

اس مدت کے بعد جو بھی درخواستیں وصول ہوں گی خواہ وہ انفرادی ہوں یا شاخوں کی ان کو اردو امتحانات کی مجلس انتظامی میں پیش کیا جائے گا تاکہ فیس دیرانہ کے ساتھ داخلہ کی اجازت دی جائے۔ کسی صورت میں ۱۵ شہریور کے بعد کوئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔

قرارداد تعزیت

مجلس اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو کی سب کمیٹی منعقدہ ۱۶ جون ۱۹۴۲ء روز سہ شنبہ، بصدارت مولوی سجاد مرزا صاحب، مس جسی نندی آنجہانی نے، رکن مجلس امتحانات اور ممتحن وغیرہ کی حیثیت سے جو قابل قدر خدمات انجام دی تھیں اس کا مجلس ہذا اعتراف کرتی ہے اور ان کے بے وقت انتقال پر اظہار تاسف کرتے ہوئے ان کے پسماندوں کے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کے متعلق مولانا سلیمان ندوی کی رائے

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن جس سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ اپنے کاموں کو انجام دے رہا ہے اس پر اس کے مخلص کارکنوں کو مبارکباد دینا زبان کے ہر خادم کا فرض ہے۔ ادارہ نے اپنے کاموں کے شعبوں میں مزید ترقی کی ہے۔ ایک طرف علوم عالیہ میں وہ اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کی مہم پر غور کر رہا ہے اور دوسری طرف چھوٹے بچوں کے لئے مفید و صالح لٹریچر کی اشاعت میں بھی دلچسپی لے رہا ہے۔ اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس نے اپنی کم عمری میں مختلف عنوانوں پر جتنی کتابیں شائع کی ہیں شاید ہی اس ملک کا کوئی ادارہ اس میں اس کا مقابلہ کرسکے

معارف بابت ماہ مئی ۱۹۴۲ء

مکتوب مولانا عبدالماجد دریابادی بنام پروفیسر سروری

عزیز مکرم۔ السلام علیکم!

میسور میں اردو پروفیسری پر تقرر مبارک ہو۔ ہمدم میں ابھی خبر پڑھی اور یہ تبریک نامہ لکھنے بیٹھ گیا حالانکہ مبارکباد کی مستحق آپ کی ذات

نہیں خود یونیورسٹی ہے۔
جب وہاں جانا ہو اور فرصت بھی ملے تو ذرا میں "میسور میں اردو" کے حالات جاننا چاہتا ہوں مثلاً یہ کہ ان کی یونیورسٹی میں اردو کے کتنے طلبہ ہیں؟ عموماً مسلمان ہیں یا کہ غیر مسلم ہیں۔ کورس کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ سب آپ کی فرصت و سہولت پر ہے
مخلصانہ مبارک باد ایک بار پھر قبول ہو۔ والسلام

ادارہ کی مطبوعات دوسروں کی نظر میں

میر محمد مومن:۔ مولفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ۔
اس کتاب میں سلطنت قطب شاہیہ کے پیشوا یعنی سلطان محمد قطب شاہ کے وزیر اعظم اور حیدرآباد کے مشہور تعمیر کار اور مصلح کے حالات زندگی اور علمی و رفاہی و سیاسی کارناموں کا مفصل تذکرہ عالمانہ محققانہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مولف اس سے قبل اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے حالات زندگی شایع کر چکے ہیں۔
یہ تالیف دس حصوں پر مشتمل ہے جن سے قبل ایک دیباچہ بھی ہے جس میں مصنف نے بالکل ٹھیک لکھا ہے۔
"جو قوم اپنے بزرگوں کے سرمائے اور تجربے سے فائدہ اٹھانا نہیں جانتی وہ زندگی کی دوڑ میں اپنے حریفوں سے پیچھے رہ جاتی ہے۔ اور میر محمد مومن جیسے بزرگوں کے کارنامے تو تاریک سے تاریک ماحول میں بھی بلند میناروں کا کام دیتے جاتے ہیں جن کی روشنی سے بھٹکے ہوئے قافلوں کی منزل مقصود کی طرف رہبری ہوتی ہے۔"
کتاب کے پہلے حصہ میں میر محمد مومن کے ابتدائی حالات زندگی درج ہیں۔ دوسرے میں محمد قلی قطب شاہ کی پیشوائی۔ تیسرے میں دیہات اور جاگیرات۔ چوتھے میں سلطان محمد قطب شاہ کی پیشوائی اور پانچویں میں خانگی زندگی کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ آخری پانچ حصوں میں میر صاحب کی تصنیف و تالیف تصرفات۔ پس ماندگان اور دائرہ میر محمد مومن کی نسبت تحقیقی معلومات درج ہیں۔ ان تمام حصوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے ایک طویل مدت کی تلاش و جستجو کے بعد دکن کے اس عظیم الشان وزیر اعظم کے حالات زندگی مختلف کتب خانوں کی چھان بین اور دور دور کے دیہات میں سیکڑوں میل کے سفر اور میر صاحب کے بنائے ہوئے تالابوں، مسجدوں اور آبادیوں کے معائنے اور تحقیق کے بعد اس کتاب میں جمع کر دیے ہیں۔

رسالہ ہندستانی جنوری ۱۹۴۲ء

فن تقریر:۔ اس مختصر سی کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ قدیم زمانہ کی قوموں میں فن تقریر کی عظمت اور اس کی اہمیت کیا تھی۔ مقرر بننے کے لئے کن کن اوصاف کی ضرورت ہے۔ اچھے مقرر کو کن کن باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تقریر کا اسلوب بیان کیا ہونا چاہیے اور یہ کہ مختلف مواقع پر مقرر کو کن اصول کے ماتحت حرکات کرنی چاہیے۔ مطالب کتاب کو سمجھانے کے لئے متعدد قلمی تصاویر بھی شامل ہیں۔ کتاب طلبہ کے لئے خصوصاً اور عام ناظرین کے لئے عموماً مفید ہوگی۔

رسالہ برہان بابتہ جون ۱۹۴۲ء

رجسٹرڈ ایم ۳۹۵۰ Reg. M. 3950

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
من کی بپتا	۸۰	•	۸	•
سرگزشت غالب	۶۴	•	۸	•
نظام الملک	۴۰	•	۴	•
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	•
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر) ...	۱۶۰	۱	•	•
ارمغان جذب	۱۲۰	•	۱۲	•
سوتیلی ماں	۴۸	•	۴	•
سرسید احمد خاں	۱۶	•	۲	•
سرسالار جنگ	۴۸	•	۶	•
مغربی تصانیف کے اردو تراجم...	۱۴۵	۱	۴	•
محنت کی جھاڑو	۱۳۲	۱	۴	•
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	•
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	•	•
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	•
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	•
دادا بھائی	۱۶	•	۲	•
اردو نامہ	۲۰۰	۲	•	•
ارسطو جاہ	۶۵	•	۶	•
عماد الملک	۴۰	•	۶	•
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	•	۲	۶
" دوسری کتاب ..	۵۶	•	۴	۶
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	•	•
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	•
فن تقریر	۹۶	•	۸	•
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	•	•
پانی کی کہانی	۴۸	•	۶	•
رسائل طب	۳۰۲	۲	۸	•
سلک گوہر	۴۰	•	۴	•
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۱	۴	•
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری...	۱۸۴	۱	۴	•
ہوش کے ناخن	۹۴	۱	•	•
یوسف ہندی بیدفرنگ میں ...	۸۹	۱	•	•

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
ٹیگور اور ان کی شاعری ...	۱۲۸	۱	۴	•
متاع سخن	۱۲۴	•	۱۲	•
نقش سخن	۱۲۲	•	۱۲	•
بادۂ سخن	۱۲۷	•	۱۲	•
سراج سخن	۱۵۲	•	۱۲	•
ایمان سخن	۱۲۰	•	۱۲	•
فیض سخن	۱۴۴	•	۱۲	•
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر...	۵۰۰	۵	•	•
" دوم (۵۰) " ...	۴۳۲	۵	•	•
نقد سخن	۱۷۵	۱	•	•
ندر روانی	۲۴۸	۲	۸	•
گردہ و نسیم	۱۹۲	۲	•	•
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	•	•
من کی دنیا	۱۴۵	۱	•	•
مدارس میں اردو ..	۱۹۶	۱	۸	•
مکرم نامہ	۱۱۲	۱	•	•
قدردان	۱۰۴	۱	۴	•
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	•
عاصم	۲۰۰	۱	۴	•
دینی معلومات	۵۶	•	۶	•
آندور بستان اور سرنگ ..	۴۸	•	۶	•
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	•
نمود زندگی	۲۱۲	۱	۸	•
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	•	۱۲	•
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر . .	۳۱۲	۲	۸	•
بلبان	۳۲	•	۳	•
خطابات	۱۱۲	•	۱۲	•
علم جہانداری	۱۵۰	۱	•	•
جنوبی (۱۶) تصاویر ...	۱۱۸	۱	۸	•
انوار	۱۶۸	۱	۸	•
کشمش دانی (۴) تصاویر ..	۸۰	•	۱۰	•
گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

حیدرآباد دکن

سنہ ۱۹۴۲ع

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا

ماہنامہ

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو نمبر

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین
سکینہ بیگم
عبد الحفیظ صدیقی بی، ایس، سی

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۲
نشان ٹپہ برطانیہ H3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

جلد (۵) | بابت مئی ۱۹۴۲ء | شمارہ (۵)

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیرت آباد سے شایع ہوا۔

انعقاد سالانہ اجلاس ادارہ

گزشتہ سال ماہ جنوری میں رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواز جنگ مرحوم کی صدارت میں بہ مقام دارالبلد حیدرآباد جو عظیم الشان جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا تھا اس کی کامیابی کے پیش نظر ادارہ نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ آئندہ سے اس موقعہ پر ادارہ کا سالانہ اجلاس بھی کر لیا جائے اور اس تقریب میں ادارہ کی جملہ شاخوں کے ارباب کار کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر اس سال ماہ جنوری ہی سے سالانہ اجلاس اور جلسۂ تقسیم اسناد کی تاریخوں کے تعین کی کوشش کی گئی۔ آخر کار ماہ مارچ میں جب جلسۂ تقسیم اسناد کی تاریخ مقرر ہو گئی تو جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ معتمد عمومی ادارہ نے فروری کے ختم پر سالانہ اجلاسوں کا نظام العمل مرتب کر کے مجلس انتظامی کے ارکان کی رائے کے لئے روانہ فرمایا۔

اس نظام العمل کے ساتھ جناب ڈاکٹر زورؔ صاحب نے ان اجلاسوں کا جو طرز کار اور اغراض و مقاصد متعین فرمائے تھے وہ حسب ذیل ہیں:-

"ادارہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے ساتھ ایک کانفرنس کے طور پر سالانہ اجلاسوں کے بھی منعقد کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اندرون و بیرون مملکت حیدرآباد میں جو جو اصحاب ادارہ کا کام کر رہے ہیں ان سے شخصی طور پر تبادلۂ خیال کا موقع ملے اور اس طرح ادارہ کے مقاصد سرعت کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں۔

ان اجلاسوں میں ادارہ کے ارکان و معتمدین شعبہ جات و رفقاء کے علاوہ جو حیدرآباد میں مقیم ہیں بیرون شہر کی جملہ شاخوں کے صدر و معتمد صاحبان کو شرکت کی دعوت دی جائے۔ اس طرح ہر شاخ کے دو نمایندے طلب کئے جائیں گے جو ادارہ میں بطور مہمان مقیم رہیں گے۔ ان کے قیام و طعام کا منجانب ادارہ انتظام کیا جائے گا کیونکہ اس اجتماع کا اہم مقصد یہی ہے کہ جملہ ارباب کار کو ایک دوسرے سے ملنے اور سمجھنے کا موقع حاصل ہو۔ ہر جگہ کی مقامی دشواریوں اور ضرورتوں پر غور کر کے ان کے حل معلوم کئے جائیں۔

غرض اس اجتماع کے ذریعہ سے اردو زبان اور ادب کی وسعت اور ترقی کے ذرائع فراہم ہو سکیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب کی یہ تجویز مجلس انتظامی کے اجلاس منعقدہ ۴ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء میں اس شرط کے ساتھ منظور کی گئی کہ اگر سہ ربع شاخوں کے نمایندے اس میں شرکت کرنے کے لئے آمادہ ہوں تو اس کے انعقاد کا اعلان کیا جائے۔ نیز یہ کہ اس سال جنگ کی پریشانیوں کی وجہ سے بیرون ریاست کے نمایندوں کو شرکت کی زحمت نہ دی جائے۔

اس منظوری کے بعد ادارہ کی طرف سے جملہ شاخوں سے استفسار کیا گیا۔ اور تقریباً سب شاخوں نے اس خیال کا بڑی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

شاخوں کی اس مستعدانہ رضامندی اور فوری جوابات نے ادارہ کی بڑی مدد کی اور وقت سے بہت قبل ہی دعوت نامے اور نظام العمل چھپوا کر روانہ کر دئے گئے۔ ادارہ کے قدیم رفیق نواب محمد ظہیر الدین خاں بہادر رئیس پائیگاہ نے مندوبین کے قیام اور جلسوں کے

انعقاد کے لئے اپنی پائیگاہ کے بڑے بڑے شامیانے اور ڈیرے روانہ فرما دیئے۔ اس کا انتظام نواب صاحب معز کی پائیگاہ کے میر مجلس مولوی غلام احمد خاں صاحب نے اس خوبی سے کردیا کہ ارباب ادارہ بہت سی دشواریوں سے بچ گئے۔

مندوبین کی آمد جملہ مندوبین پنجشنبہ ۲۵ مارچ کی صبح میں فائز حیدرآباد ہوئے اور ادارے کی طرف سے ان کا نام پلی اسٹیشن اور کاچی گوڑہ اسٹیشن پر استقبال کیا گیا۔ اضلاع کے جو نمایندے اس اجلاس کی شرکت کے لئے تشریف لائے ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) حبیب النسا بیگم صاحبہ ایم اے لکچرار مہارانی کالج بنگلور۔ معتمد شاخ شعبۂ نسواں ادارہ۔ بنگلور
(۲) بلونت راؤ صاحب گھاٹے بی اے۔ ایل ایل بی۔ منصف و صدر شاخ ادارہ۔ کشتگی۔
(۳) بسنپا صاحب ساہو معتمد شاخ ادارہ کشتگی
(۴) قاضی محمد حسین صاحب بی اے نمایندۂ شاخ کشتگی۔
(۵) محمد محبوب خاں صاحب یوسف زئی۔ بی اے ڈپٹی ایڈ۔ معتمد شاخ چیتاپور
(۶) محمد مشائخ صاحب عارف۔ نمایندۂ شاخ چیتاپور
(۷) عبدالرشید خاں صاحب وکیل۔ نمایندۂ شاخ ہنگولی
(۸) محسن اللہ خاں صاحب محسن۔ نمایندۂ شاخ ہنگولی
(۹) قاضی محمد یوسف الدین صاحب فاروقی نمایندۂ مرکز نرسی
(۱۰) حکیم محمد فخرالدین صاحب صدر شاخ ادارہ پرلی۔
(۱۱) غلام حسن صاحب صدیقی اردو فاضل معتمد شاخ پرلی۔
(۱۲) اشرف الدین صاحب فیضی اردو فاضل نمایندۂ شاخ پرلی۔
(۱۳) محمد یونس صاحب پیش امام اردو عالم نمایندۂ مرکز پرینڈہ
(۱۴) غوث محی الدین صاحب اردو عالم نمایندۂ شاخ کلیانی
(۱۵) مرزا سردار بیگ صاحب اردو عالم " "
(۱۶) محمد بن عمر صاحب ایم اے لکچرار گلبرگہ کالج و معتمد شاخ ادارہ گلبرگہ
(۱۷) محمد عبدالغنی صاحب اردو عالم نمایندۂ شاخ گلبرگہ
(۱۸) نورالحسن صاحب انور اردو فاضل معتمد شاخ شاہ آباد۔
(۱۹) محمد فخرالدین صاحب ارمان نمایندۂ شاخ روضتین گلبرگہ۔
(۲۰) قاضی محمد حمید الدین صاحب اردو عالم نمایندۂ شاخ شعبۂ طلبہ گلبرگہ۔
(۲۱) محمد عزیز الدین قریشی نائب صدر شاخ شعبۂ طلبہ پرلی۔

(۲۲) ابوظفر محی الدین صاحب صدیقی معتمد شاخ شعبۂ طلبہ پرلی۔

(۲۳) ابوالخیر فاروقی صاحب نائندۂ شاخ " " "

(۲۴) حمید اللہ خاں صاحب رشید اردو عالم معتمد شاخ پربھنی۔

(۲۵) سید مظفر علی صاحب رضوی اردو فاضل۔ نائب معتمد شاخ پربھنی۔

اجلاسوں کے انتظامات کے سلسلے میں ارباب ادارہ کے علاوہ مولوی ضامن علی صاحب غازی، مولوی سراج الدین احمد صاحب بی اے، پروفیسر لطیف احمد صاحب فاروقی ایم اے ایل ایل بی۔ مولوی عبدالرحمٰن شریف صاحب۔ مولوی اکبرالدین صاحب صدیقی بی اے مولوی مراد علی صاحب طالع، مولوی عارف علی خاں صاحب کمال نے مہتمم ادارہ کی جو مخلصانہ اور رضا کارانہ مدد فرمائی اس کے لئے جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی ادارہ کی ذاتی نگرانی اور ہمہ جہتی امداد ان اجلاسوں کی کامیابی کی بڑی حد تک ضامن ہے۔ اس سال شعبۂ نسواں کے لئے جو اجلاس مختص کیا گیا تھا اس کے جملہ انتظامات محترمہ بشیر النسا بیگم صاحبہ بشیر شریک معتمد شعبۂ نسواں اور ان کے مخلص شوہر مولوی ضامن علی صاحب غازی نے اس تن دہی سے انجام دیئے کہ جس کا کوئی شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ شعبۂ نسواں کا یہ سالانہ اجلاس محترمہ موصوفہ ہی کی تحریک اور دلچسپی کی وجہ سے منعقد ہو سکا۔ اور یہ کامیاب نہ ہوتا اگر محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبۂ نسواں اور سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبۂ نسواں باوجود اپنی علالت اور دیگر مصروفیتوں کے اس کی کامیابی کا بیڑا نہ اٹھاتیں۔ اس اجلاس کے انتظامات کے سلسلے میں محترمہ بشیر النسا بیگم صاحبہ بشیر نے ایک کثیر رقمی عطیہ سے بھی ادارہ کی مدد کی ہے۔ احسان فراموشی ہوگی اگر اس ضمن میں محترمہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور کے نام کا ذکر نہ کیا جائے۔ محترمہ موصوفہ نے نہ صرف شعبۂ نسواں کے جلسے کے انتظامات میں مدد فرمائی بلکہ اپنی مسلسل شبانہ روز مصروفیت سے مندوبین کے قیام و طعام کا ایسا اچھا اور باسلیقہ انتظام فرمایا کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ مل سکا۔ ادارہ آپ کی اس دلچسپی اور پرخلوص خدمت کا جتنا بھی شکریہ ادا کرے کم ہے۔

یہ امر قابل اظہار ہے کہ باوجود پٹرول راشننگ کے ادارہ کے جملہ معتمدین شعبہ جات اور دیگر ارکان نے اس کے جملہ اجلاسوں میں شرکت فرمائی۔ اور جنگ کی سراسیمگی اور پریشان کن افواہوں کے باوجود اضلاع کے مندوبین نے گھر چھوڑ کر سفر کی زحمت گوارا کی۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ادارہ کا مستقبل نہایت تابناک ہے۔ اور یہ اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے لئے عہد حاضر میں بھی سرزمین دکن میں ایسے مخلص اور صاحبانِ ایثار خدمت گزار فراہم ہو گئے ہیں۔

خواجہ حمید الدین
مہتمم ادارہ و مدیر سب رس

اطلاع:۔ جن اصحاب کا چندہ ختم ہو گیا ہے وہ براہ کرم جلد روانہ فرمادیں یا سب رس تقسیم کرنے والے کو چندہ دے کر باضابطہ مطبوعہ رسید حاصل فرما لیں۔

مہتمم

فہرستِ تصویر مندوبین وارباب ادارہ

سالانہ اجلاس ۱۹۴۲ء

پہلی صف میں :- (۱) قاضی حمید الدین صاحب گلبرگہ (۲) ابوظفر محی الدین صاحب معتمد شعبہ طلبہ پرلی (۳) عزیز الدین صاحب قریشی نائب صدر شعبہ طلبہ پرلی (۴) ابوالخیر صاحب فاروقی کتب خانہ دار پرلی

" (۵) فخر الدین صاحب آرمان گلبرگہ (۶) عبد العزیز صاحب گلبرگہ (۷) عبد الغنی صاحب آفسر گلبرگہ (۸) غوث محی الدین صاحب کلیانی (۹) سردار بیگ صاحب کلیانی

دوسری صف میں :- (۱) محمد یونس صاحب شمس امام نمائندہ شاخ پربھنی (۲) اشرف الدین صاحب فیضی نائب معتمد پرلی (۳) غلام حسن صاحب صدیقی معتمد پرلی (۴) حکیم محمد فخر الدین صاحب صدر پرلی

" (۵) نور الحسن صاحب انور معتمد شاخ شاہ آباد (۶) خواجہ حمید الدین صاحب مہتمم ادارہ و مدیر سب رس (۷) حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد شاخ پربھنی (۸) محمد مشائخ صاحب عارف

" چیتاپور (۹) محمد محبوب خاں صاحب یوسف زئی معتمد شاخ چیتاپور (۱۰) بلونت راؤ صاحب گھاٹے منصف صدر شاخ کشتگی (۱۱) قاضی محمد حسین صاحب کشتگی (۱۲) قاضی یوسف الدین صاحب

" فاروقی نمائندہ شاخ نرسی (۱۳) بسپا صاحب معتمد شاخ کشتگی۔

کرسیوں پر :- پروفیسر سید محمد صاحب معتمد شعبہ شعرائے مصنفین دکن (۲) مولوی فیض محمد صاحب معتمد اردو دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) (۳) پروفیسر عبد القادر صاحب سروری معتمد اردو امتحانات۔

" (۴) ڈاکٹر محمد احسن اللہ خاں صاحب معتمد شعبہ زبان (۵) مولوی سید محمد اعظم صاحب رکن مجلس انتظامی (۶) مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری رکن مجلس انتظامی (۷) مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب نائب صدر ادارہ

" (۸) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور معتمد اعزازی (۹) مولوی ظہیر الدین احمد صاحب معتمد شعبہ تالیف و ترجمہ (۱۰) سید تقی الدین صاحب (۱۱) پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی معتمد شعبہ تاریخ دکن۔

(۱۲) مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی رکن مجلس انتظامی

پہلا اجلاس

ادارہ کے سالانہ اجلاسوں کے لئے دفتر ادارہ کے محاذی وسیع میدان میں جو شامیانے اور ڈیرے نصب کئے گئے تھے ان میں کرسیوں اور صوفوں پر تقریباً چار سو اصحاب کی نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور متصل خواتین کے لئے ایک شامیانہ مخصوص کردیا گیا تھا۔ ۲۵ مارچ کی صبح ہی سے جلسہ گاہ میں علمدوست اصحاب جمع ہونا شروع ہوگئے۔ اضلاع کے مندوبین کی نشست کے لئے ایک پہلو میں قرینے سے کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ نواب مرزا سیف علی خاں صاحب، نواب غوث یار جنگ بہادر، مولوی لیاقت اللہ خاں صاحب، مولوی سید علی اکبر صاحب، مولوی میر باسط علی خاں صاحب ان اصحاب میں شامل تھے جو جلسہ کے آغاز سے بہت قبل ہی تشریف لے آئے۔ ادارے کے جملہ معتمدین شعبہ جات اور اراکین مجلس انتظامی مثلاً مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی، ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب، ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب مولوی عبدالقادر صاحب سروری، مولوی سید محمد صاحب، مولوی فیض محمد صاحب، مولوی سید بادشاہ حسین صاحب، مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی کے علاوہ مختلف شعبہ جات کے ارکان مثلاً پروفیسر فضل حق صاحب و پروفیسر لطیف احمد صاحب فاروقی وغیرہ نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔

آنریبل نواب مہدی یار جنگ بہادر جو بحیثیت صدر ادارہ اس سالانہ اجلاس کی صدارت فرمانے والے تھے۔ سرکاری کام پر اچانک دہلی تشریف لے گئے تھے اور اپنی جگہ پر آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر صدر المہام تعمیرات کو صدارت کے فرائض سپرد فرما گئے تھے۔ آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر نے باوجود ناسازی مزاج جلسہ کی صدارت فرمائی۔ اور اگرچہ ان کا ارادہ تھا کہ تھوڑی دیر تشریف رکھنے کے بعد واپس ہوجائیں گے لیکن اس علمی ماحول اور ادبی تقریروں نے جناب صدر کو اتنا زیادہ محو کرلیا کہ وہ ختم جلسہ تک ٹھیرے رہے۔ یہ واقعہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ راجہ صاحب معز کو علم و ادب سے کتنی گہری دلچسپی ہے کہ وہ علالت اور بخار کی حرارت کے باوجود آخر تک تشریف فرما رہے۔

آنریبل راجہ صاحب کے کرسی صدارت پر تشریف لاتے ہی جناب ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی ادارہ نے مندوبین اور حاضرین کا استقبال فرماتے ہوئے ادارہ ادبیات اردو کی سالانہ روئداد پڑھ کر سنائی۔ یہ روئداد آئندہ صفحات میں درج ہے اس کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ جنگ کی پریشانیوں اور دوسری پریشانیوں کے باوجود ادارہ نے ۱۹۴۱ء میں گزشتہ سنین سے کچھ کم کام نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی روئداد کے بعد مطبوعہ نظام العمل کے مطابق اضلاع میں اردو کی ترقی اور شاخوں کی مصروفیتوں پر دو مختلف شاخوں یعنی گلبرگہ اور پربھنی کے نمایندوں مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے اور مولوی اشرف الدین صاحب فیضی (اردو فاضل) نے تقریریں کیں۔ اول الذکر صاحب نے علاقہ کرناٹک میں ادارہ کی شاخیں اردو کی جو خدمت کر رہی ہیں اس کا اور موخر الذکر نے مرہٹواڑی میں جو کام ہو رہا ہے اس کا اجمالی تذکرہ بیان کیا۔ اور ادارہ نے دور دراز کے اضلاع میں علم کی روشنی پھیلانے کا جو تہیہ کیا ہے اس پر بصیرت افروز تبصرہ کیا۔

ان دو تقریروں کے بعد مولوی اظہر الدین صاحب مصنف کتب اردو دانی و مدرس مدرسۂ مشقی خیرت آباد نے اردو کی تعلیم کا نمونۂ درس دیا۔ اس درس کے لئے پولیس اور آبکاری کے ان ناخواندہ جوانوں کو بلالیا گیا جو جلسہ گاہ پر متعین تھے اور ان کے علاوہ معزز مہمانوں کے ساتھ جو ناخواندہ چپراسی آئے تھے ان کو بھی شریک کرلیا گیا۔ غرض معمر ناخواندوں کی ایک دلچسپ جماعت فراہم کرلی گئی اور نقشوں اور تصویروں کے ذریعہ سے مولوی اظہر الدین صاحب نے اردو پڑھانے کا آغاز کیا۔ یہ درس اتنا دلچسپ ثابت ہوا کہ جملہ حاضرین مع معزز صدر صاحب کے اس میں محو ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے اندر ہی مولوی اظہر الدین صاحب نے میز، کرسی، چاقو، اور پنسل کے الفاظ پڑھنا اور لکھنا سکھا دیا۔ یہ نمونہ کا درس خاص طور پر اضلاع کے مندوبین کے لئے مفید ثابت ہوا کیونکہ وہ اصحاب اضلاع میں اظہر الدین صاحب ہی کے لکھائے ہوئے نصاب کے ذریعہ سے اردو سکھانے کا نیک کام انجام دیتے ہیں۔ ادارہ مولوی محمد سجاد مرزا صاحب ایم اے پرنسپل عثمانیہ ٹرینگ کالج نائب صدر مجلس اردو امتحانات ادارہ کا شکر گزار ہے کہ انھوں نے نمونہ کے ان درسوں کا انتظام فرمادیا۔

نمونہ کے درس کے بعد آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر صدر جلسہ نے نواب غوث یار جنگ بہادر صوبہ دار میدک و سابق سرپرست شاخ ادارہ گلبرگہ سے خواہش کی کہ ان کی ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے نواب صاحب ان کا خطبۂ صدارت پڑھ کر سنائیں۔ نواب غوث یار جنگ بہادر نے پہلے ایک تمہیدی تقریر فرمائی جس میں ادارہ کی خدمات سے متعلق اپنے ذاتی تاثرات نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کئے اور آخر میں راجہ صاحب کے قدیم تعلقات کا اظہار کرکے ان کا خطبۂ صدارت پڑھ کر سنایا۔ معتمد کے شکریہ کے بعد یہ پہلا اجلاس تقریباً ۱۲ بجے برخاست ہوا۔

سالانہ روداد ۱۹۴۱ء

عالیجناب صدر صاحب معزز خواتین و حضرات۔

ادارۂ ادبیات اردو کی زندگی کے گیارہ سال ختم ہو چکے اور اب اس نے بارھویں سال میں قدم رکھا ہے۔ اس وقت میرا یہ خوشگوار فریضہ ہے کہ میں آپ کی خدمت میں اس کے گیارھویں سال کی مصروفیتوں کی ایک مختصر سی رپورٹ پیش کروں۔ کیونکہ اس کی تفصیلی رپورٹ ایک علحدہ کتابچہ کی شکل میں ماہ جنوری میں شایع ہو چکی ہے۔ اور غالباً آپ میں سے اکثر اصحاب کے ملاحظہ سے گزری بھی ہوگی۔ اور آپ نے معلوم کیا ہوگا کہ ادارہ کا گیارھواں سال اس یادگار جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات سے شروع ہوا جس کی صدارت ملک کے مشہور مدبر اور ماہر تعلیم مرحوم سر اکبر حیدر نواز جنگ نے فرمائی تھی اور جس کے بعد سے ادارے کی زندگی کا صحیح معنوں میں دوسرا دور شروع ہوا۔ اور یقین ہے کہ جس طرح اس ادارے کے پہلے دس سال اس کے علم دوست اور فاضل صدر نواب ڈاکٹر مہدی یار جنگ بہادر کی ذاتی دلچسپی اور نگرانی کی وجہ سے نہایت کامیاب گزرے یہ دوسرا دور بھی صاحب معزز ہی کی روز افزوں نوازشات اور ہدایات کے باعث اردو زبان اور ملک کی دیرینہ روایات کے شایان شان ثابت ہوگا۔ اور جب اس کی دوسری دہ سالہ سرگزشت لکھی جائے گی تو وہ بھی اس پہلی دہ سالہ سرگزشت کی طرح اردو زبان اور ادب کی خدمت کرنے والوں کے لئے ویسی ہی رہنما کا کام دے گی جیسی کہ شمالی ہند کے مختلف رسائل و جرائد کی آرا کے مطابق پہلے دس سالوں کی سرگزشت ادارہ کا کام دے رہی ہے۔

۱۹۴۱ء کے دوران میں ادارے نے اپنے بنیادی مقاصد کے تحت گزشتہ سالوں کے مطابق بہت سے کام انجام دیے۔

اس سال اس کی طرف سے حسب ذیل کتابیں اور کتابچے شایع ہوئے۔

۱۔ رسائل طبیہ ۲۔ انوار۔ ۳۔ میر محمد مومن۔ ۴۔ بلقان۔ ۵۔ چیونٹی۔ ۶۔ قواعد وضع ابطال دو انسائیکلو پیڈیا۔ ۷۔ معلومات اداره بزبان انگریزی۔ ۸۔ نمونہ اردو انسائیکلو پیڈیا۔

ان کے علاوہ حسب ذیل کتابوں کی تیاری و طباعت کا کام اسی سال شروع ہوا لیکن یہ ۱۹۴۲ء کے اوائل میں شایع ہوئیں۔

۱۔ کشمش ثانی۔ ۲۔ گارساں دتاسی۔ ۳۔ رات کا بھولا اور دیگر افسانے۔ ۴۔ ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۴۱ء میں۔

اس وقت ادارہ کی حسب ذیل کتابیں زیر طبع ہیں۔ ۱۔ نظام علی خاں آصف جاہ ثانی۔ ۲۔ سکندر جاہ آصف جاہ ثالث ۳۔ قواعد اردو۔ ۴۔ بلاغت ۵۔ لیلیٰ۔

مطبوعہ اور زیر طبع کتابوں کی یہ فہرست گزشتہ سالوں کے مقابلہ میں طویل نہیں ہے کیونکہ کاغذ کی گرانی اور کمیابی کی وجہ سے ادارے کو اپنی بہت سی منظورہ کتابوں کی طباعت کے کام کے آغاز کا موقع ہی نہ ملا۔

ادارے کا کام بارہ مختلف شعبوں پر مشتمل ہے اور اس سال یوں تو ہر شعبہ نے اپنے اپنے لائحۂ عمل کی سربراہی میں اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ کام انجام دیا لیکن چند شعبے ایسے ہیں جن کا کام خاص طور پر نمایاں رہا۔ ان میں اردو انسائیکلو پیڈیا، اردو امتحانات، کتب خانہ، سب رس، اور طلبہ کے شعبوں کے کام خاص کر قابل ذکر ہیں۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ اول الذکر دو شعبوں نے ادارے کی

افادیت اور شہرت میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ اردو امتحانوں کی وجہ سے اہلِ ملک نوشت و خواند کی نعمتوں سے مالا مال ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یقین ہے کہ جب ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں مملکت حیدر آباد کے پڑھے لکھے لوگوں کا شمار کیا جائے گا تو اردو داں عوام میں خاطر خواہ اضافہ محسوس کیا جائے گا۔ اس شعبہ کی خدمات کی تفصیلی رپورٹ اس کے قابل صدر مولوی سید علی اکبر صاحب آج شام کے جلسے میں سنائیں گے جس سے آپ پر واضح ہوگا کہ شعبۂ اردو امتحانات اپنے صدر اور نائب صدر مولوی محمد سجاد مرزا صاحب کی ذاتی دلچسپیوں کی وجہ سے کتنا نمایاں کام انجام دے سکا ہے۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کے کام میں ملک اور بیرون ملک کے مشاہیر علم و فضل نے جس فراخ دلی کے ساتھ ہمارا ہاتھ بٹانا شروع کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ اردو بے بس نہیں ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اچھے کاموں کا اعلیٰ پیمانہ پر آغاز کیا جائے اور کام کرنے والے اپنے خلوص اور کام کی وجہ سے دوسروں کا اعتماد حاصل کر سکیں اور خدا کا بڑا فضل ہے کہ ہم کو اس چیز کے حاصل کرنے میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کا کام آسان نہیں ہے اور نہ اس میں عجلت کی جا سکتی ہے۔ تاہم گزشتہ ڈیڑھ سال کی مسلسل کاوشوں نے اس شعبہ کو اس قابل بنا دیا ہے کہ اس کی پہلی جلد تقریباً تیار ہو چکی ہے۔ اس کام میں اگرچہ متعدد لائق و فاضل اصحاب شب و روز مصروف رہے ہیں لیکن خاص طور پر اس شعبہ کے دونوں اعزازی معتمد صاحبان یعنی مولوی فیض محمد صاحب و مولوی سید بادشاہ حسین صاحب کی پُرخلوص کوششوں کا کوئی شکریہ نہیں ادا کیا جا سکتا۔ اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب کن اصولوں اور طریقوں پر عمل میں آ رہی ہے اس پر مزید روشنی کل کے اجلاس کی ایک تقریر سے پڑ سکے گی۔

کتب خانہ نے گزشتہ سال نہ صرف اپنے قلمی نسخوں میں اضافہ کیا بلکہ اس کے جملہ مخطوطات کا ایک تفصیلی کیٹلاگ بھی مرتب ہو چکا ہے جس کی اشاعت کے بعد معلوم ہوگا کہ قلیل عرصہ میں ادارے نے نادر اور کمیاب قلمی کتابوں کا کتنا قیمتی ذخیرہ محفوظ اور مدون کر لیا ہے۔ اس میں متعدد نسخے ایسے ہیں جو یا تو خود مصنفوں کے لکھے ہوئے یا ان کی زندگی کے مکتوبہ ہیں یا جن کے کوئی اور نسخے کسی اور کتب خانہ میں موجود نہیں ہیں۔

ادارے کے ترجمان سب رس اور بچوں کا سب رس دونوں پابندی اور معیار کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ ان کی اشاعت بھی بڑھتی جا رہی ہے اور بیرون ملک کے خریداروں میں جو اضافہ ہو رہا ہے وہ خاص کر قابلِ ذکر ہے۔

شعبۂ طلبہ کے سلسلے میں یہ امر موجب مسرت ہے کہ اس کی متعدد شاخیں اضلاع میں قائم ہو چکی ہیں اور اس کے لائحہ عمل کے مطابق تحریری و تقریری مصروفیتوں میں خاص طور پر سرگرم عمل ہیں۔

۱۹۴۱ء کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس سال ادارے کی شاخوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور اکثر شاخوں نے باوجود مقامی دشواریوں کے ایسے نمایاں کام انجام دئے کہ ادارہ ان پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ جملہ شاخوں نے ان پڑھوں کو اردو پڑھانے کے سلسلے میں پوری جدوجہد کی اور یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۱ء میں شہر حیدرآباد کے مرکزوں کے علاوہ اضلاع میں ۱۱ مختلف مرکزوں میں امتحان لینے پڑے۔ اور چونکہ اضلاع کے جملہ امیدوار تقسیم اسناد کے جلسے منعقدہ ٹاؤن ہال باغ عامہ میں شریک نہ ہو سکتے تھے

اس لئے مختلف مقامات مثلاً کلیانی۔ گلبرگہ۔ پربھنی۔ وغیرہ میں صوبہ دار اور تعلقدار صاحبان کی صدارت میں تقسیم اسناد کے شاندار جلسے منعقد کئے گئے۔ اس طرح اضلاع کے رہنے والوں کو بھی ادارے کے کاموں سے عمدہ پیمانے پر واقف کرنے کا موقع ملا۔ اس امر کا اظہار بھی میرے لئے باعث افتخار ہے کہ ان سالانہ اجلاسوں میں ہماری دعوت پر ادارہ کی ۱۶ شاخوں کے نمائندے شریک ہو رہے ہیں۔ ان اصحاب نے جس ایثار کے ساتھ دور دور کے مقامات سے جن میں بنگلور بھی شامل ہے سفر کی زحمت گوارا فرمائی ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کے دل میں عمل کا کتنا لطیف جذبہ کس حد تک موجزن ہے۔

گزشتہ سال جن شاخوں نے نمایاں طور پر ادارے کے کاموں میں حصہ لیا ان میں گلبرگہ۔ کلیانی پربھنی اور پرلی کی شاخیں خاص کر قابل ذکر ہیں۔ گلبرگہ میں نواب غوث یار جنگ بہادر اور مولوی ذو الفقار علی صاحب حقانی نے شاخ کے معتمد مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے کی پوری اعانت فرمائی۔ اور اب مولوی امیر علی خاں صاحب صوبہ دار اور مولوی جمیل حسن صاحب تعلقدار بھی گلبرگہ کی شاخ میں خاص طور پر دلچسپی لے رہے ہیں پربھنی کی شاخ مولوی عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری کی رہنمایانہ سرگرمیوں کی وجہ سے روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ پرلی کی شاخ مولوی اشرف الدین صاحب شفیقی کے پرخلوص مساعی کی وجہ سے دور دور کے دیہاتوں میں اپنا فیض پہنچا رہی ہے۔ چنانچہ پربھنی اور پرلی دونوں جگہوں کی شاخوں کے ارباب کار اپنے مقاصد کی تبلیغ میں اس خوبی سے مصروف عمل ہیں کہ اس اثنا میں اطراف و اکناف کے بہت سے مقامات مثلاً بردا پور۔ دھانورہ۔ مومن آباد۔ اطرس۔ دیولا وغیرہ میں بھی ادارے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اسی طرح گلبرگہ کے نوجوانوں نے اپنے اطراف و اکناف کے مقامات مثلاً شاہ آباد و رہمنا آباد وغیرہ میں بھی شاخیں قایم کردی ہیں۔ اور بڑی مسرت کا مقام یہ ہے کہ اکثر شاخوں کے ارباب کار میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو اصحاب بھی برابر سرگرم عمل ہیں چنانچہ کپل۔ دھانورہ۔ کشگی اور بردا پور کی شاخوں کے کام زیادہ تر ہندو صاحبان ذوق ہی کی صدارت یا معتمدی میں خاطر خواہ نشو ونما حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں بلونت راؤ صاحب گھاٹے منصف کشگی۔ بسٹپا صاحب ساہو کشگی۔ نارائن راؤ صاحب بی ایس سی کپل۔ کرشناجی صاحب۔ لنگپا صاحب۔ چودھری پنڈت رنگناتھ راؤ صاحب جوشی اور پنڈت کرشناجی گوبند راؤ صاحب۔ پانڈو رنگ راؤ صاحب دیسکھ (جو بردا پور کی مجلس انتظامی کے صدر معتمد و اراکین ہیں) نیز پنڈت ڈتارے گوبند راؤ صاحب وکیل۔ پنڈت ناگو راؤ صاحب۔ بھگونت راؤ صاحب۔ گوبند راؤ صاحب پٹیل۔ نانا راؤ صاحب پٹواری (جو شاخ دھانورہ کے صدر و معتمد و نائب معتمد و اراکین ہیں) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان اصحاب کے علاوہ پنڈت راگھوبند راؤ صاحب جذب وکیل عالم پور۔ راجہ نرسنگ راج بہادر عالی۔ پنڈت ونشی دھر ودیا النکار۔ مسٹر مہندر راج سکسینہ ایم ایس سی۔ اور مس جیسی نندی صاحبہ شروع ہی سے ادارے کی مختلف مجلسوں میں عملی طور پر ہاتھ بٹاتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر۔ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کیونکہ صاحب ممدوح نہ صرف اپنے زرین مشوروں سے ہمیں مستفید کرتے ہیں بلکہ خود بھی اس کے جلسوں اور علمی صحبتوں میں شرکت فرماتے رہتے ہیں۔

یہ تو صرف ان اصحاب کا ذکر تھا جو مملکت حیدرآباد میں ہماری عملی مدد فرما رہے ہیں۔ لیکن بیرون ریاست بھی بہت سے ایسے بزرگ ہیں جو دل سے ہمارے ساتھ ہیں اور ہمارے کاموں میں ہر طرح سے مدد کرتے رہتے ہیں۔ ان میں پنڈت دتاتریہ کیفی، پروفیسر ڈاکٹر سدھیشور ورما۔ ڈاکٹر جوشی ناظم کتب خانہ بمبئی۔ پروفیسر ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کلکتہ۔ اور ڈاکٹر تاراچند صاحب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ادارے کے کاموں میں نواب بہادر یار جنگ بہادر، مولوی ابوالحسن سید علی صاحب ایڈوکیٹ۔ مولوی اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر۔ قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام اور مولوی غلام احمد خاں صاحب نے بھی ہر موقع پر ہماری مدد فرمائی ہے۔ آخر میں مختلف شعبوں کے معتمدین و اراکین کے علاوہ اراکین مجلس انتظامی اور خاص کر اس کے نائب صدر مولوی لیاقت اللہ خاں صاحب کا ذکر ضروری ہے جن کی رائے اور رہنمائی کے تحت اس ادارے نے آج وہ کچھ کیا ہے جو دوسرے اداروں اور انجمنوں کو طویل العمری کے باوجود نصیب نہ ہوسکا۔

اس روداد کے خاتمے میں ایک ایسی ناکامی کا ذکر بھی ضروری ہے جو گزشتہ پانچ سالوں کی مسلسل کوششوں کے بعد بھی ناکامی ہی رہی۔ وہ یہ ادارے کی عمارت کا مسئلہ ہے۔ ادارے کا علمی و ادبی ذخیرہ اتنا کثیر ہوگیا ہے اور اس کے کام اتنے وسیع ہوچکے ہیں کہ اس کے لئے اب موجودہ مکان قطعاً ناکافی ثابت ہورہا ہے۔ ادارے کے لئے ایک ذاتی عمارت کی بےحد ضرورت ہے اور یہ ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے جس کی تکمیل کے بعد ہی ادارے کو اطمینان کے ساتھ اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کا موقع ملے گا۔

سید محی الدین قادری زور

سنہ ۱۹۴۱ء کی چند مطبوعات ادارہ

میر محمد مومن:۔ سلطنت قطب شاہیہ کے مشہور پیشوا، سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم، حیدرآباد کے مشہور تعمیر کارانہ مصلح اور بانی دا… میر مومنؒ کے حالاتِ زندگی اور علمی و رفاہی اور سیاسی کارناموں کا مفصل تذکرہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ یہ ضخیم کتاب جو ۳۰۰ سے زیادہ صفحات اور ۴۴ عکسی تصاویر پر مشتمل ہے۔ کئی سال سے زیر طبع تھی۔ دکن کی علمی و سیاسی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حیدرآباد کے اس سابق وزیر اعظم کے کارناموں کے مطالعہ سے مفید معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ قیمت مجلد عالی

انوار:۔ جناب علی اختر صاحب کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ ہر شعر ان کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعہ کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا۔ قیمت عہ

یہ کتابیں سب رس کتاب گھر، خیرت آباد حیدرآباد دکن سے طلب کرسکتے ہیں۔

خطبۂ صدارت عالیجناب آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر

(جو پنجشنبہ، ۲۲ اردی بہشت ۱۳۵۱ف صبح ساڑھے نو بجے ادارۂ ادبیات اردو کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا۔)

جناب معتمد صاحب ادارہ و محترم خواتین و حاضرین۔

آج کے اجلاس کی صدارت جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر ادارہ نے قبول فرمائی تھی مگر چونکہ ممدوح کو اہم سرکاری ضروریات کی وجہ سے دہلی روانہ ہونا پڑا، لہذا مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ میں ان کے فرائض انجام دوں۔ اس اعزاز کے لئے میں ادارہ کا ممنون ہوں۔ خرابی صحت نے مجھے اجازت نہ دی کہ میں جملہ اجلاسوں کی پوری کارروائیوں میں شریک رہتا جس کی مجھے بہ دل خواہش تھی۔ امید ہے کہ میری معذرت ان حالات میں قابل پذیرائی ہوگی۔

ادارۂ ادبیات اردو کے پہلے دس سال کی تفصیلی روئداد جو طبع اور شایع ہو چکی ہے اس کو آپ حضرات نے پڑھا ہو گا۔ ملک کے چند مایہ ناز نوجوانوں نے اولوالعزمی کے ساتھ اس کا آغاز کیا اور اس ادارہ کی عین خوش قسمتی تھی کہ اس کو ابتدا سے نواب مہدی یار جنگ بہادر سا ہمدرد نصیب ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادارہ کو جو کچھ کامیابی اب تک ہوئی ہے اس کی زیادہ تر وجہ اس عملی دلچسپی سے منسوب کی جاسکتی ہے جو نواب صاحب ممدوح اس ادارہ کے کام میں ہر قدم پر ظاہر فرماتے رہے۔ اس سلسلہ میں رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر مرحوم کے اسم گرامی کا تذکرہ ضروری ہے جن کو ادارہ سے خاص انس تھا اور جن کی وفات نے ادارہ کو ایک شفیق سرپرست اور ہمدرد سے محروم کر دیا۔

آپ حضرات کو معتمد صاحب کی رپورٹ سماعت کرنے سے اندازہ ہو چکا ہو گا کہ ادارہ کے مقاصد کتنے بلند ہیں۔ بلند عزمی کے قطع نظر ادارہ بعض ایسے کام بھی کر رہا ہے جن کی ازبس ضرورت تھی۔ ان میں سے ایک کام قلمی نسخوں کو یکجا کر کے انھیں دست برد زمانہ سے بچانا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس باب میں کوئی منظم کوشش کسی غیر سرکاری جماعت کی جانب سے آج تک یہ مشکل کی گئی ہوگی۔ آنیوالی نسلیں اس ذخیرہ کو جس قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گی اور اس سے مستفید ہوں گی وہ عیاں ہے۔ ایک اور مہتم بالشان مہم جس کا آغاز ہو چکا ہے اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب ہے۔ ہندوستان کی بعض اور زبانوں مثلاً مرہٹی میں انسائیکلوپیڈیا ترتیب دی جا چکی ہے مگر اردو اب تک اس سے محروم رہی۔ اگر اس کی تکمیل ہو جائے اور ہمیں توقع رکھنا چاہیے کہ ادارہ کے سرگرم کارکن اس کو پورا کر کے چھوڑیں گے تو اردو ادب اپنی ترقی کا ایک اور زینہ طے کرلے گا۔

مذکورہ صدر دو کوششیں وہ ہیں جو اس ادارہ کے مقاصد کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ادارہ اردو کی ترویج کے لئے امتحانات لیتا ہے، اسناد دیتا ہے اور اس کی جانب سے جرائد جاری ہیں جو اردو داں پبلک میں بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ بچوں میں اردو ادب کا مذاق پیدا کرنے کے لئے بھی ادارہ نے جو کچھ انتظام کر رکھا ہے وہ قابل استحسان ہے۔

جناب معتمد صاحب نے اپنی تقریر میں مسرت کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی ادارہ کے کام میں ترقی دینے کے لئے کوشاں ہیں مگر مجھے اس سے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اردو کو ملک کی مشترکہ زبان قرار دینے کا احساس ملک کے ہر فرقہ کے سنجیدہ اشخاص میں عرصہ سے موجود ہے اور مجھے امید واثق ہے کہ یہ احساس ترقی ہی کرتا رہے گا خواہ آثار و علائم عارضی طور پر اس کے خلاف کیوں نہ ظاہر ہوتے ہوں۔

معتمد صاحب نے اپنی تقریر میں میری جانب بھی اشارہ کیا ہے جس کے لئے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرے لئے کوئی امر اس سے زیادہ خوشی کا موجب نہیں ہو سکتا کہ میری کوئی خدمات ادارہ کے کام آسکیں۔ یہاں پر بے محل نہ ہوگا اگر اس واقعہ کا اظہار کیا جائے کہ میرے خاندان کو ادب اردو سے خاص شغف رہا ہے اور اردو کے متعدد شاعر اور مصنف اس نے پیدا کئے ہیں۔

میں ارباب ادارۂ ادبیات اردو کو ان کے مساعی پر مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے اپنی جماعت میں بلا اختلاف مذہب و ملت و جنس ہر خیال اور ہر طبقے کی خواتین و اصحاب کو شریک کیا اور یہ متحدہ جماعت ملک کی قدیم روایات کے مطابق ایک متحدہ مقصد کے لئے خوبی کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

قبل اس کے کہ میں اپنی تقریر ختم کروں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت سلطان العلوم شاہ ذیجاہ نے اردو کی سرپرستی فرما کر جو عظیم الشان جامعہ قایم فرمائی ہے اور اس زبان کو علم کی صورت میں تبدیل کرنے کی طرف جو توجہ شاہانہ منعطف فرمائی ہے اس سے دکن کے گوشے گوشے میں علم کی نورپاشی نے ذرہ ذرہ کو منور کر دیا ہے۔ آج ادارۂ ادبیات اردو کا مرکز بھی زبان اردو کی خدمت کے لئے جن ان تھک مساعی سے کام لے رہا ہے ان سے یقین ہے کہ آئندہ ایسے تعلیم یافتہ وفا شعار اور جاں نثار ملک و مالک اس ادارہ سے نکلیں گے جن میں وطن کا پریم اور مالک کی خیر سگالی کا وہ جذبہ موجزن رہے گا جو ان کو سلف سے حاصل ہے۔

میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں آپ آمین کہئے کہ خداوند تعالیٰ سلطان العلوم شاہ ذیجاہ کو تادیر ہم پر سایہ گستر رکھے اور یہ ریاست ابد مدت تا حشر پھلے پھولے۔ شاہزادگان بلند اقبال و شہزادیان فرخندہ فال حضرت ظل سبحانی کے دامان عواطف میں شاد و آباد رہیں۔

اب میں اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے امید واثق رکھتا ہوں کہ ادارۂ ادبیات اردو کے یہ اجلاس پوری طرح کامیاب رہیں گے۔

اضلاع میں اُردو کی ترقی اور شاخوں کی مصروفیتیں

صدر عالی قدر، معزز خواتین اور محترم حاضرین۔

سب سے پہلے مجھے شکریہ ادا کرنے کی اجازت ملنی چاہیے کہ اس ناچیز کو اس موقع پر کچھ سمع خراشی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اگر چہ کہ اس کام کے لئے اس ناچیز سے بہتر قابلیت رکھنے والے افراد موجود ہیں لیکن پھر بھی "زرہ امتثال امر" تعمیل ارشاد کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

اپنے موضوع کا آغاز کرنے سے قبل اگر ادارے کے متعلق اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں تو امید ہے کہ قابلِ معافی سمجھا جاؤں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ضروری اور اہم تحریک تھی، ایسی تحریک جس پر ہماری قومیت کی تشکیل اور تاسیس ہو سکتی ہے۔ اس کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اس پیش پا افتادہ حقیقت کا اظہار کرنا آپ بزرگواروں کی اعلیٰ معلومات سے گستاخانہ پیش آنے کا مترادف ہوگا کہ زبان پر ہی ہماری قومیت کی بنیاد ہے۔ قومیت مع اپنے پورے اجزا اور لوازم کے ایک حد تک زبان ہی کی اساس پر قایم ہے۔ ایسے ضروری اور اہم فرض کو ہم میں سے اکثر نے نظر انداز کر دیا تھا۔ مگر ادارہ اور اس کے عالی دماغ اور پیش بیں بانی نے اپنی حیرت انگیز بصیرت سے وقت کی اس اہم ضرورت کو محسوس کیا۔

بزرگوارو۔ کسی چیز کا محسوس کرنا اور اپنی دماغی فضا کو اس کی جولاں گاہ بنائے رکھنا ایک فلسفی اور مفکر کے لئے سزاوار ہو تو ہو لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی تخیل خواہ وہ کیسا ہی بلند، حیرت انگیز اور اچھوتا ہی کیوں نہ ہو اگر وہ حقایق پر منتج ہونا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ عملی قوا میں اس کا بروز ہو۔

جو مقاصد کہ ادارے نے متعین کئے ہیں ممکن ہے کہ یہ منفرداً یا مجموعی حیثیت سے دوسروں کے دماغ میں بھی پیدا ہوئے ہوں لیکن یہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ مدظلہٗ ہی کی تعاقب فکر تھی جس کی گرفت میں یہ مسئلہ اپنی پوری عملی حیثیت کے ساتھ جلوہ گر ہوا اب یہ ہمارا کام ہے کہ آپ کے بتائے ہوئے راستے اور آپ کی مشعلِ ہدایت کی روشنی میں ہم منزل مقصود کی طرف جلد جلد قدم بڑھائیں۔

یہ بانی ادارہ کے ایثار، خلوص اور جوش عمل ہی کا نتیجہ ہے کہ حیدرآباد سے باہر اضلاع اور قصبات میں بھی اردو زبان اور ادب کی خدمت کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہو چلا ہے۔ اور ہر شخص اس کی ترقی اور توسیع کے لئے مستعد نظر آ رہا ہے۔

بلدہ سے باہر ادارہ کی شاخوں کے قیام کا کام دو سال سے شروع ہوا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس میں ادارے کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی چنانچہ اب تک پرلی، گلبرگہ، کلیانی، کشٹگی، خانہ پور، کیل، چیتاپور، شاہ آباد، محبوب نگر، ہمناآباد، بلارم، دھانور، بزرگ اور برداپور میں شاخیں قایم ہو چکی ہیں۔ ادارے کی یہ شاخیں مختلف طریقوں سے اضلاع میں اردو زبان اور ادب کی ترویج اور توسیع میں کوشاں اور صدر ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے مقاصد کے تحت سرگرم عمل اور مصروف کار ہیں۔

جو لوگ ابتدائی تعلیم ختم کرکے تھوڑی ہی مدت میں پڑھا پڑھایا بھول کر پھر قعر جہالت میں جا گرتے ہیں، ان کی خواندگی برقرار رکھنے اور ان میں مطالعہ کا ذوق پیدا کرنے کی خاطر شاخوں نے دار المطالعے قایم کئے ہیں۔ جہاں اردو زبان کے مختلف رسائل، اخبارات اور کتب منگوائے جاتے ہیں اور عوام کو استفادہ کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

ایسے ناخواندہ افراد جو مدارس میں نہ شریک ہو سکتے ہیں اور نہ اپنے کاروبار کی وجہ سے مدارس کے اوقات کی پابندی کر سکتے ہیں، ہماری شاخیں ایسے پختہ عمروں کی تعلیم کا بھی انتظام کر رہی ہیں۔

ادارے نے جو اردو امتحانات قایم کئے ہیں، یہ شاخیں ان امتحانات کا چرچا کرکے لوگوں میں اردو سیکھنے اور اس کے ذوق کو ترقی دینے کا شوق پیدا کرانے میں بھی مصروف ہیں۔

محترم حضرات! ناچیز کی تقریر کا موضوع "اضلاع میں اردو کی ترقی اور شاخوں کی مصروفیتیں" ہے لیکن مجھے صاف طور پر اس کا اعتراف کر لینا چاہئیے کہ میری یہ ناچیز تقریر اضلاع یا اقلاً ایک پورے ضلع پر بھی محتوی او مشتمل نہ ہوگی اس لئے کہ اس عاجز نے ایک چھوٹے سے قصبے ہی میں کچھ کام کیا ہے اور اس سلسلے میں اس کی مضافاتی آبادیوں میں بھی کچھ خدمات انجام دینے کا موقع ملا ہے بہرحال تقریباً دو سالہ ناچیز تجربات کا خلاصہ اور نتائج نہایت ادب سے آپ حضرات کے روبرو پیش کئے جاتے ہیں

واجب الاحترام بزرگو۔ خلوص کی بہت زیادہ تعریف کی گئی ہے۔ اور اب یہ لفظ اس قدر عامتہ الورود اور کثیر الاستعمال ہو گیا ہے کہ اس کی معنوی اہمیت کی طرف بہت کم خیال منتقل ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کو استعمال کئے بغیر چارہ نہیں۔ مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ کسی قومی یا علمی خدمت کے لئے سب سے پہلے اس لفظ کی معنوی حیثیت مطلوب ہے۔ جب تک کوئی کام ذاتی اغراض، نفسیاتی خواہشات اور مفادات ذاتیہ سے مبرا نہ ہوگا اس وقت تک وہ حقیقی نتائج کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اردو اد بے خدمت گزار کو بھی یہی چاہیے کہ وہ اس سطح سے بلند ہو کر کچھ کام کرے۔ شاید یہ اسی لفظ کا ایک معمولی پرستار ہونے کا نتیجہ تھا کہ اس ناچیز کو پرلی اور اس کے مضافات میں کچھ تھوڑی بہت کامیابی نصیب ہوئی ہے۔

تشہیر اور پروپگنڈا، ہر کام کی تکمیل کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے جب تک کہ عوام کو انہی کے لب و لہجہ میں، انہی کے سوچ بچار کے طریقوں سے کام لے کر اور ان کے سادہ دیہاتی جذبات کو اکسا کر اردو کی طرف مائل نہ کیا جائے گا اس وقت تک کامیابی یقیناً مشتبہ ہی رہے گی۔ پروپگنڈے کے طریقے شہروں میں کچھ اور ہوتے ہیں اور دیہاتوں میں کچھ اور، شہروں میں بڑے بڑے پوسٹروں، جلی حروف کے اشتہاروں اور اخبار کے کالموں سے یہ ضرورت پوری کی جا سکتی ہے۔ لیکن دیہاتوں میں خاص خاص طریقوں سے اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مقامی بولیوں سے واقف ہونا بڑی اہم چیز ہے مثلاً مرہٹواڑی میں کام کرنے والے کے لئے مرہٹی دانی لزومی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم زبانی سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔ اردو کی دعایت کے لئے بھی یہ حربہ نہایت ہی کارگر ہے۔

محترم حضرات! انسان کسی ایسے کام کی طرف بمشکل ہی آمادہ کیا جا سکتا ہے جس سے اس کا ذاتی مفاد وابستہ نہ ہو، اردو کے داعی کے لئے بھی اس گر سے آگاہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ دیہاتیوں کو اردو دانی و اردو آموزی کی طرف مائل

مائل کرتے ہوئے جب تک ان کے کسی ذاتی فائدے کی طرف اشارہ نہ کیا جائے گا اس وقت تک حصول مقصد میں کامیابی یقینی نہیں کہی جا سکتی یہ چیز داعی کے تجربے، مشاقی اور اس کی پختہ کاری پر موقوف ہے کہ وہ اردو دانی سے ان کے مقاصد کو وابستہ کرے مثلاً دیہات کے پٹیل پٹواریوں کو یہ بتایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے کاروبار، اپنے متعلقہ قوانین، دورہ کنندہ عہدہ داروں سے بات چیت اور گفتگو کرنے کی مہارت یہ ساری چیزیں اردو دانی پر موقوف ہیں اور اس طرح وہ اپنے فرائض زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ یہ مثال اس عاجز نے نمونے کے لئے استطراداً طور پر پیش کی ہے۔ یہ تجربہ ہی تبلا سکتا ہے کہ ہر شخص کے ذاتی رجحانات، اس کی افتاد طبع، طبعی و ذہنی خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر کس طرح ترغیب میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

تعلیم دینے اور پڑھانے کے سلسلے میں بھی اس موقع پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ترغیب کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہے۔ ہر دیہات میں ترغیب دہی کے عمل کے بعد تعلیم کے لئے پڑھانے والوں کی فوری ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے داعی کو قبل از قبل اس کے لئے بھی تیار رہنا چاہیے۔ اس کو چاہیے کہ اپنے مستقر پر اپنی کوشش اور جد و جہد سے ایسے نوجوانوں کو جو برسر کار نہ ہوں اور بیکاری میں اپنا وقت ضایع کر رہے ہوں اس کام کے لئے تیار کر رکھے۔ اسے چاہیے کہ وہ ان نوجوانوں میں زبان اردو سے اتنی وافر محبت اور اس کی خدمت کرنے کا اتنا ولولہ پیدا کر دے کہ اس کے تعین کردہ دیہات پر وہ بخوبی چند ہفتوں کے لئے کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں چنانچہ اس عاجز نے اسی پر عمل کیا۔ پربنی پر ایسے نوجوانوں کی ایک خاص جماعت بنالی گئی ہے اور دورہ کرنے کے بعد جن جن دیہاتوں میں ضرورت سمجھی جاتی ہے وہاں انہیں متعین کر دیا جاتا ہے۔

آخر میں اردو آموزی کی ابتدائی کتابوں کے متعلق جو ایک نئے نصاب کی حیثیت رکھتی ہوں کچھ عرض کروں گا اس سلسلے میں صرف دو کتابیں موجود ہیں۔ یعنی اردو دانی کی پہلی اور دوسری کتاب میں یہ عرض کرنے کی بہ ادب معافی چاہتا ہوں کہ صرف یہ دو کتابیں ہمارے کار و بار کی وسعت اور مخصوص مقاصد کے لحاظ سے بہت ناکافی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اردو آموزی کا جماعت واری ایک خاص نصاب مرتب کریں اور اس میں اس قدر تنوع اور ہمہ گیری ہو کہ ایک پورے نصاب کی حیثیت سے وہ ملک سرکار عالی کے حلقہ گوشوں میں متداول ہو جائے۔ ایک ایسا نصاب ترتیب دیا جانے تو اس ناچیز کے خیال میں یہ اردو ادب کی ایک عظیم الشان خدمت ہوگی اور کیا تعجب کہ ادارے کا مرتب کردہ یہ نیا نصاب پورے ہندوستان میں رائج ہو جائے اور باہر کے لوگ بھی اس سے متمتع ہوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ایسے نصاب کے ترتیب دیے جانے کے بعد اردو کے خدمت گزاروں کی فتوحات کئی گنا بڑھ جائیں گی اور اردو دانوں کی جماعت میں بہت بڑا اضافہ ہوگا۔

اشرف الدین فقیہی

اضلاع میں اردو کی ترقی

جناب صدر، خواتین و حضرات! ادارۂ ادبیات اردو زبان و ادب کی ٹھوس اور ہمہ گیر خدمات انجام دے رہا ہے۔ موجودہ زمانہ کی اہم لسانی ضروریات اور ادبی احتیاجات کا لحاظ کرتے ہوئے اس آصفی گہوارۂ تہذیب و تمدن میں اردو کی ترقی اور اشاعت کے لئے اس ادارہ کی طرف سے بے نظیر خدمات انجام دی گئیں۔ ہمارے ملک میں جہاں بہت سی انجمنیں بنتی اور بگڑتی ہیں ــــ یہ ادارہ آج دس برس سے ترقی کی شاہراہ پر مسلسل گامزن ہے اور ہر سال بلکہ ہر مہینہ زبان کی ترقی اور وسعت کی نئی شاہ راہیں تلاش کی جارہی ہیں۔ دردمندانِ زبان اور بہی خواہانِ ادب ہر وقت زبان کی ترقی کے خیال میں منہمک رہتے ہیں۔ یہی ان کا مرغوب مشغلہ اور یہی ان کا محبوب مرحلۂ شوق ہے۔ پیغمبر شاعری علامہ اقبال نے شاید ان ہی لوگوں کے متعلق ایک مرتبہ کہا تھا ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی ‎ ‎ ‎ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

بلدہ فرخندہ بنیاد میں ایک علمی فضا اور تمدنی ماحول موجود ہے مگر مملکت کے دور دراز کے مقامات اس علمی چہل پہل اور ادبی سرگرمی سے ناآشنا ہیں۔ اور زبان کی ہمہ گیریت کے لئے ضروری ہے کہ وہ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ہر قصبہ اور ہر گاؤں میں گھس کر زمان اور مکان کے سارے قیود توڑ ڈالے۔ اس خیال کے پیش نظر چند سال قبل اضلاع میں بھی ادارہ کی شاخیں قائم کی گئیں۔ مسرت کا مقام ہے کہ اتنے قلیل عرصہ میں آج پچیس۲۵ شاخیں کامیابی کے ساتھ سرگرم عمل نظر آتی ہیں۔ جن انجمنوں کی بنیاد ذاتی اغراض، موقتی جذبات یا طبقہ واری منفعت پر ہوتی ہے وہ خزاں رسیدہ پتیوں کی طرح جلد مرجھا جاتی ہیں لیکن جن اداروں کی بنیاد جیسا کہ ادارۂ ادبیات اردو ہے ایثار و خلوص اور قربانی کے سنگ و خشت سے ہوتی ہے وہ آہنی قلعوں کی طرح مستحکم اور غیر متزلزل ہوتے ہیں۔

اضلاع میں اردو کی ترقی کے لئے ادارہ کی شاخیں مختلف طریقوں سے مصروفِ عمل ہیں۔ شاخوں کی جانب سے اُن پڑھ لوگوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ بچے، جوان اور بوڑھے جو مدرسہ کی تعلیم سے محروم ہیں ان شاخوں کی توجہ سے سیکڑوں کی تعداد میں روزآنہ مستفید ہو رہے ہیں اور وہ حضرات جو لکھنا پڑھنا سیکھ گئے ہیں، ادارہ کے مختلف امتحانات اردو دانی اردو عالم اردو فاضل کے ذریعہ علم کی پیاس بجھا رہے ہیں۔ ان لوگوں کے علمی ذوق کی آبیاری کے لئے مختلف اضلاع میں شاخوں کی جانب سے کتب خانے اور مطالعہ گھر کھولے گئے ہیں جن سے نہ صرف ادارہ کے طلبہ اور اراکین بلکہ دوسرے حضرات بھی ہزاروں کی تعداد میں استفادہ کر رہے ہیں۔ تحریری اور تقریری مقابلوں کے ذریعے سے اراکین کے ذوقِ مسابقت میں اضافہ کیا جا رہا ہے معلومات میں وسعت کی خاطر مختلف علمی، ادبی، سماجی اور معاشی موضوعات پر اصحاب بصیرت کی تقاریر کا انتظام کیا جاتا ہے۔ تفریحی جلسوں متعدد مشاعروں اور تعلیمی و سیاحتی جماعتوں کے ذریعے سے اس ہنگامہ پرور دنیا کی آلائشوں سے دور زندگی کے چند لمحات خالص تفریحی مشاغل میں بسر کرنے کے مواقع بھی فراہم کئے جاتے ہیں، جہاں وہ باہمی میل جول اور تبادلۂ خیالات کے ذریعے سے معلوم ہو۔ یہ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جارہے ہیں بعض مقامات پر تو ادارہ کی شاخیں وہاں تمام علمی اور ادبی

تحریکات کے لئے ایک نمایاں اور مرکزی حیثیت حاصل کر رہی ہیں۔ ان میں گلبرگہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جناب مولوی سید ذوالفقار علی صاحب حقانی پرنسپل گلبرگہ کالج کی ذاتی دلچسپی کی بدولت یہ شاخ مستحکم بنیادوں پر سرگرمِ عمل ہے۔ حال ہی میں محترمہ محمدی بیگم صاحبہ بی۔اے (مسز جمیل حسن صاحب اول تعلقدار گلبرگہ) کی صدارت اور محترمہ حمیدہ بانو بیگم صاحبہ مخفی کی معتمدی میں ادارہ کی شاخ نسواں بھی قائم ہو چکی ہے جو ایک بڑی کمی کی تلافی کرتی ہے۔ اب یہ ادارہ گلبرگہ کی خواتین کی علمی اور ادبی سرگرمی کی رہنمائی میں منہمک ہے۔ صوبۂ گلبرگہ میں جہاں ادارہ کی کئی شاخیں، شعبہ جات طلبۂ شعبۂ نسوان، کتب خانے اور ادارہ کے امتحانات کے متعدد مرکز موجود ہیں ان نیک مقاصد کی استقلال اور مستعدی کے ساتھ تکمیل کی جا رہی ہے۔

غرض کہ نہ صرف بلدہ میں بلکہ اضلاع میں بھی اردو کی ترقی کے لئے غورکردہ نظام ناموں کے ذریعہ سے بہت کچھ ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ لیکن وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم سب بلا لحاظ مذہب و ملت، مسلک و سیاسی رجحانات اس مشترکہ زبان کو جس نے قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کے دامن میں پناہ لی جو اعلیٰ حضرت بندگان عالی کی ادب نوازی کے باعث پروان چڑھی، ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچایا جائے۔

اردو کی ترقی کے لئے جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا بے مثل ایثار اور ان کے ساتھیوں کی بے نظیر خدمات ادارہ کے شاندار مستقبل کی بشارت دیتی ہیں۔ اس پرآشوب زمانہ میں جب کہ دنیا انقلابات کی رو میں بہہ رہی ہے، اردو کی مخالفت میں بھی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ خود حامیانِ اردو بعض ذیلی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے سے دست بہ گریبان ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ محض ارضی اور صوبہ واری اختلافات کی آڑ میں بعض کوتاہ اندیش لوگ اپنی تعمیری قوتیں تخریبی کاموں پر صرف کر رہے ہیں۔ لیکن یہ زبان ان مخالفتوں اور خود فریبانہ ساعی سے مٹ نہیں سکتی کیونکہ یہ مشترکہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا واحد ورثہ اور ہندوستان کی مختلف قوموں اور ملکوں کے خوش گوار امتزاج کا نتیجہ ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ وابستگانِ اردو اور وارفتگانِ ادب انفرادی اور اجتماعی ایثار اور قربانیوں کے ذرائع سے زبان کے اس سفینہ کو طوفانِ مخالفت اور سیلِ حوادث سے بچائیں۔ زبان کی یہ مقدس شمع جو حضرت امیر خسروؔ کے ہاتھوں سلگی، جسے ولیؔ دکنی نے ساز، غالبؔ نے حرارت، حالیؔ نے درد اور اقبالؔ نے سوز عطا کیا اب بھی پروانوں کی دلسوزی کی طلب گار ہے۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے　　　شمع یہ سودائی دل سوزئ پروانہ ہے

محمد بن عمر

اطلاع:۔ اضلاع میں اردو کی ترقی کے لئے جو بہی خواہانِ اردو ادارہ کا ہاتھ بٹانا چاہیں وہ شاخوں کے قواعد و ضوابط کا مطالعہ فرمائیں۔ جو اس مجموعہ کے آئندہ صفحات میں درج ہیں۔

مہتمم

مشاورتی اجلاس

مطبوعہ نظام العمل کے مطابق عام اجلاس کے بعد دفتر ادارہ میں ایک مشاورتی اجلاس منعقد ہوا جس میں معتمدین شعبہ جات، اراکین مجلس انتظامی، رفقاء، اور شاخوں کے جملہ نمایندوں نے شرکت کی۔ یہ اجلاس ۲۶ مارچ ۱۹۴۲ء کو ۲ بجے سے ساڑھے تین بجے تک جاری رہا۔ اس مجلس میں مولوی محمد محبوب خاں صاحب یوسف زئی۔ بی اے ڈیپ ایڈ معتمد شاخ چیتاپور۔ مولوی اشرف الدین صاحب فیضی نمایندۂ پرلی۔ مولوی عبدالرشید خاں صاحب وکیل نمایندۂ ہنگولی۔ مسٹر بلونت راؤ صاحب گھاٹے بی اے ایل ایل بی منصف و صدر شاخ کشتگی وغیرہ نے ادارے کے عام امور اور شاخوں سے متعلقہ معاملات تبادلۂ خیال کے لئے پیش کئے۔ ابتداء میں جناب ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی ادارہ نے سالانہ اجلاسوں کے مقاصد کی وضاحت کی اور مشاورتی اجلاس میں جن امور پر بحث ہونی ہے ان کو واضح کیا۔

ادارۂ ادبیات اردو کے مسلک کو پیش کرتے ہوئے اردو کی موجودہ ضروریات کو بیان کیا اور اس نقطۂ نگاہ پر اہمیت دی کہ ادارہ اور اس کی شاخوں کو اردو ہندی جھگڑے میں نہیں الجھنا چاہیے۔ ہم کو کسی سے پرخاش نہیں ہے۔ ہمیں تخریبی سے زیادہ تعمیری نظام العمل کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ہندی اور طرف داران ہندی کی مخالفت کرنے یا ان کے مسائل میں الجھنے کی جگہ ادارے کے ارباب کار ہمیشہ صرف اردو کی خاموش خدمت کو اپنا مطمح نظر بنائے رہیں۔ ہمیں دوسری مقامی زبانوں مرہٹی، تلنگی، یا کنٹری کی بھی مخالفت یا تحقیر نہیں کرنی چاہیے بلکہ جہاں تک ہو سکے ان سب زبانوں کے بہی خواہوں کے ساتھ تعاون عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر ہو سکے تو ہم خود بھی ان زبانوں کی تحصیل کی کوشش کریں۔ بہرحال جن مقامات پر لوگ بحث و مباحثہ یا اختلاف پر اتر آئیں وہاں صاف طور پر اپنے مسلک کا اظہار کرتے ہوئے اس امر کو واضح کر دینا چاہیے کہ ہم کسی زبان کے مخالف نہیں ہیں کیونکہ قومی اور ملکی ترقی کے لئے سب کا مل کر ترقی کرنا ضروری ہے اور ہم سب کو چاہیے کہ ملک سے ناخواندگی دور کریں اور عوام کو لکھنے پڑھنے کی دولت سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔

شاخوں کے نمایندہ اصحاب نے اپنی جن مقامی دقتوں اور ضرورتوں کو بیان کیا اس سے متعلقہ حل سوچے گئے اور باہمی تبادلۂ خیال عمل میں آیا۔ اس گفتگو میں ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے ڈی فل معتمد شعبۂ زبان۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب رکن مجلس انتظامی، مولوی عبدالقادر صاحب سروری معتمد شعبۂ امتحانات۔ مولوی سید محمد صاحب ایم اے معتمد شعبۂ شعراء و مصنفین دکن۔ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی معتمد شعبۂ تاریخ دکن۔ مولوی سید بادشاہ حسین صاحب و مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ معتمدین شعبۂ اردو انسائیکلو پیڈیا نے بھی حصہ لیا اور ادارے کے کاموں اور اصولوں کی وضاحت کی۔ مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے معتمد شاخ گلبرگہ نے بعض امور سے متعلق کل صبح کے مشاورتی اجلاس میں تفصیلی تقریر کرنے کا پیش کش کیا۔ چونکہ چار بجے سے ٹاؤن ہال میں جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہونے والا تھا اس لئے ساڑھے تین بجے یہ مشاورتی اجلاس دوسرے روز کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی اس بے تکلف علمی صحبت نے مختلف مقامات کے اردو دوستوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ اور ادارہ اور اس کی شاخوں کے وہ ارباب کار جو محض اپنی زبان کی خدمت گزاری کے جذبہ کے تحت ایک دوسرے سے سیکڑوں اور ہزاروں میل کی مسافت پر رہنے کے باوجود اور کسی شخصی تعارف کے بغیر ہی گزشتہ کئی سال سے ایک مسلک کے مطابق کام کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا اس باہمی اختلاط اور بالمشافہ تبادلۂ خیال کی بناء پر توقع ہے کہ آئندہ اردو کے یہ خدمت گزار اپنی کوششوں کو زیادہ سرگرمی کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے۔

جلسۂ تقسیم اسناد و عصرانہ

(۲۶ مارچ ۱۹۴۲ء کو ٹاؤن ہال باغ عامہ میں ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات کا جو جلسۂ تقسیم اسناد و عصرانہ منعقد ہوا تھا

اس کی یہ روئداد اورینٹ پریس نے جملہ مقامی اخبارات میں شائع کی تھی۔)

"حیدرآباد۔ ۲۶ مارچ۔ بہشت ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام آج شام کو ۴ بجے دارالبلد باغ عامہ میں تقسیم انعامات و اسناد کا جلسہ زیر صدارت آنریبل نواب سر عقیل جنگ بہادر نائب صدر اعظم دولت آصفیہ منعقد ہوا۔ ۴ بجے سے قبل اسناد و انعام حاصل کرنے والے نیز علمی دلچسپی رکھنے والوں کی ایک کافی تعداد دارالبلدیہ میں جمع ہونا شروع ہوئی۔ بالائی منزل پر خواتین کی نشست کا معقول انتظام تھا۔ ٹھیک ۴ بجے آنریبل نواب سر عقیل جنگ بہادر تشریف لائے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ و معتمد ادارہ نے معتمدین شعبہ جات، اراکین مجلس انتظامی اور رفقائے نیز صدر شعبۂ اردو امتحانات مولوی سید علی اکبر صاحب کی معیت میں باب الداخلہ پر آنریبل موصوف کا استقبال کیا۔

خیر مقدم و روئداد نواب سر عقیل جنگ بہادر کے کرسی صدارت پر فائز ہوتے ہی جلسہ کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ مولوی سید علی اکبر صاحب نے صدر جلسہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے اردو امتحانات کی روئداد کو پڑھ کر سنایا۔ مجلس انتظامی کی عملی مصروفیتوں کے ضمن میں امتحانی انتظامات، نصاب کی تبدیلی، نصابی کتب کی تیاری اور جدید انتظام کا ذکر کرتے ہوئے ۱۹۴۱ء کے امتحانات کی تیاری ۔۔۔ میں شعبۂ امتحان نے مختلف ماہرین سے کوا پرٹیو ہال میں جو (۱۵) تقریریں کرائیں جن سے امیدواروں کے علاوہ عام علمی دلچسپی رکھنے والے افراد مستفید ہوئے اس کا ذکر کیا۔ یہ بھی بتلایا گیا کہ عورتوں کی تعلیم کا انتظام معتمد و صدر شعبۂ نسواں کی نگرانی میں ہوتا رہا۔ ادارہ کی مساعی جو ہر سال مشکور ہو رہی ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ تبلایا گیا کہ بلدہ اور اضلاع میں سال گزشتہ صرف آٹھ مرکز تھے اور سال حال ۲۱ مرکز پر امتحان لیا گیا۔ صدر مجلس امتحانات نے ان اصحاب کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے امتحانی مراحل کے طے کرنے میں ادارہ سے بے لوث اور پرخلوص تعاون کیا۔ ۱۹۴۰ء میں شرکا کی تعداد (۲۶۰) تبلائی گئی اور ۱۹۴۱ء میں (۶۰۰) امیدوار شریک امتحان رہے۔ گزشتہ سال (۱۹۵) اشخاص نے اردو سیکھی اور اس سال یہ تعداد (۴۳۵) تک پہنچ گئی۔ جس میں (۱۴۰) عورتیں اور (۹۵) غیر مسلم امیدوار شریک ہیں۔ امتحانات اردو فاضل، اردو عالم، خوش نویسی اور اردو دانی میں (۶۰۰) امیدوار شریک اور (۴۲۹) اول، دوم، سوم اور امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔

انعامات کا ذکر کرتے ہوئے مولوی سید علی اکبر صاحب نے فرمایا کہ اردو فاضل میں اول آنے والے کو سر عقیل جنگ بہادر نے طلائی تمغہ اور اردو عالم کے لئے ایک طلائی دستی گھڑی۔ نواب سالار جنگ بہادر کی طرف سے ایک طلائی تمغہ آنریبل سید عبد العزیز صاحب کی طرف سے نیز اردو عالم میں اول آنے والی طالبہ کے لئے بیگم صاحبہ نواب بہادر یار جنگ بہادر کی طرف سے ایک طلائی تمغہ عطا کیا گیا۔ ان انعامات کے علاوہ اضلاع کے مختلف اصحاب نے اپنے اپنے مرکزوں سے اول آنے والے طلبہ اور طالبات کے لئے نقروی تمغے عطا کئے جن کی تعداد (۲۴) ہے۔ اس تفصیل کے بعد اضلاعی مرکزوں کی کارگزاری اور مساعی کا ذکر رہا۔ جس کے ختم پر مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب نائب صدر مجلس انتظامی ادارہ نے آنریبل صدر جلسہ

سے تقسیم اسناد کی استدعا کی۔ انعام اور اسناد لینے والوں میں دو شخصیتیں بہت نمایاں تھیں ایک ذلیفہ یاب فوجی صاحب جن کی عمر (۶۰) سال سے متجاوز ہوگی۔ اور دوسرا ایک مسلمان لڑکا جس کی عمر (۹) سال سے کم تھی۔ تقسیم اسناد کے بعد مولوی عبدالقادر صاحب سروری نے عوام کا اور ڈاکٹر زور نے آنریبل نواب سر عقیل جنگ بہادر اور دوسرے معززین اور کارکنان ادارہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب میں ایک پر تکلف عصرانہ ترتیب دیا گیا تھا۔ اس طرح یہ علمی اجتماع تقریباً ۱/۲ ۶ بجے شام کو برخاست ہوا۔"

استدعائے تقسیم اسناد مطبوعہ نظام التمل اور ادارہ کی روایات کے مطابق ادارہ کے صدر آنریبل نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات و فینانس ادارہ سے متعلق ایک تقریر اور اسناد تقسیم کرنے کے لئے استدعا فرمانے والے تھے لیکن جناب موصوف اچانک سرکاری کام سے دہلی تشریف لے گئے اس لئے ادارہ کے نائب صدر مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب نے یہ فریضہ انجام دیا۔ جناب موصوف نے اپنی فی البدیہہ تقریر میں ادارۂ ادبیات اردو کی اس خوش قسمتی پر فخر کا اظہار کیا کہ عالیجناب نواب سر عقیل جنگ بہادر نے اپنی عادت کے برخلاف اس کے جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت قبول فرمائی۔ چونکہ نواب صاحب معز نمود و نمایش سے ہمیشہ دور رہتے ہیں اور باب حکومت میں اور اس کے باہر غرض ہر جگہ اپنی صداقت اور با اصول مسلک کے مطابق بیجا رو رعایت سے ہمیشہ اجتناب فرماتے ہیں اور اسی وجہ سے جلسوں اور مصنوعی آرائشوں سے دور رہتے ہیں اس لئے ان کا ادارہ کے اس جلسہ کی صدارت فرمانا ایک ایسا واقعہ ہے جو ادارہ کی افادیت اور ٹھوس کام کے لئے ایک بہترین سند کا کام دے گا۔ میری نظر میں ادارہ اور اس کے سرگرم معتمد ڈاکٹر زور صاحب کا معز کو صدارت کے لئے راضی کر لینا ایک معجزہ ہے۔ اس کا تو سب کو علم ہے کہ نواب سر عقیل جنگ بہادر کو علم و ادب کا ذوق اپنے خاندان اور خاص کر قابلِ احترام والد نواب عماد الملک مرحوم سے ورثہ میں ملا ہے۔ اور وہ ملک و بیرون ملک کی جملہ علمی و ادبی تحریکات کا خاموش مطالعہ فرماتے رہتے ہیں۔ رسالہ سب رس اور ادارہ کی دیگر مطبوعات پر نواب صاحب ہمیشہ گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور ان کی علم نوازی کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ انھوں نے اردو فاضل میں اول آنے والے امیدوار کو طلائی تمغہ ملتے رہنے کا اپنی جیب سے ایک مستقل انتظام فرما دیا ہے۔ اس کے بعد مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب نے تقسیم اسناد و انعامات کے لئے جناب صدر سے استدعا کی۔

عصرانہ جلسہ تقسیم اسناد اور عصرانہ میں شاخوں کے جملہ نمائندوں اور ادارے کے اربابِ کار کے علاوہ جن معززین نے شرکت فرمائی ان میں سے حسب ذیل اصحاب خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔

راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی۔ نواب غوث یار جنگ بہادر صوبہ دار میدک۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج۔ مولوی محمد نفیس الدین صاحب صدر مہتمم تعلیمات حیدرآباد۔ ڈاکٹر سید حسین صاحب سجل جامعہ عثمانیہ۔ مولوی محمد الیاس برنی صاحب ناظم دار الترجمہ۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب۔ پروفیسر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب۔ مولوی خواجہ محمد احمد صاحب مددگار ناظم آثار قدیمہ۔ مولوی غلام ربانی صاحب پرنسپل چادر گھاٹ ہائی اسکول۔ مولوی ظہیر الدین احمد صاحب نائب صدر محاسب۔ مولوی موید الدین حسن صاحب دوم تعلقدار۔ پروفیسر فضل حق صاحب نظام کالج۔ مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری معتمد سیاسیات۔ مولوی محمد حبیب الرحمن صاحب ناظم معلومات عامہ۔ ڈاکٹر رگھونندن راج صاحب سکسینہ

مولوی سید رحمت اللہ صاحب نائب معتمد امور عامہ۔ مولوی مرزا محمد بیگ صاحب ناظم اسٹیٹ پیشکاری۔ مولوی شبیر حاتمی صاحب مالک کتاب خانہ انجمن ترقی اردو۔ ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب پروفیسر نظام کالج۔ ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب مہتمم کتب خانہ آصفیہ مولوی محمد احمد عثمانی صاحب لکچرار سٹی کالج۔ مولوی ابو احمد صاحب لکچرار ٹریننگ کالج۔ مولوی غلام قادر صاحب وائس پرنسپل سٹی کالج مولوی قاسم علی سجن لال صاحب ایم اے۔

ادارہ کی شاخوں کے قاعدے اور طرز کار

حیدرآباد سے باہر اگر کسی مقام کے اہل ذوق اصحاب اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت کی خاطر اجتماعی طور پر کوشش کرنا چاہتے ہوں تو ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد صاحب اعزازی کے نام پانچ علم دوست اصحاب کے دستخطوں کے ساتھ ایک خط روانہ کریں تاکہ قیام شاخ کے لئے اجازت نامہ کا فارم بھیجا جائے۔ اس فارم کو بعد خانہ پری واپس کرنے پر معتمد صاحب مذکور ادارہ کی مجلس انتظامی سے منظوری حاصل کرکے قیام شاخ کی اطلاع دیں گے اور اس سلسلہ میں ضروری کارروائی کریں گے۔

ادارہ کی شاخوں کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(۱) ادارہ کے اردو امتحانات کا چرچا کرنا۔

(۲) امتحان زبان دانی کے لئے مفت تعلیم کا انتظام کرنا

(۳) اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات کی تعلیم کے لئے معاوضے کے ساتھ انتظام کرنا۔

(۴) اردو مطالعہ خانہ قایم کرنا۔

(۵) سب رس کے لئے قلمی معاون اور خریداروں کو فراہم کرنا۔

(۶) ادارہ کے قواعد کے تحت اپنے ارکان بنانا اور جمع شدہ رقم میں سے صرف نصف کی حد تک حصہ ادارہ کو روانہ کرنا اور نصف سے اپنی شاخ اور مطالعہ خانہ کے اخراجات کا انتظام کرنا۔

(۷) شاخیں سب رس کے جو خریدار فراہم کریں گی ان کے چندے کا ایک چوتھائی حصہ ادارے کی طرف سے بطور امداد اخبارات و رسائل کی صورت میں شاخوں کو دیا جائے گا۔

(۸) ہر شاخ کے دار المطالعہ کے لئے ادارہ کی تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ نصف قیمت پر دیا جائے گا اور شاخوں کی کوشش سے جس قدر مطبوعات فروخت ہوں گی ان پر کمیشن شاخوں کو دیا جائیگا۔

(۹) ان کے علاوہ شاخوں کے مزید قواعد و ضوابط وہی ہوں گے جو ادارۂ ادبیات اردو کے ہیں اور اس کے پہلے کتابچہ معلومات میں شایع ہو چکے ہیں۔

خیر مقدم و روداد شعبہ اردو امتحانات ۱۹۴۲ء

ادارۂ ادبیات اردو کے اردو امتحانات اب محتاج تعارف نہیں ہیں۔ گزشتہ سال سر اکبر حیدر نواز جنگ مرحوم کی صدارت میں اس کا جو پہلا جلسہ تقسیم اسناد و انعامات منعقد ہوا تھا اس میں ان امتحانات اور خود ادارے سے متعلق تعارفی امور پیش کر چکا ہوں۔ آج اس کا دوسرا سالانہ اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔ اور یہ میرا خوش گوار فریضہ ہے کہ میں آپ سب حضرات کا خیر مقدم کروں۔ ہم عالیجناب نواب سر عقیل جنگ بہادر کے خاص طور پر مشکور ہیں کہ ممدوح نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے آج کے جلسہ کی صدارت قبول فرمائی یہ ادارۂ ادبیات اردو کی خوش قسمتی ہے کہ ممدوح کو اس سے گہری دلچسپی ہے۔

یہ امر موجب مسرت ہے کہ اس سال کے امتحانات گزشتہ سال کے مقابلہ میں بہت کامیاب رہے۔ اس کی مجلس انتظامی جس کی صدارت کا مجھے فخر حاصل ہے برابر مصروف عمل رہی۔ چنانچہ اس نے امتحانات کے اہم انتظامات کے علاوہ نصاب کی تبدیلی، نصابی کتب کی تیاری، تعلیم کا انتظام اور امتحانات کے امیدواروں کے لئے تقریروں کا جو اہتمام کیا اس کی وجہ سے ان امتحانات میں زیادہ باقاعدگی پیدا ہوئی اور ان کے معیار و ترویج میں حسب دل خواہ ترقی ہوئی۔

اس سال ان امیدواروں کے لئے جنھوں نے اردو دانی کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد اپنی تعلیم جاری رکھی اور اپنے علمی ذوق میں اضافہ کرنے کی خواہش ظاہر کی ایک اور امتحان "اردو زبان دانی" کا قائم کیا گیا معلوم ہوا ہے کہ اس نئے امتحان کے لئے وہ تمام بالغ اور سن لوگ تیاری کر رہے ہیں جنھوں نے اس سال اردو دانی کا امتحان کامیاب کر کے پڑھی لکھی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ جیسا کہ آپ سب حضرات واقف ہیں ادارۂ ادبیات اردو کے اعلیٰ امتحانات میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مضامین نرے ادبی نہ ہوں بلکہ شرکا کے لئے عملی طور پر مفید اور ان کی زندگی میں کار آمد ثابت ہوں۔ اسی اصول کے پیش نظر نئے امتحان "اردو زبان دانی" میں عام شہری اور مذہبی معلومات اور طبقۂ اناث کے لئے ابتدائی امور خانہ داری کے شمول کے علاوہ تلنگی یا مرہٹی یا کنڑی سے اردو ترجمہ بھی مضمون اختیاری کی حیثیت سے شریک کیا گیا ہے

تیاریٔ امتحانات ۔ ۱۹۴۲ء کے امتحانات کی تیاری کے سلسلہ میں اس سال بھی شعبۂ امتحانات نے بمقام کواپریٹو ہال مختلف ماہر فن اصحاب سے تقریباً پندرہ تقریریں کرائیں جن میں امیدواروں کے علاوہ علمی دلچسپی رکھنے والے اصحاب نے بھی شرکت کی۔ عورتوں کی تعلیم کا انتظام معتمد و صدر شعبۂ نسواں جناب سکینہ بیگم صاحبہ اور جناب رابعہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں ہوتا رہا۔ نیز بلدہ کی مختلف درسگاہوں نے بھی ہمارے نصاب کی تعلیم کا انتظام کیا۔ مختلف اضلاع اور دیہات میں اردو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لئے ادارے کی تحریک پر جن اصحاب نے دلچسپی لی وہ خاص طور پر قابل شکریہ ہیں کیونکہ انہی کی مساعی کی وجہ سے اس سال اضلاع میں ۱۹ مختلف مقامات پر اردو کی مفت تعلیم دی گئی اور اتنی کثرت سے امیدوار شریک ہوئے کہ وہاں امتحان کے مرکز قائم کرنے پڑے۔ گزشتہ سال خاص حیدرآباد میں دو اور اضلاع میں چھ اس طرح کل آٹھ مرکز تھے۔ لیکن اس سال ۲۱ مرکزوں میں امتحان لیا گیا اور ہر مرکز پر ادارے کی طرف سے ایک ایک صاحب بطور صدر نگران روانہ کئے گئے۔ کیا پنی میں اگرچہ مرض ہیضہ کا اندیشہ تھا لیکن مولوی عبد المجید صاحب صدیقی نے

وہاں کے مرکز کی خواہش پر ایثار سے کام لے کر وہاں کا سفر کیا۔ دوسرے مرکزوں میں مہدی علی صاحب ایم ایس سی۔ ہند رراج صاحب سکسینہ ایم ایس سی۔ سید بادشاہ حسین صاحب۔ نصراللہ صاحب ایم ایس سی۔ کاظم حسین صاحب بی اے۔ معین الدین صاحب ایم ایس سی خیرالدین صاحب۔ اکبرالدین صاحب بی اے اور ڈاکٹر مرزا غفار بیگ صاحب وغیرہ نے نگرانی کرنے کے لئے سفر کی جو زحمت اٹھائی اس کے لئے منجانب مجلس امتحانات شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

شرکاء امتحانات :۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں شرکاء کی تعداد میں بھی قابل لحاظ اضافہ ہوا۔ گزشتہ سال جملہ شرکاء کی تعداد ۲۶۰۰ تھی۔ لیکن اس سال بڑھ کر ۷۷۶ ہوگئی گویا ۱۳۶۷ امیدوار زیادہ شریک ہوئے۔

سال گزشتہ ادارے کی کوششوں سے ۱۱۶۵ اشخاص نے اردو سیکھی تھی۔ اور اس سال ۳۵۴۴ ان پڑھوں کو دولت خواندگی سے مالا مال کیا گیا۔ اردو عالم کے امتحان میں گزشتہ سال ۷۴ امیدوار شریک تھے اور اس سال ان کی تعداد ۱۰۵ تک پہنچ گئی۔ ایسا ہی تناسب اردو فاضل اور خوشنویسی کے امیدواروں کا بھی رہا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس سال ۱۴۸ عورتیں اور ۹۵ غیر مسلم امیدواروں نے ان امتحانات میں شرکت کی بہ حیثیت مجموعی جملہ امتحانات کے کامیاب طلبہ کا اوسط یہ ہے۔

اردو فاضل ۔ ۷۴ حاضر ۳۶ ۔ کامیاب ۱۴ بدرجۂ دوم نتیجہ فیصد ،،

اردو عالم ۔ ۹۹ ،، ۶۵ ۔ ،، ۱ ،، اول اور ۲۴ بدرجۂ دوم نتیجہ ۹۶ فی صد

خوش نویسی ۔ ۱۹ ،، ۱۱ ۔ ،، ۴ ،، ،، ،، ۲ ،، ،، ۵۸ ،،

اردو دانی ۔ ۳۴۳ ،، ۳۱۷ ۔ ،، ۶۸ ،، ،، ،، امتیاز ۹۲ ،،

انعامات :۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ ادارے کے کرم فرما اور تعلیم سے دلچسپی لینے والے حضرات نے امتیاز سے کامیاب ہونے والے امیدواروں کے لئے انعامات کا جو سلسلہ قایم کیا تھا وہ بھی ترقی کر رہا ہے۔ اور بعض انعامات تو مستقل صورت حاصل کر چکے ہیں، جن میں عالیجناب آنریبل سر عقیل جنگ بہادر کا طلائی تمغہ خاص کر قابلِ ذکر ہے۔ صاحب معز نے اردو فاضل میں اول آنے والے امیدوار کے لئے ہمیشہ کے لئے طلائی تمغہ دیئے جانے کا رقمی انتظام فرما دیا ہے۔ اس سال اردو عالم میں اول آنے والے طالب علم کو عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر نے ایک طلائی دستی گھڑی عطا فرمائی ہے اور عالیجناب آنریبل مولوی سید عبدالعزیز صاحب صدرالمہام عدالت و امور مذہبی نے ایک طلائی تمغہ اور اردو عالم میں اول آنے والی طالبہ کے لئے بیگم صاحبہ نواب بہادر یار جنگ بہادر نے بھی طلائی تمغہ عطا فرمایا ہے۔ شعبۂ امتحانات کو توقع ہے کہ یہ تمغے بھی دوامی صورت حاصل کر لیں گے۔ ان طلائی تمغوں کے علاوہ اضلاع کے مختلف اصحاب نے اپنے اپنے مرکزوں سے اول آنے والے طلبہ اور طالبات کے لئے بھی نقرئی تمغے عطا کئے ہیں۔ جن کی تعداد ۲۴ ہے اور جن کی تفصیل یہ ہے۔

اردو فاضل ۔ مولوی محمد فاروق صاحب ایچ۔ سی۔ ایس۔ برائے مرکز پربھنی۔ سید مظفر علی رضوی

مولوی محمد احسان اللہ صاحب ،، ،، پرلی۔ اشرف الدین فیضی

نواب غوث یار جنگ بہادر ،، ،، گلبرگہ۔ سید محمد نورالحسن اختر

اردو عالم ۔ علیۂ بزم ہندال پربھنی ،، ،، پربھنی۔ سید داؤد

عطیہ نواب ثمر جمال الدین حسین خاں والی اسٹیٹ کلیانی برائے مرکز کلیانی۔ سید منظور احمد

" مولوی شیخ حسین صاحب　　برائے مرکز پرلی۔ سید عبدالخالق

بلونت راؤ صاحب گھاٹے بی اے ایل ایل بی " کشتگی۔ سعید الدین خاں

عطیہ مولوی ہدایت احمد صاحب منصف برائے مرکز پرینڈہ۔ عبدالرشید

" مولوی احمد محی الدین صاحب انصاری ناظم ضلع برائے مرکز گلبرگہ

محمد عبدالغنی افسر

خوشنویسی :-

عطیہ صدر دفتر ادارہ برائے اول بہ امتحان۔ محمد غیاث الدین۔　عطیہ مولوی سید سجاد حسین صاحب ثناقی تحصیلدار برائے مرکز کشتگی۔ سید تاج الدین

اردو دانی :-

عطیہ مولوی احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری برائے مرکز کامار یڈی۔ منگیا

" نرسا گوڑہ صاحب مستاجر آبکاری " " اناث نصیر فاطمہ

" مولوی محمد حسین صاحب سب انسپکٹر آبکاری " کشتگی۔ رضیہ بیگم

" مولوی قاضی محمد حسین صاحب انسپکٹر " " ذکور۔ شیخ اسمٰعیل

" مولوی سبط نبی صاحب منصف برائے مرکز اناث کلیانی۔ زیب النسا بیگم

" مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار " " کلیانی۔ نظام الدین

عطیہ مولوی عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری برائے مرکز اناث پربھنی۔ احمدی بیگم

" مولوی عبدالجلیل صاحب مددگار زراعت برائے مرکز پربھنی۔ سید حسین

" سید فیاض الدین صاحب برائے مرکز پرینڈہ۔ محمد خلیل

" مولوی سید قدرت اللہ صاحب قادری برائے مرکز " عبدالرسید

" صدر دفتر ادارہ " " اناث حیدرآباد۔ فاطمہ

" مولوی خواجہ محمود احمد صاحب حسینی " " پرلی۔ فاطمہ امت العزیز

عطیہ مولوی محمد ابراہیم صاحب صدر مہتمم تعمیرات برائے مرکز گلبرگہ۔ نور النسا

گزشتہ سال بعض مرکزوں مثلاً گلبرگہ، کشتگی اور کلیانی کے اطراف و اکناف میں طاعون پھیل جانے کی وجہ سے وہاں کے کامیاب امیدوار سند لینے کیلئے کثیر تعداد میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ اس سال بھی بعض مرکزوں مثلاً نرسی، دھاڑور، کہیل، کشتگی، پرینڈہ وغیرہ کے امیدوار بوجہ پریشانی جنگ حاضر نہ ہو سکے اور استدعا کی ہے کہ وہ اپنے یہاں جلسہ منعقد کر کے اسناد تقسیم کریں گے۔ گزشتہ سال گلبرگہ، پربھنی اور کلیانی وغیرہ میں ایسے ہی جلسے صوبہ دار اور تعلقدار صاحبان کی صدارت میں منعقد ہوئے تھے۔ اس سال ادارے نے اپنی مختلف شاخوں اور مرکزوں کے نمایندوں کو آج کے اجلاس کی شرکت کے لئے طلب کیا ہے اور اس امر کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں نمونے کے درس اور دیگر امور سے اضلاع کے اصحاب کو آگاہ کیا جائے۔ اس بارے میں شعبۂ امتحانات کے نائب صدر مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے نے اپنی نگرانی میں اچھے انتظامات فرما دیے ہیں جس کے لئے میں منجانب شعبہ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

طبقۂ اناث کی کامیاب امیدواروں کے لئے کل سہ پہر میں ایک علحدہ جلسے میں اسناد و انعامات کی تقسیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہ جلسہ ادارے کے شعبۂ نسوان کے زیر اہتمام محترمہ رقیہ بیگم صاحبہ پرنسپل زنانہ کالج کی صدارت میں کل پانچ بجے دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد میں منعقد ہوگا۔

جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ادارہ ادبیات اردو کا شعبۂ امتحانات جو ایک نہایت مفید علمی کام انجام دے رہا ہے۔ اور اس میں جو کامیابی ہو رہی ہے اس کے لئے ادارہ کے قابل اور مستعد معتمد جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور لائق مبارکباد ہیں۔

سید علی اکبر

مشاعرہ

اردو کا ذوق عام کرنے کے سلسلے میں مشاعروں نے قدیم زمانے ہی سے بڑا حصہ لیا ہے۔ ان کے گوناگوں نقائص کے باوجود اس حقیقت سے کوئی بہی خواہ اردو انکار نہیں کر سکتا کہ مشاعروں میں عوام بلا اختلاف مذہب و ملت جس کثرت کے ساتھ جمع ہوتے ہیں کسی اور علمی صحبت میں نہیں ہوتے۔ اس طرح عوام میں اردو کا ذوق عام کرنے کے لئے مشاعرے سے بڑھ کر کوئی اور ذریعہ نہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو نے موقع بہ موقع اس ذریعہ سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس سے قبل ادارے کی طرف سے دو تین مشاعرے نہایت کامیابی کے ساتھ منعقد کئے جا چکے ہیں۔

سالانہ اجلاسوں کے نظام العمل میں بھی مذکورۂ بالا مقصد کے تحت ۲۶ مارچ کی رات میں ایک مشاعرہ ترتیب دیا گیا جس کی صدارت ملک کے مشہور اور بلند پایہ شاعر عالیجناب نواب تراب یار جنگ بہادر سعید نے قبول فرمائی۔ اور از راہِ عنایت اس کے انتظامات اور ترتیب شعرا کے کام میں بھی ادارہ کا ہاتھ بٹایا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے سے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ یہ تقریباً ایک بجے تک جاری رہا۔ مختلف اضلاع سے ادارے کی شاخوں کے جو نمائندے ان اجلاسوں کی شرکت کے لئے تشریف لائے تھے ان میں سے حسب ذیل نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مولوی محبوب خاں صاحب حسن یوسف زئی۔ مولوی محمد مشائخ صاحب عارف چتاپوری۔ مولوی فخر الدین صاحب ارمان گلبرگوی۔ مولوی نور الحسن صاحب آنند شاہ آبادی

دیگر شعرا میں جناب صدر کے علاوہ حسب ذیل شعرائے کرام خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت بزم آفندی۔ حضرت علی اختر۔ مولوی سراج الحسن ترمذی حضرت سالک۔ جناب ضو لکھنوی۔ مولوی مسعود الحسن صاحب نقوی مسعود بی اے۔ جناب مجید۔ جناب نعیم۔ مولوی سید زائر حسین صاحب نیر۔ مولوی محمد انور صاحب وحشی۔ حضرت اجلال۔ جناب قدر۔ نواب معین خاں بہادر۔ نواب ناصر الدین احمد ناصر۔ مولوی مراد علی صاحب طالع جناب تحسین سروری۔ جناب مسیح الدین خاں مشین۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد مولوی عظیم الدین محبت۔ مولوی شریف الحسن صاحب حبیب۔

اس مشاعرے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کے سامعین میں معزز خواتین کثیر تعداد میں شریک تھیں جن کے لئے ایک علحدہ شامیانہ میں پردہ کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ اور اگرچہ یہ مشاعرہ جلسگاہ ادارہ واقع رفعت منزل خیریت آباد میں منعقد ہوا تھا جو شہر سے کافی فاصلہ پر واقع ہے تاہم اس کثرت سے اہلِ ذوق جمع ہو گئے تھے کہ فرش کے علاوہ شامیانہ کے اطراف جو کرسیاں اور صوفے ڈالے گئے تھے وہ سب بھر گئے۔

عالیجناب نواب تراب یار جنگ بہادر سے فرمائش کی گئی تھی کہ وہ اس مشاعرے کی منتخب غزلیں سب رس میں اشاعت کے لئے روانہ فرمائیں چنانچہ نواب صاحب نے جو انتخاب عنایت فرمایا ہے اس کو آئندہ صفحات میں درج کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر زور سے

(یہ قطعہ جناب شاہ عظیم الدین محبت ایم۔ اے نے ادارہ کے سالانہ جلسے کے مشاعرہ میں سنایا تھا)

کام سے رسم و راہ رکھتا ہے جذبۂ بے پناہ رکھتا ہے
توڑ لائے گا ایک دن تارے آسماں پر نگاہ رکھتا ہے

محبت

غزل

آسماں غم کا بار کیا جانے | مرے لیل و نہار کیا جانے
دل سکون و قرار کیا جانے | جبر پر اختیار کیا جانے
کس کو کہتے ہیں ضبط و صبر و سکوں | کوئی بے اختیار کیا جانے
دل کو اپنی کشش پہ ناز ہو جب | تم کو بے اعتبار کیا جانے
راستوں کو مرے نشیمن کے | ہائے فصلِ بہار کیا جانے
لذتِ غم سے ہوش قائم ہیں | بے خودی بے قرار کیا جانے
چار عنصر کے ربطِ باہم کو | ایک مشتِ غبار کیا جانے
ایک کشتی رواں ہے طوفاں میں | زندگانی قرار کیا جانے

موت کا جس کو خوف ہو وہ سعید
زندگی کا وقار کیا جانے

تراب یار جنگ سعید

مشاعرہ سالانہ ادارۂ ادبیات اردو

غزل

جب نظر آئینۂ دل میں وہ صورت آئے گی
کیا خبر غش آئے گا پہلے کہ حیرت آئے گی

جب یہ پوچھا وصل کی کس روز نوبت آئے گی
فتنۂ محشر پکارا جب قیامت آئے گی

آ چکے وہ بھی کہیں ہم عاشقوں کی جان پر
مدتوں سے سنتے آتے ہیں قیامت آئے گی

بزم میں دشمن کو پہلو میں لئے بیٹھے ہیں وہ
اور اب اس سے زیادہ کیا قیامت آئے گی

آج مئے پینے کی بابت کیسی زاہد باز پرس
یہ تو ذکر اس وقت کا ہے جب قیامت آئے گی

حال جو سب کا وہی اپنا ڈراتا ہے عبث
کیا فقط میرے لئے زاہد قیامت آئے گی

وہ تو پوشیدہ تری رفتار کے فتنوں میں ہے
دو قدم جب تو چلے گا تب قیامت آئے گی

ہم تو وحشی ہیں برہنہ حشر میں ہوں گے تو کیا
خود گریباں چاک جب صبح قیامت آئے گی

حشر کا دن ہے غضب کا روز یہ مانا مگر
سامنے اُس پردے والے کے تو صورت آئے گی

شیخ صاحب آپ حوروں کی عبث ہیں فکر میں
ہم گنہ گاروں ہی کے حصہ میں جنت آئے گی

جائیں گے جنت میں حوروں کے لئے کیا حشر سے
دیکھ کر تجھ کو سمجھ میں کون صورت آئے گی

جب تک انساں کو طریقِ معرفت حاصل نہ ہو
بے حقیقت کی سمجھ میں کیا حقیقت آئے گی

عشق تو اے بزم کر بیٹھے مگر کیا تھی خبر
دل کا دل جائے گا اور اتنی مصیبت آئے گی

بزم افندی

غزل

دکھا نہ گردشِ چشم او ستم شعار مجھے
بنا نہ آئینۂ دورِ روزگار مجھے

فلک نے خوگرِ وحشت بنا دیا کیسا
سکونِ دل بھی ہے اب وجہ انتشار مجھے

جبیں پہ عشق نے صحرا نوردیاں لکھ کر
بنایا لوحِ جہاں پر خطِ غبار مجھے

عنایتیں نہ سہی بزم ہی میں رہنے دو
سمجھ لو عہدِ گزشتہ کی یادگار مجھے

حقیقتوں کو اگر عشق کی سمجھ لیتے
جلاتے اور مٹاتے نہ بار بار مجھے

کبھی کبھی جو عنایت سی مجھ پہ ہوتی ہے
یہ مدعا ہے کسی کل نہ ہو قرار مجھے

کسی کا شکوۂ ظلم و ستم نہ کر نیر
یہ لطف کم ہے وہ سمجھے گنہگار مجھے

سیّد زائر حسین نیر

غزل

لب آشنائے شکوہ نہ واقف ہو آہ سے
امید تو یہی ہے ترے خیر خواہ سے

ہے کس کا حوصلہ کہ جھپکنے نہ پائے آنکھ
بجلی بھی کانپتی ہے تمہاری نگاہ سے

جل بجھ کے اپنی آگ میں ہوگا یہ خود تباہ
گھبرائیں آپ کیوں دلِ سوزاں کی آہ سے

پڑھتا ہوں آستاں پہ کسی کے نمازِ شوق
اب جیتے جی اٹھے گا نہ سر سجدہ گاہ سے

میں سر سے چل کے آؤں گا اس بزمِ ناز تک
اے کاش تو بلائے کبھی مجھ کو چاہ سے

ہے دل کی آنکھ محو تماشائے حسنِ یار
ظاہر میں ہے نگاہ لڑی روئے ماہ سے

میں خاکسارِ جادۂ اقلیمِ عشق ہوں
ثروت سے واسطہ نہ غرض مجھ کو جاہ سے

اک شوق بے خودی میں چلا جا رہا ہوں میں
منزل سے واسطہ نہ غرض مجھ کو راہ سے

خاطر کو اضطراب ملا جاں کو سوزِ شمع
کیا لائے کیا بتائیں تری جلوہ گاہ سے

اک دل جسے سمجھتے تھے ہم مامنِ امید
اس گھر کو آگ لگ گئی برقِ نگاہ سے

کر دوں نثار ایک اشارہ پہ جان بھی
اتنی نعیم مجھ کو عقیدت ہے شاہ سے

نعیم

غزل

کیسے کیسے رنگ کیسے کیسے منظر دیکھتے
آپ کے جلوؤں میں کھو جاتے تو اکثر دیکھتے

عشق بن کر دیکھتے یا حسن بن کر دیکھتے
ہم بہر صورت تمھیں کو بندہ پرور دیکھتے

ناامیدی میں امید جلوہ سامانی کہاں
دل کی صورت ہم سراپا درد بن کر دیکھتے

اک تجلی طور پر دیکھی تو کیا تم نے کلیم
آئینہ بن کر مذاقِ آئینہ گر دیکھتے

تشنۂ عرفانِ ساقی تا حدِ عرفاں نہ تھا
ورنہ جب اٹھتیں نگاہیں جام و ساغر دیکھتے

میں تو دیوانہ تھا دیوانے کا شوقِ دید کیا
کاش مجھ کو آپ دیوانہ سمجھ کر دیکھتے

باریابی کا شرف ملتا تو کیا ہوتا مجید
ہم تو اندازِ مزاجِ بندہ پرور دیکھتے

الحاج ابو الاشرف مجید آغائی ابو العلائی

غزل

گناہ گار ترا موقفِ حساب میں ہے
بس ایک اشکِ ندامت ہے جو جواب میں ہے

ہر ایک چشمِ تمنا ہے فرشِ راہ مگر
سنورنے والا ابھی عالمِ حجاب میں ہے

طلسمِ ہستیٔ فانی اسی کے دور میں ہے
نمود و بود کا عالم جو ہر حباب میں ہے

ہزاروں طالبِ دیدار دل سنبھالے ہیں
زمانہ جس کا ہے مشتاق وہ حجاب میں ہے

بہار پر نہیں بےجا گلوں کی خندہ زنی
یہ دور وہ ہے جو ہر آن انقلاب میں ہے

تعینات کے پردے حجاب بن نہ سکے
وہی نظر میں سمایا ہے جو حجاب میں ہے

سکوتِ ضوؔ کا نکیرین سے یہ کہنا ہے
کہ اس کو ہوش کہاں عشقِ بوتراب میں ہے

ضوؔ لکھنوی

غزل

پھر آنسوؤں میں خونِ جگر پا رہا ہوں میں
پھر آج ہو نہ ہو انہیں یاد آ رہا ہوں میں

ہر سانس میں پیامِ اجل پا رہا ہوں میں
لیکن گماں یہ ہے کہ جئے جا رہا ہوں میں

کچھ دن سے دل کا حال عجب پا رہا ہوں میں
اپنی نظر سے آپ گرا جا رہا ہوں میں

جلوے کہیں الٹ کے نہ رکھ دیں بساطِ خاک
ذروں میں اہتمامِ نظر پا رہا ہوں میں

رعنائیٔ بہار میں کھویا ہوا ہے دل
یعنی ابھی فریبِ نظر کھا رہا ہوں میں

ہر سانس ہے نویدِ تمنا لئے ہوئے
ہر سانس میں پیامِ طلب پا رہا ہوں میں

ساقی کے التفات کا اعجاز دیکھنا
مےکش تو اور بھی ہیں مگر چھا رہا ہوں میں

اس طرح جا رہا ہوں تری بزمِ ناز سے
تجھ سے تجھے چھپا کے لئے جا رہا ہوں میں

سالکؔ ہجومِ کشمکشِ دہر تا کجا
اب منزلِ سکوں کی طرف جا رہا ہوں میں

سالکؔ

غزل

عیش کی ساعتیں ہوں یا چند نفس بہار کے
میری نظر سے دیکھئے پردے ہیں اعتبار کے

وہ تری زلفِ عنبریں دوش پہ کھیلتی ہوئی
وہ تری چشمِ نیم باز رنگ لئے خمار کے

کون یہ خوش نصیب تھا کس کا خیال آگیا
ڈھونڈ رہے ہیں وہ نشاں ٹوٹے سے اک مزار کے

ہے دمِ واپسیں مرا چھائی ہوئی ہیں حسرتیں
اب وہ نہ آئیں اس طرف کہہ دے کوئی پکار کے

آتی ہے یادِ آشیاں مجھ کو یقیں ہے ہم صفیر
عہدِ خزاں گزر گیا آئے ہیں دن بہار کے

وہ بھی ہیں بزمِ ناز بھی بادہ بھی ہے خوشا نصیب
آج مرے چمن میں دن آ ہی گئے بہار کے

واہ رے آتشِ نہاں اف رے تصورِ جمال
آج بھی دے رہے ہیں لو ذرے مرے مزار کے

مسعود الحسن نقوی مسعود

غزل

کروٹ بدل رہا ہوں جو میں اضطراب میں
اک حشر سا بپا ہے جہانِ خراب میں

مطلب کے حرف صفحۂ کاغذ سے اڑ گئے
لکھا تھا میں نے خط جو انھیں اضطراب میں

دل چاہتا ہے تم کو سدا چھیڑتا رہوں
ایسا مزا ملا ہے تمھارے عتاب میں

طفلی ہی میں بلا ہو قیامت ہو قہر ہو
کیا جانے کیا ہو رنگ تمھارا شباب میں

ساقی ہی کی عطا میں کمی پا رہا ہوں آج
یا فرق آگیا مرے ذوقِ شراب میں

میری نگاہ میں وہ کوئی چیز ہی نہیں
جو دل کہ آسکے نہ ترے انتخاب میں

غربت بھی کیا بلا ہے کہ اے وحشیِ حزیں
خونِ جگر میں پیتا ہوں یادِ شراب میں

محمد انور وحشی

چوتھا اجلاس

اس اجلاس کی صدارت آنریبل مولوی سید عبدالعزیز صاحب صدرالمہام عدالت و امور مذہبی دولتِ آصفیہ نے قبول فرمائی تھی چنانچہ مطبوعہ نظام العمل میں انہی کا نام شائع ہوا تھا لیکن وہ بھی نواب ڈاکٹر مہدی یار جنگ بہادر کی طرح اچانک سرکاری کام پر دہلی تشریف لے گئے تو ادارہ کے نائب صدر مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب معتمد محکمۂ فینانس سرکار عالی سے استدعا کی گئی کہ وہ آنریبل موصوف کی جگہ کرسی صدارت کو زینت بخشیں۔ چنانچہ یہ اجلاس صاحب معزز ہی کی صدارت میں ٹھیک دس بجے شروع ہوا سب سے پہلے مسٹر بلبیر پرشاد صاحب بھٹناگر ایم اے ایم ایڈ نے ایک تحقیقی مقالہ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء سے متعلق پڑھ کر سنایا۔ یہ مبسوط مقالہ اتنا پسند کیا گیا کہ اس کو علحدہ کتابی صورت میں شایع کرنے کا تصفیہ کیا گیا۔ اس لئے اس روداد میں اُس کو شریک نہیں کیا گیا۔

مسٹر بلبیر پرشاد کی تقریر کے بعد مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار اردو سٹی کالج نے اردو زبان کی اشاعت کے طریقے اور اس کی موجودہ ضروریات پر ایک معلومات آفریں تقریر کی۔ اس میں اضلاع کے نمائندوں اور اردو کے عام خدمت گزاروں کے لئے ایسی مفید اور عملی باتیں بیان کی گئیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہر شخص اردو کی خاطر خواہ خدمت کرسکتا ہے۔

مولوی سید محمد صاحب کی تقریر کے بعد ادارہ کے اربابِ کار اور نمائندگانِ اضلاع کا ایک گروپ فوٹو لیا گیا جو اس مجموعہ کے ساتھ شریک کیا جارہا ہے۔

گروپ فوٹو کے بعد مولوی ظہیر الدین صاحب مدرس مدرسہ مشتی خیرت آباد نے اردو کی تعلیم بالغاں کے عنوان پر ایک تقریر کی جس کی وضاحت مختلف تعلیمی آلات کے ذریعہ سے کی گئی۔ مولوی صاحب کے نمونے کے درس کی طرح (جو پہلے اجلاس میں دیا گیا تھا) یہ تقریر بھی بڑی دلچسپ اور سبق آموز ثابت ہوئی۔

"اردو انسائیکلو پیڈیا" کے عنوان پر شعبۂ اردو انسائیکلو پیڈیا کی مجلس انتظامی کے صدر ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی تقریر بھی شریکِ نظام العمل تھی لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب موصوف نے اردو انسائیکلو پیڈیا کے قواعد و ضوابط اور طرز کار سے متعلق ایک مطبوعہ کتابچہ جلسہ میں تقسیم کیا اور فرمایا کہ وہ جس موضوع پر تقریر کرنے والے تھے اس کی نسبت جملہ معلومات اس کتابچہ میں شایع کی گئی ہیں۔

جناب صدر صاحب جلسہ کی فی البدیہہ تقریر صدارت اور معتمد صاحب ادارہ کے شکریہ کے بعد یہ اجلاس تقریباً ساڑھے بارہ بجے برخاست ہوا۔ اس میں ادارہ کے اربابِ کار کے علاوہ حسب ذیل معززین نے بھی شرکت فرمائی۔

نواب یٰسین بیگ بہادر، راجہ بہادر بشیشور ناتھ، مولوی خواجہ معین الدین انصاری، مولوی سید محمد اعظم، مولوی ظہیر الدین احمد مولوی ابوالحسن، مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ، پروفیسر فضل حق وغیرہ۔

اردو کی تعلیم بالغاں کا طریقہ

صدر محترم و معزز خواتین و حضرات!

قبل اس کے کہ میں طریقۂ تعلیم بالغاں پر کچھ عرض کروں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا مضمون کچھ اچھوتا نہیں ہے بلکہ بعض حضرات کے خیالات کا خوشہ چیں ہے۔

مجھے پہلے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ صرف نمونۂ تدریس کی خدمت میرے تفویض ہے چنانچہ اسی سلسلے میں یہاں آیا۔ اس وقت نظام العمل کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ صرف تدریس کا کام ہی میرے ذمے نہیں ہے بلکہ طریقۂ تعلیم بالغاں کی نسبت کچھ کہنا پڑے گا۔ چونکہ نظام العمل طبع ہو چکا تھا اور میرے بچاؤ کا کوئی پہلو باقی نہ رہا اس لئے مجبوراً کچھ اپنے بے ربط خیالات اور ان تجربوں کا ذکر کر دینا ضروری سمجھا جو دوران تدریس تعلیم بالغاں مدرسہ شبینہ خیریت آباد میں پیش آ رہے ہیں۔

اہم مقصد تعلیم بالغاں حضرات! تعلیم بالغاں کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ جہالت کی تاریکی ملک سے دور ہو جائے اور ان پڑھ و نیم خواندہ اشخاص اپنی مادری زبان میں پڑھنا لکھنا سیکھ کر اپنی عملی زندگی کو بہترین طریقے سے کامیاب بنانے میں فرائض شناس ہو جائیں چنانچہ اسی مقصد کے تحت مغربی ممالک میں تعلیمی ادارے اور ماہرین تعلیم سے لوگوں کی تعلیم کو اپنا فرض سمجھ رہے ہیں اور بہت ساری سہولتیں بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔

تعلیم بالغاں کے فوائد تعلیم بالغاں ایک ایسی شمع ہے کہ ملک کی عام جہالت کی ضلالت کو بہت جلد اپنی ضیا سے بدل دے سکتی ہے۔ (۲) تعلیم بالغاں کی بدولت کاروباری لوگ فرصت کے اوقات کو فضول مصروفیات سے روک کر اپنی زندگی کے معیار کو بلند کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مجھے اپنے مدرسۂ شبینہ کے بعض متعلمین کے بیان سے اس کی تصدیق ہوئی کہ وہ فرصت کے اوقات میں بن لغویات میں مصروف رہا کرتے تھے ان سے ایک حد تک بچ گئے۔

(۳) اور سب سے زیادہ فائدہ یہ ہے کہ جب والدین خود تعلیم پانے لگیں تو وہ اپنی اولاد کی تعلیم میں زیادہ دلچسپی لینے لگیں گے۔ چنانچہ مدرسۂ شبینہ کے ایک متعلم عبدالرحمٰن نامی کو چار ماہ کی پابندی نے یہ خیال پیدا کر دیا اور اب وہ اپنے بچے کی تعلیمی حالت و حاضر باشی دریافت کرنے لگا ہے۔ اور گھر بھی اپنے بچے کی نگرانی کر رہا ہے۔

بچوں اور بالغوں کے خواص

بچہ	بالغ
(۱) بچے کا جسم چھوٹا، کمزور اور نازک ہوتا ہے۔	(۱) بالغ کا جسم بڑا مضبوط اور سخت ہوتا ہے۔
(۲) بچے کی واقفیت محدود ہوتی ہے۔	(۲) واقفیت وسیع ہوتی ہے۔
(۳) بچے کے خیالات مسلسل نہیں ہوتے۔	(۳) بالغ کے خیالات میں تسلسل ہوتا ہے۔
(۴) توجہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتا۔	(۴) اس میں دیر تک توجہ رکھنے کا مادہ ہوتا ہے۔

(۵) نقل اتارنے کا شوق ہوتا ہے۔ — (۵) نقل آتارنے کا شوق نہیں ہوتا۔

(۶) عجوبہ پسند ہے۔ — (۶) اس میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔

غرض بچوں اور بالغوں کے خواص میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے تو ایسی صورت میں تعلیم بالغاں کے نصاب کی ترتیب کا طریقۂ تعلیم اور مدت تعلیم بھی جداگانہ ہونی چاہیئے۔ چنانچہ عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب ناظم تعلیمات وصدر شعبہ اردو امتحانات ادارہ نے اپنی ایک تقریر میں (جو تعلیم بالغاں کے عنوان پر ہے) ارشاد فرمایا ہے کہ

(۱) "جو طریقہ بچوں کے لئے مفید ہے وہ بڑوں کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہوسکتا"۔

(۲) "مدارس تحتانیہ کے کتب مدارس بالغاں کے لئے موزوں نہیں ہوسکتے"۔

(۳) "ایک اور جگہ پنجاب کے عہدہ دار تعلیمات کی رائے سے اختلاف فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ "مجھے جو تجربہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ متعلمین چھ مہینے میں آسان الفاظ اور جملے پڑھنا سیکھ جاتے ہیں لیکن مردم شماری کی رپورٹ میں خواندگی کا جو معیار قرار دیا گیا ہے اس کو نہیں پہنچتے۔ اگر مدت تعلیم ۹ ماہ قرار دی جائے تو متعلمین اس قابل ہوسکتے ہیں کہ آسان کتابیں اور اخبار پڑھ سکیں اور معمولی خط وکتابت کرسکیں"۔

چنانچہ ادارۂ ادبیات اردو کی خواہش پر عالیجناب مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹرننگ کالج ونائب صدر شعبہ اردو امتحانات ادارہ نے اپنی نگرانی میں مجھ سے دو کتابیں عالیجناب ناظم صاحب ممدوح کی ہدایتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترتیب دلوائیں۔ یہ دونوں کتب مندرجہ ذیل امور پر محتوی ہیں۔

بڑوں کی تعلیم کے لئے موزوں ہیں۔

مدارس تحتانیہ کے کتب سے جدا ہیں۔

اور ۹ ماہ کی مدت میں ایک مبتدی ان کو پڑھ کر آسان کتابیں اور اخبار پڑھنے اور خط وکتابت کرنے کے قابل ہوسکتا ہے۔

نئے رسم خط کے اختیار کرنے کی وجہ

چونکہ تعلیم بالغاں کے لئے ایسے رسم خط کی ضرورت تھی جو مبتدی کے لئے سہل الحصول ہو۔ لیکن مروجہ نستعلیق رسم خط ناخواندہ افراد کے لئے پریشان کن ہے۔ مفرد ومرکب حروف کی جداگانہ صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو رسم خط آموز۔

اختیار کردہ رسم خط نو آموز کی پریشانیوں کو ایک حد تک رفع کرنے میں مدد ہے۔

طریقۂ تعلیم

تعلیم کے مشہور طریقے یہ ہیں۔ طریق ہجی۔ طریق الصوت۔ طریق بین وگو۔ تعلیم بالغاں کے لئے سب سے آخری طریقہ (طریق بین وگو) مناسب ہے اس لئے کہ اس میں تحصیل علم کا قدرتی طریقہ ہوتا ہے۔ کتاب کے پڑھنے کی استعداد جلد پیدا ہوجاتی ہے اور بیشتر الفاظ جلد یاد ہوجاتے ہیں۔

مگر اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ نئے الفاظ کے تلفظ کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی اس لئے اردو دانی کے پہلے حصے میں اس خرابی کو دور کرنے کے لئے ہر سبق کے دوسرے صفحے پر حرف کی آواز بتلانے کے لئے ہدایت کی گئی ہے۔

میری ناقص رائے میں ہر حرف کی تین آوازیں بتلائی جائیں تو نامناسب نہ ہوگا ان میں سے کسی ایک آواز کی کہیں نہ کہیں نمونہ پیش کیجئے جیسے کرسی کے حرف کَ رس کی آواز کُ کتاب کاکِ۔ کاپی کاکا۔ اس طرح مبتدی کچھ حروف سیکھ جائے گا اور طریقۂ تین و گنگی متذکرۂ بالا نقص کا پہلو نکل جائے گا۔

سبق کی ترتیب معلوم سے نامعلوم کی طرف چلنے کے لئے (جیسا کہ کل نمونۂ تدریس میں دکھلایا گیا تھا) سبق کو تین حصوں میں ترتیب دیا جائے۔ پہلے حصے میں تصاویر کے ذریعے نام نکلوائے جائیں۔ دوسرے حصے میں صرف ان ہی تصاویر کے نام ہوں۔ اور تیسرے میں کچھ مرکبات ہوں کہ جن میں وہی اوپر کے نام آجائیں۔

اس ترتیب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک لفظ کو مختلف طریقوں سے بار بار دہرایا جائے اس طرح وہ فوراً ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اردو دانی کے پہلے حصے میں یہی اصول استعمال کئے گئے ہیں۔ جب متذکرۂ بالا ترتیب کے ساتھ اردو دانی کا پہلا حصہ ختم ہو جائے تب متعلم کی معلومات کی جانچ کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں ان میں سے ایک طریقہ پیش کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو تختہ مدور نما۔

نستعلیق رسم خط سے واقف کرانیکا طریقہ اردو دانی کے حصۂ دوم کے سبق ۱۹ میں نستعلیق کے رسم خط کے قاعدے بتلائے گئے ہیں مزید معلومات کے لئے "رسم خط آموز" کا توضیحات کا حصہ ملاحظہ کے قابل ہے۔ جب متعلم کو وہ قاعدے پوری طور پر سمجھائیں تب کتاب کا آخری حصہ پڑھایا جائے۔

حضرات! اس میں شک نہیں کہ میں اپنی فضول و لاحاصل بکواس سے آپ حضرات کی سمع خراشی کر رہا ہوں لیکن مندرجہ ذیل واقعہ کا اظہار بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک دفعہ کمترین کو مدرسہ شبینہ میں نقطے کی علامت سمجھانے کا اتفاق ہوا ایک متعلم ایسا ملا کہ علامت کے سمجھنے میں اس کو دشواری ہونے لگی پھر میں نے بمصداق کلم الناس علی قدر عقولہم۔ ایک سوال کیا اچھا بتاؤ لفظ "پن سل" میں کہاں کہاں دھبے ہیں اس نے جھٹ پٹ گن دئے۔ بعد ازاں سمجھایا گیا کہ کتاب میں لکھنے میں ایسے ہی دھبہ کو نقطہ کہتے ہیں۔ اور کل کے نمونۂ تدریس میں روشنائی کے متعلق یہی دشواری پیش آئی ہے۔ سرخی کے بجائے سیاہی کا لفظ استعمال کرنا پڑا۔

ان تجربوں سے مجھے نتیجہ اخذ کرنا پڑا کہ پہلے انہی کے تلفظ میں الفاظ کو دہراؤں بعد ازاں اس کی تصحیح کروں۔

مدرسہ شبینہ خیریت آباد کی سرپرستی یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی ملک یا ادارہ کو مالک یا سرپرست اور مخیر ہمدرد مل جائے تو وہ ملک یا ادارہ ترقی کے زینہ پر تیزی سے گامزن ہوتا ہے۔ مدرسۂ شبینہ خیریت آباد اگرچہ کہ محکمہ بلدیہ کی جانب سے قائم ہوا ہے لیکن اس کو ایسی بزرگ ہستی کی سرپرستی حاصل ہے جو ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ ہمدرد اور مخیر ہے۔ جن کا نام نامی عالیجناب سجاد مرزا صاحب ہے۔ جو دامے۔ سخنے۔ قدمے ہر طریقے سے مدرسہ شبینہ کی مدد کے لئے ہر وقت تیار ہیں یہ جو کچھ آلات تعلیمی میں نے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں، وہ صاحب معز کا عطیہ ہیں۔ اور صاحب ممدوح کی فیاضانہ امداد نے ہی مدرسہ شبینہ کے گیارہ!! امیدواروں کو امتحان اردو دانی کے لئے آمادہ کیا بفضلہ تعالیٰ گیارہ کے گیارہ کامیاب ہوئے اور جن میں چار نے امتیازی درجہ حاصل کیا ہے۔

استدعا چونکہ مدارس شبینہ بلدہ میں تحتانیہ مدارس کا نصاب رائج ہے اس لئے عالیجناب صدر محترم و عالیجناب ناظم صاحب تعلیمات سے استدعا ہے کہ متذکرۂ بالا اصولوں کے تحت جو کتابیں دستیاب ہوں مدارس شبینہ بلدہ و اضلاع کے نصاب میں شریک فرمائی جائیں تو تعلیم بالغاں کے مقاصد کو ایک حد تک پوری کر سکتی ہیں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

محمد اظہر الدین

تقریر صدارت مولوی لیاقت اللہ خاں صاحب

(۲۲ اردی بہشت ۱۳۵۱ف روز جمعہ صبح کے ساڑھے نو بجے ادارۂ ادبیات اردو کے سالانہ اجلاس کے چوتھے جلسہ کی صدارت آنریبل مولوی سید عبدالعزیز صاحب کی جگہ مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب معتمد فینانس سرکار عالی نے فرمائی اور ختم جلسہ پر حسب ذیل تقریر کی۔

معزز خواتین و حضرات!

آج کے جلسہ کی صدارت آنریبل مولوی سید عبدالعزیز صاحب فرمانے والے تھے لیکن ان کے سرکاری کام پر دہلی تشریف لیجانے کے باعث یہ کام میرے ذمے کیا گیا ہے۔ اور مجھے مصروفیات کی وجہ سے موقع نہ مل سکا کہ اپنے خیالات قلمبند کرسکوں تاہم کل اور آج کے اجلاسوں کی شرکت سے متعلق میں اپنے تاثرات کو پیش کروں گا۔

سب سے پہلی چیز جس نے مجھے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ آپ کی اردو دانی کی سندوں پر "پڑھو اور پڑھاؤ" چھپا ہوا نظر آیا ان الفاظ سے آپ کا یہ مطمح نظر معلوم کرکے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے سند لینے والوں کو اپنا پڑھنے لکھنے کا کام جاری رکھنے کی طرف توجہ دلائی اور مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ آپ کی ہدایت کو ضرور پیش نظر رکھیں گے۔ اگرچہ بدقسمتی سے آج کل پڑھانے کا پیشہ حقیر نظروں سے دیکھا جاتا ہے لیکن ہم کو اپنے استادوں کی ایسی عزت کرنی چاہیئے جیسی کہ ہم اپنے والدین کی کرتے ہیں۔ اگر آپ کے خواندہ حضرات آپ کی اس تلقین کو اپنا مسلک بنالیں تو جس طرح ایک شمع سے ہزار ہا شمعیں جلتی ہیں اسی طرح ایک شخص کئی اشخاص کو تعلیم یافتہ بنا سکتا ہے۔

حیدرآباد میں آئے دن نئی نئی انجمنیں اور نئے نئے ادارے قایم ہوتے ہیں جن میں بعض فرقہ وارانہ ہیں اور بعض طبقہ وار۔ لیکن ادارۂ ادبیات اردو ان سب سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ہر فرقے، ہر طبقے اور ہر مذہب کے اصحاب پہلو بہ پہلو آتے ہیں۔ اور یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے اس ادارے کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ حیدرآباد سے ناخواندگی کو دور کیا جائے۔ ناخواندگی کا اثر نہ صرف دماغ پر بلکہ جسم کے تمام اعضاء پر پڑتا ہے۔ کل صبح کے اجلاس میں اردو پڑھانے کے لیے جو نمونے کا سبق دیا گیا اس سے اس کی بہ خوبی وضاحت ہوسکتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ناخواندہ شخص نے تصویروں کے ان دو تختوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا جن میں سے ایک میں پنسل، چاقو، میز اور کرسی کی صرف تصویریں تھیں اور دوسرے میں تصویروں کے نیچے نام بھی لکھے ہوئے تھے۔ حالانکہ نام جلی حروف میں تھے پھر بھی ایک ناخواندہ شخص غور سے دیکھنے کے بعد بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ دونوں تختوں میں کچھ فرق ہے۔ غیر خواندہ لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں اسی طرح کے ناتمام احساس اور ناقص شعور کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور طرح طرح کی پریشانیاں اور مصیبتیں اٹھاتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی پریشان کردیتے ہیں۔ اس قسم کے متعدد واقعات ہماری روزمرہ زندگی میں اکثر پیش نظر ہوتے ہیں۔ ناخواندہ آدمی نہ صرف اپنے مذہب سے بے بہرہ رہے گا بلکہ تجارت اور ملازمت میں بھی نقصان اٹھائے گا۔ ناخواندہ لوگ محض توہمات کی وجہ سے پریشان رہنے کے علاوہ احساس کمتری میں بھی بہت بری طرح سے مبتلا رہتے ہیں۔

ہم کو ڈاکٹر زور صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ وہ اپنے اولوالعزم ساتھیوں کے ساتھ ناخواندگی کی وبا کو دور کرنے میں مصروف ہیں انھوں نے ایک مفید کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور ہم سب کا فرض ہے کہ اس کی کامیابی کے لئے کوشش کریں تاکہ ناخواندگی دور ہو اور اہل ملک اچھی باتوں کو سمجھیں۔ بری صحبتوں سے بچیں۔ اور اپنے احساس کمتری کو دور کرسکیں۔

اگرچہ سرکاری طور پر بھی تعلیم بالغاں کی مہم اٹھائی گئی ہے لیکن سب کام سرکاری طور پر ہی نہیں کئے جاسکتے۔ اگر ہمارے دوست ڈاکٹر زور صاحب جیسے اصحاب اس قسم کے کاموں میں سرکار کے ساتھ تعاون کریں تو ان مہموں کی کامیابی یقینی ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو نے ملک میں تعاون کی ایک اچھی مثال قایم کردی ہے۔ مجھے امید ہے کہ دوسرے ادارے اور انجمنیں بھی اس قسم کے علمی کاموں میں اس کی تقلید کریں گے۔

آج کے اجلاس میں بلیشر پرشاد صاحب بھٹناگر نے یہ بیان کیا ہے کہ اردو کا بہاؤ شمال سے جنوب کی طرف تھا میں اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج اعلیحضرت ظل سبحانی کی علم نوازیوں سے اس کا بہاؤ جنوب سے شمال کی طرف ہوگیا ہے۔ اردو کوئی مشکل زبان نہیں ہے۔ مجھے اس امر کا ذاتی تجربہ حاصل ہے کہ اکثر انگریز ہماری زبان بہت جلد اور بآسانی سیکھ جاتے ہیں۔ اور جس طرح ہم لوگ اپنی اردو گفتگو میں انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں اس طرح انگریز اپنی انگریزی گفتگو میں اردو کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

اردو کے خدمت گزاروں کو سیاسی جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے اور خاص کر ہم کو ملک کی فلاح و بہبود کی خاطر اس کی خدمت کرنی چاہیے۔ اور اضلاع سرکار عالی میں جہاں تک ہوسکے ادارہ کی زیادہ شاخیں قائم ہونی ضروری ہیں تاکہ جو کام آپ اصحاب نے شروع کیا ہے اس کا فیض دور دور تک پہنچے۔

میں اپنی تقریر کو اردو کی کامیابی کی اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اعلیحضرت بندگان عالی کی سرپرستی میں ہم اپنے ملک و ملک اور زبان کی کچھ نہ کچھ خدمت کرسکیں۔

اغراض و مقاصد ادارۂ ادبیات اردو

(۱) اردو زبان اور ادب کی توسیع اور حفاظت۔

(۲) سرزمین دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا۔

(۳) ملک کے نوجوانوں میں انشا پردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔

(۴) عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اور اس کے لئے ضروری وسائل اختیار کرنا۔

(۵) اردو کو مختلف علوم و فنون سے روشناس کرنا۔

(۶) تاریخ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی اور ادبی آثار کی حفاظت۔

(۷) ایک نیا مکمل کتب خانہ قایم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہوسکیں اور جس کا ایک حصہ اشاعت کیلئے وقف رہیگا۔

دوسرا مشاورتی اجلاس اور ظہرانہ

ادارہ کے ارباب کار اور شاخوں کے نمایندوں کا جو مشترکہ اجلاس پنجشنبہ ۲۶ مارچ کی دوپہر میں ابتدائی مباحث کے بعد دوسرے دن کے لئے ملتوی ہوگیا تھا وہ جمعہ ۲۷ مارچ ۴۲ء کو ۱۲ بجے سے پہر دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔ اس میں جملہ نمائندگان اضلاع کے علاوہ معتمدین شعبہ جات و اراکین مجلس انتظامی میں سے مولوی ظہیرالدین احمد صاحب نائب صدر محاسب و معتمد شعبہ تالیف و ترجمہ پروفیسر فضل حق صاحب، مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی معتمد تاریخ دکن، مولوی عبدالقادر صاحب سروری معتمد شعبہ امتحانات، مولوی فیض محمد صاحب صدیقی معتمد شعبہ اردو انسائیکلوپیڈیا، مولوی سید محمد صاحب معتمد شعبہ شعرا و مصنفین دکن، مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی رکن مجلس انتظامی، پروفیسر لطیف احمد صاحب فاروقی وغیرہ نے شرکت فرمائی۔

دو دن کے مباحث اور تبادلۂ خیال کے بعد حسب ذیل امور طے پائے ہے۔

(۱) چونکہ شاخوں کے مدارس شبینہ بالغاں میں ایسے لڑکے بھی جو ۱۲ سال یا اس سے کم عمر کے ہیں اور دن میں کہیں کام کرنے پر مجبور ہیں پڑھنے کے لئے آتے ہیں اور ان کے لئے موجودہ اردو دانی کی کتابیں موزوں نہیں ہیں جو بالغوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ اس لئے کافی بحث و مباحثہ کے بعد طے کیا گیا کہ ایسے بچوں کے لئے مجلس امتحانات میں ایک متبادل نصاب کے تعین کی سفارش کی جائے۔ اور نیا نصاب تیار ہونے تک موجودہ طبقۂ تحتانیہ کے لئے مدارس سرکار عالی میں جو کتابیں رائج ہیں، ان میں سے ایک یا دو کتابوں کا انتخاب کیا جائے تو مناسب ہے۔

(۲) اردو امتحانات کی شرکت کے لزوم کے لئے، محکمہ کورٹ آف وارڈز سے بھی اسی طرح کی گشتی نکلوائی جائے جیسی آبکاری، جنگلات وغیرہ سے جاری ہوئی ہے۔

(۳) طے پایا کہ مدارس شبینہ میں مدارس سرکار عالی کے زیر تعلیم طلبہ کو شریک ہونے کی حتی الامکان ہمت افزائی نہ کی جائے، صرف ایسے لڑکے جو تلنگی، مرہٹی یا کنڑی مدارس میں پڑھتے ہیں اگر وہ اردو پڑھنا لکھنا سیکھنے کی خاطر، ادارہ کے ان مدارس میں شریک ہونا چاہیں تو، انھیں شریک کیا جا سکتا ہے۔

(۴) محکمۂ تعلیمات کو متوجہ کیا جائے کہ معلمین کے امتحانات میں شریک ہونے کی نسبت ہمت افزائی کی جائے۔

(۵) شرکت امتحانات سے متعلق ہمت افزائی کی جو گشتیاں مختلف محکموں سے جاری ہوئی ہیں انکو طبع کرا کے شاخوں میں بھیج دی جائیں۔

(۶) ادارہ کی موجودہ سندیں عوام کے لئے دیدہ زیب اور تشویق کا باعث نہیں ہیں ان کو زیادہ بہتر بنانے کے مسئلے پر غور کیا جائے۔

(۷) مولوی ظہیرالدین احمد صاحب نے اپنی طرف سے پہلی کے مرکز ذکور میں اول آنے والے امیدوار کو تمغہ عطا کرنے کا وعدہ فرمایا۔

ظہرانہ بعد نماز جمعہ جناب ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی ادارہ نے شاخوں کے جملہ نمائندوں اور ادارے کے دیگر ارباب کار کو اپنے یہاں ایک پرتکلف ظہرانہ پر مدعو فرمایا جس میں تقریباً چالیس اصحاب نے شرکت کی اور اس کے بعد جملہ نمایندگان اضلاع کی واپسی عمل میں آئی۔ اس طرح ادارہ کے یہ سالانہ اجلاس نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اختتام کو پہنچے۔

پانچواں اجلاس یعنی سالانہ اجلاس شعبۂ نسواں

پانچواں اجلاس جمعہ ۲۷ مارچ ۴۲ء کی سہ پہر میں خواتین کے لئے مخصوص تھا۔ چنانچہ ۳ بجے ہی سے اسناد و انعامات حاصل کرنے والی خاتونوں کی ایک کثیر تعداد جلسہ گاہ میں جمع ہو چکی تھی۔ ۴ بجے صدر اجلاس رقیہ بیگم صاحبہ ایم اے آکسن (بیگم زین یار جنگ) پرنسپل کلیۂ اناث جامعۂ عثمانیہ تشریف لائیں جن کا عہدہ داران و ارکان مجلس انتظامی رابعہ بیگم صاحبہ (مسز انوار اللہ صاحب ناظم تعمیرات جامعۂ عثمانیہ) صدر شعبہ۔ سکینہ بیگم صاحبہ (مسز سید رحمت اللہ صاحب نائب معتمد امور عامہ) معتمد شعبۂ نسواں۔ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر (مسز ضامن علی صاحب نمازی) شریک معتمد شعبۂ نسواں۔ جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی۔ ایم اے ایس تصدق فاطمہ غلام پنجتن۔ بلقیس بانو صاحبہ اردو فاضل اور بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور نے استقبال کیا۔ جلسہ شروع ہونے تک چار سو سے زیادہ ہندو مسلم اور انگریز خواتین جمع ہو چکی تھیں جن میں بیگم صاحبہ نواب مہدی یار جنگ بہادر۔ بیگم صاحبہ نواب بہادر یار جنگ بہادر۔ بیگم صاحبہ نواب غوث یار جنگ بہادر۔ بیگم صاحبہ نواب رفعت یار جنگ مرحوم۔ بیگم صاحبہ نواب سراج یار جنگ مرحوم کے علاوہ مسز خواجہ معین الدین انصاری۔ صغرا بیگم ہمایوں مرزا۔ معصومہ بیگم حسین علی خاں۔ مسز صوفی ایم اے۔ مسز غلام پنجتن۔ مسز باسط علی خاں۔ مسز محمد حسین جعفری۔ مسز ہاشم علی خاں۔ مسز ڈاکٹر سید معین۔ مسز ضیاء الدین انصاری۔ مسز پروفیسر فضل حق۔ مسز رشید احمد۔ مسز ظہیر الدین احمد۔ مسز مشتاق احمد۔ عظمت النساء بیگم صاحبہ اور مسز احمد عبد القادر وغیرہ خاص کر قابل ذکر ہیں۔ اردو عالم کی ایک کامیاب امیدوار تمیز النساء کی قرأت کے بعد رابعہ بیگم صاحبہ نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر نے اردو زبان پر اپنی بصیرت افروز نظم دلگداز پیرایہ میں سنائی۔ حبیب النساء بیگم صاحبہ ایم اے لکچرار مہارانی کالج میسور نے ادارہ کی شاخ بنگلور کی روئداد اور سرگرمیوں پر تقریر کی۔ اس کے بعد سکینہ بیگم صاحبہ معتمد نے صدر اجلاس سے اسناد و انعامات تقسیم کرنے کی استدعا کی۔ بیگم صاحبہ بہادر یار جنگ بہادر کا معطیہ تمغہ اردو عالم میں اول آنے والی طالبہ شوکت النساء بیگم کو تالیوں کی گونج میں عطا کیا گیا۔ اس سال تقریباً ڈیڑھ سو خواتین نے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ بیگم صاحبہ زین یار جنگ کے خطبۂ صدارت کے بعد صغرا بیگم ہمایوں مرزا نے اردو پر ایک تقریر کی۔

عصرانہ اور معائنہ ادارۂ ادبیات اردو

جلسۂ تقسیم اسناد کے بعد جملہ خواتین اور حاضرین اجلاس کو ایک پرتکلف عصرانہ پر مدعو کیا گیا جو برابر کے شامیانے میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس اثنا میں جلسہ گاہ سے ادارۂ ادبیات اردو کی عمارت تک پردہ کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ عصرانہ کے ختم پر جملہ خواتین اس عمارت میں تشریف لائیں۔ اور تقریباً چار سو خواتین نے کوئی ڈھائی گھنٹے یعنی ۹ بجے رات تک ادارہ کے ایک ایک شعبے اور کمرے کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ نادر قلمی نسخوں اور مرقعوں کی نمائش خاص شوق سے ملاحظہ کی گئی۔ بیگم صاحبہ نواب مہدی یار جنگ بہادر اور بیگم صاحبہ نواب بہادر یار جنگ بہادر نے ادارہ کی مطبوعہ چند کتابیں بھی سب رس کتاب گھر سے خرید فرمائیں۔ ادارہ کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اتنی زیادہ خواتین نے اس کا بیک وقت معائنہ کیا۔

خطبۂ استقبالیہ

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ (مسز انوار اللہ) جو شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیات اردو کے سالانہ جلسہ میں ۲۳ اردی بہشت ۱۳۵۱ف کو شام کے پانچ بجے پڑھا گیا۔

محترم صدر صاحبہ اور معزز خواتین!

سب سے پہلے میں اس ممنونیت اور مسرت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں جو محترمہ بیگم زین یار جنگ بہادر، صدر کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ نے اس جلسہ کی صدارت وتقسیم اسناد و انعامات کی درخواست کو قبول فرماکر ہمارے دلوں میں پیدا کردی ہے، صاحبہ موصوفہ کی علمی قابلیت، ذوق تعلیم، علم پروری، عمل دوستی، محتاج تعارف نہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شمع اپنے اطراف کو منور کرتی ہے، اسی طرح ایک عالم باعمل کے فیضان سے اس کے ماحول کا مستفیض ہونا لازمی ہے۔ لہٰذا بڑی خوشی کے ساتھ میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں نیز درخواست ہے کہ آئندہ بھی آپ علم و تجربے، رائے و مشورے اور استوار تعاونِ عمل سے ہمارے شعبہ کو مستفید ہونے کا موقع دیتی رہیں گی۔ پھر میں اپنے معزز مہمانوں کے اس احساس کا احترام کرتے ہوئے تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ زحمتِ مسافت اور سواریوں کی موجودہ دقت کو برداشت کرکے ہماری ہمت افزائی اور حوصلہ پروری کے لئے اس جلسہ میں شرکت فرمائی۔ اس موقع پر اس غیر متوقع خوشی کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں جو حبیب النسا بیگم صاحبہ ایم اے معتمد شعبہ نسوان بنگلور کی شرکت جلسہ سے ہمیں حاصل ہوئی ہے جن کی علمی جد و جہد، جوش عمل، تعاون کار اور زبان کی پرداخت کی مساعی جمیلہ کی برکت سے بنگلور میں بھی ادارۂ ادبیات کا ایک شعبہ نسوان پیکر وجود میں آچکا ہے اور آج باوجود بغرض امتحان اپنے عارضی قیام حیدر آباد کے، محض اس جلسہ کی خاطر التوا اور روانگی کرکے اس دلچسپی و شغف کا ثبوت دے رہی ہیں جو آپ کو ذات و کردارِ نسوان کے ساتھ ہے۔

اب میں شعبۂ نسوان کی سالانہ روئداد مختصراً آپ کے گوش گزار کرتی ہوں۔ مجھے اس امر کا اظہار کرتے افسوس ہوتا ہے کہ پارسال ہمارا شعبہ کما حقہ سرگرم کار نہیں رہ سکا۔ ہماری کئی اسکیمیں جن کا ذکر اس وقت بے سود ہے ارادہ ہی کے طبوس میں مستور ہو کر رہ گئیں جس کا چند اور مخالف اسباب کے ساتھ ایک بڑا مانع سبب اکثر ارکانِ شعبہ کی غیر دل جمعی، علالت یا بہ ضرورت شہر سے باہر رہنا ہوا۔

مدرسہ تعلیم بالغات واقع اڈکمیٹ بھی اس کے اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ محترمہ سارا بیگم صاحبہ جو مدرسۂ مذکور کی تعلیم اور تعلیمی نظم و نسق میں دلچسپی سے حصہ لیتی تھیں مسلسل علالت کے باعث گزشتہ تمام سال عملی مدد دینے سے بالکل مجبور رہیں۔ تاہم یہ غنیمت ہوا کہ اس زمانہ میں معلمہ فاطمہ بیگم جو اب مدرسہ مذکور میں ہم صدر و ہم مددگار کی حیثیت سے تعلیم کا کام کر رہی ہیں، ہمیں دستیاب ہو چکی تھیں جنھوں نے اپنی محنت، تندہی سے میرے غیاب میں مدرسہ کو بخوبی سنبھال لیا کہ نتائج امتحان اطمینان بخش رہ سکے، گزشتہ سال ہمارے مدرسہ سے گیارہ امیدوار شریک ہوئیں لیکن دو سوئے اتفاق سے موقع امتحان پر غیر حاضر رہیں تو نے حسب ذیل کامیابی حاصل کی

کامیاب بدرجہ امتیاز	کامیاب
حفیظہ بی	اقبال بیگم
ہاجرہ بانو	امیر النسا بیگم

نور جہاں جہانگیر بی
آمنہ بیگم
عائشہ بیگم
بلقیس بیگم

سال حال طالبات اردو دانی کی شرکت و حاضری امید افزا تھی لیکن افسوس فی الحال جنگ کے باعث سراسیمگی برپا کرنے والی افواہوں کی بناء پر باوجود ہدایت و رعایت، دل دہی و تسلی کے اکثر و بیشتر طالبات کا ضلعوں میں یا دور دراز مقاموں پر منتقلی کی غرض سے نام خارج کروالیا گیا۔ جس سے سال آئندہ کے بھی متاثر ہونے کا اندیشہ ہے لیکن ہمیں مایوس نہ ہونا چاہئے۔

نہ کرنے سے کسی کام کا کئے جانا بہر صورت بہتر ہے قطرہ قطرہ دریا، دانہ دانہ انبار بنتا اور ایک ایک ذرہ ہی مل کر پہاڑ کھڑا ہوتا ہے۔ پُر خلوص محنت غیر منقطع ہمت اور مسلسل عمل پیہم نہ سہی تو نتیجتاً موجودگی میں نہیں تو غیاب میں زندگی میں نہیں تو بعد موت کامیاب کرکے ہی چھوڑتے ہیں۔ تعلیم بالغات کے بارے میں تبادلہ خیالات کے دوران میں میرے ایک ماہر فن تعلیم دوست کی ایک بات جو میرے دل کو لگی تھی اس کا اعادہ یہاں ضروری جانتی ہوں کہ " آپ اگر یہ کام کرنا چاہتی ہیں تو سر سید بن جائیے جس نے بچوں کی بھیک مانگی ہے پھر جیسی ملت کی کایا امن نے پلٹ کے رکھ دی آپ بھی کچھ کریں گی " میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ حتی الامکان اس زرین مشورہ پر عمل پیرا رہوں گی۔ یہ بھی بہ طور خاص قابل ذکر امر ہے۔ کہ اس سال بلدہ اور اضلاع کی جملہ ۱۴۸ طالبات شریک امتحانات ہوئیں۔

اب میں آپ کو ایک خوش خبری سناتی ہوں کہ صدر مہتمہ مدارس نسوان سرکار عالی جے سنندی صاحبہ نے جو بوجہ علالت افسوس ہے کہ اس موقع پر شریک نہ ہوسکیں مدرسہ بالغات کے معائنہ اور اظہار پسندیدگی کے بعد امداد کا وعدہ فرمایا تھا۔ بحمد اللہ اس کے لئے آبان ۱۳۵۱ف سے سرکاری امداد مبلغ للعہ کی اجرائی ہوگئی ہے اور امید ہے کہ ادارہ کی سالانہ معینہ امداد مبلغ دو سو روپے کے ساتھ مل کر یہ رقم مدرسہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو کفایت کرکے اس کی ترقی کا موجب بنے گی۔

نیز مسرت و خوش آئند توقع کے ساتھ ایک اور اطلاع دیتی ہوں کہ اب اڈک میٹ میں میرے ہی مکان پر ایک مدرسۂ اطفال کا بھی افتتاح عمل میں آچکا ہے یہ مدرسہ اسفندار ۱۳۵۱ف سے اوقات سرکاری کے مطابق روزانہ کام کر رہا ہے۔ جس کے آغاز کے وقت بیگم منظور جنگ بہادر نے ایک رقمی مدد دے کر میری ہمت افزائی کی تھی اور اب مسز اطہر لیڈی ڈاکٹر صبور النسا بیگم اور مسز ذکی الدین صاحب مددگاران تعمیرات، ماہانہ امداد سے مدرسہ کے مصارف میں ہاتھ بٹا رہی ہیں جس کی میں بہ دل ممنون ہوں۔ نیز سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبہ ایک معینہ رقم اسی مدرسہ کو ماہانہ قرض دے رہی ہیں، مجھے توقع ہے کہ مدرسہ اطفال کے لئے بھی میں جلد تر سرکاری امداد حاصل کرسکوں گی۔

اردو عالم کے لئے بھی دس طالبات زیر تیاری ہیں جو امید ہے آئندہ امتحان دے سکیں گی۔

میں اپنے رفقائے کار خاص کر سکینہ بیگم صاحبہ کا جو ہمارے شعبہ نسوان کی روح رواں ہیں گرم جوش شکریہ ادا کرتی ہوں، اگرچہ اصولاً ایک سال بعد معتمدی پر کسی اور ممبر کا انتخاب ضروری تھا لیکن صاحبہ موصوفہ کا جوشِ عمل اور انتھک محنت متقاضی ہوئی

کہ انھیں کو ہر سال منتخب کیا جائے چونکہ فی زمانہ ان کی صحت متاثر ہو رہی ہے اس لئے بشیر النسا بیگم بشیر کو شریک معتمد منتخب کیا گیا ہے
محترمہ سارا بیگم صاحبہ اور عزیزہ تصدق فاطمہ کی بھی میں مشکور ہوں کہ ان کے مفید مشوروں اور تعاون عمل سے مجھے بروقت مدد ملتی رہی۔
اب میں اپنا اہم فریضہ سمجھتی ہوں کہ ہمارے رہنما سید محی الدین قادری صاحب زورؔ کی خدمت میں نہ صرف جمیع ارکانِ شعبہ بلکہ جملہ خواتین کی جانب سے پُر زور ہدیہ تشکر پیش کروں، جناب کا نام نامی تعریف و تعارف سے بے نیاز ہے۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

یقین ہے کہ اس اُبلتے چشمے سے بہت سے فوارے نکل کر چمنِ اردو کو سیراب کریں گے۔
آخر میں میری دلی دعا ہے کہ خدائے قادر و قدیر ہمارے ولی نعمت اعلیٰ حضرت حضور پر نور، خانوادہ شاہی اور ابدمدت سلطنت آصفیہ کو ہر قسم کے چشم زخم اور فتنہ و آشوب سے محفوظ و مامون رکھے۔

بدعا آمدہ ام ہم بدعا دست برآر!

رابعہ بیگم

اپنی زبان

قائم تغیرات پہ ہستی کا ہے نظام — اِک سیلِ انقلاب ہے دنیا ہے جس کا نام
ہر لحظہ اضطراب پہ مائل ہے زندگی — یعنی کہ پیچ و تاب کی قائل ہے زندگی
پستی کا امتیاز بھی رفعت کے ساتھ ہے — اور شورشِ وجود عدم ہی کے ہاتھ ہے
لیکن ہے فتحمندی کا طاقت پہ انحصار
طاقت کا اتفاق و محبت پہ ہے مدار

پہلے زمین و زر پہ جھگڑتے تھے فتنہ گر! — اس دور میں ہے اک نیا جھگڑا زبان پر
ہم خانہ جنگیوں میں گرفتار ہو گئے — اغیار کی بن آئی کہ سرکار ہو گئے
بیزار اپنی وضع و تمدن سے ہم رہے — ہر اک طرح سے تختۂ مشقِ ستم رہے
یہ جنگ اور تباہی کے آثار الاماں — یہ آتشیں فضاؤں کے اسرار الاماں
ہیں اب تو مال و جان کے لالے پڑے ہوئے — غارت گرِ سکون ہیں در پر کھڑے ہوئے
اقبال اور عروج و امارت بھی کھو چکے — اگلی وہ آن بان وہ عظمت بھی کھو چکے
وہ امن کا سہانا زمانہ گزر گیا — شیرازہ اتفاق کا یکسر بکھر گیا
بے لاگ زندگی کا سکوں خواب بن گیا — پانی کا اب تو قطرہ بھی گرداب بن گیا
پر یہ جمود و شامتِ گلزار تا بہ کَے؟ — خوابِ گراں پہ خندۂ اغیار تا بہ کَے؟
لے دے کے اک زبان پہ قابو نصیب ہے — کچھ دوڑ دھوپ کیجئے کہ خطرہ قریب ہے
الفت اگر ہے آپ کو ہندوستان سے — غافل نہ آپ ہوں کبھی اردو زبان سے
اس دورِ کشمکش میں ہوئی نیم جان ہے
للہ! سنبھالئے کہ یہ اپنی زبان ہے

بشیر النسا بیگم بشیر

بنگلور میں ادارۂ ادبیات اُردو

(محترمہ حبیب النساء بیگم صاحبہ ایم اے۔ لکچرار مہارانی کالج بنگلور نے ادارہ کے سالانہ جلسۂ شعبہ نسواں میں حسب ذیل تقریر کی۔)

محترمہ صدر صاحبہ اور عزیز بہنو!

میں اپنی انتہائی خوش قسمتی تصور کرتی ہوں کہ مجھے آج حیدرآباد کے اس عظیم الشان جلسۂ نسواں میں ادارۂ ادبیات اُردو کی شاخ بنگلور کی رپورٹ سنانے کا موقع ملا۔ اردو نے سرزمین دکن میں جنم لیا اور یہیں اس کا نشو ونما بھی ہوا۔ اور اس وقت وہ ایک ایسی سرزمین میں سرسبز ہو رہی ہے جس کی خاک کا ہر ذرہ تاریخ گزشتہ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ اور جہاں علوم وفنون کے چشمے ابل رہے ہیں اور اعلیٰ حضرت حضور والا جاہ کے مبارک ہاتھوں سے اردو کے نونہالانِ چمن سینچے جا رہے ہیں۔ اب اس میں کونپلیں بھی پھوٹنی شروع ہو گئی ہیں جس کا زندہ نمونہ آپ کے سامنے اس وقت ادارۂ ادبیات اردو کی شکل میں موجود ہے۔ دراصل یہ ادارہ اپنے وجود کے لئے حضرت قبلہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ صاحب کی ان تھک کوششوں اور جوش وخلوص کا رہین منت ہے۔ ادارے نے اپنا نصب العین اردو کی توسیع واشاعت بنایا اور ہر جگہ اپنی سرگرمیوں سے ذوقِ عمل کا بیج بو دیا۔ ۱۹۴۱ء کے ماہ جنوری میں عزیز بہن محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیرؔ جب آل انڈیا ویمنز کانفرنس کے سلسلے میں بنگلور تشریف لائی ہوئی تھیں تو انھوں نے ادارۂ ادبیات اردو کے اغراض ومقاصد بیان کرکے اس کی شاخ بنگلور میں کھولے جانے کی تحریک کی تھی۔ اس کے دو ماہ بعد ہی مجھے حیدرآباد آنے کا اتفاق ہوا ادارۂ ادبیات اردو کو بچشم خود دیکھ کر جو مسرت کہ مجھے محسوس ہوئی الفاظ میں بیان نہیں کرسکتی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ میری دیرینہ آرزو پوری ہونے والی ہے اور وہ وقت آگیا ہے کہ اردو کی خدمت جس کا اب تک صرف تصور ہی تصور تھا واقعتاً انجام دوں۔ الغرض ہم نے ادارہ کے شعبہ نسواں کی شاخ بنگلور میں قائم کردی اور ۱۹۴۲ء کی جنوری سے اس نے اپنا کام باقاعدہ شروع کردیا۔ اس کی روئداد حسب ذیل ہے:۔

محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیرؔ کی تحریک پر بنگلور میں ادارۂ ادبیات اردو کی شاخ قائم کرنے کا جو خیال عرصہ سے تھا وہ ۵ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو اس طرح تکمیل کو پہنچا کہ گرل گائیڈ ہیڈ کوارٹرز میں خواتین بنگلور کا ایک جلسہ بصدارت عقیلہ بیگم صاحبہ عقیلہ ایم آر اے منعقد ہوا جس میں حبیب النساء بیگم ایم اے نے ادارے کے اغراض ومقاصد بیان کئے اور ڈاکٹر زورؔ صاحب کے جوش ملی و ذوق علمی کا تذکرہ کیا، تمام خواتین نے متفقہ طور پر شاخ کے قیام کا تصفیہ کیا جس کی بناء پر ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو مہارانی کالج میسور میں جب اردو وفارسی انجمن کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا اور تقریباً دو سو خواتین نے شرکت کی تو شاخ ادارہ کی مجلس انتظامی کا انتخاب کیا گیا۔

اس مجلس انتظامی کا پہلا جلسہ ۲۳ر جنوری ۱۹۴۲ء کو گرل گائیڈ ہیڈ کوارٹرز بنگلور میں منعقد ہوا۔ اس میں حبیب النساء بیگم ایم اے معتمد نے گزشتہ جلسوں کی کاروائی اور حساب کتاب پیش کیا۔ اور عقیلہ بیگم صاحبہ صدر شاخ ادارہ سے استدعا کی کہ وہ اس شاخ

کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد کی اطلاع و تبلیغ تشہیر کے لئے مختلف مقامات مثلاً انجمن میمن خواتین بنگلور انجمن اردو اساتذہ پرائمری اسکولس اور دیگر انجمنوں میں تقریروں کا انتظام فرمائیں جس کو محترمہ نے بخوشی قبول فرمایا۔ چنانچہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۲ء کو انجمن اردو اساتذہ پرائمری اسکولس کی صدارت کرتے ہوئے محترمہ عقیلہ بیگم نے ادارۂ ادبیات اردو بنگلور کے قیام اور اس کے مقاصد و امتحانات کا خوبی سے ذکر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر خواتین نے اردو امتحانات میں شریک ہونے کی خواہش ظاہر کی۔

بنگلور کے شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ حسب ذیل خواتین پر مشتمل ہے۔

صدر۔ عقیلہ بیگم صاحبہ محمود شریف ایم آر اے۔ معتمد۔ حبیب النسا بیگم صاحبہ ایم اے۔ شریک معتمد۔ عالیہ بیگم حقانی آئے

اراکین:۔ صابرہ بیگم صاحبہ۔ ملکہ بیگم صاحبہ۔ فاطمہ ہڈ مسٹرس اردو گرلز اسکول۔

ابھی تک تعلیم بالغان کا باقاعدہ انتظام نہیں ہو سکا تاہم ہم نے آئندہ سال ادارے کے امتحانات میں شرکت کے لئے اکثر بہنوں کو آمادہ کر لیا ہے۔ فی الحال ادارے کے تحت میں ایک کتب خانہ کامیابی سے چل رہا ہے۔ الغرض حیدر آباد کی علمی سرگرمیوں کو دیکھ کر ہمیں بھی اُردو کی خدمت کا شوق ہو رہا ہے۔ اس وقت بنگلور میں ادارے کے علاوہ دو تین اور انجمنیں ہیں جن کے معتمد یا صدر کو ہم نے ادارہ کی شاخ کا رکن بنا لیا ہے۔ لیکن مجھے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی سرگرمیوں کے مقابلے میں ہم اردو کی کوئی خدمت انجام نہیں دے رہی ہیں لیکن آپ کے ذوق و شوق سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہیں رہ سکتیں۔ خدائے پاک آپ کی ہمتوں میں برکت عطا فرمائے اور آپ کی کوششیں بار آور ہوں۔ اور ادارۂ ادبیات اردو دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے۔

یارب چمن ہمیشہ یہ پھولا پھلا رہے ... اغیار کی یہ چشم بدی سے بچا رہے
سرسبز یہ درخت رہے برگ و بار سے ... سلطان آصفی کا اسے آسرا رہے

حبیب النسا بیگم

علم خانہ داری

از محترمہ محمودہ صالحتی۔ علم خانہ داری عورتوں کے لئے ایک نہایت ضروری فن ہے۔ اردو زبان میں اس علم کے متعلق بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں خواتین کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھ کر ادارۂ ادبیات اردو نے یہ کتاب شائع کی ہے۔ اس میں جسم اور اعضائے جسمانی حفظ صحت، ہوا، پانی اور غذا، گھر اور اس کی نگہداشت، امراض اور اس کی روک تھام تیمارداری اور فرسٹ ایڈ، گھر کا انتظام اور کھانوں کے نسخے وغیرہ قابل ذکر ہیں ہر عنوان کے تحت کئی ذیلی سرخیاں قائم کر کے سلیس اور سادہ زبان میں مفید معلومات قلمبند کر دی گئی ہیں۔

یہ کتاب اپنی خصوصیات اور افادیت کا لحاظ کرتے اس قابل ہے کہ ہر پڑھی لکھی خاتون اس کا مطالعہ کرے اور اپنی گھریلو زندگی کو خوشگوار بنائے۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اکثر زنانہ مدرسوں اور امتحان اردو عالم کے نصاب میں شریک ہے صفحات ۱۵۰ قیمت ۸

اُردو زبان

(محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا نے حسب ذیل فی البدیہہ تقریر کی)

میرے خیال میں پہلے زمانے میں سلطان غوری اور غزنیوں کے زمانے سے دہلی میں فارسی زبان عام تھی ۔ لوگ بولتے بھی فارسی تھے اور لکھتے پڑھتے بھی فارسی ۔ دفتری زبان بھی فارسی تھی ۔ جتنے شاعر بڑے بڑے ہندو اور مسلمان گزرے سب فارسی میں اشعار کہتے تھے ۔ اس طرح لکھنؤ میں بھی سید امین سعادت خاں برہان الملک سے پہلے سے ہی فارسی عام بولی جاتی تھی ۔ ایک زمانے تک فارسی ہی مقبول خاص و عام رہی ۔ حیدرآباد دکن میں بھی قطب شاہی زمانے سے فارسی جاری ہوئی ۔ دفتری زبان فارسی تھی ۔ جب عالمگیر کی حکومت دکن میں ہوئی اس وقت بھی فارسی زبان دفتری زبان تھی اور سب لوگ فارسی ہی میں لکھتے پڑھتے تھے ۔ حالانکہ تیمور شاہ وغیرہ ترکستان سے آئے تھے ۔ لیکن انھوں نے اپنی زبان ترکی کو رواج نہ دیا بلکہ فارسی ہی کو اپنی ملکی و قومی زبان بنایا ۔ جب نظام الملک میر قمرالدین خاں آصف جاہ کی حکومت ہوئی اس وقت بھی فارسی دفتری زبان تھی ڈیڑھ سو سال تک فارسی جاری رہی میر محبوب علی خاں سابق شاہ دکن خلد آشیاں کے زمانے سے اردو زبان دفتری زبان قرار پائی ۔ اب ہمارے بادشاہ میر عثمان علیخان دام اقبالہٗ نے اردو کو بام عروج پر پہنچا دیا اُردو یونیورسٹی قائم کی جس کی وجہ سے سیکڑوں کتابیں دوسری زبانوں سے اردو زبان میں ترجمہ ہو رہی ہیں ۔ ادارۂ ادبیات اردو بھی دکن میں قائم ہوا یہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زورؔ کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ آج کے دن اس ادارہ کے تحت بہت سی کتابیں لکھی جا رہی ہیں اور ترجمہ بھی کی جا رہی ہیں اس کی کامیابی کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے عورتوں کو بھی شریک کیا ہے ۔ تعلیم یافتہ خواتین شریک ہیں، رابعہ بیگم صاحبہ، سکینہ بیگم صاحبہ، بشیرالنسا بیگم صاحبہ، رقیہ بیگم صاحبہ وغیرہ نہایت دلچسپی سے کام کر رہی ہیں ۔ اگر خواتین شریک نہ ہوتیں تو اس قدر جلد ادارۂ ادبیات اردو ترقی نہیں کر سکتا تھا ۔

حاضرین ۔ شہر بغداد میں جب بنی عباسیوں کا ستارہ آسمانِ عروج پر تھا، ادارۂ ادبیات اردو جیسا ایک عظیم الشان محکمہ ترجمہ کا بھی قائم کیا گیا تھا، اس میں دوسری زبانوں سے عربی زبان میں ترجمہ کیا جاتا تھا ۔ قدیم یونانیوں کے حالات سے جو یورپ فائدہ حاصل کر رہا ہے یہ وہی عربی کی کتابیں ہیں ۔ جاپان نے جو ترقی کی ہے اس کا بہت بڑا سبب یہی ہے کہ وہاں دو محکمے ترجمہ کے قائم ہیں ایک تو منجانب سرکار دوسرا منجانب رعایا جاپان کی درسگاہوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ ان کی ملکی زبان ہے ۔ افسوس اس کا ہے کہ ہماری عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم تو اردو میں دی جاتی ہے اور رپورٹ اور تقریریں وغیرہ انگریزی میں ہوتی ہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہم خود اپنی زبان کو چھوڑنا چاہتے ہیں حالانکہ ہماری اردو زبان تمام ہندستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ ہندستان کے علاوہ ایران عربستان اور سیلون وغیرہ میں بھی اردو جاننے والے ہیں اگر وہاں ہندی وغیرہ بولی جائے تو ایک آدمی بھی ہندی، تلگو، مرہٹی جاننے والا یورپ اور عرب و ایران میں نہیں ملے گا ۔ ہم سب ہندو مسلمانوں کو چاہیئے کہ اردو ترقی دیں کیونکہ یہ زبان صرف مسلمانوں کی نہیں ہے، بلکہ ہندو، مسلمان دونوں نے مل کر اس کو ترقی دی ہے ۔ اردو زبان میں بھاشا، سنسکرت، فارسی، عربی، ترکی وغیرہ کے الفاظ مل کر ایک مشترکہ زبان بن گئی ہے ۔ شاہ جہاں کے زمانہ میں جب لال قلعہ بن رہا تھا اس وقت فوج وہاں رکھی گئی تھی چاروں طرف کے آدمی وہاں تجارت کرتے تھے اور اپنی اپنی زبان میں باتیں کرتے تھے اس طرح اردو زبان خود بخود بنتی گئی ۔

حیدرآباد دکن کو اس کا بھی فخر ہے کہ اردو کا پہلا شاعر جو شمالی ہند میں اردو شاعری کا بانی ہوا ولی دکنی تھا۔ میں اپنے تعلیم یافتہ بھائیوں اور بہنوں سے یہ ضرور کہوں گی کہ وہ اردو کو ترقی دینے کی کوشش کریں اور ادارۂ ادبیات اردو کی دستگیری کریں۔ اردو کتابیں پڑھا کریں اردو رسالے اور اخبارات خرید کر پڑھیں۔ آج کل کے تعلیم یافتہ مرد اور عورتیں انگریزی کتابیں اور اخبارات پڑھا کرتی ہیں۔ اردو کا ان کو شوق ہی نہیں اردو کو اپنی قومی و ملکی زبان بنائیں تاکہ اردو ہمیشہ زندہ رہے۔

صغریٰ ہمایوں مرزا

خطبۂ صدارت

رقیہ بیگم صاحبہ ایم اے اکسن (مسز زین یار جنگ بہادر) پرنسپل کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ کا خطبۂ صدارت جو انھوں نے جمعہ ۲۷ مارچ ۱۹۴۲ء کو شعبۂ نسوان ادارۂ ادبیات اُردو کے سالانہ جلسہ میں پڑھا۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ و خواتین!

میں اس مشہور علمی اور ادبی ادارے کے شعبۂ نسوان کے سالانہ اجلاس کی صدارت کو اپنے لئے باعث صد افتخار سمجھتی اور آپ کی بہ دل مشکور ہوں گر جب میری نظر پر محترمہ لیڈی حیدری مرحومہ اور محترمہ بیگم صاحبہ نواب مہدی یار جنگ بہادر جیسے پیشروؤں پر پڑتی ہیں جنھوں نے سابقہ اجلاسوں میں صدارت کی تو میری کم بضاعتی مجھ پر زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔ بہرحال آپ نے اس ناچیز کا جو انتخاب فرمایا ہے اس کے حق بجانب ہونے کی ذمہ داری آپ ہی پر رہے گی۔

اس ادارے کے مختلف شعبوں کے کاروبار سے مجھے بھی کسی قدر واقفیت حاصل ہے۔ قبل اس کے کہ ادارۂ ادبیات اردو کے کارناموں کا ذکر کروں میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ کی بے لوث خدمات کا اعتراف ضروری سمجھتی ہوں۔ صاحب موصوف نے اس ادارے کی اور اس ذریعہ سے زبان اردو کی جس پُرخلوص جذبہ سے خدمت انجام دی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ یہ ادارہ اور اس کی جملہ کارگزاریاں ڈاکٹر زورؔ صاحب کے شخصی انہماک کی رہین منت ہیں۔ اور ہم سب مشکور ہیں کہ ایسے نازک زمانے میں جب کہ قومی زبان کا جھگڑا سیاسی رنگ اختیار کر رہا تھا صاحب موصوف کی توجہ اور دلچسپی نے نہ فقط اس ادارے کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں بڑی مدد دی بلکہ اس کی توسیع میں بھی ماہرانہ رہبری کی۔

ادبیاتِ اطفال کی فراہمی کے لئے جو مجلس کام کر رہی ہے وہ بھی اس ادارے کے شعبہ کی حیثیت سے اپنے مقصد میں بہت کچھ سرگرم عمل ہے۔ گزشتہ دو سال کے عرصے میں اس شعبے نے بچوں کے مطالعہ کی دلچسپ، مفید، دیدہ زیب اور با تصویر کتابیں لکھوائی ہیں جس میں سے دو، چیونٹی اور کشمش نانی اس وقت شائع بھی ہو چکی ہیں۔ بچوں کی کتابوں کی طرح ہماری زبان میں نسوانی ادب کی بھی قابل لحاظ کمی ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ ادارے کا شعبۂ نسوان محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کی صدارت اور عزیزہ سکینہ بیگم صاحبہ کی معتمدی میں پوری دلچسپی اور توجہ کے ساتھ مصروفِ کار ہے۔ اس نے بھی اس اثناء میں چند مفید کتابیں مثلاً "نند دکن" "من کی بپتا" "سوتیلی ماں" "رسائل طیبہ" "علم خانہ داری" وغیرہ شائع کر کے اپنے فرائض کا بخوبی اظہار کیا ہے۔ خاص کر رسائل طیبہ کی اشاعت بہت ضروری تھی کیونکہ طیبہ بیگم مرحومہ ان خواتین میں سے تھیں جنھوں نے حیدرآباد میں سب سے پہلے طبقۂ اناث کی علمی و ادبی فلاح و بہبودی کے لئے کام کا آغاز کیا۔ انھوں نے نہ صرف خود کام کیا بلکہ دوسروں کو بھی عمل کی طرف راغب کیا۔ ان کی قائم کی ہوئی انجمن اب تک کام کر رہی ہے۔ انھوں نے انشا پرداز اور مصلح کی حیثیت سے جو مرتبہ حاصل کیا اس کا اندازہ ان خطبوں، تقریروں اور مضامین سے ہو سکتا ہے جو اس کتاب رسائل طیبہ میں شائع ہوئے ہیں۔

کتابوں کی اشاعت کے علاوہ شعبۂ نسوان نے تعلیم بالغات جیسے اہم کام کا آغاز کیا اور وہ بھی ترقی کرتا جا رہا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے

مسرت ہوئی کہ آپ کے شعبہ کی طرف سے ادارے کے گزشتہ دو امتحانات میں اچھی تعداد میں طالبات شریک اور کامیاب ہوئیں۔ اور آئندہ امتحان میں بھی شریک ہونے والی ہیں۔ اس کامیابی پر میں صدر شعبہ رابعہ بیگم صاحبہ کو مبارک باد دیتی ہوں کیونکہ تعلیم بالغات کا انتظام وہ اپنی نگرانی اور اپنے ہی مکان میں ایثار کے ساتھ کر رہی ہیں۔

مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ آپ کے شعبۂ نسوان کی شاخیں مختلف مقامات میں قائم ہو رہی ہیں۔ خاص کر بنگلور اور گلبرگہ کی شاخوں کی مجلس انتظامی میں جو خواتین شریک ہیں اور اب تک انھوں نے جس مستعدی کے ساتھ جلسے منعقد کئے تقریریں کیں اور تعلیم بالغات کا انتظام کر رہی ہیں اس کو پیش نظر رکھ کر تو میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس شعبۂ نسوان کا فیض دور دور پہنچے گا اور اس طرح آپ کا مستقبل بے حد شاندار نظر آتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بنگلور کی شاخ عقیلہ بیگم صاحبہ محمود شریف ایم' آر' اے' ایس کی صدارت اور حبیب النساء بیگم صاحبہ ایم اے کی معتمدی میں وہ تمام کام ریاست میسور میں انجام دے گی جو آپ کا شعبہ اس سلطنت ابدمدت میں کر رہا ہے گلبرگہ کا شعبۂ نسوان محترمہ محمدی بیگم صاحبہ بی اے۔ (مسز جمیل حسن صاحب تعلقدار) صدر شعبہ اور حمیدہ بانو صاحبہ معتمد نیز بیگم صاحبہ علاء الدین صاحب مہتمم تعلیمات کی دلچسپیوں کی وجہ سے ایک اچھے علمی اور ادبی نظام عمل کے مطابق مصروف کار ہے۔ حال ہی میں انھوں نے شعبہ کی طرف سے جو یوم غالب منایا اس کی روئداد سے مجھے معلوم ہوا کہ گلبرگہ کی خواتین میں یہ شعبہ علم و فضل کا بڑا اچھا ذوق پیدا کر دے گا۔

حیدرآباد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی کمی نہیں ہے لیکن اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ سب ایک علمی و ادبی مرکز پر جمع ہو کر علم کا ذوق اور ذہن کی شائستگی پھیلانے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔ ادارۂ ادبیات اردو نے ایک ایسا مرکز تیار کر دیا ہے اور اب آپ ہم سب کا فرض ہے کہ اس مرکز کو مستحکم کریں اور پڑھی لکھی خواتین کے علمی اور ادبی ذوق میں اضافے کا باعث بننے کے علاوہ ان پڑھ عورتوں کو بھی پڑھنے لکھنے کی دولت سے مالا مال کریں۔ اگر ہم سب مل کر کوشش کریں تو کوئی تعجب نہیں کہ آئندہ سال دوگنی تعداد میں عورتیں ادارے کے امتحانات میں شریک ہوں گی۔ ان کو سندیں اور تمغے دے کر مجھے بے حد مسرت ہوئی اور اس کے لئے میں آپ سب خواتین کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

رقیہ بیگم

شعبۂ ادبیات اطفال کی مطبوعات

چیونٹی - از رائے جھمندر راج سکسینہ ایم ایس سی لکچرار نباتیات جامعہ عثمانیہ۔ اس کتاب میں تقریباً بیس عکسی تصویریں شریک ہیں۔ کتاب کا سرورق بھی بچوں کی دلچسپی کے لئے رنگین بنایا گیا ہے۔ چیونٹی کی سوانح عمری' سماجی زندگی' گھریلو زندگی' اور عام عادتیں کے عنوانات کے تحت مفید اور دلچسپ معلومات بڑے سلیس انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ قیمت ۸ھ۔ صفحات ۱۱۶۔

کشمش نانی - یہ کتاب مولوی شجاع احمد صاحب تائدؔ نے بطور خاص بچوں کے لئے لکھی ہے۔ اس میں پرانی طرز کی کہانیوں کو نئے انداز میں لکھا گیا ہے۔ جو دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ اس میں کئی تصویریں بھی ہیں۔ جن سے کتاب کی زینت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کا ٹائٹل اور تصویریں ملک کے مشہور و معروف حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنائی ہیں۔ ہر پڑھے لکھے گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ قیمت ۱۰ ار

سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو

گزشتہ پنجشنبہ کو ادارۂ ادبیات اردو کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں شعبہ اردو امتحانات کے متعلق مولوی سید علی اکبر صاحب کی رپورٹ اور ادارہ کی سالانہ رپورٹ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور میں اس ادارہ کی قابل تحسین جدوجہد کے جو حالات پیش کئے گئے ہیں ان سے اس ترقی کا اندازہ ہوتا ہے جو ادارہ اپنی جدوجہد کے ہر شعبہ میں کر رہا ہے۔ اس کا شعبۂ امتحانات اردو ہماری نظر میں ایک اہم ترین شعبہ ہے جس کے تعمیری نتائج بہت دور رس ہیں اور جس سے دکن میں زبان اردو کی ترویج و ترقی کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس شعبہ کی روئداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان امتحانات کے شرکاو کی تعداد گزشتہ سال کے ۲۹۰ کے مقابلے میں اس سال ۶۷۷ تھی۔ سال گزشتہ ادارہ کی کوششوں سے ۱۶۵ اشخاص نے اردو سیکھی تھی اور اس سال ۴۳۵ اشخاص نے سند حاصل کی۔

اردو عالم کے امتحان میں گزشتہ سال ۴۷ امیدوار شریک تھے اور اس سال ان کی تعداد (۱۱۵) تک پہنچ گئی۔ ایسا ہی تناسب اردو فاضل اور خوش نویسی کے امیدواروں کا بھی رہا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس سال (۱۴۵) عورتیں اور ۹۵ غیر مسلم امیدواروں نے ان امتحانات میں شرکت کی بحیثیت مجموعی جملہ امتحانات کے کامیاب طلبہ کا اوسط حسب ذیل رہا:۔

اردو فاضل۔ ۴۷ حاضر ۳۶ کامیاب ۱۴ بدرجۂ دوم نتیجہ فی صد ۷۷۔

اردو عالم۔ ۹۹ حاضر ۶۵ کامیاب ۱۔ اول اور ۲۴ بدرجۂ دوم نتیجہ ۶۵ فی صد۔

خوش نویسی۔ ۱۹ حاضر ۱۱۔ کامیاب ۴ اول اور ۲ بدرجۂ دوم نتیجہ ۵۸ فی صد۔

اردو دانی۔ ۴۴۳ حاضر۔ ۳۱۷ کامیاب ۸۷ بدرجۂ امتیاز۔ ۹۲ فی صد۔

ممالک محروسہ کے طول و عرض اور آبادی کی تعداد کا لحاظ کر کے یہ اعداد کچھ زیادہ نہیں ہیں، لیکن اس بات کو نہ بھولنا چاہئے کہ ادارہ کی یہ ابتدائی کوشش ہے اور اس قسم کی کوئی دوسری کوشش بھی ممالک محروسہ میں ابھی تک شروع نہیں ہوئی ہے۔ یہ ایک بنیادی اور تعمیری کام ہے لیکن ہمارے ملک میں محنت کرنے والے لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ نیز اس کام میں نام و نمود کے مواقع بہت کم ہیں اور محنت کرنے کی ضرورت بہت زیادہ ہے، پھر بھی یہ امر ادارہ کی مقبولیت کا بڑا ثبوت ہے کہ اس کو اس قدر "خشک" کام کے لئے بھی بہت سے مخلص کارکن مل گئے جنھوں نے چند ہی روز میں اپنی کوششوں کے امید افزا نتائج حاصل کر لئے۔ شعبۂ امتحانات کی رپورٹ میں انعامات دینے والے اصحاب کی جو فہرست دی گئی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ادارہ کی اس تحریک میں وہ لوگ جو ٹھوس کام کی قدر و قیمت سے واقف ہیں کس قدر عملی دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں، اس شعبہ کا مقصد اردو زبان کو تمام ممالک محروسہ میں رائج کرنا اور مقبول بنانا ہے۔ یہ واقعہ کہ علاوہ مسلمانوں کے ان ۴۳۵ اشخاص میں جنھوں نے سندات حاصل کیں ۹۵ غیر مسلم اور ۱۴۴ خواتین بھی تھیں یقیناً بہت امید افزا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادارہ کا کام صحیح سمت میں خوشگوار نتائج پیدا کر رہا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ نے اپنی رپورٹ میں ادارے کے بعض دوسرے شعبوں اور خصوصاً شعبۂ تصنیف و تالیف کا ذکر کیا۔ ان شعبوں میں سب سے اہم اور بہت دشوار کام انجام دینے والا شعبہ اردو انسائیکلوپیڈیا کا شعبہ ہے جس کے متعلق ڈاکٹر صاحب موصوف نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ یہ

"کام آسان نہیں اور نہ اس میں عجلت کی جاسکتی ہے تاہم گزشتہ ½۱ سال کی مسلسل کاوشوں نے اس شعبہ کو اس قابل بنا دیا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد تقریباً تیار ہو چکی ہے"

یہ ایک بہت امید افزا اور خوشگوار خبر ہے کہ ½۱ سال کی محنت کے بعد پہلی جلد تقریباً تیار ہو چکی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس کام کی رفتار روز بروز تیز ہوتی جارہی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس کام کی تکمیل ادارہ کی زندگی کا ایک قابل فخر کارنامہ ہوگا۔

ڈاکٹر زورؔ نے اپنی رپورٹ میں ادارہ کی سب سے بڑی ضرورت کا ذکر کیا ہے، یعنی یہ کہ اس کے لئے ایک مستقل عمارت کا ہونا ضروری ہے اور جیسا کہ موصوف نے فرمایا "یہ ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے جس کی تکمیل کے بعد ہی ادارہ کو اطمینان کے ساتھ اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کا موقع ملے گا"۔ حیدرآباد جیسے مقام پر جہاں امراء اور خوش حال اصحاب کی کمی نہیں ہے ادارہ کی عمارت کے لئے سرمایہ کا جمع ہو جانا کوئی مشکل کام نہیں معلوم ہوتا۔ علاوہ بریں عوام میں بھی ادارہ کی شہرت بڑھتی جارہی ہے اور...... ہمیں امید ہے کہ اگر کسی ایسے سرمایہ کی فراہمی کا کام شروع کیا جائے گا تو اس کے خاطر خواہ نتائج حاصل ہوسکیں گے۔

ہم ڈاکٹر زورؔ اور ان کے شرکار کار کو مبارک باد دیتے ہیں کہ وہ استقلال کے ساتھ اور باوجود تمام مشکلات کے ہر سال اپنی تحریک کے بہتر نتائج ملک کے سامنے پیش کر رہے ہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ اہلِ ملک ادارۂ ادبیات اردو کے ساتھ پورا تعاون کرکے اس کی مخلصانہ کوششوں کی قدر کریں گے۔

قاضی عبدالغفار

(اداریۂ پیام مورخہ ۳۰ مارچ ۱۹۴۲ء مطابق ۲۶ اردی بہشت ۱۳۵۱ف)

قواعد رکنیت ادارہ

۱۔ سرپرست وہ ہوں گے جو ایک ہزار روپے یکمشت یا ایک سو روپے سالانہ ادارہ کو عطا فرمائیں۔ ان کی خدمت میں تمام مطبوعاتِ ادارہ بلاقیمت پیش کی جائیں گی۔

۲۔ معاون وہ ہوں گے جو ڈھائی سو روپے یکمشت یا پچیس روپے سالانہ ادارہ کو عطا فرمائیں۔ ان کو سال بسال مطبوعات ادارہ بلاقیمت دی جائیں گی۔

۳۔ رکن دوامی وہ ہوں گے جو از روئے قواعد بالا ادارہ کے سرپرست یا معاون ہوں یا وہ جو ادارہ کو پچاس روپے یکمشت عطا کریں گے۔ ان کو سال بسال ادارہ کی مطبوعات و رسائل تین چوتھائی قیمت پر دئے جائیں گے۔

۴۔ رکن الف وہ ہوں گے جو چھ روپے سالانہ دیں۔ ان کو سال بسال ادارہ کی مطبوعات و رسائل تین چوتھائی قیمت پر دئے جائیں گے۔

۵۔ رکن ب وہ ہوں گے جو تین روپے سالانہ دیں گے۔ ان کو سال بسال ادارہ کی مطبوعات و رسائل بارہ فی صد کمی قیمت پر دئے جائیں گے۔

۶۔ رفیق وہ ہوں گے جن کی علمی و ادبی خدمات مستند سمجھی گئی ہوں، یا جو ادارہ کے علمی و ادبی کاموں میں غیر معمولی حصہ لے رہے ہوں، جس کے اعتراف میں مجلس انتظامی ان کو رفیق منتخب کرے گی۔

ادارۂ ادبیات اُردو کا جلسۂ تقسیم اسناد

ملک میں غیر سرکاری طور پر "ادارۂ ادبیات اردو" ڈاکٹر زور صاحب کی معتمدی میں اردو زبان کی خدمت جس زور سے ادا کر رہا ہے وہ نہایت ہی قابلِ قدر ہے۔ اس کی سرگرمیاں مختلف النوع ہیں اور اب تو اس نے اپنی ان سرگرمیوں کو اردو زبان کے امتحانات کو داخل کر کے اور بھی عالمگیر کر دیا ہے۔ اس ادارہ سے ملک کے مردوں اور عورتوں سب کو برابر کی دلچسپی ہے اور اس کے امتحانوں میں شریک ہو کر اسناد اور تمغے حاصل کرنے والوں میں خواتین کی ایک خاصی تعداد بھی ہوا کرتی ہے۔

اب کی مرتبہ ادارۂ مذکور نے اپنی اسناد اور تمغے تقسیم کرنے کے لئے بڑا شاندار جلسہ منعقد کیا تھا۔ اس کے مردانہ اجلاس بھی ہوئے اور زنانہ اجلاس بھی۔ مولوی سید علی اکبر صاحب صدر شعبۂ اردو امتحانات نے اس موقع پر جو رپورٹ سنائی اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ملک میں اس ادارہ کے امتحان بہت مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ادارہ نہ صرف نصاب مقرر کرتا اور سال میں چند مراکز پر امتحان لے لیتا ہے، بلکہ نصاب کی کتابیں بھی ایک حد تک تیار کرتا اور اپنے ماہرینِ تعلیم سے امتحان میں بیٹھنے والوں کے لئے تقریریں کرواتا اور زبان سکھانے کے انتظامات بھی کرتا ہے۔ آپ نے بتایا کہ گزشتہ سال ان امتحانوں کے لئے بلدہ و اضلاع میں صرف آٹھ مرکز تھے مگر سال حال یہ بڑھ کر (۲۱) ہو گئے۔ شرکاء امتحانات کی تعداد (۲۶۰) سے بڑھ کر (۶۷۷) ہو گئی اور اردو سیکھنے والوں کی تعداد (۱۶۵) کے مقابلے میں (۴۳۵) جن میں (۱۴۸) خواتین اور ۹۵ غیر مسلم شریک ہیں۔

مردانہ جلسۂ تقسیم اسناد میں نواب سر عقیل جنگ بہادر نے اسناد اور تمغے تقسیم فرمائے اور زنانہ جلسہ میں بیگم زین یار جنگ بہادر نے۔ زنانہ جلسہ کی روئداد سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ادارہ کی ایک نسوانی شاخ محترمہ حبیب النساء بیگم صاحبہ ایم اے لکچرار مہارانی کالج کی دلچسپی کی وجہ سے بنگلور میں بھی قائم ہو گئی ہے اور ادارہ کا شعبۂ نسواں بیک وقت خواتین میں خواندگی اور اردو زبان دونوں کی اشاعت کر رہا ہے۔

اردو زبان کو ان دنوں سیاسی جھگڑوں میں پھنسا لیا گیا ہے مگر یہی وہ زبان جو اب بھی ہندستان کی عام زبان ہے اور جس کو ان سیاسی گتھیوں کے کھل جانے کے بعد آئندہ عام طور پر عام زبان تسلیم بھی کر لیا جائے گا۔ جو زبان یہاں عوام میں پیدا ہوئی ہے اور عوام کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے جس نے مقابلتاً بہت تھوڑی مدت میں اپنی طبعی نمو پذیری کے باعث اتنی ہی وسعت اختیار کر لی ہے جتنی کہ دنیا کی کسی اور بڑی ادبی زبان میں ہے، جو ہر قسم کی ادبی نازک خیالیوں اور فنی اصطلاحوں کو بیان کر سکتی ہے یا اگر وہ نہیں ہیں تو آسانی سے پیدا کر سکتی ہے، وہ آسانی سے مٹائی نہیں جا سکتی لیکن اگر اس کو زندہ رکھنے کی ایسی ہی مساعی ہوتی رہیں جیسی کہ ادارۂ ادبیات اردو کی ہیں، پھر تو اس کے لئے کوئی اندیشہ نہیں کیا جا سکتا۔

رہبر دکن

ادارۂ رہبر دکن مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۴۲ء
مطابق ۲۹ اردی بہشت ۱۳۵۱ ف

تاثرات سالانہ اجلاس

جلسے کے انعقاد سے قبل ہی باقاعدہ ادارے کے دعوت نامے، معتمد اور ارکان کے نام وصول ہوئے۔ ادارۂ ادبیات اردو کے علمی ذخیرے، وہاں کے نوادر دیکھنے کا تو ایک عرصے ہی سے اشتیاق تھا۔ اِس سمندِ شوق پر جب جلسۂ تقسیم اسناد اور کانفرنس ادارہ کی شرکت کا تازیانہ لگا، پھر اس جذبۂ بے اختیار کا روکنا دشوار تھا۔ چنانچہ ۱۲؍ اردی بہشت کی صبح کو خاکسار معتمد مع عالی جناب حکیم مولوی فخرالدین صاحب صدر، شاخ پرلی کی روحِ رواں مولوی اشرف الدین فیضیؔ، نیز کثیر کامیاب شدہ امیدواروں کو بغرض حصول اسناد اپنے ہمراہ لے کر بلدہ روانہ ہوا اسی رات گیارہ بجے نام پلی پہنچ گیا۔ رات جوں توں کرکے کاٹی اور صبح ادارے کا رخ کیا۔

جب ہم ادارے کی عالیشان عمارت میں داخل ہوئے دائیں طرف عظیم الشان ڈیرے کھڑے ہوئے تھے، سب سے اخیر میں وہ ڈیرہ تھا جو باہر سے آنے والوں کے لئے نصب کیا گیا تھا۔ ہمیں اچانک مولوی خواجہ حمید الدین شاہدؔ نے دیکھ لیا اور جس محبت، خلوص اور دلی جوش سے ہمارا انھوں نے خیر مقدم کیا ہے اور ہم میں سے ہر ایک کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو بھی بے کہے اپنی دور رس نگاہوں سے بھانپ کر ان کا سرانجام کردیا، اس کے لئے ایک علحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ بہرحال ہمیں صاحب ممدوح نے فوراً ہی دسترخوان پر حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اس کے ظاہر کرنے کی شاید ضرورت نہیں کہ کھانے کی ہر چیز پورے سلیقے کے ساتھ اور فیاضانہ حیثیت سے پیش کی گئی تھی، بہرحال کھانے سے فارغ ہوتے ہی ادارۂ ادبیات اردو کے بانی اور عالی دماغ منور الفکر، روشن خیال معتمد جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ صاحب ممدوح کی حیرت انگیز سادگی اور ان کا بے پایاں خلوص، ان کی گفتگو کے ہر لفظ سے مترشح تھا۔ یہ بات ہم لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھی کہ ایسے علمی اعزازات کا مالک اور اتنے بڑے ادارے کا بانی، جس کے جلو میں دنیوی ثروتیں بھی حاضر ہیں، ہم لوگوں سے اس سادگی اور مساویانہ طریقے سے ملے گا۔ صاحب معز سے بڑی دیر تک بے تکلفانہ گفتگو رہی۔ لیکن چونکہ پہلے اجلاس کا وقت قریب تھا اس لئے ہم سب کی توجہات اس طرف منعطف ہوگئیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کا یہ جلسہ اگرچہ کہ عالی جناب آنریبل ڈاکٹر مہدی یار جنگ بہادر ایم۔ اے۔ ڈی لٹ صدرالمہام تعلیمات و صدر ادارہ کی صدارت میں ہونے والا تھا لیکن جناب معز سرکاری کاروبار کے سلسلے میں باہر تشریف لے گئے تھے اس لئے جلسۂ مذکور بہ صدارت عالی جناب آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر صدرالمہام تعمیرات شروع ہوا۔ عالی جناب معتمد صاحب ادارہ نے اپنی سالانہ رپورٹ جو ادارے کے مالۂ و ماعلیہ پر مشتمل تھی اپنے دل پذیر انداز میں پڑھ کر سنائی۔

"اضلاع میں اردو کی ترقی اور شاخوں کی مصروفیتیں" کے عنوان سے دو مقررین نے تقریریں کیں۔ پہلی تقریر مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے (گلبرگہ) کی تھی۔ صاحب موصوف نے بڑی خوبی سے اضلاع میں اردو کی ترقی کے امکانات پر ایک

سیر حاصل بحث کی اور ضلع گلبرگہ میں آپ کی نگرانی میں شاخوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے، ان کا بڑی خوبی سے ذکر کیا۔
اس کے بعد اسی عنوان پر دوسری تقریر ہماری شاخ بیدر کے سرگرم رکن جناب مولوی اشرف الدین فیضی کی تھی۔ اگرچہ کہ صاحب ممدوح کو اس سفر کی روانگی اور اس کے متعلقہ کاروبار سے بہت کم فرصت ملی، لیکن آپ کی تقریر بہت برجستہ اور اپنے موضوع پر پوری طرح حاوی تھی۔ جناب فیضی صاحب نے اپنی اس تقریر میں زیادہ تر اپنے ذاتی تجربات ہی پیش کئے اور خالص عملی نقطۂ نگاہ سے یہ بتایا کہ دیہات میں ادارے کی تحریک کس طرح موثر، ہمہ گیر اور ہمہ رس بنائی جا سکتی ہے۔ حقیقت میں آپ کی تقریر نئے کام کرنے والوں کے لئے اردو کو ترقی دینے اور ادارے کے کاروبار کو وسعت دینے کی عملی تدابیر سے مالامال تھی۔
آخر میں مولوی اظہر الدین صاحب نے تعلیم اردو کا نمونتاً ایک درس دیا، جو دلچسپ ہونے کے باوجود بہت کامیاب رہا۔
اس کے بعد صدارتی تقریر بوجہ کسل مندی مزاج عالی جناب صدر نشین جلسہ نہ فرما سکے، جس کو عالی جناب غوث یار جنگ بہادر نے پڑھ کر سنایا، اس طرح یہ جلسہ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔
اسی دن ڈھائی بجے ادارے ہی کی عظیم الشان، خوش نما اور بے نظیر عمارت میں جلسۂ مشاورتی شروع ہوا۔ جلسہ میں شعبہ جات ادارہ کے داعی بھی شریک تھے جلسے کے آغاز میں عالی جناب ڈاکٹر زور صاحب مدظلہ نے کل شاخوں کے معتمدین اور نمائندوں کے روبرو ایک مبسوط تقریر فرمائی، جس میں ادارے کی سابقہ ترقی، اس کی موجودہ حالت، کام کرنے کے طریقے، اضلاع میں ترقی اردو کے امکانات وغیرہ پر بڑی خوبی سے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ اس سلسلے میں آپ نے ان استفسارات پر بھی توجہ فرمائی جو شاخوں کے معتمدین نے وقتاً فوقتاً تحریری طور پر آپ سے کئے تھے، آپ نے ہر ایک کا کافی وشافی جواب دیا ہر ایک کی مشکلات کو صرف یہی نہیں کہ رفع فرمایا بلکہ ہر ایک میں کام کرنے کا جوش اور سرگرم عمل ہونے کی ایک برقی رو دوڑا دی
اس اجلاس کے ختم ہوتے ہی ہم سب اس عظیم الشان عمارت میں ہر سمت پھیل گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ادارے کے ذخیرہ کو جس حسن ترتیب اور سلیقہ کے ساتھ سجایا گیا ہے اس سے جناب ڈاکٹر زور صاحب کے ذوق سلیم اور ان کی کارآگاہی کا پتہ چلتا تھا۔ اس وسیع عمارت کے ہر کمرے بلکہ ہر گوشے کو عجیب عجیب نوادر اور یادگاروں سے آراستہ کیا گیا تھا، کم از کم میری تو یہ حالت تھی کہ جس طرف جا نکلتا تھا "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا ست" کا مضمون تھا۔
کس چیز کا ذکر کیا جائے اور کس طرح کیا جائے۔ ایک طرف قدیم مخطوطات ایک شانِ خوش اسلوبی سے جمع کی گئی تھیں۔ ان مخطوطات میں ایسی بھی تصانیف ہیں جن سے زبانِ اردو کی ابتدائی تاریخ پر ایک نئی روشنی پڑ سکتی ہے۔ ایک حصہ میں صرف قدیم اخبارات و رسائل جمع کئے گئے تھے۔ ان میں ایسے رسالے اور اخبار بھی تھے جن کا اس سے قبل نام بھی سننے میں نہیں آیا تھا۔ اور ان میں سے ہر ایک یقیناً اپنے زمانے کی تاریخ اور معاشرت کا آئینہ دار ہے۔
مطبوعہ کتابوں میں کم وبیش سربرآوردہ مشاہیر اور مصنفین سے لے کر اوسط درجے کے لکھنے والوں اور مولفین کی کتابیں بھی دیدہ زیب جلدوں کے لباس میں آئینہ دار الماریوں کے اندر جگمگا رہی تھیں، ان کتابوں میں ادب، فلسفہ، سائنس، سیاسیات

اخلاقیات، معاشیات، لسانیات وغیرہ ہر موضوع پر وافر کتابوں کا ذخیرہ خوش ترتیبی کے ساتھ جاذبِ نظر ہو رہا تھا۔

ایک دوسرے کمرے میں موجودہ زمانے کے ماہانہ رسائل ایک وسیع اور عریض میز پر خوش ترتیبی کے ساتھ رکھے گئے تھے۔ یہ کہنا شاید مبالغہ معلوم ہوگا کہ ان رسالوں میں شاید ہی کوئی ایسا رسالہ ہوگا جو ہندستان کے کسی گوشے سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ کس قدر سالانہ مصارف برداشت کرکے یہ عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا جارہا ہے۔

مخطوطات اور قلمی کتابوں میں سے ان اہم اور نادر کتابوں کو جو زبانِ اردو کی تاریخ، اس کے مدارج ارتقاء اور اس کے عبوری دور پر ایک نئی روشنی ڈال سکتی تھیں، ایک خاص کمرے میں ہر جلد کو کھول کر اور ان کے متون پر شفاف شیشوں کی تختیاں رکھ کر ان کی خصوصیات کو نمایاں کیا گیا تھا۔ ان کتابوں کو دیکھ کر بیک نظر ہی ان کی مختصات اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ادارے کی عمارات اور اس کے متعلقہ حصوں کا بالاستیعاب ذکر کیا جائے تو بلاشبہ ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ اس لئے بادل ناخواستہ ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اور صرف اس عمارت کے دو شعبوں کو نمایاں کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

پہلا شعبہ ادارے کی مطبوعات خصوصی کا ہے، جس میں ادارے کی لکھی ہوئی، لکھوائی ہوئی جملہ تصانیف اپنی انتہائی زیبائشوں اور خوش نمائیوں کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ یہ کتابیں ایک سو کے قریب ہیں اور ادب، تاریخ، تنقید، تذکرہ اور تعلیم وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر مشتمل ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس قدر قلیل مدت میں ایسی بلند پایہ اور عالمانہ کتابیں ادارے نے کس طرح تیار کرلیں۔ آج کل مشینوں کا نظریہ اور اس کا افادی دائرہ وسیع تر ہوتا جارہا ہے، اس لئے مولانا عبدالماجد کا یہ فقرہ کچھ زیادہ مبالغہ آمیز نظر نہیں آتا، جہاں مولانا سراپا حیرت ہوکر لکھتے ہیں کہ "یاالٰہی! یہ کوئی ادبی ادارہ ہے یا کوئی مشینی کارخانہ، کہ جب دیکھئے ڈھلی ڈھلائی، چھپی چھپائی کتابیں دھڑا دھڑ نکلتی چلی آرہی ہیں" اور پھر یہ نہیں کہ محض اعداد کو بڑھانے کے خاطر سطحی، پست اور معمولی کتابوں کا اضافہ کردیا گیا ہو، بلکہ ہر کتاب اپنے مضمون کی ندرت اور موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ مضمون کے زیادہ طویل ہوجانے اور معزز ناظرین کے اکتا جانے کا خوف نہ ہوتا تو اس موقع پر دو چار کتابوں کے روشناس کرانے کو ضرور دل چاہتا تھا۔

دوسرا شعبہ اپنی اہمیت اور افادیت اور عظمت کے لحاظ سے ایک مہتم بالشان شہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرا اشارہ انسائیکلو پیڈیا کے مخصوص کمرے سے ہے۔ اس کمرے میں قدم رکھتے ہی انسان اپنے آپ کو ایک مخصوص علمی فضا میں پاتا ہے۔ پورا کمرہ ایک مخصوص قسم کی خانہ دار الماریوں سے محصور ہے۔ یہ الماریاں انسائیکلو پیڈیائی احتیاجات اور ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر خاص طور پر بنوائی گئی ہیں۔ ان خانہ دار الماریوں کے یہ خانے حروفِ تہجی کے ہر حرف کے لئے مخصوص تھے اور اس حرف سے شروع ہونے والے الفاظ سے متعلق ماہرین کے پاس سے جس قدر مواد وصول ہوتا رہتا ہے، وہ نہایت ترتیب اور احتیاط کے ساتھ خاص لفافوں میں اپنے مخصوص خانوں میں رکھ دیا جاتا ہے۔ سہولت کار اور تسہیل عمل کے لئے یہ طریقہ نہایت مناسب

معلوم ہوتا ہے۔ اسی سے متعلق انسائیکلو پیڈیا کا متعلقہ کتب خانہ ہے۔ جس میں دنیا کی اکثر و بیشتر مشہور و معروف انسائیکلو پیڈیاؤں کی مکمل جلدیں الماریوں میں جاذبِ نظر ہو رہی تھیں ۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے علاوہ یورپ کی مختلف السنہ سے تعلق رکھنے والی انسائیکلو پیڈیائیں بھی ایک حد تک جمع کر لی گئی ہیں ۔ قبل ازیں اگرچہ کہ اردو میں کوئی ایسی مکمل تصنیف نہ تھی، جو انسائیکلو پیڈیا کہلائی جاسکے ۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جستہ جستہ طور پر ہندستان کے مختلف گوشوں میں اہل علم نے اس سلسلے میں کچھ کام کیا تھا ۔ مثلاً قاموس المشاہیر، اسلامی انسائیکلو پیڈیا اور ایسی نوعیت کے مختلف چھوٹے بڑے رسائل جو بڑی کوششوں سے ہم دست کئے گئے ہوں گے، وہ بھی نظر فریب جلدوں میں موجود تھے ۔

اس شعبے کے معتمد ملک کے مایہ ناز نوجوان ابوالمکارم مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی۔ اے۔ ایم ایڈ (عثمانیہ) ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس مہتم بالشان کام کے لئے جس گوناگوں قابلیت اور ہمہ جہتی معلومات کے شخص کی ضرورت تھی ۔ اور اس قسم کی ساری خوبیاں موجودہ معتمد میں موجود ہیں ۔ صاحب موصوف جس دلی شغف اور قلبی انہماک سے اس کام میں مصروف ہیں، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنھوں نے آپ کو قریب سے دیکھا ہو ۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سوائے انسائیکلو پیڈیائی تخیل کے سب کچھ آپ نے پس پشت ڈال دیا ہے ۔ یہی تخیل آپ پر دن رات چھایا رہتا ہے، امید ہے کہ عالی جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ مدظلہٗ کے آغاز کئے ہوئے اس عظیم الشان کام کے نتائج عنقریب ملک و قوم کو محو حیرت کر دیں گے ۔

اسی دن سہ پہر میں چار بجے ادارے کی جانب سے تقسیم اسناد کا جلسہ بہ صدارت عالی جناب آنریبل نواب سر عقیل جنگ بہادر نائب صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی، ٹاؤن ہال میں قرار پایا تھا ۔ اس لئے ہم نے بادلِ ناخواستہ ادارہ اور اس کے متعلقہ شعبوں کی علمی فضا کو خیرباد کہہ کر باغ عامہ کا رخ کیا ۔ جلسہ گاہ کی عمارت علم کے شائقین، ادارے سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اور عام تماش بینوں سے پُر تھی ۔ جب صدر عالی قدر کرسیٔ صدارت پر متمکن ہو گئے تو عالی جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) صدر شعبۂ اردو امتحانات نے سب سے پہلے محترم صدر کا خاص طور پر شکریہ ادا فرماتے ہوئے کہا کہ اگرچہ کہ نواب صاحب ممدوح اس قسم کی عام تحریکوں اور جلسوں کی سرپرستی سے اجتناب فرمایا کرتے ہیں، لیکن ادارے کے معروضات کو آپ نے نظر انداز نہیں فرمایا اور باوجود اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے اس جلسے کی صدارت فرما کر اپنی ادارہ دوستی اور معارف نوازی کا ثبوت دیا ۔ اس کے بعد اردو امتحانات میں شریک ہونے والوں کی کثیر تعداد پر آپ نے اظہار خیال فرمایا اور تفصیل سے بتایا کہ ادارے کے مختلف امتحانات میں کس قدر کثیر لوگوں نے شرکت کی ہے جنھیں اسناد عطا کرنے کے لئے خاص طور پر یہ جلسہ منعقد کیا گیا ۔ اس کے بعد صدر صاحب نے فرداً فرداً ہر کامیاب شدہ امیدوار کو سندیں عطا فرمائیں اور اس طرح یہ جلسہ بخیر و خوبی انجام پذیر ہوا

یہ جلسہ برخواست ہوتے ہی لوگ عمارت کے اس مخصوص حصے میں داخل ہونے لگے جہاں حاضرین جلسہ اور شاخوں کے معتمدین و نمائندگان کے لئے ایک عصرانہ تجویز کیا گیا تھا ۔ عصرانے کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانے پر تھا ۔ دلکاجی ہوٹل کے سرگرم، پھرتیلے اور مشاق کارکن لوگوں کی مطلوبہ اور پسندیدہ چیزیں بہم پہنچانے میں مصروف تھے ۔ بہرحال مطعومات لطیفہ اور مشروبات نفیسہ سے اپنے کام و دہن کو لذت یاب کر کے ہم لوگ اپنی قیام گاہ (ادارہ) پر لوٹے ۔

دوسرے دن یعنی بتاریخ ۲۳ اردی بہشت ۱۳۵۱ف یوم جمعہ صبح ساڑھے نو بجے رفعت منزل خیریت آباد میں چوتھا اجلاس آنریبل مولوی سید عبدالعزیز صاحب صدرالمہام عدالت و امور مذہبی کی صدارت میں منعقد ہونے والا تھا' لیکن چونکہ صدرالمہام ممدوح سرکاری ضروریات سے بیرون بلدہ تشریف لے گئے تھے اس لئے آپ کی جگہ عالی جناب مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب معتمد فینانس کرسیٔ صدارت پر متمکن ہوئے۔ مسٹر بلبیر پرشاد صاحب ایم اے نے اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما سے لے کر اس کے درمیانی ادوار اور اس سے تعلق رکھنے والی تبدیلیوں کا بڑی خوبی اور نہایت تفصیل سے ذکر کیا۔ اردو کی تاریخ اور اس کے اساسی تخیلات پر جن جن مشاہیر نے اظہار خیال کیا تھا' آپ نے ان سب کا ذکر کیا۔ اخیر میں اردو زبان کی موجودہ حالت' عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام' دارالترجمہ کا وجود اور ادارۂ ادبیات اردو کی مصروفیات سے اردو زبان میں جو دن دونی اور رات چوگنی ترقیاں ہو رہی ہیں' ان کو اچھی طرح واضح کیا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نے یہ مضمون بڑی محنت' کاوش اور استقصا سے تحریر فرمایا تھا۔ اور اس کی خوش ترتیبی سے آپ کے علمی ذوق اور مضمون نگارانہ قابلیت کا اظہار ہوتا تھا۔

اس پُر از معلومات مضمون کے ختم ہونے کے بعد مولوی اظہرالدین صاحب نے اپنا ایک تحریری بیان پڑھ کر سنایا' جس میں تعلیم بالغان سے متعلق مختلف تدابیر اور طریقۂ تعلیم کی نسبت متعدد خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولوی صاحب موصوف نے تعلیم بالغان کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کر کے کام کرنے والوں کے لئے بہت آسانیاں فراہم کر دی ہیں۔ اور آپ کے اس مضمون میں بھی کام کرنے والوں کو مختلف ہدایتیں اور موثر تدبیریں ملیں گی۔ آخر میں عالی جناب صدر جلسہ کی برجستہ اور پُر از معلومات تقریر کے بعد جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

بعد نماز جمعہ اصحاب ادارہ کی رہنمائی میں ہم ایک خاص ڈیرے میں پہنچا دئے گئے۔ جہاں ہم لوگوں کے لئے خاص طور پر عالی جناب ڈاکٹر زور مدظلہ' کی طرف سے دعوت کا انتظام کیا گیا تھا۔ دعوت امیرانہ طور پر ترتیب دی گئی تھی۔ مختلف قسم کے لذیذ کھانے خاص اہتمام سے چنے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بہ نفسِ نفیس ہر شخص کی تواضع فرما رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاخوں کے معتمدین اور نمائندوں کا اول سے آخر تک ہر موقع پر جس طرح آپ نے خیال رکھا اور ان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو بھی کسی وقت آپ نے نظرانداز نہ ہونے دیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو ادارہ اور اس کے کام نیز اس سلسلے میں تھوڑا بہت کام کرنے والوں کا کس قدر خیال رہتا ہے۔ بہرحال دعوت ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب مدظلہ' سے وداعی ملاقات کر کے اور مذکورۂ بالا تاثرات کے نقوش اپنے دل و دماغ میں محفوظ کرتے ہوئے ہم رفعت منزل سے رخصت ہوئے' اور اس طرح ہماری دو روزہ مصروفیتیں انجام پذیر ہوئیں۔

غلام حسن صدیقی

(معتمد شاخ پرلی)

گلبرگہ شریف کی شاخوں کا معاینہ

۵ رخورداد ۱۳۵۱ف کو شام کے ۶ بجے کی گاڑی سے میں حیدرآباد سے روانہ ہوا' اور رات میں ۲ بجے کے قریب گلبرگہ پہنچا۔ اسٹیشن پر مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے (عثمانیہ) لکچرار انگریزی گلبرگہ کالج و معتمد شاخ گلبرگہ اسٹیشن پر موجود تھے۔ انہیں کے پاس میرا قیام رہا۔ اور قیام گلبرگہ کے زمانہ میں موصوف کی وجہ سے ہر طرح کی سہولت اور آرام ملا جس کا میں بے حد مشکور ہوں۔ میرا قیام تقریباً دس روز رہا۔ اس دوران میں ادارے کی تمام شاخوں کے عہدہ داروں' معاونوں اور سرپرستوں سے ملاقات کرنے اور گفتگو کرنے کے مجھے مواقع مل سکے۔

۷ رخورداد کی شام کو عالی جناب صوبہ دار صاحب گلبرگہ و سرپرست شاخ گلبرگہ سے بہ تفصیل ملاقات کا موقع ملا۔ تقریباً گھنٹے بھر تک ادارے کی مصروفیتوں سے متعلق گفتگو ہوئی' ممدوح نے اردو امتحانات سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا' جو نہایت ہمت افزا تھے۔ اور مفید مشورے بھی دئے۔ آپ کی مشفقانہ سرپرستی میں' شاخ گلبرگہ اس صوبے اور اطراف واکناف میں علم کی روشنی پھیلانے اور عوام کی علمی اور ذہنی تربیت میں' نہایت مفید خدمت انجام دے رہی ہے۔ ادارہ کی شاخ اس سرزمین میں ادبی' علمی وادبی جدوجہد اور چہل پہل کا مرکز بن گئی ہے۔ ممدوح ہی کے پاس جناب تعلقدار صاحب صوبہ بیدر اور مولوی محمد غوث صاحب صدیقی ایم ایس سی (عثمانیہ) ایچ' سی ایس' منصرم مہتمم کوتوالی صوبہ گلبرگہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ جناب تعلقدار صاحب کو خاص ادبی شغف ہے۔ اور وہ اچھے شاعر بھی ہیں' چنانچہ حال ہی میں بیدر میں جو معرکتہ آلارا مشاعرہ منعقد ہوا تھا' آپ کی صدارت میں ہوا تھا۔ مولوی محمد غوث صاحب صدیقی کا شعری ذوق بھی بڑا اچھا ہے موصوف شاخ گلبرگہ کے سرگرم معاون ہیں۔

۸ رخورداد کی شام کو مرکزی شاخ کا معاینہ کیا' کتب خانہ اور دارالمطالعہ کو دیکھا۔ اور اسی رات میں عالی جناب مولوی سید ذوالفقار علی صاحب حقانی صدر گلبرگہ کالج اور صدر شاخ گلبرگہ سے ملاقات ہوئی۔ موصوف صوبہ کی سرکاری اور غیر سرکاری ساری علمی چہل پہل کی روح رواں ہیں۔ ادارہ کی تعلیم بالغاں کی مہم' اشاعتِ علم اور ادبی تربیت میں کی ہر کوشش میں' آپ کی سعی کو دخل ہے۔ ۹ رخورداد کی رات کو موصوف کے ساتھ ہم طعامی کا بھی موقع ملا۔ اور کھانے کے بعد ادارہ کی مصروفیتوں سے متعلق بھی گفتگو ہوتی رہی۔

۱۰ رخورداد کی شام کو میں نے شاخ روفیتن کا معاینہ کیا۔ دفتر' کتب خانہ' دارالمطالعہ اور تعلیم گاہ کو گیا۔ مولوی محمد بن عمر صاحب بھی میرے ہمراہ تھے۔ کتب خانہ بہت وسیع تو نہیں ہے۔ تاہم اس میں کافی ذخیرہ کتابوں کا موجود ہے۔ اور توقع ہے کہ آئندہ چند سالوں میں' صاحبان علم کی توجہ اور معتمد شاخ مولوی نیاز علی خاں صاحب نیاز کی کوشش سے اس نواح میں تشنگان علم کا مرکز بن جائے گا۔ مدرسے میں ۵۰ طلبہ تھے' جن میں اکثر ملازم اور نادار لڑکے اور چند معمر لوگ بھی شامل ہیں۔ یہ سب

اردو دانی کی تعلیم پا رہے ہیں۔ ان کے لئے کتابیں او تختیاں شاخ کی طرف سے مہیا کی گئی ہیں۔ شاخ روضتین کا یہ بڑا کارنامہ ہے۔ اوراس ساری کارکردگی کا سہرا اس کے سرگرم معتمد مولوی نیاز علی خاں صاحب نیازؔ کی سعی اور حسن انتظام کا نتیجہ ہے۔ مدرسے کے لئے ایک قدیم مسجد کے صحن میں جگہ نکالی گئی ہے، جہاں سابق صوبہ دار صاحب گلبرگہ عالی جناب نواب غوث یار جنگ بہادر کی توجہ سے ایک سائبان کی منظوری عطا ہو چکی ہے۔ امید ہے کہ یہ جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔

اسی شاخ کے زیر اہتمام دوسری تعلیم گاہ اردو عالم اور اردو فاضل کے امیدواروں کے لئے جس وقت میں وہاں گیا، مولوی محمد اسحاق صاحب بی ایس سی (عثمانیہ) اردو فاضل کو درس دے رہے تھے۔ پڑھنے والوں میں ایک اپاہج صاحب بھی تھے۔ جو باوجود نہایت تکلیف کے، مستعدی اور شوق کے ساتھ درسوں میں حاضر رہتے ہیں۔ ان کا شوق دراصل ہمارے لئے مثال کا کام دے سکتا ہے۔

۱۴ کی رات میں ادارہ کی شاخوں کی جانب سے اور مولوی خواجہ معین الدین صاحب بی اے۔ ایل ایل بی ناظم اسٹیٹ روضتین کے زیر اہتمام عشائیہ ترتیب دیا گیا تھا، جس میں تقریباً سارے کارکن، طلبہ اور چند عہدہ دار گلبرگہ شریف، شریک تھے کھانے کے بعد، میری صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں تقریباً تمام مقامی شعرا شریک تھے۔ تقریباً بیس شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ عبدالرحیم صاحب فضلؔ کا کلام خاص طور پر پسند کیا گیا۔ بعض نوجوان فرزندان گلبرگہ جیسے نورالحسن صاحب انورؔ معتمد شعبۂ طلبہ ادارہ گلبرگہ اور غلام محی الدین خاں صاحب کیفؔ کا کلام سن کر مجھے بڑی مسرت ہوئی اور قوی توقع ہوگئی کہ یہ ذوق جس کے مسلسل جاری رہنے کے کافی امکانات پیدا ہو گئے ہیں، مستقبل قریب میں گلبرگہ کی سرزمین سے اچھے اردو شاعر پیدا کرے گا۔

یہ ساری علمی دلچسپی، ذوق اور چہل پہل کو دیکھتے ہوئے، مجھے یقین ہو گیا کہ گلبرگہ شریف کے لئے ایسے علمی اور ادبی مرکز کی سخت ضرورت تھی، جو نہایت منظم طور پر کام کر رہا ہو۔ اور جس کے انتظام کی باگ، خود فرزندان سرزمین کے ہاتھوں میں ہو۔ کیونکہ حقیقی علمی ترقی کا سنگ بنیاد یہی ہے۔ سب سے بڑھ کر جس چیز سے میں متاثر ہوا، وہ یہاں کے کارکنوں کی مستعدی اور اپنے مقصد کے ساتھ خلوص ہے، جو فی الحقیقت، اچھے نتائج پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

ان شاخوں کے علاوہ شاخ نسوان بھی اپنے حلقے میں نہایت سرگرمی سے کام کر رہی ہے، اور گلبرگہ شریف کی خواتین کے لئے، علمی، ادبی اور سماجی جدوجہد کا مرکز بن گئی ہے۔ شاخ نسوان کی صدر محترمہ محمدی بیگم صاحبہ بی اے (عثمانیہ) (بیگم صاحبہ مولوی جمیل حسن صاحب ایم اے، ایچ سی ایس، اول تعلقدار گلبرگہ شریف) ہیں۔ جن کی علمی شہرت اور وقار جامعہ عثمانیہ میں اور جامعہ کے باہر، اپنا سکہ بٹھا چکی ہے۔ شاخ نسوان کی معتمد محترمہ حمیدہ بانو صاحبہ مخفیؔ (بیگم صاحبہ مولوی عبدالکریم صاحب ناظر تعلیمات گلبرگہ شریف) بڑے نفیس شعری ذوق کی مالک ہیں۔ اور نہایت سرگرمی سے گلبرگہ شریف کی خواتین کی علمی اور ادبی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ ان دونوں محترمات کے علاوہ محترمہ سلیم النسا بیگم صاحبہ بی اے۔ بی ٹی صدر مدرسہ فوقانیہ نسوان، بیگم نصیر الدین، بیگم وزیر احمد قریشی، مسز زبیری، مسز سردار علی، سعیدہ بیگم صاحبہ کی اعانت اور

کوششوں سے بھی شاخ کو بڑی تقویت ہے۔ مرکزی شاخ نسوان (بلدہ) کے بعد غالباً سب سے زیادہ مستعد، باوقار اور کارکرد یہی جماعت ہے۔ خواتین کی تعلیم کے لئے جو انتظام یہاں کیا گیا ہے وہ اڈک میٹ کی منظم تعلیم گاہ کو چھوڑ کر، جہاں محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ (بیگم انوار اللہ صاحب چیف انجینیر تعمیرات جامعہ عثمانیہ) ان پڑھ عورتوں میں علم کی روشنی پھیلانے میں ہمہ تن معروف ہیں، بلدہ حیدرآباد کی خواتین کے لئے بھی قابلِ تقلید ہے۔ آمد و رفت کی دقتوں کے مدنظر، عہدہ داران شاخ نسواں گلبرگہ شریف نے یہ انتظام کیا ہے کہ ہر محلے میں کسی خاص مقام پر پڑھنے والی خواتین کو جمع کر کے تعلیم دے رہی ہیں۔ یہ انتظام خاص طور پر محترمہ حمیدہ بانو صاحبہ مخفیؔ اور بیگم صاحبہ مولوی نصیر الدین صاحب بی اے۔ بی ٹی، لکچرار گلبرگہ کالج کی دلچسپی اور ایثار سے نہایت عمدگی سے چل رہا ہے۔

۱۴ر خورداد کی شام میں ادارہ کی ایک نئی شاخ کے افتتاح میں شرکت کا بھی مجھے موقع ملا۔ جو شیخ کے روضہ میں وہاں کے سربرآوردہ حضرات کی کوششوں کی بدولت قائم کی گئی ہے۔ یہ مقام شہر گلبرگہ سے کوئی چار میل کے فاصلے پر ایک علٰحدہ اطراف بلدہ کی بستی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آمد و رفت کی سہولت نہ ہونے سے اور کم سن لڑکوں کی دقتوں کے سبب گلبرگہ کی تعلیم گاہیں، ان کے لئے دور تھیں۔ اس لئے یہ شاخ یہاں قائم کی گئی ہے، جس کے ساتھ تعلیم گاہ کا بھی افتتاح ہوا۔ اس میں کم سن بچوں کے ساتھ چند معمر اور مسن پڑھنے والے بھی موجود تھے جو اردو دانی کے لئے پڑھ رہے تھے۔ شاخ کے معتمد جناب فخر الدین صاحب ارماںؔ کی تعارفی تقریر کے بعد جناب مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے (عثمانیہ) لکچرار انگریزی گلبرگہ کالج نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے اردو زبان سیکھنے کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اور ادارہ کے اغراض و مقاصد بیان کئے۔ شاخ کا افتتاح کرتے ہوئے میں نے حاضرین کے نیک اقدام پر انہیں مبارک باد دی۔ اور امید ظاہر کی کہ وہ آئندہ مفید خدمات انجام دیں گے۔

امید کہ سجادہ صاحب روضہ شیخ اور مولوی فخر الدین صاحب ارماںؔ کی دلچسپی سے بہت جلد مفید خدمت انجام دے سکے گی۔

۱۵ر خورداد کی شام کو مولوی باقر محی الدین صاحب صدر مہتمم صوبہ گلبرگہ شریف سے ملاقات ہوئی۔ موصوف کو ادارہ کی سرگرمیوں سے بہت دلچسپی ہے۔ علم کی اشاعت اور علم حاصل کرنے والوں کے راستے سے موانعات کو دور کرنے میں آپ نے جو شہرت بلدہ میں حاصل کرلی ہے، اس کی بدولت یقین ہے کہ آپ کی موجودگی، گلبرگہ شریف کی علمی ترقی اور ادارہ کی مساعی میں نئی قوت محرکہ کا کام کرے گی۔

مجھے افسوس ہے کہ جناب مولوی جمیل حسن صاحب اول تعلقدار گلبرگہ شریف سے، اپنے قیام گلبرگہ کے دوران میں ملاقات کا شرف نہ حاصل ہو سکا، جن کی دلچسپی شاخ گلبرگہ سے مسلسل قائم ہے۔ آپ رخصت پر تھے، اتفاق سے جس گاڑی سے میں بلدہ واپس ہو رہا تھا، اسی گاڑی سے آپ گلبرگہ پہنچے۔ اسٹیشن پر رواروی کی ملاقات ہوئی۔

اس مختصر سی روداد سے ظاہر ہے کہ، گلبرگہ کی شاخ کو اس کے نہایت سرگرم سرپرستوں، عہدہ داروں، کارکنوں اور نہایت مستعد معتمد مولوی محمد بن عمر صاحب کی مساعی کی بدولت اچھی خاصی مرکزیت حاصل ہو گئی ہے۔ روضتین اور شیخ کے روضہ کی شاخیں، اسی کی زیر نگرانی کام کر رہی ہیں۔ مولوی محمد بن عمر صاحب نے قیام جامعہ کے زمانے میں

بہ حیثیت صدر انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ، تنظیم اور تقسیم کار کی جو تربیت حاصل کی تھی، اس سے گلبرگہ شریف کی علمی اور ادبی قابلیتوں کی تنظیم میں وہ جس طرح کام لے رہے ہیں، اس کی بدولت وہ ملک کی بہت سی توقعات کا مرکز بن گئے ہیں۔

طلبہ کی ناداری کی وجہ سے، اکثر درس گاہوں میں تعلیمی کتب کی فراہمی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ اور یہ ایک حقیقی وقت ہے، یقین ہے کہ جناب معتمد صاحب ادارہ کی توجہ اور خدمت گزاران ادارہ کا ایثار، اس کا مناسب حل جلد سے جلد دریافت کرے گا تاکہ، ان تشنگان علم کے راستے سے موانعات حتی الامکان دور ہو سکیں۔

شاخ رضتین میں پروفیسر سروری صاحب کا استقبال

بتاریخ ۸ رخورداد ۱۳۵۱ف بوقت ۸ ساعت شب جناب مولوی عبدالقادر صاحب سروری پروفیسر جامعہ عثمانیہ بہ معیت مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے۔ لکچرار گلبرگہ کالج و معتمد ادارہ، شاخ رضتین میں تشریف فرما ہو کر دار المطالعہ اور کتب خانہ کے علاوہ جماعت اردو دانی و زبان دانی اردو عالم و اردو فاضل کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ طلبہ اردو دانی کے لئے صاحب موصوف نے برائے تقسیم شیرینی کچھ رقم بھی عنایت فرمائی۔

عشائیہ و مشاعرہ ۱۲ رخورداد ۱۳۵۱ف ۸ ساعت شب طلبہ اردو فاضل محلہ رضتین کی جانب سے جناب عبدالقادر صاحب سروری کی تشریف آوری کے سلسلے میں ایک عشائیہ ترتیب دیا گیا تھا۔ جس میں گلبرگہ کے بعض سربرآوردہ اصحاب اور عہدہ داران مقامی شریک تھے۔ عشائیہ کے انتظامات نہایت اعلیٰ پیمانے پر مولوی سید محبوب حسین صاحب تمنا متعلم اردو فاضل منتظم عشائیہ نے ترتیب دئے تھے۔

اسی روز ۹ ساعت شب جناب معز کی صدارت میں ایک بزم مشاعرہ منعقد کی گئی۔ مولوی خواجہ معین الدین صاحب بی اے۔ ایل ایل بی ناظم اسٹیٹ رضتین و صدر ادارہ ہذا کی سرپرستی میں انتظامات مشاعرہ بہت ہی اعلیٰ پیمانے پر عمل میں آئے۔

جناب حبیب اللہ صاحب شیدائی، متعلم اردو فاضل منتظم مشاعرہ ادارہ کے کثیر رضاکاروں کے ساتھ مہمانوں کا شاندار استقبال کر رہے تھے۔ پردہ نشین عورتوں کا خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا، خواتین میں بیگم سروری، حمیدہ بانو صاحبہ مخفی معتمد شعبہ نسوان، بیگم معین الدین، بیگم محمد غوث صدیقی، معلمان مدارس نسوان گلبرگہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نیاز علی خاں نیاز معتمد ادارہ نے آغاز مشاعرہ سے پہلے جناب صدر کا تعارف عوام سے کرایا، بعد ازاں مشاعرہ کا آغاز عمل میں آیا۔ اس مشاعرہ میں گلبرگہ کے مشہور اور نوجوان شاعر شریک تھے۔ جن میں سے حسب ذیل شعرا کا کلام خاص طور پر پسند کیا گیا۔

غوث صدیقی یم سی ایس مددگار مہتمم پولیس گلبرگہ، حمیدہ بانو صاحبہ مخفی، فضل، کیف، تمنا، نیاز، افسر، انور، اظہر، طالب، تاب، عزیز، نگین، وغیرہ، اس کے علاوہ جناب خیر صاحب نے اپنا کلام روانہ فرمایا تھا، جس کو سید شاہ ولی اللہ حسینی صاحب نے پڑھا، اور بہت پسند کیا گیا۔ ۲ بجے شب مشاعرہ کا اختتام عمل میں آیا۔

جلسۂ تقسیم اسناد نارنگی ۳۱ اردی بہشت کو نارنگی میں امیدواران امتحانات کو سندیں تقسیم کرنے کا جو جلسہ منعقد ہوا اس میں صدر صاحب جلسہ جناب راگھو ریڈی صاحب دیسکھ نے حسب ذیل تقریر کی:۔

حضرات! سال گزشتہ تقسیم اسناد کا جلسہ زیر صدارت جناب

بچیا صاحب ساہو ساکن موضع نارسنگی منعقد ہوا تھا، جس میں
(۴۰) اسناد اردو دانی اور ایک سند اردو عالم کی تقسیم ہوئی تھی،
ختم جلسہ پر حاضرین امیدواران کو شیرینی اور معزز حاضرین جلسہ
کو چائے پان سے خاطر تواضع کی گئی تھی۔ مناسب تھا کہ امسال
بھی یہ جلسہ مسٹر موصوف کے زیر صدارت منعقد کیا جاتا۔ لیکن
سال حال میری جو عزت افزائی کی گئی ہے۔ اس کے لئے میں جناب مولوی
محمد سرور صاحب دکھنی کا ممنون و مشکور ہوں۔ مجھے یہ معلوم کر کے
بڑی مسرت ہوئی کہ دو سال سے متواتر ہمارے بچوں کو صاحب
موصوف ترغیب و تحریص دلوا کر ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات
میں شریک کرا کر برابر کامیاب کر رہے ہیں۔ یہ مولوی صاحب
کی ہمدردی، علم دوستی اور ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے، بالخصوص
وہ بچے جو جہالت کا شکار ہو رہے تھے ان کی مدد کر کے اور
اپنے حسن انتظام و تدابیر سے شریک کروایا اور ان میں ایک نئی
تازہ روح پھونک دی۔ اس نمایاں کامیابی کا سہرا مولوی صاحب
موصوف کے سر ہے اور مجھے توقع ہے کہ ہر سال ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

بڑی ناانصافی و ناشکر گزاری ہوگی اگر اس موقع پر
ادارۂ ادبیات اردو کے روح رواں اور اعزازی معتمد جناب
مولوی ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور کو مبارک باد نہ
دوں، جن کے قدوم میمنت لزوم سے ادارہ ادبیات اردو ممالک
محروسہ سرکار عالی میں رشک ارم بنا ہوا ہے اور یہ سرچشمہ ہر سال
روبہ ترقی ہے۔

آخر میں میں کرمی مولوی محمد سرور صاحب دکھنی کا شکریہ
ادا کرتے ہوئے جمیع امیدواران کامیاب شدہ کو مبارک باد
دیتا ہوں اور دیگر حاضرین سے توقع رکھتا ہوں کہ اپنے اپنے بچوں
کو ہر طرح ہدایت دے کر اس امتحان میں شریک کرنے کی
کوشش کریں جس سے ترغیب و تحریص میں اضافہ ہو اور
ہمارے نونہالان ملک جہالت کا شکار نہ ہونے پاویں، اور اس طرح
زیور علم سے آراستہ و پیراستہ ہو کر اپنے ملک و مالک کی سچی خدمت گزاری
کا جذبہ پیدا کر سکیں۔ چونکہ مجھے اچانک طور پر اطلاع ملی تھی اور مجھے
دعوتی کے طور پر بلوایا گیا تھا، اس لئے مجھے کوئی بسیط تقریر کا موقع
نہیں ملا، اب میں صرف اتنا عرض کر کے اپنی تقریر ختم کرتا ہوں کہ
حاضرہ شیرینی میری جانب سے جمیع حاضرین طلبہ کو تقسیم کر دی جائے
اور اس تقریر کو ادارہ ادبیات میں بہ طور اطلاع کے بھیج دیا جائے۔

حضرات! ابھی آپ جلسۂ ہذا میں جو تقاریر وغیرہ سماعت
فرما رہے ہیں اور علم کا جو چرچہ ہو رہا ہے، اور علم کی روشنی جو عام
طور پر چمک رہی ہے، حقیقتاً پوچھا جائے تو اس تمام جلوہ گری کا
بالکلیہ انحصار ہمارے بادشاہ ظل اللہ کی ادنیٰ توجہ کا نتیجہ ہے۔
خدا ہمارے بادشاہ ظل اللہ کو تا ابد زندہ رکھے۔ آمین۔

شاخ چیتاپور عالی جناب مولوی غلام محمود خاں صاحب
محمود ڈویژن افسر (صدر)، و عالی جناب
مولوی عبدالقادر خاں صاحب ناصر تحصیل دار علاقہ پائگاہ (نائب صدر)
کی علم دوستی کی بدولت جملہ عہدہ داران و معززین مقامی نے بھی
ادارۂ ادبیات اردو شاخ چیتاپور سے گہری دلچسپی لینی شروع کی ہے
چنانچہ یہ امر موجب مسرت ہے کہ پہلا سال ہونے کے باوجود یہ
شاخ اردو خواندگی میں اضافہ کرنے اور ذوق مطالعہ کے پیدا
کرنے میں منہمک ہے۔

دارالمطالعہ ۲۲ فروردی ۱۳۵۱ف یوم دوشنبہ سے ریلوے اسٹیشن
سے متصل شارع عام پر دارالمطالعہ کھولا گیا ہے، جس میں بلالحاظ
تعطیل ۵ تا ۸ ساعت شب ہر مذہب و ملت کے اصحاب آکر
مندرجۂ ذیل اخبارات و رسائل سے مستفید ہوتے ہیں۔ جناب
صدر و نائب صدر ہر دو اصحاب ادارہ کی صفائی و نگرانی کے
عوض ایک غریب طالب علم کو جیب خاص سے (عال) ماہانہ

عطا فرما رہے ہیں ۔

(۱) رہبر دکن (۲) ادب لطیف (۳) مست قلندر (۴) مولوی (۵) نظامی (۶) السٹریٹڈ ویکلی ۔ عطیہ عالی جناب ڈویژن افسر صاحب

(۷) سب رس (۸) بچوں کا سب رس ۔ عطیہ صدر دفتر ادارۂ ادبیات اردو شاخ چیتاپور

(۹) ہندستانی ادب ۔ عطیہ عالی جناب تحصیل دار صاحب نائب صدر ادارہ

(۱۰) نگار ۔ عطیہ عالی جناب ڈاکٹر مرزا غوث بیگ صاحب ۔

(۱۱) دی انسفار میشن (انگریزی) } عطیہ عالی جناب سید عابد حسین صاحب (بی اے ۔ پیشکار تحصیل سیڑم

(۱۲) ہماری زبان (نیم ماہی) } عطیہ عالی جناب احمد سعید صاحب گتہ دار سنگ سیلو ۔ واڑی جنگشن

واضح ہو گا کہ اخبارات و رسائل سے نصف عالی جناب ڈویژن افسر صاحب ہی کے عطا کردہ ہیں ۔ موصوف ہی نے اپنی مہربانی سے دار المطالعہ کے لئے سنگ سیلو کے دیدہ زیب دو طرفہ بنچیس کے علاوہ سنگ سیلو ہی کا پالش کیا ہوا ایک طویل و عریض میز بنوا دیا ہے ادارہ کے روبرو بھی موسم گرما کے لحاظ سے دو طرفہ سنگ سیلو کے بنچس بنوا دیے ہیں ۔ وسط میں پٹرومکس کا ستون نصب ہے جس سے شب میں عجیب دلکش منظر ہوتا ہے ۔ ۲۲ر فروردی سے ۲۲ر خورداد تک یعنی دو ماہ میں دو ہزار آٹھ سو پچیس اصحاب نے دار المطالعہ کے اخبارات و رسائل سے استفادہ کیا ہے ۔ چیتاپور کی آٹھ ہزار کی دیسی آبادی میں مطالعہ کنندگان کی یہ کثیر تعداد یقیناً امید افزا ہے ۔

مدرسہ شبینہ | ناخواندگی کو دور کرنے کی غرض سے ادارہ کے اردو امتحانات کی تعلیم کا سلسلہ بھی ہر شب کو جاری ہے ۔ دار المطالعہ کے عقب میں اور دو حجرے ہیں جن میں عالی جناب ڈویژن افسر صاحب کی عنایت سے فی الوقت ٹٹیوں کا فرش کر دیا گیا ہے اور ہر متعلم کے لئے فرشی ڈسک فراہم کیا گیا ہے جن میں سوائے جمعہ کے روزانہ بلا معاوضہ حسب تفصیل ذیل تعلیم دی جا رہی ہے ۔

نشان سلسلہ ۔ امتحانات	تعداد طلبہ حاضر باش ۔	معلمین	اوقات تعلیم
۱ ۔ اردو دانی ۔	۱۰	۔ مولوی محمد عمر صاحب مددگار مدرسہ وسطانیہ	۷½ تا ۸½ شب
۲ ۔ اردو زبان دانی	۱۴	" عبد الجلیل صاحب " " "	" " "
۳ ۔ اردو عالم	۷	" محبوب خاں یوسف زائی اول مددگار مدرسہ وسطانیہ	۸½ تا ۹ "

غرض توقع ہے کہ انشاءاللہ چیتاپور اس سال مرکز ہو جائے گا ۔

شاخ شاہ آباد

بتاریخ ۱۲ر خورداد ۱۳۵۱ف بروز جمعہ بمقام جامع مسجد اسٹیشن شاہ آباد زیر صدارت عالی جناب مولوی محمد عماد الدین صاحب اول تعلقدار و سرپرست ادارہ، ایک جلسہ میلاد النبی مقرر ہوا ۔ جس میں کامل ترین انسان کے عنوان پر شرکاء و طلبہ ادارہ کا تقریری مقابلہ تھا ۔ اور منجانب مولوی سید محمد جعفر حسین صاحب وکیل ہائی کورٹ و صدر ادارہ کی جانب سے دو انعامی مڈل رکھے گئے تھے اور شربت خوری کا انتظام کیا گیا تھا ۔

جلسہ ٹھیک ۵ بجے شام قرأت سے شروع ہوا ۔ اور بعد حمد و نعت تقریریں ہوئیں ۔ شرکاء ادارہ میں سید ظہور الحق صاحب محمد فخر الدین صاحب، محمد حفیظ حسین صاحب کامل، زیدی صاحب اور طلبہ ادارہ میں محمد جبار صاحب، سید اسحاق صاحب، عزیز الحسن صاحب کے تقاریر قابل ذکر ہیں ۔

شرکاء ادارہ میں سید ظہور الحق صاحب اور طلبہ ادارہ میں محمد جبار صاحب نے انعامی مڈل پایا ۔ بعد ازاں جناب مولوی سید احمد خاں صاحب مدرس انجمن نے مختصر تقریر فرمائی اور بعد دعا کے جلسہ برخواست ہوا ۔ حاضرین جلسہ کی تعداد دو سو سے زائد تھی ۔ جناب مولوی سید سرمد حسینی صاحب معتمد ادارہ اس کامیاب جلسہ کے لئے مستحق مبارک باد ہیں ۔

(ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں)

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	پائی
من کی لہر ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت عالم ...	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
زندگی نامہ (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان حدب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سرسید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم...	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اعمال نامہ	۱۹۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ..	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ..	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
من تصویر ...	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہر ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری..	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی مدرنگ میں ...	۸۹	۱	۰	۰
ٹیگور اور ان کی شاعری ...	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ..	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
نقش سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر...	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) " ...	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گوہر و تسنیم ..	۱۹۲	۲	۰	۰
مساجد حیدرآباد دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدارس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن ...	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دمڑی معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آندورکسیتاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
مدیر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
طفلاں	۳۲	۰	۳	۰
خطابات ...	۱۱۲	۰	۱۲	۰
علم جانداری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار	۱۹۸	۱	۸	۰
کشمش بانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴	

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو

فیروز سرس ۱۹۴۴ء

۵۸۱

سب رس

جنگ نمبر

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

جنگ نمبر

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد (۵) بابت فروری ۱۹۴۲ء شمارہ (۲)

فہرست مضامین

تاریخی کتابیں

۱۔ تاریخ گولکنڈہ (باتصویر) از پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی۔ قیمت ۸ر

۲۔ مقدمۂ تاریخ دکن ۔ از پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی قیمت عہ

۳۔ نظام الملک آصفجاہ اول از مولوی شیخ چاند مرحوم ایم اے۔ ایل ایل بی (ریسرچ اسکالر) قیمت ۴ر

۴۔ سرسالار جنگ اعظم ۔ از مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے۔ ایم ایڈ۔ قیمت صرف ۶ر

۵۔ عماد الملک از مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے۔ ایم ایڈ۔ قیمت صرف ۶ر

۶۔ میر محمد مومن (باتصویر) از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے۔ پی ایچ ڈی (لندن) قیمت عہ ۸ر

۷۔ بلقان از مولوی عبدالحفیظ صاحب صدیقی بی ایس سی۔ قیمت صرف ۳ر

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیرت آباد سے شائع ہوا

اداریہ

ادارۂ ادبیات اردو کے سرپرست رائٹ آنریبل نواب سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر نے مختصر سی علالت کے بعد ۸؍ جنوری ۱۹۴۲ء کو دہلی میں وفات پائی اور تین روز کے بعد ان کی لاش حیدرآباد میں لیڈی حیدری مرحومہ کے پہلو میں دفن کی گئی۔ مرحوم سر حیدری نواز جنگ علم و فضل اور تہذیب و شائستگی کے دلدادہ تھے۔ آخر زمانے میں ادارۂ ادبیات اردو کے کاموں میں ذاتی دلچسپی لینی شروع کی تھی۔ اور سب رس کے تو وہ شروع ہی سے قدردان تھے۔ چنانچہ اس کے لئے متعدد مرتبہ تصویریں روانہ کی تھیں اور پابندی سے اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اردو انسائیکلوپیڈیا سے ان کو بے حد دلچسپی تھی اور اس کام کے لئے انھوں نے اتنی رقم فراہم کردی تھی کہ ادارہ اس کی پہلی جلد بغیر کسی مالی کاوش کے شائع کرسکتا ہے۔ ہندستان کی اکثر علمی و ادبی کوششیں خواہ وہ اجتماعی ہوں یا انفرادی مرحوم کی علمی سرپرستی سے تمتع حاصل کرتی رہیں۔ دوسرے عہدہ داروں اور امیروں کے برخلاف ان کی یہ خصوصیت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی کہ ان کی نگاہ میں عالموں اور ادیبوں کی قدر بڑے بڑے امیروں اور عہدہ داروں سے زیادہ تھی۔ اور اپنی ملاقات میں وہ بڑے بڑے عہدہ داروں سے پہلے ان غریب ادیبوں ہی کی طرف توجہ کرتے تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو اور اس کا ماہ نامہ سب رس ان کی وفات پر اظہارِ تعزیت اور ان کے پس ماندوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتا ہے۔

سب رس کا یہ شمارہ جنوری کے شمارہ کی طرح چند روز کی تعویق سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ادارے کو کاغذ کی فراہمی میں بڑی دقت پیش آرہی ہے۔ ایک وقت میں اتنا کاغذ فراہم نہیں ہوسکتا کہ ایک ماہ کا سب رس شائع ہوسکے، اس لئے وقتاً فوقتاً کاغذ فروشوں سے حاصل کرنا پڑتا ہے اور پھر بھی جیسا کاغذ ہم سب رس میں لگانا چاہتے ہیں وہ نہیں مل سکتا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ماہ مارچ کا رسالہ وقت پر شائع ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے قدردان، سب رس کا بے چینی سے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اور جہاں دو چار روز گزر جاتے ہیں دفتر میں متعدد خطوط یاد دہانی کے چلے آتے ہیں۔ اِن سب کا انفرادی طور پر جواب دینے کے لئے ہمیں ایک علحدہ دفتر قائم کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ اِس لئے ہم اپنے قدردانوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ جنگ کی وجہ سے ملک میں جو حالات پیدا ہوگئے ہیں ان کے پیش نظر تھوڑی سی تعویق کو درگزر فرما دیں گے۔ ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی اور سب رس کسی صورت میں بند نہیں کیا جائے گا۔ یہ ممکن ہے کہ کاغذ کی کم یابی کی وجہ سے اس کے کچھ صفحات کم کردئے جائیں۔ لیکن اس کی تلافی اس طرح کی جائے گی کہ ہر پرچے میں دیدہ زیب تصویریں شامل ہوں۔ اس کے لئے ہم نے مشہور فن کاروں مثلاً خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی اور عبدالقیوم صاحب کو آمادہ کرلیا ہے۔ خاص کر موخرالذکر نے تو التزام کے ساتھ ہر مہینے چند تصویریں تیار کردینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ چنانچہ زیر نظر شمارے میں بھی ان کے قلم کے چند نمونے شریک ہیں۔

سب رس کا جنگ نمبر آپ کے پیش نظر ہے، اس کی ترتیب میں اس امر کا خیال رکھا گیا ہے کہ دنیا کی موجودہ کش مکش اور اس کے پس منظر اور عواقب سے متعلق ہمارے ناظرین کو کچھ اندازہ ہوسکے۔ جیسے جیسے جنگ ہندستان سے قریب ہوتی جارہی ہے ضروری ہے کہ اہلِ ہند کی ذہنیت بھی جنگی مسائل سے آگاہ ہو۔ اِس آگہی کے بغیر ہم نہ اپنی حفاظت کرسکتے ہیں اور نہ دوسروں کی مدد۔ ایسے ہنگاموں اور انقلابوں کے لئے ہر قوم کو پہلے ہی سے تیار رہنا چاہئے۔ دنیا نام ہے تبدیلیوں اور تغیرات کا۔ اور یہ تبدیلیاں قوموں کی ذہنی و جسمانی نشو و نما کے مطابق عمل میں آتی ہیں۔ اس طرح جو قوم جس درجے کی مستحق ہوتی ہے وہی درجہ اس کو ان تغیرات کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ہمارا یہ جنگ نمبر ہمیں یقین ہے کہ شوق سے پڑھا جائے گا۔ کیونکہ اس میں جو مضامین شریک ہیں ان میں سے اکثر ماہرین کے نتائج قلم ہیں؛ اور ان کے مطالعہ کے بعد نظر میں وسعت پیدا ہونا لازمی ہے۔

اِس شمارے کی ترتیب میں مولوی فیض محمد صاحب بی اے۔ ایم ایڈ نے ہماری خاص مدد فرمائی ہے جس کا ہم منجانب ادارہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اِس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اس شمارے کو کامیاب بنانے میں محکمۂ لاسلکی نشرگاہ سرکارِ عالی نے بھی ہماری کافی مدد فرمائی ہے۔ کیونکہ اس میں کے متعدد مضامین اسی محکمہ کی اجازت سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

خواجہ حمید الدین شاہد

خشکی کی جنگ کے نئے طریقے

آج کل کی جنگ کے تین پہلو قابل غور ہیں۔ خشکی کی جنگ، ہوائی جنگ، اور بحری جنگ۔ ان تینوں کی خاص نفسیت ہے اور یہ نفسیت سائنس کے اس بڑھتے ہوئے رجحان کے باعث پیدا ہوئی ہے جو اِس عہد میں ہماری زندگی پر پوری طرح حاوی ہے۔ خشکی کی جنگ پہلے بھی ہوا کرتی تھی۔ اور اب بھی ہوتی ہے۔ لیکن وسائل کی وسعت کے اعتبار سے دونوں کی نوعیت جداگانہ سی ہو گئی ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب کہ گھوڑوں اور خچروں سے سواری اور باربرداری کا کام لیا جاتا تھا۔ اور تیر و تفنگ سے میدان جنگ میں نبرد آزمائی کی جاتی تھی۔ لیکن آج کل کی جنگ پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ ساری باتیں پرانی معلوم ہوتی ہیں، اور ان کی حیثیت اب بالکل گر گئی ہے۔ اس کی دو بڑی وجہیں ہیں، اول تو موجودہ سائنس کی ہرجہتی ترقی نے ذرائع حمل و نقل کو بے حد وسیع کر دیا ہے۔ اور اشیاء کی ماہیت اور ان کے بے شمار استعمالات اور اطلاقات کا علم اس قدر معیاری ہو گیا ہے کہ جنگی سامان تیار کرنے والے سائنس داں روزانہ اپنے معملوں میں سائنسی، اصولوں کی مدد سے نت نئی اشیا فراہم کر کے حملے اور مدافعت کے بہترین سامان تیار کر رہے ہیں، اسی باعث جنگ کی نوعیت خواہ وہ خشکی کی جنگ ہو کہ بحری یا ہوائی اب بالکل بدل چکی ہے۔ اور ہر ملک اور ہر قوم کے جنگی محکمے مسابقتی انداز میں اس میں کمال پیدا کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔

خشکی کی جنگ کے سارے نئے طریقے کم و بیش اسی سائنسی رجحان کے تابع ہیں۔ حمل و نقل کے ذرائع حملہ اور مدافعت کے طریقے اور آلات حرب کے اصول، زمینی قلعے اور زمین دوز قلعے فوجی نقل و حرکت غرض سب باتوں پر سائنسی ایجادات اور اختراعات کا گہرا اثر پڑا ہے۔ ان سب کی تفصیل اس محدود وقت میں بیان کرنی مشکل ہے۔ اس لئے ہم صرف فوجی میکانیت یعنی MECHANISATION OF ARMY پر روشنی ڈالیں گے۔ کیونکہ یہی وہ نیا طریقہ ہے جس نے خشکی کی جنگ کا سرے سے رنگ بدل دیا ہے۔ اور انسانی اور حیوانی قوت کو میکانی امداد سے اس درجے وابستہ کر دیا ہے کہ ہم اسے فوجی میکانیت کہنے پر مجبور ہیں۔

فوجی میکانیت میں دو امور قابلِ غور ہیں، ایک تو حمل و نقل کی سہولت اور دوسرے جدید تر آلات حرب، آج کل بھی اور قدیم زمانے میں بھی اُس سپہ سالار کو بڑا ہوشیار اور کارگزار سمجھا جاتا تھا، جس میں اپنی فوج کو جلد سے جلد ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل کر کے مرکز پر جمع کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی تھی۔ کہ جہاں سے دشمن پر غالب حملہ کیا جا سکے۔ یہ کامیاب حملے کا ایک بڑا گر تھا۔ چنانچہ جنگ میں یہی ہوتا ہے۔ اور نقل و حرکت کی تیزی سے کارکردگی بڑھ جاتی ہے۔

پچھلی جنگ عظیم کے شروع ہونے سے قبل گھوڑوں ہی سے جنگ میں زیادہ کام لیا جاتا تھا۔ لیکن جب اس اثنا میں داخلی احتراقی انجن (COMBUSTION ENGINE) نے رفتہ رفتہ ترقی یافتہ صورت اختیار کر لی اور طرح طرح کے چھوٹے بڑے کارآمد مشین بنائے جانے لگے تو برطانیہ نے اس دلچسپ ایجاد سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اور جنگی حمل و نقل کے لئے سب سے پہلے آہن پوش مسلح موٹر گاڑیاں استعمال کیں۔ ان گاڑیوں سے نہ صرف بار برداری کا کام لیا گیا بلکہ آلاتِ حرب

اور سپاہیوں کی منتقلی میں بھی مدد لی گئی۔ ان گاڑیوں کو مشین گنوں اور خود کار اسلحہ سے مسلح کیا گیا۔ اس سے تین نمایاں فائدے حاصل ہوئے۔ ایک تو فاصلے جلد طے ہونے لگے۔ دوسرے دشمن پر یکایک حملے کئے گئے اور تیسرے کم سپاہیوں سے زیادہ کام لیا جانے لگا۔ اور کارکردگی پہلے سے زیادہ ہوگئی۔ ایک اور خاص فائدہ یہ ہوا کہ پہلے عام طور پر وزنی توپوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل کرنا ایک دوبھر کام سمجھا جاتا تھا۔ اور اس میں دقت بھی زیادہ اٹھانی پڑتی تھی۔ لیکن اب یہ توپیں بڑی بڑی موٹر گاڑیوں پر چڑھا دی جاتی ہیں اور انہیں جہاں چاہیں لے جاسکتے ہیں۔ خصوصاً پسپائی کی صورت میں فوجیں اپنے وزنی سامان کو میدانِ جنگ میں چھوڑ کر جان بچانے کے لئے بھاگ نکلتی تھیں، لیکن اب ایسے قیمتی اور اعلیٰ قسم کے آلاتِ حرب کے ضائع جانے کے اندیشے ان تیز رفتار سواریوں کے باعث بہت گھٹ گئے ہیں، علاوہ ازیں اس میکانی قوت کی آہن پوش مسلح گاڑی نے انسانی طاقت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اور جو کام پہلے چار فوجی دستے انجام دے سکتے تھے اب وہی کام ایک فوجی دستہ انجام دے سکتا ہے۔

ان آہن پوش مسلح گاڑیوں کی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ پیادہ فوج کی جنگی قابلیت بہت بڑھ گئی ہے وہ اس طرح سے کہ اب طویل مسافتیں آسانی سے اور جلد طے ہو جاتی ہیں اور سپاہیوں کی توانائی محفوظ رہتی ہے۔ یہ گاڑیاں ناہموار اور دشوار گزار راستوں اور میدانوں میں آسانی سے چل سکتی ہیں، بشرطیکہ عارضی طور پر ان کے پہیوں پر پٹہ چڑھا دیا جائے صاف سڑکوں پر ان کی رفتار بالعموم (۴۰) میل فی گھنٹہ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ چونکہ ان گاڑیوں سے مختلف قسم کے کام لئے جاتے ہیں، اس لئے ان کی ساخت اور جسامت کے اعتبار سے ان کی متعدد قسمیں ہیں جیسے مشین گن کی گاڑی۔ لاسلکی کی گاڑی، سامان اور رسد لے جانے والی گاڑی، وزنی توپوں کو کھینچنے والی گاڑی وغیرہ وغیرہ

ان گاڑیوں نے توپ خانے کے کام میں ایک اہم تاریخی تبدیلی کردی ہے۔ پہلے توپ خانہ فوج کے سامنے سامنے ہوتا تھا۔ اس کے پیچھے سوارہ فوج ہوتی تھی۔ اور سب سے آخر میں پیادہ۔ توپ خانے کا کام بہت اہم ہے۔ یعنی وہ آگے بڑھ کر ان علاقوں پر قبضہ کرتا ہے جو حملے کے لئے مفید ہوں۔ اپنی آتش بازی سے دشمن کے بڑھتے ہوئے دباؤ کو گھٹانا اور پھر اپنی سوارہ اور پیادہ فوج کو آگے بڑھ کر لڑنے کا موقع دینا۔ اب بھی طریقۂ کار یہی ہے۔ لیکن موٹر گاڑیوں کی بدولت یہ سارے کام بہت جلدی اور عمدگی سے انجام پاتے ہیں، اس کے علاوہ اگر ان کی حرکت پذیری زیادہ ہو اور سڑکیں ذرا اچھی مل جائیں تو پھر یہ پھیل کر ایک چوڑا محاذ بناتی ہیں اور دشمن کو ہر طرف سے روک سکتی ہیں۔ اگر حملے کارگر ہوئے تو دشمن کا تعاقب کرتی ہیں اور اپنی پسپائی کی صورت میں فوج کی حفاظت کرتی ہیں، ان میکانی موٹر گاڑیوں کو (MOTOR UNITS) کہتے ہیں۔

ان گاڑیوں کو چلانے کے لئے بہت کم آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ حملہ کرنے والی گاڑیوں میں جس میں توپ خانہ ہوتا ہے، بالعموم تین آدمی بیٹھتے ہیں۔ توپ چلانے والا سامنے ہوتا ہے۔ اس کے جسم کا کچھ حصہ اوپر کی طرف نکلا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اگر دشمن کے جوابی حملے شروع ہو جائیں تو پھر یہ ایک (LEVER) کھینچ کر فوراً اپنے کو محفوظ کرلیتا ہے۔ ڈرائیور اور کنٹرولر اس کے پیچھے بیٹھتے ہیں۔ اور ہر ایک کی نشست محفوظ ہوتی ہے۔ اس گاڑی کی کمانیاں بہت عمدہ ہوتی ہیں تاکہ وہ ناہموار راستوں کے سخت دھکے برداشت کرسکے۔ اس میں درستی کا کافی سامان ہوتا ہے۔ آگ بجھانے کا آلہ اور اشارے بھیجنے کا سامان بھی ہوتا ہے،

پٹرول کی ٹانکی بڑی اور عین وسط میں ہوتی ہے۔ جس پر بڑے بڑے گولوں کا بھی اثر نہیں ہوتا۔

ایسی کئی گاڑیوں کے پیچھے پیادہ فوج لاریوں میں ہوتی ہے۔ فوجیوں کا لباس اور ساتھ کا سامان پہلے کی طرح زیادہ نہیں ہوتا۔ بلکہ مختصر اور مفید ہوتا ہے۔ جسم کا نچلا حصہ بالکل آزاد ہوتا ہے تاکہ چلنے اور دوڑنے میں سہولت ہو۔ البتہ اوپری حصہ میں ضروری سامان ہوتا ہے جیسے رائفل، پانی کی بوتل، غذا کا ڈبہ، گیسی نقاب، بغلی تھیلا وغیرہ۔ اس کے علاوہ فوجی کو جس سامان کی ضرورت پڑتی ہے وہ پیچھے کی لاریوں میں ساتھ ساتھ میدان جنگ میں لایا جاتا ہے۔

جنگ کے وقت یہ سب گاڑیاں باقاعدگی کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں، اور ان سب کے پیچھے اور بھی چند گاڑیاں ہوتی ہیں، جن کا کام زخمیوں کی امداد دور افتادہ گاڑیوں کی درستی وغیرہ ہے۔ ان لڑاکا انجن والی گاڑیوں میں سب سے زیادہ اہمیت دبابے کو حاصل ہے۔ خشکی کی جنگ میں اس کی افادیت اس قدر عام ہوگئی ہے کہ آج کل دبابے کا لفظ زبان زد خاص و عام ہوگیا ہے۔ دبابے صدفی صد برطانوی ایجاد ہے، جو نہایت خفیہ طور پر ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۶ء کے درمیان پائۂ تکمیل کو پہنچی۔ سب سے پہلے یہ انگلستان میں تیار کئے گئے۔ اور سام (SOMME) کی پہلی جنگ کے آخر آخر زمانے میں یعنی ۱۵ ستمبر ۱۹۱۶ء کو فرانس کے میدان جنگ میں اتارے گئے۔ جب دشمن نے ان غیر متوقع وحشت ناک اور تباہ کار دیووں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے اگرچہ اس وقت تک آہن پوش گاڑیاں میدانِ جنگ میں برسرِکار تھیں اور جانبین ان سے مانوس تھے تاہم جب دبابوں کا ناہموار میدانوں میں بے تکلفی سے گشت لگانا بلاخوف وخطر دشمن کی صفوں میں گھسنا۔ اپنے حملوں سے تباہی لانا اور خود کو بے ضرر رکھنا ایسی کراماتی باتیں تھیں کہ سب ششدر رہ گئے۔

دبابے بڑی آہن پوش گاڑیاں ہیں۔ ان پر سخت فولادی چادر چڑھی ہوتی ہے۔ پہیے دندانے دار ہوتے ہیں جن پر زنجیر جیسا چپٹا ایک آہنی پٹا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ناہموار زمین پر آسانی سے چل سکتا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں جو دبابے تیار کئے گئے تھے ان میں (۱۰۵) اسپی طاقت کا چھ سلنڈر (DAIMBLER) انجن لگایا گیا تھا۔ دبابے آگے پیچھے موٹر کی طرح بے تکلفی سے حرکت کر سکتے ہیں۔ ان میں چار (TANKS SPEED) ہوتے ہیں۔ انگریزی زبان میں دبابوں کو (TANKS) کہتے ہیں۔ یعنی ٹنکی۔ یہ نام رکھائی ایک دلچسپ لطیفہ ہے۔ ہوا یہ کہ جب دبابے انگلستان سے فرانس بھیجے جانے لگے تو خیال ہوا کہ کہیں دشمن کے جاسوسوں کو اس کا پتہ نہ لگ جائے اور وہ اس ایجاد کو نہ لے اڑیں۔ اس لئے احتیاط کے مدنظر ان کو بڑے بڑے (CASES) میں بند کر کے اُن پر (TANKS FOR RUSSIA) کی چٹھیاں لگا دی گئیں۔ ان کی شکل و صورت بھی چونکہ ٹنکیوں کے جیسے تھی۔ اس لئے ان پر آلۂ حرب ہونے کا شبہ کم کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے کچھ ایسا رواج پڑا کہ ان گاڑیوں کا نام ہی (TANKS) پڑ گیا۔

شروع شروع میں یہ دبابے جنگ میں بڑے مزے سے دھاوے بولتے رہے۔ اور تھوڑے عرصے تک اس کی وضع اور جسامت کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھا گیا۔ لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جب دشمن نے اس مصیبت کو دیکھا تو اس کی توڑ کے ذریعے نکالے اور پھر جب ذریعے نکل آئے تو جسامت اور وضع کا سوال معرض بحث میں آگیا۔ چنانچہ یہ

محسوس ہوا کہ اگر دبابے زیادہ بڑے ہوں گے تو دشمن کی گولیوں کا آسانی سے نشانہ نہ بن سکیں گے۔ اگر زیادہ وزنی ہوں گے تو رفتار گھٹ جائے گی۔ اور اگر چوڑے ہوں گے تو توپچی کے زاویہ نظر پر خراب اثر پڑے گا۔ گویا یہ سب خامیاں تھیں جن کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہوگیا۔

ایک دوسری بات یہ ہے کہ دبابے خشکی کی جنگ میں اس کثرت سے استعمال کئے جارہے ہیں کہ ان کے کام کی تقسیم لازمی ہوگئی ہے۔ اس لئے کام کی تقسیم کے اعتبار سے دبابے علی العموم تین قسم کے ہوتے ہیں ہلکے اوسط درجے کے اور وزنی ہلکے دبابوں کا وزن ۵ اور ۶ ٹن کے درمیان ہوتا ہے اور رفتار ۲۰ میل فی گھنٹے کے لگ بھگ۔ میدانِ جنگ میں یہ ہلکے دبابے آگے آگے ہوتے ہیں، ان پر ایک بڑی اور ایک چھوٹی مشین گن ہوتی ہے۔ یہ کافی مضبوط ہوتے اور دشمن کے حملوں کو برداشت کرسکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہلکے دبابے مقابلے کی لڑائی سے زیادہ فن کارانہ لڑائی لڑتے اور تباہ کن جہازوں کی طرح کبھی آگے بڑھ کر اور کبھی پیچھے ہٹ کر دشمن کی غیر منظم فوجی اکائیوں پر چھاپے مارتے ہیں۔ ان دبابوں کے پیچھے پیچھے اوسط درجے کے دبابے ہوتے ہیں۔ ان کا وزن ۱۵ تا ۱۶ ٹن ہوتا ہے۔ ان میں تین بڑی توپیں اور ایک (B.POUNDER GUNS) ہوتی ہے۔ ان کا کام دشمن کی فوج کو اپنے حملوں سے پریشان کرنا، اس کی ترتیب کو خراب کرنا مقابل کے دبابوں پر حملہ کرنا اور دبابوں پر حملہ کرنے والوں کو تباہ کرنا اور اگر ضرورت پڑے تو اپنے (SHELLS) اڑا کر دھوئیں کی چادر پھیلانا اور اسی طرح اپنی فوج کو محفوظ کرلینا ہے۔

اِن دبابوں کے پیچھے بڑے دبابے ہوتے ہیں جنھیں "وزنی دبابے" کہتے ہیں۔ ان کا وزن ۷۰، ۸۰ ٹن کے قریب ہوتا ہے۔ رفتار کوئی ۶ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ انہیں انفنٹری کے دبابے بھی کہتے ہیں، کیونکہ محاصرے کی جنگ میں ان کا اہم فریضہ انفنٹری کی کارکردگی کے لئے میدان صاف کرنا ہے۔ چنانچہ یہ سامنے سامنے ہوتے ہیں، اور فوج پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ گویا یہ دبابے نہ صرف حملہ آور ہی ہیں بلکہ فوج کے لئے ٹٹی کا کام دیتے ہیں جب یہ آگے بڑھ کر مشین گنوں کے عمل کو روکنے، مورچوں کو توڑنے اور فوج کو تتر بتر کرنے لگتے ہیں۔ تو سپاہی موقع سے آگے بڑھ کر زور دار حملے کرتے ہیں۔ اگر دشمن نے ہتیار ڈال دئے تو محاصرہ کرلیتے ہیں اور اگر پیچھے ہٹنے لگے تو پیچھا کرتے ہیں۔ اس حالت میں ہلکے اور اوسط درجے کے دبابے خوب جولانیاں دکھاتے ہیں۔

اس میکانی فوج میں ڈرائیوروں کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر ڈرائیور بجائے خود ایک بہت اچھا میکانک اور فن کار سپاہی ہوتا ہے۔ کیونکہ اکثر صورتوں میں جب کہ دبابے اک نشستی ہوں تو ڈرائیور کو دبابہ رانی کے ساتھ ساتھ توپچی کے بھی فرائض انجام دینے پڑتے ہیں، ان کا حال بالکل اک نشستی لڑاکا ہوا باز سا ہے۔ فوجیوں کو اِس خصوص میں سخت احتیاط کے ساتھ تربیت دی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ان ڈرائیوروں کو جدید ترین ہتیار استعمال کرنے پڑتے ہیں جو بجائے خود ایک خاص فن ہے۔ نئی نئی قسم کی توپیں ہیں اور نئی نئی قسم کے گولے اور شیل یہ بہت قیمتی چیزیں ہیں، اگر استعمال میں ذراسی غلطی کی جائے تو بے جا نقصان ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ دبابوں کی قیمت خود بہت زیادہ ہوتی ہے اور ساری ذمہ داری صرف

تین چار آدمیوں پر ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی باگ ماہرین کے ہاتھ میں دی جاتی ہے۔

آج کل خشکی کی جنگوں میں محض میکانی طاقت ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اور بھی باتیں قابل لحاظ ہیں، مثلاً فوج کی مختلف اکائیوں میں ربط و تعلق قائم رکھنا کیونکہ جدید ذرائع حمل و نقل اور آلات جنگ کی فراوانی کے باعث جنگ کا میدان ایک طرف سکڑ کر مرکز کی طرف آرہا ہے تو دوسری طرف اس میں پھیلاؤ کا رجحان بھی ہے۔ تاوقتیکہ وسعت کے بعد اتحاد قائم نہ رہے نتائج موافق حال نہیں ہوسکتے۔ اس لئے مختلف جنگی اکائیوں میں ربط اور تعلق قائم رکھنے کے لئے (SIGNALLING) کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور جھنڈیوں، قندیلوں، راکٹوں اور شمسی خبر رسانی (HILIOGRAPHY) کے ذریعے اشارے بھیجے جاتے ہیں۔ سارے جنگی علاقے پر ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کا جال آن کی آن میں بچھا دیا جاتا ہے۔ اور جیسے جیسے فوج آگے حرکت کرتی ہے تار بھی ساتھ ساتھ بچھائے جاتے ہیں۔ موٹر گاڑیوں میں ایسا تار کافی مقدار میں ہوتا ہے۔ اور ان میں تار بچھانے اور لپیٹنے کے خاص خاص آلات ہوتے ہیں۔ یہ کام بڑی تیزی کے سے خود کار مشینوں اور مستعد آدمیوں کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ اس کے علاوہ جا بجا ایسے چھوٹے لاسلکی آلات بھی نصب کردئے جاتے ہیں کہ جنھیں سپاہی ضرورت پڑنے پر کرکے اپنے ساتھ رکھ لیتے ہیں۔

پیام رسانی کے لئے کبوتری ڈاک کا قدیم اور عجیب طریقہ اس زمانے میں بھی رائج ہے۔ اور اس سے بہت سے مفید کام لئے جاتے ہیں۔ پیامات کو مقررہ اشاروں میں لکھ کر الومونیم کی ڈبیہ میں بند کرکے کبوتر کے پیر سے باندھ دیتے ہیں۔ یہ سدھائے ہوئے کبوتر گولیوں کی بوچھار میں بچتے بچاتے اپنی راہ تلاش کرتے اور پیام پہنچاتے ہیں۔ کبوتروں سے ایک اور اہم کام بھی لیا جاتا ہے۔ ان کے پیروں سے بہت ہی چھوٹے مگر بہت ہی حساس خود کار فلم کیمرے باندھ کر دشمن کے علاقوں کی طرف اڑا دیا جاتا ہے۔ یہ چوطرف گھوم کر جب واپس آتے ہیں تو کیمرے سے فلم نکال کر آشکار کرلی جاتی ہے۔ دشمن کے علاقوں کی صحیح تصویریں، ان کی نقل و حرکت اور فوجی اکائیوں کی صحیح وضع کا پتہ دیتی ہیں اور ان سے حملہ کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

فیض محمد صدیقی

آب دوز اور سرنگ

یوروپی اقوام جنگ کے جو نئے نئے طریقے اور ذریعے اختیار کررہی ہیں، ان کے راز بڑی خوبی سے پیش کئے گئے ہیں۔ آب دوز اور سرنگ کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ اس کی ساخت اور ترکیب، اس کے حملے اور مدافعت کے طریقے اور ضروری تفصیلات نہایت خوبی کے ساتھ واضح کی گئی ہیں۔

از مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے۔ ایم ایڈ۔ صفحات (۸۴) قیمت صرف ۶؍ سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

کیمیائی جنگ

قدیم زمانے میں جو جنگ ہوا کرتی تھی اس کا انحصار جسمانی قوت پر ہوتا تھا۔ یعنی کامیابی کا دارومدار ہر سپاہی کی دلیری و بہادری پر موقوف تھا۔ اس زمانے کی جنگ میں اکثر دستی ہتیار مثلاً لٹھ، تلوار، پٹہ وغیرہ کا استعمال ہوتا تھا اس کا مشاہدہ اب بھی سینما گھروں میں ہو سکتا ہے مقابلہ کی لڑائی سے بچنے کے لئے بعد میں ایسے ہتیار مثلاً بندوق، توپ، مشین گن وغیرہ ایجاد کئے گئے جن کی مدد سے دشمن کا مقابلہ کافی فاصلے سے ممکن ہوگیا۔ ان ہتیاروں کی زد سے بچنے کے لئے مضبوط اور گہری خندقیں تیار کی جانے لگیں۔ جس میں سپاہی چھپے بیٹھے رہتے ہیں اور جہاں سے وہ دشمن پر مسلسل گولہ باری کرتے ہیں۔ اگر دشمن قریب آجائے تو لڑائی پھر مقابلہ کی ہوجاتی ہے اور اس میں جانی نقصانات کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے حملہ آور فوج دور دور سے خندقوں کا محاصرہ لیتی ہے اور محصور فوج تک اشیائے خوردنی پہونچنے نہیں دیتی۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے یہ ہوتا ہے کہ محصور فوج عاجز آکر ہتیار ڈال دیتی ہے۔ یہ کامیابی یا شکست ہتیار کی برتری کی وجہ سے نہیں بلکہ مجبوری کے تحت ہوتی ہے۔ جنگ میں کامیابی کا دارومدار زیادہ تر اقوام کی معاشی حالت اور سپاہیوں اور آلات کی تعداد پر منحصر ہوتا ہے۔ لڑائیوں میں بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ خندقوں کا محاصرہ کرنے کے بعد بھی مہینوں بلکہ برسوں بغیر کسی نتیجہ کے وہیں رکے رہنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں زہریلی گیسوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہے کہ جنگ میں صرف بندوق، گولے اور مشین گن ہی کافی نہیں بلکہ اس میں اگر کیمیائی اشیا کا بھی اضافہ کیا جائے تو یہ اور موثر ہوجائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ آج آزاد اقوام کی نگاہیں ہتیار تیار کرنے والے کارخانوں کی بجائے کیمیائی تجربہ خانوں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

قدیم تاریخ سے بھی ظاہر ہے کہ جنگ کی صورت میں کیمیائی قوت کو اہمیت دی جاتی تھی۔ مثلاً قدیم یونانی آگ اب بھی موجودہ ہتیاروں کا مقابلہ باآسانی کر سکتی ہے۔ اس آگ کو ایک شامی سائنس داں کالی نکس نے سنہ ۶۹۰ء میں سب سے پہلے استعمال کیا تھا۔ اس کے صحیح اجزا کا پتہ نہیں چل سکا لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں چونا پانی کے ساتھ مل کر حرارت پیدا کرتا ہے اور پٹرول کو آگ لگاتا اور دھماکہ پیدا کرتا ہے۔ اس کا استعمال پندرہویں صدی تک جاری رہا یہاں تک کہ بارود ایجاد ہوئی کیمیائی اشیا کی اہمیت اب اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ان پر جنگ عظیم سے پیشتر ہی کافی تحقیقات کی جانے لگی تھیں۔ یہ اشیا ابتداءً جنگ میں استعمال کے لئے نہیں تیار کئے گئے تھے بلکہ علمی تجربات کے لئے ان کو بنایا گیا تھا۔ کیمیائی مرکبات قلیل مقدار میں ہونے کی وجہ سے جنگ میں ان کا استعمال بڑے پیمانہ پر ناممکن تھا ان اشیا کو کثیر مقدار میں پیدا کرنے کے لئے کیمیائی صنعت کی مناسب ترقی ضروری ہوئی۔ یورپ میں جنگ عظیم سے پیشتر ہی کیمیائی صنعت ترقی کے منازل طے کر چکی تھی۔ اس صنعت کی اہم کارگزاری رنگ کی تیاری ہے۔ جس کے بنانے میں جرمنی نے بہت بڑا حصہ لیا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں کرۂ زمین پر رنگوں کی کل پیداوار تقریباً ڈیڑھ لاکھ ٹن تھی اور اس کا تین چوتھائی حصہ جرمنی کا تیار کردہ تھا۔ رنگوں کی تیاری کے دوران میں ۵۰ فیصدی ایسے مرکبات حاصل ہوئے جو جنگ میں استعمال کئے جانے کے قابل تھے۔

جنگ عظیم سے پیشتر ہی جرمنی میں ایسی اساسی کیمیائی صنعت گاہوں کو فروغ دیا گیا تھا جن میں معمولی مرکبات مثلاً نائٹروجنی مرکبات،

کلورین، سلفیورک ترشہ۔ نائٹرک ترشہ۔ اور قلیاں وغیرہ تیار ہوا کرتے تھے۔ کلورین گیس نہ صرف جنگ ہی میں کام آتی ہے بلکہ بہت سے مرکبات کی تیاری میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے جرمنی میں اس کی ایک کثیر مقدار تیار کی گئی۔ اس کے ماسوا اعلیٰ تار کول کی صنعت آرسنک۔ برومین اور فاسفورس کی تیاری بھی جنگ میں ضروری سمجھی گئی۔ دریائے رہائن کے اطراف کی تمام کیمیائی صنعت گاہیں ان کیمیائی اشیا کی تیاری میں مصروف تھیں۔

۱۹۱۴ء-۱۸ء میں جنگ کے یہ تمام طریقے بیکار ثابت ہوئے۔ جرمنی میں نہ تو کیمیائی قوت معقول تھی اور نہ تو بارود گولے کی مقدار کافی تھی۔ جنگ کے اختتام کی مدت اس کے اندازے سے بہت زیادہ طویل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے مجبور ہو کر ۱۹۱۵ء میں پہلی مرتبہ وائپرس کے قریب گیس کے استعمال سے دشمنوں کو متحیر کر دیا۔ غرض اس طرح آیندہ جنگ میں بارود گولی کے علاوہ کیمیائی اشیاء کا استعمال لازمی ہو گیا۔ سپاہیوں اور سائنس دانوں کی خدمات کو مساویانہ رتبہ دیا گیا۔ جنگ میں کیمیائی اشیا کے استعمال نے نہ صرف طریقہ جنگ کو بدل دیا بلکہ جنگی ہتیاروں میں ایک نئی جان ڈال دی۔

کیمیائی جنگ کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان اشیا کا مقابلہ دھماکو اشیا کے ساتھ کیا جائے۔ ان دونوں کے استعمال کا طریقہ مختلف ہے۔ کیمیائی اشیا کا اثر دیر رس ہوتا ہے اور زیادہ تر فضا پر منحصر ہوتا ہے۔ لیکن گولی یا شل (Shell) کا اثر اپنے نشانہ پر فوری پڑتا ہے۔ گیس ہوا میں چھوڑی جائے تو یہ صرف ہوا کے ذریعہ اپنے نشانے تک پہنچ سکتی ہے۔ طیران پذیر گیس کا دائرہ عمل بہ مقابلہ تبخیر پذیر کے بہت وسیع ہوتا ہے توپ کے گولے کے اثرات پر غور کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کا اثر دھماکہ پر اور اس کے پھٹنے کے بعد اس کے ذرات کے بکھر جانے کی قوت پر منحصر ہوتا ہے اس کا دائرہ عمل بہ مقابلہ کیمیائی اشیا کے بہت کم ہوتا ہے۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ بم پھٹنے کے بعد وقفہ میں کھڑے ہوئے سپاہیوں میں سے ایک ہلاک ہوتا ہے اور دوسرا بچ جاتا ہے۔ لیکن گیس کے اثرات سے جملہ جاندار چیزیں مساوی طور پر متاثر ہوتی ہیں۔ اس سے بچنے کے لئے سپاہیوں کو گیس ماسک یا اور کوئی مصنوعی چیز کا استعمال لازمی ہو گیا ہے جس کے متعلق آگے چل کر مختصراً بیان کیا جائے گا۔ گولی بندوق سے نکل جانے کے بعد اس کے مہلک اثرات فوری ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن گیس کے بادل دشمنوں کے سر پر گھنٹوں چھائے رہتے ہیں۔

گیس کی دوسری خصوصیت اس کے تجسسی اثرات ہیں۔ معمولی خندق سپاہی کو گولی کی زد سے بچا لیتی ہے۔ درختوں کو کاٹ کر ایک ڈھیر بنا دیا جائے تو پوری فوج کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ لیکن گیس کو روکنے کا کوئی ذریعہ نہیں یہ اپنا راستہ فضا میں ہر طرف آسانی سے نکال لیتی ہے۔ یہی ایک خصوصیت گیس کی ہے جو اس کی اہمیت بڑھا دیتی ہے۔ ابھی ہم نے بیان کیا تھا کہ گیس ماسک کے ذریعہ ان زہریلے اثرات کا ایک حد تک مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ گیسی نقاب سب سے پہلے انگلستان اور فرانس کی کوششوں سے تیار ہوئے۔ جرمنی نے ۱۹۱۵ء میں جب فرانس کی سرحد پر کلورین گیس کے ذریعہ حملہ کیا تو تقریباً ۹۲ فیصد سپاہی اس کی زد سے بچ نہ سکے۔ ان پریشان کن نتائج سے بچنے کے لئے برطانیہ اور فرانس نے بہت ہی کم مدت میں ایک ایسی چیز پیش کی جس سے گیسی حملوں سے بآسانی بچاؤ ہو سکتا تھا۔ سوڈیم کاربونیٹ اور سوڈیم تھائیو سلفیٹ کے محلول میں ڈبویا ہوا ایک کپڑا تیار کیا گیا۔ اس کپڑے کو چہرے پر باندھنے کے بعد کلورین گیس کی تعدیل عمل میں آتی ہے۔ پس اس طرح اس گیس کے نقصان دہ نتائج سے نجات حاصل کی گئی۔ جنگ کے دوران میں برطانیہ میں ۲ لاکھ سپاہیوں کی حفاظت کے لئے سات مختلف قسم کے

نقاب استعمال ہوتے رہے۔ مثلاً اشک ریز گیس کی صورت میں ہائپو ہلٹس استعمال کئے جاتے تھے۔ ہلٹ کا کپڑا سوڈیم ہائپو سلفیٹ، دھونے کا سوڈا اور گلیسرین کے محلل میں ڈبو لیا جاتا ہے۔ فاسجین گیس کلورین سے دس گنی زیادہ زہریلی ہوتی ہے۔ اس گیس کی تعدیل کے لئے جو نقاب تیار ہوتے ہیں ان کو کاوی سوڈا، فینول اور گلیسرین کے محلول سے سیر شدہ کر لیتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں مختلف گیسوں کے لئے مختلف اقسام کے نقاب کا وقتاً فوقتاً استعمال چونکہ بہت ہی تکلیف دہ ہے اس لئے جملہ گیسوں سے بچنے کے لئے اب صرف ایک ہی قسم کا نقاب ایجاد کیا گیا ہے۔ اس نقاب میں سوڈا لائم، عامل چارکول اور میکانکی فلٹر استعمال ہوتے ہیں جو اپنا تعدیلی عمل کرتے رہتے ہیں۔ جسم کی حفاظت کے لئے بھی اب ایسے لباس تیار کئے گئے ہیں جن کے استعمال سے مسٹرڈ گیس وغیرہ کا اثر نہیں ہونے پاتا۔ اس لباس کو کسی خشک ہونے والے نباتی تیل میں ڈبو لیا جاتا ہے جیسے السی کا تیل۔ تاکہ مختلف گیسوں کو جذب کر کے جسم کو محفوظ رکھ سکے۔

اب ہم جنگ میں استعمال ہونے والی کیمیائی اشیاء کا مختصراً ذکر کریں گے۔

(۱) گیسیں:۔ یہ وہ کیمیائی اشیاء ہیں جو جسمانی اثر رکھتی ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جو ہلاک ہوتی ہیں، دوسری وہ جو تکلیف دہ ہوتی ہیں اور جو سپاہیوں کو ناقابل جنگ بنا دیتی ہیں۔ مثلاً کھانسی، چھینکیں، تے و متلی وغیرہ کے ذریعہ۔

(۲) دھواں پیدا کرنے والی اشیاء:۔ ان سے مراد ایسی اشیاء ہیں جن سے دو فوجوں کے درمیان ایک دھوئیں کی چادر پھیلا دی جاتی ہے جس سے دشمن کی بصارت پر اثر پڑتا ہے۔ بعض دھوئیں ایسے بھی ہیں جو بدن کو کامل طور پر جلا دیتے ہیں۔

(۳) آتش افروز اشیاء:۔ ان سے تباہ کن آگ بھڑک اٹھتی ہے اور بعض ایسی چیزوں کو بھی آہستہ آہستہ جلانا شروع کر دیتی ہیں جو آسانی سے نہیں جل سکتیں۔

ان کے علاوہ بہت سی کیمیائی اشیاء ہیں جنکے اثرات مختلف قسم کے ہوتے ہیں مثلاً چند ایسی اشیاء ہیں جو فوری مہلک ہوتی ہیں۔ اور چند ایسی بھی ہیں جن کے اثرات دیر سے نمایاں ہوتے ہیں چند ایسی اشیا بھی ہیں جن سے آنکھوں میں جلن پیدا ہوتی ہے اور پانی بہنا شروع ہو جاتا ہے مثلاً اشک ریز گیس یہ عموماً امریکہ اور یورپ میں غیر منظم مجمعوں کو منتشر کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ مہلک اثرات پیدا کرنے کے لئے بعض گیسیں ایسی بھی ہیں جن کی بہت ہی قلیل مقدار موت کے لئے کافی ہے۔ مثلاً ڈائی فنیائیل آرسین۔

دنیا میں اب تک جتنے کیمیائی مرکبات تیار ہوئے ہیں ان کی تعداد تین اور پانچ لاکھ کے درمیان ہے۔ لیکن ان میں سے صرف تینتیس ہزار مرکبات جنگ عظیم کے لئے منتخب کیے گئے تھے اور تفصیلی تحقیقات عمل میں لائی گئی تھیں۔ مزید تجربوں سے پتہ چلا کہ ان میں صرف تینتیس مرکبات جنگ میں استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ استعمال کے لئے صرف اثرات اور تیاری ہی کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا بلکہ ان کی کثیر مقدار کا حصول اور ان کی بار برداری وغیرہ میں سہولت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان لاکھوں میں سے صرف ۹ مرکبات قابل استعمال قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

فاسجین، کلورین۔ کلوریکرین وغیرہ سے شش پر اثر پڑتا ہے چھینکیں، متلی اور قے شروع ہو جاتی ہے۔ ان کے اثرات کو گیس نقاب بھی نہیں روک سکتے کیونکہ یہ ان میں سے بآسانی گزر جاتی ہیں۔ اور اگر زیادہ مقدار میں سونگھی جائیں تو مہلک اثرات پیدا کرتی ہیں۔

آرسین کے مرکبات مثلاً ڈائی کلورو آرسین۔ ڈائی فنیائیل آرسین، ڈائی فنیائیل سیان آرسین وغیرہ بیحد زہریلی ہوتی ہیں۔

برومو ایسیٹون۔ برومو بنزائیل، سائنائڈز، کلورا سیٹوفینون وغیرہ سے آنکھوں میں جلن پیدا ہوتی ہے اور پانی نکلنا شروع ہوتا ہے۔ ڈائی کلورایتھائیل سلفائیڈ یا مسٹرڈ گیس سے بدن پر چھالے آجاتے اور بدن سوج جاتا ہے۔ اور متضرر چند دنوں میں بے حد تکلیف اٹھاکر مر جاتا ہے۔ غیر خالص تیل کے نامکمل احتراق سے دھواں پیدا ہوتا ہے۔ جہازوں کے ذریعہ اس کو سمندر میں چھوڑتے ہیں تاکہ دشمن کی نظر محدود کردی جائے۔

سفید فاسفورس کا محلول کاربن ڈائی سلفائیڈ میں تیار کرتے ہیں۔ تبخیر سے کاربن ڈائی سلفائیڈ اڑجاتی ہے اور فاسفورس جلنا شروع ہوجاتی ہے۔ ہوا کی آکسیجن سے ترکیب کھاکر آکسائیڈ کا دھواں بن جاتا ہے۔ میدانِ جنگ میں اس کو دبابوں کے ذریعہ چھوڑ کر تباہ کن نتائج پیدا کئے جاتے ہیں۔ سلفر ٹرائی آکسائیڈ اور کلورو سلفرنک ترشہ سے بھی دھواں تیار کیا جاتا ہے اس کی مدد سے فوج کو آگے بڑھنے کا بآسانی موقع مل جاتا ہے۔

آتش افروز اشیا کی بھی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جن کا اثر ایک محدود دائرہ میں ہوتا ہے اور ان کی حرارت اور شعلہ اتنے تیز ہوتے ہیں کہ عالی شان عمارتیں چند لمحوں میں زمین دوز ہوجاتی ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس کا اثر کافی دور تک پھیلتا ہے اور اس سے چھوٹی عمارتیں بآسانی جل جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے جو اشیا استعمال ہوتی ہیں وہ فاسفورس، سوڈیم اور ٹرائی نائٹرو ٹولوین ہیں۔ تجربہ سے پتہ چلا ہے کہ ان اشیا کو علحدہ علحدہ استعمال کرنے کی بجائے اگر ان کا ایک آمیزہ لیا جائے تو نتائج بہت ہی مفید برآمد ہوتے ہیں۔ مثلاً فاسفورس، کاربن ڈائی سلفائیڈ، غیر خالص بنزین، جلانے کا تیل اور ٹرائی نائٹرو ٹولوین کے تناسب کو بڑھا گھٹا کر بھڑک اٹھنے کے لئے جتنا وقفہ درکار ہوتا ہے اس وقفہ کو کم و بیش کرسکتے ہیں۔

اب اس مقصد کے لئے تھرمائیٹ بم ایجاد کئے گئے ہیں۔ تھرمائیٹ دھاتوں کے آکسائیڈز کا آمیزہ ہوتا ہے۔ عام طور پر الومنیم اور لوہے کے آکسائیڈ کا آمیزہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس آمیزہ کے جلنے سے کثیر حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے تقریباً ۸ لاکھ کیلاری حرارت فی گرام سالمہ پیدا ہوتی ہے۔ اس سے تعامل کی حرارت ۳۰۰۰ درجہ مئی تک ہو جاتی ہے جو بہت دیر تک قایم رہتی ہے۔

کیمیائی اشیا کے استعمال کے لئے جو ہتیار بنائے گئے ہیں وہ اسی طرح کے ہیں جس طرح کے گولے اور شل کے ہتیار ہوتے ہیں۔ مثلاً گیس کے بھی کارتوس ہوتے ہیں جو بندوق کے ذریعہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ توپ کے گولوں کی طرح گیسی گولے بھی ہوتے ہیں جو توپوں کے ذریعہ دشمن پر پھینکے جاتے ہیں۔ آتش افروز بم کا عمل بھی اسی طرح ہوتا ہے جو شہروں کو تباہ کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ غرض جملہ ہتیار جو معمولی طور پر استعمال ہوتے تھے ان کو حسب ضرورت گیس ہتیاروں میں تبدیل کرلیا جاتا ہے۔

سائنس نے اب تک جو خدمت کی ہے اس کی شکل تعمیری تھی۔ سائنس دانوں نے صرف تحقیقات کی خاطر دنیا کے سامنے نئی نئی چیزیں پیش کیں۔ کسے معلوم تھا کہ یہی چیزیں بجائے فائدہ کے اب انسان کی تباہی کا ذریعہ بن جائیں گی!

قاضی معین الدین

جنگ

بے خبر ہے جنگ کے معنی سے کیا کرتا ہے تو
صبح اٹھ کر جنگ کی خبریں پڑھا کرتا ہے تو

جنگ کیا ہے؟ اک مرض، ناقابلِ فہم و علاج
نوعِ انسانی کا رعشہ، ملتوں کا اختلاج

جنگ کیا ہے؟ فطرتِ انساں کی پستی کا ثبوت
خود پرستی کی شہادت، زر پرستی کا ثبوت

جنگ کیا ہے؟ موت کے شعلوں سے ہولی کھیلنا
دوسروں پر ظلم ڈھانا، خود مصیبت جھیلنا

جنگ کیا ہے؟ عادتِ فرمانروائی کی دلیل
بے رخی کا کارنامہ، کج ادائی کی دلیل

جنگ کیا ہے؟ مفلسوں پر صاحبِ زر کا ستم
ضعف پر قوت کا حملہ، خیر پر شر کا ستم

جنگ کیا ہے؟ آفتیں ڈھانا وطن کے نام پر
نرم غنچوں کو مسل دینا چمن کے نام پر

جنگ کیا ہے؟ شیوہ غارتگری کا شاہکار
بربریت کا نمونہ، سرکشی کا اشتہار

جنگ کیا ہے؟ اپنی عظمت کے تکبر کا سرور
زور کا پندار، زر کا ناز، ہمت کا غرور

جنگ کیا ہے؟ دوسروں کے منہ سے روٹی چھیننا
خلعتِ زریں پہن کر بھی لنگوٹی چھیننا

جنگ کیا ہے؟ مسکرانا بیکسوں کے حال پر
قوم کی بازی لگانا دوسروں کے مال پر

جنگ کیا ہے؟ گرم تازہ خونِ انسانی کی پیاس
ذہنِ شیطاں کا تقاضا، روحِ شیطانی کی پیاس

جنگ کیا ہے؟ کم نگاہی، کور چشمی، حرص و آز
جنگ میں یکساں ہیں سو انساں ہوں یا اک جہاز

جنگ انساں کو سکھا دیتی ہے اک مہمل سبق
جنگ الٹ دیتی ہے مکتوبِ محبت کا ورق

جنگ اک نشہ ہے جس سے سلب ہوتے ہیں حواس
جنگ ہے اک تلخ تر مے جس سے بڑھ جاتی ہے پیاس

جنگ اک رستہ ہے جس میں کوئی منزل ہی نہیں
جنگ اک خرمن ہے جس کا کوئی حاصل ہی نہیں

تجھ کو پہلے جنگ کا مطلب سمجھنا چاہیئے
آج تک سمجھا نہیں تو اب سمجھنا چاہیئے

شاہد صدیقی

انجامِ جنگ

دنیائے بحر و بر میں عجب ارتعاش ہے
کوہِ غرور و کبر بھی اب پاش پاش ہے

اے رہروانِ راہ سکوں دیکھتے چلو
بربادیوں کے دوش پہ باطل کی لاش ہے

عظیم الدین محبت

موجودہ جنگ کا اثر ہندوستان کی صنعتوں پر

جنگ اپنی ان تمام ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے باوجود جن کا تلخ ترین تجربہ انسانیت کو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اپنے اندر بعض ایسے پہلو بھی رکھتی ہے جو تمام عالم کے لئے نہیں تو کم از کم بعض ممالک کے لئے فائدہ بخش ہوتے ہیں۔ موجودہ جنگ ہی کو لیجئے۔ انسانیت کی تباہی میں اس جنگ کا کتنا ہی حصہ کیوں نہ رہا ہو کم از کم ہندوستان کی صنعتوں کو اس جنگ نے بہت کچھ تقویت دی۔

یہ امر محتاج تشریح نہیں ہے کہ موجودہ جنگ کارخانوں میں لڑی جارہی ہے اور محاذ پر لڑنے والے ہر سپاہی کے لئے تین آدمیوں کو کارخانوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ ہندوستان میں بھی یہ جنگ جاری ہے اس لئے یہاں کی صنعتوں پر بھی اس کا راست اثر پڑ رہا ہے۔

جنگ عظیم کے دوران میں حکومت نے پہلی مرتبہ فوجی اور جنگی ضروریات کے مدنظر ہندوستان کی صنعتی ترقی کی طرف توجہ کی اور اکثر صنعتوں کی امداد کی۔ لوہے اور فولاد کی صنعت اور سوتی کپڑے کی صنعت نے اس سے کافی فائدہ اٹھایا۔ لیکن جنگ کے بعد جونہی حالات بدل گئے صنعت و حرفت میں گرم بازاری بھی نہ رہی اور جیسے ہی بیرونی مال سے مسابقت کا آغاز ہوگیا ہندوستان کی صنعتی ترقی پھر ماند پڑ گئی۔ کیونکہ صنعتیں اس قابل تو نہیں ہو چکی تھیں کہ اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہو سکتیں اور بیرونی مسابقت کی تاب لا سکتیں۔

اس جنگ کے شروع ہوتے ہی دوبارہ صنعتی ترقی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اور دوبارہ ہندوستانی مصنوعات کی ترقی کے لئے سنہری موقع ہاتھ آگیا۔ سب سے پہلے تو جنگ کے شروع ہوتے ہی بحری راستوں میں طرح طرح کی رکاوٹوں اور باربرداری کے جہازوں میں کمی کی وجہ سے ہندوستان کی درآمد تقریباً بند ہو گئی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مصنوعات کو زبردست بیرونی مسابقت سے نجات ملی۔ جرمنی کے مال درآمد کا تو سوال ہی باقی نہ رہا۔ اور انگلستان کے بیشتر کارخانے اور جہاز، جنگی ضروریات کی تکمیل کے لئے وقف ہو گئے اس لئے اب امریکہ کی مصنوعات کو جو جرمنی اور انگلستان کی مصنوعات کے مقابلہ میں ذرا مہنگی ہوتی ہیں ہندوستان کی منڈیوں میں آنے کا موقع ملا۔ ہندوستانی کارخانوں کے لئے امریکی مصنوعات کا مقابلہ کرنا نسبتاً آسان ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی مصنوعات کو بیحد فائدہ پہنچا۔

خود حکومت ان مختلف تدابیر پر غور کر رہی ہے جن کی وجہ سے ہندوستانی مصنوعات کو فروغ ہو۔ اور ہندوستان جنگی سرگرمی میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکے۔ چنانچہ حکومت نے ستر کروڑ روپے مختلف کارخانوں کی امداد کے لئے منظور کئے۔ اس کے علاوہ جہاں تک ہو سکے، ہندوستانی مصنوعات کی ترقی کے لئے آسانیاں فراہم کی جارہی ہیں۔ اس سلسلہ میں دہلی میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کانفرنس میں برطانیہ عظمیٰ کے ان تمام ممالک کے نمائندے شریک تھے جو نہر سوئز کے مشرق میں واقع ہیں۔ اس میں ان تمام مختلف تدابیر پر غور کیا گیا جو جنگی سامان کی تیاری سے متعلق ہیں۔

اس کے علاوہ حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی صنعتوں کو ترقی دینے اور ترقی کے ذرائع پر غور کرنے کے لئے ایک وفد جو "راجر سپلائی مشن" کہلاتا ہے ہندوستان بھیجا۔ یہ وفد اب ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ ختم کر چکا ہے۔

ہندوستان کی مصنوعات کی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ صنعتی ماہرین کی کمی ہے۔ حکومت نے اس کمی کو محسوس کیا اور یہاں کے لوگوں کو انگلستان کے کارخانوں میں کام سیکھنے اور تجربہ حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ چنانچہ اب تک ایسی کئی جماعتیں انگلستان جاچکی ہیں۔

اب ہم ان مصنوعات پر یکے بعد دیگرے بحث کریں گے اور ان کا سرسری مطالعہ کریں گے جنھوں نے موجودہ جنگ کے دوران میں نمایاں ترقی کی۔

لوہے اور فولاد کی صنعت موجودہ جنگ کے آغاز سے لوہے اور فولاد کی صنعت نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ اور اس کی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی نے ...۱۱۴ ٹن پگ آئرن اور ایک ملین ٹن سے زیادہ اسٹیل زنگوائس تیار کیا۔ اور مزید اضافہ کی کوشش کی جارہی ہے۔ ریلوے لائنوں کی تعمیر میں وسعت دینے کی اسکیم بھی پیش نظر ہے جنگی ضروریات کے تحت رائفلیں، مشین گنیں اور شل وغیرہ تیار کئے جارہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ جنگ کے دوران میں اس صنعت کو اتنی ترقی ہوجائے گی کہ یہ صنعت جنگ کے بعد کے حالات کا مقابلہ کرسکنے کے قابل ہوجائے گی۔

لوہے اور فولاد کی صنعت کی حیثیت کلیدی صنعت کی ہے۔ باوجود اتنی صنعتی ترقی کے اب تک مشینری باہر ہی سے درآمد ہورہی ہے۔ لیکن اب کوشش کی جارہی ہے کہ مشینری بھی یہیں بنائی جائے۔ چنانچہ اسٹیم انجن اور ریل کے انجنوں کی تیاری کے ساتھ ساتھ ایسے آلات بھی تیار کئے جارہے ہیں جن کی ضرورت خود ہمارے کارخانوں میں ہوتی ہے۔

صنعت پارچہ بافی دوسری قابل ذکر صنعت پارچہ بافی کی صنعت ہے۔ جس کو جنگ سے پیدا شدہ حالات سے فائدہ اٹھانے کے کافی مواقع ملے۔ جنگی ضروریات کے تحت پارچہ بافی کے کارخانوں کو اتنا کام حاصل ہو رہا ہے کہ ان کو چوبیس گھنٹے متواتر کام کرنا پڑتا ہے۔ اور آٹھ آٹھ گھنٹوں کی تین باریاں مقرر کی جارہی ہیں۔ اور اس لئے کارخانوں میں مزدوروں کی بھی غیر معمولی کھپت ہورہی ہے۔ حال ہی میں ایسٹرن گروپ سپلائی کونسل نے سوتی کپڑوں، واٹر پروفوں، تولیوں وغیرہ کی بہت بڑی مقدار کے لئے آرڈر دیا ہے۔

سن کی صنعت جنگ سے پہلے سن کی صنعت کو بڑے بڑے خطرات درپیش تھے۔ کیوں کہ جرمنی میں جو ہندوستانی سن کا سب سے بڑا خریدار تھا، سن کا بدل معلوم کرنے کی کوششیں ہورہی تھیں۔ جنگ چھڑنے کی وجہ سے جرمنی کا بازار ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور اس کی تجارت کو نقصان پہنچا لیکن جب سے سن کے کارخانے جنگی ضروریات کی تکمیل کررہے ہیں۔ اس صنعت کو کافی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ چنانچہ جنگ سے پہلے کی تجارت کے مقابلہ میں اب اس کی تجارت ۲۵ کروڑ روپیہ بڑھ گئی ہے۔ پہلے ڈھائی کروڑ ساٹھ لاکھ ریت کے تھیلوں کے آرڈر ملے تھے اور اب مزید ستر لاکھ تھیلوں کا آرڈر ایسٹرن گروپ سپلائی کونسل کی طرف سے ملا ہے۔

اونی صنعت گزشتہ جنگ عظیم تک اونی مصنوعات کے کارخانے تعداد میں پانچ سے زیادہ نہ تھے۔ لیکن موجودہ جنگ کی وجہ سے اس صنعت کو کافی فروغ ہوا۔ چنانچہ اونی مصنوعات کے کارخانے صرف جنگی ضروریات کی تکمیل میں مشغول ہیں اور ان میں رات دن کام ہورہا ہے۔ اور مزدوروں کی کھپت بھی غیر معمولی ہے۔

صنعت دواسازی۔ جنگ سے پہلے طبی ضروریات کی تکمیل کے لئے تقریباً تمام دوائیں باہر سے درآمد ہوتی تھیں خصوصاً

جرمنی اور انگلستان سے۔ جنگ کے چھڑنے کی وجہ سے باہر کی دواؤں کی درآمد تقریباً بند ہوگئی اور دوسری مصنوعات کی طرح صنعت دواسازی کو بھی ترقی کا موقع ملا۔ چنانچہ میڈیکل اسٹور سپلائی کمپنی نے اکثر دوائیں تیار کروانے کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ جہاں تک ہوسکے ہندوستان بیرونی دواؤں کا محتاج نہ رہے۔ چنانچہ تقریباً ۲۹۲ دوائیں بیرونی ممالک سے درآمد ہونے والی اشیا کی فہرست سے نکال دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ جنگی ضروریات کی تکمیل کے لئے بھی دوائیں تیار کی جارہی ہیں۔ چنانچہ فوجوں کے لئے وٹامن سی کے قرص ہندوستان ہی میں تیار کئے جارہے ہیں۔

چرم سازی جنگ کی وجہ سے چرم سازی کی صنعت کو بھی کافی وسعت ہوئی۔ خصوصاً گزشتہ ڈیڑھ سال کے عرصہ میں کثیر ملکی ضروریات کی تکمیل کے باوجود ہندوستان سے تقریباً ۱۲۵۰۰۰ جوتے ماہانہ برآمد کئے جارہے ہیں۔ جوتوں کی تیاری کے سلسلہ میں اکثر ضمنی مصنوعات ہندوستان میں نہ ہونے کی وجہ سے مشکلات کا سامنا ہورہا ہے۔ لیکن محکمہ رسد نے ان اشیا کو بیرون ملک سے منگواکر یہ دشواری حل کردی ہے۔ اب کوشش اس بات کی کی جارہی ہے کہ متعلقہ مصنوعات کو یہیں فروغ ہو۔ چرم سازی کی صنعت کے سلسلہ میں بھی بہت سے آرڈر ملے ہیں جن میں جوتے، دستانے وغیرہ شامل ہیں۔

کاغذ سازی کی صنعت بیشتر مصنوعات صرف اس بنا پر ترقی کررہی ہیں کہ ان کی ضرورت جنگ میں ہوا کرتی ہے۔ لیکن کاغذ سازی کی صنعت جنگی ضروریات کو پورا کئے بغیر ترقی کررہی ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی جنگ سے پیدا شدہ حالات کا کافی دخل ہے۔

جنگ سے پہلے ہندوستان میں تقریباً ۲۰ فی صدی کاغذ جرمنی اور آسٹریلیا سے اور ۲۴ فی صد ناروے اور سویڈن سے درآمد ہوتا تھا۔ جنگ چھڑتے ہی یہ درآمد بالکل بند ہوگئی۔ اور اس طرح اس صنعت کو ترقی کرنے کے مواقع پیدا ہوگئے۔ جنگ سے پہلے ہر مہینہ پانچ ہزار ٹن کاغذ تیار کیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ مقدار ترقی کرکے سات ہزار ٹن تک پہنچ چکی ہے۔ اور پندرہ کارخانے جو ہر سال ایک لاکھ ٹن کاغذ تیار کرسکتے ہیں۔ نہایت منافع کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کارخانے قائم ہورہے ہیں چنانچہ ریاست کشمیر میں ایک کارخانہ قائم ہورہا ہے اور خود حیدرآباد میں سرپور پیپر ملز بہت جلد اپنا کام شروع کردے گی۔

انجینیرنگ یہ صنعت ایک کلیدی حیثیت کی مالک ہے۔ ایک سو چالیس سے زائد کارخانے ہندوستان کے طول و عرض میں کام کررہے ہیں۔ اور کلکتہ ان کا مرکز ہے۔ کئی کارخانے پارچہ بافی کی مشینیں دخانی جہاز کے انجن اور مختلف مشینوں کے پرزے تیار کررہے ہیں۔

یہاں صرف چند بڑی صنعتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن کو جنگ کے دوران میں غیر معمولی فائدہ پہنچا۔ ان مصنوعات کے علاوہ اور کئی چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو جنگی آرڈر ملے ہیں اور انھوں نے بھی جنگ سے پیدا شدہ حالات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ چاقوؤں کے لئے بھی آرڈر ملے ہیں و نیز پلنگ، کرسیاں، وغیرہ تیار کروائے جارہے ہیں۔

حال ہی میں بنگلور میں ہوائی جہاز کا ایک کارخانہ قائم ہوا ہے۔ اس کارخانہ کے قیام کی وجہ سے ہندوستانی صنعتوں کی مستقل ترقی کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔

حسن الدین احمد

بین الاقوامی سیاسیات

آج کل کے اندوہگیں زمانے میں جب انسان خونخوار درندوں کی طرح دوسروں کے ملکوں پر حملہ کرنے، امن و امان سے رہنے والے مردوں، عورتوں، بچوں کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے اور انھیں بے دردی سے ختم کرنے، حکمیات اور فطرت کے مادّی مضمرات سے خود اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کرنے میں لگا ہوا ہے، جب خود ہمارے اپنے ملک ہندوستان میں بے اعتمادی کی آگ بھڑک رہی ہے، بین اقوامی سیاسیات کے موضوع پر تقریر کرنا بظاہر صدا بصحرا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن آج کل کی زندگی کے زمانے ہی میں اس کی ضرورت ہے کہ ہم کبھی کبھی شیخ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ کے اس عالی مطمح نظر کو سامنے رکھ لیا کریں جہاں انھوں نے کہا ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند   کہ در آفرینش زیک جوہر اند

چو عضوے بدرد آورد روزگار   دگر عضوہا را نماند قرار

یعنی اس تخیل کو بھی کبھی کبھی اپنے دل میں جگہ دے دیا کریں جس کے تحت ہمارا اعلیٰ ترین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے مفاد کے ساتھ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کو بھی مدنظر رکھیں۔ جس طرح ہم ایسے شخص کو جو صرف اپنے ذاتی عیش و عشرت میں لگا ہوا ہو اور دوسروں کے دکھ درد کی پرواہ نہ کرتا ہو، نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے اسی طرح ہمیں ان قوموں کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے جو محض اپنے ہی لئے جیتی ہیں اور اپنے مادی مفاد کو اپنا مقصدِ حیات بنائے ہوئے ہیں جس کے حصول کے لئے وہ دوسروں کو دھوکا دیکر یا ان پر جبر و زیادتی کرکے انھیں مغلوب کرنے کے درپے ہیں۔

یہ ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ حکمیات یعنی سائنس والوں نے مادی حقائق فطری کا تجسس کرکے بین اقوامی یا خالص انسانی تخیل کو بجائے ترقی دینے کے ایک زبردست دھکا لگایا ہے۔ اب جب کہ فاصلے اور وقت کا سوال اتنا اہم نہیں رہا اور ہم ہزار ہا میل پرے کی بات چشم زدن میں اپنے کانوں سے سن سکتے ہیں اور سیکڑوں میل فی گھنٹہ رفتار سے دنیا کے چاروں طرف چند روز کے اندر اڑان کر سکتے ہیں، ہونا یہ چاہیے تھا کہ ہر شخص کے دل میں بین اقوامی احساس پیدا ہو جائے اور کالے گورے، مشرقی مغربی، ایشیائی یورپی کا فرق باہمی صلح و آشتی میں کسی قسم کا نقص پیدا نہ کرے۔ اس کے برعکس حکمیاتی انکشافات کا نتیجہ بظاہر اس سے زیادہ نہیں نکلا کہ انسان نے اپنی انتہائی ترقی کا ماحصل یہ قرار دے لیا ہو کہ "دوسروں کو جانے دیجئے" خود اپنے ہی رنگ روپ، اپنے ہی مذہب، اپنے ہی تمدن والوں کو بیگانہ بنا دے اور اپنے جوع ارضی کی خاطر تمام اعلیٰ تصورات کو روند ڈالے۔ غور سے دیکھا جائے تو بین اقوامی تخیل ایک روحانی اور اخلاقی تخیل ہے اور اس میں اور محض مادی حکمیاتی انکشافات میں دور کا بھی واسطہ نہیں چنانچہ ہم ان انکشافات کو باہمی یک جہتی کے بجائے باہمی منافرت بڑھانے کے کام میں لا رہے ہیں۔

ایک شخص یا ایک قوم کی حرص و آز کی وجہ سے دنیا میں کشت و خون کا جو بازار گرم ہے اس کے باوجود آج بھی بہت سے

ایسے ہیں جو اس جنگ کے ختم ہونے پر دنیا کی حالت کو بہتر بنانے کی فکر میں ہیں۔ مثلاً ابھی چار پانچ مہینے کا عرصہ ہوا کہ لندن کے ایک مہربان ہمسفر یز صاحب نے جو انجمن نیابت متناسبہ (Proportional Representation Society) کے معتمد ہیں، اس بارے میں ایک گشتی مراسلہ چند ممالک کے مفکروں کے پاس بھیجا تھا اور ساتھ ہی میری بھی ناچیز رائے دریافت کی تھی کہ جنگ کے بعد دنیا کا سیاسی ڈھانچہ کس طرح کا بنایا جائے کہ بنی نوع انسان کے درمیان جو تناقض ہے وہ مٹ جائے۔ ہر جنگ میں ایک دو نہیں، ہزاروں بے قصور عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں، لاکھوں غریب بچے یتیم ہو جاتے ہیں، کروڑوں اپنے گھر مسمار ہوتے ہوئے اور جو کچھ اپنا سمجھتے تھے اسے برباد ہوتا ہوا دیکھتے ہیں، اور ان سے بھی زیادہ محض وہ لے کر جو اپنے کندھوں پر اٹھا سکیں، باقی سب کچھ چھوڑ کر کسی دوسرے شہر اور دوسرے ملک کو ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بہیمانہ صورت حالی کے خلاف ہر جنگ کے بعد ایک ردِ عمل ضرور ہوتا ہے۔ جس کا فوری نتیجہ لڑنے والے فریقوں کے درمیان مصالحت کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ اگر جنگ عالمگیر ہو تو عام خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح آئندہ جنگ کے تخیل ہی کا خاتمہ کر دیا جائے اور مستقل امن و امان، صلح و آشتی کی سبیل نکالی جائے۔

اس سے بھی زیادہ مبارک ایسے لوگوں کے نتائج فکر ہیں جو بغیر ایسے ردِ عمل کے ہی اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ انسان میں کس طرح انسانی جذبہ قایم ہو سکے اور وہ اپنے بھائی کا خون پینے سے کیسے باز رہ سکے۔ دنیا میں یہ جذبہ کہ بنی آدم میں، خواہ کہیں رہتے ہوں، کسی نسل سے پیدا ہوں، کسی رنگ روپ کے ہوں، یگانگت ہونی چاہیئے، برابر کارفرما رہا ہے اور ہمیشہ اس کی کوشش ہوتی رہی ہے کہ ایسے قواعد بن سکیں جن کے ذرایع سے انسان میں اپنے بھائی کے خلاف شیطانی جذبات میں کچھ کمی پیدا ہو جائے۔ یہی وہ قواعد ہیں جنھیں مجموعی طور پر بین اقوامی قانون کا لقب دیا جاتا ہے اور جنھیں ہماری آنکھوں دیکھتے، جاپان اٹلی اور جرمنی کے اقدامات نے بالکل نیست و نابود کر دیا ہے۔

نظری اعتبار سے سب سے پہلا شخص جس نے بین اقوامی سیاسیات اور بین اقوامی قانون کو ایک جداگانہ فن کا رتبہ دیا وہ ولندستان کا باشندہ گروتیوس تھا جس نے ۱۶۲۵ء میں اپنی کتاب "قانون جنگ و امن" لکھ کر ایک نیا اور وسیع میدان قائم کر دیا۔ گروتیوس کا زمانہ یورپ میں مذہبی جنگوں کا زمانہ ہے۔ جب ہندوستان میں اکبر اعظم فتحپور سیکری کے دیوانِ خاص کی اونچی نشست پر بیٹھ کر (جو ہندوستان کی بین قومی صلح و آشتی کے زمانے پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے کے لئے آج تک باقی ہے) تمام مذاہب کے سرگروہوں سے اپنے اپنے مذہبی عقائد کے موافق دلائل و براہین ٹھنڈے دل سے سنتا، اس زمانے میں براعظم یورپ دو بلکہ تین عظیم الشان کمیٹیوں میں بٹا ہوا تھا اور بیسیوں سال تک مذہب کے نام پر بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا۔ گروتیوس پر جنگوں اور ان جنون آمیز خون ریزیوں کا بہت بُرا اثر پڑا اور اس نے محسوس کیا کہ گو جنگ کا خاتمہ تو ممکن نہیں، اس کی شدت کو کم ضرور کیا جا سکتا ہے، چنانچہ اس نے اس احساس کے تحت بین اقوامی نظریہ کی بنیاد رکھی۔

مفکرین کے خیالات کو نظر انداز کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ لڑنے والوں کے درمیان کسی نہ کسی طرح کا سلوک ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ قدیم یونان بیسیوں چھوٹی چھوٹی شہری مملکتوں میں منقسم تھا اور ایک مملکت کا دوسری سے جو برتاؤ رہتا تھا وہ فی الجملہ خوش گوار تھا۔ اگر جنگ کا موقع آتا تو پہلے باضابطہ اعلان جنگ کر دیا جاتا اور بعض اشخاص و اوارات مثلاً ندا اور بت خانے محفوظ

سمجھے جاتے تھے۔ یونان کے بعد روما کا زمانہ آتا ہے۔ گو رومن سلطنت کے حدود ایک طرف ایران سے تو دوسری طرف اسکاچستان سے ٹکرکھاتے تھے۔ اور مشکل سے قرب وجوار کا کوئی ملک ایسا ہوگا جس پر اس سلطنت کا پرچم نہ لہراتا ہو تاہم یہاں بھی جنگ و امن کے لئے خاص خاص ضابطے مقرر تھے۔ رومن لوگ قوانین کے بڑے دلدادہ تھے، چنانچہ انھوں نے جنگ جیسے ادارے کو بھی قانونی جامہ پہنا دیا تھا اور یہ اصول قرار دے دیا تھا کہ جنگ صرف اس صورت میں جائز سمجھی جائے گی کہ کوئی قوم رومن سرحدوں یا سفیروں پر حملہ کرے یا عہدناموں کو توڑے یا رومنوں کے دشمنوں سے جا ملے۔ اگر رومنوں کو ہتھیار اٹھانے پڑتے تو جنگ کا خاتمہ صرف اس طرح ممکن تھا کہ رومن دشمن کے ملک پر قبضہ کرلیں ورنہ فریق ثانی ہتھیار ڈال دے یا پھر وہ رومنوں کا حلیف بن جائے۔

سنہ واری اعتبار سے رومن قانون کے بعد قانونِ اسلام کا زمانہ آتا ہے، اور جیسے اسلام نے ہر دوسرے انسانی ادارے میں عظیم الشان انقلاب برپا کیا ویسے ہی بین اقوامی طرزِ عمل میں بھی بدیہی تبدیلیاں کیں۔ جس زمانے میں دنیا کے سامنے اسلامی اصول پیش کئے گئے ہیں وہ ایسا زمانہ تھا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم جنگ آزما قوموں، فرقوں، گٹھوں، اور طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرؤں کو صرف اس وقت جنگ کی اجازت دی گئی کہ مخالفین ان پر ظلم و زیادتی کریں، اور حکم دیا گیا کہ جنگ صرف ان لوگوں کے خلاف لڑی جائے جو مسلمانوں پر ظلم ڈھائیں، نیز یہ بھی ہدایت کی گئی کہ فتنے کے ختم ہوتے ہی تلوار نیام میں ڈال دی جائے۔ جو غیر مسلم مسلمانوں کے حلیف ہوں ان سے کسی صورت میں عہد شکنی کی ابتدا نہ کی جائے، اور انھیں اپنا دوست سمجھا جائے۔ اسلام نے جو اصلاح جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک میں کی وہ بنی آدم پر اس کا بڑا بھاری احسان ہے۔ جنگ بدر پہلی لڑائی ہے جس میں اس قاعدے کی ابتدا کی گئی کہ جنگی قیدیوں کو آرام و آسایش سے رکھنا چاہیے اور ایک قلیل معاوضے یا چھوٹی سی خدمت لے کر انھیں چھوڑ دیا جائے (انسانیت کا یہی سبق تھا جسے سیکھ کر وہی عرب جن کے مرد تو مرد عورتیں بھی زخمیوں پر ترس نہ کھاتی تھیں اور مقتولوں کے ناک کان کاٹنے اور ان کا کلیجہ نکال کر چبا جانے میں مضائقہ نہ سمجھتی تھیں، ایسے شریف مزاج بنا دیے گئے کہ جب پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوئے تو انھوں نے اپنے مقدس پیشوا کے احکام کی اطاعت پر ان ظالموں میں سے کسی کو ہاتھ تک نہ لگایا جنھوں نے آٹھ سال پہلے ان پر انتہائی ظلم ڈھاکر ان کے جنم بھوم سے نکال دیا تھا)

جہاں تک یورپ کا تعلق ہے، رومن نظام کا ڈھانچا جزوی تبدیلیوں کے ساتھ پندرھویں صدی عیسوی تک قایم رہا، لیکن اس صدی کے وسط میں فرانس، انگلستان، اسپین اور ایسی ہی دوسری مملکتوں کے قیام کی وجہ سے عالمگیر سلطنت کے تخیل کو بڑا دھکا لگا۔ نپولین نے تقریباً تمام یورپ فتح کرلیا تھا اور اس کے زوال کے بعد جنگ کے خلاف ایک ردِ عمل شروع ہوا، چنانچہ زارِ روس نے ایک "مقدس محالفے" کی بنیاد ڈالی۔ انیسویں صدی کے خاتمے سے سنہ ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ بین اقوامی تخیل میں ترقی کا زمانہ تھا۔ زارِ روس کے طلب نامے پر سنہ ۱۸۹۹ء اور سنہ ۱۹۰۷ء میں ولندستان کے پائے تخت ہیگ میں جو بین اقوامی کانفرنسیں ہوئیں انھوں نے ایک بین اقوامی ثالثی کا محکمہ قائم کیا۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں جنگ روس و جاپان کے بعد اسی مقام پر ایک تیسری کانفرنس ہوئی جس میں قانون جنگ پر مفصل بحث ہوئی اور انگلستان کی دعوت پر سنہ ۱۹۰۹ء میں لندن میں ایک اسی طرح کی کانفرنس نے بحری جنگ کے متعلق قواعد

بنلانے۔ اسی زمانے میں بہت سے بین اقوامی ادارے بھی قایم ہوئے جیسے سنساری اتحاد تار برقی، سکوں، اوزان، پیمانوں وغیرہ کی یکسانی کے معاملے، صلیب احمر اور ہلال احمر کی بین اقوامی انجمن اور ایسی ہی دوسرے ادارات۔

جنگ عظیم کے دوران میں بین اقوامی ہیئتوں کو بڑا دھکا لگا اور ان میں سے اکثر ادارے کالعدم ہوگئے۔ وڈرو ولسن کے مشہور ۱۴ نقاط جو مغلوب اور پست جرمنی کے سامنے پیش کئے گئے تھے، سب کو معلوم ہیں۔ ان میں شاید سب سے اہم نقطہ ایک ایسی انجمن کے قیام کی تحریک پر مشتمل تھا جس کے ذریعے سے ولسن کے زعم میں تمام ملکوں کی سیاسی آزادی اور علاقہ جاتی خود مختاری کی ضمانت ممکن تھی کسی زمانے میں اس انجمن کا بڑا زور شور تھا۔ گو امریکہ والوں نے اپنے صدر کا ساتھ نہیں دیا اور اس انجمن سے الگ رہے لیکن اس ملک کے علاوہ وقتاً فوقتاً دنیا کی ہر مملکت اس میں شریک رہی اور اس میں شرکت ایک فخر کی بات سمجھی جانے لگی۔ اس کے ادارات میں ایک کونسل بمنزلہ کابینہ، ایک اسمبلی بمنزلہ مقننہ، ایک معتمدی اور ایک عدالت تھی اور یہ خیال پیدا ہوچلا تھا کہ بین اقوامی ہیئت مملکتی سیاسی ہیئت کی طرح ہوجائے گی۔ اس کا موازنہ تقریباً دو کروڑ روپیہ سالانہ کا تھا جو ہر مملکت کی اہمیت کے اعتبار سے تقسیم کیا جاتا تھا۔ خود ہمارا ہندوستان اس کا رکن ہے اور شاید اب بھی کئی لاکھ روپیہ سالانہ چندہ ادا کرتا ہے۔ اسی انجمن نے مفتوحہ ممالک کے حصے بخرے کرکے یورپ میں ایک حد تک قومیت کے اصول پر ان کی تقسیم کردی اور یورپ سے باہر انہیں اپنے بڑے بڑے موئدوں یعنی انگلستان فرانس، جاپان اور بلجیم کے درمیان تقسیم کردیا لیکن اس انجمن کے ڈھانچے میں سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ خود اس کے ارکان میں خود غرضی بھری ہوئی تھی اور بہت جلد یہ محسوس ہونے لگا کہ بین اقوامی مفاد کو کسی فوری قومی خطرے پر قربان کیا جاسکتا ہے۔ جب جاپان نے بغیر کسی واقعی سبب کے منچوریا پر قبضہ کرلیا تو سوائے ایک تحقیقاتی کمیشن بھیجنے کے انجمن اقوام نے کچھ نہ کیا۔ اس سے منافقوں کے حوصلے بڑھ گئے اور اٹلی نے حبش کے خلاف فوج کشی کرکے دنیا کی اس نہایت قدیم سلطنت کا خاتمہ کردیا۔ معاشی مقاطعے کی تہدیدیں عائد کرنے پر بڑی بڑی تقریریں ہوئیں اور قرار دادیں منظور کی گئیں، لیکن عمل کے فقدان کی وجہ سے اٹلی پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوا۔ اب پہلے جاپان، پھر اٹلی اس کے بعد جرمنی انجمن اقوام سے علیحدہ ہوگئے اور اس کی رکنیت کو بجائے اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھنے کے اپنی توہین تصور کرنے لگے۔ اس کے بعد جو ہوا وہ حال کے واقعات ہیں۔ آسٹریا، چیکوسلوفاکیہ، پولستان، فنستان، بلجیم، ولندیزستان ڈنمارک، ناروے، کس کس کا قصہ دہرایا جائے۔ اب سنا ہے کہ انجمن کے معاشی اور طبی ادارے امریکہ منتقل ہوگئے ہیں۔ سیاسی ادارے علم نہیں کہ کہاں ہیں۔

حقیقت میں، جیسا ایک بڑے عالم نے کہا ہے، بین اقوامی قانون صرف اس وقت قائم رہ سکتا ہے جب کسی مملکت کو کسی دوسری مملکت پر غیر معمولی تفوق نہ ہو، اور بین اقوامیت کا احساس اسی وقت ممکن ہے جب عمومیت کا راج ہو اور مختلف مملکتیں ایک ہی اخلاقی معیار پر پہونچ جائیں۔ آمریت ایک غیر ذمہ دار ادارہ ہے جس کے ساتھ بین اقوامی ذمہ داری کا احساس باقی نہیں رہتا۔ بین اقوامی سیاسیات کا دارومدار باہمی رواداری، باہمی مساوات اور اخلاقی برتری پر ہے، اور اس وقت تو ان میں سے ایک چیز بھی نظر نہیں آتی۔

ہارون خاں شروانی

کلی مملکت

قرون وسطیٰ میں قومی مملکت کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ اس زمانے میں صرف بادشاہت، سلطنت، شہر اور جمہوریت زیر بحث آتی اور جب لوگ طاقت پر خیال آرائی کرتے تو صرف روحانی اور سنساری دو طاقتیں ان کے پیش نظر ہوتیں۔ اس میں شک نہیں کہ قرون وسطیٰ کے لوگوں میں 'جماعت' اوارے یا انجمن کا ایک دھندلا سا تصور پایا جاتا تھا لیکن یہ کہنا کہ وہ ان اصطلاحات کے موجودہ مفہوم سے واقف اور ان پر کار بند تھے صحیح نہ ہوگا۔ جن معنوں میں مملکت کا لفظ آج برتا جاتا ہے اس سے یہ لوگ ناآشنا تھے۔ تصور مملکت صرف دور اصلاح اور اس کے بعد کی پیداوار ہے۔ مملکت یا اسٹیٹ کا لفظ سب سے پہلے اطالیہ میں استعمال ہوا جس کے معنی استقرار قوت کے ہوتے تھے۔ بعد میں اس مملکت کو بادشاہ کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا اور یہ مملکت کا اولین تصور تھا جسے مکیاولی نے پیدا کیا۔ مکیاولی کے خیال میں بادشاہ اپنی رعایا کا مالک تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ سیاسیات کو 'مذہب اور اخلاقیات سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ وہ مذہبی معاملات میں بھی مملکت کو 'جو بادشاہ کی ذات سے قائم تھی' مقتدر سمجھتا تھا۔ اس کے بعد لوتھر نے بادشاہ کو مذہبی اختیارات بھی دے دیے اور اس طرح بادشاہ کو ایک بڑی ذی اقتدار ہستی سمجھا جانے لگا۔

مکیاولی اور لوتھر دونوں کے نظریے سب کے لئے قابل قبول نہیں تھے۔ چنانچہ اسی کا اثر تھا کہ "اقتدار اعلیٰ" کا نظریہ وجود میں آیا جو سترھویں صدی کے اواخر تک عام طور پر قبول کیا جانے لگا لیکن مملکت اور اقتدار اعلیٰ کے تصور میں یہ بات بہت قابل لحاظ ہے کہ صرف بادشاہ کو مقتدر اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ اور اقتدار اعلیٰ کی کم و بیش خدائی صفات تصور کی جاتی تھیں۔ مگر جب ہابز نے "قانون قدرت" کا نظریہ پیش کیا تو اقتدار اعلیٰ کے متعلق پچھلے اعتقادوں میں تھوڑی سی تبدیلی ہوگئی ہابز کا خیال یہ تھا کہ چونکہ عوام اس قابل نہ تھے کہ خود اپنے لئے قانون سازی کر سکیں انھوں نے اپنے اس اختیار قانون سازی کو اپنے ایک سردار کے تفویض کر دیا اور یہ سردار بعد کو چل کر موروثی بادشاہ بن گیا۔ اس کے برخلاف ایک انقلابی مفکر روسو نے اقتدار اعلیٰ کے متعلق ایک نیا تصور پیدا کیا یعنی روسو نے یہ بتایا کہ دراصل عوام کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے اور اس تخیل نے عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ ایک مطلق اقتدار اعلیٰ تھا لیکن یہ عوام کے چند منتخب یا نامزد کئے ہوئے نمائندوں کو حاصل رہا۔ اقتدار اعلیٰ کی اسی تفویض کا نام دوسرے الفاظ میں عمومیت ہے۔

پچھلی صدی میں جرمنی سے تین ایسے مفکر اٹھے جنھوں نے مملکت کے تصور میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ میری مراد ہیگل فشٹے اور مارکس سے ہے۔ انھوں نے مملکت کا وہ تصور پیدا کیا جو آج عام طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ نیز انھوں نے قوم اور جماعت کی اہمیت کو بھی واضح کر دیا۔ جس کا اثر یہ ہے کہ آج علم سیاسیات میں مملکت اور قوم کے خاص معنی ہوگئے ہیں۔ لیکن بیسویں صدی کی دو بڑی یورپی جنگوں کے درمیانی زمانے میں یعنی سنہ ۱۹۱۸ء اور سنہ ۱۹۳۹ء کے درمیان کلی مملکت کا ایک بالکل نیا تصور پیدا ہوا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیاست کے تین نئے نظام منظر عالم پر آ گئے۔ یعنے بالشویک روس، فاشستی اطالیہ اور نازی جرمنی۔ یہ تین نئے نظام جو آپس میں

مختلف بھی ہیں، کلی مملکت کی نمایاں مثالیں ہیں جو تاریخ یورپ میں اپنی ہنگامہ آرائیوں اور معرکہ خیزیوں کے ساتھ ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

اطالیہ جرمنی یا روس کی مثالوں میں مملکت کی جو صورت ہمیں نظر آتی ہے وہ بالکل ہمارے زمانے کی چیز ہے۔ گویا بابل اور آسٹریا میں مملکت کے اس طرز کی تھوڑی سی جھلک نظر آتی ہے اور انقلاب فرانس کا مطالعہ کرنے والوں کو جیکوبنوں کی ایک اور مثال نظر آتی ہے جو کلی مملکت کے اولین پرستار معلوم ہوتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ مملکت کو اس نئے ڈگر پر ڈال دینے کا کام بیسویں صدی کے آمروں ہی نے انجام دیا۔ اصول کے لحاظ سے فاشستی مملکت سب سے پہلے ہماری توجہ کا مرکز بن جاتی ہے جو کلی مملکت کی اچھی مثال ہے۔ ایک مشہور آمر کا قول ہے: "مملکت کے باہر یا مملکت سے اعلیٰ کوئی چیز نہیں۔ مملکت کے خلاف کوئی چیز نہیں۔ ہر چیز مملکت کے اندر اور ہر چیز مملکت کے لئے۔"

موجودہ کلی مملکتوں کا ظہور کم و بیش ایک ہی طرح ہوا۔ یعنی مملکت کی حکومت پر ایک سیاسی جماعت نے زبردستی قبضہ کرلیا اور پوری قوم کو اپنے اصول، نظریوں اور لائحہ عمل پر چلانے کی کوشش کی۔ پارلیمنٹی قسم کی عمومی مملکتیں تو غیر شخصی اور غیر جانب دار ہوتی ہیں، جو کسی ایک جماعت یا مختلف جماعتوں کے اتحاد عمل سے کام کرتی ہیں۔ لیکن جب ایک سے زیادہ جماعتیں مل کر حکومت چلانے لگتی ہیں تو ان کے آپس میں منافشات اور اندرونی کشمکش ایک نہ ایک دن، رنگ لاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ لیکن نازسی، فاشستی یا اشتراکی حکومت میں چونکہ ایک ہی جماعت حکومت کی باگ کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں رکھتی ہے مملکت کی حکومت میں کسی قسم کی کمزوری جلد پیدا ہونے نہیں پاتی۔ اور حاکم جماعت کا رہنما اقتدار اعلیٰ کو پوری طرح اپنی ذات میں مرکوز کرلیتا ہے۔ پچھلے زمانے میں شہنشاہوں یا آمروں نے غیر محدود اختیارات ضرور حاصل کرلئے تھے لیکن قوم کے تمام سیاسی، معاشی اور نفسیاتی ذرائع اور فوج اور پولس سے کام لے کر اپنے منشا کے مطابق ان سے فائدہ اٹھانا صرف روس، جرمنی اور اطالیہ کے آمروں کا حصہ ہے۔ جو دنیا کی تاریخ میں پہلی نظیر ہے۔

اس موقع پر یہ دیکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ روس اطالیہ اور جرمنی، ان تین، تمثیلی کلی مملکتوں کے رہنماؤں میں اس نئی مملکت کے متعلق کس قسم کا احساس ہے۔ مسولینی نے اپنی کتاب "فاشسیت" میں لکھا ہے کہ "فاشستی تصور حیات خلاف انفرادیت ہے اور صرف مملکت ہی کو سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ فرد مملکت کو صرف اسی حد تک تسلیم کیا جاتا ہے جب تک کہ اس کا مفاد مملکت کے مفاد کے مترادف ہے۔ فاشسیت کا تصور یہ ہے کہ افراد، مملکت کی ملک ہیں۔ اس لئے ان سے ہر قسم کا کام لینے اور ہر طرح کا فائدہ حاصل کرنے کا، مملکت کو حق ہے۔ فاشسیت مملکت کی آزادی کی حامل ہے، لیکن انفرادی آزادی کا اس نے خاتمہ کردیا ہے۔ اور مملکت کی آزادی افراد کی آزادی کی آئینہ دار سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ مملکت اپنے فائدے کے لئے افراد کو ایک خاص ڈگر پر چلاتی ہے اور اس طرح قوم کی پوری حیات اجتماعی کو، طاقت کی مدد سے ایک خاص سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس کے برخلاف، جرمنی کی نازسی مملکت اپنے نظریوں کے اعتبار سے ایک حد تک مختلف ہے۔ مسولینی نے تو صرف مملکت کو مانا اور اس کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے لیکن ہٹلر نے، ہیگل کے اس نظریہ کی سخت مخالفت کی کہ مملکت کی پرستش

کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس نے ۱۹۳۴ء میں قومی اشتراکی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہم مملکت کے مالک ہیں" اس کے
خیال کے مطابق اقتدار کا منتہا مملکت نہیں بلکہ نازی جماعت اور اس کا رہنما ہے۔ اس تخیل کا نتیجہ یہ ہے کہ ناتسی جماعت
اور اس کے رہنما نے غیر محدود اختیار مختتم بٹور لیا۔ اور جرمن مملکت ناتسی جماعت کا آلۂ کار بن کر رہ گئی۔

مملکت کو ایک طرف مسولینی نے قابل تعظیم اور مقدس ہستی تصور کیا اور دوسری طرف ہٹلر نے اس کو ایک جماعت کے ماتحت
کر دیا لیکن ہمیں ایک تیسرا شخص ایسا بھی نظر آتا ہے جس کا ایک جداگانہ تصور ہے۔ یہ کارل مارکس ہے جس نے سوویٹ مملکت
کا ایک نیا تصور پیدا کیا تھا۔ سوویٹ مملکت کے سیاسی اصول اور نظریوں کی تفصیل میں جانا اس وقت ممکن نہیں لیکن یہاں کارل مارکس
کا یہ خیال یقیناً قابل لحاظ ہے کہ اگر ارذلیہ کو پوری طرح سیاسی اقتدار حاصل ہوجائے تو پھر مملکت کا یہ نیا پودا مرجھا جائے گا
اور بہت جلد سوکھ جائے گا۔ لینن کا یہ خیال تھا کہ مملکت اس قدر جلد ختم نہ ہوگی بلکہ مملکت کا یہ نیا پودا اس وقت جل جائے
گا جب اشتمالیت پوری طرح رائج ہوجائے۔ لینن کے موجودہ جانشین اسٹالن کا خیال ہے کہ روس میں اشتمالیت کو جگہ نہ
مل سکی بلکہ وہاں اشتراکیت قائم ہے۔ اور اسٹالن نے مارکس کے بہت سے اصولوں کو چھوڑ کر روس کی کشتیٔ حیات کو ایک
نئے راستے پر ڈال دینے کی کوشش کی ہے۔

کلی مملکت کا بنیادی تصور یہ ہے کہ افراد کی نسبت مملکت کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ کیونکہ مملکت کی ہر جہتی ترقی اور
اس کی آزادی دراصل افراد مملکت کی آزادی ہے۔ اور اگر مملکت کو گھن لگ جائے اور رفتہ رفتہ اس کا وجود ہی خطرے
میں پڑ جائے تو افراد مملکت کی انفرادی آزادی شرمندۂ معنی نہیں رہتی۔ کلی مملکت کا نظریہ یہ ہے کہ افراد کی حیثیت خلیوں
کی ہے جن کا وجود صرف اسی وقت تک رہتا ہے جب تک کہ یہ خلیے پورے عضویہ کے ساتھ وابستہ رہیں اور عضویہ کی بقا کے لئے
ان خلیوں کا وجود اور ان کے افعال بھی ضروری ہیں لیکن جب یہ خلیے جاندار عضویہ سے جدا ہو کر اپنی علحدہ زندگی گزارنے کی
کوشش کریں تو اس کا نتیجہ خلیہ کی موت اور پھر اصل عضویہ کا اختتام ہے یعنی دوسرے الفاظ میں "فرد قائم ضبط ملت سے ہے
تنہا کچھ نہیں" اس تصور کا اثر یہ ہے کہ کلی مملکت میں افراد کی آزادی تسلیم نہیں کی جاتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جرمنی اور اٹلی
میں ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ تقریر، تحریر یا مطبع کی آزادی کوئی چیز نہیں۔ سماجی، معاشی، معاشرتی
حتیٰ کہ مذہبی امور میں بھی افراد مملکت کو مملکت کے بتائے ہوئے اصول پر چلنا پڑتا ہے۔

روس کی سوویٹ حکومت نے جو کلی مملکت کی سب سے پہلی مثال ہے، حیات قومی کے ہر شعبہ پر پوری طرح قابو پانے کی،
سب سے زیادہ کوشش کی ہے۔ چنانچہ روس میں صنعتی ذہنیت پیدا کرنے کے لئے ادب اور فن کاری سے بھی کام لیا گیا۔
روس میں مطبع کو کسی طرح کی آزادی نہیں۔ تعلیم مملکت کے بتائے ہوئے اصول سے ہٹ کر نہیں ہوتی۔ معاشی زندگی پر
قابو پانے کے لئے جرمنی اور اطالیہ کی نسبت روس نے زیادہ کوشش کی اور مملکت کی ضروریات کے لحاظ سے پیداوار پر
بھی نگرانی رکھی گئی۔

اطالیہ اور جرمنی بھی بڑی حد تک روس کی طرح ہر شعبۂ زندگی پر اپنا قابو رکھتے ہیں اور ان مملکتوں نے روس سے صرف

اس حد تک اختلاف کیا ہے کہ افراد کی خانگی جائداد کو ان سے چھینا نہیں بلکہ اسے بڑی حد تک محدود کردیا۔ لیکن اطالیہ، جرمنی اور روس تینوں میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ان مملکتوں نے اپنے معاشی ذرائع کو پوری طرح اپنے قابو میں کرلیا اور اپنی مملکت کو صنعتی بنانے کی کوشش کی۔ یہ تینوں مملکتیں خود کفیل اور مسلح ہوگئیں۔ اور اپنی فوجی طاقت کو بڑھانے کی امکان بھر کوشش کی اور ہر مملکت کا یہ مطمح نظر رہا کہ اپنی طاقت کے بل پر پوری دنیا پر چھا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ یورپ کی ان تینوں کلی مملکتوں میں اصول اور نظریوں کے لحاظ سے، باہم اختلافات بھی ہیں۔ لیکن یہ مملکتیں بعض وقت اپنے اختلافات کو مشترک مفاد کی خاطر پس پشت ڈال دیتی ہیں اور آپس میں اتحاد کرلیتی ہیں اور بعض وقت ایک دوسرے کی مخالفت پر آمادہ ہوجاتی ہیں۔ جرمنی اور اطالیہ میں تو ایک عرصہ سے دوستی قائم ہے اور ان دونوں مملکتوں نے ایک محور بنا کر یورپ میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ مگر ۲۲ رجون ۱۹۴۱ء کو جب جرمنی نے روس پر حملہ کردیا تو دنیا کو یہ معلوم ہوا کہ ان تینوں کے درمیان رشتۂ اتحاد، محض موقتی فائدے کے لئے تھا۔ اب کلی مملکتوں کے ارکین میں سے، جرمنی اور اطالیہ ایک طرف اور روس دوسری طرف کھڑے ہوگئے ہیں اور سوویٹ اور نازیت کے درمیان ایک محشر خیز جنگ برپا ہے جس کے بڑے دوررس نتائج ہوں گے۔

کلی مملکت کے مستقبل پر غور کرنے کے لئے موجودہ جنگ یورپ کی رفتار پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ یورپ میں ہٹلر کی پچھلی کامیابیوں کا یہ اثر ہے کہ ایک طرف اسپین اور پرتگال کی عمومی حکومتیں ختم ہوگئیں اور وہاں آمروں کا راج قائم ہوگیا ہے تو دوسری طرف ہٹلر کی فتح مند فوجیں جس جگہ بھی گئیں وہاں یا تو عمومیت ختم ہوگئی یا اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہی ہے چنانچہ فرانس سے لیکر روس کی سرحدوں تک جتنے ملک جرمنوں کے ہاتھ میں آئے وہاں آمریت اور اس کے لوازمات یعنی "ظلم و زیادتی" کا دور دورہ ہوگیا غالباً فتوحات کا یہی نشہ تھا جس نے ہٹلر کو روس پر حملہ کرنے کی طرف مائل کردیا۔ اب یورپ کی دو مختلف کلی مملکتوں کے مابین، اور یورپ کی دو بڑی آمریتوں کے درمیان، جنگ ٹھنی ہوئی ہے۔ اس جنگ کے نتائج پر کسی قسم کی پیش قیاسی ممکن نہیں لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ روس اور جرمنی کی اس جنگ کے دو نتائج یقینی ہیں یا تو روس کو فتح ہوگی یا جرمن فوجیں روس پر چھا جائیں گی۔ اگر روس کو فتح ہوجائے تو ظاہر ہے کہ نازیت کا مستقبل بہت تاریک ہوجائے گا۔ اور دنیا کی عمومیتیں جو اس وقت نازیت کے خلاف برسرِ پیکار ہیں ہٹلریت کا خاتمہ کرکے چھوڑیں گی۔ نازی جرمن کے خاتمہ کے بعد ظاہر ہے کہ روس کو بھی اپنی کلی مملکت کی توسیع کے کچھ زیادہ مواقع حاصل نہ رہیں گے۔ اس کے برخلاف اگر روس، جرمنی کے مقابلہ میں ہار جائے تو پھر عمومیتوں کو نازی طاقت سے بڑا خطرہ رہے گا۔

——— عبدالحفیظ صدیقی

ضروری اطلاع:۔

نیا سال شروع ہوچکا ہے۔ جن اصحاب نے نئے سال کا چندہ اب تک روانہ نہیں فرمایا وہ براہ کرم منی آرڈر سے بھیجدیں یا دفتر سے وی پی آنے پر حاصل کرلیا جائے۔ بلدہ کے خریدار دفتر ہذا کے ملازم سے باضابطہ رسید حاصل کرکے چندہ ادا فرمائیں۔

ہندوستان کے معدنی ذخیرے

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ آج سے ہزارہا سال قبل ہندوستان کا کپڑا، رنگ اور مسالہ قیمتی اشیاء میں شمار ہوتا اور دیگر ممالک میں جا کر بکتا تھا، لیکن شاید زیادہ لوگ اس سے واقف نہ ہوں کہ اس سے بہت قبل اس زمانے میں جب کہ مصر، یونان اور روما کے تمدن انتہائی عروج پر تھے، یہاں کے کارخانوں میں ہندوستان کی معدنیات استعمال ہوتی تھیں۔ لیکن جب دوسرے ممالک میں معدنیات اکتشاف ہونے لگیں اور پرانے طریقوں سے ہندوستان میں معدنیں زیادہ مقدار میں نہیں نکالی جانے لگیں تو یہاں کی معدنیات کی مانگ کم ہوتی گئی اور بتدریج ان کی طرف سے توجہ ہٹ گئی۔

۱۸۱۴ء سے پھر معدنیات کی کان کنی شروع ہوئی۔ معدنیات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا شوق بڑھتا گیا اور بتدریج صنعتی ملکوں کو معلوم ہوگیا کہ ہندوستان سے اہم اہم معدنیات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس مانگ کی بدولت ہندوستان میں معدنیات کی پیداوار بڑھتی گئی۔ چنانچہ اس وقت ۳۵ کروڑ سے زیادہ مالیت کی معدنیات ہر سال زمین سے نکالی جاتی ہیں۔ لیکن یہ مقدار جو بظاہر کثیر معلوم ہوتی ہے اس ملک کے معدنی ذخائر کی ایک نہایت چھوٹی سی کسر ہے۔

ہندوستان کی مشہور معدنیات لوہے کی کچ دھات، کوئلہ، منگنیز کی کچ دھات اور ابرک ہیں

لوہے کی کچ دھات

زمانۂ قدیم میں ہندوستان کے لوگ کچ دھاتوں سے دھات حاصل کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے چنانچہ ہندوستان کا فولاد عیسوی سنہ کے آغاز سے بہت پہلے مشرق قریب کے ممالک کے بازاروں میں فروخت ہوتا تھا اور ان سے وہ پھل بنائے جاتے تھے جو دمشقی پھل کے نام سے مشہور تھے۔

ہندوستانیوں کی اس فن دانی کا ثبوت لوہے کے اس ستون سے بھی ملتا ہے جو دہلی میں قطب مینار کے قریب نصب ہے۔ اس کا طول ۲۴ فٹ قطر ایک فٹ اور وزن ۶ ٹن ہے۔ چوتھی صدی عیسوی میں بنا ہے اور لوہے کا خالص ترین نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں لوہا ہندوستان میں دیہاتوں میں گھریلو صنعت کے طور پر تیار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اکثر مقامات پر لوہے کی بھٹیوں اور بھٹیوں کے میل کے آثار پائے جاتے ہیں۔ جب مغرب کے ممالک میں جدید طریقوں سے لوہا تیار ہونے لگا تو اس ملک کی لوہے کی صنعت کو صدمہ پہنچا، اور یہ تقریباً معدوم ہوگئی۔

لوہے کی کچ دھات تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ لیکن لوہا حاصل کرنے کے لئے صرف ایسی کچ دھاتیں کارآمد ہوسکتی ہیں جن میں لوہے کا تناسب ۶۰ فی صد سے کم نہ ہو۔ اعلیٰ قسم کی کچ دھات بہار، اوڑیسہ، مشرقی ریاستوں (EASTERN STATES) درگ، چانڈا، عادل آباد اور میسور میں کثیر مقدار میں پائی جاتی ہے۔

اس ملک میں گزشتہ چند سال میں لوہے کی صنعت میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس صدی کے آغاز میں لوہے کی کچ دھات کی پیداوار ۶۵ ہزار ٹن سالانہ تھی اور اب ۳۰ لاکھ ٹن سالانہ ہے جس سے ۱۸ لاکھ ٹن لوہا حاصل ہوتا ہے، اور اس صنعت کے

اعتبار سے برٹش امپائر میں ہندوستان کا نمبر دوسرا ہے۔ یہاں کی کچ دھات ممالک متحدہ امریکہ کی کچ دھات سے بہتر ہے، اور اس کا ذخیرہ ممالک متحدہ امریکہ کے ذخیرہ کے ۳/۴ کے برابر ہے۔

اس کی سب سے مشہور کچ دھات کا نام ہیمیٹائٹ (HAEMATITE) ہے۔ یہ خالص ہو تو اس میں ۷۰ فی صد لوہا ہوتا ہے۔ لیکن اس ملک کی کچ دھات میں بالعموم ۶۴ فی صد لوہا، ۳ فی صد سے کم گندک اور ۳ تا ۸ فی صد فاسفورس پائی جاتی ہے۔

۱۸۳۰ء میں ہندوستان میں لوہا تجارتی پیمانے پر تیار کرنے کی کوشش شروع کی گئی۔ لکڑی کا کوئلہ ایندھن کے طور پر استعمال کیا گیا لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ ۱۸۷۵ء میں کوک کی مدد سے کلٹی (KULTI) میں پہلی مرتبہ جدید قاعدے سے لوہا تیار کیا گیا۔ اس وقت اس کی تیاری کے تین کارخانے قائم ہیں۔ جتنی کچ دھات نکلتی وہ کارخانوں میں صرف ہو جاتی۔ لیکن ۱۹۳۶ء سے ۱۰ لاکھ ٹن کچ دھات برآمد ہونے لگی، جو زیادہ تر جاپان جاتی ہے۔ لوہے کی تیاری کے لئے عمدہ قسم کا کوئلہ درکار ہے اور چونکہ کارآمد کوئلہ کی مقدار کی بہ نسبت کچ دھات کی مقدار زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس لئے توقع کی جاتی ہے کہ برآمد شدہ کچ دھات کی مقدار ہر سال بڑھتی جائے گی۔ ہندوستان سے بیڑ (PIG IRON) بھی برآمد ہوتا ہے چنانچہ جاپان چار لاکھ ٹن اور انگلستان ۱/۲ ۱ لاکھ ٹن بیڑ سالانہ ہندوستان سے خریدتا ہے۔

کوئلہ کوئلہ کنی ہندوستان کی سب سے اہم معدنی صنعت ہے۔ اس صنعت میں تقریباً دو لاکھ آدمی کام کرتے ہیں۔ تین کروڑ ٹن کوئلہ سالانہ پیدا ہوتا ہے جس کی مالیت گیارہ کروڑ ہوتی ہے۔ کوئلہ پیدا کرنے والے ممالک کی فہرست میں ہندوستان کا نمبر نواں ہے۔

کوئلہ کی سب سے زیادہ کھپت ریلوے میں ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱/۳ مقدار اس غرض کے لئے فروخت ہوتی ہے۔ کچھ مقدار لوہے اور فولاد کے کارخانوں، پاور ہاؤس وغیرہ کے لئے خریدی جاتی ہے۔ کچھ عرصے سے کوئلہ برآمد ہونے لگا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں برما، سیلون اور مشرق بعید کو تقریباً دو لاکھ ٹن کوئلہ برآمد کیا گیا۔

حکومت کے زیر نگرانی ایک (COAL GRADING BOARD) قائم ہے جو کوئلہ کی جماعت بندی کر کے صداقت نامہ عطا کرتا ہے۔ جس سے خریداروں کو کوئلہ کی قسم کے معلوم کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔

ہندوستان میں دو زمانوں کے کوئلہ کی کانیں پائی جاتی ہیں۔ (LOWER GONDWANA) ۹۸ فی صد اور (TERTIARY) ۲ فی صد (LOWER GONDWANA) میں کوئلہ کی مقدار کا اندازہ ۶۰ ارب ٹن کیا گیا ہے۔ کوئلہ کلکتہ سے ۱۳۰ میل کے فاصلہ پر رانی گنج کے میدانوں میں ۱۷۷۴ء میں دریافت کیا گیا۔ لیکن کوئلہ کنی ۱۸۱۴ء میں شروع ہوئی۔ ۱۸۱۴ء سے ۱۸۵۵ء تک کوئلہ کشتیوں کے ذریعے دامودھر دریا کے راستہ کلکتہ پہنچایا جاتا تھا۔ ۱۸۵۵ء میں رانی گنج تک ریل پہنچائی گئی اور اس کے بعد سے ریل کے ذریعہ کوئلہ منتقل کیا جانے لگا۔ کچھ عرصے بعد بہار اور بنگال کے دوسرے مقامات پر کوئلہ دریافت ہوا اور وہاں کی کانوں سے نکالا جانے لگا۔ جھریا کا کوئلہ کوک بنانے کے لئے نہایت موزوں ہے۔ اور اس کی مدد سے کچ دھاتوں سے دھاتیں حاصل کی جاتی ہیں۔ بہار اور بنگال کے علاوہ وادی پنچ (صوبہ متوسط) سنگارینی اور ٹانڈور میں بھی کوئلہ کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔

میگنیز (MANGANESE) کچ دھاتیں میگنیز کچ دھاتیں بالاگھاٹ، ناگپور، بھنڈارا (صوبہ متوسط) اور ریاست ساندور اور وزیگاپٹم (مدراس)، پنچ محل (بمبئی) سنگھبوم (بہار) اور میسور میں پائی جاتی ہیں۔ میگنیز کچ دھات کی پیداوار کے اعتبار سے ہندوستان سب سے اول نمبر پر ہے۔ چنانچہ اس ملک کی پیداوار کی مقدار پوری دنیا کی پیداوار کے ۲/۳ حصہ کے برابر ہے۔ اس ملک میں ہر سال ۱۰ لاکھ ٹن جس کی مالیت ۴ کروڑ ہوتی ہے، نکالی جاتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا استعمال لوہے اور فولاد کی صنعت میں ہے۔ ۳/۴ لاکھ ٹن کچ دھات اس ملک کے لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ اور باقی مقدار انگلستان، جاپان اور فرانس کو برآمد کی جاتی ہے۔

آپ کے لئے یہ معلوم کرکے دلچسپی کا باعث ہوگا کہ سیٹھ لکشمی آن جہانی نے جو سکندرآباد کے باشندے تھے اور بعد میں ناگپور جاکر میگنیز کی کچ دھات کی تجارت کرنے لگے، جنگ کے دوران میں اس سے لاکھوں روپے کمائے اور چونکہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی، اس لئے اپنی کمائی کا بیشتر حصہ تقریباً ۶۰ لاکھ روپے ناگپور یونیورسٹی کو اس غرض سے وقف کیا کہ عملی سائنس اور کیمیا کی تعلیم پر صرف کیا جائے۔

ابرک ابرک زیادہ تر ہزاری باغ اور گیا (بہار) اور نلور (مدراس) میں پائی جاتی ہے۔ راجپوتانہ، میسور، گوالیار اور ٹراونکور میں بھی تھوڑی تھوڑی مقدار میں دستیاب ہوتی ہے۔ ہندوستان دیگر تمام ممالک سے زیادہ مقدار میں ابرک پیدا کرتا ہے۔ دنیا کی ۳/۴ مقدار ہندوستان سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱/۲ کروڑ روپے کی ابرک ہر سال برآمد ہوتی ہے۔ جو زیادہ تر انگلستان اور امریکہ جاتی ہے۔ ابرک بڑے بڑے ڈلوں کی شکل میں پائی جاتی ہے اور ہندوستانی مزدور اس کو پتلے پتلے ورق کی شکل میں تراشتے ہیں۔ ہندوستان کی ابرک کی خوبی زیادہ تر اس تراشنے کے باعث ہے، چنانچہ بعض اوقات دوسرے ممالک سے ابرک ہندوستان تراشے جانے کے لئے آتی ہے۔

پٹرولیم پٹرولیم کچھ زیادہ مقدار میں نہیں پایا جاتا۔ ڈگبوئی (آسام) اور اٹک (پنجاب) سے تقریباً ۱۰ کروڑ گیلن پٹرولیم ہر سال حاصل ہوتا ہے جو ہندوستان کی ضروریات کی ایک چھوٹی کسر کو بھی پورا کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔

باکسائٹ (BAUXITE) یہ وہ کچ دھات ہے جس سے ایلومنیم حاصل کی جاتی ہے۔ زیادہ تر کٹنی (ضلع جبل پور) اور خیرا (بمبئی) میں پایا جاتا ہے۔ اور مقامات پر بھی ملتا ہے۔ اس سے پٹرولیم کے صاف کرنے میں کام لیا جاتا ہے اور پھٹکری بھی تیار کی جاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر برآمد کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہاں ایلومنیم تیار کرنے کا کارخانہ قائم نہیں ہے۔

کرومائٹ (CHROMITE) بلوچستان، میسور، سنگھبوم (بہار) میں حاصل کیا جاتا ہے۔ فولاد کی تیاری کی بھٹیوں کے لئے اس کی اینٹیں استعمال کی جاتی ہیں۔ بیشتر برآمد کیا جاتا ہے۔ آج کل اس سے ڈائی کرومیٹ تیار کرنے کا کام بھی لیا جاتا

میگنیسائٹ (MAGNESITE) سیلم اور میسور میں پایا جاتا ہے۔ اس سے سارل سمینٹ اور فولاد کی بھٹیوں کے لئے اینٹیں بنائی جاتی ہیں۔

المینائٹ (ILMENITE)، مونازائٹ (MONAZITE)، زرکون (ZIRCON) ہندوستان ان معدنیات کا نہایت اہم ماخذ ہے۔ یہ بیشتر ٹراونکور کے ساحل پر پائی جاتی ہیں۔

الینائٹ سے ٹائیٹانیا (TITANIA) ایک سفید رنگ حاصل کیا جاتا ہے۔ مونازائٹ (MONAZITE) سے تھوریا (THORIA) حاصل کیا جاتا ہے۔ جس سے تابان گیس پیرہن (INCONDESCENT GAS MANTLES) تیار کئے جاتے ہیں۔ زرکون (ZIRCON) سے بھٹیوں کے لئے اینٹیں تیار کی جاتی ہیں۔

چونے کا پتھر اور چکنی مٹی چونے کا پتھر تقریباً ہر جگہ کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ بعض وقت اس میں چکنی مٹی ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کو کچھ اور اجزا کے ساتھ ملا کر بھوننے سے سمنٹ بنتا ہے۔ ۱۹۱۴ء میں سمنٹ کی تیاری اس ملک میں شروع ہوئی آج اس کے ۲۰ کارخانے قائم ہیں' اور ۱۰ لاکھ ٹن سمنٹ ہر سال تیار ہوتا ہے۔

جپسم (GYPSUM) جہلم' بیکانیر' جودھپور اور ترچناپلی میں پایا جاتا ہے۔ اس سے مختلف قسم کے سمنٹ اور پلاسٹر تیار کئے جاتے ہیں۔

سوپ اسٹون (SOAP STONE) جے پور' گنٹور' اور جبل پور میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بے شمار استعمال ہیں۔ چنانچہ اس سے چہرہ کا پوڈر' تختی کی پنسل' فرنچ چاک وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں۔

سونا سونا بیشتر کولار میں پایا جاتا ہے۔ جہاں ۲۴ ہزار آدمی کام کرتے ہیں' اور تقریباً ۳ کروڑ مالیت کا سونا نکالا جاتا ہے۔ اس قیمتی دھات کے اعتبار سے ہٹی کی معدنیں بھی بہت اہم ہیں۔

تانبا اور دیگر ادنیٰ دھاتیں تانبا' قلعی' سیسے اور جست کی کچھ دھاتیں قابل لحاظ مقدار میں نہیں پائی جاتیں۔ اگرچہ کہ اس کے نشانات پائے جاتے ہیں کہ قدیم زمانے میں تانبا ہندوستان میں حاصل کیا جاتا تھا۔ لیکن اس وقت صرف سنگھ بھوم بہار میں حاصل کیا جاتا ہے۔ میسور میں بھی خفیف مقدار میں تیار کیا جاتا ہے۔ سالانہ چھ ہزار ٹن تانبا ہندوستان میں نکلتا ہے۔

نمک نمک علاوہ سمندر اور جھیلوں کے معدنوں سے بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ مثلاً پنجاب میں بہت سی معدنیں ہیں جن سے نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ایک کروڑ مالیت کا نمک نکلتا ہے جس میں سے $\frac{1}{4}$ مالیت کا نمک معدنوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اس قدر مقدار ہندوستان کی ضروریات کے لئے ناکافی ہے۔ اس لئے تقریباً $\frac{1}{2}$ کروڑ مالیت کا نمک قریب کے ملکوں سے درآمد کیا جاتا ہے۔

سید حسین

حالاتِ حاضرہ

اس وقت جنگ جس منزل پر پہنچ گئی ہے اس میں شک نہیں نہایت تلخ منزل ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی اس کی حیثیت "تلخی کام و دہن کی آزمائش" سے آگے نہیں بڑھی۔ اور مستقبل قریب میں اس سے کہیں زیادہ تلخیاں دنیا کو برداشت کرنا ہیں۔ جنگ کے آغاز کو تقریباً دس مہینے ہوچکے ہیں اور اس قلیل مدت میں یورپ کے جغرافیہ میں جتنی حیرتناک تبدیلیاں ہوچکی ہیں وہ وحشیانہ قوت اور انسانی حرص و آز کی تاریخ میں غیر معمولی یادگار کی صورت سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب دنیا کا یہ ہیجان ختم ہوگا اور کرۂ ارض کے باشندے زمین کی آخری تباہیوں اور بربادیوں کو دیکھ کر سمجھیں گے کہ کس ملک نے کتنے ویرانے اپنی یادگاریں چھوڑے۔ اور زمین کے نشیب و فراز کا دھبہ مٹانے کے لئے کتنے گڑھے لاشوں سے پُر کئے گئے۔

ہزاروں دبابوں کی آتش فشاں توپیں اور ان کی آگ کا بے پناہ سیلاب، آسمان پر چھائے ہوئے بے شمار طیارے اور ان سے آتش گیر مادہ کی مسلسل بارش، لاکھوں مشین گنوں اور رائفلوں کی گولیاں اور کروڑوں انسانوں کے خون آلود سینے۔ یہ ہے فرانس کے میدان جنگ کا نقشہ جس کی طرف اس وقت ساری دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔

۴ر جون کو دارالعوام میں مسٹر چرچل نے کہا تھا کہ فلانڈرس کی لڑائی کے بعد ہٹلر کا فرانس و بلجیم کے اہم ساحلی مقامات پر قابض ہونا ایک دوسری نہایت سخت ہولناک جنگ کا آغاز ہے۔ جس کا ہدف انگلستان کو بنتا ہے یا فرانس کو اور ان کا یہ کہنا پورا ہوکر رہا۔ خیر انگلستان پر حملہ کرنے کا خیال تو وہ دل میں نہ لاسکتا تھا، کیونکہ برطانیہ کی بحری قوت کا اندازہ وہ فلانڈرس میں کرچکا تھا کہ باوجود چاروں طرف سے محصور ہوجانے کے برطانوی فوج لاکھوں کی تعداد میں رودبار انگلستان کو عبور کرکے واپس چلی گئی۔ لیکن فرانس پر حملہ کرنے کے لئے کوئی خلیج بیچ میں حائل نہ تھی۔ چنانچہ جنگ فلانڈرس کے بعد ہی فوراً اس نے پیرس کی طرف اقدام شروع کردیا۔ اور ایک ہفتے کے اندر وہ جنرل ویگان کے قائم کئے ہوئے خط مدافعت کو چیر کر فرانس کے پائے تخت سے اس قدر قریب ہوگیا کہ عروس البلاد پیرس کے حسین چہرے پر بموں اور گولوں کے دخانی بادل چھاگئے۔ یہاں تک کہ یہ شہر مزید کشت و خون کئے بغیر اس کے حوالے کردیا گیا۔

فرانسیسیوں اور جرمنوں کی مخالفت اتنی قدیم ہے کہ اس کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہیں یہ ہابیل و قابیل کی اولاد تو نہیں جو علحدہ علحدہ جرمنی اور فرانس میں آباد ہوگئیں۔ اور جن کی لڑائی اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتی، جب تک ان میں سے کوئی ایک فنا نہ ہوجائے۔

جرمنی کا فرانس پر اس شدومد سے حملہ کرنا تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ اس سے قبل تین بار فرانس کو ان حملوں کا تجربہ ہوچکا ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ ۱۸۷۰ء کی وہ جنگ جس نے فرانس کی شکست کے بعد جرمن قوم کی زبردست حکومت یورپ میں قائم کرادی، اہلِ فرانس کے دل سے کبھی محو نہیں ہوسکتی، لیکن اس کا کیا علاج کہ فرانسیسی قوم بہت صلح پسند قوم ہے۔ اور اس نے کبھی جرمن قوم سے انتقام لینا پسند نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ ماتحت ہی پر قناعت کی۔ پھر ہوسکتا ہے کہ

اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ بات قابل تعریف سمجھی جائے۔ لیکن سیاسی حیثیت سے فرانس کی یہ اتنی بڑی غلطی تھی جس کا خمیازہ اسے بار بار بھگتنا پڑا۔ اور اب بھی وہی صورت سامنے ہے۔ پچھلی باتوں کو چھوڑئیے، ابھی صرف چار سال کی بات ہے کہ جرمن افواج رہائن لینڈ میں داخل ہوتی ہیں اور فرانس ہاتھ پر ہاتھ دھرے ان کا منہ تکتا رہتا ہے۔ درآں حالے کہ اگر جرمن اقدام کو اسی جگہ اور اسی وقت روک دیا جاتا تو آج نہ کہیں ہٹلر نظر آتا نہ ہٹلریت۔ اس میں شک نہیں کہ معاہدہ ورسائی کے بعد یہ دوسری عظیم الشان غلطی تھی جس نے برطانیہ کی توازن قوت والی پالیسی کو درہم برہم کرکے ٹیوٹانک سیلاب کو تمام یورپ پر محیط ہو جانے کی دعوت دی۔ اور اس غلطی کی پاداش میں خون کے جتنے بھی آنسو بہائے جائیں کم ہے۔

اس وقت جنگ کا جو نقشہ دنیا کے سامنے موجود ہے اور جس رنگ سے نازی افواج سرزمین فرانس میں آگے بڑھ رہی ہیں وہ بہت تشویش انگیز ہے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ جنگ پولینڈ و ناروے یا ہالینڈ و بلجیم کی جنگ نہیں، بلکہ ایک ایسے ملک کی جنگ ہے جو اپنی سوا چار کروڑ کی آبادی میں ۵۳ لاکھ بہترین آراستہ فوج رکھتا ہے۔ جو دنیا میں چوتھے درجے کی بحری قوت تسلیم کیا جاتا ہے۔ جو ۲۰ کروڑ پونڈ سونے کا مالک ہے۔ اور جس کے یہاں لوہے اور کوئلے کی بھی کمی نہیں۔ پھر اس کے ساتھ سب سے بڑی بات جو آزمائش میں فرانسیسی قوم کے قدم میں لغزش پیدا نہیں ہونے دے گی، وہ اس کا زبردست جذبۂ قومی ہے۔ اور جیسا کہ موسیو رینالڈ وزیراعظم فرانس نے ظاہر کیا ہے فرانسیسی سپاہی اپنی خاک وطن کے ایک ایک ذرہ کے لئے جان دے گا۔ برطانیہ اس جنگ میں جو ارادے بھی رکھتا ہو لیکن فرانس تو یہ عزم لے کر میدان میں آیا ہے کہ جب تک اس کی آبادی کا آخری قطرۂ خون باقی ہے وہ نازی حکومت کا مقابلہ کرے گا۔ چنانچہ فرانس کے اس آہنی عزم کا پتہ اس واقعہ سے بھی چلتا ہے کہ جب فتح پولینڈ کے بعد جرمنی نے صلح کی گفت و شنید شروع کی اور برطانیہ نے بھی اس پر کان دھرنا چاہا تو فرانس نے صاف صاف کہہ دیا کہ لڑائی جیتنے سے پہلے صلح کی گفتگو کیسی۔ صلح تو اب اس وقت ہوگی جب ٹیوٹانک یا فرانسیسی قوم میں سے ایک قوم صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جائے۔

جن حضرات نے ابتداء سے اس جنگ کی نوعیت کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ جرمنی نے حملۂ پولینڈ سے قبل اور اس کے بعد بھی کئی مہینے تک دنیا کو اعصابی کشاکش میں مبتلا رکھا اور یہ سمجھنے کا موقع نہ دیا کہ اس کا حقیقی ارادہ کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے چھوٹے چھوٹے ملکوں پر جو کسی طرح اس کے حریف نہ ہو سکتے تھے۔ اچانک حملے شروع کر دئے۔ اور اس کا اصل سبب صرف یہ ہے کہ جرمنی کی اقتصادی حالت طویل جنگ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر سال کے اندر ہی وہ کامیابی حاصل نہ کر سکا تو گزشتہ جنگ عظیم کی طرح پھر ملک میں انقلاب رونما ہو جائے گا۔ اور یہ انقلاب نازی حکومت کی موت ہوگا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس مرتبہ جرمنی اقتصادی دشواریوں میں مبتلا نہیں ہو سکتا کیونکہ جن ممالک کو وہ فتح کر چکا ہے وہاں کی پیداوار، صنعت و تجارت سے پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لیکن غالباً یہ درست نہیں ہے، سب سے بڑا ملک جو اِس جنگ میں نازی حکومت کے ہاتھ آیا ہے۔ پولینڈ ہے، اور یقیناً یہاں کے ۹۰ فی صدی صنعتی ادارے اس کے قبضے میں ہیں۔ لیکن وہ سب کے سب اس قدر تباہ حالت میں ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے کم از کم پانچ سال امن و سکون

کے دکھارہیں ۔ ناروے پر اس نے سویڈن کا لوہا حاصل کرنے کے لئے حملہ کیا تھا، لیکن چونکہ بحر شمالی میں اس کے جہازوں کی آمد و رفت بند ہے، اس لئے وہ ناروے کی بندرگاہ ناروک سے یہ فائدہ بھی حاصل نہیں کرسکتا ۔ اب ہالینڈ کو لیجئے جو پیداوار زراعت کے لئے بہت مشہور ملک ہے ۔ لیکن ڈنمارک کی طرح یہاں کی کاشت بھی منحصر ہے، اس امر پر کہ چارہ اور میکانکی قسم کی کھاد باہر سے فراہم ہوتی ہے ۔ جو بہ حالت موجودہ ممکن نہیں ۔ معدنیات میں سوائے کوئلے کی معمولی مقدار کے اور کچھ نہیں پایا جاتا ۔ البتہ تیل نکالنے ٹین اور ربڑ کی چیزیں بنانے کے کارخانے وہاں ضرور ہیں، لیکن جب تک باہر سے تخم اور ٹین اور ربر نہ آئے یہ کارخانے بیکار ہیں ۔ سونا بے شک ہالینڈ میں بہت کافی ہے ۔ لیکن وہ نازی حملہ سے پہلے ہی منتقل ہوچکا ہے ۔ بلجیم، ہالینڈ سے زیادہ ترقی یافتہ صنعتی ملک ہے ۔ لیکن یہاں بھی وہی دقت درپیش ہے کہ جب تک باہر سے لوہا، تانبا وغیرہ نہ آئے تمام صنعتیں بیکار ہیں ۔ لکسمبرگ میں البتہ لوہے کی اچھی کانیں ہیں لیکن ان سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے اطمینان و سرمایہ کی ضرورت ہے ۔ جو اس وقت مفقود ہے ۔ الغرض مفتوحہ ممالک سے نازی حکومت کو کوئی اقتصادی مدد ایسی نہیں مل سکتی جس کے اعتماد پر وہ جنگ کے مصارف اور دباؤ کو برداشت کرسکے ۔

جرمنی کی موافقت میں دو امکانات اور ہیں جن میں سے ایک امکان تو سامنے آگیا یعنی اٹلی نے ۱۰ مئی کو اتحادین کے خلاف اعلان جنگ کردیا اور دوسرا امکان روس کی امداد کا ہے ۔ اب آپ سب سے پہلے اٹلی کو لیجئے ۔

جنگ سے پہلے برلن، روم محور کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور ہٹلر و مسولینی دونوں نے یہ پالیسی اختیار کر رکھی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو ڈرا دھمکا کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ہضم کرتے رہیں ۔ چنانچہ ہٹلر نے آسٹریا، زیکوسلیوکیا وغیرہ اسی ترکیب سے حاصل کئے ۔ اور مسولینی نے حبشہ اور البانیہ پر قبضہ کرلیا، لیکن جب پولینڈ کے مسئلہ میں ہٹلر نے اسٹالین سے اتحاد پیدا کیا تو ....

.....روسی و اطالوی اغراض کے تصادم کو روکنے کے لئے مسولینی سے ملا اور اس کا نتیجہ یہ تو ضرور نکلا کہ رومانیہ پر روس نے اپنا حملہ ملتوی کردیا ۔ لیکن اٹلی کی حالت بدستور تذبذب میں رہی کیونکہ اسے جرمنی کی کامیابی کا یقین نہ تھا ۔ اس کے بعد جب جرمنی نے ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ اور بلجیم پر قبضہ کرکے فرانس پر حملہ کردیا تو اس نے بھی اتحادیوں کے مشکلات سے فائدہ اٹھانے کے لئے اعلان جنگ کردیا ۔ اٹلی عرصے سے بحر روم کے اقتدار کا خواب دیکھ رہا ہے ۔ اور جبوٹی تیونس کارسکا اور انیس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ۔ جبوٹی تو وہ اس لئے چاہتا ہے کہ حبشہ میں اس کے قدم آسانی سے جم جائیں ۔ تیونس کی تمنا اس لئے ہے کہ سسلی پر اس کا اقتدار قائم ہوجائے ۔ جو بحر روم کا نہایت اہم دروازہ ہے ۔ کارسکا کی خواہش اسے اپنے مغربی ساحل کی حفاظت کے خیال سے ہے ۔ اور انیس اس لئے چاہتا ہے کہ اپنی شمالی سرحد کے خط مدافعت کو اور آگے بڑھا دے ۔ ہرچند امریکہ اس کو اطمینان دلا رہا تھا کہ اگر اس نے جنگ میں شرکت نہ کی تو جنگ کے بعد وہ اس کے مطالبات کے تسلیم کئے جانے پر پورا زور دے گا ۔ لیکن اس نے یہ دیکھ کر کہ جرمن افواج فرانس میں نہایت تیزی سے بڑھتی چلی آرہی ہیں ۔ نقد کو نسیہ پر ترجیح دی اور اعلان جنگ کردیا ۔ پھر نتیجہ جو کچھ بھی ہو ۔ لیکن اطالیہ کی اس بزدلانہ اور غیر شریفانہ روش سے جتنا بھی اظہار نفرت کیا جائے کم ہے ۔

اٹلی کے پاس بحری، بری اور فضائی فوج کافی ہے۔ لیکن اس کی جائے وقوع ایسی نہیں کہ وہ اپنے سواحل کو تباہی سے بچا سکے۔ بحر روم میں اس وقت اتحادیوں کا بڑا زبردست بیڑہ موجود ہے۔ جس کا مقابلہ کرنا اٹلی کے بس کی بات نہیں۔

اٹلی کے اعلان جنگ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے تمام مقبوضات افریقہ ہاتھ سے نکل جائیں گی اور بحر روم میں ناکہ بندی کر کے اس کو اور جرمنی دونوں کو ساری دنیا سے بے تعلق کر دیا جائے گا۔ ہر چند مسولینی نے اپنے اعلان میں ظاہر کر دیا ہے کہ وہ یونان، ترکی، یوگوسلیویا اور مصر سے لڑائی مول لینا نہیں چاہتا لیکن ترکی اور یونان کے تعلقات بحر روم سے اتنے شدید ہیں کہ ان کے مفاد کو نقصان پہنچنا ناممکن نہیں اور اس طرح گویا بلقان میں بھی اس آگ کے پھیل جانے کا سخت اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

روس نے ابھی تک کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ لیکن اگر امریکہ سے اتحادین کی مدد کا فیصلہ کیا تو پھر روس کے لئے خاموش بیٹھنا دشوار ہوگا۔ چنانچہ اس نے امریکہ کو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ اگر وہ یعنی امریکہ جنگ میں شریک ہوا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ بحر اٹلانٹک میں اس کے بیڑوں کی نقل و حرکت شروع ہوگی اور جاپان کو موقع مل جائے گا کہ جزائر فلپائن اور ایسٹ انڈیز پر اپنا اقتدار قائم کرلے۔ اس تنبیہہ کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگر امریکہ جنگ میں شریک ہوا تو روس بھی اس کے خلاف قدم اٹھانے پر مجبور ہوگا۔ لیکن یہ قدم کیا ہوگا اس کا تعین دشوار ہے۔ بظاہر اس کے دو ہی رخ ہو سکتے ہیں۔ بلقان یا ہندوستان۔ لیکن بلقان کی طرف بڑھنے کا امکان اس لئے ضعیف ہے کہ بحالات موجودہ وہ بلقان میں پگڑی الجھانا مناسب نہیں سمجھتا، علی الخصوص ایسی حالت میں جب کہ جرمن افواج بھی فرانس کے طرف بہت مصروف ہیں۔

رہ گیا ہندوستان، سو اس میں شک نہیں کہ اس کی ریلوے لائین اب سرحد ایران تک پہونچ گئی ہے اور ایران اس کی راہ میں حائل ہونے کی قوت بھی نہیں رکھتا۔ لیکن روس کے ذرائع نقل و حرکت اس قدر ناقص ہیں کہ وہ نہ کوئی زبردست فوج سرحد ایران پر لا سکتا ہے نہ ذخائر حرب وغیرہ کی فراہمی برمحل اس سے ممکن ہے۔ البتہ موصل اور اباادان کے تیل کے چشموں پر ضرور حملہ کا امکان ہے۔ لیکن خود اس کے چشمے جو باکو میں پائے جاتے ہیں وہ برطانوی زد سے اس قدر قریب ہیں کہ شائد موصل کے چشمے حاصل کرنے سے پہلے وہ خود اپنے چشمے ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ الغرض روس کا وجود اس جنگ میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور نہ وہ کسی اقدام پر آمادہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر جاپان کے جہازوں نے بحر ہند یا بحر پاسفک میں نقل و حرکت شروع کر دی جس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا پھر یہ بھی خاموش نہ بیٹھ سکے گا۔

ہندوستان کی پوزیشن اس لحاظ سے تو بہت محفوظ ہے کہ اس پر کسی طرف سے فی الحال حملہ کا امکان نہیں۔ لیکن چونکہ اس کی قسمت برطانوی حکومت سے وابستہ ہے اور وہ خود اپنی حفاظت کرنے کا اہل نہیں ہے، اس لئے قدرتاً اس کو فکرمند ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس کے آثار یہاں کی تجارت، یہاں کے لین دین اور یہاں کے نرخ اشیاء کے مد و جزر سے بخوبی ظاہر ہیں۔ لیکن غالباً یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ ہندوستانی آبادی میں جو فکر و اضطراب اس وقت پایا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف بے محل بلکہ مضرت رساں بھی ہے۔ اگر ہندوستان یہ نہیں چاہتا کہ وہ نازی حکومت کی گرفت میں آئے تو اس کا

فرض ہے کہ وہ برطانوی حکومت کا ساتھ دے ۔ اور اس کی ساکھ قائم رکھنے کی کوشش کرے ۔ بنکوں سے روپیہ نکال نکال کر گھروں میں رکھ لینا اور حکومت کے قرطاسی وعدوں کی طرف سے بے اعتماد ہو جانا کسی طرح مناسب نہیں، بلکہ تمام اندرونی اختلافات کو دور کر کے اجتماعی حیثیت سے برطانوی کامیابی کی کوشش کرنا چاہئے ۔ ورنہ نازی حکومت یہاں آئے یا نہ آئے ہم خود اپنی ہی ناعاقبتانہ اندیشیوں سے اپنے آپ کو تباہ کریں گے اور سارا ملک بدامنی کا شکار ہو جائے گا ۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ حیدرآباد میں اس نوع کا اضطراب بہت کم ہے اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ یہاں کی آبادی اپنے فرمانروا پر پورا اعتماد رکھتی ہے ۔ اور ذات شاہانہ کی متعین کی ہوئی راہ کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کرنا پسند نہیں کرتی ۔

نیاز فتح پوری

سپاہی کی پسند

رقاصہ کے گھنگروؤں کے چھنا چھن سے زیادہ مجھے تلواروں کی جھنکار پسند ہے ـــــ مژگاں کے تیز بھالوں کی بہ نسبت میں دشمنوں کے پھینکے ہوئے ان تیروں کو پسند کروں گا جو میرے سینے میں پیوست ہو کر میرے انتقام کی آگ کو اور بھڑکا دیں، اور میں بہت زیادہ جوش و خروش کے ساتھ آمادۂ پیکار ہو جاؤں ـــــ کسی نازنین کے دستِ حنائی سے زیادہ میرے ہاتھ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ جب وہ مخالفین کے خون میں غلطاں ہو کر سرخ ہو جاتے ہیں ـــــ محبت میں گھل گھل کے مرنے پر میں دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونے کو ترجیح دوں گا۔ اگر مادرِ وطن کو میری ضرورت ہو ـــــ میں بہت زیادہ خوش ہوں گا اگر میرے خون سے میرے دیس کو کوئی فائدہ پہونچے ـــــ حسین مطربہ کے راگوں اور نغموں سے زیادہ وہ آوازیں مجھے بھلی معلوم ہوتی ہیں جو دشمنوں کے نیم مردہ جسموں سے نکلتی ہیں۔ جب ہم فتحمندی کے شادیانے بجاتے انہیں روندتے چلے جاتے ہیں ـــــ سرو قد محبوبوں کی مستانہ چال سے زیادہ مجھے ایک سپاہی کی چال پسند ہے، جو سینہ تانے میدان کارزار میں نکل آتا ہے ـــــ روئے جاناں سے زیادہ اس چہرہ کی قدر کرتا ہوں جو رعب دار ہو ـــــ مخمور اور مست آنکھوں سے زیادہ بہتر وہ آنکھیں ہیں جو بھیانک اور وحشت انگیز ہوں اور جو ایک ہی نظر میں دشمن کے تن بدن میں رعشہ پیدا کر دیں ـــــ نازک سیمیں تن سے زیادہ وہ جسم خوش نما ہے جو سڈول اور قوی ہو۔ وہ دل قابلِ قدر ہے جو جرأت اور شجاعت سے معمور ہو، اور جس میں حبِ وطن کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو ـــــ انسانیت اور شرافت کے نام پر اپنی جان تک دینے سے گریز نہ کرنا میرا دھرم ہے ـــــ وطن کی پرستش میرا ایمان ـــــ

سردار الہام

سپاہی

طبل بجتے ہیں، آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے کیوں
حیات و موت کا احساس مٹتا جا رہا ہے کیوں
وطن کا پاسباں جنگی ترانے گا رہا ہے کیوں

سپاہی جا رہا ہے

بدن پر چست وردی، خوش نما تمغے چمکتے ہیں
بگل کا شور اٹھا ہے فرائض راہ تکتے ہیں
"کسی" کی مد بھری آنکھوں کے ساغر کیوں چھلکتے ہیں

سپاہی جا رہا ہے

وطن کا پاسباں اب زخم کھا کر مسکرائے گا!
وطن کا پاسباں اب فتح کے پرچم اڑائے گا
وطن کا پاسباں اب انقلابی گیت گائے گا

سپاہی جا رہا ہے

سردار الہام

فضائی حملہ اور اُس سے بچاؤ کی چند تدبیریں

مغربی ایشیاء میں جاپان کے برق آسا اقوام سے جنگی حالات میں جو انقلاب رونما ہوا ہے، وہ ہم سے مخفی نہیں۔ اور جنگ کی ہولناک چنگاریاں اب نہ صرف تخیل اور تصور کی مدیں ہیں، بلکہ دن اور رات ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کی مشرقی سرحد کے طویل دامن سے جنگ کے شعلے اپنی پوری سرعت کے ساتھ لپٹ رہے ہیں۔ اب یہ کہنا کہ جنگ کا انتظار کیجئے یا یہ تصور کرلینا کہ جنگ ہندوستان میں داخل ہو نہیں سکتی، ایک ناقابلِ تلافی غلطی متصور ہوگی جب کہ مشرقی ہندوستان کے اہم ترین مقامات پر جاپانی بم بار دن اور رات جہنم کی آگ برسا رہے ہیں۔ اور رنگون کی معصوم آبادی کروڑہا روپے کی سر بفلک عمارتیں، غم زدہ ماؤں کے بے شمار بیٹے الغرض انسانی محبت اور تعلق کے سب رشتے اور دھاگے جاپانی بم باری سے روئی کے گالوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔ تو کیا عجب ہے کہ یہی بم باری جو ہندوستان کے مشرقی گوشے میں قیامت کا خونی مرقع پیش کر رہی ہے، آج یا کل ہم پر نازل ہو۔ جنرل آرچی بالڈ ویول سابق سپہ سالار افواج ہند نے کرسمس ۱۹۴۲ء کے موقع پر نشریہ کے ذریعہ اپنی خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے کروڑہا ہندوستانیوں کو اس آنے والی قیامت سے متنبہ کیا ہے اور تلقین کی ہے کہ وہ حفظِ ماتقدم کے مقدس فریضے کو سہاریں۔

ہوائی جہاز کی ایجاد شہری آبادیوں پر جو نئے نئے ستم ڈھا رہی ہے، وہ اتنی ہلاکت انگیز ہے، جس کا اندازہ صرف یورپ کے ان حسین شہروں سے لگایا جاسکتا ہے جو نازی بربریت سے آج خاک اور راکھ کا تودہ بنے ہوئے ہیں، جن میں دبی ہوئی چنگاریاں آج بھی اپنے کئے پر پچھتا رہی ہیں۔ موجودہ جنگ میں جرمن ہوائیہ کی بے پناہ تاخت نے دول یورپ اور بالخصوص انگلستان کے شہریوں کو جو سبق دیا ہے، وہ آج ہم ہندوستانیوں کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتا ہے اور ہم ہوائی حملوں کے بچاؤ میں ان تلخ تجربات سے ملک اور اہلِ ملک کی خدمت کا مقدس فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ ہوائی حملوں اور اس کے بچاؤ کے متعلق جو کچھ بھی یہاں سپردِ قرطاس کیا جارہا ہے وہ ان ہی تجربات کا رہینِ منت ہے، جو انگلستان نے جرمن ہوائیہ کی دہشت اور بربریت سے حاصل کئے ہیں۔

موجودہ جنگ میں جب دشمن کسی ملک پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو میکانکی دستوں کی روانگی سے قبل اس کی ہوائی طاقت اس ملک کی شہری آبادیوں پر دن دھاڑے یا چاندنی راتوں میں اپنی متعدد پروازوں میں بم باری کرتی ہے اور ان آبادیوں پر بم باری کا عین مقصد یہ ہوتا ہے کہ وقت سے پہلے وہاں دہشت، سراسیگی اور بدحواسی پھیلا دی جائے۔ صنعتی کارخانے، تیل کے چشمے، بڑی عمارتیں، راہِ آہن، ریلوے اسٹیشن، بجلی گھر، پانی کے خزانے، فوجی چھاؤنیاں اور بندرگاہیں دشمن کے بم بار طیاروں کے خاص نشانات ہوتے ہیں۔ دشمن کے طیاروں کو اگر مدافعت سے دوچار ہونا نہ پڑے تو سمجھ لیجئے کہ ان کے نشانات کی شرح بہت بڑھی چڑھی رہتی ہے۔ لیکن اگر طیارہ شکن توپیں سرگرمِ عمل ہوں، اور لڑاکو طیارے دشمن کے مقابلے کے لئے ان کا تعاقب کرنے لگیں، تو دشمن ہراسانی میں اندھا دھند بم باری کرنے لگتا ہے، جن کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ شہری آبادیوں پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے اور بموں کی بارش ان کے مکانوں کو، ان کی امانتوں اور جائدادوں کو ناقابلِ قیاس نقصان پہنچاتی ہے۔

فضائی حملوں سے بچاؤ کی تدابیر سے قبل یہ واضح کردینا ازبس ضروری ہے کہ شہری آبادیوں پر دشمن کے طیارے کس طرح حملہ آور ہوتے ہیں اور ان ہوائی حملوں کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں۔ ہوائی حملے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ بم بار طیاروں کا دستہ اچانک کسی شہر پر نمودار ہو جاتا ہے۔

اورنہایت کم بلندی سے بم اندازی میں مصروف ہوجاتا ہے۔ اس بم بار دستے کے سر پر ایک اور دستہ ہوتا ہے جو جنگجو ہوائی جہازوں پر مشتمل ہوتا ہے، ان لڑاکا ہوائی جہازوں کے ذمہ یہ خدمت تفویض کی جاتی ہے کہ وہ اس بم بار دستے سے انتہائی بلندی پر پرواز کرتے رہیں۔ اور اگر اس بم باری کے درمیان میں شہری دفاع کے طیارے اِدھر آتے ہوئے دکھائی دیں تو انھیں بم بار دستے سے بہت دور مصروف رکھا جائے۔ تاکہ بم باری کی شرح میں تغیر رونما نہ ہوسکے۔ اور بم صحیح صحیح نشانات پر گریں۔ بالآخر شہری دفاع کے طیارے دشمن کے لڑاکا جہازوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ تاکہ ان بم باروں کو بھگادیں جو اپنے لڑاکوں کے بل بوتے پر آگ اور لوہے کی بارش برسانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ادھر دشمن کے جنگجو طیاروں کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ شہری دفاع کے طیاروں کو اپنے بم باروں تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ اب نتیجہ قوت، طیارہ رانوں کی صلاحیت اور مشینوں کی اچھائی پر موقوف ہوتا ہے۔ اس قسم کے حملے کم ازکم دس منٹ اور زیادہ سے زیادہ ۳ ½ گھنٹے تک جاری رہتے ہیں۔ اگر حملہ طویل مدت تک جاری رکھنا ہو تو اکثر بم باری کے دوران میں یہ دیکھا گیا ہے کہ دشمن کے نئے نئے مسلح دستے یکے بعد دیگرے پرے باندھے ہوئے اپنے پیشروؤں کا جائزہ لینے کے لئے بڑھتے ہیں۔ اور یہ ترتیب فضا میں کچھ ایسی منظم ہوتی ہے جس کو دیکھ کر اچنبھا سا ہونے لگتا ہے۔

حملے کا دوسرا طریقہ وہ ہوتا ہے جب کہ دشمن کے متعدد طیارے چشمِ زدن میں شہری آبادیوں پر پہنچ جاتے ہیں، اور آتش افروز بم برسانے لگتے ہیں۔ یہ وہ رقت انگیز وقت ہوتا ہے جب کہ انسانی نظریں ان ہولناک اور تباہ کن وزنی شعلوں کو دیکھتی ہیں، جو شہری آبادی کو آناً فاناً جلا کر خاکستر کرنے لگتے ہیں۔ ان بموں کے بھیانک شعلے بجلی کی سرعت کے ساتھ اپنے اطراف واکناف میں دوزخ کا مکمل نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اور وہ شہر جو رات میں ہوائی حملوں کے بچاؤ کے پیشِ نظر تاریک کردیا گیا تھا، شعلوں کی لپیٹ میں یکبارگی روشن ہوجاتا ہے۔

حملے کا تیسرا طریقہ وہ ہے جب کہ بم بار طیارے پھٹنے اور چیخنے والے بم اور آتش افروز بم یک ساتھ شہروں پر پھینکنے لگتے ہیں، اس وقت شہروں پر قیامت کا سناٹا طاری رہتا ہے۔ اور پھٹنے والے بموں کے مہیب دھماکے، اور چیخنے والے بموں کی بھیانک آوازیں شہر میں، فضاؤں میں ایک تزلزل پیدا کردیتی ہیں۔ اِس تیسرے قسم کے حملے سے بالخصوص شہروں کے معصوم بچوں اور ضعیف الناس میں سراسیگی اور بدحواسی پھیل جاتی ہے۔

جو شہر اِن بم باروں کا ہدف بن رہا ہو وہاں حکومت کی جانب سے برقی الارم، دفاعی طیاروں، آتش فرو انجنوں، امبولنس کی گاڑیوں، پناہ گاہوں اور طیارہ شکن توپوں کا انتظام موجود ہوتا ہے۔ رصد گاہ یا اور کسی دوسرے ذریعے سے دشمن کے طیاروں کی پوزش کا پتہ لگتے ہی الارم دیا جاتا ہے۔ جو بیک وقت شہر کے طول اور عرض میں پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت شہریوں کو چاہیئے کہ وہ انتہائی استقلال کے ساتھ گھریلو پناہ گاہوں میں چلے جائیں۔ اور جو لوگ شاہراہوں پر چل رہے ہوں۔ وہ کسی قریب کی پناہ گاہ میں پُرامن طریقے سے پہنچنے کی کوشش کریں۔ اور اگر قریب میں کوئی پناہ گاہ نہ ہو تو قریب کی کسی ٹرام، موٹر بس یا کسی اور سواری کی آڑ میں جو الارم کو سنتے ہی جہاں کی وہاں یک لخت رک جاتی ہیں، پناہ لیں۔ جانوروں کی سواریوں کو ہانکنے والوں کا یہ اولین فرض ہونا چاہیئے کہ وہ خطرے کی گھنٹی کو سنتے ہی اپنے جانوروں کو جوئے سے نکال کر ان سواریوں کی آڑ میں خود بھی پناہ لیں۔ اور ان بے زبان جانوروں

کو بھی پناہ لینے دیا جائے ۔ وہ لوگ جو ذاتی پناہ گاہیں نہ رکھتے ہوں ان کو چاہئے کہ وہ ہوائی حملے کے الارم کو سنتے ہی قریب کے کھلے میدانوں یا اپنے گھر کی انگنائیوں میں اہل و عیال سمیت نکل جائیں ۔ اور زمین سے پیوست ہو کر لیٹ جائیں ۔ فضائی یورشیں اگر رات میں ہوں اور تاریکی (BLACKOUT) کا عمل جاری ہو تو اس موقع پر خوف و ہراس سے حتی الوسع گریز کرنا چاہئے ۔ یہ نہیں کہ ہوائی حملہ کا الارم ہوا اور لوگ بے تحاشا ادہر ادہر دوڑنے لگے ۔ اس گھبراہٹ اور عدم استقلال سے شہری آبادیوں کو ناقابلِ بیان نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں ۔ اس بے تحاشا بھاگ دوڑ میں معصوم بچے، ضعیف مرد اور عورتیں چیونٹی کی طرح تلوؤں تلے مسل جاتے ہیں ۔ چنانچہ رنگون پر پہلے فضائی حملے کے موقع پر وہاں کے شہریوں نے جن کمزوریوں کا ثبوت دیا ہے وہ ہمارے لئے ایک واضح سبق ہے، کہ استقامت اور استقلال کے دامن کو ایسے نازک موقع پر ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے ۔ بلکہ شہریوں اور خصوصاً نوجوانوں کا اس موقع پر یہ مقدس فریضہ ہونا چاہئے کہ وہ ان خطرات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے علی الاعلان کمزوروں کی مدد اور معصوموں کی اعانت اور ہمدردی پر "تیار باش" رہیں ۔ اور جب فضائی حملہ ختم ہو جائے اور "سب کچھ ٹھیک ہے" کا الارم دیا جائے تو شہریوں کو چاہئے کہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکل آئیں اور حکومت کے دفاعی محکمہ کے اراکین کے دوش بدوش زخمیوں کی مرہم پٹیوں، آگ بجھانے، بچوں کو دلاسا دینے اور مظلوموں کو تسلی دینے میں مصروف ہو جائیں جب اِن خدماتِ خلق سے انہیں فرصت مل جائے تو پھر پوری سرعت کے ساتھ اپنے کاروبار میں لگ جائیں ۔

آگ بجھانے والے محکموں کو چاہئے کہ وہ اس پُرخطر دور میں حکومت کے بنائے ہوئے پانی کے خزانوں پر کسی قسم کا بھروسہ نہ رکھیں ۔ کیونکہ ہوائی حملوں نے ان آبی خزانوں کو لایعنی حیثیت دے رکھی ہے ۔ ہمارے پیش نظر ہانگ کانگ کی تازہ مثال موجود ہے کہ کس طرح وہاں کے شہریوں اور سپاہیوں کو کئی روز تک صرف اس وجہ سے پانی میسر نہ ہو سکا کہ جاپانی طیاروں نے وہاں کے تمام پانی کے ذخیروں کو بمباری سے تباہ کر دیا تھا ۔ اس لئے آگ بجھانے والے محکمہ جات کا اولین فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ جا بجا گڑھوں، لوہے کی ٹنکیوں یا تہ خانوں میں پانی کی وافر مقدار مہیا رکھیں تاکہ شہر میں جو آگ آتش افروز بموں سے لگ جاتی ہے وہ بہر صورت پھیلنے نہ پائے ۔ اس ضمن میں شہریوں کا بھی یہ فرض ہونا چاہئے کہ سرکاری یا بلدیات کی آبرسانی کے ذرائع پر کسی قسم کا بھروسہ نہ رکھیں ۔ کیونکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہوائی حملوں میں اکثر ان نلوں کو اس وجہ سے شدید نقصان پہنچا ہے کہ ان کا ایک جال ہوتا ہے، جو شہروں کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا ہوتا ہے اور بمباری بہر صورت شہر کے بڑے رقبے پر محیط ہوتی ہے ۔ بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ جہاں بھی بم گرتا ہو وہاں آبرسانی کے پائپ اور تالاب نزدیک ضرور ہوتے ہیں ۔ اِس لئے شہریوں کو چاہئے کہ وہ اپنے مکانوں میں بلکہ مکانوں کے تہہ خانوں میں پانی کا وافر ذخیرہ ہمیشہ مہیا رکھیں ۔ کنویں اس خصوص میں بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں ۔ ہر صاحب خانہ کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ صحن میں ریت کے بھرے ہوئے تھیلے اور اگر مالی حالت اجازت دے تو آگ بجھانے کے دوسرے آلات ہمیشہ تیار رکھے ۔ ہر مکان میں تقریباً ایک ایک درجن بالٹیوں کا مہیا رہنا نہایت ضروری امر ہے، تاکہ اپنے موقع پر جب کہ خود یا کسی ہمسایہ کا مکان آتش افروز بموں کا شکار ہوا ہو تو محلے کے تمام افراد اُن بھری ہوئی بالٹیوں کو لے کر سرعت کے ساتھ اس آگ کو بجھانے میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں ۔ اور اگر آگ واقعی بہت تیز ہو تو قریب کے ٹیلی فون سے

آتش فرو انجن طلب کیا جائے، جو آن کی آن میں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہو جائے گا۔ اگر کوئی آتش افروز بم کسی عمارت پر یا راستے پر دکھائی دے تو اس بم کو عورتیں تک باآسانی بجھا سکتی ہیں۔ اس بم کو دیکھ کر خوفزدہ نہ ہونا چاہیئے، کہ یہ کہیں پھٹ نہ جائے۔ نہیں نہیں آتش افروز بم، دھماکو بموں کی طرح کبھی پھٹا نہیں کرتے، بلکہ یہ ایک جگہ ساکت پڑے رہتے ہیں اور ان سے بڑے بڑے شعلے نکلتے رہتے ہیں۔ اس وقت نہایت احتیاط کے ساتھ اگر دس، پندرہ پانی کی بڑی بالٹیاں ان پر انڈیل دی جائیں تو وہ خود بخود ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور اس طرح ان کی آتش افروزی کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔

ہر گھر میں بھری ہوئی بالٹیاں اور فوری طبی امداد "FIRST AID" کا سامان رہنا نہایت ضروری ہے۔ ملک کے ہر بچے کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ فوری طبی امداد کے کورس کو ختم کرنے کی سعی کرے تا کہ ان حالات میں جب کہ بم باری شدید پیمانے پر جاری ہو۔ اپنے گھر بار کی خدمت اور تیمارداری بخوبی انجام دے سکے۔ ان موقعوں پر سرکاری یا خانگی ڈاکٹروں کا انتظار کرنا، دانشمندی کے خلاف ہوگا۔

بم باری کے موقعوں پر ریت کے تھیلوں کی آڑ میں اگر پناہ لی جائے تو یہ حفاظت کا اچھا ذریعہ ثابت ہوں گے۔ اس کے علاوہ "اینڈرسن شلٹرز" (ENDERSON SHELTERS) وضع کی پناہ گاہیں بہ عجلتِ ممکنہ اگر حکومت کی جانب سے ہر اہم مقام پر بنائی جائیں تو معین مستحسن ہوگا۔ کیونکہ اینڈرسن شلٹرز نے جن کی تعمیر میں لوہا اور کنکریٹ استعمال کیا جاتا ہے۔ انگلستان کے لاکھوں شہریوں کی جرمن بم باری کے ایام میں ایسی حفاظت کی ہے جس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ اور اسی وضع کی ان گنت پناہ گاہیں ترقی یافتہ ممالک میں نہایت سرعت کے ساتھ بن چکی ہیں، اور بنائی جا رہی ہیں۔

یہ وہ نازک ساعت ہے جب کہ ہم اپنی عزیز مملکت کو ان تیاریوں سے بہت دور دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے حفظ ما تقدم کا یہ تقاضا ہونا چاہئے کہ عوام اپنے بچاؤ کی تدبیروں میں نہایت سرعت کے ساتھ مصروف ہو جائیں۔ اور درحقیقت اِس پُر آشوب زمانے میں جتنی ذمہ داریاں عوام پر عائد ہیں، اتنی سپاہیوں پر بھی نہیں۔ عوام کا مقدس فرض اِس وقت یہ ہونا چاہئے کہ وہ بے دریغ اپنی خدمات حکومت کے حوالے کر دیں۔ اور حکومت کا اوّلین فرض یہ ہونا نہایت ضروری امر ہے کہ وہ پوری سرعت کے ساتھ دفاعی کاموں کی طرف اپنی خاص توجہ منعطف کرے، تا کہ ملک اور مالک کی حفاظت کا کوئی صحیح حل نکل سکے۔

افتخار (بر ہمنی)

دَورانِ جنگ میں

بے جرم و خطا ہوش کی لعنت دے کر
انسان کو حیوان سی طاقت دے کر
تو خوش ہے کہ کعبے میں نہیں بت کوئی
آذر کی نگاہوں کو جسارت دے کر

اب ربطِ نو کی بھی صدا سن ساقی
انسان نے پہچانی نئی دھن ساقی
پھر ہوش کی زد میں ہے فسانہ تیرا
لے چاک ہوا پیرہنِ کہن ساقی

نظر

نغمۂ جنگ

میرے آتے ہی ہوئے سیکڑوں فتنے پیدا
ساری دنیا میں ہے اک شورِ قیامت پیدا
کیا کہوں، کیسے جوانوں کو دیا جامِ فنا
میرے ماتھے پہ پسینہ بھی نہ آیا اب تک

میرے بربط میں فقط شعلہ اثر موت کے راگ
کتنی ماؤں کے دلِ زار میں سلگائی ہے آگ
میں نے چھینا ہے بہت زہرہ جبینوں کا سہاگ
میرے ماتھے پہ پسینہ بھی نہ آیا اب تک

ہر طرف چھا ہی گیا میرے تنفّس کا دھواں
ہاں، کسی کو نہ ملی میرے مظالم سے اماں
عرصۂ جنگ میں اک خون کی ندّی ہے رواں
میرے ماتھے پہ پسینہ بھی نہ آیا اب تک

جذبۂ حرص کو بیدار کیا ہے میں نے
آدمی زاد کو خوں خوار کیا ہے میں نے
بے بسوں کو تہِ تلوار کیا ہے میں نے
میرے ماتھے پہ پسینہ بھی نہ آیا اب تک

سن کے افسانۂ پُر درد ہنسا کرتی ہوں
مر رہا ہے کوئی، میں شاد رہا کرتی ہوں
قتل و غارت کے پیامات دیا کرتی ہوں
میرے ماتھے پہ پسینہ بھی نہ آیا اب تک

میرے یہ طور، زمانے سے جدا طور سہی
امنِ عالم کے لئے قہر مرا دور سہی
میرے آئین میں ظلم و ستم و جور سہی
میرے ماتھے پہ پسینہ بھی نہ آیا اب تک

التجا کوئی کرے، رحم مرے پاس نہیں
آہ وزاری کرے کوئی، مجھے احساس نہیں
اہلِ عشرت کے لئے میرا قدم راس نہیں
میرے ماتھے پہ پسینہ بھی نہ آیا اب تک

میری نظروں میں جہنم کے نظارے رقصاں
میری رفتار سے لرزاں ہے نظامِ دوراں
میری آواز سے بیدار ہوئے کون ومکاں
میرے ماتھے پہ پسینہ بھی نہ آیا اب تک

تحسین سروری

توپوں کا ایندھن اور "جرمن" کلچر

"خون اور فولاد کا دیوتا محبت اور رحم کے دیوتا کی جگہ لے گا" ان چند لفظوں میں صدر روزولٹ نے تقریر کرتے ہوئے دنیا کے اس مستقبل کا ذکر کیا تھا جس کو پیدا کرنے کے لئے جرمن "کلچر" کی ترقی کے مختلف طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ لفظ "کلچر" لاطینی زبان سے لیا گیا ہے اس کی اصلی معنی خیالات کی شائستگی اور تربیت کا ایک اعلیٰ مقام ہے جو کسی قوم کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو حاصل ہو جاتے۔ یہ تہذیب انسانی کی ذہنی اور دماغی تکمیل ہے۔ لیکن جدید جرمنی اور نازیت کے بانیوں نے اس لفظ میں جو معنی پیدا کئے ہیں وہ ایک ایسی قومی ترقی کا عملی تخیل ہے جس کے تحت حیوانی قوت کی انتہائی شدت کے ساتھ تہذیب کے تمام قدیم اخلاقی معیار کو برہم کر کے کمتر اور کمزور اقوام پر جرمن تسلط قایم کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس تسلط کی تکمیل کے لئے جرمن قوم کے افکار و عزائم کو انسانیت کے اس عہد قدیم سے ملا دینے کی کوشش کی گئی ہے جو حیوانیت سے زیادہ قریب ہے۔ بقول ایک جرمن مفکر کے "جرمن قومیت ان اجنبی اثرات سے قطع تعلق کرتی جارہی ہے جس کو یہود و نصاریٰ کی مذہبی روایات نے اس کی اجتماعی زندگی میں داخل کر دیا تھا" اب وحشت انسانیت کے ارتقا کا (اس کو آپ ارتقائے معکوس بھی کہہ سکتے ہیں) ایک اعلیٰ ترین منظر ہے اور اس کے اندر موجودہ تہذیب و تمدن سے ہزار ہا سال پہلے کی وہ تمام خصوصیات تازہ کی جارہی ہیں جو صرف حیوانی قوت کو تفوق کا معیار بناتی تھیں۔ اس کی صرف ایک مثال میں آج آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔

جو لوگ مذاہب کی تعلیمات اور تہذیب انسانی کے مسلمہ اصولوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ زندگی کی تنظیم میں عورت کا درجہ اور مقام کیا ہے۔ ماں، بیوی اور بہن کی حیثیت سے تمام مذاہب اور تہذیبوں نے عورت کی ایک مخصوص حیثیت اور تمدن میں اس کا ایک خاص مقام مقرر کر دیا ہے اور متمدن اقوام کی زندگی میں اس کے جنسی فرائض کا ایک اخلاقی معیار بھی مقرر ہے جس کے مطابق مرد اور عورت کے تعلقات کی تنظیم کی جاتی ہے۔ ان جماعتوں میں بھی جو لا مذہب ہیں زن و شوہر کے تعلقات کا کوئی نہ کوئی معیار مقرر ہے۔ عورت کا وجود جس طرح کہ مرد کا وجود اپنے بعض فطرتی فرائض کا پابند ہے اور ان میں سب سے بڑا فرض نسل انسانی کی ترقی ہے؛ لیکن جرمن "کلچر" نے فطرت کے اس تقاضے کو اپنی صورتوں کا اس درجہ پابند کر لیا ہے کہ اب جرمنی اور محوری ممالک میں عورت کا وجود تمام انسانی حقوق سے محروم ہو کر صرف ایک ایسی مشین کے مماثل ہو گیا ہے جس کا کام سوائے بچے پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ نازیوں کے ایک اخبار نے حال ہی میں کہا تھا کہ جرمنوں کو سب سے زیادہ "انسانی سامان جنگ" درکار ہے اور ایک جرمن یونیورسٹی کے پروفیسر نے فرمایا تھا کہ وہ لڑکی اور عورت جو زیادہ بچے پیدا نہ کرے اپنے ملک سے غداری کرتی ہے۔ اگر بچوں کی یہ مانگ نسل انسانی کی ترقی کے لئے ضروری سمجھی جاتی تو اس پر اعتراض کرنا ناروا ہوتا۔ لیکن جرمن "کلچر" میدان جنگ میں توپوں کے لئے صرف ایندھن تیار کرنے کی غرض سے زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے پر اصرار کرتا ہے اس کی نظر میں ہر نوجوان ایک ہیولیٔ موضوعی ہے،

جو جنگ کے آتش خانوں کو گرم رکھنے کے لئے پیدا کیا جاتا ہے اور پالا جاتا ہے بقول ایک جرمن مصنف کے "ہر جرمن ماں کا ہر تندرست بچہ جرمن قوم کی زندگی میں میدان جنگ کا ایک سپاہی ہے" الفرد روز برگ کہتا ہے کہ "جرمن رائش میں ہر ایسی عورت جو بچہ پیدا نہ کرے ــــ خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ــــ قومی دولت مشترکہ کا ایک نامکمل جزو سمجھی جائے گی" ظاہر ہے کہ جرمن "کلچر" کے اس نقطۂ نظر نے مناکحت اور مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کی اس اخلاقی حیثیت کو بالکل ختم کر دیا ہے جس کی بنا پر گھروں کی خاندانی زندگی منظم ہوا کرتی ہے اب توارنسٹ برگمان مناکحت کے تمام پابندیوں سے قطع نظر کرکے صرف یہ حساب لگاتا ہے کہ۔

"ہر ایک تندرست جرمن نوجوان کو کم از کم (۲۰) لڑکیوں سے بچے پیدا کرنے کے قابل ہونا چاہیے"!

۱۹۳۶ء میں نازیوں کی حکومت نے ایک قانون نافذ کرکے زن و شوہر کے ایسے تمام تعلقات کو ناجائز اور قابل تنسیخ قرار دے دیا جن سے بچے پیدا نہ ہوں۔ جرمن نوجوانوں کی تمام انجمنوں میں جو ملک میں پھیلی ہوئی ہیں لڑکیوں کو عام طور پر یہ تعلیم دی جانے لگی کہ ماں بننے کے لئے شادی کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ مملکت اور فیوہر کی خدمت کرنے کے لئے بغیر شادی کئے بھی بچے پیدا کرنا ضروری ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج جرمنی کے ہر ایک ہزار بچوں میں سے پندرہ بیس بچے غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے جنسی اتصال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان بچوں کی پرورش اور نگہداشت اسی توجہ اور اہتمام کے ساتھ کی جاتی ہے جس توجہ اور اہتمام کے ساتھ سامان جنگ کے ذخائر جمع کئے جاتے ہیں توپیں ڈھالی جاتی ہیں، طیارے بنائے جاتے ہیں، پٹرول جمع کیا جاتا ہے اور دبابے تیار کئے جاتے ہیں۔

جرمن "کلچر" کی اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۵ء میں اتنے جرمن بچے پیدا ہونے لگے کہ وہ جوان ہو کر میدان جنگ میں مرنے والے نوجوانوں کی جگہ پر کر سکیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں جو لاکھوں جرمن نوجوان مارے گئے تھے ان کی جگہ جلد سے جلد پر کرنے کے لئے ہٹلر نے اپنی قوم کو جنسی تعلقات میں ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد کر دیا اور انسانی نسل توپوں کا ایندھن بنا دی گئی۔ جرمن "کلچر" کے اس اصول کو دوسرے محوری ممالک میں بھی اختیار کیا گیا۔ چنانچہ اٹلی اور جاپان میں تمام قوانین بدل دئے گئے حتیٰ کہ زنا اور اغوا کی سزاؤں میں بھی بہت تخفیف کر دی گئی۔ وہاں کچھ عرصہ پہلے (۲۱) سال کی عمر تک کی لڑکیوں کا اغوا جرم تھا لیکن مسولینی نے عمر کے اس معیار کو گھٹا کر (۱۴) سال کر دیا۔ یعنی اب (۱۴) برس کی عمر سے زیادہ کی لڑکی کا اغوا کوئی جرم نہیں رہا۔ جرمن "کلچر" نے "حیاتیات" سے قدیم اخلاقی اصولوں کو خارج کرکے ایسے اصولوں کو تمام محوری ممالک میں رائج کر دیا ہے جو انسانوں کے جنسی قوانین کو خالص حیوانی زندگی کی طرف واپس لے جا رہے ہیں۔ اب حیاتیات کے جرمن ماہرین صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ملکوں کی اجتماعی زندگی میں زیادہ سے زیادہ کتنے بچے پیدا کئے جا سکتے ہیں اور یہ بچے صرف اس طرح شمار کئے جاتے ہیں جیسے توپیں یا رائفل یا دبابے۔ اس سے زیادہ جرمن "کلچر" کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ گویا بھیڑیں یا بکرے ہیں جو قربانی کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں یعنی جرمن کلچر نے انسانیت کی تمام دوسری خصوصیات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے!!۔

"حیاتیات کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ایک جرمن مصنف نے لکھا ہے کہ تندرست مرد (۶۰) سال کی عمر تک بھی بچے پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ کسی جنگ میں نوجوانوں اور نوجوانوں کے مارے جانے کی وجہ سے شرح پیدائش

کم ہو سکتی ہے البتہ عورتیں اکثر (۵۵) سال کی عمر کے بعد بچہ پیدا نہیں کر سکتیں۔ اس لئے ان کا وجود اس عمر کے بعد بیکار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی رائے میں (۶۰) سالہ مردوں کی قدر و قیمت بھی (۵۰) سالہ عورت سے زیادہ ہوتی ہے۔ نازیوں کے لئے گھر کی زندگی میں عورت کا وجود بے قیمت ہے اگر وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا نہ کرتی ہو۔ جرمن ماہرین فن نے "حیاتیات" کے تجربات کے بعد یہ حساب لگایا ہے کہ جس طرح ایک گھوڑا (۵) سال کی عمر میں (۸۰) یا (۹۰) گھوڑیوں سے بچے پیدا کر سکتا ہے اس طرح کوئی وجہ نہیں کہ ایک نازی سپاہی بھی بہت سی عورتوں سے بہت سے بچے پیدا نہ کرے۔ وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ مناکحت اور ازدواجی تعلقات کی مذہبی یا اخلاقی پابندیوں کو منسوخ کر کے اور صرف حیوانی فطرت کے مسلمہ اصولوں کو رہنما بنا کر جرمن نسل کی ترقی میں کوشش کرنی چاہیے۔

یہ جرمن "کلچر" ہے۔ یہ وہ "تنظیم نو" ہے جس کو دنیا پر مسلط کرنے کے لئے ہٹلر لاکھوں انسانوں کا خون بہا رہا ہے اس کلچر میں انسانوں کی انسانیت کو گھوڑوں اور گدھوں کی طرح افزائش نسل کے لئے استعمال کرنا ایک قومی فرض قرار دے لیا گیا ہے۔ نازی کلچر کے ان حقایق پر گہری نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ یہ کیسا خوفناک انقلاب ہے جو آدم کی اولاد کو وحشت اور بربریت کے ان ویرانوں کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے جہاں ان کی قدیم تہذیب کا کوئی اخلاقی معیار اور اصول باقی نہ رہے گا۔ جہاں وہ جنگل کے بہایم کے ساتھ ساتھ شمار کئے جائیں گے جہاں وہ بھیڑیوں اور گیدڑوں کی طرح بچے پیدا کریں گے۔ جہاں ان کی جنسی قوتیں صرف ایک مشین کی طرح استعمال کی جائیں گی۔ جہاں مرد محض توپوں کا ایندھن سمجھے جائیں گے اور عورتیں کوئی جنسی آبرو نہ رکھیں گی۔ سوائے اس کے کہ وہ مردوں کی جنسی ضروریات کو پورا کریں اور ایسے بچے پیدا کریں جن کی ہڈیوں سے ڈکٹیٹروں کی عظمت و جلال کے مینار و محراب تعمیر ہو سکیں۔ نازیوں نے بچوں کے پیدا کرانے کا جو حیوانی اصول اختیار کیا ہے اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ بھی نہیں ہو سکتا کہ انسانی زندگی کے ہر ذہنی اور اخلاقی شعبہ میں پستی اور خواری پیدا ہوا اور موجودہ سماج کی ساری تنظیم یکسر برباد ہو جائے۔ جنسی اخلاق اور مناکحت اور خاندانی زندگی کی اس تباہی سے صرف ایک ایسی ہی "تنظیم جدید" پیدا ہو سکتی ہے جو انسانوں کو حیوان بنا اور ان تمام حدبندیوں کو توڑ دے جن سے انسانیت اور حیوانیت کے درمیان ایک بین امتیاز قایم ہے۔

آج ۸ کروڑ سے زیادہ مرد اور عورتیں بھی ذہنی تربیت حاصل کر رہی ہیں کہ ان کا وجود صرف ایک لیڈر کے احکام کا پابند ہے اور ان کا کام سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں میں جنگل کے درندوں کی سی قوت پیدا کریں۔ انسانی شعور اور عزت نفس کا اس جرمن کلچر کی فرہنگ میں ایک بے معنی اصطلاح ہے وہ صرف چند لیڈروں کا مجموعہ اور باقی جتنے انسان ہیں وہ جانوروں کا ایک بڑا گلہ ہیں۔ ذہنی اور اخلاقی غلاموں کا ایک بڑا گروہ ہیں جو صرف ایک فرعون کو سجدہ کرنے اور صرف ایک فرعون کی ٹھوکر میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے! ــــ ہٹلر کی تنظیم جدید کا یہ محض کوئی تصور نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جس کا خوفناک چہرہ اب بے نقاب ہو چکا ہے۔

قاضی عبدالغفار

عصرِ حاضر کے سیاسی افکار

(۱) مصلحین اشتراکیت (Revisionists)

۱۸۶۴ء میں لندن کے مقام پر "مزدوروں کی بین الاقوامی انجمن" کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن پر مارکس کا قبضہ تھا۔ اس چیز نے مارکسی نظام کو مضبوط بنا دیا اور مارکس کے نام میں ایک جادو کا اثر بھر دیا۔ آئین پسند پرولتاریوں نے مارکس کو یورش واگروان کر اس انجمن سے خارج کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اس انجمن کے زیرِ اہتمام (۱۸۶۶-۱۸۶۹ء) چار عظیم الشان کانفرنسیں براعظم یورپ میں جنیوا، لوزان، برسلز اور باسل کے مقامات پر منعقد ہوئیں۔ ان اجتماعات نے حکومت اور کارخانہ داروں کو خوفزدہ کر دیا کیونکہ ان کانفرنسوں میں نفرت و حقارت کے مظاہرے کئے گئے تھے، سرمایہ دار طبقہ کو مجرم قرار دیا گیا تھا اور مزدوروں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اقتدار پر قابض ہو جائیں۔ ان وجوہ کی بنا پر ایک فوری اور خونین سماجی انقلاب کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ ان بین الاقوامی اجلاسوں میں مارکس نے جتنا زیادہ حصہ لیا (اس انجمن کے دوسرے اراکین کی نسبت مارکس زیادہ زبانیں جانتا تھا) اتنا ہی مارکسی نظام محارب پرولتاری طبقہ کا مسلمہ اصول بنتا چلا گیا۔

مندرجۂ ذیل تین امور نے اس "اولین بین الاقوامی" (First International) کا خاتمہ کر کے مارکسی تبلیغ کو سخت دھکا لگایا۔

(۱) خود انجمن کے اراکین میں مارکس کی آمریت کے خلاف جذبات موجود تھے (۲) فرانسیسی پروشیائی جنگ نے اس انجمن کو دو مخالف قومی گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ (۳) خود مارکسی نظام کی صحت کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔

شکّی اصحاب نے ایک نئے مکتبِ خیال "اصلاحِ اشتراکیت" کی بنیاد ڈالی جس کے متعلق مارکس کے کٹر معتقد کارل کاٹسکی نے اس صحیح رائے کا اظہار کیا ہے کہ اس دبستان نے سائنٹفک اشتراکیت کے نظریات اور بنیادی اصول ترک کر دیئے ہیں۔

"اصلاحِ اشتراکیت" ایک ایسی اصطلاح تھی جس نے نئے اور پرانے اشتراکیوں کے درمیان حائل خلیج کی وسعت کو چھپا دیا تھا۔ اس مکتبِ خیال کی بہترین تعریف "لوس — وون — مارکس" تحریک (Loss-Von-Marx Movement) کے قائد ایڈورڈ برنشٹین نے اپنی کتاب "ارتقائی اشتراکیت" (۱۸۹۹ء) میں کی ہے۔ اس کتاب میں اس نے تاریخ کے مادی نظریہ کو ترک کر دیا ہے اور طبقاتی جنگ کے نظریہ میں ترمیمات کی ہیں۔ قیمت اور فاضل قیمت کے مزدوری نظریات کا جہاں تک عملی کاروباری زندگی سے تعلق ہے اس نے انھیں جھٹلایا ہے۔ اور اقتصادی جبریت (Economic Determinism) کے نظریہ کی تردید کی ہے اور مارکس کی اس تعلیم کی بجائے کہ پرولتاری متشدد انقلاب برپا کریں اس نے ارتقائی اصلاح کا نظریہ پیش کیا ہے۔

جس زمانہ میں اصلاحِ اشتراکیت کی تحریک جرمنی میں زور پکڑ رہی تھی اور سماجی جمہوریت پسند جماعت کے عملی سیاسیات کے

متعلق طرزِ عمل میں اعتدال پیدا کر رہی تھی۔ اسی زمانہ میں انگلستان میں ایک اسی قسم کی تحریک ۱۸۸۴ء میں "فے بین سوسائٹی" کے قیام پر منتج ہوئی۔ "منشوریت" (Chartism) کی تحریک کی شکست (۱۸۴۸ء) اور "تحریک عیسوی تعاون" (Christian Co-operation) کی موت (۱۸۵۸ء) کے بعد انگلستان میں اشتراکیت زوال پذیر تھی۔ اس کے بعد کے تیس سال برطانیہ کے لئے عدیم النظیر صنعتی و حرفتی کامیابی کے دن تھے۔ اس زمانہ میں انقلابی نظریہ ایک عام مزدور کے لئے اپنے اندر کچھ جاذبیت و کشش نہ رکھتا تھا۔ اس صدی کے ربع آخر میں یہ کامیابی گھٹنی شروع ہوگئی۔ جرمنی اور امریکہ کی جدید رقابت نے صنعت کو سخت نقصان پہنچایا۔ نئے محصولوں نے تجارت کو دھکا لگایا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ امریکہ اور برطانیہ کی سمندر پار نو آبادیات کی زرخیز زمینوں کی پیداوار کے مقابلہ نے زراعت کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس بڑھتی ہوئی بداقبالی کے زمانہ میں اجتماعیت (Collectivism) کا احیا ہوا۔ اجتماعیت کے علمی و عقلی پہلو کی بنیاد طامس ہل گرین کا سیاسی فلسفہ تھا۔ ثبوتیت[1]، انسان دوستی، اور جان سٹوئرٹ مل کی آخری نیم اشتراکی تصنیفات (بالخصوص اس کی آپ بیتی مطبوعہ ۱۸۷۳ء) نے اسے اور تقویت پہنچائی۔ جب اس تحریک کے رہنماؤں نے کارل مارکس کی کتاب "سرمایہ" کا مطالعہ کیا تو اس تحریک میں اشتراکی رجحان پیدا ہوگیا۔

فے بین سوسائٹی کے بانی اس نتیجہ پر پہنچے کہ مارکس کی اس تصنیف کے صرف کچھ اجزا اچھے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بعض اجزا کو رد کر دیا، چند اجزا میں ترمیم کی اور باقی اجزا کو اپنا لیا۔ اس امر کو مندرجہ ذیل فہرست سے بآسانی اور مجمل طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

(۱) انھوں نے مارکس کے مادی اور اقتصادی جبریت کے نظریات کو جھٹلایا۔ اس کے طبقاتی جنگ کے نظریہ کی مذمت کی اور اس کے قیمت کے مزدوری نظریہ کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

(۲) وہ مارکس اور اشتراکیت کے اساسی اصول کے برعکس ریاست کو ایک دوامی ادارہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ریاست صرف پرولتاری آمریت کے قیام کا ایک ذریعہ ہی نہیں کہ جتنی جلدی ممکن ہو اسے ختم کر دیا جائے بلکہ وہ اسے ایک مستقل ادارہ سمجھتے تھے۔ وہ مارکس کے برعکس پرامن و آئینی ارتقا کو متشدد انقلاب پر ترجیح دیتے تھے۔ مارکسی دبستان یہ کہتا تھا کہ اگر متشدد انقلاب برپا نہ کیا گیا تو مزدوروں کے مصائب بڑھ جائیں گے۔ مگر فے بین سوسائٹی کے اراکین کا یہ خیال تھا کہ متشدد انقلاب کے بغیر بھی مزدوروں کی تدریجی فلاح و بہبود ہو سکتی ہے۔

(۳) انھوں نے اس کے فاضل قیمت کے نظریہ کو قبول کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ سرمایہ دار طبقہ مزدوروں کو لوٹ کھسوٹ رہا ہے۔ اور اس کے اس اصول کو اپنایا کہ سرمایہ داروں اور زمینداروں کی جائدادیں اور سرمایہ ضبط کر لیا جائے۔ وہ سماج کو نئی بنیادوں پر از سرِ نو تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ اجتماعیین سے ایک قدم آگے تھے ـــــ وہ اشتراکی تھے۔

فے بین سوسائٹی کا دستورِ کار مندرجہ ذیل امور کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(۱) اشتراکیت کی بیخ کنی کے لئے حملہ سے مختلف طریق کار اختیار کیا گیا ـــــ اشتراکیت کی انقلابی غایت کے متعلق یہ ظاہر کیا گیا کہ

---

[1] اگسٹ کومت کا نظام فلسفہ جس کی سند سے صرف ان چیزوں کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے جو دیکھی اور ثابت کی جا سکتی ہوں۔

وہ اجتماعیت سے زیادہ انتہاپسندانہ نہیں ہے ــــــ یعنی اشتراکیت کا مطمح نظر ریاستی عمل کی بے ضرر توسیع بتایا گیا۔ اور اس توسیع کی مثال پہلے ہی اس شکل میں موجود تھی کہ ڈاک خانہ ریاست کے قبضہ میں تھا۔

(۲) بلدیہ اور ریاست کو آہستہ آہستہ پیداوار پر قابض ہو جانا چاہیئے اور شخصی کاروبار کا استیصال کر دینا چاہیئے۔

(۳) بلدیہ اور ریاست کو چاہیے کہ بچوں، اپاہجوں، بوڑھوں، بیکاروں، محتاجوں اور کنگالوں کی مدد کی طرف تیز رفتاری سے قدم بڑھائے۔ محصول کے متعلق یہ کہا گیا کہ ایسے ایک تکلیف دہ ضرورت نہیں بلکہ قومی منافع کو پرولتاری مفاد کے لئے دوبارہ تقسیم کرنے کا ایک راحت بخش طریقہ ہونا چاہیے۔

فے بین یا اجتماعی اشتراکیت کی کامیابی کا زمانہ وہ ربع صدی تھی جو ۱۹۰۹ء میں "قانون مفلس اقلیت" (Minority Poor Law) کے متعلق اس کی تحقیقات کی اشاعت پر ختم ہوگئی۔ اس سال کے بعد ریاست کی مخالفت زیادہ نمایاں ہوگئی۔

(۲) مخالفین اجتماعیت

۱۸۸۴ء تا ۱۹۰۹ء کے پچیس سالہ دور میں اجتماعیت کو اپنی کارگزاری دکھانے کے کئی مواقع ملے۔ جرمنی میں بسمارک نے، فرانس کے یکے بعد دیگرے وزیر اعظموں نے، انگلستان میں فے بینزم سے متاثر کابینوں نے اور تمام دنیا بھر کی حکومتوں اور بلدیات نے ریل گاڑیوں، تلغراف، ٹیلیفون، ڈاک خانوں، بندرگاہوں، گیس ورکس اور آب رسانی کے کارخانوں اور دیگر بے شمار تعمیری کاموں تک ریاست کے دائرۂ عمل کو پھیلا دیا۔ اس قسم کے متعدد تجربات نے ہمدرد ناظرین پر یہ روشن کر دیا کہ وہ دائرۂ عمل بہت محدود ہے جس میں حکومت اپنے صنعتی کام کو کامیابی کے ساتھ سرانجام دے سکتی ہے۔ علاوہ ازیں مزدور طبقہ کی امیدیں بر نہ آئیں۔ ان کا خیال تھا کہ ریاستی انتظام کے ماتحت انھیں شخصی انتظام سے زیادہ آزادی اور مراعات حاصل ہوں گی۔ مگر ان کی یہ توقعات پوری نہ ہوئیں اور یہ حالت دیکھ کر مایوس ہو گئے کہ شاہِ جابر کی جگہ شاہِ شطرنج نے لے لی ہے۔

چنانچہ اجتماعیت کے خلاف ردِ عمل شروع ہو گیا۔ فے بین اشتراکیت کو "ریاستی سرمایہ داری" کا نام دیا گیا۔ اس کے سابقہ حامیوں نے اسے پروشیائی جبر و استبداد کے مشابہ قرار دیا۔ اور اب بھی جو اشخاص فے بین اشتراکیت کے حامی تھے انھیں "پیرانِ فرتوت" (Dotards) کے نام سے منسوب کیا گیا اور کہا گیا کہ ایسے افراد کے لئے صرف دو القاب ہیں جو نسا لقب وہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک لقب "آزادی سے متنفر مکار" تھا اور دوسرا لقب "آزادی کے معنوں سے بھی ناآشنا بیوقوف" تھا۔ یہ امر بیّن ہے کہ آزادی انفرادیت کی بیّن صفت ہے اور مساوات اشتراکیت کا امتیازی نشان۔ اس لئے آزادی کا یہ نعرہ ثابت کرتا ہے کہ انفرادیت کے حق میں ایک تحریک شروع ہونے والی تھی۔ پہلے تو یہ تحریک صرف اسی سرگرم مطالبہ تک محدود تھی کہ صنعتی گروہوں کو آزادی دی جائے (انفرادی آزادی نہیں)۔ اور یہ تحریک انگلستان سے پہلے فرانس میں نمودار ہوئی۔ اس فرانسیسی تحریک کو کسبی اشتراکیت[1] (Syndicalism) کا نام دیا گیا۔

---

[1] یہ تحریک یا اصول کہ کل صنعت و حرفت یعنی پیدائش دولت اور تقسیم دولت اہل حرفہ کی انجمنوں کے ہاتھ میں ہو۔ اور سرمایہ داروں کا وجود نہ رہے۔

فرانس میں اس تحریک کی نبیاد انیسویں صدی کے آخری سالوں میں رکھی گئی۔ یہ تحریک وہاں کی تجارتی انجمنوں (Trade Unions) میں خود بخود پیدا ہوگئی۔ سب سے پہلے یہ ریاست اور سیاسی نظام کے خلاف بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ یہ سیاسی نظام اس وقت کی فرانسیسی زندگی کے بدلے کے دور میں مزدوری کے مسائل کو دیانت دارانہ طور پر حل کرنے سے بالکل قاصر رہا تھا۔ اس تحریک کی دوسری شکل وہ احتجاج تھا جو اشتراکیت کے خلاف کیا گیا کہ وہ اپنے مواعید کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس تحریک کی تیسری شکل وہ تھی جب صنعت و حرفت کے معاملہ میں دفتری نظام کے استبداد کی مخالفت کی گئی اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ گروہوں کی خود مختاری کو قدرتی طور پر واپس لایا جائے۔

کسبی اشتراکیت ریاستی قوت، قیادت، عقلیت اور ضبط و مزاحمت کی مخالف ہے۔ ان امور کی جگہ یہ متشدد انقلاب بغیر کسی دوسرے کی تحریک کے عوام کے رضاکارانہ عمل و حرکت، غیر منضبط وجدان و جبلت کے تخلیقی ارتقا، اور قطعی خونخوار ی کا علمبردار ہے۔ طبقاتی جنگ اس کی انتہائی شکل ہے۔ عام سٹرائک کو یہ اہم جارحانہ ہتھیار سمجھتی ہے۔ سرمایہ داروں اور زمینداروں کو بالکل نیست و نابود کر دینا چاہتی ہے۔ اس کا مطمح نظر صنعتی انجمنوں کے وفاق کی شکل میں سماج کو نئی بنیادوں پر قائم کرنا ہے۔ کسبی اشتراکیت کی یہ آخری شق اسے فوضویت کلی سے متمیز کرتی ہے

کسبی اشتراکیت کو ایک غیر عملی نظریہ نہ رہنے دیا گیا۔ اس نے سنہ ۱۹۰۲ء میں فرانس کے "مزدوروں کے وفاق عامہ" (Confederation Generale du Travail) پر قبضہ کرلیا۔ سنہ ۱۹۰۶ء اور آئندہ سالوں کی فرانس کی عام سٹرائکوں کو قبل از وقت وقوع میں لانے کے لئے اس نے سرگرم کوششیں کیں۔ اس کا دوسرا اہم مگر ناکام تجربہ سنہ ۱۹۰۹ء میں سویڈن میں کیا گیا۔ اسی زمانہ میں یہ تحریک انگلستان میں بھی شروع ہوگئی۔ یہاں مسٹر ٹام مان اس تحریک کا حامیٔ اعظم تھا۔ اس تحریک نے یہاں سنہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں کوئلے کی کان اور ریلوے میں سٹرائکیں کرادیں۔ یہاں کان کنوں کے وفاق کی مجلس انتظامیہ کی شکل میں اسے ایک خوشگوار اور ہم مزاج وطن مل گیا۔ اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب میں اس نے اہم حصہ لیا۔ اس نے اطالیہ کو تاخت و تاراج کیا حتی کہ فسطائیت نے سنہ ۱۹۲۲ء میں اس کی بڑھتی ہوئی ترقی کو روک دیا۔ ابھی تک امریکہ میں یہ "دنیا کے صنعتی مزدوروں" کی مبینہ انجمن کے ذریعے ہنگامے برپا کرتی رہتی ہے۔

کسبی اشتراکیت ریاست اور ہر قسم کی سیاست کی سخت ترین مخالف ہے۔ مگر اس کا یہ پہلو سوائے فرانس کے کسی اور ملک کے لئے جاذب توجہ ثابت نہیں ہوا۔ اس کی یہ تعلیم انگلستان کے جمہوریت پرست مزدوروں کی طبیعتوں اور فطرتوں کے سخت خلاف تھی۔ یہاں کا مزدور اپنی رائے کو نہایت اہم سمجھتا ہے اور بلدیاتی و پارلیمانی انتخابات میں حصہ لینے کا عادی ہے۔ چنانچہ انگلستان میں اجتماعیت کی مخالفت فرانس کی طرح انتہا کو نہیں پہنچی ہوئی تھی۔ ریاستی اشتراکیت کے مخالفوں کی اکثریت نہ تو کسبی اشتراکی بنتی تھی اور نہ انارکسٹ بلکہ وہ ہم پیشہ لوگوں کی انجمن کے محض حامی بن جاتے تھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو شروع شروع میں گلڈ[1] اشتراکی کہا کرتے تھے۔ مگر ان کا

---

[1] گلڈ اشتراکیت کی رو سے ساری سماج کو مختلف شعبوں کی برادریوں میں تقسیم ہونا چاہیے اور ہر ایک کی حکومت اسی کی کونسل کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

مقصد محض یہ تھا کہ ان لوگوں نے فن بُنتروم سے جو قطعی بغاوت کی ہے وہ چھپ جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ فن بُن اشتراکیوں کے نظریۂ ریاست اور گلڈ اشتراکیوں کے نظریۂ ریاست کے درمیان ایک وسیع ترین خلیج حائل تھی۔ فن بُن ریاست زمین اور زر کی واحد مالک ہے اور پیدائش تقسیم و تبادلہ پر مختارِ کل ہے۔ مگر گلڈ اشتراکی ریاست اس کے برعکس کسی صنعت و حرفت میں بھی کسی قسم کا حصہ نہیں لے سکتی۔

گلڈ اشتراکی ایک دو پہلو نظام ریاست پیش کرتے ہیں۔ ایک تو پیدا کرنے والوں کی تنظیم یعنی ہم پیشہ لوگوں کی قومی انجمنوں یا صنعتی تجارتی جمعیتوں کا وفاق ہے جو ملک کے جملہ اقتصادی معاملات میں فیصلہ کن اور مختارِ کل حیثیت رکھتا ہوگا۔ دوسری تنظیم خرچ کرنے والوں کی ہوگی یعنی ایک ریاست جو سیاسی اداروں کا مجموعہ ہوگی غیر اقتصادی معاملات کا انتظام کرے گی۔ پادریوں کی ایک تعداد اس ضبط مزاحمت کے خلاف ہے جو پارلیمان نے ان کی لامرکزیت پر عائد کردی ہے۔ یہ پادری اس امر کا مطالبہ کرتے ہیں کہ کرجوں کو صنعتی انجمنوں کے مساوی درجہ دیا جائے اور ایک سہ پہلو ـــــ سیاسی، اقتصادی اور مذہبی ـــــ آئین بنایا جائے۔ جونہی گلڈ ازم عملی سیاسیات کے دائرہ میں داخل ہوئی، جامعوں، مدرسوں، وزرشی انجمنوں، شبینہ بزموں اور دیگر مجلسوں کی طرف سے یقیناً اسی قسم کے مطالبات پیش کئے جائیں گے۔

(۳) نئے انفرادی

اگرچہ اشتراکیت ابھی تک مزدوروں کی جماعتوں اور تجارتی انجمنوں کی مجالسِ انتظامیہ میں گھری ہوئی ہے۔ تاہم اس نے سیاسی فلسفہ کے میدان میں مدافعانہ جنگ شروع کر رکھی ہے۔ اس کے بڑے دشمن اس کے اپنے اندر ہی سے اٹھے ہیں۔ مرعوب کن مارکسی نظام کے انتشار کی سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ جرمنی میں برنسٹین، فرانس میں ڈولینیر یز، اور انگلستان میں سڈنی وب کے سے مصلحین اشتراکیت نے اس کی جڑیں کھوکھلی کردی ہیں۔ فن بُن تعمیر کو سب سے زیادہ نقصان ما لوک ایسے مخالفین اشتراکیت نے نہیں پہنچایا بلکہ اسے ان کسبی اشتراکیوں اور گلڈ اشتراکیوں کے ہاتھوں سے نقصان پہنچا ہے جن کی پرورش اس نے خود کی تھی۔ علاوہ ازیں کسبی اشتراکیت اور گلڈ اشتراکیت میں بھی ان ہردلعزیز نراجیوں کی وجہ سے آج کل انتشار پیدا ہو رہا ہے جنھیں ان ہر دو تحریکوں نے ہر قسم کی آئینی قوت کے خلاف بغاوت کی کامیاب تعلیم دی ہے۔ مسٹر برٹرینڈ رسل نے اپنی تصنیفات "تعمیر نو کے اصول" (سنہ ۱۹۱۶ء) "آزادی کی راہیں" (سنہ ۱۹۱۸ء) اور "صنعتی تہذیب کے آثار" (سنہ ۱۹۲۳ء) میں اپنے تخلیقی جذبات پر ہر قسم کی قیود کی اتنی سخت مخالفت کی ہے کہ اسے طالسطائی اور کروپوٹکن کی قبیل کے انتہا پسند نراجی انفرادیوں (Anarchist Individualists) میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ پروفیسر ایچ۔ جے۔ لاسکی نے اپنی تصانیف "مسئلۂ حاکمیت" (سنہ ۱۹۱۷ء) "موجودہ ریاست میں اقتدار" (سنہ ۱۹۱۹ء) اور "سیاسی گرامر" (سنہ ۱۹۲۵ء) میں اگرچہ برٹرینڈ رسل کے سے انتہا پسندانہ خیالات کا اظہار نہیں کیا مگر پھر بھی اس کا شمار انہیں ممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ ریاستی حاکمیت کا جو نظریہ بوڈین، ہوبز، بنتھم اور آسٹن نے پیش کیا ہے اس کی لاسکی نے مذمت کی ہے اور اسے حقیقت اور انفرادی حق کے خلاف قرار دیا ہے۔ اجتماعیوں اور اشتراکیوں نے فرد کے قدرتی حقوق تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ مگر لاسکی نے ان حقوق کے متعلق کہا ہے کہ اگرچہ ان کی بنیاد محض تجربہ پر ہے اور یہ محض استقراء سے معلوم کئے جا سکتے ہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ اس کا خیال ہے کہ متشدد قوت کو مختلف حصوں ـــــ سیاسی، صنعتی اور مذہبی ـــــ میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ اس تقسیم کو وہ شخصی آزادی کے لئے لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی ادارہ کی قدر و قیمت کا معیار انفرادی

بہبود ہے۔ یہ نظریہ اس غیر محدود آزادی کے نظریہ سے کچھ مختلف نہیں ہے جو گاڈون (GODWIN) نے "سیاسی انصاف" میں پیش کیا ہے۔

جدید انفرادیت کے مبلغ صرف وہ اشخاص ہی نہیں جو اشتراکیت، کسبی اشتراکیت اور گلڈ اشتراکیت کے پھندوں سے آزاد ہو کر معصوم انارکیت کے کشادہ میدانوں میں پہنچ چکے ہیں۔ بلکہ اس کے علمبردار وہ اعتدال پسند بھی ہیں جو بنتھم اور ملز کی فلسفیانہ انتہا پسندی کی روایات کو اعتدال پسند صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اس مکتبِ خیال کا متبحر عالم اور فصیح و بلیغ مقرر پروفیسر ایل۔ ٹی۔ ہوب ہوس ہے۔ جس کی عمرانیات کے اصولوں پر چار مشہور کتابیں ہیگلی نظریۂ ریاست کی دلکش پیرایہ میں مخالفت کرتی ہیں۔ یہ چار کتابیں "مابعد الطبیعیاتی نظریۂ ریاست" (The Metaphysical Theory of the State مطبوعہ ۱۹۱۸ء) "معقولی فلاح" (The Rational Good مطبوعہ ۱۹۲۱ء) "سماجی انصاف کے عناصر" (۱۹۲۲ء) اور "سماجی ترقی" (۱۹۲۴ء) ہیں۔ ان کتابوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ صرف فرد ہی شخصیت رکھتا ہے (یعنی یہ کتابیں ریاست اور گروہ دونوں کی شخصیت کا انکار کرتی ہیں) اور سماج کی بنیاد اخلاقی اصولوں پر ہے (یعنی وہ ریاست کے غیر اخلاقی یا ماورائے اخلاق ہونے کی منکر ہیں) یہ کتابیں ریاست کے متعلق ہیگلی مکتبِ خیال کے نامیاتی نظریہ کی بجائے ایک غیر طبعی اور میکانکی نظریہ پیش کرتی ہیں۔ ان کتابوں کے نزدیک ریاستی اعمال و افعال کا معیار مشترکہ مفاد ہے اور اس مشترکہ مفاد کا اہم عنصر شخصی آزادی ہے۔

شخصی آزادی لارڈ ہف سیسل کی قسم کے نئے قدامت پسندوں کی تعلیم کا اصل اصول ہے۔ سیسل نے اپنی تصانیف "آزادی اور حاکمیت" (۱۹۱۰ء) "قدامت پسندی" (۱۹۱۲ء) اور "قومیت اور کیتھولسزم" (۱۹۱۸ء) میں یہی تعلیم دی ہے۔ پروفیسر لاسکی نے گاڈون کی تعلیمات کی طرف رجوع کیا ہے۔ ہوب ہوس نے بنتھم کی تعلیمات کو اپنایا ہے۔ اور لارڈ سیسل نے برک کے اصولوں کو اختیار کیا ہے۔ وہ سماج اور ریاست کی مذہبی اساس پر زور دیتا ہے۔ فرد کی ضمیر کی حاکمیت کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ آزادی اور ملکیت کو شخصی حقوق قرار دیتا ہے۔ اور آزادی کو انفرادی اخلاق کی ترقی کے لئے لازمی قرار دیتا ہے۔

المختصر عصرِ حاضر میں ہر طرف سیاسی فلسفہ کے علمبرداروں میں انیسویں صدی کے نصفِ آخر کی اجتماعیت اور اشتراکیت کی مخالفت پائی جاتی ہے۔ ان رجحانات کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کے متعلق کسی قسم کی پیشین گوئی کرنا ناممکن ہے۔ ہم صرف اس امر کی توقع کر سکتے ہیں کہ یہ رجحانِ طبع بنی نوعِ انسان کو علمِ سیاست کے دائمی مسئلہ کے آخری و قطعی حل کی طرف ایک قدم آگے بڑھا دے گا۔ ـــــ یہ مسئلہ قانون اور آزادی، انضباط اور ترقی ہئیتِ حاکمہ اور ضمیرِ فرد اور قوم اور انسان اور ریاست کے درمیان مطابقت و مصالحت پیدا کرنا ہے۔

اکرام قمر

جنگ

جنگ سے خلق ہو رہی ہے دنگ　　ہوا پیدا کوئی تمور لنگ
عہدِ تہذیب پر لگا دھبہ　　ہے یہ انسانیت کے واسطے ننگ

انور شاہ آبادی

یورپ کی جنگ اور ہندوستان کی خود حفاظتی

اس وقت دنیا ایک نہایت خوفناک، تاریک اور تباہ کن دور سے گزر رہی ہے۔ چھوٹے بڑے ملک بلا کسی امتیاز کے برباد اور مختلف قومیں بلا کسی تفریق کے تہہ تیغ کی جارہی ہیں۔ انسانی زندگی کا فوری خاتمہ کیا جارہا ہے۔ لڑنے والے سپاہی تو میدان میں کو دے ہوئے ہیں ہی، پُر امن شہری اہل علم کاریگر سوداگر، کسان، بوڑھے، بچے، عورتیں غرض کہ کوئی متنفس بھی بم کے گولوں، توپ کے گولوں، مقناطیسی سرنگوں، برقی شعاعوں اور دوسرے آلات ہلاکت کی زد سے محفوظ نہیں۔ ع

ہوگیا ہے مثلِ آب انسان کا ارزاں لہو

یہ سب آخر کیوں ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ یورپ میں لڑائی کا دیو اپنے منھ سے آگ کے شعلے اور خون کے فوارے اُگل رہا ہے۔ اس آگ اور خون کا طوفان پھیلتے پھیلتے افریقہ کے ساحل اور روس کی سرزمین تک تو آپہنچا ہے، ڈر ہے کہ ایران، قفقاز وغیرہ کے سر سے گزرنے کے بعد کہیں خدانخواستہ ہمارے بے خطا ملک کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ ہم اس وقت اس چیز سے بحث کرنا اور یہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ اس خطرے کی موجودگی میں ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

یہ تو ہر شخص کے علم میں ہے کہ لڑائی ہورہی ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ کہاں ہورہی ہے مگر یہ بات ہر شخص کے علم میں نہیں ہے کہ کیوں ہورہی ہے؟ لہٰذا یہی بات کسی قدر وضاحت سے ہم عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم اگر تسلسل کلام کی خاطر تھوڑی سی وہ باتیں دہرائیں جن سے آگے سامعین کا علم مہینوں بلکہ برسوں کی راہ طے کرچکا ہے تو امید ہے کہ ہمیں معاف فرمایا جائے گا۔ اور ہمیں انگریزی اصطلاح کے مطابق۔ یہ طعنہ نہ دیا جائے گا کہ ملکۂ این (Queen Anne) کی موت کی خبر آج سنائی جارہی ہے۔

۱۹۱۴ء میں جب جرمنی کے قیصر ولیم پر ملک گیری کے سخت مرض کا دورا پڑا اور بڑی ہوئی سمندری طاقت کے بھروسہ پر اس کا غرور حد سے تجاوز کر گیا تو اس نے چھیڑ نکال کر لڑائی شروع کردی۔ اور آناً فاناً فرانس کے ایک حصے اور بلجیم کو تہس نہس کر ڈالا۔ کئی سال تک یہ خونی ہولی کھیلی جاتی رہی۔ مگر آخر کار جرمنی کو شکست ہوئی اور اتحادی ساری دنیا کو مصیبت سے نجات دلانے میں کامیاب ہوئے۔ جرمنی کو اپنے مقبوضات کے حصۂ کثیر سے ہاتھ دھونا اور تاوان جنگ کا بار گراں اپنے سر لینا پڑا۔ اس کے علاوہ اور بھی سنگین شرطوں سے اُس کے ہاتھ، پاؤں باندھ دیئے گئے۔ دنیا میں امن و امان کا دور دورہ شروع ہوا اور ہر متحارب اپنے ملک کو سدھارنے میں لگ گیا لیکن جرمنی میں پارٹی بندی کا زور شور شروع ہوا۔ روس میں انقلاب ہوچکا تھا۔ جرمنی میں بھی اشتراکیت کی تحریک کی بناء پڑی۔ یہ تحریک رفتہ رفتہ زور پکڑنے اور عوام میں ہر دل عزیز ہونے لگی۔ لڑائی کے بچے کچے فوجی افسروں اور سپاہیوں نے بھی اس تحریک کی اشاعت کے لئے اپنی ایک پارٹی قائم کی۔ اس کے جلسے ہونے لگے۔ اور اس نے اپنی بقا و زلیست کے لئے دوسری پارٹیوں کو کم زور بلکہ فنا کرنے کے لئے سخت جدوجہد شروع کی۔ اس ہما ہمی میں بوہیمیا کے رہنے والے ایک جاہل، اَن پڑھ، نامعلوم اور گم نام شخص نے بھی اپنی تقریروں سے عوام کی توجہ اپنی طرف منعطف کرکے اپنی ایک جماعت قائم کرلی جس کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔

اور اس کی آواز پر لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے ۔ یہ تھی نیشنل سوشلزم کی ابتدا اور ہر ہٹلر کی قیادت ۔ پھر ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کی پارٹی نے قوم اور پارلیمنٹ پر اقتدار حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اِن تمام ذرائع اور صورتوں پر اقتدار بلکہ اِن کاریگروں اور صناعوں پر تسلط حاصل کرلیا جو جرمنی جیسے سائنس داں ملک میں افراط سے موجود تھے ۔ چنانچہ ملک کی بیروزگاری کے دفیعہ کے لئے فوراً اس کے الٹے دماغ نے یہ ترکیب سوچی کہ لوگوں کو ہتیار بنانے کے کام پر لگایا جائے ۔ چانسلر ہونے کے بعد ہی سے یہ پروگرام شروع ہوگیا ۔ اور ملک میں خفیہ طور سے ہر کارخانہ صرف ہتیار بنانے میں مصروف ہوگیا ۔ کاش کہ یہ صلاحیت تباہی اور بربادی کے ذرائع فراہم کرنے کے بجائے کسی نیک اور تعمیری کام کی طرف منتقل ہوتی ۔ بہرحال ہتیار بنانے کا یہ پروگرام ۱۹۳۹ء تک اسی شد و مد اور زور و شور سے پورا کیا جاتا رہا جیسے ایک مجنوں کسی ایک دھن میں لگ کر دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہوجائے اس کے ساتھ ایک فریبی اور دھوکا باز انسان کی طرح اس نے ہمیشہ دنیا کو یہی بتایا کہ وہ دوسروں کے مقبوضات لینا نہیں چاہتا ۔ وہ فرانس پر فوج کشی نہیں کرے گا ۔ وہ آسٹریا کو فتح کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا وہ کسی ملک سے برسرپیکار ہونے کا خواہشمند نہیں ہے ۔ مگر اس کے ان الفاظ کو اس کے اعمال ہمیشہ جھٹلاتے رہے ۔ تاہم دیگر اقوام نے اس کے ان الفاظ پر ابتداً ایک حد تک بھروسہ کیا ۔ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی ملک کے کسی مقتدر رہنما نے کسی زمانے میں ایسی غلط بیانی، دھوکا دہی، مکر، فریب، دروغ بافی اور ستم ظریفی سے کام لیا ہو ۔ جیسا ہٹلر نے —— ایک تقریر میں اس نے اگر ایک بات کہی تو دوسرے موقعہ پر دوسری تقریر میں اس نے اس کے برعکس کہا ۔ اور جب کرنے کا وقت آیا تو اس نے اپنی ہر تقریر کے خلاف کیا ۔ اس نے کہا کہ میں کسی ملک کو لینا نہیں چاہتا ۔ مگر اس نے ایک ایک کرکے رہائن لینڈ، سار بروکن، آسٹریا، یوگوسلاویہ، پولینڈ، رومانیہ، لکسمبرگ اور دیگر ممالک کو اس وجہ سے عظیم رائش میں شریک کرلیا کہ وہاں ریائی نسل کے جرمن آباد تھے ان کو ایک جھنڈے کے نیچے لانے کا عجیب وغریب بہانہ تراشا گیا ۔

دنیا اس بات پر حیران رہ گئی کہ ہٹلر نے بلا کسی وجہ کے یہودیوں کے ساتھ اس بے دردی سے ایسا وحشیانہ برتاؤ کیوں کیا! اس نفرت، حقارت، عداوت اور خصومت کا راز سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہر یہودی کی املاک چاہے اس یہودی کو گولی کا نشانہ بنایا گیا، اور چاہے ملک بدر کیا گیا ہو گورنمنٹ کے قبضے میں پہنچ گئیں ۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ جرمنی میں یہودی قوم کے افراد تجارت، صنعت حکومت غرض کہ ہر اقتدار کے صنف پر بالکلیہ چھائے ہوئے تھے، ان کی دولت پر ہٹلر کی نگاہ آز صرف اس وجہ سے تھی کہ ہتیار بنانے کے لئے اسے سرمایہ درکار تھا ۔ چنانچہ یہودیوں کے ساتھ ہٹلر نے نئے نئے مظالم ایجاد کئے، ان کو کنسنٹریشن کیمپ میں ڈالا ۔ جیلوں میں بھرا ۔ گولیوں کا نشانہ بنایا ۔ جسم کا ایک ایک حصہ کاٹ کر کئی کئی روز میں موت کے گھاٹ اتارا ۔ یا بہ یک بینی و دو گوش ملک سے نکال دیا ۔ جو طرز عمل یہودیوں کے ساتھ کیا گیا وہ آنے والے واقعات کا صرف ایک دیباچہ یا پیش لفظ تھا ۔ لیکن پھر بھی دنیا ان دل ہلادینے اور رونگٹے کھڑے کرنے والے واقعات کے لئے تیار نہیں تھی جو دنیا نے آنکھوں سے دیکھے ۔ ان خوں ریزیوں اور خون آشامیوں کے جواز یا عدم جواز تنقید اور تبصرہ، بحث و تمحیص اور اس قسم کے دوسرے امر کا تعلق تو تاریخ کے طالب علم سے ہوگا ۔ دنیا اس وقت خود انصاف کرے گی، جب یہ تمام چیزیں تفصیل سے اس کے سامنے آئیں گی ۔ لیکن معمولی سمجھ اور دماغ والے کے لئے ہٹلر کا خون کی ندیاں بہانا، نہتے شہریوں پر گولیاں برسانا، ہسپتالوں، گرجاؤں، تھیٹروں، خانگی مکانوں اور تاریخی عمارتوں کو مسمار کرنا، شہروں کا تاخت وتاراج

کرنا خود اپنے سپاہیوں کو گاجر، مولیوں کی طرح کٹوانا فہم وادراک کی سرحد سے بہت دور ہے ۔

ہٹلر کے اس خبط نے موجودہ جنگ میں جو مظاہرے کئے وہ پولینڈ، فلانڈرس، فرانس، یونان، کریٹ اور روس میں قیامت کے نمونے بن گئے ۔ ماضی و حال کے کسی جنرل یا ملک گیر کے نامۂ اعمال میں جان و مال کا اتنا اتلاف نہیں لکھا گیا۔ جتنا اس شخص کے ذمہ ہے۔ اس کی خون آشامی سے چنگیز شرما گیا اور تیمور لرز گیا۔ دنیا کے مروجہ عام قوانین اور اخلاق کے اصولوں کے خلاف آج کل کی لڑائی میں سپاہیوں کے علاوہ غیر مصافی شہری بوڑھے، بچے اور عورتیں سب قتل کئے جاتے ہیں ۔ کھلے شہروں پر بم باری ہوتی ہے ۔ سمندر میں ایسے جہاز ڈبوئے جاتے ہیں جو کبھی کھانے کا سامان لے جا رہے ہوتے ہیں ۔ اور کبھی چھوٹے چھوٹے بچوں کو خون کی ندیوں میں سے نکال کر عافیت کی جگہ پہنچا رہے ہوتے ہیں جس قدر تباہی بڑھتی جاتی ہے اس تباہی کا موجد اسی قدر خوش ہوتا اور کھلا جاتا ہے ۔ یہ جنونی نہیں تو اور کون ہے؟ اگر فرانس سے عداوت تھی اور برطانیہ پر غصہ تھا تو پولینڈ نے کیا بگاڑا تھا ۔ ہالینڈ، بلجیم، ڈنمارک اور ناروے والوں کی کیا خطا تھی۔ یونان نے کیا کیا تھا ۔ افریقہ کے ساحلی ملکوں نے کیا نقصان پہنچایا تھا ۔ بات یہ ہے کہ یہ جنونی کا ایک جنون ہے جس میں قوم کی قوم اپنی عقل کھو کر ساتھ ہو گئی ہے، مگر وہ وقت دور نہیں جب اس جنونی کا خاتمہ ہو اور اس کے خاتمے کے بعد اس کے ملک کو جنون کی پاداش نہایت بھاری شکل میں بھگتنا پڑے ۔

یہ لڑائی پولینڈ سے شروع ہو کر یورپ میں پھیلی ۔ اور قریب قریب پورے براعظم کو گھیر لینے کے بعد اب روس جا پہنچی۔ اب اس کا امکان ہے کہ قفقاز سے ہوتی ہوئی براعظم ایشیا پر محیط ہو جائے ۔ اول تو اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو اور اس کا فضل و کرم اس فتنہ و فساد کو اس طرف بڑھنے سے روک دے ۔ لیکن جیسے کہ ہر لڑائی کی حالت ہوتی ہے اور خصوصاً اس لڑائی کی نوعیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے لہٰذا ایک عقلمند کی طرح ہمیں غور کرنا ہے کہ اب ہمارا وتیرہ کیا ہونا چاہئے ۔

قاعدہ ہے کہ جب کسی جگہ آگ لگتی ہے تو آس پاس والے یہ سوچ کر کھڑے نہیں رہ جاتے کہ جب آگ ہمارے گھروں تک پہنچ لے گی تو ہم اس کے بجھانے میں مشغول ہوں گے ۔ بلکہ کوشش یہ کرتے ہیں کہ آگے بڑھ کر ہی قابو میں کر لیں ۔ ایشیا میں جب جنگ کے شعلے بھڑکیں تو ہندستان اس کی لپیٹ میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ لہٰذا اپنے گھر کے جلنے کا انتظار کئے بغیر جلتے ہوئے مکانات تک پہنچ کر آگ بجھانا ہی تقاضائے عقل و دانش ہے ۔

چند اداروں یا افراد کے خیال کے مطابق اگر ہم اس وجہ سے جنگ میں امداد نہ دیں کہ ہم کو یا تو اس وقت اپنے شرائط منظور کرا لینے چاہئیں، اور یا اپنی حالت پر صبر و تشکر کر کے اس بناء پر بیٹھ جانا چاہئے کہ یہ آقا رہا تو کیا اور وہ آقا آیا تو کیا، ہم کو تو بہرحال غلامی کرنی ہے تو اس صورت میں ان چیزوں پر غور کرنا ضروری ہے کہ جرمنوں نے اپنے زمانے میں مقبوضات کے افریقی اقوام کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جرمنی میں نازی پارٹی نے اپنے جرمن مخالفین کے ساتھ کیا برتاؤ روا رکھا ۔ موجودہ جنگ میں جن ملکوں کو فتح کر لیا گیا ہے وہاں کے باشندوں کے ساتھ نازیوں کا طرز عمل کیا ہے ۔ جرمن حکومت کا دارومدار اس کی خفیہ پولیس یعنی گسٹاپو پر ہے ۔ گسٹاپو کا اقتدار دہشت، خوف اور قتل عام پر ہے ۔ نازیوں کی کتاب میں حکومت سے مخالفت کا علاج رائفل، مشین گن، کنسنٹریشن کیمپ اور کوڑے مارنے کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ جب صورت یہ ہو کہ اپنی قوم اور ملک کے ان خالص آریوں کے ساتھ جو اُن کی پارٹی کے مخالف تھے ۔ نازیوں نے بدترین سلوک روا رکھا۔

اور کنسنٹریشن کیمپ میں رکھ کر کچوکے دے دے کر قسطوں میں موت کے گھاٹ اتارا تو ایشیائی قوموں کو کیا وہ آنکھوں پر بٹھائیں گے، یا کلیجے سے لگائیں گے؟ باوجود تعریف کرنے کے ہٹلر اس بات کو نہیں بھولتا کہ جاپان ایک زرد قوم ہے۔ مہربانی فرما کر ہندوستان کے باشندے اس نکتے کو سمجھنے کی زحمت فرمائیں۔

ظلم اور بربریت کے اس مجسمہ کے کرتوت کا صحیح نقشہ تصور میں بٹھانے کے لئے یہ بھی سن لیجئے کہ اس کی فوجیں کیسی ہیں۔ کس طرح بڑھتی ہیں، کیا کرتی ہیں، اور قبضہ کیونکر ہوتا ہے؟

ستمبر ۱۹۳۹ء میں پولینڈ پر حملہ بول دیا گیا۔ وہاں سے لڑائی کی آگ ہالینڈ، بلجیم، ڈنمارک، ناروے اور فرانس تک جا پہنچی۔ ہوتا یہ تھا کہ سب سے آگے بھاری سے بھاری دبابے ان کے پیچھے ان سے ہلکے دوسرے دبابے اور پھر دبابے اور پھر دبابے۔ اس طرح ہزاروں دبابے اس کے بعد بھاری آہن پوش فوجی لاریاں اور ان کی قطاریں جو تدریجی طور سے ہلکی ہوتی چلی گئیں۔ اس کے عقب میں پیدل سپاہی اور پھر سوار فوج۔ دبابوں سے لے کر فوج کے عقبی حصے تک میلوں لمبی اس قطار پر ہوائی جہاز سایہ کئے ہوئے جن میں حفاظتی بم مار وغیرہ کی تقسیم الگ موجود۔ اس طرح میلوں لمبا تباہی اور بربادی چھانے والا پورا ایک شہر بہ یک وقت حرکت کرتا ہے۔ یہ فوج ہر اس رکاوٹ کو جو راستے میں آئے آگ برساتی ہوئی تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اس بربادی اور تباہی کی جماعت سے خدا محفوظ رکھے۔ جن ملکوں یا جن لوگوں کو اس سے سابقہ پڑ چکا ہے ان کی مصیبت اور زبوں حالی کا تصور کیا جائے تو کلیجہ منھ کو آتا اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ الامان و الحفیظ۔ یورپ کے جن ملکوں پر تباہی کی اس مشین نے حملہ کیا ان میں سے اکثر نے مردانہ وار حملہ کیا۔ کیونکہ وہ بھی کچھ نہ کچھ تیار تھے۔ اور اس ٹڈی دَل سے سینہ سپر ہونے کے ذرائع رکھتے تھے۔

کاش ہمارے لیڈر اس چیز پر غور کرنے کے بعد آنکھیں کھولتے۔ اور دیکھتے کہ دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے۔ یہ وقت ہے کہ اپنی جان بچاؤ جیتے رہے تو آزادی بھی اچھی حکومت بھی بھلی۔

ہم نے ابھی خشکی پر چلنے والی فوج کا نقشہ دکھایا۔ سمندر پر بھی کچھ کم بربادی اور خوں ریزی نہیں ہوتی۔ جنگی جہاز ایک دوسرے پر گولا باری کرتے ہیں، ہوائی جہاز بم گراتے ہیں۔ مقناطیسی سرنگیں جہاز ڈبوتی ہیں۔ جس میں نہ کوئی امتیاز ہے اور نہ استثنا۔ مچھلی پکڑنے والا جہاز، سامان رسد کا جہاز، پناہ گزینوں کا جہاز، ہسپتالی جہاز، غیر متحارب قوم کا جہاز سب اس سرنگ کا نوالہ ہوتے ہیں۔ جیسا ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ انگلستان سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ایک جہاز امریکہ لے جا رہا تھا، ظالم نازیوں نے اس پر بھی ترس نہ کھایا۔ نازیوں کے اخلاق، ان کی مذہبی رواداری، ان کی ذہنیت اور ان کی پارٹی کے اصولوں کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا تلاش کیا جاسکتا ہے۔

خدا اس مصیبت سے بچائے۔ اور ہم کو اس کی کوئی تدبیر سوچنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین! یہ لڑائی تھوڑا ہی ہے، یہ تو ایک قیامت ہے، مصیبت ہے، آفت ہے اور خدا جانے کیا ہے۔ چونکہ ہم دور ہیں اس وجہ سے ہمیں کوئی اندازہ ہی نہیں ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ ہم کچھ نہ کچھ اندازہ کریں اور اپنی بساط کے موافق اس کے دفعیہ میں حصہ لیں۔ ہو سکے تو لڑائی پر جائیں۔ نہ جا سکیں تو دوسروں کو بھیجیں۔ جانے والوں اور لڑنے والوں کی مدد کریں۔ ہتیار اور سامان جنگ بنانے والے کارخانوں میں ملازمت اختیار کریں یا ملازمین فراہم کریں۔ تاکہ لڑائی کے جیتنے میں سہولت اور عجلت ہو۔ کچھ نہ ہو سکتا ہو تو روپے پیسے سے امداد کریں۔ ہم نہ صرف اس وجہ سے مدد

کریں گے کہ جرمنی یورپ میں برطانیہ سے برسرِ جنگ ہے۔ ادھر ہم پر برطانیہ کی امداد لازمی ہے، بلکہ ہم اس لئے بھی مدد کریں گے کہ "آج وہ کل ہماری باری ہے"، ہمیں اپنی جان بچانے کی خاطر اُن لوگوں کی مدد کرنی ہے جو اِس درندہ کا مقابلہ کر رہے ہیں، جو ہمیں پھاڑ کھانے کو آ رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان بہادروں کی طاقت اور ہمت کسی طرح کم نہ ہونے پائے تاکہ درندہ کو مار کر ٹھنڈا کردیں۔ اور ہماری جان بچ جائے۔

یاد رہے کہ دنیا امن اور چین کا سانس اب اسی وقت لے سکے گی جب ہٹلر کی ہٹلریت ختم ہو جائے۔ ہندوستان والو! اٹھو اور اپنی روایتی خود حفاظتی اور موقع شناسی کو کام میں لاؤ۔ اور قبل اس کے کہ موذی تمہیں ایذا دے اس کا کام تمام کر دو۔

ابن علی

نازیوں کے شیطانی احکام[1]

سرنگیں، تارپیڈو، گیس، طیارے، غبارے، بم
دھوئیں کی چادریں، بندوق، توپیں ہوں تو پھر کیا غم

جہاں میں لاج رکھنی ہے تجھے اے ملتِ نازی
نہ کر اندیشۂ سود و زیاں اور فکرِ بیش و کم

تجھے غارتگرِ امن و سکوں کہتی ہے اک دنیا
چل اب کر دے نظامِ عالمِ امن و سکوں برہم

ملیں تہذیب کی دیوی کو نذریں خونِ انساں کی
جہاں کے چپہ چپہ میں تو ہو ہنگامۂ ماتم

دہانِ توپ سے نکلیں گے آخر امن کے نغمے
فضائے دہر میں تو چھیڑ تو دے موت کا سرگم

عظیم الدین محبت

[1] ۱۳ اسفندار ۱۳۵۱ف ٹاؤن ہال کے مشاعرہ میں پڑھی گئی۔

جنگ اور حیوانی دنیا

انسان کے بہت سارے ہتیار جو اس کی ایجاد ہیں دراصل قدرت کے خزانہ میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ سمندری جہاز کو دیکھئے گویا مچھلی کا ہی تیرتا چلا جاتا ہے۔ انسان بڑے بڑے درختوں کو پانی کے دھارے پر بہتے ہوئے صدیوں سے دیکھتا چلا آتا ہے۔ ان کو دیکھ کر اس نے بھی لکڑیوں کو ایک کے بازو ایک باندھا اور سادہ کشتی بنالی جس پر آج بھی ہندوستان کے اطراف کے سمندروں میں مچھیرے بیٹھ کر مچھلیاں پکڑا کرتے ہیں۔ یہ کشتیاں اپنی بناوٹ میں اتنی ہی سادہ ہیں جتنی کہ بنانے والوں کی عقل۔ سائنس کی ترقی نے اس بنیاد پر عمارت رکھی اور بڑے بڑے جہاز بنا دیئے۔ جہاز امن اور لڑائی دونوں زمانوں میں یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔

ہوائی جہاز ایک اور ایجاد ہے اس کو بھی حیوانوں سے سیکھا گیا ہے عجیب بات ہے کہ زمین اور سمندر میں رہنا جانور اپنی کمتری سمجھتا ہے۔ بہت سارے جانور پرندوں پر رشک کرتے ہیں اور بعضوں نے تو بھونڈے طور پر اڑنا سیکھ بھی لیا ہے۔

زمین پر بسنے والا انسان چین سے نہ بیٹھ سکا۔ ایک کل ایسی نکالی کہ بس اس میں بیٹھا اور آسمانوں سے باتیں کرنے لگا۔ اس پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کتنی باتیں پرندوں سے سیکھی گئی ہیں۔ گدھ سب سے اونچا اڑتا ہے لیکن اڑنے سے پیشتر وہ ہمیشہ چند قدم دوڑے گا، اڑے گا بھی تو ایک دم اوپر کی طرف نہیں بلکہ رفتہ رفتہ اونچا ہوتا جائے گا۔ یہی حال ہوائی جہاز کا ہے وہ پہلے کچھ دور دوڑتا ہے اور پھر زمین چھوڑ دیتا ہے اور رفتہ رفتہ بلند ہوجاتا ہے۔ اترتے ہوئے بھی گدھ اور ہوائی جہاز دونوں کو یکساں عمل کرنا پڑتا ہے۔ تمام پرندوں کے جسم کے اندر تھیلیاں ہوتی ہیں جن میں ہوا بھری ہوئی ہوتی ہیں اس کا مقصد پرندے کے جسم کو ہلکا کرنا ہے کیونکہ پرندہ اگر وزنی ہو تو زیادہ اونچا نہیں اڑ سکتا۔ اسی وجہ سے ہوائی جہاز بھی ہلکی دھاتوں سے بنایا جاتا ہے۔ الومونیم میں چند اور دھاتیں ملا کر اس کو مکا نگڑ مضبوط بنا لیتے ہیں۔ ہوائی جہاز بھی جس قدر بھاری ہوں گے اتنی ہی کم بلندی پر اڑ سکیں گے۔ موجودہ جنگ میں فن لینڈ والوں نے روسیوں کے سارے جہاز مار گرائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روسیوں نے جہاز تو بہت بڑے بڑے بنا لئے لیکن انھیں زیادہ اونچا نہ اڑا سکے۔

پچھلی جنگ میں برطانیہ نے پہلی مرتبہ دبابے یعنی ٹینکس استعمال کئے۔ یہ ایک عجیب چیز تھی۔ اس مشین کے پہیوں پر لوہے کا ایک پٹہ چڑھا رہتا ہے اس پٹے پر بڑے بڑے دانت ہوتے ہیں جن پر یہ مشین راستہ چلتی ہے اس مشین کی خوبی یہ ہے کہ زمین خواہ ہموار ہو یا ناہموار یہ بغیر رکاوٹ کے چلی ہی جاتی ہے اس مشین کے اور سانپ کے چلنے کے طریقہ میں بڑی یکسانیت

ہے۔ سانپ کے لئے بھی زمین کی سطح کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی۔ اس کے پیٹ پر جو چھلکے ہوتے ہیں وہ اس طرح کے ہوتے ہیں کہ سانپ کو پھسلنے نہیں دیتے ان کی پکڑ مضبوط ہوتی ہے۔ لیکن رکاوٹ دونوں کی ایک ہی ہے۔ اگر سانپ کو شیشہ کے بڑے مرتبان میں رکھ دیا جائے جس کی دیواریں اونچی ہوں تو سانپ مرتبان کی سطح چکنی ہونے کی وجہ سے چڑھ نہیں سکے گا۔ (TANKS) دبابوں میں گو سطح چکنی ہونے پر رکاوٹ کا سوال دور کیا گیا ہے لیکن سیدھی دیواروں پر وہ بھی نہیں چڑھ سکتا۔ اسی لئے ٹینک کو روکنے کے لئے کڑی یا لوہے کے ستون گاڑھ لیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ان پر چڑھ کر دوسری طرف اتر نہیں سکتا لیکن انسان نے ان ستونوں کو توڑنے کے لئے دبابہ میں انتظام رکھا ہے۔ ستون اگر قریب قریب اور ترچھے گاڑھے جائیں تو دبابہ ان پر بآسانی چڑھ جائے گا۔

انسان کا ایک اور حربہ ڈبکنی کشتی ہے۔ یہ کشتی پانی کی سطح پر اور سمندر کے اندر بآسانی تیر سکتی ہے۔ یہ اوپر تیرتی ہوئی جہازوں کو بہت دور سے دیکھ لیتی ہے تو فوراً غوطہ لگا کر پانی کے اندر ہی اندر جہاز سے کافی قریب فاصلہ پر پہنچ جاتی ہے اور اس پر تارپیڈو مارتی ہے۔ انسان نے اس ہتیار کو مگرمچھ گھڑیال وغیرہ سے سیکھا ہے۔ مگرمچھ بھی اپنے شکار کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس پر پانی کے اندر سے حملہ کرتی ہے۔ دونوں حملوں میں فرق یہ ہے کہ حیوان خود کو خطرہ میں ڈال کر حملہ کرتا ہے لیکن ڈبکنی کشتی دور ہی سے تارپیڈو مار کر بھاگ نکلتی ہے۔

سمندری جانوروں میں ایک جانور بہت ہی دلچسپ ہوتا ہے .... اس کے ایک ہی آنکھ ہوتی ہے یہ جانور بڑا بے بس ہے اس کو اپنے بچاؤ کے لئے قدرت نے ایک خاص عطیہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے جسم کے اندر ایک تھیلی ہوتی ہے جس میں سیاہی بھری ہوتی ہے اس جانور کا مقابلہ جب کسی خونخوار جانور سے ہوتا ہے تو اس کے لئے بھاگ نکلنے کے سوائے کوئی دوسری صورت نہیں ہے مشکل یہ ہے کہ غریب تیزی سے تیر بھی نہیں سکتا۔ اس لئے یہ غریب ایک دلچسپ حرکت کرتا ہے۔ اپنے جسم کے ساتھ سیاہی کی تھیلی کو سکیڑتا ہے۔ سیاہی پانی میں نکل جاتی ہے اور پھیل کر ایک سیاہ پردہ بنا لیتی ہے۔ حملہ کرنے والا جانور کو نہیں دیکھ سکتا اور یہ اس چادر کی آڑ میں فرار ہو جاتا ہے۔ اس کارآمد نسخہ سے انسان نے خوب فائدہ اٹھایا۔ قدرت نے تو اس حربہ کو کمزور بھاگ جانے والے جانور کو اپنی جان بچانے کے لئے دیا تھا۔ انسان نے حملہ کرنے اور بھاگ نکلنے دونوں کے لئے اس سے فائدہ اٹھایا۔
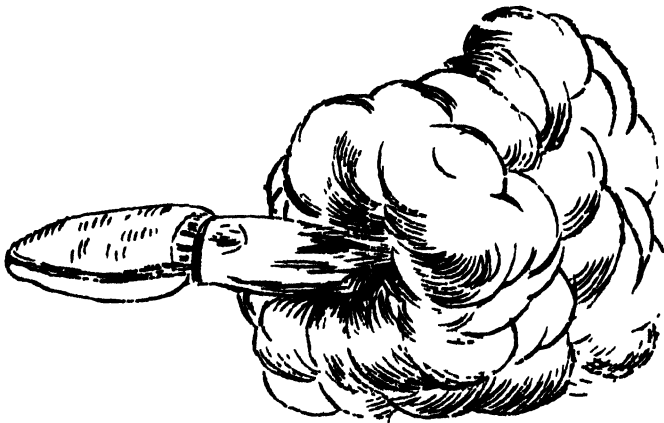
فرانس میں جب جرمن فوجیں پیش قدمی کر رہی تھیں تو انھوں نے بھی اپنے آگے دھوئیں کی چادریں چھوڑیں اور ان کی آڑ میں آگے بڑھتی چلی گئیں۔ فرانسیسی اس حربہ سے ناواقف تھے انھیں سوائے پیچھے ہٹنے کے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ جرمن

ہوائی جہازوں اور اطالیہ کے سمندری بیڑے نے بھی اس ترکیب سے فائدہ اٹھایا۔ حملہ کیا اور جب آثار ٹھیک نہیں دکھائی دیئے تو دھوئیں کی چادریں چھوڑ بھاگ نکلے۔

پچھلی جنگ اور موجودہ جنگ کا ایک اور خطرناک حربہ سرنگیں تھیں ان کا عمل اس طرح ہوتا ہے کہ سرنگ تو پانی کی سطح سے کچھ نیچے رہتی ہے اور دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن اس سے نکلتے ہوئے لانبے لانبے ڈورے ہوتے ہیں جو دور تک پھیلے ہوتے ہیں اور اگر کوئی جہاز گزرتا ہوا ان سے چھو جاتا ہے تو سرنگ پھٹ جاتی ہے اور جہاز کے پرخچے اڑجاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی نئی تدبیر نہ تھی۔ انسان فخر نہیں کرسکتا۔ کہ وہ اس کا موجد ہے قدرت نے اس حربہ کو بھی جانوروں کے بچاؤ اور غذا حاصل کرنے کے لئے عطا کیا ہے۔ یہاں دو جانوروں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک تو بہت ہی ننھا سا جانور ہے جو کائی سے چمٹا رہتا ہے اور جس کا نام ہائیڈرا ہے۔ ہائیڈرا کے منہ کے اطراف بہت سارے ہاتھ نکلے ہوتے ہیں۔ ان ہاتھوں پر ان گنت بال ہوتے ہیں بالوں کی جڑوں میں
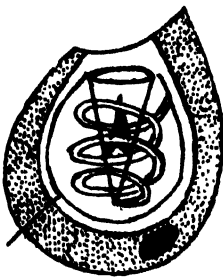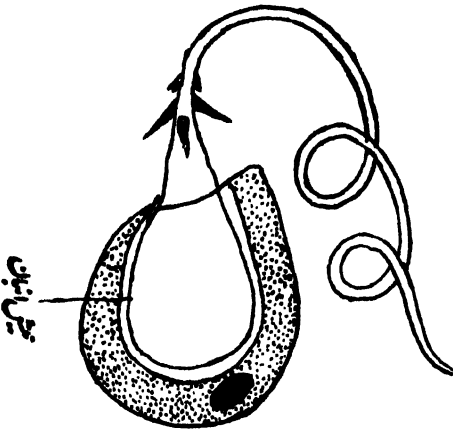
ایک تھیلی ہوتی ہے جس میں زہر اور ایک سوئی رہتی ہے اب اگر کوئی جانور ان بالوں سے چھو جائے تو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سوئی باہر نکل کر جانور کے جسم میں چبھ جاتی ہے بے چارہ جانور اگر چھوٹا سا ہو تو بے ہوش ہو جاتا ہے اور کھا لیا جاتا ہے۔ لیکن بڑا ہو تو فوراً ہٹ جاتا ہے۔ گویا اس سے ہائیڈرا یا تو غذا حاصل کرتا ہے یا خود کو بچا لیتا ہے۔ دوسرا جانور اس سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس کا نام بھی عجیب و غریب ہے اس کو پرتگالی جنگی جہاز کہتے ہیں کیونکہ پرتگال والوں نے ہی پہلی مرتبہ اس کا پتہ لگایا تھا۔ اس کے جسم سے بھی لانبے لانبے ڈورے نکلے ہوتے ہیں ان ڈوروں پر بہت سی ننھی ننھی سی گھنٹیاں لگی ہوتی ہیں۔ یہ گھنٹیاں بجتی نہیں۔ اس میں زہر ہوتا ہے اور جوں ہی کوئی جانور ان ڈوروں سے چھو جائے بس اس پر آفت ہی آجاتی ہے۔ سارا ڈورا اپنی گھنٹیوں کے ساتھ اس سے لپٹ جاتا ہے۔ اور اگر جانور چھوٹا ہو تو مر جاتا ہے۔ انسان کے ہاتھ یا پیر پر بھی اس کی جلن بچھو کے زہر کی جلن جیسی ہوتی ہے۔

مقناطیسی سرنگ جنگ اور صنعتی اعتبار سے نیا ہتیار ہی لیکن قدرت کے خزانے سے لیا گیا تھا۔ اصل میں اس کو حیوانی حجری دنیا کے دو نسخوں کا مرکب کہنا چاہیے۔ مقناطیس لوہے کو اپنے طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اور ہائیڈرا کی مثال کو مدنظر رکھ کر دونوں خصوصیات کو ملایا گیا۔ اور مقناطیسی سرنگ حاصل کی گئی۔

ہوائی چھتریوں سے اترنے والی فوجوں کا نام آپ ہالینڈ کی لڑائی میں سن چکے ہیں۔ اس خطرناک حربہ کا سبق بھی حیوانی دنیا ہی سے لیا گیا ہے۔ جس مقام پر چیونٹیاں کثرت سے ہوں وہاں انسان کے لئے غذا مٹھائیاں وغیرہ چھپا کر رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ عموماً یہی کیا جاتا ہے کہ ان چیزوں کو کسی برتن میں رکھ کر پانی سے بھرے ہوئے لگن میں رکھ دیتے ہیں اب چیونٹیوں کے لئے انتہائی مشکل پیش آتی ہے کیونکہ یہ غذا تک نہیں پہنچ سکتیں۔ ایسی حالت میں اگر چیونٹی کو کہیں اور جگہ آسانی سے مل سکتی ہے تو خیر ورنہ یہ بے تکان محنت کرنے والا اور ہمت کبھی نہ ہارنے والا کیڑا عجیب حرکت کرتا ہے۔ دیوار پر چڑھ کر چھت پر ٹھیک اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جو غذا کے بالکل اوپر ہو وہاں کئی چیونٹیاں ایک دوسرے سے مل کر گچھا سا بنا لیتی ہیں اور پھر چھت چھوڑ دیتی ہیں اب ان کی تقدیر کہ وہ راست غذا ہی پر گریں یا پانی میں۔ گو اس میں خطرہ کا امکان بہت زیادہ ہے لیکن منچلے کیا کچھ نہیں کرتے کئی ایک جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ مردہ چونٹیوں سے پانی پر لگن کے ایک کنارے سے غذا کے برتن تک ایک تیرتا ہوا پل بن جاتا ہے۔ پھر پیچھے انتظار کرنے والی چونٹیوں کے لئے غذا یا مٹھائی پر دھاوا بولنا کس قدر آسان ہے۔ بالکل یہی صورت زندگی سے بیزار چھتریوں سے اترنے والی فوجوں کی ہے۔ فن لینڈ، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس میں کتنے نہیں مارے گئے۔ اور آئندہ نہ جانے کتنے اور مارے جائیں گے۔

ایک اور سب سے قدیم مگر سب سے دلچسپ حربہ لڑنے والوں کا ہے۔ یہ حربہ حملے اور بچاؤ دونوں صورتوں میں مدد دے سکتا ہے۔ یہ بھی قدرت کا سب سے زیادہ آزمایا ہوا نسخہ ہے۔ اس حربہ کا مقصد نظر کو دھوکا دینا ہے۔ چڑیاں اور بچے تتلیوں کے دشمن ہیں۔ اودھر تتلی نظر آئی اور یہ پیچھے دوڑتے ہیں۔ لیکن کچھ دور بھاگنے کے بعد بچے پریشان ہو جاتے ہیں کہ آخر ان کا شکار کہاں چلا گیا۔ ہوتا یہ ہے کہ یہ ننھا سا کیڑا وہیں دب جاتا ہے اس کا رنگ بالکل گھاس کے درخت پھول یا پتہ کے جیسا ہوتا ہے اس لئے وہ نظر نہیں آتا۔ یہی حال چکور، بٹیر، بھورے خرگوش اور مختلف پرندوں کا ہے کہ بالکل قریب پہنچ جانے کے بعد بھی دکھائی نہیں دیتے۔ اور ہم کو خبر اس وقت ہوتی ہے جب وہ ہمارے ہی قدموں میں سے اڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اس دھوکا دینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن کی نگاہ سے بچ جائیں اس لئے اکثر جانوروں کی کوشش ایسے ہی رنگ کی ہوتی ہے جیسا کہ زمین درخت یا پتوں کا رنگ ہوتا ہے جن کے درمیان یہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ برفستان

میں پائے جانے والے ریچھ اور خرگوش کا رنگ بالکل برف جیسا سفید ہوتا ہے۔ قدرت کے اس عطیہ سے فائدہ اٹھاکر فن لینڈ والو نے جن کا ملک برفستان ہے اپنی فوجوں کی وردیاں بھی سفید بنائی ہیں۔ سپاہی پھسلتی ہوئی تختیوں پر تیزی سے روسیوں پر حملہ کرتے اور غائب ہوجاتے تھے۔ روسیوں کو ان کے حملہ کی اطلاع اس وقت ہوتی جب کہ بہت کچھ نقصان ہوگیا ہوتا۔ اسی طرح سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں پر بھی برف جمی رہتی ہے وہاں کے سپاہیوں کا لباس بھی سفید ہے اس فوج کو بھی بھوتوں کی فوج کہتے ہیں۔

یہ تھیں چند چالیں جو انسان نے قدرت سے سیکھیں جنگ اور امن دونوں زمانوں میں قدرت یکساں طور پر انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ انسان میں عقل کی زیادتی کے ساتھ ساتھ انتقام بہیمیت اور دوسرے انسانوں کو مٹانے کے جذبات بھڑکتے ہی چلے جاتے ہیں۔ قدرت کا کارخانہ ایسا نہیں ہے کہ جس میں صرف مٹانا ہی سکھایا جائے بلکہ بنانا بھی سکھایا جاتا ہے۔ آپس میں مل کر رہنا بھی انسان نے چیونٹیوں، شہد کی مکھیوں اور جنگلی جانوروں کے گلوں سے سیکھا ہے۔ لیکن آپس میں مروت اور محبت سے رہنا نہیں سیکھا۔ حالانکہ یہ جانور اپنے ہم جنسوں سے نہیں بلکہ غیر جنس والوں سے اس وقت لڑتے ہیں جبکہ ان کی جنس کی زندگی خطرہ میں پڑجائے مگر انسان!!!

قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

جنگی ڈاک

سید مہدی علی

(میدانِ جنگ ۲۰ جنوری ۱۹۴۲ء)

حبیب!

آج میں تم کو اس مقام پر بیٹھے ہوئے مخاطب کر رہا ہوں جہاں انسانی زندگی بربریت اور خودغرضی کی فولادی زنجیروں میں جکڑی ہوئی موت کی آغوش میں سانس لے رہی ہے۔ جہاں دنیوی اقتدار اور ہوس کی خاطر لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا جارہا ہے۔ آہ ——— وہ مقام جہاں طلبِ دنیا کی دھن میں ہزاروں قربانیاں دی جارہی ہیں۔ انتہائی بے دردی کے ساتھ زندگیوں سے کھیلا جارہا ہے۔

تم روز آنہ جنگی خبریں نہایت بے چینی کے ساتھ سنا کرتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ ان کے سننے کے بعد اختلاج سے کس قدر تمہارا براحال ہوجاتا ہے۔ جنگ کی عبرت انگیز خونریزی اور غارت سے تم کسقدر متاثر ہو۔ موجودہ تہذیب و تمدن اور انسانیت کو ہوس اور خودغرضی کے تباہ کن سیلاب میں بہتے ہوئے دیکھ کر تمھیں کس درجہ صدمہ پہنچتا ہے۔ لیکن حبیب تھوڑی دیر کے لئے غور کرو کہ تم سفر کے بعد سنائی جانیوالی خبروں کو سن کر پریشان ہوتے ہو۔ میدان کارزار کا تذکرہ اور اس کے خیال سے وارفتگی محسوس کرتے ہو۔ جس کی نگاہوں کے سامنے ہزاروں بے گناہ انسان ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہے ہوں، لاکھوں زندگیاں موت کے گھاٹ اتاری جارہی ہوں۔ آہ ——— اس بدنصیب انسان کے قلبی انتشار کا خیال کرو جس کی نظریں کشتوں کے پشتوں پر ہو جس کے کان بم پھٹنے، توپوں کی گرج اور جنگی شور و غل آہ و زاری اور دم توڑتے ہوئے انسانوں کے کراہنے کی صداؤں کے نذر ہوگئے ہوں نہ جانے جنگ کے تاریک پردے میں ابھی میرے لئے کتنی ہولناک مصیبتیں اپنے وقت کے انتظار میں کروٹیں بدل رہی ہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ وہ زندگی ہی کیا جس میں لطفِ حیات نہ ہو؟ وہ جینا بھی کیا جو موت کی آغوش کے نذر ہوجائے۔ آہ زندگی ——— اور وہ بھی ہم غلاموں کی زندگی ——— لیکن یقین رکھو جو شخص دوسرے کو دکھ پہنچاکر خود خوش رہنا چاہے وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔

گرفتارِ غم (ز)

جنگی اور غارت گر جہاز

یہ ایک بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ جنگ کی نوعیت جنگی ساز و سامان اور انسان کے دائرۂ عمل کی وسعت کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے۔ بہت ہی قدیم زمانہ میں جنگ صرف خشکی پر ہوا کرتی تھی۔ لیکن جب انسان نے سمندر پر تسلط حاصل کر لیا تو جہازوں اور جنگی جہازوں کی ضرورت ہوئی۔ اور پھر جب ہوا پر فتح پالی تو ہوا میں زور آزمائیاں ہونے لگیں۔ آج کل جو جنگ ہوتی ہے اس میں جنگ میں حصہ لینے والی قوموں کو ان تینوں قسم کی جنگ کے لئے تیار ہونا پڑتا ہے۔ تاکہ ہر طرح کا مقابلہ کیا جا سکے۔ آج ہم صرف بحری جنگ اور جنگی اور غارت گر جہازوں کا کچھ حال بیان کریں گے۔

جس طرح خشکی کی جنگ میں حصہ لینے والی قومیں مختلف پینترے بدلتی ہیں اور ہر موقع اور ضرورت کے لحاظ سے ساز و سامان تیار کرتی ہیں وہی حال بحری جنگ کا بھی ہے۔ اس کی بھی ایک خاص فنیت ہوتی ہے۔ جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مختلف قسم کے جہازوں کی ضرورت ہے۔ اور ہر ملک اپنی اپنی ضرورت کے لحاظ سے مختلف قسم کے جہاز بنا لیتا ہے۔ لیکن جنگ عظیم کے بعد سے تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں جہازوں کی ساخت پر چند پابندیاں لگا دی گئیں۔ اور جسامت اور ظاہری ساخت کے اعتبار سے ان کے خاص خاص درجے بھی مقرر کئے گئے ہیں۔ مسافروں کے جہاز اور تجارتی جہاز بھی ان پابندیوں سے بچ نہ سکے ان ہی حدود کے اندر فرائض کے اعتبار سے جہازوں کی مختلف قسمیں بنالی گئی ہیں اور کام کی نوعیت کے لحاظ سے انھیں طرح طرح کے ساز و سامان سے مسلح کیا جاتا ہے ان کے نام ہی سے ان کے کام کا بہت کچھ پتہ لگ جاتا ہے جیسے جنگی جہاز، گشتی جہاز، طیارہ بردار جہاز، تباہ کن یا غارت گر جہاز موٹر بوٹ وغیرہ۔ اب ان میں سے بعض کا مختصر حال سنیئے۔

سب سے پہلے ہم جنگی جہاز کو لیتے ہیں۔ جنگی جہاز بڑے اور طاقتور ہوتے ہیں سمندروں میں ان کا راج ہوتا ہے۔ ان کی قیمت ۱۳-۱۴ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو اس سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے ان کی تیاری میں ساری فن کارانہ قابلیت صرف کر دی جاتی ہے۔ اور کچھ اس اہتمام سے بنایا جاتا ہے کہ (SHELL) اور ہوائی حملوں کا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے جنگی جہاز کا مقابلہ صرف جنگی جہاز ہی کر سکتا ہے۔ دوسرے جہاز تو ان کے قریب بھٹک بھی نہیں سکتے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ چھپ چھپا کر حملہ کردیں۔ جنگی جہاز کی ہمراہی میں کئی اور چھوٹے جہاز ہوتے ہیں جو مختلف فرائض انجام دیتے ہیں۔ جنگی جہاز کا خاکہ ڈالنے میں ماہرین اپنی پوری جدت سے کام لیتے ہیں اس لئے کہ خاص خاص حدود کے اندر رہ کر انھیں جہاز کی افادیت کو بڑھانا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی اس کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے کہ اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ وہ کم جگہ

گھیریں اور زیادہ سے زیادہ تیز چل سکیں۔ چنانچہ اگر کوئی جہاز بہت بڑا ہو جائے یعنی اس کا پھیلاؤ زیادہ ہو تو وہ عام بندرگاہوں میں آ جا نہ سکے گا۔ اور اس کی کارکردگی کی صلاحیت متاثر ہو جائے گی۔ ان مقاصد کے تحت جہاز کی میگزین توپیں بائلر اور انجن سب کو جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے سے قریب رکھا جاتا ہے۔ ان سب کے اطراف زبردست فولادی تیر توپ سے پھر اتنے حصے کے اوپر موٹی فولادی چادر کی چھت ہوتی ہے جس کی اوپری سطح سخت اور اندرونی نسبتاً نرم اور لچکدار ہوتی ہے۔ تاکہ اگر بمباری ہو تو وہ ٹوٹنے نہ پائے۔ جہاز کے دوسرے حصوں کی حفاظت بھی کم و بیش اسی احتیاط سے کی جاتی ہے جنگی جہاز بالعموم ۳۵ ہزار ٹن کے دو خول والے جہاز ہوتے ہیں ایک اندرونی اور دوسرا بیرونی۔ اگر دشمن کے تارپیڈو سے اتفاقاً بیرونی خول پھٹ بھی جائے تو اندرونی خول کی وجہ سے جہاز ڈوبنے سے بچ جاتا ہے۔ درستی کرلی جا سکتی ہے۔

اور اس اثنا میں نقص کی

جہاز کا پیندا بہت کمزور ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی حفاظت کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

جنگی جہاز کے بعد گشتی جہاز کا درجہ ہے۔ یہ جہاز بھی جنگی جہازوں کی طرح ہتھیار بند ہوتے ہیں اور ان کی رفتار نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ اس کلاس کے جہاز آج کل نہیں بنائے جا رہے ہیں کیونکہ خود جنگی جہازوں میں رفتار کی تیزی کا خیال رکھا جا رہا ہے پھر بھی تھوڑا سا فرق ضرور ہوتا ہے اگر ہم جنگی جہاز کو اعلیٰ درجہ کا جہاز کہیں تو یہ ان سے چھوٹے بلکہ کافی چھوٹے گشتی جہاز ہیں۔ جن کا وزن بالعموم دس ہزار ٹن ہوتا ہے۔ ان پر پانچ دہانے کی کئی ہلکی توپیں ہوتی ہیں۔ تیز چلتے ہیں اور رفتار کوئی ۳۲ ناٹ کے قریب ہوتی ہے۔ یہ جہاز کئی طرح کے کام انجام دیتے ہیں۔ سب سے پہلا کام ہے گہرے سمندروں میں گشت لگانا۔ دشمن کے جہازوں کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنا اور اگر کہیں ایسا جہاز نظر پڑ جائے تو اسے اپنے حملوں سے پریشان کرکے پسپا کرنا اور اسکی

راہ عمل کو بدلنا۔ چنانچہ حالیہ جنگ میں تین برطانوی گشتی جہازوں (AJAX EXCTER) اور (ACHILLES) نے جرمنی کے (POCKET BATTLESHIP) گراف اسپی کو بری طرح گھیر کر (MONTEVEDO) پر شکار کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اڈمائرل گراف اسپی جرمنی کا بہت اچھا جہاز تھا اور اس کی جنگی قابلیت مسلم تھی لیکن ان تینوں گشتی جہازوں نے اسے اس ہوشیاری سے پسپا کرنا شروع کیا کہ بالآخر اس نے اپنے آپ کو ڈبو ہی لیا۔

ان جہازوں کا دوسرا اہم کام زمانۂ جنگ میں تجارتی اور رسد پہنچانے والے جہازوں کی حفاظت کرنا ہے خطر کے زمانے میں یہ ان جہازوں کو صحیح سلامت اپنی منزل مقصود تک پہنچا آتے ہیں۔ آج کل گشتی جہاز بھی اپنی حفاظت کیلئے چند طیارے ساتھ رکھتے ہیں۔ یہ طیارے وقتاً فوقتاً جہاز کے اطراف گشت لگا کر دشمن کے جہازوں اور آبدوزوں کی نقل و حرکت کو معلوم کرتے اور اس کی اطلاع اپنے جہاز کے ملاحوں کو دیتے رہتے ہیں۔ اس طرح اب ان گشتی جہازوں کا دائرۂ عمل بہت بڑھ گیا ہے۔ اور ان کی کارکردگی میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

آج کل ایک اور خاص قسم کے جہاز بھی استعمال کئے جا رہے ہیں جو صرف طیارہ بردار ہوتے ہیں۔ یہ جہاز کافی بڑے ہوتے ہیں۔ ان پر ایک بہت بڑا عرشہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر کافی تعداد میں مختلف قسم کے جنگی ہوائی جہاز ہوتے ہیں جنھیں ضرورت پر
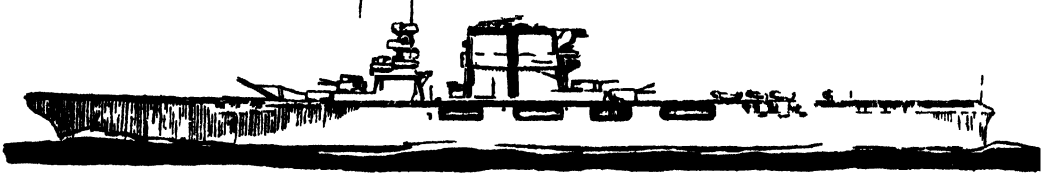
عرشہ پر لاکر اڑایا جاتا ہے۔ آج کل کی جنگ میں یہ بڑے کارآمد جہاز ثابت ہوئے ہیں کیونکہ ہوائی حملے کا بچاؤ طیارہ گرانے والی توپ سے زیادہ خود طیارہ کرسکتا ہے جب کبھی ہوائی خطرہ کی اطلاع ملتی ہے تو فوراً طیارے ہوا میں نکل آتے اور بڑھ کر اپنی گولیوں سے دشمن کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہاں ایک بات ذرا یاد رکھنے کے قابل ہے کہ طیارہ بردار جہاز کے طیارے کبھی اپنے جہاز سے قریب میں جنگ نہیں کرتے بلکہ ذرا پرے ہٹ کر لڑتے ہیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خود اپنے جہاز کی طیارہ گرانے والی توپوں کا نشانہ بن جائیں۔ ان جہازوں پر بلند زاویہ کی طیارہ گرانے والی توپیں بھی ہوتی ہیں جو دشمن کے ہوائی جہاز کی ٹکڑیوں اور بمباروں کو نشانہ بناتی ہیں۔ برطانوی بحریے میں تو ایسے حملوں کے لئے خاص جہاز ہی بنائے گئے ہیں جن کو ہوائی حملے کی مدافعت کے جہاز یا (ANTI AIRCRAFT SHIPS) کہتے ہیں۔ اصل میں یہ گشتی جہاز ہی ہیں جن پر دوسرے آلات کے ساتھ بلند زاویہ کی طیارہ شکن توپیں چڑھی ہوتی ہیں۔ یہ جہاز خاص طور سے بندرگاہ اور اس کے جہازوں کی حفاظت کے لئے بہت کارآمد ہیں۔

بحری جنگ میں سب سے اہم اور مشکل کام تباہ کن یا غارت گر جہازوں کا ہے۔ پہلے ان جہازوں کا نام ان کے کام کے لحاظ سے "تارپیڈو کشتی کو تباہ کرنے والا جہاز" تھا۔ لیکن اب ان کی تباہ کاری کا دائرہ محدود نہیں رہا۔ بلکہ وسیع ہوگیا ہے۔ اس لئے انہیں صرف تباہ کن یا غارت گر جہاز" ہی کہتے ہیں ان جہازوں میں تارپیڈو کی چار پانچ نالیاں لگی ہوتی ہیں جن سے جہازوں پر خطرناک حملے کئے جا سکتے ہیں۔ جسامت اور وزن کے لحاظ سے تباہ کن جہاز بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں

ان کے فرائض یہ ہیں۔ اول تو وہ جنگی جہاز کی ہمراہی میں رہتے ہیں اور ہر بیرونی حملے پر سینہ سپر ہوجاتے ہیں۔ ان کی رفتار کافی تیز یعنی ۳۰ ناٹ ہوتی ہے۔ اس طرح سے وہ جنگی جہاز کے اطراف بڑے مزے میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اگر دوران جنگ میں جنگی جہاز کو کسی وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑے تو یہ آگے بڑھ کر دشمن کے جہاز پر تارپیڈو سے حملہ شروع کردیتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ اپنی سبک رفتار کے باعث دشمن کے جوابی حملے سے بچتے رہتے ہیں۔ یہ ان کی سب سے بڑی ستم ظریفی ہے۔

عام طور پر سب تباہ کن جہاز اور خصوصیت کے ساتھ برطانوی تباہ کن جہاز حفاظتی اور مدافعتی فرائض انجام دیتے ہیں۔ تجارتی جہازوں کی حفاظت ان کا مقدس فریضہ ہے۔ ان کو خطرات سے بچانے کے لئے وہ بلا کھٹکے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دیتے ہیں۔ یوں کہئے کہ وہ اچھے خاصے سمندر کے پہرہ دار ہیں۔ ان کا سب سے بڑا حربہ

تارپیڈو ہے۔ لیکن ان کے علاوہ یہ ۶، ۴ انچ کی کم و بیش آٹھ توپوں سے بھی مسلح ہوتے ہیں۔ ان پر غیر ضروری چیزیں بہت کم ہوتی ہیں تاکہ رفتار پر اثر نہ پڑے۔ یہ جہاز ان فرائض کے علاوہ دشمن کے بھولے بھٹکے اور تجارتی جہازوں کا پیچھا کر کے انھیں بُری طرح تباہ اور تہ آب کر دیتے ہیں۔

یہ تو ہوئی بڑے جہازوں کی تفصیل۔ ان کے علاوہ ان سے چھوٹے جہاز بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ گو جسامت کے اعتبار سے یہ مختصر ہوتے ہیں لیکن ان کے فرائض کی تفصیل اہم ہے۔ ان کے نام خود ان کے کام کو ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے سرنگ بچھانے والے جہاز سرنگ کاٹنے والے جہاز جال بچھانے والے جہاز شایعتی جہاز (ESCORT VESSEL) حفاظتی جہاز، موٹر، تارپیڈو، کشتیاں رسد پہنچانے والے جہاز درستی کے جہاز وغیرہ۔

ان جہازوں کے علاوہ تین قسم کے اور جہاز قابل ذکر ہیں (۱) آہن پوش جہاز کا کام ساحل اور ساحلی قلعوں کی حفاظت ہے۔ اس پر دو بڑی توپیں ہوتی ہیں۔ چونکہ اس میں رفتار کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھا جاتا اس لئے یہ پوری طرح مدافعتی آلات سے مسلح ہوتے ہیں یہ ساحل سے بہت قریب رہتے ہیں اور بیرونی حملوں کا جواب ڈٹ کر دے سکتے ہیں۔ دوسرا (GUNBOAT) ہے یہ اصل میں بہت چھوٹا سا جنگی جہاز ہے۔ اس پر دو ایک ہلکی توپیں ہوتی ہیں۔ یہ اپنی حیثیت کے مطابق صرف بڑے بڑے دریاؤں کی پہرہ داری کرتا ہے۔ چنانچہ چین کے بحری اسٹیشن پر برطانیہ کے کئی (GUN BOAT) یانگ سی کیانگ اور دوسرے دریاؤں میں پہرہ داری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ تیسرے سروے کرنے والے جہاز ہیں۔ یہ جہاز لڑاکا نہیں ہوتے۔ ان کا کام پوری صحت کے ساتھ سمندروں کی پیمایش کر کے بہتر سے بہتر نقشے مرتب کرنا ہے بحریہ کو ان جہازوں کی سخت ضرورت ہے کیونکہ جب تک صحیح راستے معلوم نہ ہوں اور مختلف مقامات پر سمندر کے حالات کا علم نہ ہو جنگی جہازوں کی کارکردگی موثر نہیں ہو سکتی۔

برطانیہ کی بحری طاقت جرمنی اور اٹلی کی مشترکہ بحری طاقت سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک تو یہ بات ہوئی اور دوسرے ساز و سامان کے لحاظ سے برطانیہ کے جہاز ایسے اعلیٰ درجے کے ہیں کہ جرمنی کا ایک بھی جہاز اس پایہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ عظمیٰ کو سارے سمندروں پر تسلط حاصل ہے۔ اور ان کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اسی باعث لارڈ بیلی فیکس نے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا اور سچ کہا تھا کہ ــــــ

"برطانوی بیڑہ اتنا زبردست ہے کہ اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

فیض محمد صدیقی

ہندوستان اور جنگ

۱۹۱۴ء کی ہولناک جنگ اور اس کے ڈھائے ہوئے مصائب کو ابھی دنیا بھولنے نہ پائی تھی کہ فیورر اڈالف ہٹلر نے اسے پھر ایک ایسی نئی لڑائی میں الجھا دیا جس کی مثال تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ بدقسمتی سے ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب برطانیہ اور اس کے حلیفوں کو جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا پڑا، انگلستان ان مدبرین کی بدولت جو جنگ سے پیشتر ماموراور مفاہمت یعنی (APPEASEMENT) کی پالیسی پر عمل پیرا تھے، جنگ کے لئے جیسا چاہئے تیار نہ تھا۔ چمبرلین کی حکومت جنگ کے ابتدائی آٹھ ماہ تک کسی نہ کسی طرح لڑکھڑاتی ہوئی کام کرتی رہی۔ لیکن برطانوی پبلک ان کی جنگی مساعی سے مطمئن نہ ہو سکی اور بالآخر اُن کو حکومت کی باگ ڈور مسٹر چرچل جیسے فرسی، مستعد اور کارفرما مدبر کے حوالے کرنی پڑی۔ چرچل نے حکومت کا جائزہ لینے کے بعد برطانوی سلطنت کے باشندوں کو کامیابی کے سبز باغ نہیں دکھلائے، بلکہ اپنی ایک ابتدائی تقریر ہی میں آنے والے خطرے سے ان کو آگاہ کیا۔ اور کہا کہ انھیں خون، آنسو، محنت اور عرق ریزی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ چنانچہ پوری سلطنت نے یک دل و یک جان ہو کر ان کی صدا پر لبیک کہا۔ اور دو سال کی لگاتار کوشش کا نتیجہ ہے کہ آج سلطنت برطانیہ کا سیاسی اور فوجی موقف اس سے بدرجہا بہتر ہے جو آغاز جنگ کے وقت تھا۔

(۲) جنگ چھڑنے کے بعد ہندوستان میں خیالات کی جو افراتفری رہی اس سے بہت کم لوگ ناواقف ہوں گے۔ جوں ہی جنگ کا اعلان ہوا مہاتما گاندھی کو یہ کہنے میں دریغ نہ ہوا کہ ہم سب کچھ چاہتے ہیں لیکن برطانیہ کی تباہی نہیں چاہتے۔ کانگریس نے محض اتنی سی بات پر وزارتیں واپس کر دیں کہ جنگ کا اعلان ہندوستانی قوم سے پوچھے کچھے بغیر کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے کانگریس کی پالیسی واضح نہیں رہی ہے۔ کبھی وہ اشتراک عمل کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور کبھی اہمسا کے نظریے کی وجہ سے جنگ میں حصہ لینے سے خود کو معذور پاتی ہے۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ وہ بھی برطانیہ کو ایسے آڑے وقت میں مشکلات میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی۔ مسلم لیگ کی روش اِس سے بھی زیادہ صاف رہی ہے۔ وہ مرکزی حکومت میں چند تبدیلیوں کے ساتھ مکمل تعاون کے لئے آمادہ ہے۔ اور اِس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے اراکین کو کارہائے امداد جنگ مثلاً ضلع واری یا صوبائی جنگی کمیٹیوں میں شرکت سے منع نہیں کرتی۔ اگر ہندوستان کی یہ دو بڑی سیاسی جماعتیں دستوری ترقی کو ایک گھر یلو مسئلہ سمجھ کر اسے ختم جنگ تک اٹھا رکھتیں تو اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی جنگی مساعی کو ان کے تعاون سے بہت مدد ملتی۔ لیکن اس کے بغیر بھی یہ امر لائق تشفی ہے کہ جنگ کے لئے ہندوستان کی جانب سے ہر قسم کی کافی مدد اب تک دی جا چکی ہے اور دی جا رہی ہے۔

(۳) اب تک ہندوستانی فوج کئی مورچوں پر دشمن سے متصادم اور اپنی ضرب المثل جواں مردی سے دشمن کو زیر کر چکی ہے۔ حبشہ کو اطالوی غلامی سے نجات دلانے میں ہماری فوجوں نے بہت ممتاز حصہ لیا۔ اِسی طرح آسٹریا اور سومالی لینڈ میں بھی ہماری فوجیں بہت بے جگری سے لڑیں۔ اور خاص کر کیرین کے فتح کرنے میں تو اُن کا بڑا ہاتھ رہا۔ اِس وقت وہ مغربی ریگستان میں نہایت بہادری کے ساتھ لڑ رہی ہیں۔ چنانچہ جالو اور سدی عمر کی فتح کا سہرا اُن ہی کے سر رہا۔

(۴) ہندوستانی فوج جس کی تعداد امن کے زمانے میں صرف دو لاکھ تھی ۔ اب بڑھ کر دس لاکھ ہوچکی ہے ۔ اور ہر مہینہ اس تعداد میں پچاس ہزار رکروٹوں کی بھرتی سے اضافہ ہو رہا ہے ۔ ہندوستانی فوجی عہدہ داروں کی تعداد جنگ کے پہلے انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی، اب سیکڑوں تک پہنچ گئی ہے ۔ ہندوستانی فوج کا ایک بڑا حصہ میکانکی آلات سے آراستہ کیا جاچکا ہے ۔ سمندری بیڑے کے ہندوستانی عہدہ داروں میں پچاس فی صد اور ملاحوں کی تعداد میں (۱۰۰) فی صد کا اضافہ ہوچکا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاہی ہندوستانی بیڑے میں توسیع کے بہت کچھ امکانات ہیں، تاہم اس بیڑے کی یونٹوں نے موجودہ جنگ میں بندر شاہ پور، بحیرۂ احمر، بحیرہ متوسط اور بحر قلزم میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں اور جن کا اعتراف جنرل ویول کمانڈر ان چیف نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں بھی کیا ہے، وہ ہمارے فخر و مباہات کا موجب ہیں ۔

(۵) جنگی صنعتوں کو بھی خاصی ترقی دی گئی ہے ۔ چیٹ فیلڈ اسکیم کے تحت فولاد کا ایک عظیم الشان کارخانہ وجود میں آچکا ہے اور اس ملک میں بموں، توپوں اور شلوں کی تیاری کے انتظامات عمل میں آچکے ہیں ۔ ان کارخانوں کے قیام سے جنگی سامان کا بڑا حصہ ہندوستان میں تیار اور ایک طرف مشرق میں سنگاپور اور دوسری طرف مغرب میں ایران، عراق، مصر اور لبیا وغیرہ تک کی فوجوں کو سربراہ کیا جارہا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستان تمام مشرقی دنیا کا سلح خانہ اور ذخیرہ گاہ بنا ہوا ہے ۔

(۶) جنگی صنعتوں کے قیام اور ان کو چالو رکھنے کے لئے کافی تعداد میں فنی کاریگروں کی فراہمی ضروری ہے ۔ چنانچہ اس غرض کے لئے جہاں ۱۹۴۰ء میں (۱۶) مرکز قائم کرنے اور (۳۰۰۰) آدمیوں کو تربیت دینے کا خیال تھا ۔ آج (۲۸۷) مرکز قائم کئے جاچکے ہیں، جن میں بہ یک وقت تخمیناً اٹھارہ ہزار کاریگروں کی تربیت کی گنجائش موجود ہے ۔ اور اب منصوبہ یہ ہے کہ ختم مارچ ۱۹۴۲ء تک اڑتالیس ہزار کاریگر تیار کئے جائیں اور بہ یک وقت پچیس ہزار کاریگروں کی تربیت کا انتظام رکھا جائے ۔ شاید یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جنگی اغراض کے مدنظر دوران جنگ میں جو صنعتیں قائم ہوں گی انھیں امن کے زمانے میں روزمرہ کی ضروریات تیار کرنے کے کام میں لانا ممکن ہوگا ۔ اور ان صنعتوں کے قیام کے لئے جو کاریگر تیار کئے جائیں گے وہ حالت امن میں ہماری صنعتی ترقی کے لئے بہترین اثاثہ ہوں گے ۔

(۷) ممکن ہے کہ صحیح رہبری کے فقدان کی وجہ سے برٹش انڈیا کے باشندوں کو جنگی امداد کے متعلق فیصلہ کرنے میں دقت ہوئی ہو ۔ لیکن حیدرآباد کی رعایا کا معاملہ صاف ہے ۔ وہ اپنے بادشاہ کے شیدائی ہیں، اور حضور پرنور کی انگلی کے ایک اشارے پر تن، من دھن قربان کرنے کو اپنی سعادت ہی نہیں بلکہ نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔ جنگ چھڑنے کے ایک ہفتے کے اندر ارشاد ہوتا ہے کہ :-

> "جس طرح سے میرے بزرگوں نے زمانۂ گزشتہ میں برٹش گورنمنٹ کے نازک آوان میں مدد کی تھی یا جس طرح سے میں نے گزشتہ جنگ ۱۹۱۴ء میں ہر ممکن طریقے سے خدمات کی تھیں، بلعینہٖ اسی طرح اس دفعہ بھی تیار ہوں، اور ایسا کرنا اپنی حد تک فرض تصور کرتا ہوں تاکہ جو لقب "یار وفادار" کا میرے خاندان کو برٹش گورنمنٹ نے عطا کیا ہے اس کا صحیح معنی و مفہوم دنیا کی آنکھوں کے سامنے قائم رہے" ۔

(۸) حضرت بندگان اقدس کا یہ ارشاد جملہ رعایا و برایا کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتا رہا ہے ۔ چنانچہ حضرت پیر و مرشد نے

جیب خاص سے جو تیرہ لاکھ کی رقم عطا کی ہے، اس کے علاوہ اب تک حکومت سرکار عالی کی جانب سے تین رجمنٹیں جنگی خدمات کے لئے روانہ کی جا چکی ہیں۔ جنگی تنخواہوں وغیرہ کا بار حکومت اٹھا رہی ہے۔ ماہانہ (۱ ½) لاکھ روپے کلدار کا مستقل عطیہ جنگ ختم ہونے تک دئے جانے کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ ہوائی بیڑے کی فراہمی کے لئے (۲۰) لاکھ اور ایک جنگی جہاز کی تیاری کے لئے (۲۰) لاکھ کا چندہ حکومت کی طرف سے دیا جا چکا ہے۔ اور دفاعی قرضوں میں اب تک دو کروڑ روپے لگائے جا چکے ہیں۔ علاوہ بریں سالانہ (۱۰۰) ہوائی ملاحوں اور پانچ سات سو فنی کاریگروں کی تربیت کا انتظام کیا گیا ہے۔ نیز مختلف صنعتوں کے قیام سے جنگی سامان فراہم کرنے میں مدد دی جا رہی ہے۔ علاوہ ان کارخانوں کے جو ملک میں پہلے ہی سے قائم ہیں، جیسے کہ کپڑے کی گرنیاں ہیں جو زیادہ سے زیادہ مقدار میں فوجی ضروریات کو پورا کر رہی ہیں، جدید صنعتوں کا قیام بھی عمل میں لایا جا رہا ہے۔ جو لڑائی کے زمانے میں فوجی ضرورتوں کو پورا کریں گی۔ اور جنگ کے ختم ہونے پر عامہ رعایا کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔ چنانچہ دواسازی کا ایک کارخانہ قائم کیا جا چکا ہے۔ اور اس کے علاوہ صنعتی ترقی کا ایک وسیع اسکیم منظور کیا جا چکا ہے۔ جس کی تکمیل پر کیمیائی اشیاء مثلاً گندک، کا تیزاب اور اس سے حاصل کردہ ضمنی اشیاء، شیشے کی چادریں اور برتن، گلوکوز اور اسٹارچ نیز کیسین وغیرہ بڑے پیمانے پر تیار کرنا ممکن ہوگا۔ رعایائے سرکار عالی نے سقامت ہنگام اور دیگر نامساعد حالات کے باوجود نہایت فراغ دلی سے ہر کین فنڈ میں (۲۰) لاکھ کی معتدبہ رقم فراہم کی اور پرنس آف برار کے سرمایہ اغراض جنگ میں اب تک (۵) لاکھ چندہ دے چکی ہے۔ خواتین بھی مقدور بھر مدد کر رہی ہیں۔ چنانچہ جنگی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے نرسیں تیار کی جا رہی ہیں۔ اور ہر ہائی نس پرنسز درشہوار اور مسز گڈنی کی قیادت میں ہندوستانی افواج کو جو بیرون ہند بھیجی گئی ہیں اور حیدرآبادی یونٹوں کو جو ہندوستان ہی میں کام کر رہی ہیں کثیر تعداد میں آسائش بخش اشیاء بطور تحفہ روانہ کی جا چکی ہیں، جن کی مجموعی مالیت کا اندازہ (۸۱) ہزار روپے کیا جاتا ہے۔

(۹) آج کل کے حالات کے لحاظ سے ایک طرف افغانستان اور دوسری طرف برما سے متصل ہندوستان کی سرحد کا تصور قائم کرنا درست نہ ہوگا۔ ہندوستان کی سرحد تو دراصل وہ خطوط ہیں جہاں دشمن سے ہمیں دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ یعنی مغرب میں قفقاز اور لیبیا، مشرق میں ملایا اور سنگاپور وغیرہ۔ کیونکہ اگر دشمن کو ان بیرونی چوکیوں پر نہیں روکا گیا تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کو ہر قسم کے خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا جس کے امکانات جاپان کے مکارانہ حملہ کی وجہ سے عملی سیاسیات کے حدود میں آچکے ہیں۔ ایسی صورت میں کہ جنگ کے شعلے روز بروز ہمارے ملک سے قریب تر آتے جا رہے ہیں عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ان شعلوں کا مقابلہ گھر کے باہر ہی کیا جائے۔ تاکہ ہمارا ملک جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ اور ہمارے اہل و عیال جنگ کی مصیبتوں سے مصئون رہیں۔ ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ جنگ کا جلد سے جلد خاتمہ ہونا انسانیت کے لئے ضروری ہے، تاکہ آئے دن جنگ کے دیوتا کے سامنے جو لاکھوں جانیں بھینٹ چڑھ رہی اور بے شمار گھر برباد ہو رہے ہیں یہ سلسلہ ختم ہو۔ پس اگر ہم دراصل یہ چاہتے ہیں کہ جنگ جلد سے جلد ختم ہو تو کیا یہ ہمارا فریضہ نہیں ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ مدد دیں۔ اور اس قضیہ نامرضیہ کو اپنے موافق مرام حالات میں ختم ہونے دیں؟

(۱۰) ہٹلر بارہا اس کا اعادہ کر چکا ہے کہ وہ سیاسیات میں اخلاقی قوانین کا قائل نہیں ہے۔ یہ بھی کہہ چکا ہے کہ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں

کا وقت گزر چکا ہے۔ اور اس کا بھی دعویٰ کر چکا ہے کہ جرمن قوم دوسری قوموں کے ساتھ برابری نہیں بلکہ ان کے اوپر برتری چاہتی ہے تو کیا اب ہم پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ قوت کا جواب قوت سے دے کر یہ ثابت کر دکھائیں کہ وہی قوت دیرپا ہو سکتی ہے جو "جیو اور جینے دو" کے اصول پر مبنی ہو۔ اور دنیا صرف اسی وقت رہنے کے قابل جگہ ہو سکتی ہے کہ اس میں کمزور انسانوں کو اور چھوٹی چھوٹی اقوام کو اسی طرح زندہ رہنے کا حق حاصل ہو، جس طرح کہ تنومند افراد یا بڑی بڑی قوموں کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہر ممکنہ طریقے سے نازیت اور اس قبیل کی دیگر جملہ تحریکات کو نیست و نابود کرنے میں مدد دیں۔

خواجہ معین الدین انصاری

نئی کتابیں

۱ پیغام قرآن (مصر کے امام رشید رضا کی کتاب کا ترجمہ) از عبدالمجید قریشی ۲۳۶ صفحے۔ تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور۔
۲ تذکرۂ روسائے پنجاب۔ باتصویر، جلد اول و دوم، ترجمہ سید نوازش علی۔ ۷۳۷ صفحے۔ سری الکٹرک پریس لاہور۔
۳ کربلا (ناول) از منشی پریم چند۔ قیمت عہ۔ لاجپت رائے اینڈ سنز۔ لاہور۔
۴ روٹھی رانی (تاریخی افسانہ) از منشی پریم چند۔ قیمت ۱۲ر۔ لاجپت رائے اینڈ سنز۔ لاہور۔
۵ پنڈت جی (ناول) از سرت چندر چیٹرجی۔ مترجمہ گوپال متل۔ قیمت عہ۔ لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور
۶ حیات مصطفےٰؐ۔ از صوفی عبدالرحمن ۲۰۶ صفحے۔ حمایت اسلام پریس لاہور
۷ بڑی دیدی ناول از سرت چندر چیٹرجی۔ مترجمہ بھاگوت شرما ۱۷۶ صفحے قیمت ۱۲ر۔ مرکنٹائل پریس لاہور
۸ ضرب محمود (تاریخی ناول) از احسان علی شاہ۔ ۴۹۰ صفحے۔ کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور
۹ شہباز کی بیٹی (افسانہ) از محمد حسین راز۔ ۲۶۹ " " " " " "
۱۰ خونی ٹولہ (افسانہ) از پی۔ ایس۔ نسیم انبالوی ۳۱۵ " " " " " "
۱۱ نفس معشوق (افسانہ) از نظر ۱۳۳ صفحے۔ آر حجازی پریس لاہور
۱۲ بصرے کا ظالم گورنر۔ دوسرا ایڈیشن (تاریخی ناول) از حبیب اللہ۔ ۲۷۲ صفحے۔ کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور
۱۳ شمع نازنین (افسانہ) از ریاض دہلوی ۲۰۴ صفحے۔ آر حجازی پریس لاہور
۱۴ شرمناک افسانے۔ دوسرا ایڈیشن۔ از واہی وہانوی۔ ۱۷۶ صفحے قیمت ۱۲ر نسیم بک ڈپو۔ لکھنو۔
۱۵ پریم شاستر۔ گیارہواں ایڈیشن۔ از رام رکھامل ۲۲۸ صفحے۔ مرکنٹائل پریس لاہور
۱۶ سامدرک کی لال کتاب کے ارمان۔ از گردھاری لال شرما ۴۸ صفحے۔ حجازی پریس لاہور
۱۷ پاکستان اور مسلمان (دوسرا ایڈیشن) از انیس الرحمن ۱۸۸ صفحے۔ نامی پریس۔ الہ آباد۔
۱۸ انتظام مدرسہ و درجہ (تیسرا ایڈیشن) از جوشی پریم، جوشی سرنیواس۔ ۲۴۵ صفحے۔ اندرا پرنٹنگ ورکس۔ الموڑا

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

خرمن:۔ یعنے مجموعۂ کلام حامد اختر نظر حیدرآبادی۔ ناشر مرزا مظفر بیگ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد۔ یہ کتاب ملک کے ایک ہونہار اور نوخیز شاعر نظر کی چند نظموں کا مجموعہ ہے جس کا پیش لفظ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے تحریر کیا ہے۔ جس کے آخر میں انھوں نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

"خداوند تعالیٰ اس نوجوان کو علم دے اور نظر دے"

ڈاکٹر صاحب نے پیش لفظ کے اس ٹکڑے میں جس مربیانہ انداز میں دعا دی ہے وہ خدا کرے کہ اس ہونہار شاعر کے حق میں قبول ہو۔ پیش لفظ سے قبل ایک تعارف ہے جو نواب بہادر یار جنگ بہادر سے لکھایا گیا ہے۔ جس میں صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ :۔

"فطرتاً ان کے اندر وہ سب جراثیم پائے جاتے ہیں جو ایک اچھے شاعر کے لئے ضروری ہیں۔ ان کا حال بھی کچھ کم روشن نہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ ان کا مستقبل ان کے حال سے زیادہ درخشاں ہوگا۔"

پیش لفظ کے بعد ایک دیباچہ ہے جو شاعر کے دوست محمد عمر مہاجر ایم۔ اے (عثمانیہ) کا نتیجۂ قلم ہے۔ اصل کتاب خود مصنف کے ایک پیش لفظ سے شروع ہوتی ہے، جو منظوم ہے۔ اور اس کے بعد متعدد نظمیں ہیں۔ یہ سب نظمیں جدید اردو شاعری کا اچھا نمونہ سمجھی جاسکتی ہیں۔ نظر ملک کے جلیل القدر استاد حضرت علی اختر کے نور نظر ہیں۔ اور ان کو شاعری کا ملکہ ورثہ میں ملا ہے۔ یہ ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ اور اس میں انھوں نے جو غیر معمولی دلچسپی لی ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے والد علی اختر اور دادا کاظم حسین باغ کی زندگی ہی میں اور ان دونوں کے مقابلے میں اوائل عمر ہی میں بہ حیثیت شاعر کے مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق کی بات ہے کہ ان کے والد یعنی حضرت اختر کی غزلوں کا غیر فانی مجموعہ بھی "انوار" کے عنوان سے اس خرمن نظر سے چند ماہ قبل ہی ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہوچکا ہے۔ ورنہ مجموعۂ کلام کی اشاعت میں اس جواں سال فرزند ہی کو تقدم حاصل ہوجاتا۔ توقع ہے کہ یہ مجموعہ مقبولیت حاصل کرے گا۔ اور ان مجموعوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا جو ہونہار شاعر کے رشحات قلم سے آئندہ شائع ہوں گے۔

غلامانِ اسلام:۔ از مولنا سعید احمد ایم۔ اے فاضل دیوبند۔ ناشر ندوۃ المصنفین دہلی۔ اس میں ان مقتدر ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و جستجو سے یک جا کئے گئے ہیں۔ جن کو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود اسلامی معاشرہ میں پوری عظمت حاصل ہوئی اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور اصلاحی کارنامے تاریخ اسلام کا اہم عنصر سمجھے جاتے ہیں۔

ابتداء میں ایک مقدمہ ہے، جس میں غلام کے اسلامی تصور، آزاد کردہ غلام کی حیثیت اور حقوق وغیرہ سے متعلق ضروری معلومات درج کی گئی ہیں۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، جس میں پہلی فصل ان غلاموں سے متعلق ہے جنھیں صحابہ کرامؓ ہونے کی فضیلت حاصل تھی۔ ان میں حضرت بلال، حضرت سلمان فارسی، حضرت زید، حضرت عمار بن یاسرؓ اور دیگر آٹھ دس اصحاب شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے حالاتِ زندگی، خدمات اور وفات تک کے ضروری امور درج کئے گئے ہیں۔

دوسری فصل میں ان غلاموں کا ذکر ہے جو طبقۂ تابعین میں شامل تھے۔ تیسری فصل میں اتباع تابعین کے عہد کے غلاموں کا تذکرہ لکھا گیا ہے۔ چوتھی فصل میں ارباب کشف و کرامات کا ذکر ہے۔ یعنی ان غلاموں کا جنھوں نے راہِ سلوک طے کرکے عرفان الٰہی میں

خاص رتبہ حاصل کیا۔ اور ولایت وسیادت کے درجے تک پہونچے۔ آخری فصل میں وہ غلام پیش کئے گئے ہیں، جو علماء، شعراء اور ادبا کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ غرض پوری کتاب ان لوگوں کے لئے ایک شمع ہدایت ثابت ہوسکتی ہے، جو احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور اپنی کسی نہ کسی قسم کی کمزوری مثلاً نسلی، مالی، طبقہ واری کو عذر یا حیلہ کے طور پر پیش کرکے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کسی ترقی کے اہل نہیں۔

اسلامی معاشرت میں رنگ، نسل، فرقے اور طبقے کا کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ اور ہر شخص اپنی ذاتی صلاحیت اور جدوجہد سے اعلیٰ سے اعلیٰ رتبہ حاصل کرسکتا ہے۔ جو لوگ اور خاص کر نوجوان، عہدِ حاضر میں یہ سمجھتے ہیں کہ افلاس کی وجہ سے یا کمزور طبقے میں پیدا ہونے کی وجہ سے وہ ہر قسم کی ترقیوں سے محروم ہیں۔ اِس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔

قومیت اور بین الاقوامیت ۔ از محمد قاسم حسن بی اے۔ بی ٹی۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی ۔ زیر نظر کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں قومیت کی تشریح کی گئی ہے اور اس کی اصطلاحوں کو اختصار کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ دوسرا باب ان عناصر سے بحث کرتا ہے، جن پر قومیں منحصر ہوتی ہیں۔ ان کے سلسلے میں نسل، وطن، زبان، مذہب، تہذیب، سیاست، جغرافی حالات، معاشی اغراض، نظامِ حکومت اور ارادۂ عامہ کو علٰحدہ علٰحدہ سرخیوں کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ یعنی یہی وہ عنصر ہیں جن میں سے چند یا کسی ایک کو پیش نظر رکھ کر قومیت کی تشکیل کی جاتی ہے۔ تیسرے باب میں قومیت کا ارتقاء دکھلایا گیا ہے۔ دنیا کی قدیم قومیں۔ انقلاب فرانس تک یورپ میں قومیت کی ترقی۔ انیسویں صدی اور قومیتِ جرمنی، اطالیہ اور جزیرہ نمائے بلقان کی ریاستیں، نیز یورپ کی دوسری قوموں میں انفرادیت اور علٰحدگی کا جو احساس پیدا ہوا اس کے اسباب و نتائج قلمبند کئے گئے ہیں۔ اس باب کے آخر میں اینگلو سیکسن قوم پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھے باب میں ممالک مشرقی میں قومیت کے تصور کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ اور اس طرح چین، جاپان، ہندستان، مصر اور اتحاد اسلامی کی تحریک زیر بحث آگئی ہے۔

پانچویں باب میں یورپ کی جدید قومیت اور چھٹے میں آفاقیت کی نسبت معلومات درج ہیں۔ ساتواں اور آٹھواں باب بین الاقوامیت کے لئے وقف ہے۔ ان دونوں ابواب میں بین الاقوامی نظریے کی تفصیل کے علاوہ اِس نظریے کو جن جن ملکوں میں مقبولیت حاصل ہوئی ان کے حالات اور رجحانات پر بحث کی گئی ہے۔ یونان میں جو شہری ریاستیں تھیں ان کے باہمی تعلقات پر تبصرہ کیا گیا ہے سلطنت روما کے بین الاقوامی قوانین پر نظر ڈالی گئی ہے مسیحی دنیا اور اسلامی دنیا کے اتحاد کی جو تحریکیں موقع بہ موقع رونما ہوئیں ان کو پیش کیا گیا ہے اور آخر کار انیسویں اور بیسویں صدی میں بین الاقوامیت کے لئے جو کوششیں جاری رہیں اور جو قانون مدون کئے گئے ان کا تذکرہ درج ہے۔

نواں باب انجمن اقوام یعنے لیگ آف نیشنس کے لئے مختص ہے۔ اس میں انجمن اقوام کے اعضا اس کا ارتقاء اور امنِ عالم کا نظریہ بیان کرکے اس کی معاشرتی کارگزاریاں واضح کی گئی ہیں۔ آخری یعنی دسواں باب بین الاقوامیت کے مستقبل پر لکھا گیا ہے۔

رنگین لباس :۔ مصنفۂ مسز منیر الزماں۔ مطبوعۂ عہد آفریں برقی پریس حیدرآباد۔ اِس چھوٹی سی کتاب میں رنگوں کے عجائبات اور آراستگی حسن کے حیرت انگیز حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے۔ اس کا پیش لفظ مسز سروجنی نائیڈو نے قلمبند کیا ہے۔ اور مقدمہ مشہور ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا نتیجۂ قلم ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے قدیم مزاحیہ انداز میں کتاب کے موضوع پر نظر ڈالی ہے اصل کتاب پچیس سے زیادہ عنوانوں کے تحت تقسیم کی گئی ہے۔ جس میں ماحول، فیشن، اصطلاحات، رنگوں کی خاصیت۔

اور صورت، اور لباس جیسے عنوانات پر نہایت مفید معلومات پیش کی گئی ہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ نقشے اور خاکے بھی ہیں اور ہر رنگ کی صورتوں کے لئے لباس کے رنگ کی سفارش بھی کی گئی ہے۔ پوری کتاب اِس قابل ہے کہ خواتین اور مرد دونوں اس کا شوق سے مطالعہ کریں گے اور حسب ضرورت مستفید ہوں گے۔

پریت کے گیت:- مجموعۂ کلام الطاف مشہدی۔ ناشر لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور۔ پنجاب کے اِس نوجوان شاعر کے کلام سے اہلِ ذوق اب بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ الطاف مشہدی کی نسبت شمس العلما علامہ تاجور نجیب آبادی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:-

"اقبال کے بعد زمانے نے ایک اور کروٹ بدلی، اور شعرا کے نوجوان طبقے میں جوش اور الطاف جیسے نبض شناس شاعر پیدا ہوئے۔"

اگرچہ جوش کے درجے تک پہنچنے میں جواں سال الطاف مشہدی کو ابھی کچھ عرصہ درکار ہوگا، تاہم اتنا ضرور ہے کہ ان کی شاعری کا طوفان جس شدت سے بڑھ رہا ہے، اور ان کے کلام میں جو رجحانات روز بروز پختہ ہوتے جا رہے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ الطاف مشہدی، اقبال اور جوش کی طرح اپنی دنیا آپ پیدا کرلیں گے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے سب سے پہلے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ وہ اس زبان کے ایک کامیاب شاعر ثابت ہوں گے، جو آج کل ہندوستانی کے نام سے ہمارے سیاسی قائدوں کے دل و دماغ میں پرورش پا رہی ہے۔ اور یہ زبان اس وقت تک پوری طرح جلوہ آرا نہ ہوسکے گی جب تک کہ الطاف مشہدی جیسے شاعر اور ادیب اس کی طرف متوجہ نہ ہوں گے۔ اِس مجموعے کے پہلے چند گیتوں کی زبان اور طرزِ خیال قدیم دکنی شاعروں کی زبان اور خیال سے بہت مشابہ ہے۔ پہلے گیت کا پہلا بند یہ ہے:-

بادل گرجے رین اندھیری — نیا ہے منجدھار میں میری
آشا من میں ڈول رہی ہے — چنتا آنکھیں کھول رہی ہے

جھونکے کھاتے ہیں ملہار
نیا موری کردو پار
کھیون ہار

الطاف نے غزلیں بھی لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اِس میدان کے مرد نہیں ہیں۔ انھیں چاہئے کہ نظموں اور گیتوں ہی کی طرف متوجہ رہیں۔ اس مجموعے میں ان کی جو غزلیں شائع ہوئی ہیں وہ ان کی نظموں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ان کے اسلوب میں سلاست اور روانی اور بے ساختہ پن کی فراوانی ہے۔ ترنم اور سوز کی بھی کمی نہیں۔

رسول مقبولؐ:- از سید احمد حسین جوہر فریادی۔ ناشر ادارۂ شرقیہ کالی کمان حیدرآباد۔ اس چھوٹی سی کتاب میں رسول مقبول پیغمبر اسلام کی سیرت بیان کی گئی ہے۔ اس کا تعارف حیدرآباد کے مشہور شاعر جناب علی اختر نے اور پیش لفظ علامہ عبداللہ عمادی نے تحریر کیا ہے۔ جوہر فریادی صاحب کو علم و ادب کا چسکا ہے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی لو لگی رہتی ہے۔ انھوں نے

جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس سے متعلق اُردو میں متعدد کتابیں لکھی گئیں، لیکن یہ موضوع ایسا ہے کہ ہر شخص اپنی بساط اور عقیدت کے مطابق اس میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کے ہر پہلو پر کئی کئی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ یہ ایک وسیع گلزار ہے جس میں قدم قدم پر نئے نئے مناظر اور رنگ برنگ کی پھلواریاں نظر آتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص اس باغ میں قدم رکھتا ہے تو اپنی پسند کے چند پھول اور پتے چن کر ایک گلدستہ تیار کرلیتا ہے۔ اب یہ چننے والے کی تمیز اور ذوق پر منحصر ہے وہ جس رنگ کے اور جیسے چاہے پھول چن لے اور گلدستہ بنالے۔ اسی قسم کا ایک گلدستہ زیرِ نظر کتاب ہے۔ جس میں رسول مقبولؐ کی زندگی سے متعلق چند معلومات سلیس اور سادہ اسلوب میں قلمبند کی گئی ہیں۔ آنحضرتؐ کے اخلاق اور عادات میں سے چند کی طرف توجہ دلائی ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑوسی کے حقوق، آپس کے برتاؤ، کمزوروں اور غلاموں کے ساتھ تعلقات، ایفائے عہد اور قیدیوں کے ساتھ مراعات کے سلسلے میں پیغمبر اسلام نے کیسے اعلیٰ پایہ سبق دئے ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے معمولی علم و لیاقت کے لوگ بھی سیرتِ رسولؐ کی نسبت ضروری معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

فردوسِ تخیل: یعنی مجموعۂ کلام محترمہ زاہدہ خاتون شروانیہ مرحومہ ناشر دارالاشاعت پنجاب لاہور۔ صفحات ۳۸۲۔

زاہدہ خاتون شروانیہ مرحومہ نواب سر مزمل اللہ خاں کی صاحبزادی تھیں اور انھوں نے انیسویں صدی کی ابتدا میں اپنی پاکیزہ نظم و نثر اور غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے اردو دنیا میں کافی شہرت حاصل کرلی تھی۔ افسوس ہے کہ انہوں نے عالم دوشیزگی میں آخر فروری ۱۹۲۲ء کو بے وقت وفات پائی۔ اور شعر و سخن کا یہ رباب عین اس وقت ٹوٹ گیا جب کہ اس سے روح پرور نغمے ابھی نکل ہی رہے تھے۔

یہ مجموعہ فردوسِ تخیل ان کی ایک عزیزہ ہارون بیگم شروانیہ کا مرتب کیا ہوا ہے۔ بیگم ہارون خاں صاحب شروانی خود ایک اچھی شاعرہ ہیں اور علم و ادب سے کافی دلچسپی رکھتی ہیں۔ انہوں نے اس مجموعے کو حسن ذوق کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ حمد و نعت و مناجات کے بعد دورِ اول کی سرخی قائم کرکے چند نظمیں شامل کی ہیں۔ دورِ ثانی کی سرخی کے تحت سترہ نظمیں ہیں اور دورِ ثالث کے تحت تقریباً چالیس۔ اس کے بعد چند اور سرخیاں مثلاً مجمع احباب، بزم طرب، بزم عزا اور حسن تضمین قائم کرکے متعدد نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ آخر میں بکھرے ہوئے موتی کے عنوان کے تحت زاہدہ خاتون مرحومہ کے قطعات و رباعیات اور مفرد اشعار درج ہیں۔ ابتدا میں خود مرتبہ کا ایک چھوٹا سا تعارف ہے۔ جو اگر ذرا طویل ہوتا تو مناسب تھا۔

زاہدہ خاتون کی شاعری کیف اور اثر سے مملو ہے۔ ان کی سلاست اور بلاغت بھی ان کو اُردو کے اچھے شاعروں میں شمار کرانے کی ضامن ہے۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ ان خواتین میں ایک ممتاز حیثیت کی مالک ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی طرح سے اُردو زبان اور ادب کی خدمت کی ہے۔

سید محی الدین قادری زورؔ

نوٹ:۔ ان تبصروں کے اکثر اجزا لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے سنائے گئے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
من کی بیتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ...	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سرسید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طیبہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن ...	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاسمہ ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدورکشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابات ...	۱۱۲	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

سب رس
اردو
ادبیات
ادارہ
حیدرآباد دکن
سنہ ۱۹۴۲ع

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہدؔ
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

جلد ۵ بابت مارچ سنہ ۱۹۴۲ء شمارہ ۳

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

مولوی سید احمد محی الدین صاحب مدیر رہبر دکن کا انتقال پُر ملال

حیدرآباد کے علمی حلقوں میں اس خبر نے رنج والم کی ایک لہر دوڑا دی کہ سرزمین دکن کے مقبول ترین اخبار رہبر دکن کے جواں سال و جواں ہمت مدیر نے اچانک بعارضۂ قلب وفات پائی ان کی تجہیز و تدفین، زیارت اور تعزیتی جلسہ میں ہزارہا مخلوقِ خدا بلا امتیاز مذہب و ملت شریک ہوئی۔ اور ان کے اعزہ و ورثا کے نام تمام ہندستان سے سیکڑوں تعزیتی برقیے اور پیامات و خطوط وصول ہو رہے ہیں جو ہر روز رہبر دکن میں شایع ہوتے رہتے ہیں اور جن کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مرحوم مدیر رہبر دکن کی ہستی کتنی عزیز تھی۔ اور ہم لوگ کتنے مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ زندگی میں اپنی قوم کے خدمت گزاروں کی صحیح قدر و منزلت کرنا ہم نے نہیں سیکھا۔ اور جب تک یہ چیز پیدا نہ ہو کوئی قوم صحیح معنوں میں ترقی یافتہ نہیں سمجھی جا سکتی ہماری قوم کے بڑے سے بڑے خدمت گزار اپنی جملہ قوتوں کو بے دریغ اپنے مقاصد کے حصول میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اہلِ قوم نہ ان کے اس ایثار کی قدر و قیمت سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ایسے مواقع فراہم کرتے ہیں کہ مخلص خدمت گزار اپنی قوتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لے سکیں

مرحوم احمد محی الدین نے اردو صحافت کو اعلیٰ معیار پر پہنچانے کے لئے جو جو زحمتیں اٹھائیں اس کا اندازہ نہ ان کی زندگی میں کیا گیا اور نہ اب عام طور پر کیا جا سکتا ہے۔ وہ انگریزی جرائد کی طرح عرصہ تک ایک سالنامہ شایع کرتے رہے جس کے مضامین کی فراہمی اور ترتیب میں انھوں نے ہمیشہ حسن ذوق اور اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا۔ اور جس کے لئے بعض وقت انھیں بڑی زحمتیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ مضمون لکھنے کی فرمایش کے بعد جب انھیں وقت پر مضمون نہ ملتا تو وہ طرح طرح سے تقاضے کرتے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ اس کے لئے خود ایک سے زیادہ مرتبہ مضمون نگاروں کے مکان پر تشریف لے گئے ہیں۔ ادارۂ سب رس ان کی اس بے وقت موت پر اظہارِ رنج و الم کرتا ہے اور بطور خاص قرار داد تعزیت ماہ نامہ سب رس کے نگران عالیجناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ۔ کے خطبۂ صدارت اردو کانفرنس کے اس اقتباس کو یہاں نقل کرتا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے رہبر و مدیر رہبر کو خراجِ تحسین و عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ خطبہ اس شمارہ میں آیندہ صفحات میں شریک ہے۔

"مرحوم مولوی سید احمد محی الدین مدیر رہبر دکن کا نام آج کی مجلس میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انھوں نے نہ صرف جامعہ عثمانیہ کی تبلیغ و تشہیر کا کام بے غرضانہ طریقے سے انجام دیا بلکہ اپنے طور پر بھی اس امر کی بے پایاں کوشش کی کہ اہلِ دکن میں اردو کا اعلیٰ ذوق پیدا ہو۔ رہبر دکن اردو کا پہلا اخبار ہے جو ملک کے چپہ چپہ میں پہنچا۔ اور دور دراز کے چھوٹے چھوٹے قریوں میں بھی عوام کے دلوں کو ایسا موہ لیا کہ وہ رفتہ رفتہ مطالعہ کے عادی ہو گئے۔ یہ اردو کی ایک ایسی پائدار خدمت ہے جس کا کوئی صلہ متعین نہیں کیا جا سکتا اور جس کے لئے ہم مرحوم احمد محی الدین کے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔ افسوس ہے کہ وہ ہم سے اس قدر جلد جدا ہو گئے اور ہم آنیوالی کشمکشوں میں ان کی صائب رائے اور ان تھک قوتِ عمل سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ تاہم رہبر دکن زندہ ہے جس کو ان کے ورثا اور رفقائے کار خاص کر مولوی عبد اللہ خاں صاحب۔ مولوی سید یوسف الدین صاحب۔ مولوی عبد الحمید خاں صاحب ناکارہ حیدرآبادی اسی آن بان سے شایع کر رہے ہیں اور یقین ہے کہ وہ اپنے بچھڑے ہوئے رہنما کی ان آرزوؤں کو پورا کرتے رہیں گے۔ جو اردو زبان کی مقبولیت اور ہمہ گیری کی ہمیشہ آئینہ دار رہیں۔ اس توقع میں اس لئے بھی تقویت ہوتی ہے کہ خود مرحوم کے فرزندوں میں مولوی سید حامد حسین الدین بی ایس سی کو اپنے قابلِ احترام باپ کی اکثر خصوصیتیں ورثہ میں ملی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے اعلیٰ کردار اور لیاقت کی بنا پر ان عزائم کی تکمیل کر سکیں گے جن کو ان کے والد اپنی بے وقت موت کی وجہ سے پورا نہ کر سکے۔"

ادارہ

ناتمامی

ہمنشیں بیتاب ہوں بیتاب رہنے دے مجھے　　آنسوؤں کے گرم طوفانوں میں بہنے دے مجھے!
کب تلک آخر قہقہوں کی آڑ میں وحشی سی آہ　　کب تلک آہوں کے پردے میں خروشِ رسم و راہ!
کب تلک خود کو فریبِ آرزو دیتا رہوں　　زندگی میں موت کی سی ہچکیاں لیتا رہوں!
تو سمجھتی ہے کہ میں ہی درد کا خوگر نہیں　　آدمی ہوں آدمی، پتھر نہیں، پتھر نہیں!!
واہ کیا دستور ہے بجلی بھی چمکیں، شبنم نہ ہو　　دل میں طوفاں ہوں بپا آنکھ بھی پرنم نہ ہو!!

کیا یہی ہے تیری دنیا، کیا یہی ہے زندگی؟
ایک روتا سا ترنم، ایک پھیکی سی ہنسی!

بات کیا ہے، کیوں تمناؤں کے بربط چھڑتے نہیں　　لاکھ خوشیاں ہوں، مگر آنسو ہی کیوں رکتے نہیں؟
تو بھی ہے تیری جوانی بھی ہے مے بھی جام بھی　　مٹ نہیں جاتے ہیں کیوں دل سے فکرِ صبح و شام بھی!
مفلسی کیوں چھینتی ہے زندگانی کا جمال　　خواہشوں کی رو میں کیوں بہتا ہے الفت کا خیال!
کیا غلط ہے، تیری رنگت نور برساتی نہیں　　میری غربت تیرے ہونٹوں پر ہنسی لاتی نہیں؟
کیا ہوئیں، کیوں دل ہے بے چین آجکل عشق کے اصول　　تیری زلفوں کی بہاریں تیرے رخساروں کے پھول؟
کیا ہوا، کیوں پھول بنکر پھول برساتی نہیں　　چوڑیوں کی شوخ جھنکاروں پہ کیوں گاتی نہیں؟
وہ ادائیں جو لگاتی ہیں وہ رنگینیاں کیا ہوئیں　　سچ بتا، اٹھلا کے چلنے کی امنگیں کیا ہوئیں؟
اب نگاہوں میں انی تلوار کیوں ہوتی نہیں　　اب ترے پازیب میں جھنکار کیوں ہوتی نہیں؟
اب وہ دنیا، جس میں غنچے بھی ہیں گل بھی خار بھی　　دستِ نازک میں کبھی ساغر کبھی تلوار بھی!!
ہاں، جہاں گردن جھکا دی تھی غمِ آفاق نے بھی　　دن کے سونے میں گھلا کرتی تھی چاندی رات کی!
ہاں جہاں ہر رنج کو ہر دم مٹا دیتے تھے ہم　　کیسی کیسی آفتوں میں مسکرا دیتے تھے ہم!

آج لیکن تو بھی کیا سارا جہاں خاموش ہے　　اور مرے احساس میں کیوں درد و غم کا جوش ہے؟
آہ کس کو حالِ دل کا رازداں سمجھا تھا میں!
پاسبانِ کشتیٔ عمرِ رواں سمجھا تھا میں!!

(۲)

اب خدایا رحم، مے کیا، جب کوئی ساقی نہیں!
اب ترے بندے میں تابِ ضبط باقی ہی نہیں!!

کیوں شفق کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے آسماں　　اب دھڑک سکتا نہیں تا حشر قلبِ جہاں!!
جھانکتا ہے کوہ کے پیچھے سے کیوں مہرِ مبیں؟　　اب شعاعِ اولیں کو چومنے والا نہیں!!
کیوں ہوائیں ناز کرتی ہیں گلوں کو چوم کر؟　　اب میں ان کا بن سکتا نہیں اب جھوم کر!
اب بہاروں کا حسیں پیغام لیکر کیا کروں　　فصلِ گل کی اب سہانی شام لیکر کیا کروں؟
اب ضرورت ہی نہیں اسکی کہ دل سیراب ہو　　دودِ صہبا لے بادلوں میں کشتیٔ مہتاب ہو!
اب نہیں حاجت ستارے آسماں پر مسکرائیں　　زہرہ و ناہید کے جلووں میں نظریں کھو جائیں!
اب تصورِ کہکشاں پر سے گزر سکتا نہیں　　چاندنی کے فرش پر میں رقص کر سکتا نہیں!
ابر کے سائے میں پی سکتا نہیں جامِ شراب　　اب قیامت بن نہیں سکتا کبھی میرا شباب!
اٹھ دے یارب کلی کو پھول بننے کی امنگ　　اب شبِ بجرا بادلوں میں آسمانی جل ترنگ!!
اب یہ مردہ چاند تاروں کو ہنسانا چھوڑ دے　　اپنے فرسودہ مناظر سے ستانا چھوڑ دے!!

جی چکا ہاں جی چکا، جینے کا کچھ انعام دے!
تیری رحمت کے تصدق، موت کا پیغام دے!!

نظر حیدرآبادی

انوار — جناب علی اختر صاحب کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کیساتھ شایع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجرباتِ زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں بلکہ حیات و شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر ان کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کے ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعہ کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا۔ قیمت عمر

اردو ٹائپ کا مسئلہ

یہ اردو کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ اور ہم ان مضامین اور مراسلات کو بہ خوشی شایع کریں گے
جن میں اس پر سنجیدہ اور عملی نقطۂ نظر سے بحث کی جائے گی۔ (سب رس)

خدمت جناب ایڈیٹر صاحب سب رس۔ حیدرآباد

کرمی تسلیم۔ ہماری زبان (دہلی) نے میرے کتابچہ اردو رسم خط پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹائپ کے متعلق چند ایسی غلط فہمیوں کو دہرایا جن کا ازالہ ضروری معلوم ہوا خصوصاً جب کہ ہماری زبان، انجمن ترقی اردو کا ترجمان شمار ہوتا ہے۔ افسوس کہ ایڈیٹر صاحب نے میری تحریر کی رسید بھی روانہ کی اور نہ اس کو اب تک شایع کیا۔ میں ان کے موسومہ خط کی نقل آپ کے پرچہ میں اشاعت کی غرض سے روانہ کر رہا ہوں تاکہ ناظرین کی توجہ طباعت کے اہم مسئلہ پر مبذول ہو اور اگر اس سلسلہ میں آپ ناظرین کو اظہار خیال کا موقع دیں تو سب کا اس میں فائدہ ہوگا۔ فقط

کمترین

سجاد مرزا

جوبلی ہل ۶ جنوری

خدمت جناب ایڈیٹر صاحب ہماری زبان (دریا گنج ۱۔ دہلی)

مکرمی تسلیم۔ آپ نے ہماری زبان مورخہ یکم نومبر ۱۹۴۲ء (کاتب کی غلطی یا لیتھو کی طباعت کی بدولت ۱۹۴۱ء ۱۹۴۲ء ہو گیا ہے) میں اردو رسم خط کے متعلق جو ہمدردانہ خیالات ظاہر فرمائے ہیں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں آپ کو اور آپ کے باوقار پرچے کے ذریعے آپ کے ناظرین کو چند امور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

۱۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے "آیا ٹائپ کو رواج دینے سے اردو کو ترقی ہوگی یا نہیں ...... نستعلیق کو ٹائپ میں ڈھالنا اس فن کو تباہ کرنا ہے۔"

میرے نزدیک اس سوال کا عرصہ پہلے تصفیہ ہو چکا ہے اردو کی ترویج و ترقی کے لئے ٹائپ ناگزیر ہے۔ خود آپ کے پرچوں میں ایک مرتبہ سے زیادہ مولانا عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کا یہ بیان شایع ہو چکا ہے کہ "میں نستعلیق ٹائپ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں" "لطیفی پریس دہلی نستعلیق ٹائپ بنا رہا ہے" وغیرہ انجمن ترقی اردو کی کانفرنس منعقدہ دہلی ۱۹۳۹ء میں بالاتفاق یہ تحریک منظور کی گئی کہ حتی الامکان ٹائپ میں طباعت کی جائے۔ خود انجمن کا آرگن اردو ٹائپ میں چھپتا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی اردو کے لئے ٹائپ کا مسئلہ بحث طلب رہتا ہے اور نستعلیق کا ٹائپ بنانا گناہ ہے؟

۲۔ آپ کا بیان ہے کہ "لیتھو کو ترقی دیکر یورپ کے معیار پر پہنچانے سے اردو کو زیادہ فائدہ ہوگا اور اس طرح بے شمار خوشنویس بھی برسر کار رہیں گے۔" یہ تو سب جانتے ہیں کہ لیتھو یورپ کی ایجاد ہے۔ اور یورپ نے اسے کمال پر پہنچا دیا ہے۔ لیکن اس نے لیتھو سے کبھی وہ کام نہیں لیا جو کام کہ ہم آپ گزشتہ سو برس سے لے رہے ہیں۔ کیا گزشتہ سو برس کی

مدت تحریرات کی طباعت کے لئے لیتھو کی ناموزونیت ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے ؟ کیا یہ طویل مدت لیتھو میں آپ کے حسب منشا، ترقی دینے کے لئے کافی نہیں ہے ؟ بچارے غالب مرحوم کو جو کاتبوں سے شکایت تھی کیا اس میں اضافہ نہیں ہے ؟ واقعہ تو یہ ہے کہ لیتھو کی طباعت سے پہلے کے کاتب بھی جو غضب ڈھاتے تھے وہ شیخ آذری کے ان اشعار سے ثابت ہے۔۔۔

دیوان بندہ راکہ ایتا سواد کرد　　تنہا درونہ شعر محمد نوشتہ است
از نظم و نثر ہرچہ بہ طبعش خوش آمدہ　　دیوان بندہ پُر ز خوش آمد نوشتہ است
ہرجاکہ لفظ بد مثلاً دید در سخن　　دست تصرفش ہمہ رابد نوشتہ است
اکنوں شریک بہتر دیوان بندہ است　　زیراکہ بیشتر سخن خود نوشتہ است

ٹائپ کے باعث کاتبوں کی بیکاری کا مسئلہ۔ اول تو کاتبوں نے سالہا سال سے اپنی ناقابل معافی غلطیوں کے ایسے ایسے ثبوت دئے ہیں کہ وہ قابل گردن زدنی ہیں۔ اگر اس کو بھی نظر انداز کیا جائے تو ان کی بیکاری کے خدشہ کے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ جب پانی کے لئے نل اندازی ہوئی تو یہ شور مچا تھا کہ سقے بھوکوں مریں گے جب ٹانگے چلے تو پھر شور مچا کہ کہار بھوکوں مریں گے۔ جب موٹر ٹکسیاں چلیں تو ٹانگے والوں کے لئے اسی قسم کا رونا پٹنا ہوا لیکن واقعات نے کیا ثابت کیا ؟ آپ مجھ سے زیادہ اچھی طرح سے جانتے ہیں۔

۳۔ "ٹائپ کے رواج سے خوش نویسی برباد ہوجائے گی" کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ لیتھو کی وجہ سے خوشنویسی کا معیار برابر گرتا چلا جاتا ہے خود آپ کی مطبوعات کو خط نستعلیق کے مقررہ اصولوں سے جانچا جائے تو یہ خوبی واضح ہوگا کہ جس کو نستعلیق خط کہا جاتا ہے وہ درحقیقت اصلی خط سے کوسوں دور ہے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ میں ٹائپ نے خوشنویسی کے معیار کو برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ اس کو بڑھایا اور یورپ میں جہاں لوگ کثرت سے ٹائپ رائٹر استعمال کرتے ہیں عام لوگوں کا خط اردو لکھنے والوں کے خط سے مقابلتاً بہت بہتر ہوتا ہے اگر تجربہ رہبر ہے تو ٹائپ کے رواج سے اردو کی خوشنویسی میں ترقی ہونی چاہیے۔

۴۔ "عربی نسخ کو رواج دیا جائے" "ضرور" کہتے سب ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ عربی نسخ اردو طباعت کے لئے رائج نہ ہوسکا رسالہ اردو، سائنس، نسخ میں اور "ہماری زبان" لیتھو میں کیوں طبع ہوتے ہیں ؟

جن کو لیتھو کی طباعت سے گہرا تعلق ہے وہ اس مسئلہ پر مجھ سے زیادہ عمدگی سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ ہندوستان میں اردو کے لئے نسخ ٹائپ رائج ہوسکتا ہے تو میں اپنی زندگی کے کئی برس اور ذاتی روپیہ اردو کے لئے ایک نئے رسم خط کی تلاش میں نہ گنواتا۔

میں امید کرتا ہوں کہ میں نے اپنے کتابچہ "اردو رسم خط" میں ٹائپ کے مسئلہ سے متعلق جو مواد پیش کیا ہے اس پر ٹھنڈے دل سے کر غور فرمایا جائے گا فقط

سجاد مرزا

(چونکہ مولوی محمد سجاد مرزا صاحب نے ایک اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس بارے میں ہمارے یہاں جناب یوسف قاسم عارف صاحب کا ایک مکتوب (موسومہ جناب ڈاکٹر زور صاحب) عرصہ سے موجود تھا اس لئے مولوی صاحب کی دعوت پر سب سے پہلے ہم اسی کو شایع کرتے ہیں۔ یوسف قاسم عارف صاحب کلکتہ کے ایک مشہور اور متمول تاجر ہیں۔ اردو زبان سے انھیں خاص دلچسپی ہے اور ان عملی دلچسپیوں اور خدمات کے اعتراف ہی میں ان کو بنگال کی اردو کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا تھا اس میں انھوں نے ایک نہایت ہی پر مغز خطبہ پڑھا تھا جس میں اردو کی کئی اہم ضرورتوں کے حل پیش کئے تھے۔

اس مکتوب کے مطالعہ سے جہاں مولوی سجاد مرزا صاحب کے خط کے پس منظر کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہوگی یہ بھی معلوم ہوگا کہ انجمن ترقی اردو کے علاوہ اور کون لوگ اس کام کی طرف متوجہ ہیں۔) (سب رس)

مکرمی جناب ڈاکٹر زور صاحب۔

سلام مسنون۔ مزاج گرامی۔ آپ نے اور مولانا نجیب اشرف صاحب نے میرے خطبۂ صدارت (بنگال اردو کانفرنس) ملاحظہ فرمانے کا بہت اشتیاق ظاہر فرمایا تھا۔ لیکن ایک بنگالی کا خطبہ اگرچہ آپ کے ملاحظہ کے لایق تو نہیں مگر چونکہ آپ ــــ مولانا موصوف سے وعدہ کر چکا ہوں اس لئے صرف دو ہی نسخے ہونے کے باوجود ایک آپ کو اور ایک مولانا کو ارسال کر رہا ہوں۔

فروری کے "سب رس" میں کل ہند کانفرنس کے بارے میں شذرہ سپرد قلم کیا گیا ہے وہ آنکھوں دیکھے واقعات پر مخلصانہ اور سچی رائے ہے۔ ٹائپ کے متعلق آخری سطر میں پڑھ کر جی چاہا کہ اس موضوع پر ایک مضمون "سب رس" کے لئے لکھ ڈالوں۔ آپ کا یہ اعتراض کہ اردو کی طباعت کے لئے کانفرنس نے ٹائپ کے استعمال کی ترغیب تو دی مگر جو اصل مسئلہ ہے یعنی رسم الخط اس کے بارے میں کوئی حل پیش نہیں کیا۔ بالکل درست اور صحیح ہے۔ لیکن اگر آپ کے "علم" میں یہ بات آجاتی کہ جو رزولیوشن ٹائپ کی ترغیب کے بارے میں کانفرنس میں منظور ہوا اس کو ٹائپ اور رسم الخط کی کمیٹی سے کچھ تعلق نہیں تھا تب آپ اپنے شذرہ میں کیا لکھتے۔

ڈاکٹر صاحب کانفرنس میں جو کچھ ہوگیا بس غنیمت جانیئے۔ آپ کو یہ تو علم ہی ہے کہ میں اور میرے اسسٹنٹ سید حشمت علی افضلی محض ٹائپ اور رسم الخط کی کمیٹی میں ہی شریک ہونے کے لئے کانفرنس میں پہنچے تھے۔ کیونکہ مولانا عبد الحق صاحب نے خود بڑے ہی اصرار کے ساتھ مدعو کیا تھا۔ اور یقین دلایا تھا کہ صرف تقریروں کی ہی کانفرنس نہیں ہوگی بلکہ عملی کام بھی ہوگا اور خصوصاً ٹائپ کے سلسلے میں کئی حضرات ایسے شریک ہوں گے جو عملی تجربہ رکھتے ہیں اور مدتوں سے اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ چونکہ مجھے بھی آج سے نہیں بلکہ پچیس برس سے اردو ٹائپ (نستعلیق) بنانے کا جنون ہے۔ اور بڑی حد تک اس میں کامیابی بھی حاصل کر چکا ہوں (جس کا مختصر نمونہ آپ دہلی میں ملاحظہ فرما چکے ہیں) اس لئے میں اپنے شہر کی ایجوکیشنل کانفرنس اور اس سلسلے میں اپنے غریب خانہ پر مقیم مہمانوں کو چھوڑ کر دہلی پہنچ گیا تھا مگر یہ نہ پوچھئے کہ جس ٹائپ اور رسم الخط کی کمیٹی میں میں اور میرے اسسٹنٹ شریک ہوئے اس میں کیا ہوا؟ اس میں عملی کام تو در کنار تقریروں کا بھی مزہ نہ آیا۔ لیکن فاضل مدیر

"ہماری زبان" نے ۱۶ر جنوری کے پرچہ میں مقالہ افتتاحیہ شروع کرتے ہی اس کمیٹی کے کام پر "سیر حاصل بحث" فرمائی ہے۔ چنانچہ میں پہلے تو یہی معمہ حل نہ کر سکا تھا کہ یا الٰہی اس کمیٹی میں ٹائپ کے بارے میں یہ رزولیوشن کس وقت مرتب ہوا تھا اور کس نے پیش کیا تھا۔ "ہماری زبان" دیکھ کر اور بھی چکر میں پڑ گیا کہ لیجئے رزولیوشن تو رزولیوشن ٹائپ کی کمیٹی میں ایک مستقل ذیلی مجلس بھی ترتیب دی گئی تھی۔ بھلا ڈاکٹر صاحب کیا یہی چھپنے کی باتیں ہیں؟ مگر جب میں نے ۱۶ر جنوری کے ہی "ہماری زبان" میں سکریٹری صاحب کی رپورٹ کے شروع ہی میں پڑھا کہ "یہ زمانہ پروپگنڈے، ہنگامے اور اشتہار بازی کا ہے۔" ہر ادارہ" اور ہر وہ "شخص" جو "نام ونمود" کا طالب ہے اپنا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔" تو سارا معمہ بہت کچھ سمجھ میں آگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک طرف ہندی والوں کے "عمل اور خلوص" کو دیکھ کر اور دوسری طرف اردو والوں کے "نام ونمود" کو دیکھ کر دل کڑھتا ہے۔

"سب رس" کے متذکرۂ بالا شذرہ میں یہ پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اردو کانفرنس کی صدارت آپ کے ہی ادارۂ ادبیات اردو کے فاضل صدر (نواب مہدی یار جنگ بہادر) نے فرمائی۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ یہ بات معلوم ہو گئی۔ کیونکہ صاحب موصوف نے اپنے خطبۂ صدارت میں ٹائپ کے متعلق جو مخلصانہ رائے ظاہر فرمائی ہے اس کے بارے میں میں کچھ ان کو لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مگر اب آپ کو ہی تحریر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اور وہ بھی مختصراً یعنی جناب موصوف نے اردو نسخ لائنو ٹائپ کے متعلق جو کچھ سپرد قلم فرمایا ہے وہ میرے ناچیز خیال میں محض سماعی معلومات کی بناء پر لکھا گیا ہے۔ ورنہ اردو نسخ لائنو ٹائپ جو بنا ہے اور جس کے موجد کلکتہ کے ہی ایک قادری صاحب ہیں۔ قطعی ناقص اور بدخط ہے۔ اور اس سے بہت سے الفاظ صحیح حروف کے ساتھ کمپوز نہیں ہو سکتے ہیں۔ اسی ٹائپ کا مطبوعہ نمونہ جناب الیاس برنی صاحب نے دہلی میں اردو ٹائپ و رسم الخط کی کمیٹی میں بڑی لمبی چوڑی تعریف کے ساتھ پیش فرمایا تھا۔ لیکن اس کمیٹی میں بھی یہ کسی کو پسند نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (الہ آباد) نے اپنی اسکیم متعلقہ اردو ٹائپ (عملی نہیں تحریری) پیش ہی نہیں کی تھی۔ مولوی سجاد مرزا صاحب (حیدرآباد) ہر مرحلہ پر اپنی غیر جانبدارانہ رائے ظاہر فرماتے تھے۔ بھوپال کے ایک صاحب نے نئے رسم الخط کا نمونہ پیش کیا تھا مگر وہ بھی پسند نہیں کیا گیا۔ میں نے بھی اپنے ٹائپ کا نمونہ پیش کیا تھا اور اس کے متعلق تمام ضروری معلومات کمیٹی کے روبرو پیش کی تھیں۔ اور چونکہ میرا ٹائپ پیٹنٹ نہیں ہوا ہے اس لئے کارڈ بورڈ کے ٹائپ کے ٹکڑوں سے کمپوز کر کے بھی دکھایا۔ سب نے تعریف کی سب نے پسند کیا۔ مگر اس کے متعلق کوئی اچھی یا بری تجویز منظور کرنے پر کمیٹی میں بڑی گڑبڑ ہو گئی اور بلا کسی فیصلہ کے سب کو کھانے پر طلب کر لیا گیا۔ یکم فروری کے "ہماری زبان" میں صفحہ ۲ کے شروع ہی میں یہ پڑھ کر "انجمن ترقی اردو ایک ایسا ٹائپ تیار کرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ جو نسخ اور نستعلیق کے بین بین ہو الخ" بہت کچھ سمجھ میں آگیا۔

ڈاکٹر صاحب یہ سب کچھ لکھنے سے میرا منشا کسی کی برائی یا کسی کے خلوص پر شبہ کرنا نہیں۔ لیکن چونکہ آپ بھی اردو کے خدمت گزار ہیں اور میں بھی اگر ہو سکے تو اردو کی کچھ خدمت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اس لئے آپ سے یہ سب کچھ کہہ بھی دیا ورنہ

میں تو ایک تاجر اور عملی کام کرنے والا انسان ہوں مجھے ان انجمنوں اور کانفرنسوں سے واسطہ بھی کیا۔ اپنا کام کر رہا ہوں اور خدائے تعالیٰ سے اپنی کامیابی کا امیدوار۔ آپ کو اپنے ٹائپ کا جو نمونہ دہلی میں دکھایا تھا وہ ۴۸ پائنٹ کا تھا۔ اب ۳۰ پائنٹ پر بنانے کے انتظامات کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ جلد ہی بن جائے گا۔ لیکن اس کے بننے میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں یا آتی ہیں وہ میں ہی جانتا ہوں۔ یہاں پر حروف تراشنے والے نہ تو اچھے کاریگر ملتے ہیں اور نہ ہی حسب منشاء مولڈ بننے کا معقول سامان ہے۔ بہرکیف سارا کام اپنی ہی نگرانی اور اپنے ہی ہاتھوں سے انجام دے رہا ہوں۔ اور خیال ہے کہ وہی سوا دوسو ۲۲۵ حروف میں مکمل ٹائپ تیار ہو جائے گا۔ اور غالباً بہت ہی آسان اور اچھا ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ گاہے گاہے اپنی خیریت اور کار لائقہ سے مطلع فرماتے رہا کیجئے۔ فقط والسلام

امرتولہ لین۔ کلکتہ — آپ کا مخلص — **یوسف قاسم عارف**

اجڑے ہوئے دل سے ۔۔۔!

قلب پژمردہ وہ تیری بے قراری کیا ہوئی ؟ — آہ وزاری کیا ہوئی بے اختیاری کیا ہوئی ؟
کیا ہوئیں وہ ہائے تیری گرم آہیں کیا ہوئیں ؟ — چپکے چپکے رات بھر وہ اشکباری کیا ہوئی ؟
چاندنی راتوں میں وہ تیرا مچلنا کیا ہوا ؟ — وہ اندھیری رات میں اختر شماری کیا ہوئی ؟
کیا ہوئے تیرے خیالی محل سارے کیا ہوئے ؟ — کیا ہوئی وہ بندشوں کی استواری کیا ہوئی ؟

کیوں نہیں اب انس تجھ کو عندلیب زار سے ؟ — پھر گلوں کے ساتھ تو بھی مسکراتا کیوں نہیں ؟
اب بھی پروانے فدا ہوتے ہیں لاکھوں شمع پر — تو تصور کو کسی کے چوم جاتا کیوں نہیں ؟
باغ میں اب بھی پپیہے بولتے ہیں جا بجا — ان کا وہ انداز لیکن تجھ کو بھاتا کیوں نہیں ؟

ہاں مرے دل زندگی ناکامیوں کا نام ہے — رنج و غم کھا کھا کے مرنا زیست کا انجام ہے
اور ہوں گے، جن کو چین اور استراحت ہے نصیب — تیری قسمت میں مگر آلام ہی آلام ہے
تیری قسمت میں نہ تھا دنیا میں آنکھیں کھولنا — اے جہاں نادیدہ دنیا میں ترا کیا کام ہے

آ بھی مرگ ناگہاں جاوید یاں تیار ہے
دل جو سینے میں نہیں ہے زندگی بیکار ہے

غلام عمر خاں جاوید

امراؤ جان ادا

قسمت نے مرزا رسوا کو ایسے وقت میں پیدا کیا جب لکھنو کے وقار و عزت کا کاروان شاہان اولوالعزم کے ساتھ کوچ کر چکا تھا اور اب صرف گردِ کارواں سے کاروان کی عظمتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ مدتوں کی شان و شوکت کا آخری نمائندہ کلکتے میں مقید ہوچکا تھا جسے کبھی کبھی دیکھ کر بڑے بوڑھے اپنی اولوالعزمیوں کی مٹتی ہوئی نشانی اور اس اجڑی ہوئی بستی کے شاندار ماضی کی یاد تازہ کرلیا کرتے تھے۔

سچ ہے اگر مقدر یاوری کرے تو ستارہ آفتاب ہوسکتا ہے ورنہ اختر کی تابانی بھی فنا ہو جاتی ہے۔ بہر حال رسوا کے وقت میں لکھنو بگڑ چکا تھا، تباہ ہو چکا تھا۔ شہزادے افلاس اور بیگمات غربت و ادبار کی قربان گاہ پر نذر ہو چکی تھیں۔ جس نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہو وہ مجبور ہے کہ قلم سے خونین آنسو روئے، اور اجڑے ہوئے لکھنو کی پریشان حالی و خستگی کی داستان دُہرا کر ماضی کو حال کے آئینے میں دیکھے۔ چنانچہ سرشار و شرر اپنے فرائض انجام دے چکے تھے، اور اب رسوا کی باری تھی جنھوں نے اپنی ناولوں میں زیادہ تر لکھنو کی معاشرتی و خانگی زندگی کی کیفیت دکھائی اور جس ماحول کا نقشہ کھینچا اس کی سچی اور فطری تصویریں ہمارے آگے پیش کردیں۔

رسوا سے پہلے بھی اُردو میں بیسوں ناول لکھے جاچکے تھے جن کی حیثیت اپنے پلاٹ، رنگ اور زبان کے لحاظ سے منفرد اور بے مثل تھی لیکن "رسوا کا رنگ سب سے الگ، ان کا رنگ سب سے نرالا ہے۔ نہ اُن کے پلاٹ میں سنسنی خیزیاں، نہ اُن کی زبان میں غرابت زائیاں، جگر کاویاں نہ کوہ تراشیاں، نہ اُن کے الفاظ ترنم ریز، نہ اُن کی ترکیبیں ارتعاش انگیز، نہ اُن کے میدانِ رزم میں برق پاشیاں، نہ اُن کی داستانِ بزم میں اہتمام آرائیاں۔ پلاٹ وہی صبح شام کے پیش آنے والے صاف و سادہ واقعات جو ہم آپ سب دیکھتے ہیں، زبان وہی روزمرہ کی ستھری و نکھری بول چال جو ہم آپ سب بولتے ہیں۔ قصے کے مقامات نہ لندن، نہ ماسکو نہ ٹوکیو، بس لکھنو و فیض آباد، دہلی و الہ آباد افسانے کے اشخاص نہ لندھور نہ سندھ باد، نہ تاج الملوک نہ ملکۂ زرنگار، بس یہی حکیم صاحب، شاہ صاحب، راجہ صاحب اور نواب صاحب، میر صاحب، اور مرزا صاحب عسکری بیگم اور عمدہ خانم، امراؤ جان اور بوا نیک قدم۔

مندرجہ بالا عبارت ہندستان کے ایک مایۂ ناز ادیب کی ہے، جس نے رسوا کی ساری ادبیت کو اِن چند سطروں میں سمو دیا ہے۔ چونکہ یہ عبارت رسوا کے متعلق عمیق و مدید مطالعے کے بعد لکھی گئی ہے۔ اِس لئے اس میں کی ہر خصوصیت محض ایک ناول پر منطبق نہیں ہوسکتی، لیکن مجموعی حیثیت سے اس کا ایک خاکہ ہم امراؤ جان ادا میں دیکھ سکتے ہیں۔ تفصیلی بحث آگے آئے گی یہاں رسوا کے ایک مشاعرے کو دیکھ لیجئے جو حسن بیان کی دلکشی، بے تکلف طرز ادا اور مشاہدے کی فراوانی کا ایک شاہکار ہے۔ اور اوپر کے اقتباس کی بڑی حد تک تصدیق کردیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:—

"گرمی کے دن تھے مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاؤ ہوا تھا تاکہ شام تک زمین سرد رہے۔ اسی پر دری بچھا کے اُجلی چاندنی کا فرش کردیا گیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ اُن پر بالو کے

آبخورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علٰحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذی
ہانڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں
لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئیں تھیں۔ ڈھکنیوں میں
تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوش بُو دار تمباکو رکھ دیا۔ ڈیڑھ خمے
حقوں کے نیچوں میں پانی چھڑک چھڑک ہار لپیٹ دئے تھے۔
چاندنی رات تھی اس لئے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا۔
صرف ایک سفید کنول دورے کے لئے روشن کر دیا گیا تھا۔
آٹھ بجتے بجتے سب احباب میر صاحب، آغا صاحب، خاں صاحب،
شیخ صاحب، پنڈت صاحب وغیرہ وغیرہ تشریف لائے۔
پہلے شیر فالودے کے ایک ایک پیالے کا دَور چلا پھر شعر و سخن
کا چرچا ہونے لگا۔"

رسوا کے لئے داستاں سرائی کوئی پیشہ نہ تھا، اور نہ
وہ اسے "ذریعۂ عزت" ہی سمجھتے تھے۔ ان کا خاص شغف
عربی و فارسی ادبیات سے تھا، جس کے مختلف اصناف میں
وہ اسکالر کی حیثیت رکھتے تھے۔ کل تصنیفیں مطبوعہ تقریباً دو
درجن ہیں، جن میں سے اکثر ڈرامے اور ناولوں کے تحت میں
آجاتی ہیں "شریف زادہ" "ذات شریف" "افشائے راز" اور
"امراؤ جان ادا" کافی شہرت رکھتی ہیں۔ یہ سب لکھنؤ کی معاشرتی
اور مجلسی واقعات کا آئینہ ہیں۔ ان میں مصنف کی فطرت نگاری کا
کمال خود کرداروں سے جھلکتا ہے، جو مٹی کے کھلونے یا کٹ پتلی
کی طرح بے حس و حرکت نہیں۔ بلکہ وہ گوشت و پوست کے انسان
ہیں۔ وہ نہ اہرمن ہیں نہ یزداں، نہ خباثت کے مجسمے اور نہ معصومیت
کے مرقعے، بلکہ ان میں اچھائیاں اور برائیاں سب ہی موجود ہیں۔
اور خاص خاص حالت میں ان میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔
یہ ناولیں بے حد دلاویز ہیں، لیکن فنی خامیوں سے بالکل مبرا نہیں
کہی جا سکتیں۔

مرزا رسوا کے ادبی کارناموں میں سب سے زیادہ مشہور و
مقبول امراؤ جان ادا ہی ہے اس لئے اس کے متعلق کچھ تفصیل
سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ناول لکھنؤ کی ایک نہایت حسین
باتمیز، پڑھی لکھی، خوش فہم اور شستہ طوائف کی آپ بیتی ہے جسے
رسوا نے اسی کی زبانی بیان کرائی ہے۔ [illegible]جان کا بچپن کا
نام امیرن تھا۔ یہ فیض آباد کے ایک غریب [illegible] شریف خاندان کی
لڑکی تھی۔ اس کے ابا بہو بیگم صاحب کے مقبرے پر جمعدار تھے۔
ایک دفعہ محلے کے ایک بدمعاش دلاور خاں اور امیرن کے ابا
سے کچھ ان بن ہو گئی۔ بدلہ لینے کی غرض سے اس نے ایک روز
سر شام امیرن کو اپنے گھر بلایا اور منہ میں کپڑا ٹھونس اپنے ایک
ساتھی پیر بخش کے ہمراہ لکھنؤ لا کر خانم جان ایک طوائف کے
ہاتھ بیچ ڈالا۔ خانم نے اس کا نام امراؤ جان رکھ دیا۔ امراؤ جان
اپنی ہجولیوں کے ساتھ خوش خوش رہنے لگی۔ ماں باپ سے
جدائی کا غم محو ہو گیا۔ تعلیم و تربیت اس کے پیشے کے اعتبار سے
ہونے لگی۔ موسیقی میں اسے بڑا ملکہ ہو گیا۔ اس نے اردو فارسی
پڑھی اور موزونی طبعی کے سبب شعر و شاعری شروع کر دی۔ سیکڑوں
شعر یاد کر لئے اور خود بھی خوب خوب شعر کہے۔

امراؤ جان کی جوانی آئی۔ بازار گرم ہوا۔ رئیس اور
نواب زادے آنے لگے، دکان چمکی اور وہ بے شمار دولت کی
مالک ہوئی۔ عین شباب شہرت میں فیض آباد پہونچی۔ اتفاقاً وہاں
ماں اور بھائی نے اسے پہچانا۔ رگ حمیت حرکت میں آئی اور وہ
بہ سبب ننگ خاندان ہونے کے فوراً لکھنؤ واپس چلی آئی۔ بڑھاپے
میں پیشے سے توبہ کی، اور مذہبی اصولوں پر چلنے کی کوشاں ہوئی۔

رسوا نے اس ناول میں باوجودیکہ ایک عصمت فروش
بے غیرتی کی روٹی کھانے والی کی تصویر پیش کی ہے، تاہم انھوں
نے اس کی کردار نگاری میں وہ کمال ظاہر کیا ہے کہ ہمیں بجائے

نفرت کے عبرت ہوتی ہے اور بجائے غصے کے ہمدردی۔ ماحول
و مقدر نے اس سمجھ دار عورت کو ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جو
اس کے لئے موزوں نہ تھی۔ کہنے کو تو وہ زنِ بازاری تھی' لیکن
اس کے دل میں جذباتِ عالیہ کا دریا موجزن تھا۔ عام طوائفوں
کے برعکس وہ نہایت غیور، خوددار اور حساس عورت تھی۔ اسے
اپنے گناہوں کا شدت کے ساتھ احساس تھا' جس کی وجہ سے
وہ اپنے کو پردہ نشین عورتوں کے برابر نہ سمجھتی تھی۔ اور دل و
جان سے ان کی قدر کرتی تھی۔ اس نے کبھی بھی کسی کے احسانات
فراموش نہیں کئے' اور نہ کبھی کسی کو اتنا موقع دیا کہ وہ اسے
ایک فاحشہ و خود غرض عورت سمجھتا۔ امراؤ جان نہایت پاباش
وفادار، غیرت مند اور قیافہ شناس عورت تھی اور کسی سے اس
وقت تک نہ ملتی جب تک کہ اس کے ذاتی اطوار و اخلاق سے
پوری طرح واقف نہ ہوجائے۔ وہ بے حد وضع دار تھی اور حسیات
نفس پر پورا پورا اختیار رکھتی تھی (طوالت کے لحاظ سے مثال و
اشارات کو نظر انداز کرتا ہوں)

امراؤ جان اپنے گناہوں کا علانیہ اعتراف کرتی ہے۔
ان کی تاویلیں نہیں کرتی۔ وہ ان پر تاسف کرتی ہے' ضد نہیں
کرتی۔ دولت و ثروت سے آخری وقت تک اس کی گئی ہوئی
عزت کی تلافی نہ ہوسکی' نواب زادوں سے ملنے والی اپنے غریب
بھائی اور ماں سے ننگ خاندان ہونے کے سبب نظریں چار
نہ کرسکی اور مدت العمر گزشتہ زندگی پر کفِ افسوس ہی ملتی رہی۔
یہ ہے غیرت ایک طوائف کی جس کا رواں رواں گناہ کی
سیہ کاریوں سے تباہ' اور جس کا بال بال زمانے کی دراز
دستیوں سے لوٹ و برباد ہوچکا تھا۔

شرافت رسوا کے قلم کا طرۂ امتیاز ہے۔ منظر کتنا ہی
کثیف و گندہ' فضا کتنی ہی کدر و گھناؤنی ہو وہ اسے بے حد
دلکش بنا دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس ناول میں جس میں کہ ایک
طوائف کی آپ بیتی ہے' فحش و عریانی کی موجودگی کا خیال گزرے
لیکن عریانی و فحش تو درکنار کہیں رکاکت و ابتذال کا بھی نشان
نہیں۔ اور جہاں ہے وہاں بھی لطیف سے لطیف پیرایۂ بیان
اختیار کیا گیا ہے تاکہ وہ ہماری نفسانی خواہشوں کو برانگیختہ نہ
کرے۔ بلکہ روح کو پاکیزہ بنا دے' جذبات عالیہ کو گرمائے اور
متحرک کرے۔ ایک معمولی سا اقتباس ملاحظہ ہو:—

رسوا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کو آپ کی طرف توجہ نہو' نگاہیں
ضرور پڑتی ہوں گی' مگر بات یہ تھی کہ آپ کی مسی نہیں ہوئی
تھی خانم سے لوگ ڈرتے تھے اس لئے آپ سے کوئی
نہ بولتا ہوگا۔

امراؤ۔ شاید یہی ہو گر مجھے اتنی تمیز کہاں تھی' میری تو وہ مثل
تھی "بے دولتی اپنے تیہے میں آپ کھولتی" اپنی ہمجولیوں کو
دیکھ دیکھ کے بھنکی جاتی تھی۔ کھانا پینا حرام تھا' راتوں کو
نیند اڑ گئی تھی۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ سطریں کس قسم کے جذبات کی طرف اشارہ
کرتی ہیں۔ لیکن رسوا کے کمالِ احتیاط کو دیکھئے کہ عبارت کہیں پر
وہ فاش نہیں کرتے۔ تمام جذبات کا من و عن بیان ہے' لیکن
قلم کی جولانی میں شرافت کا عنصر غالب ہے۔ ناول میں ہم ہجر و
وصال کی داستان' حسن و عشق کی روداد کے علاوہ اور کیا توقع
کرسکتے ہیں۔ تاہم ایک ماہر ادیب احساسات کے ہر رخ' جذبات
کی ہر ادا سے واقفیت کے سبب اسے نہایت متناسب و مہذب
بنا دیتا ہے۔ رسوا بھی بخوبی سمجھتے ہیں کہ ادب زندگی کے مختلف
پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے اور اسے ہمارے اخلاق سے گہرا تعلق
ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ سمجھ دار ادیب کا کام نصیحت کرنا اور
سدھارنا بھی ہے' محض تفریح ہی کرانا نہیں اس لئے اپنے

خداداد بیان کی قوت، احساسات کی سرعت و شدت، اخلاق کی ہمہ گیری و پاکیزگی کے سبب وہ اپنے متن میں کامیاب ہوتے ہیں اور آج بھی ان کی ناولیں ہر مہذب و تعلیم یافتہ گھرانوں میں بار پانے کے قابل ہیں۔

رسوا کی تحریر ہمیشہ قافیہ پیمائی اور بڑے بڑے مغلق الفاظ سے پاک ہے۔ وہ سیدھی سادھی عبارت میں خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ تحریر تقریر کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ اور دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے ہیں چھوٹے چھوٹے جملوں میں بے حد دلکشی اور غضب کی دل نشینی ہے۔ شوخی و ظرافت، سنجیدگی و مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم ان کی اردو کو سہل ممتنع کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ باوجود کوشش کے اس کی نقل دشوار ہے۔ رسوا کی گفتگو بھی وہ ہے جو لکھنو کے شرفا کی زبان ہے جس میں نہ انگریزی الفاظ ہیں اور نہ عربی و فارسی الفاظ کہ جن کے لئے لغت کی ضرورت ہو۔ رسوا کردار نگاری میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ خود کردار ہم میں سے ایک معلوم ہونے لگتے ہیں وہ ہماری طرح زمین کے بسنے والے اور ہماری ہی طرح خطا و نسیاں کے مرکب ہوتے ہیں۔ رسوا اپنے کرداروں کی ہر بات سے متاثر ہوتے ہیں اور ان تاثرات کو موزوں ترین جامۂ الفاظ پہنانے کی غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ جو منظر جس قسم کا ہوتا ہے اس کو ان کا مصور قلم ویسے ہی آب و تاب کے ساتھ پیش کرتا ہے، مثال کے لئے فیض آباد میں امراؤ اور اس کے ماں اور بھائی کی ملاقات یا ختم کتاب میں امراؤ کے بول اور دلی احساسات کا منظر ملاحظہ ہو۔ اختصار کے لحاظ سے اقتباس پیش نہیں کرتا محض اشارہ کافی سمجھتا ہوں۔ ان اقتباسات میں ہمیں جذبات انسانی و نفسیاتی پہلو کی حیرت خیز ترجمانی ملے گی۔ اور وہ رسوا کی نثر نگاری اور کمال فن کی شہادت دیں گے۔ یہاں ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو جس سے امراؤ کے احساس ذات کا پورا خاکہ پیش نظر ہو جاتا ہے:۔

میں۔ اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے۔

نواب۔ اکثر مر گئے۔ نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کارخانہ ہی نہ رہا۔ بالکل نیا انتظام ہے۔

میں۔ اگلے نوکروں میں ایک بڈھے جمعدار تھے۔

نواب۔ ہاں تم انہیں کیا جانو۔

میں۔ غدر سے پہلے ایک مرتبہ فیض آباد آئی تھی۔ مقبرے پر روشنی دیکھنے گئی تھی۔ انھوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب۔ وہی جمعدار نا، جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی۔

میں۔ مجھے کیا معلوم (دل میں) ہائے فسانہ اب تک مشہور ہے۔

یہ ناول اپنے بعض لطیف واقعات کے سبب بے حد دلچسپ ہو گئی ہے۔ اس میں رسوا مولویوں کی بے تکی اور ہونق صورت کا چربہ اتارتے ہیں۔ ان پر فقرے کستے ہیں، ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ لیکن کہیں ابتذال و بے لطفی پیدا نہیں ہوتی مثلاً بسم اللہ جان کے عاشق زار، پیر فرتوت جناب مولوی صاحب کا قصہ سنئے جن کا سن شریف تقریباً ستر سال کا ہوگا۔ آپ بسم اللہ جیسی "ایک چھٹی ہوئی، شوخ، نوجوان رنڈی پر عاشق ہیں" اور بے حد وفاشعار ہیں۔ بسم اللہ جان نے ایک روز لطف اندوز ہونے کے لئے مولنا کو نیم پر چڑھنے کا نادری حکم دیا۔ مولوی صاحب تھر تھر کانپنے لگے، لیکن پاس وفا اور حفظ مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے درخت پر چڑھنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ادھر بے چارے نیم پر چڑھتے جاتے ہیں اور ادھر نگاہوں سے التجا کرتے جاتے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر تماشائیوں کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑ گئے۔

دوسرا قصہ ان مولوی صاحب کا ہے جن سے امراؤ

کانپور کی مسجد میں ملی تھی۔ مولوی صاحب "جوان آدمی تھے۔ صورت بھی کچھ ایسی بری نہ تھی۔ سانولی رنگت تھی، چہرے پر رونق بن سا تھا۔ سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ منہ پر ڈاڑھی تھی لیکن کچھ بے تکے پن کی حد سے بڑھی ہوئی۔ مونچھوں کا بالکل صفایا تھا، تہمد بھی اونچی بندھی ہوئی تھی۔ سر پر چھینٹ کی بڑی سی ٹوپی تھی جو سر کی پوری چوھدی کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ بات کرنے کا عجب انداز تھا۔ منہ چلانے سے کھلتا تھا پھر بند ہو جاتا تھا۔ نیچے کا ہونٹ کچھ عجب انداز سے اوپر کو چڑھ جاتا تھا۔ اس کے ساتھ نکے دار ڈاڑھی بھی کچھ عجب انداز سے ہل جاتی تھی۔ اور ناک سے کچھ ہوں سا نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کھا رہے ہیں اور بات بھی کرتے جاتے ہیں........"

امراؤ صحن مسجد میں بیٹھی تھی کہ یہی مولوی صاحب اس کے قریب جا کر پوچھتے ہیں :۔

"کیوں بی صاحب آپ کا یہاں کیا کام ہے"

امراؤ۔ مسافر ہوں خدا کا گھر سمجھ کے تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئی ہوں، اگر آپ کو ناگوار ہو تو چلی جاؤں۔ "مولوی صاحب اگرچہ بے تکے تھے، مگر میری لگاوٹ اور دلفریب تقریر نے جادو کا اثر کیا۔ بھلا جواب کیا منہ سے نکلتا، ہکا بکا ادھر ادھر دیکھنے لگے میں سمجھ گئی دام فریب میں آ گئے"۔

مولوی صاحب۔ (تھوڑی دیر کے بعد بہت سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا۔

میں۔ جی کہیں سے آنا ہوا اگر بالفعل تو یہیں ٹھیرنے کا ارادہ ہے۔

مولوی (بہت گھبرا کے) مسجد میں؟

میں۔ جی نہیں۔ بلکہ آپ کے حجرے میں۔

مولوی۔ لاحول ولا قوۃ۔

میں۔ اوئی! مولوی صاحب مجھے تو آپ کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔

مولوی۔ جی ہاں تو میں اکیلا تو رہتا ہوں۔ اسی لئے تو میں نے کہا کہ مسجد میں آپ کا کیا کام ہے۔

میں۔ یہ کیا خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہتے ہیں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا۔ مسجد میں ہمارا کام نہیں۔ یہ خوب کہی، آپ کا کیا کام ہے؟

مولوی۔ میں تو لڑکے پڑھاتا ہوں۔

میں۔ میں آپ کو سبق دوں گی۔

مولوی۔ لاحول ولا قوۃ۔

میں۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیا پڑھتے ہیں یہ کیا آپ کے پیچھے شیطان پھرتا ہے۔

مولوی۔ شیطان آدمی کا دشمن ہے۔ اس سے ہر وقت ڈرنا چاہئے۔

میں۔ خدا سے ڈرنا چاہئے۔ موئے شیطان سے کیا ڈرنا۔ اور یہ کیا آپ نے کہا آدمی ہیں؟

مولوی۔ جی ہاں اور کون ہوں؟

میں۔ مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں۔ اکیلے مسجد میں رہتے ہیں آپ کا جی نہیں گھبراتا۔

مولوی۔ پھر کیا کریں۔ ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے۔

میں۔ اسی سے تو آپ کے چہرے پر وحشت برستی ہے۔ وہ آپ نے نہیں سنا۔ تنہا منشیں کہ نیم دیوانگی است...... "

طوالت کے لحاظ سے مکالمے کا بقیہ حصہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ان دو اقتباسات سے رسوا کی سنجیدہ ظرافت اور مکالمے کی دل نشینی کا کافی اندازہ ہو گیا ہو گا۔

یہاں تک رسوا کی طرز تحریر، شوخی و متانت، قدرت بیان واقعیت اور منظر کشی کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ناول مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی کے

مندرجہ ذیل ارشادات کی بالکل مصداق ہے ملاحظہ ہو:۔

"اکثر و بیشتر معاصرین تکلف میں الجھ کر رہ گئے، رسوا تکلف سے پاک اور آورد سے بے نیاز ہیں۔ ابھی ہنسا رہے تھے، ابھی رلانے لگے۔ درد و گداز، سوز و ساز، شوخی و متانت، سب ہی اپنے اپنے موقع سے موجود ہے۔ لیکن آمد و بے ساختگی ہر حال میں رفیق، شستگی و روانی ہر گوشۂ نشاط میں قلم کی شریک جو منظر جہاں کا دکھایا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرصع ساز نے انگوٹھی پر نگ جڑ دیا ہے۔ ہر نقل پر اصل کا گمان، ہر تخیل میں حقیقت کا نشان، تصویر پر صورت کا دھوکا الفاظ میں معانی کا جلوہ"

امراؤ جان ادا میں بعض فنی غلطیاں ہو گئی ہیں جسے سہو القلم ہی کہہ سکتے ہیں یا یہ کہ رسوا کے وقت میں ناول نگاری ارتقاء کی ابتدائی منزلوں میں تھی اور معمولی تسامحات کا ہونا لابد اور یقینی تھا۔ بہرحال جو صورت بھی ہو وہ یقیناً غلطیاں ہیں۔ پہلی لغزش یہ ہو گئی ہے کہ بعض جگہ امراؤ کے سن اور اس کی گفتگو میں توازن و تناسب قائم نہ رہ سکا، مثلاً جب وہ نو برس کی ہوئی تھی تو اس کی شادی اپنے پھوپھی زاد بھائی سے ہونے والی تھی۔ اتفاقاً اسی وقت وہ دلاور خاں کے پھندے میں پھنس کر لکھنؤ میں خانم کے ہاتھ فروخت ہوتی ہے۔ یہاں خانم کی لونڈی حسینی اس سے سوال کرتی ہے:۔

حسینی۔ بچی تو کہاں سے آئی ہے؟

میں۔ (رو کے) بنگلے سے۔

حسینی۔ (خانم سے) بنگلہ کہاں ہے؟

خانم۔ اے ہے کیا نخی ہو۔ فیض آباد کو بنگلہ کہتے ہیں۔

حسینی۔ تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟

میں۔ جمعدار۔

خانم۔ تم بھی غضب کرتی ہو۔ بھلا وہ نام کیا جانے ابھی بچہ ہے۔"

تعجب کی بات ہے کہ جو لڑکی اپنے شہر کا نام جانتی ہو، جس کی عمر نو سال کی ہو، جس کی شادی ہونے والی ہو، وہ اپنے باپ کا نام نہ جانے۔ یہاں مرزا صاحب نے امراؤ کو گویا دو چار سال کا پیش کیا ہے۔ اور یہ زبردست غلطی ہے۔ شاید یہاں یہ خیال گزرے کہ امراؤ کے باپ کا نام جمعدار ہی رہا ہو تو اس کی بھی توضیح امراؤ کے قول سے ہو جاتی ہے۔

"میرے ابا ہو بیگم کے مقبرے پر نوکر تھے۔ معلوم نہیں کس صیغے میں اسم تھا، کیا تنخواہ تھی، اتنا یاد ہے کہ لوگ انہیں جمعدار کہتے تھے۔"

دوسری لغزش یہ ہے کہ نواب چھبن صاحب جنہوں نے بسم اللہ جان کے ساتھ بڑے بڑے سلوک کئے تھے، وہ اب غریب ہو گئے اور مفلسی کے سبب اپنی معشوقہ کے در سے بھی نکالے گئے۔ ذلت کے احساس سے وہ دریا میں کود پڑے۔ ایسے دل گداز منظر کو دکھانے کے بعد مرزا رسوا ایک بے تکا مذاق کر بیٹھتے ہیں۔ جو طبیعت پر نہایت گراں گزرتا ہے۔ نواب چھبن صاحب چاہے نہ ڈوبے ہوں لیکن مذاق مناسب موقع نہیں ہے ملاحظہ ہو:۔

بسم اللہ۔ سنا ہے بے چاری (چھبن کی ماں) دیوانی ہو گئی ہے میں۔ جو نہ ہو کم ہے۔ یہی تو ایک اللہ آمین کا لڑکا تھا، ایک تو بے چاری رانڈ، یوہ دوسرے یہ آفت ان کے سر پر ٹوٹی۔

رسوا۔ تو نواب چھبن صاحب کو آپ نے ڈبو ہی دیا۔ اس موقع پر مجھے ایک بات اور پوچھ لینے دیجئے۔

امراؤ۔ پوچھئے

رسوا۔ نواب صاحب پیرنا جانتے تھے یا نہیں۔

امراؤ۔ کیا معلوم؟ یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟

رسوا۔ اس لئے کہ میر مجھلی صاحب نے مجھے ایک نکتہ بتا دیا تھا۔

کہ جو شخص پیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں ڈوب سکتا۔

تیسری غلطی قابلِ لحاظ یہ ہے کہ مرزا صاحب نے شروع میں اپنا اور منشی احمد حسین صاحب کا ذکر کیا ہے۔ جن کے اصرار پر امراؤ اپنی آپ بیتی سناتی ہے۔ رسوا کی شخصیت تو بہت نمایاں ہے، جو دوران گفتگو میں اکثر سوال و مذاق بھی کرتے ہیں، لیکن منشی جی بالکل معدوم ہو جاتے ہیں یا معلوم نہیں پتھر کے بنے ہیں کہ غم انگیز موقعوں پر بھی سکوت ہی اختیار کرتے ہیں۔ نہ منہ سے بولتے ہیں۔ نہ سر سے کھیلتے ہیں۔ اس کی بھی کہیں توضیح نہیں کی گئی ہے کہ پہلے دن کے بعد امراؤ نے اپنی سرگزشت محض مرزا صاحب سے بیان کی، ورنہ اسی سے منشی جی کا معدوم ہونا سمجھ میں آجاتا۔ بہرحال ناول میں ایسے کردار کا لانا جس سے کوئی فائدہ ہی نہ اٹھایا گیا ہو بالکل بے کار ہے۔ اسی طرح چند اور بھی غلطیاں ہیں، لیکن ہم ان سے درگزر کرتے ہیں۔ ہاں بعض جگہ مکالمے کی طوالت بھی محل نظر ہو گئی ہے۔

اِن تمام غلطیوں کے باوجود ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ رسوا کی عظمت و اہمیت ان سے کسی طرح نہیں گھٹتی۔ بعض دوسرے خصوصیات میں وہ اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ آج کل بھی لوگ وہاں تک نہ پہونچ سکے۔ وہ اُردو نثر میں سہل ممتنع طرز کے موجد اور ایک ایسے طنزیہ اسلوب کے بانی ہوئے ہیں، جس کی نقل اب تک نہ ہو سکی۔ قلم پر انہیں وہ قدرت حاصل تھی کہ اس کی ادنیٰ جنبش ہمارے آگے حیات کے پیکر، زندگی کے مجسمے پیش کر دیتی ہے اور جس کی کردار نگاری ایسی ہے کہ نقل پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ واقعات اتنے دلچسپ کر دئیے جاتے ہیں کہ ہم پس منظر میں محو ہو جاتے ہیں، اور اگر ناول کو بالاستیعاب نہ پڑھیں تو سوائے محاسن کے معائب پر نظر ہی نہیں پڑتی اور اگر پڑتی بھی ہے تو ادر خصوصیتیں انھیں چاند کے دھبّے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

ہم اسے بھی نہیں بھول سکتے کہ مرزا رسوا ان شہرت پسند افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں سے بہت بلند ہیں جو اپنی داستانِ حسن و عشق کو تمام ادب و فلسفہ کی جان سمجھتے ہیں، وہ ان سے بدرجہا بہتر ہیں، جن کی سطحیت پسندی ریسرچ اور دقت نظری کو مضحکہ خیز سمجھتی ہے اور وہ ان سے منزلوں آگے ہیں جو خزائن مسروقہ کے بل بوتے پر عالم متبحّر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان باسلیقہ لکھنے والوں کے پلاٹ اور تحریر پر ایک نظر کیجئے اور رسوا کی تحریر کی شگفتگی، تحلیل نفسی کی مہارت، کردار نگاری عظمت اور مصوری کی شان و شوکت کو بغیر عصبیت کے دیکھئے تب معلوم ہوگا کہ رسوا اردو ادب میں کیا پایہ رکھتے ہیں، اور ان کا صرف یہ کارنامہ اردو ناول نگاری میں کتنا بیش بہا اضافہ ہے۔ اس سے بہت زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن نہ فرصت ہے نہ ہمت، اس لئے کہ اتنا ہی لکھنا بلاغت کی طبیعت پر گراں گزر رہا ہے۔ مجبوراً ختم کرتا ہوں ممکن ہے کہ یہ مختصر اور سرسری تبصرہ پھر ایک بھولی ہوئی یاد تازہ کرے۔

اقبال انصاری

ضروری اطلاع

نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ جن اصحاب نے نئے سال کا چندہ اب تک روانہ نہیں فرمایا وہ براہِ کرم منی آرڈر سے بھیجدیں یا دفتر سے وی پی آنے پر حاصل کر لیا جائے۔ بلدہ کے خریدار دفتر ہذا کے ملازم سے باضابطہ رسید حاصل کر کے چندہ ادا فرمادیں۔

علمِ ہیئت و جغرافیہ پر ایک سرسری نظر

مندرجہ بالا عنوان سے نومبر ۱۹۴۱ء کے سب رس میں ایک مضمون شائع ہوا تھا اور ایڈیٹر صاحب نے تمہیدی نوٹ میں جواب لکھنے کی صلائے عام بھی دی تھی، جس سے توقع تھی کہ دسمبر کے پرچے میں کوئی مدلل جواب کسی ماہر فن کی طرف سے شائع ہوگا، مگر ایسا نہ ہوا۔ میرے پاس تو اس کی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ کسی ماہر فن نے اس مضمون کو درخور اعتناء نہ سمجھا، اس لئے میں نے تھوڑی بہت ابتدائی معلومات کی بناء پر یہ مناسب خیال کیا کہ مختصراً اس کا جواب لکھ بھیجوں تاکہ پڑھی لکھی دنیا میں خاموشی کا مطلب مولوی سید اسمٰعیل صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات نیم رضامندی نہ لیں اور اپنے قوائے ذہنی و عملی کو کسی مفید کام کی بجائے اس غلط راستے پر ضائع نہ کریں۔

ہم نے پہلے یہ خیال کیا کہ مولوی صاحب نے مذاق کیا ہے، جیسا کہ بالعموم علم جغرافیہ کے استاد کیا کرتے ہیں مثلاً قاضی جلال سابق پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کالج نے اپنی ایک کتاب میں اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ انگریزی زبان اُردو زبان سے بنائی گئی ہے۔ اس کتاب کو قاضی صاحب نے شائع نہیں کرایا، بلکہ خاص خاص محفلوں میں اس کے اقتباسات پڑھے جاتے اور حاضرین اس سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ مولوی صاحب بھی اسی حد تک رہتے تو یہ مقصد بڑی حد تک حاصل ہوتا۔ مگر اس کے برخلاف وہ اس قدر سنجیدہ ہو گئے ہیں کہ اپنی سنجیدگی میں گم گشتہ دکھائی دے رہے ہیں۔ کوئی دلیل ایسی نہیں دی گئی کہ اس سے معمولی معلومات کے آدمی کی بھی تشفی ہوتی۔ چند بڑے ہیئت دانوں کے نام دے کر مضمون میں رعب اور وزن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی مگر وہ بھی ناکام رہی۔

موجودہ ہیئت کے نظریات کو مولوی صاحب دقیانوسی تصور کرتے ہیں اور اس نظریے کو جو علم ہیئت کے ابتدائی منازل میں ٹولمی (دوسری صدی عیسوی) سے لے کر ٹایکوبراہے (سولھویں صدی عیسوی) تک باقی تھا، نیا اور ترقی یافتہ نظریہ قرار دیتے ہیں۔ کیا مولوی صاحب اس سے باخبر نہیں کہ ٹولمی نے ۱۳۰ء میں مسلسل مشاہدات کے بعد ایک ہزار پچیس ستاروں کا محل وقوع متعین کیا تھا، ۱۴۵۰ء میں الغ بیگ نے سمرقند میں تقریباً اتنے ہی ستاروں کا ایک نخشہ تیار کیا تھا اور پھر مولوی صاحب کا دوست ٹایکوبراہے ۱۵۸۰ء میں ایک ہزار پانچ سے زیادہ ستاروں کا محل وقوع متعین نہ کر سکا، کیا مولوی صاحب نے اِس بات پر بھی غور کیا کہ اس ڈیڑھ ہزار سال میں مختلف اوقات میں مختلف ہیئت داں تقریباً ایک ہی تعداد کا تعین کر سکے۔ اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ مشاہدے کے لئے اُن لوگوں نے ایک ہی قسم کا آلہ استعمال کیا تھا۔ یعنی دو آنکھیں۔ اس زمانے میں دوربین دسترس سے باہر تھی، ایک معمولی میدانی دوربین سے پچاس ہزار ستارے مشاہدہ کئے جا سکتے ہیں۔ ایک ڈھائی انچ قطر والی دوربین سے ارگیلانڈر نے تین لاکھ ستاروں کا مشاہدہ کیا اور مونٹ ولسن کی رصدگاہ میں چڑھائی ہوئی سو انچ قطر والی دوربین سے نصف آسمان پر ایک کھرب قابلِ تصویر ستارے مشاہدہ کئے جا چکے ہیں۔ اور دو سو انچ قطر والی نئی دوربین کے نتائج کا ہنوز انتظار باقی ہے۔

مولوی صاحب آخر کس بنا پر فرما رہے ہیں کہ "ابتدائی منزل کو معراج کمال سمجھے ہوئے ہیں" کیا مولوی صاحب اس کرۂ ارض پر رہ کر یہ مضمون لکھ رہے ہیں یا مریخ سے اس کو بھجوایا ہے۔ مولوی صاحب نے جس رصدگاہ میں زمانہ گزارا ہے اس کا حوالہ دیتے' ان ستاروں کے نام بتلا کر علم ہیئت میں ایک غیر معمولی اضافہ کرتے جو "مغرب سے مشرق کی طرف سیر کرتے ہیں" اور ان ذکی الحس ماہران فن ہیئت وجغرافیہ" کے نام نامی واسمائے گرامی سے دنیا کو شناسا کراتے جنھوں نے فیثاغورث' بطلیموس' کوپرنیکس' کیپلر اور نیوٹن کے نظریات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔

زمانۂ موجودہ میں فن ہیئت نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اس سے مولوی صاحب کی کوئی تشفی نہ ہوئی۔ اس لئے آپ نے "تحقیق کا دروازہ کھٹکھٹایا" اور اس کو نہ کھلنے پر غصے سے "زمین سے پتھر اٹھا کر آسمان کی طرف پھینکا وہ زمین پر آرہا" اس کے بعد انھوں نے یہ نازک مشاہدہ کیا کہ ایک بلند پہاڑ پر اگے ہوئے بلند آم کے درخت سے ایک آم ٹوٹ کر زمین پر گرا' اس کے بعد اُن کا طائر فکر ہزارہا فٹ کی بلندی پر اڑنے والے طیاروں کے ساتھ پرواز کرکے یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ وہاں سے پھینکی ہوئی چیزیں بھی کم بخت زمین پر ہی آگرتی ہیں حتیٰ کہ طیارہ شکن توپیں جو سمت الراس کی طرف گولہ پھینکتی ہیں' ان میں کا کوئی گولہ بھی افسوس کہ آفتاب میں نہیں جا لگتا' ایک دفعہ جب جولانی پیدا ہوئی تو پھر کس کے بس کی بات تھی کہ مولوی صاحب کے خیال کو پلٹا سکتا' اسی تجسس اور کرید میں آپ نے اپنی مشہور رصدگاہ سے یہ ستم ظریفی مشاہدہ فرمائی کہ فضائے بسیط سے نکلنے والے شہاب ثاقب بھی زمین پر ہی گرتے ہیں۔ اتنے صاف' صریح انواع واقسام کے سائنٹفک تجربات کے بعد مولوی صاحب کے اس فیصلہ کن نتیجے سے کس کو اختلاف ہوسکتا کہ "ثابت ہوا کہ ان سب کا میلان گاہ زمین ہی ہے۔ اور ہونا بھی چاہیئے' کیونکہ زمین ہی ہر چیز کا میدان ہے اور وہی اس کا محاذ قرار پائے گی .... معلوم ہوا کہ ساری کشش زمین میں ہے نہ کہ آفتاب میں"

اگر مولوی صاحب علم حرکت وجاذبہ کے ابتدائی اصول اور قوانین سے واقف ہوتے تو ان تجربات کے کرنے کی زحمت گوارا نہ کرتے اگر آپ کے دست نازک اور توپوں میں اتنی قوت ہوتی کہ وہ پتھر یا گولے کو کم ازکم ساٹھ میل فی ثانیہ کی رفتار سے پھینک سکتے تو آپ کا کوئی نشانہ خطا نہ کرتا' زہرہ' عطارد' مریخ یا سورج جس کو چاہتے اس کو عین مرکز پر مار سکتے۔ مولوی صاحب نے یہ کس بنا پر فرض کرلیا کہ سارے ہیئت داں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ صرف سورج میں کشش ہے اور زمین میں نہیں کشش ہر اس چیز میں ہوتی ہے جو جسم رکھتی ہے اس مقدار میں کمی یا زیادتی جسموں کی کمیت کے راست اور ان کے درمیانی فاصلے کے مربع کے معکوس متناسب ہوتی ہے' یہ کوئی قیاسی یا سماعی نظریہ نہیں۔ بلکہ مختلف قسم کے تجربوں کے بعد ماخوذ کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب اپنی تشفی چاہیں تو ایک رقاص لے کر کسی پہاڑ مثلاً میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی کے پاس جائیں اور خود تجربہ کرکے رقاص اور پہاڑی کی مقدار کشش معلوم کرلیں۔ سائنس کی کسی ابتدائی کتاب میں اس تجربے کی تفصیلات مل جائیں گی۔ یہی رقاص مولوی صاحب کی اس امر میں بھی رہنمائی کرے گا۔ کہ زمین ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے۔ مولوی صاحب نے زمین کو ساکن کر دینے کے بعد ہمیں اس کی شکل وصورت نہ دکھائی۔ اور یہ بھی نہ بتلایا کہ جدید نظریہ کی رو سے وہ شاخ آہو پر ٹکی ہوئی ہے' یا پشت ماہی پر۔ کیا مولوی صاحب کی نظر سے مشرق کے زمانۂ حال کے سب سے بڑے مفکر اور فلسفی ڈاکٹر اقبال مرحوم کا یہ شعر نہیں گزرا۔ سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ❊ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں اس موقع پر ایک جملہ معترضہ کی بھی اجازت دیجیئے کہ مولوی صاحب بورے لس اور نپ چون کو ہی سلری کائنات کا انتہائی

نقطہ سمجھے ہوئے ہیں، حالانکہ کوئی ستائیس سال قبل مولوی صاحب کے فلک التاسع یا فلک الافلاک سے بہت پرے پلوٹو کے وجود کے متعلق پیش قیاسی کی گئی تھی اور آج پورے گیارہ سال ہوئے کہ اس سیارے کا مشاہدہ کیا جاچکا ہے۔ اسی طرح مولوی صاحب جب شہاب ثاقب کا ذکر کرتے ہیں، تو کئی معلومات کا راز افشا کر بیٹھتے ہیں، جو شہاب ثاقب کہ ہمیں اپنی آنکھوں یا دوربین سے دکھائی دیتے ہیں، وہ ہماری فضا میں داخل ہونے کے بعد دکھائی دیتے ہیں، ہماری فضا سے باہر ہزار ہا شہاب ثاقب ہیں جو سورج میں جا گرتے ہیں۔ اس اور وجوہ کے منجملہ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اس سے سورج کا حجم بڑھ رہا ہے اور اشعاع حرارت کی وجہ نقصان کی تلافی ہوتی جارہی ہے۔

مولوی صاحب نے زمانۂ حال کے بہترین آلات مثلاً جہاز، طیارہ، کیمرہ، دوربین، ریڈیو وغیرہ کے وجود اور ان کے افادے کا اقرار کیا ہے، مگر اس سے لاعلم دکھائی دے رہے ہیں کہ ان آلات سے علم ہیئت میں کیا کیا حیرت انگیز تحقیقات ہوئی ہیں۔ اور ہوتی جارہی ہیں، کس بنا پر یہ شکایت ہو رہی ہے کہ ان آلات کی مدد سے تحقیق آگے نہیں بڑھائی جارہی ہے۔ اور اس روشن زمانے میں پرانے خیالات پر قناعت کی جاکر کورانہ تقلید کی جارہی ہے۔ اگر مولوی صاحب زمانۂ موجودہ کے "غیر سائنٹفک" تحقیقات (جب مولوی صاحب کے تحقیقات بالکل سائنٹفک تجربے پر مبنی ہوں تو پھر زمانۂ موجودہ کے ہیئت دانوں کے تحقیقات کو غیر سائنٹفک سمجھنا چاہئے) سے باخبر ہوتے تو اس کتاب کے لکھنے کی مشقت نہ اٹھاتے۔ جس کے دلائل و براہین نظریہ، محسوسہ، لامسہ، بصریہ، وغیرہ وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اگر مضمون زیر تنقید کو مولوی صاحب نے اپنی کتاب کے اشتہار کے طور پر لکھا ہے تو وہ مقصد بھی پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ یہ کام "صبا" یا "دارالتشہیر" کے ذمے کیا جاتا تو وہ ایک جنبش قلم سے اس کتاب کو اس سال کی بہترین کتاب اسی طرح بنا ڈالتے جس طرح وہ روزانہ ایک فلم کو اس سال کی بہترین فلم ثابت کرتے اور عوام کو اس کے دیکھنے پر مائل کیا کرتے ہیں۔

ایک اور چیز جو ہمیں اس مضمون میں دکھائی دی، وہ یہ ہے کہ مضمون کا عنوان تو علم ہیئت و جغرافیہ تھا۔ مگر ہیئت پر مولوی صاحب نے دو ورق تحریر فرمائے اور جغرافیہ پر صرف دو سطریں لکھیں۔ اگر وہ اس کے برعکس کرتے تو ہمیں یہ شعر پڑھنے کی فرصت ہی نہ آتی کہ ؎ تو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ با آسمان نیز پرداختی

آخر میں مولوی صاحب سے ہماری استدعا ہے کہ وہ اپنے قیمتی نظریے کو "ذکی الحس ماہرین" صاحبان معقول اور ارباب منقول" تک ہی محدود رکھیں اور غریب طالب علموں کو اس بھول بھلیاں میں نہ چھوڑیں۔ ورنہ کہیں "کار طفلاں تمام خواہد شد" والا قصہ نہ ہو جائے۔

محمد ابراہیم

غلط فہمی

من کا درپن دکھا کے بسمل کر دے		سب ہیں اس جگ میں جیتے جی کے کارن
ساجن کو سکھی درد بنا دل کر دے		ہم پیت نہ کرتے تھے اس کے کارن
اک روز پریم کھیت گھائل کر دے		ساجن سے بگڑ گئی ہے سکھی کے کارن

سرلش۔ تم روز بروز پاگل ہوتے جا رہے ہو کنھیا۔

کنھیا۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) ہاں۔ میں بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔ سرلش کوئی نامعلوم قوت میرے دل و دماغ پر چھاتی جا رہی ہے (زوردار لہجے میں) کبھی تم نے بھی کسی سے پریم کیا ہے سرلش۔

سرلش۔ ہاں کیا ہے۔ پاگلوں سے۔ کیونکہ ان کا پریم پاگل پن نہیں سکھاتا۔ موج کو دریا سے اٹھتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور اس میں فنا ہوتے ہوئے بھی۔ اس منظر سے بہت کچھ لطف بھی اٹھایا ہے خود فنا نہ ہو سکا۔

کنھیا۔ افسوس! کتنی گہری نیند سو رہے ہو تم سرلش۔ جو لوگ اپنا گھر بار جلا کر آگ تاپتے ہیں تم ان کو پاگل سمجھتے ہو، خیر، تم کبھی اس دنیا کا رخ نہ کرنا۔ اس سمندر کے سینے پر لہروں جیسے موٹے موٹے سانپ بہے جاتے ہیں۔ آہ پیمان وفا باندھا بھی تو کتنا بودا کہ ٹوٹ گیا۔

جیوتی۔ تمہاری حالت دیکھ کر مجھے کچھ ہنسی آتی ہے اور کچھ رونا۔ سوچ رہی ہوں کہ کیا کروں۔

کنھیا۔ دونوں کام مشکل نہیں ہیں تمہارے لئے۔ ان سے تمہارا حسن دوبالا ہو جائے گا۔ جیوتی، میں تمہارے ہنسنے اور رونے کی دلکش راگنیوں پر دنیا کی موسیقی اور اس کے دلکش نغموں کو ہیچ سمجھتا ہوں۔ ساغر کی کھنک، ماہ تاباں کی ضیا پاشی اور بجلی کی تڑپ اسی میں ہے، تم ایک بار ہنس کر تو دیکھو۔ دیکھو تو سہی میرا کہنا سچ ہے یا جھوٹ۔

جیوتی۔ اندھیرے میں راستہ بھٹک کر کوئی مسافر ادھر آ نکلا ہے

کنھیا۔ کیا جگنو کی چمک اس کی منزل کا پتہ بن جائے گی۔ بولو کیا ہوگا۔ بولو۔

کنھیا۔ (کھویا ہوا) کیا ہوگا ـــــــ راستہ بھولنے والے مسافر کو آسمان کے اس تارے کے قدموں پر سر ٹیک دینا چاہیئے جو اکیلا ہی اکیلا چمکتا ہے مسافروں کو راستہ بتلاتا ہے ـــــ مگر خود کچھ نہیں جانتا۔ کیا وہ اپنے حسن کی ضیا پاشی پر فخر نہیں کر سکتا ـــ کیوں کیا خیال ہے تمہارا جیوتی۔

جیوتی۔ ہم دونوں زمینوں سے اڑتے اڑتے آسمانوں پر پہونچ گئے۔ دونوں غلط نکلے۔

کنھیا۔ بھول ہوئی ہے۔ کسی نے اس راز کو سمجھا نہیں ہے۔ آسمانوں کی بلندیاں زمینوں کی پستیوں ہی کی رہین منت ہیں۔ جیو۔ تم آسمانوں کو روند سکتی ہو۔ لیکن زمین کو نہیں۔ وہ تمہیں روند سکتی ہے۔ بپھرتی ہے وہ۔

جیوتی۔ کتنا حسین خواب تھا۔ جو تم نے ابھی ابھی دیکھا۔ کتنا حسین۔ معلوم ایسا ہو رہا تھا کہ دنیا تمام موسیقی کے شباب آور نغمے ہیں۔ اور تم ان سب کو ملا کر خیال گا رہے ہو۔ سیلاب میں مجھے بہائے جانا چاہتے ہو کنھیا۔ (جذبات میں ڈوبی ہوئی) ہوں۔

سرلش۔ تم بلندی سے پستی کی طرف آ رہے ہو کنھیا اپنا مقام چھوڑ دیا ہے تم نے۔

کنھیا۔ ہاں، گر رہا ہوں، مجھے اس کا احساس ہے۔ بلندی پر جو چیز ہوتی ہے، وہ گرنے ہی کے لئے ہوتی ہے۔ چوکنا ہو کر میں نے تو کوئی ایسا نیا کام نہیں کیا ہے، سرلش معلوم ہوتا ہے کہ تم کھوئے ہوئے ہو، ہوں۔

[illegible] تمہاری جستجو میں۔ تمہارے خیالات کی تلاش میں۔

اور تمہاری خواہش کی خاطر میں ضرور کھویا گیا ہوں۔ اپنے لئے نہیں۔ ہاں وہ دنیا ہے کہاں، بس یہی تو اجڑنے کے لئے (نرم ہنسی) کیوں کنھیا۔

جیوتی۔ وہ پہلی رات یاد ہے کنھیا، گنگا ماں کے پوتر جل میں چندرما کو دیکھ کر تم نے کیا کہا تھا۔ وہ الفاظ ابھی یاد ہیں تم کو۔ تم سوچ کیا رہے ہو کنھیا۔

کنھیا۔ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ کچھ اپنی اور کچھ پرائی۔ مگر جیوتی، سب بھول جاؤں گا۔ بھولنے ہی کے لئے تو سوچا جاتا ہے۔ (چونکا ہو کر) ہاں وہ رات، آسمان پر تاروں نے اپنا جال بچھا دیا تھا، اس رات کو پوچھ رہے ہو تم جیوتی، مگر وہ چندرما کو اپنے کم زور جال میں پکڑ نہ سکے۔ کتنے نراش تھے وہ۔ تم اس رات کو کیوں یاد کرتی ہو جیوتی۔

جیوتی۔ بھولنے کے لئے، ہاں ہاں، میں بھی بھولنے کے لئے یاد کرتی ہوں کنھیا۔

کنھیا۔ ایسا نہ کہو جیوتی، ایشور کے لئے ایسا نہ کہو، اگر تم نے اس رات کو، اس کی خاموشی کے تکلم کو بھلا دیا تو۔ آہ۔

جیوتی۔ (نرم ہنسی) تم ابھی سو رہے ہو کنھیا۔ تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا ہی نہیں، کاش تم اس روشن دئے کو دیکھ سکتے۔ جو اپنی جان کی بازی لگائے تمہارا گھر روشن کرنا چاہتا ہے۔ تم چندرما کو —— اس کے حسن کو اور اس کے نورانی پیکر کو دیکھ چکے ہو، مگر کبھی تم نے یہ نہیں دیکھا کہ تمہارے قریب ہی ایک ننھا سا معصوم دیا تمہارے درشن کی آس میں جل رہا ہے۔ (بے قرار ہو کر) کنھیا کاش وہ بجھ جاتا۔

کنھیا۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) ہوں، بجھ جائے گا تو اسے تم اندھیرے میں ڈھونڈھ سکو گی۔ کاش تم اس خاموش دئے کی جلتی ہوئی زبان سے اس کے درد کا حال ہی پوچھ لیتیں۔ بولو جیوتی، تم نے کبھی اس کے دکھ درپن میں اپنے چاند کو ہنستا ہوا بھی دیکھا ہے۔ کاش تم اس کی آس اپنی ایک ہی پھونک سے مٹا دیتیں۔

جیوتی۔ (خوشی سے) کنھیا۔ کنھیا، پھر وہی نیک شبد اپنی زبان پر لاؤ۔ (آہستہ سے) اس فلسفیانہ گفتگو نے ہماری کھلی ہوئی باتوں کو راز بنا دیا ہے۔ معمہ، یہ پہیلی میں، اب بوجھ چکی ہوں کنھیا۔ تم ابھی سے مجھے پریم کی لوریاں دے کر سلا دینا چاہتے ہو تم اس آسمانی نغمے کو میرے دل کے تاروں پر بجانا چاہتے ہو۔ تم مجھے آزمانا چاہتے ہو! گاؤ گاؤ کنھیا پھر وہی راگ، وہی آسمانی لوری سناؤ مجھے، جو تم نے اس رات کی خاموشی کو توڑنے کے لئے گایا تھا۔ جس راگ نے ایک سہمے ہوئے دل میں آشا کی جوت لگا دی تھی، گاؤ کنھیا۔

سرخی شفق کی، خون تمنا	سنسان جنگل خاموش صحرا
الفت کا آنسو، ہر موج دریا	دکھ کی کہانی، فرقت کا نقشہ

شامِ غریباں

آہ یہ منظر اور یہ اداسی!	جیسے کنول کا پھول ہو باسی
"کوئی ابھاگن برہا کی ماری"	دردِ مجسم مغموم داسی

شامِ غریباں

کنھیا۔ (غمگین لہجے میں) لوگ روتے روتے ہنستے ہیں۔ ان لوگوں نے نکھرے ہوئے آسمان پر نورانی قندیل کو دیکھا ہے۔ اسے گہن لگتا ہوا نہیں دیکھا کاش میں بھی انہیں میں سے ہوتا۔ آفتاؤں سے گزر کر کاش میں بھی جیوتی کے دل میں جگہ پیدا کر سکتا۔ وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں، کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ۔ سرگوشی۔ تم اس اندھیرے غار کی پہنائیوں میں چھپ کر ابھر بھی سکو گے کنھیا؟ (نرم قہقہہ) میرے دوست اس روگ کو کیا کہتے ہیں۔ آج تک میں نے دنیا والوں کو مرنے کی امید پر

جیتے دیکھا ہے۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ اس دنیا میں جینے کی امید
پر مرنے والے لوگ بھی زندہ ہیں۔ (تعجب سے) تم مردہ ہو یا زندہ
بتاؤ کنھیا بتاؤ۔

کنھیا۔ میں ـــــ (دکھ بھرا ہوا) میں مردہ ہوں یا زندہ۔ یہ
تو خود مجھے بھی نہیں معلوم، ہاں اتنا معلوم ہے کہ مر مر کے جیتا
ہوں۔ میں ایک کھلونا ہوں سرلش! کھلونا کھیلنے والا جب
اسے اپنے ہاتھ میں لے کر کھیلتا ہے تو میں جی اٹھتا ہوں اور
جب وہ تھک کر مجھے پھینک دیتا ہے تو یہی میری موت ہے۔
سرلش، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کھیلنے والا مجھ سے کھیلتا رہے،
پھینکے نہیں۔ جب ٹھکرایا جاتا ہوں تو میری شمع حیات بجھ
جاتی ہے، میرے دوست۔

سرلش۔ تم سچ کہتے ہو کنھیا، میں جتنا بھی تمہاری حالت پر
غور کرتا ہوں، اتنا ہی دور بہا تا ہوں، بہت دور، تم میرے
احاطۂ خیال سے بھی بچ کر نکل جاتے ہو، نہیں معلوم وہ کونسی
قوت پائی ہے، تم نے، اچھا ہوتا کہ تم میری سمجھ میں آجاتے
کاش میں تمہاری مدد کر سکتا۔

کنھیا۔ سرلش یہی کیا کچھ کم ہے کہ تم برابر میرا ساتھ دئے
جا رہے ہو۔ میرے دوست میں ہمیشہ تمہارا احسانمند رہوں گا۔

سرلش۔ تم اس قدر رنجیدہ کیوں ہو کنھیا۔ تمہاری زندگی
میں جیوتی اندھیرا لے کر نہیں آئی ہے۔ وہ تمہیں روشنی اور حیات
دے سکتی ہے۔ تمہارے من موہ لینے والے گیتوں کو تمہارے
سوا کوئی اور پامال نہیں سمجھتا۔ تم خود کو دھوکا دینے کی
کوشش کرتے ہو۔ اور چاہتے ہو کہ ساری دنیا تمہاری طرح
خود فریب ہو جائے۔ کتنی مضحکہ خیز سمجھ ہے تمہاری، سوچو
تو تم یہ کیا کر رہے ہو۔

کنھیا۔ جیوتی، بہتر ہے کہ تم خود اپنے ہاتھوں سے اِس
نراش دئے کو بجھا دو، اب اس میں تیل بھی باقی نہیں رہا۔
جل چکا اور ساتھ ہی اپنا سرمایۂ حیات آتش شوق کی نذر
کر چکا۔ (زور سے) بجھا دو اسے، آگے بڑھو جیوتی۔

جیوتی۔ پامال پھولوں کو دیوتا کے چرنوں پر نچھاور کر کے کوئی
بھگوان سے کیا لے سکتا ہے کنھیا، پاپ، تم چاہتے ہو کہ میں
بھگوان کے مندر میں اپنے پژمردہ حسن کے کمھلائے ہوئے
پھولوں کو گل نو شگفتہ سمجھ کر اس کی نذر چڑھا دوں جن نغموں کو
گا گا کر میں عیاش نوجوانوں کی خدمت کرتی رہی وہی نغمے میں
دیوتاؤں کے حضور میں کیسے گا سکتی ہوں کنھیا۔
تم نے رات کی تاریکی میں مجھے پناہ دیتے ہوئے اپنے گھر کو بھی تاریک
بنا لیا۔ کاش میرے قدم کسی ایسے راستے کی طرف اٹھتے، جو کبھی
ختم نہ ہونے والا ہوتا۔ میں تو یہی خیال کر کے چلی تھی، لیکن تم نے
مجھے بچا لیا (روتی ہوئی) کنھیا، کنھیا بولو تم نے مجھے کیوں بچا لیا
بولتے نہیں، سمجھی تمہارے نغمے بھی، میرے اَن گنت نغموں کی طرح
دوسروں کے لئے ہیں، افسوس!

کنھیا۔ جیوتی! اس یادگار رات کی تاریکی میں، میں راستہ بھٹک گیا
تھا، تم نے اس تاریک رات کو روشن بنا دیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا
کہ یہ اجالا زندگی بھر میرے ساتھ رہے گا۔ میں اب بھی اندھیرے
میں ہوں جیوتی، کاش تم اس بھیانک تاریکی کو دیکھ سکتیں، کاش!
تم نے پتھر کیوں چھپا رکھا ہے اپنے سینے میں، مجھے پہلے ہی
سے اندھیرے میں چھوڑ دیا ہوتا، تم نے مجھے راستہ بتلا کر راستے سے
بھٹکا دیا، ایک ایسے کنول کو روند دیا تم نے جو ابھی مسکرا کر کھلنے بھی
نہیں پایا تھا۔ کاش تم اس خزاں کے منظر کو بھی دیکھ لیتیں۔ جو
بہار کے شباب پر چھایا جا رہا ہے۔

جیوتی۔ اب ضبط کی تاب نہیں رہی کنھیا، مجھے جانے دو، میں
اس راستے سے لگ جاؤں تو بڑی خوش نصیب سمجھوں گی خود کو۔

کنھیا ۔ تم چلی جاؤ گی، تم کیا بن کے آئی تھیں اور کیا بن کے جا رہی ہو ۔ جیوتی، کبھی تم نے اپنی حالت پر بھی غور کیا ہے ۔

جیوتی ۔ اپنی حالت پر غور کر چکی ہوں تب ہی تو چلی جا رہی ہوں کنھیا، مجھے معلوم ہے کہ میرے چلے جانے سے تمہیں بہت دکھ ہوگا ۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ درد اور یاس کی ترجمانی کرنے لگے گا ۔ مگر میں مجبور ہوں میں کیا ہوں تم نہیں جانتے کنھیا ۔

کنھیا ۔ ایشور کے لئے اپنے مسافر کی منزل کھوٹی نہ کرو ۔ جیوتی میں جانتا ہوں کہ تم ایک دیوی ہو، حسن کی، خوبصورتی کی دیوی ۔

جیوتی ۔ میرے محسن تم مجھے نہیں جانتے، تم نہیں جانتے کہ رات کے اندھیرے میں تم نے ایک کھوٹا روپیہ پایا ہے ۔ اب تو دن ہے ۔ کنھیا پرکھو کسوٹی پر گھس کر تو دیکھو، کھوٹا روپیہ ہے یہ ۔ اس کی ظاہری خوبصورتی کو دیکھ کر تم اس پر بے طرح ریجھے ہوئے ہو تم یہ خیال کرتے ہو کہ یہ کھوٹا روپیہ بازار میں بھُن جائے گا ۔ افسوس یہی تو تم نہیں سمجھ سکتے ۔ اب مجھے جانے بھی دو کنھیا، میں چلی ہی جاؤں تو بہتر ہے ۔

کنھیا ۔ جاؤ گی جیوتی ۔ مجھے تنہا چھوڑ کر چلی جاؤ گی، اچھا جاؤ ۔

جیوتی ۔ ہاں چلی جاؤں گی، اس لئے کہ میری خونیں داستان کو اب کسی نردوش کے خون کی بھینٹ کی ضرورت نہیں ہے ۔ خدا حافظ کنھیا ۔

کنھیا ۔ جیوتی، جیوتی ۔ ایشور کے لئے ٹھہر جاؤ جیوتی ۔

جیوتی ۔ تم پھر بھٹک گئے کنھیا ۔

کنھیا ۔ کیسے نہ بھٹک جاتا جیوتی، جسے میں نے رات کے اندھیرے میں پا لیا تھا، اسے دن کے اجالے میں کھو کر بھٹکوں نہیں تو کیا کروں جیو؟

جیوتی ۔ سنو کنھیا، میرے شباب آور نغمے سنو، شاید انہیں سن کر تم مجھے پہچان سکو گے، میں اپنے دل کے تاروں کو جوڑ کر ایک ایسا نغمہ سناؤں گی، جس کو سن کر تم پر میری حقیقت کے راز فاش ہو جائیں گے، سنو میں کیا ہوں ۔

"مایا ہے سب مایا

یہ ستھری ستھری آنکھیں   یہ لمبی لمبی پلکیں

یہ تیکھی تیکھی چتون !   یہ سندر سندر درشن

مایا ہے سب مایا

یہ گورے گورے گال   یہ کالے کالے بال

یہ پیاری پیاری گردن   یہ ابھرا ابھرا جوبن

مایا ہے سب مایا"

سرلش ۔ کنھیا، کنھیا، کیا ہوا میرے دوست تم اس قدر اداس کیوں ہو گئے، وہ کہاں ہے تمہاری دنیا، وہ جیوتی ۔

کنھیا ۔ وہ ——— وہ ویشیا تھی سرلش ۔

سرلش ۔ ویشیا !

کنھیا ۔ ہاں ویشیا ! غلط فہمی ہوئی مجھ سے، لیکن کتنی پاک باطن تھی وہ، آہ جیوتی !

افضل حسین عابدی

خلشِ انتقام

اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب بے اختیار !

گرو گوبند، سکھوں کا ہزیمت خوردہ افتادہ پیشرو، اپنے گزشتہ کارناموں کی اپنے دل ہی دل میں جانچ پڑتال لے رہا تھا۔ جوانی کے ولولے، وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں، اور وہ اس کی ساری امنگیں کافور ہو چکی تھیں۔ شباب کی بہار آفرینیوں پر پیرانہ سالی کی خزاں نے اپنا رنگ چڑھا دیا تھا۔ اس کا دل متضاد خیالات و کیفیات کا ایک جولان گاہ بنا ہوا تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس کی زندگی کا ماحصل صفر اور اس کا مآل محض ایک رائیگاں ثمر ہے۔ افسردہ و پژمردہ خاطر وہ ان خیالات کے دریا میں غوطہ زن تھا کہ ایک پٹھان نے جو اس کو کچھ عرصہ قبل قرض دیا تھا، نہایت ترش روئی و بے مروتی کے ساتھ اس سے اپنا قرض واپس طلب کرنے لگا "مجھے اس وقت تو معاف کرنا بھائی صاحب، میں کل تک آپ کا حساب بے باق کر دوں گا"۔

"نہیں جناب، بغیر لئے کے میں اپنا ایک قدم بھی یہاں سے آگے نہیں بڑھا سکتا، جب دیکھو ایک نہ ایک عذر، کوئی نہ کوئی حیلہ ہر روز کل، آخر کون صبر کر سکتا ہے" بس یہ کہتے کہتے مارے غصے کے پٹھان نے اس کی گردن پکڑ لی اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا "چور کہیں کا" معاً۔ ایک برہنہ شمشیر بجلی کی طرح چمکی اور پٹھان کی لاش زمین پر تڑپنے لگی۔

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برقِ خرمن کا (۲) لگا کر آگ دیکھیں گے تماشا اب نشیمن کا

گرو گوبند اپنی حماقت اور غیر فرزانہ حرکت پر سخت نادم ہے۔ کہ محض غصے کی حالت میں اس سے ایسی ناشائستہ حرکت ہو گئی۔ اس نے چور کہا تو کیا ہوا، میں نے چوری تو کی نہ تھی، پھر مجھے غصہ کیوں آیا۔ انگریزی میں ایک مثل ہے "اگر ٹوپی تمہیں برابر آتی ہے تو پہن لو" اف! مجھ سے یہ کیا ہو گیا، میں نے ایک بے گناہ کا خون کر دیا، میری اس حرکت نے مجھے ایک خوفناک معصیت کا مرتکب کیا ہے اور اس کی پاداش اب مجھ سے مدت العمر ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میں اپنی ساری زندگی اپنی بخشائش کے لئے صرف کر دوں۔ یہ سوچتے سوچتے وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے اس کو اس کا گوہر مقصود مل گیا ہو۔ اس نے پٹھان کے سب سے چھوٹے لڑکے کو طلب کیا اور اس کی پرورش اپنے بچوں کی طرح کرنے لگا۔ تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ فن سپہ گری کی بھی مشق جاری رہی۔ غرض بڑے اللّے تللّوں کے ساتھ بچہ پروان چڑھنے لگا۔ اس کی ناز برداریوں میں کوئی کسر باقی نہ رہی۔

گرو کے چیلوں نے کہا "گرو دیو۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں، ہمیں تو سخت اندیشہ ہے۔ آستین میں سانپ پال کر آپ کیسے اپنے مستقبل سے مطمئن ہیں؟ شیر کے بچے کو پرورش کر کے یہ نہ سمجھنا کہ یہ شیر نہ ہو گا کیسی ناممکن سی بات ہے۔ یہ ضرور بڑا ہو کر اپنے باپ کا مثنیٰ ہو گا"۔

گرو گوبند نے بڑے آنند و حیرج کے ساتھ جواب دیا "میری تعلیم و تربیت ہی بے سود و رائیگاں ہو گی، اور اس کا اصل مطلب ہی فوت ہو جائے گا۔ اگر میری اتنی محنت کا مجھے یہ ثمر نہ ملے کہ ایک شیر کا بچہ شیر نہ بنے"۔

لڑکا گرو سے بہت مانوس ہو چلا تھا، وہ اپنے باپ کی طرح اس کا ادب و احترام کرتا۔ پریم، پریم سے پریم کرتا ہے۔ وہ سائے کی طرح گوبند کے ساتھ ساتھ رہتا۔ اس کے اپنے دو بچے لڑائیوں میں نذرِ اجل ہو چکے تھے۔ اور ان سب کی محبت و الفت کا مرکز پٹھان کا بالکا ابن گیا تھا۔

ایک دن لڑکے نے گرو سے سوال کیا" بابا مجھے آپ نے ہتیار چلانے سکھائے اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں شاہی فوج میں بھرتی ہوکر اپنی شجاعت اور دلیری کا صلہ پاؤں، وطن کی خدمت کروں، میری روح اپنے ہم وطنوں پر قربان ہونے کے لئے مچلی ہوئی ہے"

گرو نے کہا" اچھا آج میں تمہاری شجاعت کی آزمائش کروں گا، تلوار لے کر میرے پیچھے پیچھے آؤ"

یہ دونوں چپ چاپ، بالکل خاموش، جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے نہر کے کنارے پہنچے پانی گھٹنے برابر تھا اور مثل موتی کے چمک رہا تھا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا، سوسنی رنگ کے آسمان پر ہلکی ہلکی سرخی پھیلنے لگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے آفتاب کی فصد کھول دی ہے۔ گوبند یہاں پر ٹھیر گیا۔ وہ اپنے خیالات کو مرتب کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو عجیب بدنظمی کی حالت میں تھے، کہنے لگا" محمود! یہاں آؤ، اور اس حصے کو کھود دو"

محمود زمین کے اس حصے کو کھودنے لگا، ایک پتھر کی سل نمودار ہوئی۔ گوبند کہنے لگا" دیکھا ان داغ دھبوں کو، یہ تیرے باپ کا خون ہے وہ مجھ سے اپنے گھوڑے کی قیمت مانگنے، اپنا قرض وصول کرنے آیا تھا، میں نے اس کی رقم دینے میں کچھ پس و پیش کیا، جو میرے ذمے واجب الادا تھی۔ اور اسی مقام پر میں نے اس کا خون بہایا ہے۔ تو پٹھان کی اولاد ہے، اب اس کا مجھ سے انتقام لے اور اپنے باپ کی روح کو خوش کر جو میرے خون کی پیاسی ہے"

محمود کے منھ سے بے ساختہ ایک چیخ نکلی، جس سے غصے کی آنچ نکلتی تھی۔ وہ ایک زخمی درندے کی طرح اس پر جھپٹا گوبند سکون و اطمینان کی حالت میں ایک فاتح کی طرح کھڑا مسکرا رہا تھا۔ محمود نے گوبند کے قدموں پر اپنے ہتیار ڈال دیئے۔ اور سسکیاں لے کر رونے لگا، اس کا سر جھکا رہا تھا۔ اس کی زبان سے الفاظ نہ نکل سکتے تھے۔ اس کی سانس اس کے سینے میں پھنستی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بہت ضبط کر کے آخر گویا ہوا" آہ شیطان سے مت کھیلو، میں نے اپنے باپ کے قتل کو ایک بھیانک خواب کی طرح بھلا دیا ہے، اور تم سے محبت کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں، ہاں اسی طرح جس طرح میں اپنے باپ سے محبت کرتا تھا۔ بابا اس سوئے ہوئے فتنے کو مت جگاؤ۔ اس انتقام کے زہریلے ناگ کو جو کہ پیاسا سو جانے دو جو تمہیں اس پر آمادہ کرتا ہے کہ میں تم سے بدلہ لوں"

(۳)

دلِ بے تاب کسی طرح سے ٹھیرائے کوئی ۔۔۔ مجھے سمجھائے کوئی یا اُسے سمجھائے کوئی

پس، اس روز سے محمود نے گوبند سے علٰحدگی اختیار کی۔ اور جب کبھی وہ اس کے پاس آتا کبھی ہتیار نہیں لاتا۔ ایک شام، آسمان ابر آلود تھا۔ ہوائیں چل رہی تھیں۔ فضائیں کیف و سرور سے معمور تھیں۔ گوبند کے دل میں کوئی ترنگ چٹکیاں لینے لگی۔ اس نے محمود کو شطرنج کی دعوت دی۔ محمود کھیل کے بعد کھیل ہار رہا تھا اور مسلسل اس کو مات ہو رہی تھی۔ اس کی طبیعت جھنجلاتے جھنجلاتے مائل بہ سکون ہو چکی تھی۔ وہ ایک چال سوچنے میں ہمہ تن مصروف و منہمک تھا کہ گرو نے شطرنج کے تختے پر سے ایک مہرہ اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ اور حقارت آمیز مسکراہٹ، ایک زہرخند وضع قطع سے کہنے لگا۔" ایک بزدل جو اپنے باپ کے قاتل کے ساتھ شطرنج کھیلتا ہے، اس کو سوائے ہار کے جیت کی امید بھی ہو سکتی ہے"؟

یہ سن کر محمود کی رگ حمیت کو ٹھیس لگی۔ اور ایک چمکتا ہوا خنجر آناً فاناً گرو گوبند کے سینے میں پیوست ہو گیا ——

مرنے والا گرو اطمینان قلب کی پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا" اوہ۔ میرے بہادر محمود۔ میرے بچے۔ آخر تجھے اب معلوم ہوا کہ ایک شجیع و خوددار لڑکا کس طرح دشمن کی غلط کاریوں کا انتقام لے سکتا ہے ——"

(ترجمہ بہ تصرف از ٹیگور)

جہاں بانو بیگم

غالب کے دو نئے شعر

میرے خاندان کے قدیم کتب خانہ میں دیوان غالب کی تیسری اشاعت کا ایک نسخہ ہے جو غالب کی زندگی میں منشی شیونرائن کے اہتمام سے مطبع مفید خلائق آگرہ میں ۱۸۶۳ء میں چھپا ہے۔ اس دیوان میں ایک بات قابل لحاظ یہ ہے کہ غالب کی اس غزل میں

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک　　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ردیف بجائے "ہونے تک" کے ہر جگہ "ہوتے تک" (ت کے ساتھ) لکھی ہے۔ حالانکہ بعد کے جتنے ایڈیشن میری نظر سے گزرے ہیں، مرقع چغتائی، مطبوعہ جرمنی، مشرحۂ بیخود و سہا وغیرہ، سب میں "ہونے تک" (ن کے ساتھ) چھپا ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ چونکہ "ہوتے تک" کا محاورہ متروک ہوگیا تھا اس لئے بعد کی طباعتوں میں اس کو بدل دیا گیا۔ یہ تغیر اس قدر آسان اور غیر محسوس تھا کہ بے تکلف ہوگیا۔ لیکن جب یہ محاورہ غالب کی زبان پر تھا اور انھوں نے اسی طرح نظم کیا ہے تو اس کو یادگار کے طور پر باقی رکھنا ضروری تھا۔ جن وجوہ سے شعرائے متقدمین کے "سوں" "کو" سے" بنا دینا روا نہیں، غالب کے لفظ میں بھی تصرف جائز نہ تھا۔ لیکن اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ غالب "سوں" اور "تک" والوں سے زیادہ مقبول ہوا۔ اور غزلیں کی غزلیں لوگوں کی زبان پر چڑھ گئیں۔ پڑھنے والوں کو "ہوتے تک" کھٹکا۔ انھوں نے بدل لیا۔

یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ مجھے اس وقت شائقان و نقادان غالب کے سامنے یہ بات پیش کرنی ہے کہ میرے کتب خانے کے دیوانِ غالب میں ایک غزل کے تین شعروں کے نیچے دو شعر قلمی لکھے ہوئے ہیں۔ اس نسخے میں اصول کتابت و طباعت کے خلاف اکثر ناتمام غزلوں کے نیچے دو تین سطریں چھوڑ کر بعد کی غزلیں لکھی ہیں۔ اس خالی جگہ میں یہ اضافہ کیا گیا ہے۔ ہر دیوان مطبوعہ میں صرف یہ تین شعر ملتے ہیں:۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت　　　میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے　　　بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر۔ ورنہ　　　کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

میرے نسخے میں ان کے نیچے یہ دو شعر قلمی لکھے ہوئے ہیں:۔

لگ گئی آگ اگر گھر کو تو اندیشہ کیا　　　شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں
تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں　　　موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں

ان اشعار کے کاتب و ناقل ایک بزرگ مولوی صادق علی تاباں ساکن گڈھ مکتیسر ضلع میرٹھ انسپکٹر محکمہ نمک ہیں مولوی صاحب غالب سے چند بار ملے تھے۔ خود اچھے شاعر اور عمدہ سخن سنج تھے۔ سالہا سال پنشن لے کر ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ میری تحقیق کے مطابق اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ تاباں صاحب نے خود غالب سے یا اس زمانہ کے کسی اور شخص سے سن کر یہ اشعار نقل کئے ہیں۔ ممکن ہے غالب نے دیوان کی اس طباعت کے بعد یہ شعر کہے ہوں اور احباب کو سنائے ہوں۔

لیکن پھر اور کسی کی بیاض میں بھی یہ شعر ملنے چاہئیں۔ تحقیق کرنے سے ممکن ہے کہیں پتا چل جائے۔ بہرحال یہ دونوں شعر بالکل اسی رتبے کے ہیں جیسے پہلے تین شعر ہیں، اور ایسے نہیں ہیں کہ پانچوں شعر ایک ساتھ کہنے کے بعد غالب ان کو کاٹ دیتے۔ اب نقادانِ غالب فیصلہ کریں اور اس اضافہ سے لطف اندوز ہوں۔

حامد حسن قادری

غزل

آؤ اور صبر و سکوں کی صورتوں کو چھین لو
آج مجھ سے میرے دل کی راحتوں کو چھین لو

کچھ ارادے بھی تو چمکیں کیا قضا اور کیا قدر
بطنِ مستقبل سے اپنی قسمتوں کو چھین لو

زندگی کو کیوں بنا رکھا ہے اک زندانِ تنگ
اس فضا اس بحر و بر کی وسعتوں کو چھین لو

تھرتھرا اٹھیں سرے سے آتش و باد، آب و خاک
عنصروں سے بجلیوں کی قوتوں کو چھین لو

دیکھنا پھر کس طرح ملتی ہے وہ کافر نگاہ
خواب آلود انکھڑیوں سے غفلتوں کو چھین لو

دیکھنا کاشانۂ انساں کے بام و در کی شان
اہلِ دنیا آسماں کی رفعتوں کو چھین لو

بڑھ کے دھاوا بول دو، کھل جائیں گے گنجِ نہاں
بطنِ گیتی میں دفینہ دولتوں کو چھین لو

ظلمتیں آفاق کی ہو جائیں گردِ کارواں
برق کی اور روشنی کی سرعتوں کو چھین لو

بزمِ انساں کو سجانے کے لئے تاروں کی بھی
محفلِ آراستہ کی زینتوں کو چھین لو

اس کا کھنچنا اس کا ملنا اس کے بس میں کیوں رہے
حسن کی سب دوریوں سب قربتوں کو چھین لو

جورِ گلچیں برطرف، اتنا گلوں سے ڈر بھی کیا
ان کے رنگوں اور ان کی نکہتوں کو چھین لو

دیکھ لیں سروِ رواں بھی عشق کی مستانہ چال
سرکشی سے آج ان کے قامتوں کو چھین لو

اچھی آنکھوں والے رم کرتے ہیں خود دل کی طرف
ان غزالوں سے اب ان کی وحشتوں کو چھین لو

ایسی شئے چھینو کہ میرے پاس کچھ بھی رہ نہ جائے
میرے دل سے آج میری حسرتوں کو چھین لو

شعر میں کچھ رس نہیں آواز میں کچھ جَس نہیں
سازِ فطرت کی حیات افزا گتوں کو چھین لو

راہ کھوٹی کر رہی ہے منزلِ دیریں کی یاد
زندگی سے زندگی کی رجعتوں کو چھین لو

جیتے مردے دیر تک مردوں کے وارث رہ چکے
ان سے اب اہلِ سلف کی تربتوں کو چھین لو

زندگی اور موت سے اے اہلِ دل کچھ لے مرو
زندگی اور موت کی سب برکتوں کو چھین لو

کر دو اک بزمِ چراغاں شامِ ہجراں کو فراقؔ
کارواں در کارواں ان ظلمتوں کو چھین لو

فراق گورکھپوری

ترقی

دیکھئے نمبر کے لحاظ سے ترقی ملے گی۔ پیروی کی ضرورت نہیں۔ فہرست تیار ہو گئی ہے اپنا سلسلہ نمبر یاد رکھئے۔ جب آپ کا نمبر آئے گا، آپ کو ترقی مل جائے گی۔ اپنا کام دل لگا کر کیجئے۔ ملک کو کام کرنے والے فرض شناس آدمیوں کی ضرورت ہے۔ یہاں ہر شخص ذاتی تگ و دو میں لگا ہوا ہے۔ یہ بات بہت بری ہے۔ جی ہاں! بہت بری ہے۔

جناب سات آدمیوں کو ترقی ملی ہے۔ ایک انگلستان سے ابھی واپس ہوئے ہیں۔ کام کا ان کو کوئی تجربہ نہیں نہ کوئی ڈگری لائے۔ فقط سات برس ٹیمز ندی کا پانی پیتے رہے اور واپس چلے آئے۔ دوسرے صاحب سرفراز جنگ بہادر کے داماد ہیں۔ تیسرے صاحب، صاحب دیوان ہیں۔ چوتھے حضرت کی سفارش معتمد صاحب نے کی ہے۔ پانچویں صاحب کا انتخاب صدر صاحب نے کیا ہے۔ چھٹے صاحب کو اس لئے ترقی دینا ضروری ہے کہ رائے عامہ کے موافق ہے۔ اور ساتویں صاحب کا تعلق ایسے فرقہ سے ہے جس کی تعداد کم ہے۔ یہ سب حضرات تو نامور ہیں۔ فہرست میں تو ان کا نام تک طبع نہیں ہوا۔ اب بتائیے سلسلہ نمبر یاد رکھ کر کوئی کیا کرے۔ جی ہاں! مگر یہ بھی تو صراحت کر دی گئی ہے کہ ان ترقیوں کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ ان ترقیوں سے کسی کے حقوق متاثر ہوں گے پھر بھلا آپ کو اب شکوہ شکایت کا کیا موقع ہے جی ہاں! کچھ نہیں!!۔

آپ سمجھتے ہیں کہ اے بی سی ڈی جی سی ایس ہو گئے اور ساری خوبیاں آپ میں آگئیں۔ قابلیت! قابلیت کیا چیز ہے۔ آپ ابھی بچے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ سفارش سے بڑی کوئی قابلیت نہیں ہوتی۔ رہی کارگزاری۔ کارگزاری کیا چیز ہے جس کو ہم کارگزار کہیں وہ کارگزار! اور جس کو ہم ناکارگزار کہیں وہ ناکارگزار۔ سمجھے آپ! جی ہاں!! اور حق! حق کس چڑیا کا نام ہے۔ کہیں ترقی کا بھی حق ہوتا ہے۔ جناب ملازمت کوئی جاگیر تھوڑا ہی ہے۔ جہاں آپ کے حقوق پیدا ہوں۔ ابھی ملازمت کرنا سیکھئے۔ جی ہاں! کتابیں چھوڑئیے اور دیکھئے دنیا میں ہوتا کیا ہے۔ ملازم آدمی کسی بات کا حق دار نہیں ہوتا۔ وہ تو تابعدار ہوتا ہے۔ تابعداری سب سے بڑا حق ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ جو کتا زیادہ دُم ہلائے آپ اسی کے سامنے ہڈی پھینکتے ہیں۔ خوب غور کیجئے اور سمجھئے۔

دیکھئے پچھلے مہینے کے لئے ہم نے آپ کو عارضی ترقی دی ہے۔ آپ کا کام اچھا رہا تو آپ مستقل کر دیئے جائیں گے۔ "کیوں جناب صدر صاحب کو خوب گانٹھا ہے۔ بڑی چلتی ہوئی رقم ہیں آپ۔" "کہئے حضرت! آج کل تو آپ ہی کا راج ہے۔ اب تو ادھر دیکھتے بھی نہیں۔" "واہ! وا!! گزیٹیڈ آفیسر ہونے کے بعد بھی وہی سیکل چرخ چوں۔ موٹر ابھی تک نہیں لی۔ ابھی سے روپیہ جمع کرنے کی فکر ہے۔ شاید بنجارہ ہل پر مکان بنے گا۔"

"حکم آیا ہوا رکھا ہے مگر وہ صاحب تو رخصت پر جانے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کو ڈر ہے کہ کہیں رخصت پر جائیں تو ان کی جگہ کسی دوسرے کا تقرر نہ ہو جائے" تو پھر وہ نہیں جائیں گے! آپ کی قسمت!! وہ جاتے تو آپ کو جگہ مل جاتی" - لیکن وہ صاحب جو صرف پندرہ دن کے لئے منصرم ہو کر گئے تھے اس جگہ مستقل ہو گئے" "یہ اپنی اپنی قسمت ہے! جگہ خالی ہوتی تو آپ کو بھی مل جاتی" "مگر ان کے متعلق تو بہت سی شکایتی درخواستیں پیش ہوئی ہیں، اور وہ تو بہت جونیر ہیں" "آپ افسروں سے بحث کرتے ہیں۔ چلے جائیے یہاں سے!

آپ کا نام سب سے اول ہے اور اب پہلی جگہ آپ کو ملے گی۔ فی الحال دو ماہ کے لئے ہم نے ایک سلسلے میں آپ کو بھیجا ہے۔ مددگار صاحب نے ایک اور نام پیش کیا تھا مگر عاملانہ خدمت کے لئے وجیہہ آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی آدمی کو فرض شناس بھی ہونا چاہیے۔ اس لئے آپ انتخاب کو صحیح ثابت کریں عنقریب موقع نکلنے والا ہے۔ آپ کو مستقل جگہ مل جائے گی آپ سے سینیر اب کوئی نہیں ہے ہم کو خود بہت خیال ہے۔

مستقل جگہ پر تو صاحب نے دوسرے کا تقرر کر دیا اور عارضی سلسلہ خالی نہیں ہوا۔ اب کس کی بات پر بھروسہ کیا جائے۔ "حضرت اس میں بھروسہ کی کیا بات ہے۔ یہ تو دنیا ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔" مگر بڑے آدمی بھی کہیں کچھ کریں کچھ تو دنیا میں اعتبار پھر کس کا رہے۔" اجی حضرت کوئی پتھر پر لکیر تھوڑا ہی بنائی تھی۔ زبان سے وعدہ کیا تھا۔ مگر شاید پھر خیال نہ رہا ہو اور مجبوراً یا ضرورتاً یا بھولے سے دوسرے کو کر دیا ہو۔ یہاں تو ایسا روز ہی ہوتا ہے۔ آپ اتنا احساس کیوں کرتے ہیں۔ جائیے احساس مت کیجئے۔ خدا حافظ۔

پانچ سال بعد

منصرمی ملی ہے تو آپ کو خرچ بھی کرنا چاہیے۔ "مگر خیال تو فرمائیے آنے جانے کا کرایہ پچاس روپے۔ مکان کا کرایہ پچیس روپے ایک، پندرہ روپے ایک، جلسہ کا چندہ دس روپے۔ پھول کے ہار کی قیمت پانچ روپے۔ منصرمی کا فائدہ تیس روپے آٹھ آنے بھلا مجھے کیا فائدہ ہوا۔ یہ کوئی بنیئے کی دوکان تھوڑا ہی ہے کہ آپ لگے پیسے پیسے کا حساب کرنے۔ یہ تو سرکاری معاملات ہیں ضابطہ کے تحت آپ کو روپے خرچ کرنا پڑیں گے۔ اور پھر یہ سب باتیں تو آپ کے فائدے کے لئے ہیں۔

جناب کا صدارت نامہ اخبار میں نگاہ سے گزرا۔ جناب نے صحیح لکھا ہے کہ ملک کو ایسے ملازمین کی ضرورت نہیں ہے جو دوسروں کے حقوق تلف کر کے اپنی ترقی کی تگ و دو کرتے پھرتے ہیں۔ جو ناجائز اثرات کی بدولت قبل از وقت، ترقی اور عہدہ حاصل کرتے ہیں اور اس مشہور مقولہ کے مطابق کہ "کام کرنے والا بے وقوف ہے" اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ مگر میں جناب کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ اس دنیا میں دو اور دو چار نہیں ہوتے۔ تین ہوتے ہیں یا پانچ

جی نہیں۔ سورج جب تک مشرق سے نکل کر مغرب میں غروب ہوگا دو اور دو ہمیشہ چار ہوں گے ممکن ہے آپ تین کو دو سمجھیں اور کوشش کریں کہ تین اور تین بجائے چھ ہونے کے چار ہو جائیں۔ جناب پانی میں سے مکھن نکالنے کی بیکار کوشش کیوں فرماتے ہیں!!!۔ جناب نے خوب کہا ہے کہ قسمت کی گردش پر آنسو بہانے کا زمانہ ختم ہو چکا اب اپنے آپ کو کارآمد بنانے کا زمانہ ہے۔

یہ بات سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ہم سب کو چاہیے کہ اس پر کاربند ہو جائیں۔

سبحان اللہ

نئی کتابیں

۱۔ تجلی (نظمیں) از محمد حسین اختر ۱۰۴ صفحے رائل الکٹرک پریس لدھیانہ

۲۔ گلدستۂ معرفت (نظم) از محمد برکت اللہ ۲۲۶ صفحے۔ گیلانی پریس لاہور

۳۔ روح انیس جدید ایڈیشن (ادبی سوانح) از مسعود حسن رضوی ۲۶۰ صفحے قیمت ہے۔ انڈین پریس۔ الہ آباد۔

۴۔ شیخ جی (مزاحیہ افسانے) از کوثر چاندپوری ۲۰۷ صفحے قیمت عہ۔ لاجپت رائے اینڈ سنز۔ لاہور۔

۵۔ سبھاش بوس (سوانح) از گوپال متل ۸۰ صفحے قیمت ۶؍ مکتبہ اردو۔ لاہور

۶۔ ترکی اور موجودہ جنگ از ملک احسان الٰہی ۱۵۰ صفحے قیمت ۱۰؍ " "

۷۔ محشر خیال (مجموعہ مضامین) از سجاد علی انصاری ۲۰۷ صفحے قیمت عا؍ خان الیاس احمد۔ قرول باغ دہلی

۸۔ زہریلی کھمبی (افسانے) از سید محمود مورخ ۱۴۰ صفحے قیمت صہ گلفروش پبلشنگ ہاؤس۔ لال کنواں۔ دہلی۔

۹۔ کربلا (ڈراما) از منشی پریم چند قیمت عا؍۔ پتہ لاجپت رائے اینڈ سنز۔ لاہور

۱۰۔ شرم گناہ (افسانے) از ایم اسلم ۲۲۲ صفحے قیمت عہ۔ پتہ اللہ ڈیسرٹرڈ لاہور

۱۱۔ جوانی کی سسکاریاں (افسانے) از اے ایچ۔ آغا قیمت عہ " "

۱۲۔ بیوفا کون؟ (مختصر کہانیاں) ۱۹۲ صفحے قیمت عہ " "

۱۳۔ شمع صمد از خواجہ محمد شفیع دہلوی ۲۱۶ صفحے قیمت عہ از محمد شفیع مینا محل دہلی

۱۴۔ اصلاح سخن (شوق سندیلوی کی غزلوں پر تبصرے) از تمنا عمادی ۱۴۰ صفحے قیمت عا؍ پتہ مسلم ایسوسی ایشن پھلواری۔ ضلع پٹنہ۔

۱۵۔ تذکرۂ بے نظیر از سید عبدالوہاب قریشی ۲۵۵ صفحے پتہ کتابستان۔ الہ آباد

۱۶۔ عہد نبوی کے میدان جنگ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۴۲ صفحے قیمت عہ حبیب کمپنی گلزار حوض حیدرآباد

۱۷۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم از ابوالاعلیٰ مودودی ۱۷۶ صفحے قیمت ۱۲؍ دفتر ترجمان القرآن لاہور۔

۱۸۔ مرقع فطرت (دنیا کی آفرینش کی داستان) از ڈاکٹر پریم ناتھ ۸۰ صفحے قیمت ۱۲؍ مکتبہ جامعہ۔ دہلی

۱۹۔ گار ساں دتاسی از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ۲۸۰ صفحے قیمت سب رس کتاب گھر

۲۰۔ برجیس طلعت (ناول) از بلقیس ضیاء ۲۰۹ صفحے قیمت عہ از مصنفہ نمبر ۲۰ کیننگ روڈ الہ آباد۔

۲۱۔ آج کا مصر (قدیم و جدید مصر کی تاریخ) از محمد حسن الاعظمی ۲۷۰ صفحے اردو اکیڈیمی لاہور

۲۲۔ خرمن (مجموعہ کلام) از نظر حیدرآبادی پتہ مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد۔

۲۳۔ ہمارا پنجاب (مختصر جغرافیہ) از شیخ عزت اللہ قیمت عا؍ پتہ فرینڈز لائبریری لاہور

۲۴۔ تاریخ اسلام (حصہ دوم) از شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت للعہ پتہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

۲۵۔ گل و بلبل (افسانے) از صادق قریشی قیمت عہ نراین دت سہگل اینڈ سنز لاہور

۲۶۔ اتم برار از سید غلام محمود شاہ بی۔ اے (عثمانیہ) ۱۶ صفحے معارف پریس اعظم گڑھ۔

۲۷۔ قابیل (ڈراما) مترجمہ مجنوں گورکھپوری ۱۹۸ صفحے قیمت عہ ایوان اشاعت گورکھپور

۲۸۔ فتح مبین (اسلامی خلافت کی تاریخ) از محمد سعید خاں ۲۹۲ صفحے شروانی بکڈپو علیگڈھ

۲۹۔ نگار نامہ (روح مکاتیب کا دوسرا حصہ) مرتبہ ساغر نظامی ۲۴۴ صفحے قیمت عہ مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ۔

۳۰۔ ہرن از محبوب کنی ۸۰ صفحے قیمت ۸؍ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ۔ حیدرآباد۔

۳۱۔ بچوں کی تربیت مرتبہ مسرت جہاں بیگم ۲۰۰ صفحے ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڈھ

۳۲۔ تاریخ انقلاب روس از ایم۔ ایم۔ جوہر میرٹھی ۲۰۲ صفحے قیمت عہ مکتبہ برہان دہلی

۳۳۔ بیوی کی تلاش (مزاحیہ افسانے) از احسان بی۔ اے ۲۰۷ صفحے قیمت ۱۲؍ نراین دت سہگل اینڈ سنز لاہور

۳۴۔ ساقی (ناول) از آغا اشرف ۱۵۱ صفحے قیمت عہ۔ نراین دت سہگل اینڈ سنز لاہور۔

مرزا سیف علی خان

استغفا

اختری کھوئی کھوئی سی رہنے لگی، ایک بوڑھی خادمہ اور ایک نئی نئی استانی، ڈھلتا بڑھاپا اور اٹھتی جوانی، آگ اور پانی میں اتحاد کیسے ہوتا! بات بات پر جھڑپ، بڑھیا تنگ آگئی، ایک روز جب اختری نے اسے گندے انڈے لانے پر ذرا سا کوسا، تو وہ بولی "لے بی بی، یہ پڑے ہیں تیرے دیگچے دیگچیاں، اور یہ پڑے ہیں وہ کپڑے، جو تو نے پچھلے مہینے سلا دیئے تھے، میں نے اس مہینے کی تنخواہ بھی بخشی، مجھ سے اب یہاں بسر نہ ہوگی، خاک چاٹ کر جی لوں گی، تیرے قورمے زردے نے تو میری زندگی اجیرن کر ڈالی؟"

اور خلافِ معمول اس روز اختری کھل کھلا کر ہنس پڑی، بڑھیا کو دونوں شانوں سے پکڑ کر دھیرے سے جھنجھوڑا، اور بولی۔ "لے اب رہنے بھی دے، بڑی اماں، تھوک دے غصہ تیرے بغیر تو مجھ سے اس شہر میں نہ رہا جائے گا، مجھ سے وعدہ لے لے، آج کے بعد اگر تجھے کسی بات پر ٹوکوں، تو میرے کان کتر لینا، میری توبہ!" —— اور اختری نے اپنے کان پکڑ لئے۔

بڑھیا کے ماتھے پر شکنوں کی شطرنج بچھ گئی، دھندلی آنکھوں پر پانی کی تہہ سی ابھر آئی۔ سوچنے لگی، اس اڑتی پھرتی چنگاری میں یہ خنکی کدھر سے آئی! اور پھر بدگمان سی ہوگئی، جانے ان میٹھے الفاظ کے پردے میں کیا زہر چھپا ہے، اس مخملی دستانے کے نیچے جانے کتنا تیز فولادی پنجہ کلبلا رہا ہے، ابھی کوئی گلاس ولاس لڑھک جائے گا مجھ سے، اور میری چودہ پشتوں پر برس پڑے گی، مذبذب حالت میں کچھ بول نہ سکی، پلٹی اور باورچی خانے کی طرف چل دی!

مگر اختری تو اس روز ربڑ کا غبارہ بنی پھرتی تھی، کبھی ادھر مٹک رہی ہے، کبھی ادھر اچھل رہی ہے، اب یہاں ہے، تو پلک جھپکنے میں وہاں، تھرک رہی ہے، پارے کی طرح تڑپتی اور کوندے کی طرح لپکتی، برآمدے سے باورچی خانے میں، باورچی خانے سے سونے کے کمرے میں، اور پھر آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے، اور گالوں پر گلاب کھل رہے تھے!

بات یہ ہوئی، کہ اس روز سامنے کے بالاخانے میں ایک نوجوان کرایہ دار آبسا، اختری یونہیں باہر گلی میں جھانک رہی تھی، اور وہ نیم وا کھڑکی کے پاس الماری میں کتابیں سجا رہا تھا۔ اور دردناک سُروں میں یہ شعر گنگنا رہا تھا ؎

نقاب ڈال رکھے ہیں دلِ فسردہ پر　　　کوئی سمجھ نہ سکا میرے مسکرانے کو

اور جانے کیوں، اختری کے کانوں کی لوویں لال پڑ گئیں اور ناک کا بانسہ لرز اٹھا، لپک کر آئینے کے سامنے آبیٹھی، بالوں کو سنوارا، قمیص کو کھینچ کھانچ کر جسم سے چپٹا لیا، لپ اسٹک سے ہونٹوں کو آگ لگا دی، اور پھر دوڑ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی، نوجوان گا رہا تھا ؎

ترے جہاں میں ٹھکانہ کہیں نہیں ملتا　　　پروں پہ لے کے نہ اڑ جاؤں آشیانے کو!

اور اختری محسوس کرنے لگی، جیسے یہ ساری کائنات ایک سونا نگر ہے، اور اس نگر کو بسانے کے لئے اس کی ایک نگاہ، ایک لطیف مَس، اور ایک مبہم اشارہ ہی بس ہے، اور یہی وجہ تھی، کہ آج بڑھیا نے اختری کے منہ سے خلافِ معمول اچھے الفاظ سنے تھے۔

اور اس کا دماغ بھنا سا گیا تھا،

دوسرے روز جب اختری اسکول گئی، تو لڑکیاں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ "شاید آج نیا سنگار دان آیا ہے، استانی جی کا"۔۔۔ "شاید آج استانی جی کو کوئی موہنا سا خواب دکھائی دیا ہے"۔۔۔ "آج موسلا دھار بارش ہوگی!"۔۔۔ اور اختری سر جھکا کر کھڑی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ کر سب کچھ بھانپ گئی، جب سے وہ قصبے کے ہائی اسکول میں آئی تھی، مٹیالے رنگ کی ایک ساڑی میں ملبوس رہتی، لبوں پر پھیکی پھیکی مسکراہٹ، آنکھوں میں سائے، چہرے پر پرچھائیاں اور چال میں سستی۔ لاہور ایسے شہر کو چھوڑ کر وہ اس قصبے کو ایک ویران سا محلہ محسوس کرتی تھی، یہاں اسے ایک دھندلا سا لیمپ جلانا پڑتا، جس کی روشنی میں اس کی آنکھیں دکھنے لگتیں، میری کوریلی کے ناول پڑھتی رہتی، اور جب ایک دو باب ختم کر لیتی، تو پریشان ہو کر اپنے آپ سے پوچھتی" اری کیا پڑھا تو نے، خاک بھی تو پلے نہیں پڑا، جانے اس مغموم چھوکری کو وہ نوجوان ـــــ " بہت دیر تک سوچتی رہتی، اور پھر کتاب کو دور پھینک کر سونے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی، لیکن اسے بہت دیر تک نیند نہ آتی، اور جب آتی تو سنسان خوابوں کا ہجوم لیئے، اور پھر اس کی کوئی سہیلی بھی تو نہ تھی، جس سے جی بہلا رہتا، اس کے نزدیک اس قصبے کی سب عورتیں درا وڑوں کی اولاد سے تھیں، جنھیں نہ بدن ڈھانکنے کا ڈھب، نہ بات کرنے کا سلیقہ، تیل سے لپے ہوئے میلے چکیٹ دوپٹے، کھلی کھلی بھونڈی قمیصیں، بات بات پر مردوں سے بھی اونچے قہقہے، نہ امریکن فلموں کے تذکرے، نہ جمیروں کے نئے ڈزائن، نہ میری کوریلی کے ناولوں پر بحثیں، بس گھی آٹے کا بھاؤ، اور ایک دوسرے کے گلے، صبح صبح وہ اسکول جاتی، واپس آتی تو دھم سے پلنگ پر، بڑھیا کو گھڑکیاں، کروٹیں اور انگڑائیاں، مٹی کے تیل کی بو، اور بھینسوں کے گوبر کی سڑاند؛ وہ تو ان پچھلے دنوں سے استعفیٰ پیش کرنے کا بھی ارادہ کر بیٹھی، ابا کو بھی لکھا، وہ سٹپٹا کر یہاں دوڑے آئے، سمجھایا، بجھایا، تسلیاں دیں، بڑے بھاری بھاری الفاظ میں آنے والے دنوں کے عفریت کا خوف دلایا، اور پھر یہ بھی کہا، کہ سجاد اب کے ایم اے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا، اور پھر ـــــ!

پھر کیا؟ اختری نے سوچا، "وہ پشاور ہوں گے، تو میں نکودر ہوں گی، وہ میرٹھ جائیں گے، تو میں قصور میں پڑی سڑتی رہوں گی"۔

لیکن اس نے ابا کے کہنے پر استعفیٰ دینے کا خیال دل سے نکال دیا، آج سے دو چار دن پہلے، وہ پھر اسی معاملے پر غور کر رہی تھی، کہ اچانک اس کی تقدیر نے پلٹا کھایا، اور مقابل کے بالاخانے کی کھڑکی کی یاد ہو گئی!

مسکراتی ہوئی لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے وہ بولی: "آج تم سب کے لبوں پر تبسم کیوں کھیل رہے ہیں؟ نویں جماعت کی لڑکیوں کو اپنی استانی کے سامنے ایسے الھڑپنے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے"۔۔۔ لیکن لڑکیاں بدستور مسکراتی رہیں، اور ایک نے تو جرأت کر کے یہ بھی پوچھ لیا۔ "استانی جی، وہ مٹیالے رنگ والی ساڑی کہاں گئی آپ نے؟"

اور اختری مسکرا کر بولی: "اچھا یہ بات ہے، لیکن وہ دیکھو زہرا نے نئی قمیص پہن رکھی ہے، اور راد ھارانی کا دوپٹہ آج خلافِ معمول اُجلا اجلا ہے، اور وہ رشیدہ کے کانوں میں نئے جھمکے! میں نے کوئی نئی بات نہیں کی"۔

لیکن لڑکیاں محسوس کر رہی تھیں کہ یہ بالکل نئی بات تھی، اپنے اس نئے نئے راز کو یوں فاش ہوتا دیکھ کر وہ بہت گھبرائی، لڑکیوں کو بے وجہ جھڑکا اور جب گھر واپس آئی، تو بڑھیا کو اپنے چولے سے جوئیں نکالتے دیکھ کر آگ بگولہ ہو کر رہ گئی، بولی۔

"کیا انہی ہاتھوں سے مجھے کھانا وغیرہ ــــــ" اور سامنے کھڑکی میں اسے ایک سایہ نظر آ گیا!

اور بڑھیا اختری کے تیور جانچ کر بولی: "لیکن بی بی، کھانا پکانے سے پہلے ہاتھ دھو لیتی ہوں میں۔"

اختری نہیں چاہتی تھی، کہ اس وقت کوئی اس کے تصورات کی ہولے ہولے بہتی ہوئی ندی میں کنکر پھینک دے، بڑھیا کو خاموش رکھنے کے لئے، وہ مسکرائی اور بولی، "میں نے کب کہا ہے، کہ تو ہاتھ صاف نہیں کرتی، تیری ایسی ستھری اور سگھڑ بڑھیا تو مغل شہزادیوں کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی" اور بڑھیا خوش ہو کر یوں ہنسی، جیسے کوئی تیز رفتار گھوڑا کنکروں پر دوڑا جا رہا ہو،

سامنے کھڑکی سے دھوئیں کی پتلی پتلی دھاریاں لہراتی ہوئی نکل رہی تھی، اور ان دھاریوں پر بہت دلآویز اور دردناک سی گنگناہٹ تیرتی آ رہی تھی، اختری کھڑکی کے پاس جا کر بہت دیر تک کھڑی رہی، اور انتظار کرتی رہی، کہ اس تصویر میں یہ پراسرار مصور کوئی نیا رنگ بھرے گا، مگر دھواں اسی طرح اڑتا رہا، گنگناہٹ اسی طرح تیرتی رہی، صرف سورج کے مغربی افق تک پہنچ جانے کی وجہ سے یہ منظر دھندلا سا گیا، پلٹ کر وہ دروازے کے پاس گئی، اور بڑھیا کو چائے لانے کے لئے کہا، اور حیران بڑھیا باورچی خانے سے نکل کر بولی، "بی بی، چائے تو کب کی تپائی پر رکھ آئی ہوں!"

"اچھا" اختری مسکرائی، اور تپائی کے قریب آ کر چائے کی طرف دیکھا، تو زور زور سے ہنسنے لگی، اور بولی "گرم چیزیں دیر تک ایک جگہ پڑے رہنے سے سرد ہو جاتی ہیں۔" بڑی اماں اٹھا لے جا طشت کو، اور اس چائے کو پھر گرم نہ کرنا، بدذائقہ ہو جائے گی۔"

بڑھیا چائے اٹھا کر لے گئی تو اختری سوچنے لگی کہ یہ عجیب نوجوان ہے جو نہ کہیں باہر سیر کو جاتا ہے، نہ اپنے کمرے ہی میں ٹہلنے کی تکلیف گوارا کرتا ہے، کھڑکی میں سے بھی نہیں جھانکتا۔ سگریٹ سلگا کر بے مزہ اشعار گنگناتا رہتا ہے، اور دیر تک گنگناتا رہتا ہے، لیکن اس کے یہاں آنے سے قبل میرا بھی تو یہی معمول تھا۔ ان دنوں میری کوئی سہیلی نہ تھی، کوئی ہمجولی نہ تھا۔ اکیلی تھی میں۔ لیکن اب جب میں چاہتی ہوں کہ وہ میرا دوست ہو جائے، میرے دل کو اس آرزو سے ہی تشفی مل رہی ہے، شاید یہ بھی اکیلا ہے، اسے بھی اس منحوس قصبے میں اپنا کوئی ہم خیال نہیں ملتا اور اسی لئے اس اندھیرے بالاخانے میں پڑا سڑ رہا ہے، اب اسے کون بتائے کہ تیرے بالاخانے کی مقابل کی کھڑکی میں تجھے اپنی ہم خیال اور ہم مذاق دوست مل جائے گی، لیکن وہ کھڑکی سے باہر دیکھے بھی تو۔ وہ تو کسی دیوار کی اوٹ میں بیٹھا جانے اب پڑھ رہا ہے یا سو رہا ہے یا سوچ رہا ہے، اب گنگناہٹ بند ہو چکی تھی۔ رات کی وجہ سے دھواں بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور ہنوز وہ کمرہ اسی طرح تاریک تھا۔

کھانا کھا کر اختری پھر کھڑکی کے پاس آ بیٹھی۔ ایک بار سامنے ایک دیاسلائی روشن ہوئی۔ اور ایک مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ شاید موم بتی جلائی تھی اس نے یا کوئی گھٹیا قسم کی لالٹین۔ اور اس کے بعد وہی گنگناہٹ شروع ہو گئی۔ بہت رات گئے تک اختری وہیں بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں دکھنے لگیں۔ کان بجنے لگے اور کل سے دل کی کونپل پر جو کلیاں مسکرانے لگی تھیں وہ جیسے کملا کر نیچے لٹکنے لگیں۔ پلٹی اور دھم سے پلنگ پر جا گری۔ بہت دیر تک سوچتی رہی کہ یہ عجیب پراسرار نوجوان ہے جو اپنے آپ کو اس اندھیری چار دیواری میں اس شدت سے جکڑے ہوئے ہے، خدا جانے اس کے خیالات کیا ہیں۔ جذبات کیا ہیں۔ اس کی افتادِ طبع کیسی ہے، کیا شغل ہے اس کا ہیرو تو میرے لئے الف لیلیٰ کا کوئی کردار بنتا چلا جا رہا ہے، اور میں کتنی بے وقوف ہوں کہ ایک مبہم سے خیال کے زیر اثر اتنی دیر تک

جاگتی رہی۔ اور پھر آج اسکول میں خواہ مخواہ لڑکیوں کے استہزا کا نشانہ بنی۔ چائے بھی تو نہ پی جس کے بغیر میں اپنے آپ کو برف کا تودا سمجھنے لگتی تھی۔ کوئی کام بھی تو نہ کیا۔ اور وہ میری کوریلی کے ناول میں اس مغموم لڑکی کو جانے وہ نوجوان ـــــ! وہ اٹھی، ناول اٹھایا اور ایک صفحے کی تلاش میں تھی کہ اسے نوجوان کی گنگناہٹ بلند ہوتی سنائی دیتی۔ پلنگ سے کھسک کر وہ کھڑکی کے قریب پہنچ گئی۔ لیکن نہ جانے کیوں اب وہ اپنے آپ کو اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک طرف دبکی کھڑی رہی اور وہ نوجوان کھڑکی سے باہر سر نکالے یہ شعر گاتا رہا ؎

مجھے بھی رخصت تعمیر آشیاں دیجے
چلے ہیں آپ اگر بجلیاں گرانے کو!

اختری نے کئی بار ارادہ کیا کہ ہمت کر کے کھڑکی کے مقابل آجائے، لیمپ کی روشنی تو کسی حالت میں اس کے چہرے پر نہ پڑ سکے گی۔ اور پھر اس نوجوان کا چہرہ بھی تو نظر نہیں آتا۔ اُس کھڑکی میں بھی ایک سایہ۔ اِس کھڑکی میں بھی ایک سایہ۔ ایک دوسرے کے سایے دیکھ کر شاید ـــــ شاید! ـــــ شاید کیا! اُس کے دل میں چند "ناپاک" خیالات آئے، ناپاک اس لئے کہ دسویں جماعت میں پڑھی ہوئی ایک مذہبی کتاب کے نقطۂ نظر سے اس قسم کے خیالات کنواری لڑکیوں کو زیب نہیں دیتے تھے۔ اور ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ نوجوان پیچھے ہٹ گیا۔ اور اختری کھڑکی کے مقابل دیر تک کھڑی رہنے کے بعد پھر اسی طرح پلنگ پر آگری۔

اس نے اپنے دل میں چمکتی ہوئی چنگاریوں پر راکھ ڈال کر انہیں بجھانے یا کم از کم چھپانے کی بہت کوشش کی مگر وہ پھر سطح پر ابھر آتیں۔ اور وہ کروٹیں بدل بدل کر اپنے شانے چھلتی رہی، نیند آئی تو انہیں سنسان خوابوں کو ساتھ لئے، اور جب صبح اٹھی تو کھڑکی سے اسی طرح دھواں اور دھوئیں کے ساتھ گنگناہٹ باہر تیری جا رہی تھی۔ اور یہ دھوئیں اور گنگناہٹیں پیدا کرنے والا نظر نہ آتا تھا۔

یوں تو گزر نہ ہوگی۔ اس نے سوچا۔ جرأت کرنی چاہیے۔ لیکن ایک کنواری لڑکی ہوتے ہوئے یہ جرأت کرنے کا خیال ایک خواب سا بن جاتا۔ وہ چاہتی کہ یونہی آپ ہی آپ، بغیر کسی قسم کے تردد کے وہ ادھر توجہ کرنے لگے تو ذرا یہ دن اچھے گزر جائیں گے، شہری معلوم ہوتا ہے، اور پھر پڑوسی بھی ہے، اسکول کے بعد اکٹھے چائے پی لی۔ یا ادب کے متعلق دو چار باتیں کریں۔ بس۔ میں اور کیا چاہتی ہوں۔ کچھ نہیں۔ بس ذرا وقت اچھا کٹ جائے گا، اس کا بھی اور میرا بھی۔ اور میرا کیا ہے، میں تو تین مہینے پہلے بھی جیتی چلی آئی، یہ بے چارا یہاں بیمار پڑ جائے گا۔ اس کا اپنا بھلا ہے اس بات میں۔

اچانک اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ نوجوان سامنے کھڑکی میں سے باہر جھانک رہا تھا۔ لمبے لمبے پریشان بال۔ بڑی بڑی اداس آنکھیں۔ باوقار لیکن پژمردہ چہرہ۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا اور جب سیدھا ہوا تو اچانک اس کی نظریں اختری پر جا پڑیں جو اس کے بالکل مقابل بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ سن ہو کر رہ گیا۔ رنگ فق ہو گیا اور آنکھوں پر گھنی بھویں جھک آئیں۔ اختری کو اپنی طرف متوجہ پا کر وہ نیچے دیکھنے لگا اور پھر گھوم کر ایک طرف ہو گیا۔ اور اختری نے آج پھر سنگار دان کو ایک گھنٹے تک استعمال کیا۔ اور یوں بن ٹھن کر نکلی کہ اسکول کی لڑکیاں اسے دیکھ کر دم بخود سی رہ گئیں۔ دن بھر وہ لڑکیوں کو لطیفے سناتی رہی اور پھر میری کوریلی کے ایک ناول کا پلاٹ بھی سنایا۔ اور پھر جب وہ اس مغموم لڑکی کی باتیں کر رہی تھی جیسے وہ نوجوان ـــــ! تو وہ اچانک رک گئی۔ اور لڑکیوں نے یک زبان ہو کر پوچھا۔ "آگے استانی جی؟"

"بس میں نے یہیں تک پڑھا ہے" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ اور لڑکیاں اداس سی ہو گئیں۔ جانے وہ نوجوان ـــــ! یہ

نشتر ان کے دل میں چبھنے لگا اور جب اختری گھر واپس آئی تو یہی سوچ رہی تھی کہ جانے وہ نوجوان ـــــ خدا جانے، کوئی اپنا تقدیر کو کیا سمجھے۔ مستقبل کے متعلق سوچنا تو بیکاروں کا مشغلہ ہے۔ ورنہ سوچ سوچ کر ناحق جی ہلکان ہوتا رہتا ہے اور پھر ہوتا وہی ہے جو مقدر میں لکھا ہے، لیکن جانے ـــــ!

بڑھیا کی خوشامد کرتی وہ اپنے کمرے میں آئی۔ دیر تک لباس نہ بدلا۔ شاید وہ نوجوان کھڑکی سے جھانکے۔ لیکن بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ مایوس سی ہو گئی، نیا لباس اتار دیا اور میلی ساڑھی پہن لی اور جونہی میلی ساڑی پہن چکی تو وہ نوجوان سامنے کھڑکی میں نمودار ہوا۔ اختری نے یوں محسوس کیا جیسے اس کے ہاتھوں میں سے چینی کے برتنوں کا طشت چھوٹ کر فرش پر گر گیا ہے! نگاہیں بت کی طرح وہیں جم گئیں۔ نوجوان کی نظریں سیدھی اس پر پڑیں۔ اور انھوں نے اختری کا کچھ اس انداز سے جائزہ لیا جیسے وہ بیوٹی کمپیٹیشن کا سب سے بڑا جج ہے۔ اختری یوں ساکت و صامت کھڑی رہی جیسے آج ہی اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے، گھبرائی ہوئی نیچے فرش پر نظریں جمائے رکھیں۔ شانے پر پڑے ہوئے بالوں کو سر کے ایک جھٹکے سے پیچھے کیا اور سامنے دیکھا تو نوجوان کھڑکی سے ہٹ چکا تھا۔ اسے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ ایک غیر مرد کے سامنے پگلوں کی طرح اپنے حسن کی نمائش کرنے کے لئے کھڑی رہی اور وہ غیر مرد اتنا بے نیاز، اتنا بدمذاق کہ اس نے توجہ ہی نہ کی۔ اختری نے محسوس کیا جیسے وہ اس گھناؤنی صورت والی گداگر چھوکری سے بھی زیادہ ذلیل ہے جو روزانہ نیچے گلی سے قدم قدم پر کوڑے کے کپڑے گراتی گزر جاتی ہے۔

اس نے جی ہی جی میں فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اس طرف کبھی نہ دیکھے گی۔ کھڑکی بند کر دیتی لیکن روشنی اور ہوا کا ایک یہی تو رستہ تھا بس وہ ادھر دیکھیں گے نہیں۔ یہیں پلنگ پر لیٹی ناول پڑھتی رہے گی، لاہور کی سہیلیوں کو خط لکھتی رہے گی۔ سجاد صاحب کے متعلق سوچتی رہے گی، بہرحال وہ ادھر توجہ نہ کرے گی۔

اور یہ تہیہ کر کے وہ باورچی خانہ میں گئی، بڑھیا کے پاس بیٹھ کر چائے پی۔ دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر لیمپ روشن کیا۔ نظریں جھکائے پلنگ تک آئی۔ اور خدا جانے کس طرح اس کی نظریں کھڑکی پر جا پڑیں۔ کھڑکی ہوا کے جھونکے سے بند ہو چکی تھی۔ یہ اچھا ہوا۔ اس نے سوچا۔ ورنہ میں تو اپنے فیصلے سے انحراف کر چکی تھی، لیکن ایک آدھ گھنٹے کے بعد اسے ہوا کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جا کر کھڑکی کھولی تو وہ نوجوان باہر گلی میں جھانک رہا تھا۔ کھڑکی کھلنے کی آواز سنی تو وہ پیچھے ہٹ کر ایک طرف گھوم گیا!

اور اختری سوچنے لگی کہ شاید یہ نوجوان شرماتا ہے، اور ڈرتا ہے کہ اگر میری طرف توجہ کر بیٹھا تو میں کہیں ہنگامہ نہ مچا دوں، لیکن مجھے تو وہ اچھا سیانا دکھائی دیتا ہے، کیا اس نے میری آنکھوں کی چمک اور میرے عارض کے رنگ نہیں دیکھے کیا وہ سمجھتا ہے کہ میں کھڑکی کے پاس صرف ہوا خوری کے لئے آ کھڑی ہوتی ہوں۔ بیچارا کتنی غلطی پر ہے، اسے سمجھایا جائے لیکن کس طریقے سے، اب میں کیسے اسے آواز دوں، اور جب وہ کھڑکی میں آئے تو کیسے کہوں کہ تم ناحق ہچکچا رہے ہو، تم تو میرے ـــــ! سوچوں کے اس بڑھتے ہوئے دھارے کے سامنے اچانک کسی احساس نے بند باندھ دیا۔ اٹھ کر پلنگ پر گر پڑی، اور روشنیوں اور تاریکیوں کو آپس میں گھلتے ملتے دیکھتی رہی۔ یوں نہیں۔ یوں۔ یوں بھی نہیں۔ یوں۔ نہیں نہیں یوں بھی ٹھیک نہیں۔ یوں! لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچی۔ اور صبح

اٹھ کر جب وہ لباس بدل رہی تھی تو اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ وقت سے بہت پہلے اسکول پہنچی۔ اسکول کی پرانی ملازمہ کو بلا کر ایک طرف لے گئی اور بولی: "میں جب سے اس اسکول میں آئی ہوں۔ مجھے۔ بڑی اماں۔ تمھارے سوا کسی سے دلچسپی نہیں۔ تمھاری میٹھی میٹھی باتیں اور تمھاری بزرگی اور تمھاری مہربان صورت ــــ میں تو اس بھرے شہر میں صرف تمہیں کو اپنا سمجھتی ہوں ورنہ یہ خشک استانیاں اور یہ گستاخ چھوکریاں ــــ ان سے تو میرا جی بیزار ہو چکا ہے، تم اتنی اچھی ہو بڑی اماں کہ ــــ"

اور بڑھیا حسرت سے ہانپتی ہوئی بولی: "لیکن بیٹی تو نے مجھے کبھی کوئی خدمت بھی تو نہیں بتائی۔ میری بزرگی اور میری باتیں تمھارے کس کام کی۔ تمھارے یہاں آنے سے پہلے یہاں ایک استانی آئی تھیں ــــ"

اختری گھبرا گئی۔ اب بڑھیا ایک ایسے قصے کو چھیڑنے والی تھی جو شام پڑے تک بھی شاید ہی ختم ہوتا۔ جیب سے دس روپیوں کا ایک نوٹ نکال کر بولی: "بڑی اماں۔ اتنا بڑا کام میں تمھارے سوا اور کسی کے سپرد نہ کرتی۔ یہ لے اپنا انعام اور شام کو میرے پاس آ نیو۔ میں تمھیں ایک خط لکھ دوں گی اور وہ ــــ" اختری کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ اور کچھ کہنے کی کوشش اور کچھ کہہ نہ سکنے کے دکھ سے اس کا رنگ اڑ گیا۔

بڑھیا مسکرا کر بولی: "لے بی بی مجھ سے پردا کیا۔ بتاؤ کون ہے، بس یہ سمجھو میرے سر پر سلیمانی ٹوپی ہے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، میں آج تک بھوسہ نہیں چھانتی پھری، یہاں سب نئی نئی استانیوں کے رقعے ــــ"

اور اختری کل کی طرح بول اٹھی: "وہ میرے گھر کے مقابل ایک پرانا سا بالاخانہ ہے نا۔ وہاں ایک نوجوان رہتے ہیں۔ انھیں دے آئیو۔"

"اچھا وہ شفیق!" بڑھیا ہنسی۔

شفیق! اور بڑھیا اسے جانتی بھی ہے، حیران بھی ہوئی خوش بھی ہوئی۔ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا بھی محسوس کرنے لگی، اسکول کے چھ گھنٹے اس کے سینے پر کابوس کی طرح سوار رہے، آخری گھنٹی بجی تو لپک کر گھر آئی۔ بہت سے خط لکھے اور پھاڑ کر وہ پھینکے۔ اور آخر وہ صرف یہ دو سطریں ہی لکھ سکی۔

حضرت۔

پڑوسیوں کے ایک دوسرے پر جو حقوق ہوتے ہیں ان سے تو آپ ناواقف نہیں ہوں گے، آج رات کا کھانا میرے ہاں تناول فرمائیے گا۔　　اختری

خط لکھ چکی تو اسکول کی بوڑھی ملازمہ آ پہنچی۔ اسے لفافہ دیا اور پھر کھڑکی کے پاس آ کر بیٹھ گئی، دل یوں دھڑکنے لگا جیسے اسے کسی نجومی نے زلزلے کی اطلاع دے دی ہے اور وہ کائنات کے کروٹ بدلنے کی منتظر ہے، جسم تپ گیا۔ آنکھوں کے ڈوروں میں جلن سی ہونے لگی۔ سامنے کھڑکی سے اسے بڑھیا کے سلیپر گھسٹنے کی آواز آئی، دس بارہ منٹ تک خاموشی رہی۔ اور پھر سلیپروں کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے پلنگ پر بیٹھ کر میری کوریلی کا ناول پڑھنے لگی۔ اور جب اس مغموم لڑکی نے اس نوجوان کو ــــ! بڑھیا نے اسی کا لفافہ سامنے میز پر رکھ دیا۔

"جواب ہی نہیں دیا!" اختری نے پوچھا۔

اور بڑھیا بولی "اری بی بی. تو اتنا گھبرا کیوں رہی ہے، تیرے خط کے پیچھے ہی کچھ لکھ دیا ہے اس نے لفافہ تو کھول"
اختری نے لفافہ کھولا۔ آنکھوں کے سامنے ایک بحرِ زخار سا لہریں لینے لگا اور پھر ان اچھلتی اور لپکتی ہوئی لہروں میں سے یہ دو سطریں ابھریں۔

محترمہ۔ میں دودھ کا جلا ہوں اور اب چھاچھ کو پھونک پھونک کر پینے کے بجائے اسے چھوتا تک نہیں۔ شکریہ ! شفیق

اختری خط پڑھ چکی تو بڑھیا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی "کل پھر اس وقت؟ مبارک ہو بی بی. شفیق بڑا اچھا چھوکرا ہے، میں اُس کی پرانی خدمتگار ہوں"
بڑھیا چلی گئی. تو اختری بہت دیر تک سامنے دیوار پر نظریں گاڑے بت کی طرح بیٹھی رہی۔ اور پھر اچانک بگولے کی طرح ابھر کر ایک کاغذ کھینچا۔ اور اس پر کچھ لکھنا ہی چاہتی تھی کہ سامنے بالاخانے کی کھڑکی کی کھڑاک سے بند ہونے کی آواز آئی۔ وہ لپک کر کھڑکی تک گئی. نیچے گلی میں جھانکا تو وہی نوجوان ہاتھ میں بستر لٹکائے اور کاندھے پر ایک بکس دھرے سیڑھیاں اترا اور پھر ہولے ہولے چلتا ایک اور گلی میں مڑ گیا۔ اختری نے یوں محسوس کیا جیسے کسی نے اسے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا ہے، دیوانوں کی طرح قلم کی تلاش میں سارا کمرہ چھان مارا اور اسے قلم اپنے ہاتھ ہی میں مل گیا۔ میز پر جھک گئی. کچھ لکھا۔ بڑھیا کو آواز دی، وہ بھاگی بھاگی آئی. تو اس کے ہاتھ میں ایک خط دیتے ہوئے بولی "یہ جا کر ڈاک خانے ڈال آ۔ جلدی"
"گھر بھیج رہی ہو بی بی؟" بڑھیا نے پوچھا "میرے سلام لکھ دئے ہیں بڑی بی بی جی کو"
"یہ میرا استعفیٰ ہے" اختری بولی.
"استعفیٰ، بی بی؟" بڑھیا کی دھندلی آنکھیں پھیل گئیں. "کیوں؟" "میں یہاں لڑکیوں کو پڑھانے اور سکھانے آئی تھی" اختری بولی. "لیکن مجھے ابھی خود ہی بہت کچھ پڑھنا اور سیکھنا ہے، خط ڈال آؤ اور پھر آ کر اس کھڑکی کو بند کر کے اس میں میخیں گاڑ دو کہ پھر کھل نہ سکے. میں آج کل تازہ ہوا سے گھبراتی ہوں"
—— اور اس نے میری کوریلی کا ناول اٹھا لیا!

احمد ندیم قاسمی

تنقید و تبصرہ

زہریلی مکھی اور دوسرے افسانے:۔ از سید محمود مورخ بی اے۔ صفحات ۱۴۰۔ ناشر گلفروش پبلشنگ ہاؤس (دہلی)
سید محمود صاحب مورخ روزنامہ مسلمان دہلی کے مدیر ہیں۔ اور ان کی کئی کتابیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں شہر خموشاں اور مورخ کے افسانے خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ ان کے افسانوں کا تیسرا شیرازہ ہے۔ جس میں دس مختصر افسانے ہیں۔ اس کا پیش لفظ دلی کے مشہور علم دوست خواجہ محمد صاحب شفیع نے قلبند کیا ہے۔ جس میں انھوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ محمود صاحب کے افسانے اس مقولے کے مصداق ہیں کہ "از دل خیزد بر دل ریزد"
اس مجموعے میں جو افسانے شائع کئے گئے ہیں وہ سب دلی کے مشہور رسالہ "ساقی" اور "شاہ جہاں" میں چھپ چکے ہیں۔
محمود صاحب کا انداز بیان بے باک اور رواں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

تذکرۂ شمیم:۔ از سعید رضوی۔ ۱۲۸ صفحات۔ یہ کتاب اصل میں انوار فاطمہ شمیم لکھنوی مرحومہ کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ مرحومہ کراستہ ویٹ گرلس کالج الہ آباد میں پروفیسر تھیں۔ اور اردو، فارسی کی تعلیم ان کے سپرد تھی۔ ۲۳ اگست ۱۹۴۰ء کو انتقال کیا۔ ان کو شعر و سخن کا بھی اچھا ذوق تھا، شمیم تخلص کرتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد اُن کے دوستوں اور عزیزوں نے جو مضامین اور نظمیں اظہار تعزیت کے طور پر لکھی تھیں ان کو بھی سعید رضوی صاحب نے اس تذکرہ میں شامل کر لیا ہے۔ اور ابتدا میں ان کی تصنیفات پر بسیط تبصرہ بھی قلبند کیا ہے۔ شمیم مرحومہ کا کلام اثر سے خالی نہیں۔

دادا لال بجھکڑ:۔ از مرزا عصمت اللہ بیگ صفحات ۲۴۔ یہ ایک چھوٹی سی باتصویر کتاب ہے۔ جس میں ہندستان کی مشترکہ قومی خصوصیتوں کا ایک نمونہ لال بجھکڑ پیش کیا گیا ہے۔ مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب نے اپنے دلچسپ مزاحیہ انداز میں لال بجھکڑ کے مشہور قصوں کو ایک مسلسل سوانح حیات کے طور پر بیان کیا ہے اور کتاب میں چند ایسی عمدہ تصویریں بھی شریک کی ہیں جو مندرجہ مضامین کی وضاحت خوبی سے کرتی ہیں۔ ہر پڑھے لکھے بچے کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

داستان تاریخ اردو:۔ از حامد حسن قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ صفحات ۸۵۲۔ ناشر لکشمی نارائن اگروال۔ تاجر کتب آگرہ۔ اس ضخیم کتاب میں اردو نثر کی تاریخ تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اور اس کی ترتیب میں حتی الامکان جملہ ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ایک عرصہ قبل سید علی حسن مرحوم مارہروی نے تاریخ نثر اُردو کے نام سے اسی موضوع پر ایک کتاب شائع کی تھی۔ لیکن داستان تاریخ اُردو نقش ثانی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس میں بہت سی نئی معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ چونکہ مرتب کو شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق ہے اور فن تاریخ گوئی میں بھی انہیں کمال حاصل ہے۔ اس لئے کتاب کے نام کے علاوہ اکثر مصنفوں اور مولفوں کی تاریخوں کے سلسلے میں انھوں نے اپنے اس ملکہ سے کام لیا ہے۔ جو بعض جگہ بے جا

طوالت کا بھی باعث ہوا ہے۔ تاہم اس سے کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور یہ تاریخ طالب علموں کے ساتھ ساتھ محققین اور ان مصنفین کے لئے بھی کافی ذخیرۂ معلومات ثابت ہوگی، جو اُردو ادب کی تاریخ کی نسبت کچھ لکھنا چاہتے ہوں۔

مرتب نے اردو نثر کے چھ دور قائم کئے ہیں۔ پہلے دور میں اُردو کے آغاز اور مختلف مقامات میں اس کی ابتدائی تحریروں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ دوسرے دور میں زیادہ تر یورپین مصنفین اُردو کا تذکرہ ہے۔ تیسرا دور فورٹ ولیم کالج کے مولفین اور ان کے ہم عصروں پر مشتمل ہے۔ چوتھا دور دلی کالج کے زمانے اور دکن کے ان مصنفین سے بحث کرتا ہے جو نواب شمس الامرا کی سرپرستی میں اُردو نثر کی خدمت کر رہے تھے۔ پانچویں دور میں سرسید احمد خاں کے معاصرین کی اردو خدمات کا تذکرہ ہے۔ چھٹا دور غدر کے بعد کی اردو نثر کی تاریخ ہے۔ جس میں محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، نذیر احمد، الطاف حسین حالی، سید علی بلگرامی، شبلی نعمانی، سید احمد دہلوی، ناصر علی خاں اور ناصر نذیر فراق کے حالات اور نمونہ جات نثر درج ہیں۔ آخر میں اس دور کی نثر پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ چھٹے دور کے بعد ایک ساتویں دور کی بھی ضرورت تھی۔ جس کے متعلق خود مصنف کا بیان ہے کہ وہ ایک اور کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ جب تک یہ دوسرا حصہ مرتب نہ ہولے اُردو نثر کی یہ تاریخ نامکمل سمجھی جائے گی۔

نغمۂ زندگی:۔ مجموعۂ کلام سید فضل احمد کریم فضلی۔ ڈی لٹ آکسن آئی سی ایس۔ بنگال صفحات ۱۴۴۔ فضلی صاحب کا یہ چھوٹا سا مجموعۂ کلام انگریزی کتابوں کی طرح بہت ہی پاک وصاف اور دیدہ زیب ہے۔ اس میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے سہل ممتنع کہنے میں مرزا غالب کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور متعدد شعر ایسے نظر سے گزرتے ہیں جن میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

نظموں میں قلم کا جادو اور آکسفورڈ خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ دوسرے عنوان کے تحت شاعر نے اپنی اُس طالب علمانہ زندگی کا ایک گونہ سوہا نقشہ کھینچا ہے جو انھوں نے آکسفورڈ میں بسر کی تھی۔ یہ مثنوی کی شکل میں ہے اور آپ بیتی ہونے کی وجہ سے اس میں خاص اثر پیدا ہو گیا ہے۔

قلم کا جادو بھی ایک ایسی نظم ہے جو ظاہری اور معنوی دونوں لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے۔

بچوں کی تربیت:۔ از مسرت زمانی بیگم صاحبہ ناشر ایجوکیشنل بک ہاؤز علی گڑھ۔ یہ ۴۴ صفحات کی کتاب ہے جس میں اس موضوع کی نسبت نہایت دلچسپ اور ضروری معلومات سلیقہ کے ساتھ درج ہیں۔ کتاب کی افادیت کے لئے اس کے یہ عنوانات کافی ہیں۔ (۱) بچہ کی پیدائش سے قبل اور اس کے بعد۔ (۲) بچوں کی جسمانی نشوونما (۳) بچوں کی ذہنی نشوونما اور (۴) بچوں کی اخلاقی نشوونما ہر پڑھی لکھی خاتون کو اس مفید کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

کتاب العلم جزو اول:۔ مدیران محمد سعید بیگ و محمد اسمٰعیل نعیم صاحبان: ناشر ایسٹرن پبلشنگ اینڈ اسٹیشنری لمیٹیڈ لاہور۔ یہ ڈیڑھ سو صفحات کا ایک دیدہ زیب باتصویر رسالہ ہے جو انگریزی کتاب "بک آف نالج" کی طرز پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مختلف علوم و فنون کے عنوانات قائم کرکے مفید اور ضروری معلومات دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ ہر تعلیم یافتہ گھر میں اس کا ایک نسخہ رہنا چاہئے۔ بہتر ہوتا کہ ناشرین ہر جزو کو مجلد شائع کرتے تاکہ کتاب کی حفاظت اور استفادہ میں پائداری ہوتی۔

ممالک اسلامیہ کی سیاست:- از مولوی عشرت حسین صاحب صدیقی بی اے: ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔ دو سو تریپن صفحات میں جملہ ممالک اسلامیہ مصر، ترکی، عرب، شام، فلسطین، عراق و ایران و افغانستان وغیرہ کے سیاسی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب مفید اور جدید معلومات پر مشتمل ہے۔ تصاویر کی کمی ہے۔ نقشے بھی بہتر ہوتے تو مناسب تھا۔

مورخ کے افسانے:- از مولوی سید محمود صاحب مورخ بی اے مدیر روزنامہ مسلمان دہلی۔ ۱۲۹ صفحات۔ مورخ صاحب ایک اچھے ادیب اور صحافت نگار ہیں ان کے افسانوں کے ایک مجموعے پر اس سے قبل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ لیکن مورخ جیسے صاحب ذوق کے فسانوں کو ان سے بہتر شکل و صورت میں شایع ہونا چاہیئے۔

شادی بیاہ و اسباق قرآن:- یہ دونوں چھوٹے رسالے مولوی انتظام اللہ صاحب اشہابی ناظم تالیفات مجلس علماء و بدھ جامعہ دینیہ آگرہ کے نتائج قلم ہیں۔ پہلا سلسلہ اصلاح الرسوم کی ایک کڑی اور دوسرا سلسلہ درس قرآن کی۔ دونوں بابو نصیر احمد خاں صاحب کی فرمایش پر شایع ہوئے ہیں اور غالباً مفت دستیاب ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو مذہبی و اخلاقی امور کی نسبت معلومات حاصل کرنے کی خواہش ہو مکتبہ جامعہ دینیہ آگرہ سے طلب فرما سکتے ہیں۔

بلقیس کی عید:- از عزیز حیدر شاکر۔ ۱۶ صفحات کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں شاکر صاحب کی بعض نظمیں شریک ہیں۔ جو اپنے شوق سے اس قسم کے چھوٹے چھوٹے رسالے شایع کر رہے ہیں۔

عدم تبدیل قلوب:- از مولنا عبد اللہ العماوی۔ ۱۶ صفحات کا مختصر رسالہ جو ادارۂ ترقی تعلیم اسلامی حبینی علم کی ساتویں کڑی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ کتابت و طباعت و کاغذ نہ تو ادارہ کے شایان شان ہے اور نہ فاضل مصنف کے۔ ابتدا میں مولوی ابو الخیر صاحب کنج نشین کا پیش لفظ ہے۔

اردو کا قاعدہ:- از مولوی محمد ہاشم صاحب مددگار فوقانیہ عثمان آباد۔ ۶۰ صفحات کا بالتصویر قاعدہ ہے جو مصنف کے سالہا سال کے تجربہ کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔

ٹرانسپورٹ ڈائرکٹری:- حیدر آباد کی ریلوں اور ہوائی جہازوں کا تفصیلی ٹائم ٹیبل اور دیگر دلچسپ معلومات انجمن آسایش مسافران کلمنڈی حیدر آباد کی طرف سے شایع کئے گئے ہیں جس کے معتمد مولوی سیف الدین صاحب ہیں۔ اس قسم کی کوششوں کی قدر افزائی ہو تو یہ انجمن اس سے بہتر معلوماتی رسائل شایع کر سکے گی۔

تاریخ عطیات آصفی:- از مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ یہ ۱۲۲ صفحات کا رسالہ ہے جس میں مملکت آصفیہ کے سررشتہ عطیات کی مکمل تاریخ کے علاوہ عطایا کے اقسام اور اس کے متعلقہ کاغذات کی تعریف اور اسناد کے الفاظ کی تشریح درج کی گئی ہے۔ اس کا مقدمہ مشہور ماہر عطیات مولوی عبد الباسط خاں صاحب رکن کمیٹی عطیات سرکار عالی نے لکھا ہے جن کی رائے ہے کہ یہ "کتاب سررشتہ عطیات اور دفتر دیوانی و مال کے کاروبار اور دواخلو کے متعلق ایک قیمتی معلومات اور صحیح رہبری کا کام دے سکتی ہے۔" اس قسم کی معلومات کے متلاشیوں کے لئے واقعی یہ مجموعہ نہایت بیش بہا ثابت ہوگا۔

شہر خموشاں:- یہ بھی مولوی سید محمود صاحب مورخ کے افسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس میں سات افسانے ہیں اور اس کا پیش لفظ جناب شاہد احمد صاحب مدیر ساقی نے قلمبند کیا ہے۔ مورخ ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں لیکن ان کے مجموعے دیدہ زیبی میں پنجاب کے اکثر افسانہ نگاروں کی مطبوعات کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہیں۔

گردھاری:۔ سید شبیر حسین قیس دکن کے ایک اہل ذوق ادیب ہیں جن کے مضامین اور تصنیفات نذر تاج و پریم منددہ وغیرہ پہلے شایع ہو چکے ہیں۔ یہ ایک ڈرامہ ہے۔ جو فلمی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ انداز بیان اور قصہ دونوں دلچسپ ہیں۔ لیکن کتاب کا کاغذ اور کتابت و طباعت معمولی ہے۔

بہن:۔ یہ چھوٹی سی بیاض نما کتاب جو تقریباً پچھتر صفحات پر مشتمل ہے محبوب دکنی صاحب کا ایک افسانہ ہے جس پر حضرت ماہر القادری نے پیش لفظ تحریر فرمایا ہے۔ طباعت کتابت اچھی ہے۔ ڈائری کے انداز میں لکھا ہے۔ بعض جگہ انداز بیان سے نوشقی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن مصنف کی جودت طبع قابل تعریف ہے۔

مومنہ:۔ یہ ایک ماہنامہ ہے جو چھوٹی کتابی سائز میں ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید سے صبیحۃ النسا بیگم اور صغریٰ بیگم صاحبات کی ادارت میں شایع ہوا ہے۔ اس وقت محرم کا شمارہ پیش نظر ہے جس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر یہ جاری رہا تو مسلم خواتین کی اچھی خدمت انجام دے گا۔

کربلا:۔ منشی پریم چند اردو کے بہترین ادیب اور افسانہ نگار تھے۔ کربلا کے المناک واقعہ کو انھوں نے ڈرامہ کی شکل میں قلمبند کیا ہے۔ اگرچہ بعض جگہ لطف داستان کی خاطر غیر تاریخی واقعات کو بھی شامل کر لیا ہے لیکن کہیں حضرات شہدائے کربلا علیہم السلام کے احترام اور صحیح عظمت کے اظہار میں کوتاہی نہیں کی گئی ہے۔ جملہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی اور افادہ سے خالی نہ ہوگا۔

"ادارہ"

خطبۂ صدارت

(جو اردو کانفرنس بزمِ اردو جامعہ عثمانیہ میں بتاریخ ۲۴ فروری ۱۹۴۲ء پڑھا گیا)

ارکانِ بزمِ اردو، معزز حضرات اور عزیز طلبہ!

اس اردو کانفرنس کی صدارت کے لئے مجھ سے بہتر کئی اصحاب موجود تھے، چنانچہ میں نے اس بارے میں آپ صاحبوں کو مشورہ بھی دیا تھا، لیکن آپ نے مجھ ہی کو یہ ذمہ داری قبول کرنے پر جس خلوص کے ساتھ مجبور کیا اس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس اہم فریضے کو میں نے اس لئے بھی منظور کر لیا کہ آپ کی بزم ایک ایسے بزرگ کی دیرینہ یادگار ہے، جن کی علمی شفقتوں اور پُر شباب سرگرمیوں کو ہم سب ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ مرحوم وحید الدین سلیمؔ نے فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کے دلوں میں اردو زبان و ادب کی خدمت گزاری کے جو ولولے پیدا کر دئیے وہ چودہ، پندرہ سال کے بعد آج بھی اسی طرح موجزن ہیں، اور شاید ہمیشہ رہیں گے۔ انھوں نے ایک ایسا چراغ روشن کر دیا تھا جس سے اس اثنا میں اور سیکڑوں چراغ روشن ہوئے اور خدا چاہے تو ع دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہے گا۔

آپ میں سے بہت کم صاحبین اس حقیقتِ حال سے واقف ہوں گے کہ جب مولانا سلیمؔ نے آج سے تقریباً بیس سال قبل بزمِ اردو قائم کی تو اس کے پہلے معتمد مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی تھے، جو اس وقت انٹرمیڈیٹ کی جماعت میں اردو کے متعلم تھے اور آج دکن کے بلند پایہ مورخ اور مخلص خدمت گزار کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

بزمِ اردو کی تاریخ میں وہ دن بھی نہایت مبارک تھا جب کہ مولانا سلیم کی وفات کے بعد چند سال خاموش رہ کر ۱۹۳۳ء میں ہمارے واجب الاحترام اور شفیق صدر مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب کی پُر خلوص ہمت افزائیوں کی وجہ سے جامعۂ عثمانیہ کی اس قدیم بزم نے دوبارہ جنم لیا۔ اور اس کے پہلے صدر نواب محمد ظہیر الدین خاں بہادر بی اے کا جلسۂ کرسی نشینی ہمارے کالج کی قدیم عمارت لیاقت منزل کے صحن میں خاص تزک و اہتمام کے ساتھ منایا گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک یہ بزم پابندی سے کام کرتی رہی اور اس نے چند مفید سالنامے بھی شائع کئے۔

گزشتہ دو چار سال سے اس کے کاموں میں پھر کچھ جمود سا پیدا ہو گیا تھا لیکن مسرت کا مقام ہے کہ اس سال اس نے کافی سرگرمی دکھانی شروع کی ہے اور ہماری جامعہ کے معروف عمل نائب معین امیر مولوی قاضی محمد حسین صاحب کی صدارت میں اس کا جو افتتاحی جلسہ منعقد ہوا وہ میری اس پیشین گوئی کے مطابق جو میں نے اسی جلسے میں کی تھی بزمِ اردو کی زندگی اور سرگرمی کا ضامن ثابت ہوا۔ اور آج کی یہ اردو کانفرنس بھی مولوی قاضی محمد حسین صاحب کے اس اصول کا عملی مظاہرہ نظر آتی ہے کہ کالج کی جملہ بزمیں اپنے اپنے میدانِ عمل میں کامیابی کے ساتھ ترقی کرتی رہیں۔

صاحبو! یوں تو یہ ملک چار، پانچ سو سال سے اُردو کی مسلسل خدمت انجام دیتا رہا ہے، لیکن گزشتہ ربع صدی میں اس زبان کے لئے اس نے جو نمایاں کام کئے ان کی وجہ سے اردو میں ایسی قوت اور وسعت پیدا ہو گئی ہے کہ شاید ہی ہندستان کی

کوئی اور زبان موجودہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں اور تبلیغ و تشہیر کی سہولتوں کے باوجود اس کا مقابلہ کرسکے۔ حضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کا عہد میمنت عہد اس کے لئے اتنا سازگار ثابت ہوا کہ جملہ قدیم سرپرستان اردو مثل محمد قلی قطب شاہ، علی عادل شاہ ثانی، واجد علی شاہ اور ابوظفر بہادر شاہ کی اردو خدمات اس کے آگے ماند پڑ گئیں۔ حسنِ اتفاق سے اس مبارک دور میں حیدرآباد میں چند ایسے صاحبِ ذوق بھی فراہم ہوگئے جنھوں نے حضرت ظلِ سبحانی کے علمی شغف اور ادبی سرپرستیوں سے کماحقہ فائدہ اٹھایا، مرحوم سر اکبر حیدر نواز جنگ نے سب سے پہلے اس بہتی گنگا کی اہمیت محسوس کی اور اس سے سیراب ہو کر اس اردو جامعہ کی بنیاد ڈالی جس کے خواب اہلِ ملک نواب مختار الملک کے عہدِ وزارت سے دیکھ رہے تھے۔ اس جامعہ کی بنیادوں کو استوار کرنے اور اس کے وقار میں اضافے کے لئے آنریبل نواب مہدی یار جنگ بہادر جیسے عالم و فاضل وزیر نے بھی جو ذاتی دلچسپی لی اور لے رہے ہیں وہ شاید ان کے مشہور والد نواب عماد الملک مرحوم کی ان دیرینہ تمناؤں کی تکمیل ہے جو مشرقی علوم کی ترقی واشاعت کے لئے انہیں ہر بار مضطرب رکھتی تھیں۔

حیدرآباد میں آج اردو کے بازار میں جو رونق اور چہل پہل نظر آتی ہے وہ صرف جامعہ عثمانیہ کے اربابِ کار اور اس کے فیض یافتوں ہی کی سرگرمیوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ ہم اتنے خود غرض نہیں کہ اپنی زبان کے ان دوستوں اور ہمدردوں کی خدمات کو بھلا دیں جنھوں نے ملک اور بیرونِ ملک میں اس جامعہ کو مقبول و مشہور کرنے میں بڑا حصہ لیا اور ہر آڑے وقت میں اس کے سپوتوں کی ہمدردی اور دست گیری کی۔ ہمارے اسی قسم کے ہمدردوں میں مرحوم مولوی سید احمد محی الدین مدیر رہبر دکن کا نام آج کی مجلس میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے نہ صرف اس جامعہ کی تبلیغ و تشہیر کا کام بے غرضانہ طریقے سے انجام دیا بلکہ اپنے طور پر بھی اس امر کی بے پایاں کوشش کی کہ اہلِ دکن میں اردو کا اعلیٰ ذوق پیدا ہو۔ رہبر دکن اردو کا پہلا اخبار ہے جو ملک کے چپے چپے میں پہنچا اور دور دراز کے چھوٹے چھوٹے قریوں میں بھی عوام کے دلوں کو ایسا موہ لیا کہ وہ رفتہ رفتہ مطالعے کے عادی ہوگئے۔ یہ اردو کی ایک ایسی پائیدار خدمت ہے جس کا کوئی صلہ متعین نہیں کیا جاسکتا۔ اور جس کے لئے ہم مرحوم احمد محی الدین کے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔ افسوس ہے کہ وہ ہم سے اس قدر جلد جدا ہوگئے اور ہم آنے والی کش مکشوں میں ان کی صائب رائے اور ان تھک قوتِ عمل سے مستفید نہیں ہوسکتے۔ تاہم رہبر دکن زندہ ہے جس کو ان کے ورثا اور رفقائے کار خاص کر مولوی عبداللہ خاں صاحب، مولوی یوسف الدین صاحب، مولوی عبدالحمید خاں صاحب اور ناکارہ حیدرآبادی اسی آن بان سے شائع کر رہے ہیں۔ اور یقین ہے کہ وہ اپنے بچھڑے ہوئے رہنما کی ان آرزوؤں کو پورا کرتے رہیں گے جو اردو زبان کی مقبولیت اور ہمہ گیری کی ہمیشہ آئینہ دار رہیں۔ اس توقع میں اس لئے بھی تقویت ہوتی ہے کہ خود مرحوم کے فرزندوں میں مولوی حامد معین الدین بی ایس سی کو اپنے قابلِ احترام باپ کی اکثر خصوصیتیں ورثے میں ملی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے اعلیٰ کردار اور عمدہ لیاقت کی بنا پر ان عزائم کی تکمیل کرسکیں گے جن کو ان کے والد اپنی بے وقت موت کی وجہ سے پورا نہ کرسکے۔

مولوی احمد محی الدین سے چند ماہ قبل اردو کے ایک مشہور شاعر فانی بدایونی اور ایک خاموش فاضل مولنا مختار احمد نے بھی حیدرآباد میں وفات پائی۔ فانی کی زندگی ان کی شاعری کی طرح خودداری اور حزن و یاس کا ایک ایسا مجموعہ تھی کہ اس

بارونق شہر میں بھی ان کا دل اکثر اداس رہا۔ اور خاص کر ان کے شفیق سرپرست اور اردو کے محسن مہاراجہ یمین السلطنت کی وفات کے بعد سے تو وہ صحیح معنوں میں اس دنیا کو چھوڑ چکے تھے۔ علامہ مختار احمد اتنے خاموش کام کرنے والے تھے کہ ان کے علمی و ادبی پائے سے اب بھی اہل اردو پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ وہ فن زبان اور لغت کے ماہر اور قدیم وضع کے عالم تھے۔

جامعہ عثمانیہ کے متعلقین اور فیض یافتوں کے علاوہ جو اصحاب حیدرآباد میں اپنے طور پر اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں ان میں مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ، حکیم شمس اللہ قادری اور آغا حیدر حسن کے نام خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کو اردو ادب اور تصنیف و تالیف سے فطری لگاؤ ہے۔ ان کے رشحاتِ قلم جدید اردو نثر کے شہکار سمجھے جاتے ہیں۔ وہ ایک پیدائشی ادیب ہی نہیں بلکہ سچے علم دوست بھی ہیں۔ چنانچہ وہ جس محفل یا مجلس میں آتے ہیں اس کو ایک ادبی صحبت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ وہ آج کل اردو کی ٹھوس خدمت میں مصروف ہیں۔

حکیم شمس اللہ قادری صاحب عرصے سے تاریخی مضامین اور کتابیں شایع کر رہے ہیں۔ ان کا رسالہ "تاریخ" معیاری اور مفید مضمونوں کی وجہ سے ممتاز ہے۔ نواب لطف الدولہ مرحوم کی یاد میں انھوں نے بلند پایہ تاریخی مطبوعات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس سے علمی دنیا کی عمدہ توقعات وابستہ ہیں۔

آغا حیدر حسن صاحب کو دہلی کی بیگماتی زبان پر جو بے نظیر قابو حاصل ہے اس سے اہلِ اردو ناواقف نہیں۔ لیکن اس حقیقتِ حال سے شاید کم لوگ واقف ہیں کہ دکن کے قدیم اردو ادب اور ہندستان کی اعلیٰ تہذیب و شائستگی سے بھی ان کو خاص شغف رہا ہے۔ چنانچہ ان کا مکان ایک اچھی خاصی نمائش گاہ ہے جس میں قدیم نقاشی اور صنعت گری کے اعلیٰ نمونے اور کم یاب قلمی کتابیں محفوظ ہیں اور پھر خوبی یہ ہے کہ آغا صاحب دوسروں کو ان سے مستفید ہونے کا موقع بھی دیتے ہیں کچھ عرصے سے انھوں نے اپنے مخصوص اسلوب بیان میں حیدرآباد کے متعلق مضامین لکھنے شروع کئے ہیں جن کا مجموعہ اس فرخندہ بنیاد شہر کے متعلق ایک یادگار کتاب ثابت ہوگا۔

گزشتہ ربع صدی میں اردو زبان نے جو ہمہ جہتی ترقی کی ہے اس پر صرف ایک سرسری تبصرہ کرنے کے لئے بھی کافی وقت اور فرصت کی ضرورت ہے۔ لیکن آج کی محفل میں ایک ایسے امر کا اظہار ضروری ہے جس کی اہمیت کو عام طور پر محسوس نہیں کیا جاتا۔ اس اثناء میں یہ خیال باطل ہوگیا ہے کہ اردو ایک بالکل نئی اور کم عمر زبان ہے۔ یہ ایک ایسا گمراہ کن تصور تھا جس کی بنا پر نہ صرف اردو کے مخالف بلکہ اس کے بہی خواہ بھی اردو کو السنۂ عالم میں اس کے شایانِ شان جگہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ بعض اصحاب جن پر انگریزی، فارسی، عربی یا دوسری زبانوں کی برتری کا بھوت سوار تھا یہ کہا کرتے تھے کہ اس زبان کی عمر ہی کیا۔ اور اس میں ادب ہی ایسا کونسا ہے کہ اس سے متعلق اعلیٰ پائے کی علمی تحقیقات کی جائیں۔ لیکن اردو کا جو قدیم ادب گزشتہ دس بارہ سالوں کے اندر شایع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے اس کی نوعیت اور خصوصیات کے پیش نظر ان لوگوں کو بھی ماننا پڑے گا جو اردو ادب کی وسعت اور گوناگونی سے مایوس ہو چکے تھے کہ اس زبان نے آج سے تین سو سال قبل ہی ایسی پختگی اور وسعت و اہمیت حاصل کر لی تھی کہ اس میں اسی زمانے میں مشکل سے مشکل

مسائل اور علوم و فنون قلم بند کئے گئے۔

یہ بھی عجیب اتفاق کی بات ہے کہ اردو کی قدامت اور اہمیت کا احساس سب سے پہلے ایک فرانسیسی ماہر و محسن اردو گارساں دتاسی کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اور اس نے چند قدیم اردو کتابیں مرتب کرکے شایع بھی کی تھیں جن میں اورنگ آباد کے مشہور شاعر ولی کا کلیات تو پیرس کے شہنشاہی مطبع میں اِس اہتمام کے ساتھ چھپوایا گیا تھا کہ شاید ہی اردو کی چند کتابیں اب تک اس آب و تاب سے چھپی ہوں۔

دتاسی کے بعد مرحوم عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری نے اردو کی قدامت کو محسوس کرکے اپنے ضخیم تذکرۂ محبوب الزمن میں پچاسوں قدیم اردو شعرا کے حالات درج کئے۔ اس سلسلے میں انجمن ترقی اُردو کے معتمد مولنا عبدالحق نے جو خدمت انجام دی وہ بھی اردو ادب کی تاریخ میں یاد رہے گی۔ انہوں نے پہلے ملا وجہی حیدرآبادی کی "سب رس" اور "قطب مشتری" مرتب کرکے شایع کی اور پھر ملک الشعرا نصرتی بیجاپوری کے سوانح حیات لکھے جو اب کتابی صورت میں شایع ہو چکے ہیں۔ آخرکار آج سے ڈھائی سو سال قبل کی اردو کتابوں کی اشاعت کے لئے نواب سالارجنگ بہادر کی سرپرستی، مولوی سید محمد اعظم صاحب کی صدارت اور مولوی سید محمد صاحب ایم اے کی معتمدی میں ایک "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات" قائم ہوئی جو گزشتہ پانچ چھے سال کے عرصے میں کئی ضخیم کتابیں مثلاً محمد قلی قطب شاہ اور شاہ سراج اورنگ آبادی کے کلیات اور سیف الملوک و بدیع الجمال، پھول بن، قصۂ بے نظیر، اور طوطی نامہ وغیرہ شایع کر چکی ہے۔ اور قریب میں چند اور اہم کتابیں مثلاً علی نامہ، ابراہیم نامہ، عبداللہ قطب شاہ اور علی عادل شاہ ثانی کے کلیات، ارشاد نامہ اور گلشن عشق وغیرہ بھی اس مجلس کی طرف سے شایع ہو جائیں گی۔

ان کتابوں اور ان کے متعلق معلومات کی اشاعت سے اُردو دنیا پر ظاہر ہوا کہ اُردو کتنی قدیم زبان ہے اور اس کا پرانا ادب بھی کتنا متنوع اور پُرکیف ہے۔ چنانچہ جو کتابیں اِس وقت تک طبع ہو چکی ہیں، ان میں سے اکثر ہندستانی جامعات میں اردو کی اعلیٰ جماعتوں میں بطور نصاب پڑھائی جا رہی ہیں۔ جیسے جیسے اہلِ اردو اپنے قدیم ادب کا مطالعہ اور ان کی نسبت معلومات حاصل کرتے جائیں گے اُن کو اپنی زبان کی ہمہ گیری، پختگی اور قدامت پر اعتماد پیدا ہوتا جائے گا، اور جب تک اہلِ زبان میں خود اعتمادی پیدا نہ ہو اس وقت تک کوئی زبان اپنی صحیح قدر و منزلت حاصل نہیں کر سکتی۔

حضرات! یہ امر بھی اُردو کے لئے فالِ نیک ہے کہ عہد حاضر میں بوڑھوں سے زیادہ جوانوں کے دلوں میں اپنی زبان کی خدمت اور محبت کا ولولہ موجیں مار رہا ہے۔ چنانچہ اس عرصے میں مختلف اقطاع ہند میں متعدد جوان ہمتوں نے اس کی فلاح و بہبود کے لئے ایسے ایسے بلند پایہ اور دور رس کاموں کا آغاز کیا ہے اور ان میں سے بعض کو تکمیل تک پہنچا چکے ہیں، جن کا بار اٹھانے کے لئے پختہ کار بوڑھے ہمیشہ پس و پیش ہی کرتے رہے۔ مثال کے طور پر صرف اردو انسائیکلوپیڈیا اور اردو امتحانات کے نام ہی کافی ہیں جن سے اردو دنیا اب کافی روشناس ہو چکی ہے اور جن کو ادارۂ ادبیات اُردو کے اربابِ کار پوری اردو دنیا کی اعانت کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اِس ادارے نے جامعہ عثمانیہ اور انجمن ترقی اُردو سے ہٹ کر اپنے لئے ایک

ایسا لائحہ عمل مقرر کیا جس کی بنا پر عوام میں اردو کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس نے گزشتہ بارہ سال کے عرصے میں اسی کے قریب ایسی عام فہم کتابیں مرتب کرا کے چھپوائی ہیں جو اردو کا ذوق پھیلانے میں مدد و معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ عوام کے لئے دلچسپ اور دیدہ زیب کتابیں فراہم کرنے کے سلسلے میں حیدرآباد کے اس ادارے کے ساتھ دہلی کی جامعہ ملیہ کی اردو اکیڈیمی کی سرگرمیاں بھی اردو دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جا رہی ہیں۔

ابھی ابھی یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب نے تقریباً چھپن ہزار روپے انجمن ترقی اردو کی عمارت کے فنڈ میں بطور عطیہ داخل کئے ہیں۔ اردو کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی آپ نظیر ہے، لیکن توقع ہے کہ مولوی صاحب کا یہ عطیہ ان تمام اصحاب کو ایسی عملی اعانت کی طرف مائل کرے گا جن کی ہمدردیاں بالعموم باتوں ہی کی حد تک محدود رہی ہیں۔ اردو کی خوش قسمتی میں کون شبہ کر سکتا ہے جب کہ اس کی خدمت گزاری کے لئے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی جیسے روشن خیال فاضل نے بھی اپنے انتہائی مصروف اوقات کے قیمتی لمحے وقف کر دئے ہیں۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کی شاخ حیدرآباد کی معتمدی قبول کر کے ایک ایسا علمی ایثار کیا ہے جس کی توقع شاذ و نادر علم دوستوں ہی سے کی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین کی نگرانی میں انجمن ترقی اردو کے ایک مخلص کارکن سید علی شبّر صاحب حاتمی بھی حیدرآباد میں سرگرم عمل ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں اردو کا ایک گشتی کتب خانہ قائم کیا ہے، جس سے توقع ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اردو کتابوں کے مطالعے سے کافی دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ اگرچہ حیدرآباد میں پہلے ہی سے مولوی فضل اللہ صاحب کا قائم کیا ہوا ایک ایسا ہی گشتی کتب خانہ موجود ہے۔ لیکن اردو کا ذوق عام کرنے کے لئے جتنے زیادہ اصحاب اور جتنی زیادہ انجمنیں اور ادارے کام کریں اتنا ہی زیادہ فائدہ ہوگا۔ بشرطیکہ ان کی قوتیں ایک دوسرے کی تخریب اور مخالفتوں میں صرف نہ ہوں۔

افسوس ہے کہ اردو کے بعض تجربہ کار خدمت گزار اپنی قوتوں اور وسیع ذرائع کو محض تخریبی کاموں میں ضائع کر رہے ہیں۔ اردو کی ترقی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہندی کی مخالفت کی جائے اور ہندی کے علم برداروں کے ساتھ کاغذی میدان میں ہنگامہ آرائی برپا رہے۔ اخباری جھگڑوں اور مباحثوں سے زیادہ اس وقت اس امر کی ضرورت ہے کہ اردو کی ٹھوس اور بنیادی خدمت انجام دی جائے۔ اردو پڑھنے، لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ دور دراز کے دیہاتی علاقوں میں اردو کے معلم و مبلغ روانہ کئے جائیں۔ اور ایک ایسی اسکیم بنائی جائے جس کی رو سے چند سالوں کے اندر اندر ہندستان کے زیادہ سے زیادہ اضلاع اور علاقوں کے باشندے اردو پڑھنا لکھنا سیکھ جائیں۔ اس کے لئے زیادہ کارکنوں کی بھی ضرورت نہیں۔ فی الحال صرف پچیس تیس معلموں ہی سے اس کام کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ ہر معلم ایک گاؤں میں چھ چھ مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال قیام کر کے وہاں کے رہنے والوں کو اتنی اردو سکھا دے کہ وہ معمولی نوشت و خواند سے واقف ہو جائیں اور رفتہ رفتہ مطالعے کے ذریعے سے اپنی استعداد بڑھاتے رہیں۔

اردو پڑھنا لکھنا سکھانے کے علاوہ ایسی "با تصویر" اور کم قیمت کتابوں کی اشاعت کی طرف بھی توجہ ضروری ہے، جو عوام اور خاص کر بالغوں کے شوق مطالعہ اور معلومات میں اضافہ کر سکیں۔ اس قسم کی کتابیں اگر مفت بھی تقسیم ہوں تو یقین رکھنا چاہیئے کہ ان پر جو روپیہ صرف ہوگا اس کی قیمت وصول ہو گئی۔ اگرچہ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی اور ادارۂ ادبیات اردو نے تعلیم بالغان کے مسئلہ میں عملی دلچسپی لینی شروع

کر دی ہے اور مولوی محمد سجاد مرزا صاحب نے ادارے کی فرمائش پر اس خصوص میں اپنی نگرانی میں چند کتابیں لکھوائی ہیں، لیکن اس کام کو اور بڑے پیمانے پر ہونا چاہیئے۔ اس میں اسی وقت خاطر خواہ کامیابی ہوگی جب کہ مخصوص انجمنوں اور اصحاب کے علاوہ ہر بہی خواہ اردو اس کو اپنا فرض منصبی سمجھ لے کہ وہ اپنی زندگی میں کم از کم ایک شخص کو خواندہ بنا دے گا یا اس کی خواندگی کے سامان فراہم کر دے گا۔

اسی طرح اردو کے ٹائپ کا مسئلہ بھی جملہ ہمدردان اردو کی توجہ کا محتاج ہے۔ اس کی تیاری میں انجمن ترقی اردو عرصے سے کوشاں ہے۔ لیکن اس کی کوششیں کس منزل تک پہنچی ہیں، اس کا شاید کسی کو علم نہیں۔ حکومت حیدرآباد کی سرپرستی میں بھی دارالطبع سرکار عالی میں اردو کا ایک نستعلیق ٹائپ تیار کرایا گیا ہے جس کی نسبت اس عام خیال کو دور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ ابھی اس قابل نہیں کہ اردو کی عام ضرورتوں کو آسانی سے پورا کر سکے۔ انفرادی طور پر بھی بعض باہمت اصحاب اس مفید کام کی سربراہی میں مصروف ہیں ان میں مولوی سجاد مرزا صاحب اور مولوی یوسف قاسم عارف صاحب (کلکتہ) کے نام خاص کو قابلِ ذکر ہیں۔ خدا کرے کہ ان کے مساعی جلد کامیاب ہوں کیونکہ ٹائپ کا مسئلہ نہایت اہم ہے اور اس کے بغیر اردو خاطر خواہ وسعت اور ترقی نہیں حاصل کر سکے گی۔

اردو کی ترقی میں ایک اور مسئلہ عرصے سے سدِّ راہ بنا ہوا ہے اور وہ مختلف صوبوں کے اہلِ اردو کا باہمی تعصب ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ دہلی والے لکھنؤ والوں کو بھی اردو کا اہلِ زبان نہیں سمجھتے تھے۔ اور حال حال تک دہلی اور لکھنؤ دونوں مقامات کے بعض کم فہم اصحاب اہلِ حیدرآباد اور اہلِ پنجاب کو بھی اردو کا اہلِ زبان سمجھنا پسند نہ کرتے تھے۔ حالانکہ حیدرآباد کے جملہ مسلمان اور ہزاروں ہندو خاندان ایسے ہیں جن کی مادری زبان مسلسل پانچ صدیوں سے اردو ہی رہی ہے۔ اور اس سرزمین کے اس شرف کو تو جملہ اہلِ علم مانتے ہیں کہ اردو سب سے پہلے دکن ہی میں بطور تحریری زبان کے استعمال کی گئی اور شمالی ہند میں اردو ادب کا آغاز ہونے کے لئے ابھی تین سو سال باقی تھے کہ دکن میں اعلیٰ پائے کی کتابیں اس زبان میں لکھی گئیں۔ اور یہ واقعہ بھی تاریخ ادب اردو میں مسلم ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا آغاز دکنی شعرا ولی، فراقی اور آزاد کے سفر دہلی اور ان کے اور ان سے پہلے کے شاعروں کے کلام کے مطالعے ہی سے شروع ہوا۔

اُردو والوں کی اس روش کے برخلاف جب اہلِ ہندی کی اس فراخ دلی پر نظر پڑتی ہے کہ وہ پوربی، اودھی، قنوجی، بندیل کھنڈی، چھتیس گڑھی، راجستانی اور برج بھاشا غرض متعدد مختلف بولیوں کو ہندی ہی سمجھتے ہیں۔ اور ان کے شاعروں اور ادیبوں کو ہندی کے اہلِ زبان مانتے ہیں تو اردو والوں کی تنگ دلی پر تعجب ہوتا ہے۔ اب وہ وقت نہیں رہا کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کو حقارت کی نظر سے دیکھیں۔ اردو کی گرامر متعین ہو چکی ہے۔ اس کا ایک معیاری اسلوب بن چکا ہے اس لئے بقول مولٰنا سلیم مرحوم اب کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں کہ کسی خاص شہر یا کسی خاص محلے یا کسی خاندان ہی کے لوگ اہلِ زبان ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون "ہندستان کی عام زبان" میں بڑے شد و مد سے اس کا اعلان کیا تھا کہ ــــــ

" اردو زبان اب دہلی اور لکھنو میں محدود نہیں رہی ہے ۔ وہ ان حدوں کو توڑ کر باہر نکل چکی ہے۔ اس کے لئے اب اسی قدر وسعت کی ضرورت ہے جس قدر کہ خود ہندستان میں وسعت ہے ۔

اے اردو زبان کو ملکی زبان بنانے کی آرزو رکھنے والو ۔ اگر یہ آرزو تمہیں دھوکا نہیں دے رہی ہے۔ فی الواقع یہ تمنا تمہارے دلوں میں موجزن ہے تو اول اپنی زبان میں ایسی وسعت پیدا کرو کہ ہر صوبۂ ہند کا باشندہ اسے اپنی زبان سمجھنے لگے "

مولانا سلیم نے یہ مضمون آج سے اٹھارہ سال قبل شایع کیا تھا ۔ لیکن ہم محسوس کر رہے ہیں کہ اہلِ اردو کے دلوں سے ابھی تک یہ صوبہ واری تعصب دور نہیں ہوا ۔ اور بعض اوقات بعض رسالوں کے مضامین اور تنقیدوں میں اس کی کافی جھلک نظر آجاتی ہے۔ صوبہ واری تعصب نے اردو کی وسعت کو اب تک بے حد نقصان پہنچایا اور اگر یہ اب بھی باقی رہا تو آنے والے نازک دور میں اور زیادہ نقصان پہنچائے گا۔

اگرچہ تعصب خواہ وہ کسی قسم کا ہو معیوب ہے۔ لیکن علمی وادبی دنیا میں تعصب کا وجود تو سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے ۔ اس کے دور کرنے میں ہم سب کو متحدہ طور پر کوشش کرنی چاہئے۔ ابھی حیدرآباد میں اسی قسم کی متعصبانہ ذہنیت کا ایک نامناسب مظاہرہ ہوا جس کو حیدرآباد کے تمام سنجیدہ علمی حلقوں نے خاص طور پر محسوس کیا ۔ اور جس ذہنیت پر بعض اخباروں نے کنایتہً اور بعضوں نے صراحتاً ملامت کی ۔ حیرت ہے کہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں جو ایک لایق فرد کا نتیجہ قلم تھا گزشتہ دو سال کی اجتماعی یا انفرادی علمی اور ادبی کاوشوں پر جو تبصرہ کیا گیا اس سلسلے میں جہاں بعض صاحبوں کی ایسی تقریروں اور مضمونوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو پانچ چھے سال قبل سے تعلق رکھتے ہیں وہیں حیدرآباد کے انفرادی کارناموں کا تو کیا ذکر اجتماعی مساعی مثلاً مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات، مجلس علیۂ طیلسانین عثمانیہ، حیدرآباد اکیڈیمی، نواب لطف الدولہ میموریل سیریز اور ادارۂ ادبیات اُردو کی کسی بڑی سے بڑی علمی کوشش کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا گیا ۔ حالانکہ جس سرزمین پر اس میقات کا انعقاد ہوا تھا ، ضروری تھا کہ وہاں کی انفرادی و اجتماعی علمی سرگرمیوں کی خاص طور پر نمایندگی کی جاتی ۔ اس فروگزاشت کو کانفرنس کے اکثر بیرونی مندوبین نے بھی بری طرح محسوس کیا۔

اس خطبے کے ساتھ ایک اور نسبتاً چھوٹے سے خطبۂ صدارت کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے جو اِسی کانفرنس کے شعبۂ اردو میں پڑھا گیا ۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بعض وقت لوگ اپنے آپ کو ایک ایسی علمی امارت اور سرمایہ داری کے زینے پر سمجھنے لگتے ہیں جہاں سے وہ دوسروں کی کوششوں کی طرف آنکھیں بند کرلینے ہی کو اپنے شایان شان قرار دیتے ہیں ۔ بہرحال اب ہمیں اردو کی فلاح اور ہمہ جہتی ترقی کے سلسلے میں نہایت فراخ دلی اور بے ریائی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ زمانہ بدل رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی ٹھیکے بھی ختم ہوتے جارہے ہیں ۔ ممکن ہے کہ ان ٹھیکہ داروں کی ذہنیت کے بدلنے میں ابھی کچھ عرصہ درکار ہو ۔ لیکن اردو کے جوان ہمت خدمت گزاروں کو بددل نہ ہونا چاہیئے۔ ان کے آگے وسیع میدان ہے ۔ وہ اگر چاہیں تو اپنی دنیا آپ پیدا کرسکتے ہیں ۔ وہ بوسیدہ مزاروں کے ان

سجادہ نشینوں کے ظاہری یا باطنی فیوض کے بغیر ہی اپنی ذاتی کدو کاوش سے اپنے ویرانوں کو چراغاں بنا سکتے ہیں۔

اُردو دنیا میں جتھا بندی کی وبا بھی ایسی متعدی ہو چکی ہے کہ ہر ادیب اور شاعر بلکہ طالب علم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو لوگ شبلی کے معتقد ہیں وہ حالی کے دبستان سے خواہ مخواہ کدورت رکھتے ہیں۔ اور حالی کے چیلے شبلی کے دبستان والوں کا ہمیشہ مضحکہ اڑاتے رہے ہیں۔ یہی حال شاعری کا بھی ہے۔ کوئی داغی ہے تو کوئی امیری اور کوئی میری ہے تو کوئی سودائی۔ اگرچہ اس قسم کے امتیازات ہر ملک اور ہر زبان میں پائے جاتے ہیں، لیکن ان کا مظاہرہ جس بدتمیزی کے ساتھ ہماری زبان میں کیا جاتا ہے، اس کے نہایت مضر نتائج برآمد ہو رہے ہیں، اور اردو کے اہلِ قلم ایسے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں جو سوائے اپنے جتھے کے دوسروں کی علمی خدمات کا اعتراف ہی نہیں کرنا چاہتے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ فضا ہمارے اسلاف کی پیدا کی ہوئی ہے اور ہماری زبان کے اکثر کہنہ سال ادیب اور خدمت گزار اس کو ایک دیرینہ سنت سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن ہمارے نوجوانوں کو جتھا بندی کی ان بھول بھلیوں سے باہر نکلنا چاہیئے۔ وہ جب تک فراخ دلی اور منصف مزاجی کے ساتھ بلا امتیاز مذہب و وطن وجماعت اردو کے ہر ادیب و شاعر کی خدمات کی سچی قدر کرنا نہ سیکھیں گے اس وقت تک خود ان کو اپنی کاوشوں کی صحیح قدر و منزلت سے محروم رہنا پڑے گا۔ اور ان کے تخیل اور زبان و ادب پر اس مسموم فضا کے اثرات ہمیشہ غالب رہیں گے۔

آخر میں ارکانِ بزم اردو کو ان کی مفید سرگرمیوں پر مبارک باد دیتے ہوئے میں اس امر کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اس زمانے کو غنیمت سمجھیں اور ابھی جن امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کو پیش نظر رکھ کر اردو زبان اور ادب کا صحیح معنوں میں وسیع مطالعہ کریں۔ ان کا کام یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ان کا اور جامعہ کے دیگر تمام متعلمین کا ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اس فیض کو جو جامعہ عثمانیہ سے حاصل کر رہے ہیں، دور دراز کے قریوں تک پہنچانے کی ایک باضابطہ مہم کا آغاز کریں۔ اور اس طرح اس مبارک عہد عثمانی کی ان برکات سے سب کو مستفید ہونے کا موقع دیں، جن کی بنا پر اردو کا مستقبل روز بروز تابناک ہوتا جا رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ دورِ مسعود دیر تک قائم رہے۔

سید محی الدین قادری زور

ادارہ کی خبریں

ادارے کے مہمان

جنوری اور فروری کا مہینہ ادارے کی زندگی کا ایک نہایت مصروف زمانہ رہا۔ خاص کر ماہ جنوری میں ادارے کو متعدد معزز مہمانوں کے استقبال کا شرف حاصل رہا۔ جن میں سے چند کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

۴ر جنوری ۱۹۴۲ء کو شام کے چار بجے کرنل ڈاکٹر سر احمد سعید خاں بہادر صدر اعظم مملکت آصفیہ و نواب چھتاری و سرپرست ادارہ ادبیات اردو کو دفتر ادارہ میں عصرانہ پر مدعو کیا گیا تھا۔ نواب صاحب معظم اپنے اے ڈی سی اور مولوی کرم اللہ خاں صاحب بی اے پرسنل مددگار کی معیت میں تشریف فرما ہوئے۔ اس تقریب میں مجلس انتظامی اور شعبہ جات ادارہ کے جملہ اراکین و معتمدین مدعو تھے۔ ڈاکٹر زور صاحب معتمد ادارہ نے مولوی لیاقت اللہ خاں صاحب معتمد فینانس و نائب صدر ادارہ۔ مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری معتمد سیاسیات۔ ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب مولوی عبد المجید صدیقی صاحب۔ مولوی عبد القادر سروری صاحب۔ مولوی سید محمد صاحب۔ نواب مرزا سیف علی خاں صاحب۔ مولوی فیض محمد صاحب۔ مولوی سید بادشاہ حسین صاحب اور نواب میر سعادت علیخاں صاحب رضوی کے ہمراہ نواب صدر اعظم بہادر کا استقبال کیا۔ جنہوں نے ادارے کے مختلف بارہ شعبوں کے کام کو تفصیل سے ملاحظہ کیا اور ادارے کے اردو امتحانات کے متعلق گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ اردو انسائیکلو پیڈیا کے طریقہ تہذیب پر دیر تک تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ اور ادارہ کی مطبوعات خصوصاً عوام اور بچوں کے لئے جو علمی کتابیں عام فہم زبان میں لکھوائی گئی ہیں ان کو بہت پسند فرمایا۔ دار المطالعہ اور کتب خانہ میں خاص طور پر قلمی کتابوں کا جو گراں بہا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے اس سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ عکس کشی کے بعد صدر اعظم بہادر عصرانہ میں شریک ہوئے۔ جہاں ادارے کے عام کاروباری مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا اور پچھلے بارہ سالوں میں ادارے نے زبان اور ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان پر گفتگو رہی۔ ان کے علاوہ یہ سوال بھی زیر بحث رہا کہ ادارے کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر ایک مستقل عمارت کی خاص طور پر ضرورت ہے۔

ایک علمی صحبت

۹ر جنوری ۴۲ء شام کے ساڑھے چار بجے ادارے میں ایک علمی صحبت اور عصرانہ منعقد ہوا جس میں آنریبل سر محمد یعقوب مشیر اصلاحات سرکار عالی۔ مسٹر فضل احمد کریم فضلی ڈی لٹ آکسن آئی سی ایس بنگال مصنف نغمۂ زندگی جناب احمد سیٹھ صاحب مدراس۔ مولوی قاضی عبد الغفار صاحب ایڈیٹر پیام۔ مولوی محمود علی صاحب جاگیردار بوبن پلی۔ اور مولوی مرزا حلیم بیگ صاحب مدعو تھے ادارے کے دیگر ارباب کار نے بھی شرکت کی۔ مولوی سر محمد یعقوب اور جناب احمد سیٹھ صاحب نے ادارے کے کاموں میں اتنی دلچسپی کا اظہار فرمایا کہ موخر الذکر تو اس کے دوامی رکن بن گئے اور اول الذکر نے اپنے تاثرات حسب ذیل الفاظ میں روانہ فرمائے۔

"ادارۂ ادبیات اردو کے تاثرات اولین

دور عثمانی میں حیدرآباد کا علمی شغف اس عہد سعود کی ایک درخشاں یادگار ہے۔ جس طرف نظر اٹھائیے علوم و فنون کے چشمے ابل رہے ہیں اور جس طرف دیکھئے علمی خزانوں سے ملکی ادارے مالا مال ہو رہے ہیں۔ حیدرآباد حال کو ہند کا قرطبہ اور بغداد کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا۔

جامعہ عثمانیہ کے بعد میرے خیال میں ان اداروں میں دوسرا نمبر ادارہ ادبیات اردو کا ہے۔ جو اہم علمی خدمات یہ ادارہ انجام دے رہا ہے۔ خاص کر اردو انسائیکلو پیڈیا کی تدوین وہ

لایق صد ہزار ان تحسین و آفریں ہے۔ کارکنان ادارہ کی صحیح
علمی ذوق کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ اور میں زور صاحب
اوران کے شرکائے کار کو تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔
میری دعا ہے کہ حیدرآباد کا ادارۂ ادبیات اردو اپنے مقاصد
میں کامیابی حاصل کرے اور اس کے مقاصد کی تکمیل سے
نہ صرف دکن بلکہ تمام ہندوستان مستفیض اور فائز مرام ہو۔
خاکسار محمد یعقوب عفی عنہ
مشیر اصلاحات سرکار عالی

خان صاحب عبدالرحمن خاں ادارے کے ارباب کار کو اس وقت بڑی مسرت
حاصل ہوتی ہے جب کہ کوئی علم دوست بغیر دعوت کے اچانک ادارہ
میں تشریف لے آتے ہیں۔ چنانچہ اس اثنا میں کھام گاؤں برار
کے مشہور علم دوست لیڈر خان عبدالرحمن خاں صاحب نے صبح کے وقت
ادارہ میں تشریف لاکر نہایت خلوص سے تبادلۂ خیال فرمایا۔ اور
برار میں ادارے کے مقاصد کی تکمیل اور اردو کی حفاظت میں ہاتھ
بٹانے کا وعدہ فرمایا۔

مولوی ابوالحسن سید علی صاحب و مولوی محمد اعظم
صاحب نے بھی ۱۱ر جنوری کو شام میں ادارہ تشریف لاکر اس کے
مقاصد سے عملی دلچسپی کا اس طرح اظہار کیا کہ اول الذکر تو دوامی رکن
اور اعظم صاحب سالانہ رکن بن گئے۔

۱۴ر جنوری کی شام میں **مولانا حبیب الرحمن خاں**
صاحب شروانی نواب صدر یار جنگ بہادر۔ نواب غوث یار جنگ
بہادر کی معیت میں اچانک ادارہ تشریف لائے اور تقریباً تین
گھنٹوں تک اس کی سرگرمیوں اور خدمات کی نسبت تبادلۂ خیال
فرماتے رہے۔ ادارے کے نادر قلمی نسخوں کے معائنے کے بعد تعجب کا
اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں گزشتہ پچاس سال سے اپنے
کتب خانہ میں قلمی نوادر جمع کر رہا ہوں لیکن ایسے نوادر مجھے بھی دستیاب
نہ ہوئے۔ خاص کر میر تقی میر کے فارسی دیوان کو دیر تک ملاحظہ فرمایا۔
یہ شاعر کی زندگی ہی میں نقل کیا گیا تھا۔

۱۱ر جنوری کو صبح نو بجے صوبہ سرحد پشاور کے ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات
شاہ عالم خاں صاحب نے ادارہ میں تشریف لاکر
تعلیم بالغان کے سلسلہ میں جو کام کیا جارہا ہے اس کے بارے
میں تفصیلی طور پر تبادلۂ خیال کیا اور مولوی سجاد مرزا صاحب کی نگرانی
میں ادارہ نے اردو دانی کی جو کتابیں لکھوائی ہیں ان پر غور و خوض
کے بعد رائے ظاہر کی کہ یہ کتابیں ہم صوبہ سرحد میں بھی رائج کریں
گے اور اسی طرز کی کتابیں پشتو زبان میں بھی لکھوائیں گے۔

اسی روز شام کے چار بجے **آنریبل سر عزیز الحق** اسپیکر
اسمبلی بنگال ادارہ میں تشریف لائے اور معائنے کے بعد خواہش
ظاہر کی کہ ادارہ صوبۂ بنگال کے لئے اردو کی نصابی کتابیں مرتب
کردے۔

کرنل ڈاکٹر **سر ضیاء الدین احمد** وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی
۱۷ر جنوری کو صبح نو بجے مولوی احمد محی الدین مرحوم مدیر رہبر دکن
کے ہمراہ ادارہ میں تشریف فرما ہوئے اور دیر تک معائنہ اور تبادلۂ خیال
کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی کے لئے نصابی کتب کی تیاری و فراہمی کی
خواہش ظاہر کی۔ قدیم اردو مطبوعات کا بغور ملاحظہ فرما کر آج سے
سو سال قبل نواب شمس الامرا نے سائنس کے مضامین اور
اصطلاحات کے لئے جو اردو ترجمے کرائے تھے ان کی موزونیت
اور سلاست و سادگی کا اعتراف فرمایا۔

۲۲ر جنوری کو شام میں آٹھ بجے **مولوی عارف الدین حسن**
صاحب کو ڈاکٹر زور صاحب نے عشائیے پر مدعو فرمایا تھا اور اس
سلسلہ میں ادارے کے چند اور ارباب کار مثلاً عبدالقادر صاحب
سروری۔ مولوی سید محمد صاحب۔ مولوی بادشاہ حسین صاحب۔

مولوی فیض محمد صاحب وغیرہ بھی مدعو تھے۔ عارف صاحب پربھنی کی شاخ ادارۂ ادبیات کے روح رواں ہیں اور ان کی نگرانی میں یہ شاخ جس خوبی کے ساتھ اردو کی خدمت انجام دے رہی ہے اس کا اندازہ اس کی روئدادوں سے ہوسکتا ہے جو موقع بہ موقع شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اردو امتحانات کی ترویج واشاعت کے سلسلہ میں دیر تک تبادلۂ خیال ہوتا رہا اور عارف صاحب نے ادارے کے اربابِ کار کو پربھنی کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے اصرار کے ساتھ مدعو فرمایا۔

شعبے

ادارے کے شعبے بھی مصروف عمل ہیں اگرچہ بعض شعبوں کا کام سست پڑ گیا ہے تاہم جنگ کی موجودہ پریشانیوں کے باوجود جو کچھ ہو رہا ہے غنیمت ہے۔

شعبۂ اردو انسائیکلوپیڈیا پہلی جلد کی ترتیب کا کام تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ خصوصاً الف ممدودہ کے بہت سے الفاظ ومصطلحات پر مقالے وصول ہو چکے ہیں جن میں حسب ذیل اصحاب کے مقالے خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر بی کے مدن ڈائرکٹر آف ریسرچ ریزرو بنک آف انڈیا۔
۲۔ ڈاکٹر ناظر علی بی اے ڈی فل پروفیسر عربی نظام کالج۔
۳۔ مس ایلی سی ایم اے ورکوک ایم اے کنٹب پروفیسر معاشیات جامعہ ٹراونکور۔
۴۔ ڈاکٹر آر۔ بالکرشنا ایم اے پی ایچ ڈی لندن۔ مہاراجہ کالج میسور۔
۵۔ ڈاکٹر عبدالصمد صاحب پروفیسر معاشیات گورنمنٹ کالج چھنگ
۶۔ راجہ کریا پراوینا این میں سبا ماہ واٹس چانسلر جامعہ میسور۔
۷۔ پنڈت گنگا پرشاد اپادھیایہ لاہور۔
مولانا حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ

ومصنف تاریخ وتنقید اردو وداستان اردو وغیرہ نے اردو انسائیکلوپیڈیا کے کام میں تعاون کا اظہار کرتے ہوئے حسب ذیل رائے ظاہر فرمائی۔

" ادارہ ادبیات اردو کے حوصلہ وہمت کی تعریف نہیں ہوسکتی۔
گراں سمجھ کے جسے سب نے یہ کہا کہ نہیں — وہ بار دوش پہ میں نے اٹھا لیا کہ نہیں
بعضوں کا ابھی ہی چاہتا رہا بعض سوچتے ہی رہے۔ مگر آپ لوگوں نے آگے بڑھ کر کہہ دیا۔ بسم اللہ مجریہا و مرسہا
چل دے خامہ بسم اللہ

ادارۂ ادبیات اردو سے خطاب

رہا محروم ساحل پر رہا جو — وہ اترا پار جو دریا میں تیرا
یہ میدان معارف طے ہو جب تک — سمند کلک کو ہرگز نہ ٹھیرا
شراب علم و فن کے جام و خم ہیں (انسائیکلوپیڈیا) — یہ ایک اک سطر۔ یہ ایک ایک پیرا
صلائے زن دریں میخانۂ علم — بہ گردش آر این مینا و مے را
حماک اللہ عن شر النوائب — جزاک اللہ فی الدارین خیرا "

شعبۂ نسوان بڑی خوشی کی بات ہے کہ ادارے کے شعبۂ نسوان نے محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کی پرخلوص کوششوں سے تعلیم یافتہ خواتین میں اردو کا ذوق پیدا کرنے اور غیر تعلیم یافتوں کو اردو پڑھنا لکھنا سکھانے کے جس کام کا آغاز کیا تھا اس کے اثرات دور دور تک پہنچتے جارہے ہیں چنانچہ بنگلور اور گلبرگہ میں شعبۂ نسوان کی شاخیں اپنا کام شروع کر چکی ہیں۔

شعبۂ نسوان بنگلور محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر کی تحریک پر بنگلور میں ادارہ ادبیات اردو کی شاخ قائم کرنے کا جو خیال عرصہ سے تھا وہ ۵ ڈسمبر ۱۹۴۱ء کو اس طرح تکمیل کو پہنچا کہ گرل گائیڈ ہیڈ کوارٹرز میں خواتین بنگلور کا ایک جلسہ بصدارت عقیلہ بیگم صاحبہ عقیلا ایم اے منعقد ہوا جس میں حبیب النساء بیگم صاحبہ ایم اے نے ادارے کے اغراض ومقاصد بیان کئے اور ڈاکٹر زور صاحب کے جوش ملی وذوق علمی کا تذکرہ کیا۔ تمام خواتین نے

منعقدہ طور پر شاخ کے قیام کا تصفیہ کیا۔ جس کی بنا پر ۸ اڈسمبر ۱۹۴۱ء کو مہارانی کالج میسور میں جب اردو و فارسی انجمن کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا اور تقریباً دو سو خواتین نے شرکت کی تو شاخ ادارہ کی مجلس انتظامی کا انتخاب کیا گیا۔

اس مجلس انتظامی کا پہلا جلسہ ۲۳ جنوری ۱۹۴۲ء کو گرل گائیڈ ہیڈ کوارٹرز بنگلور میں منعقد ہوا۔ اس میں حبیب النسا بیگم صاحبہ ایم اے معتمد نے گذشتہ جلسوں کی کارروائی اور حساب کتاب پیش کیا۔ اور عقیلہ بیگم صاحبہ صدر شاخ ادارہ سے استدعا کی کہ وہ اس شاخ کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد کی اطلاع و تبلیغ تشہیر کے لئے مختلف مقامات مثلاً انجمن معین خواتین بنگلور۔ انجمن اردو اساتذہ پرائمری اسکولس اور دیگر انجمنوں میں تقریروں کا انتظام فرمائیں جس کو محترمہ نے بہ خوشی قبول فرمایا۔ چنانچہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۲ء کو انجمن اردو اساتذہ پرائمری اسکولس کی صدارت کرتے ہوئے محترمہ عقیلہ بیگم نے ادارۂ ادبیات اردو بنگلور کے قیام اور اس کے مقاصد و امتحانات کا خوبی سے ذکر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر خواتین نے اردو امتحانات میں شریک ہونے کی خواہش ظاہر کی۔

بنگلور کے شعبۂ نسوان کی مجلس عاملہ حسب ذیل خواتین پر مشتمل ہے۔

صدر:۔ عقیلہ بیگم صاحبہ محمود شریف ایم آر اے۔

معتمد:۔ حبیب النسا بیگم صاحبہ ایم اے۔

شریک معتمد:۔ عالیہ بیگم صاحبہ بی اے

اراکین:۔ صابرہ بیگم صاحبہ۔ ملکہ بیگم صاحبہ۔ فاطمہ ہیڈ مسٹرس اردو گرلز اسکول۔

شعبۂ نسوان گلبرگہ محترمہ محمدی بیگم صاحبہ ایم اے (بیگم جمیل حسن صاحب تعلقدار) کی صدارت میں خواتین بنگلور کا جو جلسہ منعقد ہوا اس کی روداد آئندہ شمارہ میں شامل رہے گی۔

توقع ہے کہ محترمہ موصوفہ کی ذاتی دلچسپی اور پرخلوص مساعی کی وجہ سے گلبرگہ کی خواتین میں اردو زبان کی خدمت گزاری کے ولولے پیدا ہو جائیں گے۔

شعبۂ کتب خانہ ادارے کا کتب خانہ برابر ترقی کرتا جارہا ہے۔ اور اس کی قلمی کتابوں کی جو تفصیلی فہرست عرصہ سے زیر ترتیب ہے اس کا کام اب قریب الختم ہے اور یہ فہرست انشاءاللہ اس سال شائع ہو جائے گی۔

ادارے کی نئی مطبوعات ادارے کے شعبۂ ادبیات اطفال کی طرف سے بچوں کے لئے کہانیوں کی ایک باتصویر کتاب کشمکش نامی شائع ہوئی ہے۔ یہ مولوی شجاع احمد صاحب قائم کا نتیجۂ قلم ہے اور اس کا مقدمہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے تحریر فرمایا ہے۔ کتابت و طباعت بچوں کے لئے جلی اور کھلی رکھی گئی ہے۔ زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے قصے بہت دلچسپ اور تصویریں اور سرورق نہایت دیدہ زیب ہے۔

گارساں دتاسی اس اثنا میں ادارے کی طرف سے ایک اور علمی و تحقیقی کتاب گارساں دتاسی شائع ہوئی ہے۔ یہ اصل میں اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے جو کافی اضافوں کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۱ء میں ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے اردو کے پہلے پروفیسر گارساں دتاسی کے حالات زندگی تصنیفات و تالیفات۔ طرز تعلیم۔ تلامذہ اور اس کے ہمعصر اساتذۂ اردو اور مستشرقین پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ معلومات جمع فرمائے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کو اعزازی ڈگری خبر ادارے کے حلقوں میں بڑی مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اسی مہینے ادارے کے قدیم رفیق اور شعبۂ اردو وائنسائیکلوپیڈیا کی مجلس انتظامی کے رکن ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کو

جامعۂ عثمانیہ کی طرف سے ان کی اعلیٰ علمی تحقیقات کے سلسلہ میں ڈی ایس سی کی اعزازی ڈگری دی گئی جس کے لئے ہم جناب ادارہ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

شعبۂ طلبہ

اس شعبہ کے اثرات بھی دور رس ثابت ہوئے ہیں چنانچہ اس وقت تک مختلف اضلاع و دیہات میں شعبۂ طلباء کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں جن میں سے چند کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

شعبۂ طلبہ پرلی اس کے معتمد ابوظفر محی الدین صاحب پابندی سے کام کر رہے اور روئدادیں روانہ کرتے رہتے ہیں۔ ۱۵ر بہمن ۱۳۵۱ف کو اس شاخ کا ایک جلسہ مولوی غلام حسن صدیقی اردو فاضل (ادارہ) معتمد ادارہ ادبیات اردو پرلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ گزشتہ جلسہ کی روئداد کی توثیق حافظ سید ظہیر الدین قادری کی قرأت اور محمد اظہر الدین صدیقی کی حمد کے بعد مباحثہ شروع ہوا جس کا عنوان تھا "اہل سیف اور اہل قلم" اہل قلم کی موافقت میں ابوظفر محی الدین اور عزیز الدین قریشی نے اور مخالفت میں سعید الدین صدیقی۔ مظہر حسین۔ نیر الدین۔ پنڈت ناگو راؤ صاحب معتمد ادارہ ادبیات اردو دعافورہ بزرگ۔ اشرف الدین صاحب نفیثی اور تکا رام صاحب نے تقریریں کیں۔ صدر جلسہ کی معلومات آفریں تقریر کے بعد یہ مباحثہ ختم ہوا۔

۱۴ر اسفندار ۱۳۵۱ف کو مسٹر جگی پانی مہتم مارکٹ پرلی نے شعبہ طلبہ کا معائنہ کیا اور بڑی اچھی رائے ظاہر کی جس کے چند جملے یہ ہیں۔

"کردی۔ کھاتہ اور دیگر رجسٹرات کے معائنے کا موقع ملا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ طلبہ جملہ رجسٹرات کے اندراجات خود کرتے ہیں۔ آج کے یہی طلبہ آئندہ ملک سرکار عالی کے ترقی دینے والے ہیں جو کام اس وقت چل رہا ہے نہایت اچھے طرز پر ہے۔ میں خود بھی حتی الامکان کوشش کروں گا کہ ہر طرح کی مدد دیتا رہوں۔ یہ شاخ بہت جلد ترقی کرے گی اور اپنے وطن کا نام روشن کرے گی"

۷ر اسفندار کو افضل الدین صاحب مشائخ پرلی۔ اسی طرح ۱۱ر کو قاضی لئیق الدین صاحب۔ ۱۹ر کو محمد دلیل الدین صاحب نے ادارے کا معائنہ کیا اور بڑی اچھی رائیں لکھیں۔ اور موخر الذکر دو صاحبوں نے رقمی عطیوں سے بھی شعبہ کی مدد کی۔

۱۵ر اسفندار کو مولوی عزیز الدین قریشی نائب صدر اور مولوی سعید الدین صدیقی خازن شعبہ نے اراکین میں اضافہ کی خاطر بردا پور کا نہایت کامیاب دورہ کیا۔

شعبہ طلبہ پرلی کے اراکین یہ ہیں۔ محمد عزیز الدین قریشی نائب صدر۔ ابوظفر محی الدین صدیقی معتمد۔ سید نبی صاحب نائب معتمد۔ سعید الدین صدیقی خازن۔ ابو الخیر فاروقی کتب خانہ دار۔

اراکین:- اظہر الدین۔ نیر الدین۔ شریف الحسن۔ ڈگمبر بالاجی۔ سید جعفر۔ شاہ محمد۔ راسخ الدین۔ محمد عبد الکریم۔ غلام مرتضیٰ۔ شیخ امیر۔ حبیب الدین۔ واسد یوراؤ۔ عبد الرشید۔ فقیر محمد خاں۔ کرن پرشاد۔

شعبۂ طلبہ گلبرگہ گلبرگہ میں نیاز علی خاں صاحب نیاز اردو عالم معتمد شاخ رفیقین کی جد و جہد سے شعبۂ طلبہ کی شاخ بڑا اچھا کام انجام دے رہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے تعلیم کے اوقات کا ایک مفید نظام نامہ مرتب کر لیا ہے جس کی ایک نقل ادارے کے دفتر کو بھی روانہ کی گئی ہے۔ جس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

شنبہ۔ ۴ تا ۶۔ مولوی نصیر الدین صاحب بی اے بی ٹی اردو نظم (غالب، اقبال، سراج اور جوش)

یکشنبہ۔ ۹ تا ۱۰ شب۔ مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے ادب و تنقید (مقدمہ شعر و شاعری، موازنۂ انیس و دبیر، روح تنقید، جدید اردو شاعری، تاریخ ادب اردو)

دوشنبہ۔ ۹ تا ۱۰۔ مولوی محمد اسحاق صاحب بی ایس سی معلومات سائنس۔

سہ شنبہ۔ ۸ تا ۹.۳۰۔ مولوی خواجہ معین الدین صاحب بی اے ایل ایل بی خیالی کہانی

چہار شنبہ ۹ تا ۱۰۔ مولوی محمد بن عمر صاحب ۔ اردو نثر (یادگار غالب ۔ توبۃ النصوح
آب حیات ۔ پردۂ غفلت ۔ کیمیا گر ۔)

پنجشنبہ ۔ ۴ تا ۳۰۔۵ مولوی نصیر الدین صاحب مطالعۂ اقبال ۔ (اقبال کی
تصنیفات اور ان سے متعلق کتب)

جمعہ ۔ ۴ تا ۳۰۔۵ مولوی احمد عبدالعزیز صاحب ایم اے معاشیات و سیاسیات

جمعہ ۔ ۷ تا ۸ ۔ علی بن غالب صاحب ۔ فلسفہ

شاخیں

اردو کی ترویج اور اس کا ذوق عام کرنے میں ادارے کی جملہ شاخیں اپنی بساط بھر کوشش کر رہی ہیں۔ اور بعض شاخوں کی مصروفیات تو ان کے شاندار مستقبل کی ضمانت دے رہی ہیں۔

شاخ پرلی اردو امتحانات کی ترغیب دلانے کے سلسلے میں اطراف واکناف کے قصبہ جات و دیہات میں اس شاخ نے اچھا کام انجام دیا جس کے باعث ڈسمبر ۱۹۴۱ء کے آخری ہفتہ میں مختلف قصبہ جات مثلاً دھانورہ بزرگ، دیولہ اور پاٹودہ سے امیدواران اردو عالم کا پرلی میں اجتماع ہوا۔ اور ان کے اصرار پر ادارے کو مقامی امیدواروں کے درس و تدریس کو روک کر، باہر سے آنے والوں کیلئے باضابطہ درس و تدریس کا انتظام کرنا پڑا۔ مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد شاخ باعث ستائش ہیں کہ انھوں نے اپنی علم دوستی اور فراغ حوصلگی سے ان امیدواروں کو ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی اور کامل ایک ہفتہ تک روزانہ خود معتمد صاحب، مولوی اشرف الدین صاحب فیضی اور مسٹر دینا نوباراؤ صاحب ہوکے (عثمانیہ) رکن شاخ امیدواران اردو عالم کو تعلیم دیتے رہے۔

نظام الاوقات تدریس امیدواران اردو عالم شاخ دھانورہ بزرگ

۲۴/ بہمن قواعد اردو ۲ تا ۶۔ مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد
ساڑھے ۳ تاریخ ادب اردو ۸ تا ۱۱۔ مولوی اشرف الدین صاحب فیضی

ساڑھے ۲۵/ بہمن مجموعۂ نظم حالی ۲ تا ۵۔ مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد
" " سائنس کے کرشمے ۵ تا ۶۔ مسٹر دینا نوباراؤ ہوکے ایف ایس سی عثمانیہ
" " تاریخ ادب اردو ۷ تا ۱۰۔ مولوی اشرف الدین صاحب فیضی
" " باغ و بہار ۱۰ تا ۱۲۔ " غلام حسن صاحب صدیقی معتمد

۲۶/ " قواعد اردو ۱۰ تا ۱۲۔ " " " " " "
" " سائنس کے کرشمے ۲ تا ۴۔ مسٹر دینا نوباراؤ ہوکے ایف ایس سی (عثمانیہ)
" " تاریخ ادب اردو ۴ تا ۷۔ مولوی اشرف الدین صاحب فیضی
" " باغ و بہار ۹ تا ۱۲۔ " غلام حسن صاحب صدیقی معتمد

۲۷/ بہمن قواعد اردو ۹ تا ۱۲۔ مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد
" " سائنس کے کرشمے ۲ تا ۴۔ مسٹر دینا نوباراؤ ہوکے ایف ایس سی (عثمانیہ)
" " تاریخ ادب اردو ۸ تا ۱۰۔ مولوی اشرف الدین صاحب فیضی
" " باغ و بہار ۱۰ تا ۱۲۔ " غلام حسن صاحب صدیقی معتمد

۲۸/ بہمن اجتماعی زندگی کی ابتداء ۸ تا ۱۰۔ مولوی اشرف الدین صاحب فیضی
" " سائنس کے کرشمے ۲ تا ۴۔ مسٹر دینا نوباراؤ ہوکے ایف ایس سی (عثمانیہ)
" " اجتماعی زندگی کی ابتداء ۸ تا ۱۰۔ مولوی اشرف الدین صاحب فیضی
" " باغ و بہار ۱۰ تا ۱۲۔ مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد

۲۹/ بہمن مجموعۂ نظم حالی ۹ تا ۱۲۔ مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد
" " سائنس کے کرشمے ۲ تا ۴۔ مسٹر دینا نوباراؤ ہوکے ایف ایس سی (عثمانیہ)
" " اجتماعی زندگی کی ابتداء ۸ تا ۱۰۔ مولوی اشرف الدین صاحب فیضی
" " فن انشا پردازی ۱۰ تا ۱۲۔ " " " " " "

۳۰/ بہمن معائنہ شاخ ۹ تا ۱۱۔ مولوی اشرف الدین صاحب فیضی نے شاخ ہذا کے کاموں کا معائنہ کروایا قدیم اردو کے نادر نمونے بتلائے۔
" " عصرانہ ۲ تا ۴۔ منجانب مولوی غلام حسن صاحب صدیقی

آخر میں مولوی غلام حسن صاحب صدیقی معتمد شاخ ادارہ ہذا نے جناب پنڈت ناگوراؤ صاحب معتمد شاخ ادارہ ادبیات اردو دھانورہ بزرگ،

جناب بھگونت راؤ صاحب نائب معتمد و جمیع امیدواران اردو عالم کو عصرانہ پر مدعو فرمایا، اور ان سب کو الوداع کہا۔

بردا پور میں تقریر حسب خواہش معززین بردا پور تعلقہ مومن آباد، شاخ پرلی سے مولوی اشرف الدین صاحب فیضی اردو فاضل (ادارہ) کو شاخ کے قاعدے اور اس کے طرز کار سے متعلق تقریر کرنے اور تفہیم کی خاطر روانہ کیا گیا تھا۔

چنانچہ بتاریخ ۱۰ اسفندار ۱۳۵۱ف روز شنبہ بصدارت مسٹر رام لنگ پا صاحب چودھری بردا پور ایک جلسہ منعقد ہوا۔ بستی کے معززین اور علم دوست اصحاب سے تقریباً ۰۰ اصحاب شریک جلسہ رہے۔ فیضی صاحب نے ادارۂ ادبیات اردو کے بانی، محسنین، اغراض و مقاصد اور اس کے جملہ شعبہ جات پر کافی روشنی ڈالی۔ ادارے کی شاخوں کے طرز کار سے حاضرین کو تفصیلی طور پر واقف اور اردو امتحانات کی اہمیت کو ذہن نشین کرایا۔ یقین کامل ہے کہ پنڈت رنگنا تھ ہری پنت صاحب جوشی کی صدارت اور جناب قاضی سید غیاث الدین صاحب کی معتمدی میں یہ شاخ ترقی کرے گی۔

نمائش پرلی ہندوؤں کا ایک مقدس اور مشہور مقام ہے۔ ہندوستان کے بارہ جوتر لنگوں میں سے ایک جوتر لنگ یہاں متمکن ہے جو "سری ویجناتھ" کے نام سے شہرت پذیر ہے۔ چنانچہ ہر سال مہاشیوراتری کے دن ہندوؤں کا ایک بڑا اجتماع ہوتا ہے اور دور دور سے لوگ کثیر تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔

اس نادر موقع سے فائدہ اٹھا کر اور اس کے دور رس نتائج کا لحاظ کر کے ادارہ ادبیات اردو کی شاخ پرلی نے نمائش گاہ میں دلچسپی لی۔ جس میں اپنی کارگزاریوں کو متعدد نظر فریب علائم میں پیش کیا اور ساتھ ہی اس کے مندرجہ ذیل چارٹس اور نقشہ جات جو معتمد ادارہ اور فیضی صاحب کے طبع رسا کا نتیجہ ہیں ایک دلکش ترتیب سے جگہ جگہ آویزاں کئے گئے۔

۱۔ اردو زبان کی وسعت اور اس کا حیرت انگیز پھیلاؤ۔ ایک بڑے دائرے کی شکل میں دکھایا گیا تھا اور اس کے اجزا کو مختلف رنگوں سے ممتاز و نمایاں کیا گیا تھا۔

۲۔ دوسری زبانوں سے اردو کا لسانی تعلق۔ اس چارٹ میں بتایا گیا تھا کہ اردو کے اجزائے ترکیبی میں کن کن السنہ نے حصہ لیا ہے نیز یہ کہ اب اردو ان سب زبانوں کی معنوی خوبیوں سے مالا مال ہے۔

۳۔ تیسرا چارٹ ہندوستان میں اردو جاننے والوں کی اکثریت پر مشتمل تھا۔

۴۔ چوتھے میں بتایا گیا کہ ریڈیو کے ذریعہ جو مختلف و متعدد زبانوں میں تقاریر نشر کی جاتی ہیں اس میں اردو زبان کا کیا درجہ ہے۔

۵۔ پانچویں چارٹ میں ظاہر کیا گیا تھا کہ اخبار و رسائل جو مختلف زبانوں میں شائع ہوتے ہیں اس میں اردو زبان کی کیا حیثیت ہے۔

۶۔ چھٹا چارٹ ان کامیاب شدہ امیدواروں پر مشتمل تھا جو ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات میں مختلف شاخوں سے شریک ہوئے تھے۔ اس میں فیصد کامیابی کا اوسط قایم کر کے ان کی ممتاز کامیابی کو نمایاں کیا گیا تھا۔

۷۔ ساتواں چارٹ ادارۂ ادبیات اردو کی شاخوں اور ان کی مقامیت کو ظاہر کر رہا تھا۔ جو ممالک محروسہ سرکار عالی میں پھیلی ہوئی ہیں۔

جناب علی اصغر صاحب بلگرامی صوبہ دار اورنگ آباد نے مستقر ضلع بیڑ اور مومن آباد کے عہدہ داروں کی معیت میں ادارہ کی نمائش کو بنظر استحسان ملاحظہ کر کے اپنی خوشنودی و پسندیدگی کا تحریری اظہار فرمایا۔

اس نمائش کی کامیابی میں فیضی صاحب کے علاوہ عزیز الدین ہاشمی اور سعید الدین صاحب صدیقی نے بھی معتمد کا بہت ساتھ دیا۔

تمغہ مولوی خواجہ محمود احمد صاحب جسنم بی اے۔ ڈپ ایڈ (عثمانیہ) نے از راہ علم دوستی مبلغ پانچ روپیہ شاخ پرلی کو مرحمت فرمائے ہیں

تاکہ اس امیدوار کو نقروی تمغہ دیا جائے، جس نے امتحان اردو دانی ۱۹۴۱ء میں پربھنی مرکز کے جملہ امیدواروں میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے ہوں۔

شاخ برداپور

مولوی غلام حسین صاحب صدیقی معتمد شاخ ادارہ ادبیات اردو پربھنی کی تحریک اور مولوی سید غیاث الدین صاحب قاضی برداپور کی کوشش سے برداپور کے علم دوست سیٹھ ساہوکار اور معززین کو اپنے ہاں ادارۂ ادبیات اردو کی ایک شاخ قایم کرنے کا خیال ہوا۔ مولوی اشرف الدین صاحب فیضیؔ کو شاخ کے قاعدہ اور طرز کار سے متعلق تقریر کرنے پر مدعو کیا گیا۔ چنانچہ ۱۵ ار اسفندار ۱۳۵۱ف شام کے ۸ بجے بہ تحریک مسٹر کرشناجی صاحب و تائید مولوی قاضی سید غیاث الدین صاحب۔ مسٹر لنگپا صاحب چودھری ساہوکار کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ کی تشہیر قبل ہی ذریعہ اعلانات کر دی گئی تھی۔ بستی کے معززین اور علم دوست احباب کی تقریباً چار سو تعداد شریک تھی۔

مولوی سید فخر الدین صاحب نے قرأت پڑھی اور علم پر کچھ اشعار سنا کر سامعین کو محظوظ فرمایا۔ دعائیہ نظم اعلیٰ حضرت بندگان عالی بظلہم العالی کو دو طلبہ زکی الدین احمد و عبد القادر نے خوش الحانی سے پڑھا۔ اس کے بعد دو طلبہ کاشی ناتھ و چنبس نے علم کے بارے میں مختصر سی تقریر کی اردو زبان کی ضرورت کے متعلق دو طلبہ دینو دھر اور پوسارام نے مکالمہ بزبان مرہٹی کیا۔

من بعد قاضی اشرف الدین صاحب فیضیؔ نے ادارہ کا نہایت خوبی سے تعارف کرایا۔ فاضل مقرر نے بڑی تفصیل سے فرمایا کہ ہمارے آقائے ولی نعمت حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ نے اپنی شاہانہ اردو نوازیوں سے جامعہ عثمانیہ قائم فرما کر ہم پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے جس کی وجہ ہماری نسلوں کی تعلیم میں بہت بڑی سہولت ہو گئی ہے۔ اسی مادر جامعہ کے قابل فخر فرزند ڈاکٹر زور ادارۂ ادبیات اردو کے بانی ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کی حفاظت اور ترقی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان کی کوششوں کا ذکر موثر انداز میں فرمایا۔ اس کے بعد ادارہ کے اغراض و مقاصد اس کا جدید دور شعبہ جات اور ان کی فرداً فرداً کارگزاریوں کا اظہار فرمایا۔ شاخوں کے قاعدے اور طرز کار کی تفصیل سے تشریح فرمائی۔ اور اردو امتحانات میں شرکت کی ترغیب دلائی۔ یہ صدا موثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور ہر شخص نے اپنی رضامندی و خوشی کا اظہار کیا۔

فیضیؔ صاحب نے اُن حضرات کو جنھیں اردو کا ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا۔ لمباجی حجام جس کی عمر ۶۰ سالہ و چاند خاں صاحب معمر ۵۵ سالہ و شیخ محبوب فراش مدرسہ برداپور کو امتحاناً اردو کا سبق ایسے موثر انداز میں پڑھایا کہ چند ہی منٹ میں وہ اردو کے جملہ پڑھنے اور لکھنے لگے۔ آخر میں اعلیحضرت بندگان عالی و شاہزادگان بلند اقبال و شاہزادیاں فرخندہ فال کے صحت و درازی عمر کی دعا مانگی اور اردو کے نوجوان عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) کی درازی عمر و صحت و سلامتی و اردو کی ترقی کی دعا حسب ذیل نظم میں سنائی۔

ہو عمر خضر یا رب اردو کے نوجوان کی ۔۔۔ دے رفعت و بلندی تو اس کو آسمان کی

تحریک نیک ہے یہ جاہل رہے نہ کوئی ۔۔۔ ڈالی بنا ہے اس نے اردو کے امتحاں کی

بالغ نظر ہے بیشک اس کی ہی تھی ضرورت ۔۔۔ کرتا ہے وہ حمایت تعلیم بالغاں کی

اردو ادب کا چسکا ہر اک کو لگا کر ۔۔۔ ہے روز و شب وہ کوشاں ترویج میں زباں کی

جب پشت پر ہوں عثمانؔ اور زورؔ کی ہو کوشش

پھر کیوں نہ ہو گی فیضیؔ اردو زباں جہاں کی

اس تقریر کے بعد پنڈت رنگناتھ راؤ صاحب جوشی نے اردو زبان سیکھنے اور اردو امتحانات کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور امتحانات میں شرکت کی جانب توجہ دلائی۔ صدر جلسہ نے مختصر لیکن موثر پیرایہ میں اردو امتحانات میں شرکت کی ترغیب دلائی۔ بالاتفاق آرا شاخ کی مجلس انتظامی کا حسب ذیل انتخاب ہوا۔

صدر۔ پنڈت رنگناتھ راؤ صاحب جوشی۔ نائب صدر۔ پنڈت کرشناجی گوبند راؤ

معتمد۔ قاضی سید غیاث الدین صاحب۔

اراکین۔ سید فخر الدین صاحب۔ مسٹر رام لنگپا صاحب چودھری ساہوکار۔ مسٹر ڈھنگاجی صاحب مسٹر مدن لعل صاحب ساہوکار۔ مسٹر گنگادھر صاحب مہاجن۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	
من کی بینا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ...	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر) ...	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سرسالارجنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم ...	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطوجاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عمادالملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طیلم ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری ...	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں ...	۸۹	۱	۰	۰

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	
ٹیگور اور ان کی شاعری ...	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵[illegible]	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲[illegible]	۰	۱۲	۰
فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر ...	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) " ...	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدارس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن ...	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر ...	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان ...	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات ...	۱۱۲	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چونٹی (۱۶) تصاویر ...	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش ثانی (۴) تصاویر ...	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴	

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن